

نوائے سروش

مکمل دیوان غالب مع شرح

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب سرپرست مولائے سرورش ہے

تولائے سرورش

مکمل دیوان غالب مع شرح

از

غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سَنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

ہم کو حقوق کیونکہ شیخ غلام علی آئیندہ سنز پرائیویٹ، لمیٹڈ محفوظ

طابع : شیخ نیا ز احمد

مطبع : غلام علی پرنٹرز

جامعہ اشرفیہ، اچھرو، لاہور۔

مقام اشاعت :

شیخ غلام علی آئیندہ سنز پرائیویٹ، لمیٹڈ پبلشرز،

۱۹۹- سرگھر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۵۴۰۰۰/۲

ISBN - 969 - 31 - 0016 - 6

فہرست

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۱	مقدمہ: از مولانا غلام رسول مہر	
۱۷	نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا	۱
۲۰	جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار	۲
۲۵	کہتے ہوں ویں گے ہم دل اگر پڑا پایا	۳
۲۸	دل میرا سوزنہاں سے بے مہا باہل گیا	۴
۳۱	شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا	۵
۳۴	دھکی میں مر گیا جو نایاب نبرد تھا	۶
۳۷	شمار بچہ خوب بت مشکل پسند آیا	۷
۴۰	دہر میں نقش وفا و جدہ قسلی نہ ہوا	۸
۴۴	سائش گر ہے زابد اس قدر جس بارغ رضواں کا	۹
۵۱	نہ ہو گا یک بیاہاں ماندگی سے ذوق کم میرا	۱۰
۵۲	سراپا رہن عشق و ناگزیر الغت ہستی	۱۱
۵۳	محرم نہیں ہے تو ہی نواٹے راز کا	۱۲
۵۶	بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا	۱۳
۶۱	شب کہ برق سوز دل سے زہرہ ابر آب تھا	۱۴
۶۴	نالہ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا	۱۵
۶۷	ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب	۱۶

صفحہ	عزایات	نمبر شمار
۷۹	بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	۱۷
۷۵	شبِ خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا	۱۸
۷۸	دوستِ غمِ خواری میں میری کسی قربانیں گے کیا	۱۹
۸۲	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا	۲۰
۸۸	ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا	۲۱
۹۳	درِ غمِ قہر و غضب جب کوئی ہم سانہ ہوا	۲۲
۹۹	اسد! ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سرو پا ہیں	۲۳
۹۹	پٹے نذرِ کرمِ تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا	۲۴
۱۰۳	گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا	۲۵
۱۰۷	درِ مفت کشِ ودانہ ہوا	۲۶
۱۱۲	گھمبے شوقِ کوئل میں بھی تنگی جا کا	۲۷
۱۱۸	قطرہ سے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا	۲۸
۱۱۹	جب بتقریب سفر یار نے عمل باندھا	۲۹
۱۲۱	میں اور بزم سے سے یوں تشنہ کام آؤں	۳۰
۱۲۴	گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو دریاں ہوتا	۳۱
۱۲۵	نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	۳۲
۱۲۶	یک ذرہ زمین نہیں بے کار باغ کا	۳۳
۱۳۱	وہ مری چہن جہن سے غم نہاں سمجھا	۳۴
۱۳۴	پھر مجھے دیدہ تریا د آیا	۳۵
۱۳۸	ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا	۳۶
۱۳۳	لب خشک درِ تشنگیِ مردگان کا	۳۷
۱۴۴	تو دوست کسی کا بھی سنگ نہ ہوا تھا	۳۸

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۴۹	شب کہ وہ مجلس فروز غلوت ناموس تھا	۳۹
۱۵۱	آئینہ دیکھ اپنا سامنے کے رہ گئے	۴۰
۱۵۲	عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا	۴۱
۱۵۴	رنگ کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف	۴۲
۱۶۰	ذکر اس پری وشن کا اور بھربیاں اپنا	۴۳
۱۶۵	سر نہ مفت نظر یوں میری قیمت یہ ہے	۴۴
۱۶۶	غافل بہ ہم ناز خود آرا ہے، درخیاں	۴۵
۱۶۸	جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا	۴۶
۱۷۳	لطف بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی	۴۷
۱۷۴	عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	۴۸
ب		
۱۷۹	پھر ہوا دقت کہ ہوا بال کشا موج شراب	۴۹
ت		
۱۸۴	افسوس کہ دیدال کا کیا رذوق خاک نے	۵۰
۱۸۷	رنگ کوئی نہ قیامت سلامت	۵۱
۱۸۸	منہ گشیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غائب	۵۲
۱۸۹	آبد خط سے ہوا ہے سر و جو بازارِ دوست	۵۳
ج		
۱۹۳	گلشن میں بند دبست برنگ در ہے آج	۵۴

نمبر شمار	غزلیات	صفحہ
۵۵	لوہم مر یعنی عشق کے تیمار دار ہیں	۱۹۳
	ج	
۵۶	نفسِ ذابحین آرزو سے باہر کھینچ	۱۹۴
	د	
۵۷	حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	۱۹۷
	ر	
۵۸	بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر دردِ دیوار	۲۰۲
۵۹	گھر جب بنالیا تیرے درد پر کسے بغیر	۲۰۴
۶۰	کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر	۲۱۰
۶۱	لہرِ فنا ہے میرا دل، زحمتِ مہر و رخشاں پر	۲۱۴
۶۲	ہے بلکہ ہر ایک اُن کے اشارے میں نشان اور	۲۲۲
۶۳	صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگِ آخر	۲۲۸
۶۴	جنوں کی دستگیرِ مکی سے ہو اگر ہو نہ عریانی	۲۲۹
۶۵	ستمِ کشِ مصلحت سے ہوں کہ خواباں تجھ پہ عاشق ہیں	۲۳۴
۶۶	لازم تھا کہ دیکھو مرا ستہ کوئی دن اور	۲۳۴
	ز	
۶۷	نارِ رخِ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبحِ مہر	۲۳۹
۶۸	حرِ لیبِ مطلب مشکل نہیں فتونِ نیاز	۲۴۱

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۲۴۳	دستِ مہی کرم دیکھ کہ سرتاسر خاک	۶۹
۲۴۵	کیونکر اس بت سے رکھوں جانِ عزیز	۷۰
۲۴۶	نہ گلِ لغز ہوں نہ پردہ ساز	۷۱
	س	
۲۴۹	مردہ اے ذوقِ امیری کہ نظر آتا ہے	۷۲
	ش	
۲۵۲	نہ لیوے گریں تو ہر طرادت سبزہ خط سے	۷۳
	ع	
۲۵۴	جادو رہ خود کو وقتِ شام ہے تارِ شاخ	۷۴
۲۵۵	دُرخ نگار سے ہے کوثرِ جادو دانی شمع	۷۵
	ف	
۲۵۷	بیمِ رقیب سے نہیں کرتے دوا با ہوش	۷۶
	ک	
۲۵۸	زخمِ پے چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پردا نمک	۷۷
۲۶۲	آہ کو چاہئے ایک عمر اثر ہونے تک	۷۸
	گ	

نمبر شمارہ	عزایات	صفحہ
۷۹	گر تجھ کو ہے یقین اجابت، دعا نہ مانگ	۲۶۶
	ل	
۸۰	ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل	۲۷۰
	م	
۸۱	غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس	۲۷۴
۸۲	یہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر	۲۷۷
۸۳	تجھ کو دیا یہ غیر میں مارا، وطن سے دور	۲۷۷
	ن	
۸۴	لوں دامِ بختِ خفہ سے، یک خوابِ خوش، دے	۲۷۸
۸۵	وہ فراق اور وہ وصال کہاں ؟	۲۷۹
۸۶	کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں	۲۸۱
۸۷	آبرو کیا خاک اس گل کہ گلشن میں نہیں	۲۸۶
۸۸	عبد سے بے مدح ناز کے، باہر نہ آسکا	۲۹۲
۸۹	مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت	۲۹۳
۹۰	ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی، ایک دن	۲۹۵
۹۱	ہم پر جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں	۲۹۷
۹۲	مانعِ دشتِ نور دی کوئی تدبیر نہیں	۳۰۳
۹۳	مستِ مردِ ملک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں	۳۰۶
۹۴	بر شگالِ گریہ عاشق ہے، دیکھا چاہیے	۳۰۷

صفحہ	عزایات	نمبر شمار
۳۰۸	عشق تاثر سے نومید نہیں	۹۵
۳۱۲	جہاں ترانقش قدم دیکھتے ہیں	۹۶
۳۱۵	مٹی ہے خوشے باد سے تارہ التہاب میں	۹۷
۳۲۳	کل کے لئے کرا ج نہ خست شراب میں	۹۸
۳۲۴	حیران ہوں، دل کو روڈوں کے پٹوں جگر کو میں	۹۹
۳۲۷	ذکر میرا نہ بدی بھی، اُسے منظور نہیں	۱۰۰
۳۲۲	تارہ جز حسن طلب، اے ستم اسباب! نہیں	۱۰۱
۳۲۹	دونوں جہاں دے دے کے، وہ سمجھے یہ خوش رہا	۱۰۲
۳۵۱	ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کا درگر	۱۰۳
۳۵۲	قیامت ہے کہ سُن میل کا درشت قیس میں آنا	۱۰۴
۳۵۳	دل لگا کر آگئی ان کو بھی تنہا بیٹھا	۱۰۵
۳۵۴	یہ ہم جو بھر میں، دیوار و در کو دیکھتے ہیں	۱۰۶
۳۵۶	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں	۱۰۷
۳۶۰	تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں	۱۰۸
۳۶۳	زمانہ سخت کم آزار ہے یہ جان اسد	۱۰۹
۳۶۴	وائیم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں	۱۱۰
۳۶۷	سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	۱۱۱
۳۸۰	دیوانگی سے دوش پر زمانہ بھی نہیں	۱۱۲
۳۸۵	نہیں ہے زخم کوئی پہننے کے درخور مرے تن میں	۱۱۳
۳۸۹	مرے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں	۱۱۴
۳۹۲	دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں	۱۱۵
۳۹۸	غیر نا شگفتہ کو، دور سے مت دکھا کہ یوں	۱۱۶

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
	و	
۴۰۱	حمد سے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو	۱۱۷
۴۰۴	کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں	۱۱۸
۴۰۶	دارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	۱۱۹
۴۱۱	قفص میں ہوں، اگر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو	۱۲۰
۴۱۸	دھوتا ہوں جب میں پیئے کو اس سیم تن کے پانوں	۱۲۱
۴۲۲	وال اس کو بول دل ہے، تو یاں میں ہوں شہ مسار	۱۲۲
۴۲۳	وال پہنچ کر جو غم آتا ہے، ہم ہے ہم کو	۱۲۳
۴۲۸	تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم دراہ ہو	۱۲۴
۴۳۲	گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو	۱۲۵
۴۳۶	کسی کو دس کے دل کوئی نواسخ فضاں کیوں ہو	۱۲۶
۴۳۸	دعا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر بھوڑنا محض ا	۱۲۷
۴۴۱	رہئے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو	۱۲۸
	د	
۴۴۴	از مہربا بہ ذرہ دل و دل سے آئینہ	۱۲۹
۴۴۶	بے سبزہ زار ہر درو دیوار غم کردہ	۱۳۰
	ی	
۴۴۴	حد جلوہ رو بہو سے، جو شرکاں اٹھائیے	۱۳۱
۴۴۶	مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے	۱۳۲
۴۵۱	بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی	۱۳۳

نمبر شمار	غزلیات	صفحہ
۱۳۳	ہے بزمِ بیاں میں سخن آزد وہ لبوں سے	۴۵۷
۱۳۵	تا ہم کوشکایت کی بھی باقی نہ رہے جا	۴۵۸
۱۳۶	گھر میں تھا کیا کہ قرا غم اسے غارت کرتا ہے	۴۶۰
۱۳۷	غم دنیا سے، گر پائی بھی فرصت سراپا اٹھانے کی	۴۶۰
۱۳۸	حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آزد و خرامی	۴۶۳
۱۳۹	کیا تنگ ہم ستم زد گال کا جہاں ہے	۴۶۴
۱۴۰	درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری لائے لائے	۴۶۹
۱۴۱	سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے	۴۷۳
۱۴۲	گر خاموشی سے فائدہ اخفاٹے حال ہے	۴۷۵
۱۴۳	تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو	۴۷۹
۱۴۴	ایک جا حریف و فاکھیا اتحادہ بھی مٹ گیا	۴۸۰
۱۴۵	پینس میں گذرتے ہیں جو کو چہرے وہ میرے	۴۸۴
۱۴۶	مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے	۴۸۴
۱۴۷	رحم کر ظالم، کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے	۴۸۷
۱۴۸	جہنمِ خواباں خاموشی میں بھی نوا پر داز ہے	۴۸۸
۱۴۹	عشق تجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	۴۸۹
۱۵۰	ہے آرمیدگی میں نکو ہش سباجھے	۴۹۵
۱۵۱	زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غائب	۴۹۷
۱۵۲	اٹھ بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے	۴۹۸
۱۵۳	رفتارِ عمر قطع رہا اضطراب ہے	۵۰۲
۱۵۴	دیکھنا قسمت کہ آب اپنے پر رشک آجائے ہے	۵۰۶
۱۵۵	گرم فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے	۵۱۱

صفحہ	عزایات	نمبر شمار
۵۱۳	کارگاہ ہستی میں لالہ داغ سماں ہے	۱۵۶
۵۱۵	آگ رہا ہے درد و دلدار سے سبزہ غالب	۱۵۷
۵۱۶	سادگی پر اش کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے	۱۵۸
۵۱۹	دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی	۱۵۹
۵۲۳	تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے	۱۶۰
۵۲۷	کوئی دن گزرنہ گانی اور ہے	۱۶۱
۵۳۰	کوئی امید پر نہیں آتی	۱۶۲
۵۳۳	دلِ ناداں تجھے بھوکا ہے	۱۶۳
۵۳۷	کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے	۱۶۴
۵۳۸	بھر کچھ اک دل کو بیخراوی سے	۱۶۵
۵۴۶	جنونِ ہمت کش تسکین نہ ہو، گردشِ دمانی کی	۱۶۶
۵۴۸	نکوش ہے سزا فریادی بیدار و لبر کی	۱۶۷
۵۵۰	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے	۱۶۸
۵۵۵	جو نہ نقدِ داغ دل کی، کرے شعلہ پاسبانی	۱۶۹
۵۵۶	ظلمتِ کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	۱۷۰
۵۶۲	اگر مری جان کو قرار نہیں ہے	۱۷۱
۵۶۵	ہجومِ غم سے یاں تک نہ لگوئی مجھ کو حاصل ہے	۱۷۲
۵۶۶	بابِ دامن ہو رہا ہوں، بس کہ میں صحرانورد	۱۷۳
۵۶۷	جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے	۱۷۴
۵۷۲	حسنِ مدگر چہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے۔	۱۷۵
۵۷۹	نہ ہوئی گرمی مرنے سے تسلی نہ سہی	۱۷۶
۵۸۳	عجب نشاط سے جلاو کے چلے ہیں ہم آگے	۱۷۷

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۵۸۶	شکوے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے	۱۷۸
۵۹۰	ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	۱۷۹
۵۹۳	میں انہیں چھڑوں اور کچھ نہ کہیں	۱۸۰
۵۹۶	غیر میں محفل میں بوسے جام کے	۱۸۱
۵۹۹	پھر اس انداز سے بہا ر آئی	۱۸۲
۶۰۰	تفائل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے	۱۸۳
۶۰۲	کب وہ سنتا ہے کہانی میری ؟	۱۸۴
۶۰۶	گلشن کو تیری صحبت از بس کہ پسند آئی	۱۸۵
۶۰۷	نقش نازبت طناز بہ آغوش رقیب	۱۸۶
۶۰۸	جس زخم کی ہو سکتی ہو تہ ہیر و فوکی	۱۸۷
۶۱۱	سیاہ پشت گرئی آئینہ دے ہے ہم	۱۸۸
۶۱۱	سب وصل، ہجر عالم تمکین و ضبط میں	۱۸۹
۶۱۲	چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے	۱۹۰
۶۱۵	بر قدم دوری منزل ہے نمایاں، عجب سے	۱۹۱
۶۲۰	نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے مذہبے	۱۹۲
۶۲۵	چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے	۱۹۳
۶۲۷	وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے	۱۹۴
۶۳۰	تپش سے میری، وقف کشمکش ہر تار بہتر ہے	۱۹۵
۶۳۳	خطر سے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے	۱۹۶
۶۳۳	فریاد کی کوئی لے نہیں ہے	۱۹۷
۶۳۶	نہ پوچھ نسخہ مرہم جراحت دل کا	۱۹۸
۶۳۷	ہم دشت کو اپنے بھی گوارا انہیں کرتے	۱۹۹

نمبر شمار	غزلیات	صفحہ
۲۰۰	کرے ہے بادہ ترے لب سے کب رنگِ فروغ	۴۳۸
۲۰۱	کیوں نہ ہو چشمِ بیاں بخود تغافل کیوں نہ ہو ؟	۴۳۹
۲۰۲	دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کیئے	۴۴۰
۲۰۳	دیکھ کر درپردہ گرم دامنِ انسانی تجھے	۴۴۲
۲۰۴	یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہِ یادِ تجھے	۴۴۴
۲۰۵	حضورِ شاہ ہیں اہلِ سخن کی آزمائش ہے	۴۵۰
۲۰۶	کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گرا جائے ہے مجھ سے	۴۵۵
۲۰۷	ذبح کہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے	۴۵۹
۲۰۸	لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جاوے تجھے	۴۶۱
۲۰۹	باز بچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے	۴۶۲
۲۱۰	کہوں جو حال تو کہتے ہیں "دعا کیئے"	۴۶۹
۲۱۱	رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے	۴۷۳
۲۱۲	نشد شاوَابِ رنگِ دماز، مستِ طرب	۴۷۷
۲۱۳	مرضِ نازِ شوخیِ دندانِ برائے خندہ ہے	۴۷۸
۲۱۴	حسنِ بے پروا خیرِ دانا جلودہ سے	۴۸۰
۲۱۵	جب تک دُعاں زخمِ نہ پیدا کرے کوئی	۴۸۱
۲۱۶	ابنِ مریم ہمارے کوئی	۴۸۶
۲۱۷	بہت بھی غم گیتی، شراب کم کیا ہے	۴۹۰
۲۱۸	بارخ، پاکِ خفقاتی، یہ ڈراتا ہے تجھے	۴۹۱
۲۱۹	روندی ہوئی ہے کو کتبہ شہرِ یار کی	۴۹۲
۲۲۰	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکالے	۴۹۴
۲۲۱	کوہ کے یوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے	۴۹۸

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۷۰۰	مستی بہ ذوق غفلت ساقی ہلاک ہے	۲۲۲
۷۰۰	لب میخی کی جنبش کرتی ہے گوارہ ہفتابانی	۲۲۳
۷۰۱	آمد سیلاب طوفانِ صدا ئے آب ہے	۲۲۴
۷۰۲	ہوں میں بھی تماشا ئی نیرنگ تما	۲۲۵
۷۰۲	سیاہی جیسے گر جائے دم تحریر کا غدیہ	۲۲۶
۷۰۳	ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افتخاں ہے	۲۲۷
۷۰۵	خوشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے	۲۲۸
۷۰۶	جس جانشیم شانہ کش زلف یار ہے	۲۲۹
۷۱۱	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کیس جے	۲۳۰
۷۱۵	خشبم یہ گل لالہ نہ خالی زاد اسے	۲۳۱
۷۲۰	منظور غمتی یہ شکل و تجلی کو نور کی	۲۳۲
۷۲۴	علم کھانے میں بود اول ناکام بہت ہے	۲۳۳
۷۲۹	مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے	۲۳۴
۷۳۳	نویہ امن ہے بے داؤد دست جاں کے لئے	۲۳۵
قصائد		
۷۴۵	سازیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار	۲۳۶
۷۴۷	فیض سے تیرے ہے اسے شمع شبستان بہار	۲۳۷
۷۵۷	دہر جز جلوتہ یکتا فی معشوق نہیں	۲۳۸
۷۷۰	ہاں مہ فونیں ہم اس کا نام	۲۳۹
۷۷۱	تجھ کو کیا ہا یہ روشناسی کا	۲۴۰

صفحہ	مغزلیات	نمبر شمار
۷۷۲	زہر غم کر چکا تھا میرا کام	۲۴۱
۷۷۳	رمد کا کرہی ہے کیا دم بند	۲۴۲
۷۷۴	فنی صورت گری میں تیرا گزر	۲۴۳
۷۷۵	صبح دم دروازہ خا در کھلا	۲۴۴
۷۷۷	تو سن شہ میں وہ تھوپی ہے کہ جب	۲۴۵
۷۷۸	کنچ میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا	۲۴۶
۷۷۹	بچہ بڑا مدحت طرازی کا خیال	۲۴۷
	سہرا	
۷۹۹	خوش ہوا سے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا	۲۴۸
	مشنوی	
۸۰۹	ہاں دل دردمند زمزم ساز	۲۴۹
	قطعات	
۸۲۱	اے شہنشاہ فلک منظر و بے مثل و نظیر	۲۵۰
۸۲۷	اے شہنشاہ آسماں اور نگ	۲۵۱
۸۲۷	پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں	۲۵۲
۸۲۸	مری خواہ جو مقرر ہے	۲۵۳
۸۲۸	آج مجھ سا نہیں زمانے میں	۲۵۴
۸۲۹	آپ کا بندہ اور پھروں نگا	۲۵۵
۸۳۲	اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہاں دار	۲۵۶
۸۳۴	ہے پادشہ، آخر ماہ صفر چلو	۲۵۷
۸۳۷	نصرت الملک بہادر! مجھے بتلا کہ بجے	۲۵۸
۸۴۰	منظور ہے گذارش احوال واقعی	۲۵۹

نمبر شمار	قطعات	صفحہ
۲۶۰	ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ حکمی ٹولی	۸۴۷
۲۶۱	حکمت کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں	۸۵۲
۲۶۲	نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضور والا نے	۸۵۳
۲۶۳	گئے وہ دن کہ ناولستہ غیروں کی وفاداری	۸۵۵
۲۶۴	سیر گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے	۸۵۶
۲۶۵	افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو	۸۵۷
۲۶۶	سہل تھا سہل، اوسے یہ سخت مشکل آپڑی	۸۵۹
۲۶۷	گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں	۸۵۹
۲۶۸	خجہ انجمن طوے میرزا جعفر	۸۶۰
۲۶۹	ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی	۸۶۰
رباعیات		
۲۷۰	بعد از تمام ہنرم عید اطفال	۸۶۵
۲۷۱	شب زلف و ریح عرق نشاں کا غم تھا	۸۶۶
۲۷۲	آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال	۸۶۶
۲۷۳	دل تھا کہ جو جان درد تہید سہی	۸۶۷
۲۷۴	ہے خلق حمد قماشِ رٹنے کے لئے	۸۶۸
۲۷۵	دل سخت نثر نہ ہو گیا ہے، گویا	۸۶۹
۲۷۶	دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے، غالب	۸۶۹
۲۷۷	مشکل ہے زبں کلام میرا، اسے دل !	۸۷۰
۲۷۸	جیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جم جاہ نے وال	۸۷۱
۲۷۹	ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلال باہم	۸۷۲
۲۸۰	حق، شہ کی بقا سے خلق کو شاہِ ذکر سے	۸۷۳

نمبر شمار	رباعیات	صفحہ
۲۸۱	اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا	۸۷۳
۲۸۲	کہتے ہیں کہ "اب" وہ مردم آزار نہیں	۸۷۵
۲۸۳	ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے	۸۷۶
۲۸۴	سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں	۸۷۷
۲۸۵	ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے	۸۷۸
	ضمیمہ اول	
۲۸۶	دیکھنے میں ہیں گرچہ دود، پر میں یہ دونوں یا ایک	۸۸۱
۲۸۷	ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں	۸۸۶
۲۸۸	اپنا احوالِ دل زار کہوں یا نہ کہوں	۸۹۰
۲۸۹	شب وصال میں مونس گیا ہے بنِ تکیہ	۸۹۲
۲۹۰	میں ہوں مشاقِ جفا، تجھ پہ جفا اور سہی	۸۹۶
۲۹۱	آپ نے "منی الضر" کہا ہے تو سہی	۸۹۹
۲۹۲	لطفِ نظارۃِ قاتلِ دم بسمل آئے	۹۰۲
۲۹۳	بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو	۹۰۵
۲۹۴	بتائیں ہم تمہارے عارض و کاکل کو کیا سمجھے	۹۰۸
۲۹۵	نسیم صبح جب کسناں میں بوئے پیر بن لائی	۹۱۰
۲۹۶	وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے۔	۹۱۱
۲۹۷	یونہی افزائشِ وحشت کے جو سامان ہوں گے	۹۱۲
۲۹۸	نمائش پر وہ دایرہ بیدار و تغافل ہے	۹۱۵
۲۹۹	خود جان دے کے روح کو آزاد کیجئے	۹۱۷
۳۰۰	ہم سے خوابانِ جہاں پہلو تھی کرتے رہے	۹۱۹
۳۰۱	دردِ ہر دل میں تو دوا کیجئے	۹۲۱

صفحہ	ضمیمہ اول	نمبر شمار
۹۲۳	سکوت و فاشی اظہار حال بے زبانی ہے	۳۰۲
۹۲۵	کس کی برق شرخی رفتار کا دلدادہ ہے	۳۰۳
۹۲۶	اس جو دو جفا پر بھی، بد ظن نہیں ہم تجھ سے	۳۰۴
۹۲۸	نا لے دل کھول کے دو چار کروں یا نہ کروں	۳۰۵
۹۲۸	نہ پوچھ حال اس انداز، اس عتاب کے ساتھ	۳۰۶
۹۲۹	سکون دل تو تعلق ہے اضطراب کے ساتھ	۳۰۷
۹۳۰	وضع تیرنگی آفاق نے مارا ہم کو	۳۰۸
۹۳۲	حسن بے پر و اگر غار خود آرائی نہ ہو	۳۰۹
۹۳۵	خزینہ دار محبت ہوئی ہوا سے چین	۳۱۰
۹۳۶	کرم ہی کچھ سبب لطفت و انکساف نہیں	۳۱۱
۹۳۷	یوں شمع ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں	۳۱۲
۹۴۰	آفت آہنگ ہے کچھ نالہ، بلبل، ورنہ	۳۱۳
۹۴۲	برتر از دیرانہ ہے فصل خزاں میں عین بارغ	۳۱۴
	قصائد	
۹۴۹	کرتا ہے چرخ روز بہ صد گو نہ احترام	۳۱۵
۹۵۶	گئی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ	۳۱۶
۹۶۱	مر جا! سال مر صنی آئیں	۳۱۷
۹۶۸	ملاؤ کشور و لشکر، پناہ شہر و سپاہ	۳۱۸
	قطعات	
۹۷۳	ہند میں اہل سن کی ہیں دو سلطنتیں	۳۱۹
۹۷۷	مقامِ شکر ہے اسے ساکنانِ خطہ خاک	۳۲۰
۹۸۰	لیکن فعال مایزید ہے آج	۳۲۱

صفحہ	تفصیلات	نمبر شمار
۹۸۳	خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے	۳۲۲
۹۸۴	اس کتاب طرب نصاب نے جب	۳۲۳
۹۸۵	سلیم خاں کہ وہ ہے نور چشم واصل خاں	۳۲۴
۹۸۶	اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوش و حشرت میں	۳۲۵
۹۸۸	کیا ان دنوں بسر ہو ہماری مزاخ میں	۳۲۶
۹۹۰	مجلس شمع ہزاراں میں جو آجاتا ہوں	۳۲۷
۹۹۰	پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاکہ مجھ تک کی	۳۲۸
۹۹۱	دیکھ وہ برق بستہ، بسکہ دل بیتاب ہے	۳۲۹
۹۹۲	اک آہ گرم کی تو ہزاروں کے گھر جلے	۳۳۰
۹۹۲	گوڑ گاؤں کی بے جتنی رعیت وہ یک قلم	۳۳۱
۹۹۳	ہم نہیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں	۳۳۲
۹۹۴	میرج تک و صوم ہے، کس و صوم سے آیا سہرا	۳۳۳
۹۹۴	ایک اہل درد نے سنان جو دیکھا قفس	۳۳۴
۹۹۵	جب کہ سید غلام بابا نے	۳۳۵
۹۹۵	ہزار شکوہ کہ سید غلام بابا نے	۳۳۶
۹۹۶	گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدمی رہ گئی	۳۳۷
	سلام	
۱۰۰۱	سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو	۳۳۸
	مرثیہ	
۱۰۰۶	ہاں! اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو	۳۳۹
	رباعیات	
۱۰۰۸	اے عشقِ خیرہ سر سخن ساز نہ ہو	۳۴۰

صفحہ	رباعیات	نمبر شمار
۱۰۰۹	رقق کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے	۳۴۱
۱۰۰۹	اے روشنی دیدہ، شباب الدین خاں	۳۴۲
۱۰۰۹	جن لوگوں کو بے غلجے سے مداوت گہری	۳۴۳
	مستغرق استعار	
۱۰۱۰	جگر میں ٹوٹ کے سوئی ہوئی سناں پیدا	۳۴۴
۱۰۱۱	خوشی جینے کی کیا، مرنے کا علم کیا	۳۴۵
۱۰۱۱	ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پر پیار آئے	۳۴۶
۱۰۱۱	دودھ لگیاں یزمنے کی جیتے جی تنک ہیں	۳۴۷
۱۰۱۲	سات جلدوں کا پارسل پہنچا	۳۴۸
۱۰۱۲	سٹے دوسرے دل کو تندرست حق سے ہیں دو طالب	۳۴۹
۱۰۱۳	نیا ز عشق فرض سوز، اسباب ہوس بہتر	۳۵۰
۱۰۱۳	خدا سے میں بھی چاہوں از رو مہر	۳۵۱
۱۰۱۳	یاد آیا، جو وہ کہتا کہ نہیں واہ! غلط	۳۵۲
۱۰۱۳	نہیں عمر کے ستر ہوئے شمار برس	۳۵۳
۱۰۱۳	پیر و مرشد معاف کیجئے گا۔	۳۵۴
۱۰۱۴	ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک	۳۵۵
۱۰۱۵	درم و دام اپنے پاس کہاں	۳۵۶
۱۰۱۵	میکش کو نہ سمجھ بے حاصل	۳۵۷
۱۰۱۵	تم سلامت رہو قیامت تک	۳۵۸
۱۰۱۶	نہیں بھولا میں تجھ کو اے میری جاں	۳۵۹
۱۰۱۶	امیر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کر دو	۳۶۰
۱۰۱۷	دیکھت ہوں اسے حتیٰ جس کی تنہا تجھ کو	۳۶۱

صفحہ	متفرق اشعار	نمبر شمار
۱۰۱۴	ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب باتواں مجھے	۳۶۲
۱۰۱۴	ماہِ زہوں کے نلک عجز سکھاتا ہے مجھے	۳۶۳
۱۰۱۴	صبا! لگا دو طمانچہ طرف سے بلبلی کی	۳۶۴
۱۰۱۴	زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانتا ہے	۳۶۵
۱۰۱۸	ہم کی کہیں، کسی سے، اپنا طریق کیا ہے	۳۶۶
۱۰۱۸	گلشنِ دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم	۳۶۷
۱۰۱۸	پھر مرتبہ بڑھایا مرا نفعی غیر نے	۳۶۸
۱۰۱۹	آج تجھ سانئیں بدنام زمانے میں کوئی	۳۶۹
۱۰۱۹	زرا قتال مانگ ہے اور سبز اس پرہاک دوشِ لاہے	۳۷۰
۱۰۱۹	بتو! توبہ کرو، تم کیا ہو، جیب ادبار آتا ہے	۳۷۱
۱۰۱۹	بجبابے شہر میں، اگر چھوڑ دوئی جج کو چلی	۳۷۲
۱۰۱۹	روڑا اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے	۳۷۳
۱۰۲۰	مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے	۳۷۴
۱۰۲۰	ہو کر شہیدِ عشق میں پائے ہزار جسم	۳۷۵
۱۰۲۰	دم واپسیں برسرِ راہ ہے	۳۷۶
	منشوی	
۱۰۲۱	ایک دن مثلِ پتنگ کا غدی	۳۷۷
	ضمیمہ دوم	
۱۰۲۵	اسد! ہر جانسن نے طیرِ باغِ تازہ ڈالی ہے	۳۷۸
۱۰۲۵	تنگیِ رفیق رہ سکتی، عدم یا وجود تھا	۳۷۹
۱۰۲۶	ہے کہاں تمنا کا، دوسرا قدم، یارب	۳۸۰
۱۰۲۶	جس قدر جگر خوں ہو، کوچہ داؤنِ دل ہے	۳۸۱

صفحہ	صفحہ دوم	نمبر شمار
۱۰۲۸	کچھ کھٹکتا تھا میرے سینے میں، لیکن آخر	۳۷۲
۱۰۲۹	ناتوانی ہے تماشا بی عمر رفتہ	۳۷۳
۱۰۳۱	ذہبِ آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا	۳۷۴
۱۰۳۱	ہم نے وحشتِ کدہ بزمِ جہاں میں، جوں شیخ	۳۷۵
۱۰۳۱	مہ پائی دسعتِ جولاں یک جنوں ہم نے	۳۷۶
۱۰۳۲	شرِ فرست نگہ، سامانِ یک عالم چراغاں ہے	۳۷۷
۱۰۳۲	بہ صورتِ تکلف، بہ معنیِ تاسف	۳۷۸
۱۰۳۲	ضعیف جنوں کو وقتِ تمیش در بھی دُور تھا	۳۷۹
۱۰۳۲	بوقتِ سرنگونی ہے تصورِ اشتہارِ ستاں	۳۸۰
۱۰۳۲	ہر گامِ آہٹے سے ہے، دل، در تہِ قدم	۳۸۱
۱۰۳۵	خود پرستی سے رہے باہدِ گرنا آشنا	۳۸۲
۱۰۳۶	دو دیرِ استکان کی کرے ہے ہمیری	۳۸۳
۱۰۳۶	ہوں قطرہ زلِ بہِ داویِ حسرتِ شبانہ روز	۳۸۴
۱۰۳۷	یہ ہوسِ درِ سہرا بلی سلامت اتا چند	۳۸۵
۱۰۳۷	دکھا غفلت نے دُورِ افتادہ ذوقِ فنا ورنہ	۳۸۶
۱۰۳۷	پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے بندہ بالمش	۳۸۷
۱۰۳۸	یہ رہنِ شرم ہے، بادِ صفتِ شوخیِ اہتمام اس کا	۳۸۸
۱۰۳۹	عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا	۳۸۹
۱۰۳۹	دُود کو آج اس کے ماتم میں یہ پوشی ہوئی	۳۹۰
۱۰۴۰	اے آبلِ کرم کر، یاں رنجِ یک قدم کر	۳۹۱
۱۰۴۰	اے خوش ذوقِ تنائے شہادت کو اند	۳۹۲
۱۰۴۱	پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے	۳۹۳

صفحہ	ضمیمہ دوم	نمبر شمار
۱۰۴۱	اسد! اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں	۳۹۳
۱۰۴۲	عیب کا دریافت کرنا ہے ہنری مندی واسد!	۳۹۵
۱۰۴۳	سر منزلِ ہستی سے ہے صحرائے طلب دور	۳۹۶
۱۰۴۴	بہ مہرِ ناصربو بوسہ گلِ پیام رہا۔	۳۹۷
۱۰۴۵	اسد! مایوس مت ہو، اگرچہ رونے میں اثر کم ہے	۳۹۸
۱۰۴۶	عمر میری ہو گئی صرف بہارِ حسنِ یاد	۳۹۹
۱۰۴۷	جاتا ہوں جدھر سب کی اسٹے ہے ادھر انگشت	۴۰۰
۱۰۴۸	ہے سوا نیزے پہ اس کے قامتِ نونیز سے	۴۰۱
۱۰۴۹	دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کیخ	۴۰۲
۱۰۵۰	آہنگِ اسد میں نہیں جزِ نغمہٗ بیدل	۴۰۳
۱۰۵۱	عقی نگہ میری ہنسا سخاۃٴ دل کی نقاب	۴۰۴
۱۰۵۲	ہاتھ آیا زخمِ تیغِ یار سا پہلو نشیں	۴۰۵
۱۰۵۳	بزمِ داغِ طرب و باغِ کشا و پیرِ رنگ	۴۰۶
۱۰۵۴	کمالِ بندگی گل ہے رہنِ آزادی	۴۰۷
۱۰۵۵	ظلم کرنا گلہ سے عاشق پر	۴۰۸
۱۰۵۶	ہر گر و بادِ حلقہٴ منتر اک ہے خودی	۴۰۹
۱۰۵۷	فریبِ صنعتِ ایجاد کا تا شا دیکھ	۴۱۰
۱۰۵۸	صدِ سخیل کدہ ہے صرف جہیں غربت	۴۱۱
۱۰۵۹	کون آیا؟ جو عین ہے نابِ استقبال ہے	۴۱۲
۱۰۶۰	بھی میرے ہی جلائے کواے آہِ شعلہٴ ریزا	۴۱۳
۱۰۶۱	تا قیامت شبِ فرقت میں گذر جائے گی عمر	۴۱۴
۱۰۶۲	آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک	۴۱۵

صفحہ	ضمیمہ دوم	نمبر شمار
۱۰۵۷	اے آرزو شہید ونا! خون بہا نہ مانگ	۴۱۶
۱۰۵۸	مڑگاں تنک رسائی لختِ جگر کہاں	۴۱۷
۱۰۵۸	بدر ہے آئینہ طاقِ ہلال	۴۱۸
۱۰۵۹	ہو جو بلبل پیر و فکرِ اسد	۴۱۹
۱۰۵۹	ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل	۴۲۰
۱۰۵۹	ہم غلط سمجھے تھے، لیکن زخمِ دل پر رحم کر	۴۲۱
۱۰۶۰	گر کرے انجام کو آغاز ہی میں یاد، نکل	۴۲۲
۱۰۶۰	شوق بے پروا کے لاحتوں مثل سازِ نادِ درست	۴۲۳
۱۰۶۱	بہ قدرِ حوصلہ عشقِ جلوہ ریزی ہے	۴۲۴
۱۰۶۱	فرطِ بے خوابی سے ہیں شہنائے ہجر یار میں	۴۲۵
۱۰۶۲	نفس ہونہ معزول شعلہ دروون	۴۲۶
۱۰۶۳	میرا در یہ ادا کہ دل آوے اسیرِ چاک	۴۲۷
۱۰۶۳	وہ التماسِ لذتِ بیداد ہوں کہ میں	۴۲۸
۱۰۶۴	فلک شعلہ بے محابا ہے	۴۲۹
۱۰۶۴	آئسوگہوں، کہ آہ! سوار ہوا کہوں	۴۳۰
۱۰۶۵	میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب	۴۳۱
۱۰۶۵	کسی کو نہ خود رستہ کم دیکھتے ہیں	۴۳۲
۱۰۶۵	ناگوارا ہے ہمیں احسانِ صاحبِ دوستاں	۴۳۳
۱۰۶۵	ہے نزاکتِ بیکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن	۴۳۴
۱۰۶۶	دقت ہے گر بلبلِ مسکین زلیخا فی کرے	۴۳۵
۱۰۶۶	کس دل پر ہے عزمِ صفتِ مڑگانِ خود آرا	۴۳۶
۱۰۶۷	کی متصل ستارہ شناسی میں عمر صرف	۴۳۷

صفحہ	ضمیمہ دوم	نمبر شمار
۱۰۶۹	نہ انشا، معنی مضمون، نہ اظہار، صورت موزوں	۴۳۸
۱۰۶۹	اے نواساز تماشا! سرکبک جلتا ہوں میں	۴۳۹
۱۰۷۰	طلسمِ مستی دل آں سوئے ہجومِ سرشک	۴۴۰
۱۰۷۱	ہوئی ہیں آپ شرم کو شش بے جا سے تدبیری	۴۴۱
۱۰۷۲	کس کو دوں یارب! حساب سوزِ ناکہائے دل	۴۴۲
۱۰۷۲	ہو کے کب کلفتِ دل، مانعِ سیلانِ اشک	۴۴۳
۱۰۷۲	ہے وطن سے باہر اہل دل کی قدر و منزلت	۴۴۴
۱۰۷۳	بہ یادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم	۴۴۵
۱۰۷۴	بے درد سر بہ سجدۃ الفتن فرو نہ ہو	۴۴۶
۱۰۷۴	بہر حال پروردن یعقوب بالِ خاک سے	۴۴۷
۱۰۷۵	کتا تھا کل وہ نامہ رساں سے یہ سوزِ دل	۴۴۸
۱۰۷۵	خلق ہے صفحہٴ عبرت سے سبق ناخواندہ	۴۴۹
۱۰۷۶	واسطے فکرِ مضامینِ متین کے، غالب	۴۵۰
۱۰۷۷	تا تخلصِ جامہٴ مشکِ فی اوزانی اسد	۴۵۱
۱۰۷۷	شکوہ و شکوہ کو شرم و امید کا سمجھ	۴۵۲
۱۰۷۸	گو تم کو رخصتا جوئی اختیار ہے، لیکن	۴۵۳
۱۰۷۸	مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے	۴۵۴
۱۰۷۹	کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بے وفائی	۴۵۵
۱۰۷۹	مگر مصیبت تھی تو غربت میں امثالے اسد	۴۵۶
۱۰۷۹	کیا غم ہے اس کو جس کا علی سا امام ہو	۴۵۷
۱۰۸۰	امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی	۴۵۸
۱۰۸۰	بے چشمِ دل نہ کر ہو میں سیرِ لالہ زار	۴۵۹

صفحہ	ضمیمہ دوم	نمبر شمار
۱۰۸۰	ماچند پست فطرتی طبع آرزو	۴۶۰
۱۰۸۱	بہا یاں تک ہے اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر	۴۶۱
۱۰۸۱	ہم مشتقِ فکر و وصل و غم ہجر سے، اسد!	۴۶۲
۱۰۸۱	پیدا کریں دماغِ تماشا نے سرو و گل	۴۶۳
۱۰۸۲	وقت اس افتادہ کا خوش، جو قناعت سے اسد	۴۶۴
۱۰۸۲	اے سرِ شوریدہ! ذوقِ عشق و پاس آید و	۴۶۵
۱۰۸۲	ترے نوکر، تو سے در پر، اسد کو ذبح کرتے ہیں	۴۶۶
۱۰۸۳	وا کیا ہرگز نہ میرا عقدہ تا نفس	۴۶۷
۱۰۸۳	تمثالِ جلوہ عرص کر اے حسنِ اکب تک	۴۶۸
۱۰۸۴	یارب! ہمیں تو خواب میں بھی موت دکھائیو	۴۶۹
۱۰۸۴	مدعا و در پردہ، یعنی جو کہوں باطلی سمجھ	۴۷۰
۱۰۸۵	کیا ہے ترک دنیا کا بل ہے	۴۷۱
۱۰۸۵	خراباتِ جنوں میں ہے اسد اوقتِ مدحِ نوشی	۴۷۲
۱۰۸۶	دشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر، اسد!	۴۷۳
۱۰۸۶	ہم نشینی ز قیباں گرچہ ہے سامانِ دشک	۴۷۴
۱۰۸۷	کیا کروں، غم ہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار	۴۷۵
۱۰۸۷	نے حسرتِ تسلی، نے ذوقِ بے قرار ی	۴۷۶
۱۰۸۷	آب ہو جلتے ہیں ننگِ ہمتِ باطل سے مرو	۴۷۷
۱۰۸۸	اسد نے کثرتِ دہائے خلق سے جانا	۴۷۸
۱۰۸۸	رخسارِ یار کی جو ہوئی جلوہ گسری	۴۷۹
۱۰۸۹	اسد! دوا سنگام باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں	۴۸۰
۱۰۸۹	خبر ننگ کو، ننگِ چشم کو مدد جانے	۴۸۱

نمبر شمار	ضمیمہ دوم	صفحہ
۴۸۲	بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب ! تو پھر	۱۰۹۰
۴۸۳	صبح سے معلوم آتا رہا غلو ر شام ہے	۱۰۹۰
۴۸۴	توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سہو، پھر ہم کو کیا	۱۰۹۱
۴۸۵	فناں کہ بہر شفا نے حصول ناشدنی	۱۰۹۱
۴۸۶	اے اسدا آباد ہے مجھ سے جہاں شاعری	۱۰۹۱
۴۸۷	کچھ نہیں حاصل تعلق ہیں بغیر از کشمکش	۱۰۹۲
۴۸۸	اسد باد صفت عشق بے تکلف خاک گردیدن	۱۰۹۲
۴۸۹	تا چند ناز مسجد و بیت خانہ کھینچے	۱۰۹۲
۴۹۰	نہ حیرت چشم ساقی کی، نہ محبت دور ساز کی	۱۰۹۳
۴۹۱	سنگ آمد و سخت آمد در دہر خود داری	۱۰۹۵
۴۹۲	جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد	۱۰۹۵



مقدمہ

از

غلام رسول مہر

مقدمہ

اصل و نسب - اسد اللہ بیگ خاں نام، استاد اور غالب نقائص، قوم ترک
۸۔ رجب ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں طبرستان کے چار گھڑی پیشتر یہ مقام آباد
پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو سلجوقی و افراسیابی و چنگی کہا ہے۔ ممکن ہے ان و ماویا
کی تصدیق و توثیق کے لیے مستند تارہ بنی دست و بزرگ پیش من کی ہا سکیں، اس لیے کہ تاریخ کے
نزدیک تو سلجوقیوں اور افراسیاب و چنگ کا باہمی تعلق بھی محل نظر ہے، لیکن اس حقیقت
میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب کے دادا، میرزا قوقان بیگ خاں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے
اور وہ سلاویک ترک تھے۔ نیز میرزا غالب کی خاندانی روایات وہی تھیں، جو انھوں نے
وقتاً فوقتاً نظم و نثر میں جا بجا بیان کیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان روایات کے ایک ایک جز
کی توثیق غالب کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی اور عدم توثیق سے اس عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو
سکتی، اس لیے کہ غالب نے جس دائرے میں درجہ کمال حاصل کیا، وہ افراسیاب و چنگ کی داستان کا، انہوں
اور سلجوقیوں کی کشور کشائیوں سے بالکل الگ ہے۔

جد امجد - میرزا قوقان بیگ خاں کے ترک وطن کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کسی بات
پر اپنے والد امجد سے ناراض ہو گئے تھے۔ نظریہ ظاہر وہ تھا نہ آئے ہوں گے بلکہ نہ رہیں
یا بڑی حقیقت ساتھ لائے ہوں گے۔ اگرچہ مغلوں کی عظمت و شوکت کا درخشاں دور گزر چکا تھا
اور سلطنت شکست و انتراع کی آخری منزل میں پہنچی ہوئی تھی، تاہم ہمارے دور اور ہمارے زمانوں
کی طلب اس زمانے میں بھی باقی تھی چنانچہ میرزا قوقان بیگ خاں لاہور پہنچے تو میںیں الملوک

تیس سے اوپر نہیں ایسے ہی ہوگی۔

نصرت اللہ بیگ خاں نے مرحوم بھائی کے تین بیٹوں کی پرورش اپنے دست لے لی۔ مرہٹوں کی طرف سے انھیں آگرہ میں صوبیداری کا منصب موصول تھا۔ جب آگرہ میں شورشیں گزریاں تو نصرت اللہ بیگ خاں کو چار سو سوار کا رسالہ بنا دیا اور ایک ہزار سات سو روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ پھر نصرت اللہ بیگ نے ضلع متھرا کے دو پرگنہ (سونک اور سونسا) مرہٹوں سے ہر دو پرگنہ لیے۔ لاٹریک نے یہ پرگنہ بھی تاسیات انھیں کے حوالے کر دیئے ان کی آمدنی لاکھ ٹریڈ لاکھ بتائی حاق تھی۔ اس طرح چند سال بہ اطمینان گزر گئے۔

قیام دہلی اور وفات : یہ حالات تھے، جن میں غالب نے مرہٹوں کی آنکھ کھولی۔ نانہ بہت بڑے رئیس اور جاگیردار تھے، سچا بھی بہت بڑے تغواہ دار اور رئیس تھے۔ باپ اور دادا کا پایہ بھی بہت بلند تھا اور یہ امر محتاج تصریح نہیں کہ انیسویں صدی کے اوائل میں اس قسم کے خوشگوار خانہ دانی حالات بہت کم لوگوں کو میسر تھے۔ اچانک شورشیں نصرت اللہ بیگ خاں بھی غالباً میدان جنگ ہی میں نذر اجل ہوئے۔ ساتھ ہی رسالہ ٹوٹ گیا، تغواہ ختم ہو گئی، جاگیر واپس لے لی گئی اور متوفی کے متعلقین کے لیے پہلے دس ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ ایک ماہ بعد اس وظیفے کو گٹھا کر پانچ ہزار کر دیا گیا۔ پھر اس رقم سے دو ہزار ایک ایسے شخص کے لیے جو بڑ ہوئے، جسے نصرت اللہ بیگ خاں کے خاندان سے کوئی ایسا تعلق نہ تھا کہ وظیفے میں از روئے استحقاق حصہ دار بن سکتا۔ گویا مرحوم کے اصل متعلقین کے لیے صرف تین ہزار روپے سالانہ رہ گئے۔ ان میں سے ڈیڑھ ہزار بہ حصہ مساوی عبد اللہ بیگ خاں کے دو بیٹوں کے لیے تھے، ساتھ سے سات سو میرزا غالب کے اور اتنے ہی میرزا وسعت کے لیے۔

نصرت اللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں والی شیرون پور رچھرا کا ووادار کی بیٹی سے ہوئی تھی اور بعض ارباب علم و فکر کا خیال ہے کہ دونوں خاندانوں میں پہلے بھی اس قسم کے روابط موجود تھے۔ اس بنابر میرزا غالب کی شادی ۷۔ ۱۲۔ ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۹ء) میں آگست ۱۸۰۹ء کو نواب احمد بخش کے چھوٹے بھائی نواب الہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امرانو بیگم سے

ہوتی۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں غالب، آگرہ کی سکونت چھوڑ کر مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہو گئے۔ وہیں قریباً ساٹھ سال گزار کر ۶۱۔ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ بمطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۳ء کو دہلی پائی۔ تینتر سال اور کچھ دن کم چار ماہ عمر ہوئی۔ نظام الدین میں چونتیس کتب و متفرقہ عربی و کلاسیک کے پاس نواب الہی بخش خاں معروف کے احاطے میں انھیں دفن کیا گیا۔ اب وہاں سنگ مر مر کا حایت خرابہ صورت مقبرہ بنا دیا گیا ہے۔

غالب نے اردو اور فارسی نظم و نثر میں جو کچھ لکھا، اُسے الگ الگ کتابوں کی شکل میں گینا جاتے تو تعداد تیس کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ فارسی نظم و نثر میں وہ ان تمام اساتذہ کے ہمسر نظر آتے ہیں، جن پر اس زبان کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ لیکن پاک و ہند میں ان کی عظمت کا حقیقی اندازہ اردو کا مختصر سا لیوان اور اس کے بعد اردو مکتا تب دیں۔

تعلیم، میرزا غالب نے آگرہ کے مشہور معلم خلیفہ محمد معظم سے تعلیم پائی، عربی جیسا کہ وہ کہتے ہیں، شرح مآثر عامل یکم پڑھی۔ فارسی سے طبیعت کو خاص مناسبت بھی تھی اور اس پر توجہ میں بھی کوئی دقیقہ سعی اٹھانہ رکھا۔ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں ایک نو مسلم ایرانی فاضل ملا عبد القدوس طریق بہا صحت ہندوستان آئے اور دو برس آگرہ اور دہلی میں غالب کے پاس بقیم رہے، ان کی صحبت سے میرزا نے بہت فائدہ اٹھایا۔ تعجب ہے کہ اس استاد کا وجود بھی اب تک بعض ادراپ علم و فضل میں موضوع بحث بنا ہوا ہے اور اس بارے میں شک و شبہ کی ابتداء غالباً خواہد سالی مرحوم کے اس بیان سے ہوتی۔

وہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے

سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبد القدوس محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو

لوگ ہے استاد رکھتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد لکھڑ

یاد ہے " (ڈیادگار غالب" ص ۱۱)

خواہد حالی نے فیضنا وہی لکھا، جو کچھ سنا ممکن ہے میرزا غالب نے عالم سر خوشی میں

ایک سے زیادہ مرتبہ اس قسم کی بات کہہ دی ہو، لیکن اس میں جس استاد کی فنی کی گئی ہے صاف ظاہر ہے کہ اس کا تعلق تعلیم و تعلم سے نہیں، بلکہ صرف شاعری سے ہے یعنی میرزا

تھے اس حمد کے عام دستور کے خلاف شاعری میں کسی کے سامنے زانوئے تلمذ نہ کیا اور عبدالصمد کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ میرزا کا اسلوب فکر و نظر نہ کسی اشتراکاً متفق ہو سکتا تھا اور نہ کسی کے تلمذ سے انہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا تھا، بلکہ نقصان ہی پہنچتا۔ اس لیے کہ خدا داد صلاحیتوں کے طبعی نشو و ارتقا میں کم و زیادہ رکاوٹ پیدا ہوتی اور مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے انہیں جس نظام پر پہنچنا تھا، یا تو بالکل نہ پہنچتیں یا اتنی دیر میں پہنچتیں کہ زندگی کی جہالت ہی تمام ہو جاتی۔

برہنہ علیٰ خراجہ صاحب کی پیش کردہ روایت سے اس کا موقع اور محل ہم سے مخفی ہے تعلیم تعلیم کی نفی نہیں ہوتی۔ بلاشبہ میرزا نے شاعری میں جو کچھ حاصل کیا، مہدویا من سے حاصل کیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں عام طریق تعلیم پر کاربندی کے بغیر ہی سب کچھ اگیا۔ یعنی پڑھنے لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور حب خلیفہ محمد معظم سے تعلیم پانا مسلم ہے تو پھر ملا عبدالصمد سے فارسی زبان کے تقاضے سیکھنے کو محلی نظر قرار دینا باعث تعجب ہے۔ اس بارے میں وقیعہ سنجیاں بلکہ موشگافیاں اس دور پر دوہرا زکا رہیں کہ اہل علم کی طرف سے ان میں سرفراہ وقت و فکر صراحتاً حیرت افزا ہے۔

عجیب بات ہے کہ محاسبہ جاتی کی اس روایت کو بنیاد بنا کر بحث و استدلال کی بڑی بڑی جہاتیں اٹھانے والے بزرگ یہ خیال نہیں فرماتے کہ وہ قدیم آگے چل کر یا وگا رہی ہیں یہ روایت بھی درج ہے:

”قواب معطفا غاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا عبدالصمد کے ایک خط میں ہوا اس نے میرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا، یہ فقرہ بھی لکھا تھا: اسے عزیز پہ کسی کہ بہ این ہمد آزاوگی گاہ گاہ یہ خاطر گزری۔ ”ڈیڈ وگا رہی“ (۱۲)

میرزا غالب کی راستبازی اور صداقت شعاری کا فیصلہ قصور ٹری در کے یسے ملتی ہے فرمائیے، کیا نواب مصطفیٰ خان شیفقت کا شبود بھی معاذ اللہ وہی تھا جو میرزا غالب کا مانا تھا؟ معاملہ صرف اتنا ہے کہ میرزا غالب نے فارسی زبان کے متعلق جو بنیادی حقائق پیش کیے راجد جی کی کوئی مثال اس حمد یا پیشتر کے حمد میں نہیں ملتی اور یا تو کسی سے سیکھے یا خود وسعت مطالعہ سے پیدا کیے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ کہیں نہ کہیں سے رہنمائی کی روشنی حاصل

کی۔ پھر وسعت، مطالعہ، وقتِ نظر اور حسنِ ذوق کی ناپیدائی کے متعلق قلب میں اضماع پیدا ہو گیا۔ اب اگر یہ روشنی طالعہ العقب سے ہی، جیسا کہ میر نے غالب سے کہا، وراثت کے بیان سے اس کی تائید مزید ہوئی، تو اس باب میں رد و تکد کی صفیں بچھانے اور پسینے سے دنیائے علم کے کون سے پتے بارگشتہ میں آنا و کاہی کا بندوبست ہو سکتا ہے؟

شعر گوئی:

میرزا اجمد نے سنی تمیز ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ اس
 برس میں ان کے مختلف بیانات موجود ہیں جن میں آغاز شاعری دس پندرہ کے درمیان
 ساڑھے ۳۲ ہے۔ میرا خیال ہے کہ سلسلہ دس گیارہ برس ہی کی عمر میں شروع
 ہو گیا تھا۔ مگر جن اشعار کو کلام کی حیثیت میں محفوظ رکھنے لگے۔ وہ پندرہ
 برس یا اس کے اس پاس ہی کی عمر کے ہوں گے۔

شعر گوئی کی ابتدا اردو زبان میں ہوئی، جو میرزا کی ادبی زبان تھی، مگر نقیب ہے کہ کبھی کبھی
 وہ فارسی بھی کہتے ہوں گے۔ ان کے ابتدائی دو کسے اردو اشعار درج کرنا ہیں جو جانتے کہ وہ
 فارسی زبان میں ترقی کی خاصی منزلیں طے کر چکے تھے۔ لیکن مطالعہ کے آغاز میں انھوں نے
 ان فارسی شعر کا کلام بڑے ذوق و شوق سے درج کیا تھا جنھیں خیال بند مانا جاتا ہے۔ مثلاً
 جلال اسیر شوکت بھاری، بیدل عظیم آبادی، خسرو صفا بیدل سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے
 کہ اردو میں بھی انہی کا انداز اختیار کر لیا، حالانکہ اردو اپنی سادگی میں خیال بندی کے دقائق
 کی تحمل نہیں دے سکتی تھی۔ لہذا غالب کو میرزا فارسی کا سہارا لینا پڑا۔ یوں ان کے ابتدائی
 اشعار علم اردو شعروں کے مقابلے میں بہت مفلک اور سہیدہ ہو گئے۔ جب ذہن دگر نے
 درجہ بلوغ حاصل کیا اور نیک و بد کی تمیز پیدا ہوئی تو بیشتر اشعار قلم زد کر دیئے اور انہیں
 مستند کلام کے درجے سے خارج ہی کر دینا مناسب تھا۔ ۱۹۲۱ء میں نسخہ حمید کے نام
 سے مجموعہ شائع ہوا، اس سے غالب کے شاعرانہ کمالات میں ہرگز کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا
 تھا، البتہ فکر غالب کے ارتقائی مدارج معلوم کرنے کے لیے اسے حدودِ حیرت مندی و دیورندہ
 مانا جاسکتا ہے۔

اندازہ یہ سہ ماہیہ برسی کی نظر ۱۰۰ (۱۰۰) اور زیادہ تر اردو میں شعر کہتے رہے۔
 پھر فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت سے زیادہ تر فارسی نظم و نثر ہی لکھتے رہے۔ اگرچہ
 اس دور میں ہی وہی اوتقی رنجینہ کہتے رہے۔ مثلاً لکھنویاں اندک کے شاعروں کے لیے غزلیں لیکن
 وہ اصلاً فارسی ہی کے شاعر تھے۔ اسی دور کے تعلق و عمری کیا تھا۔

فارسی ہیں تا بہرین نقشہائے رنگ رنگ بگڑنا و محمود و دیگر گرب من است
 سنہ ۱۰۰۰ میں قلعے سے لازمہ کا تعلق پیدا ہوا تو پھر رنجینہ گئی کی طرف زیادہ توجہ
 ہو گئی۔ ان کا بہترین اردو کلام اسی دور کا ہے۔ بعض غزلیں ایسی ہیں کہ فارسی زبان کے
 پیش بہا غزلیں میں بھی ایسے جواہر پائے شاید ہی مل سکیں۔

ایک افسانہ اردو شاعری کے سلسلے میں بھی ایک انشانہ مشہور ہے، یعنی یہ کہ غالب
 مستام الدین حیدر خاں نے غالب کا ابتدائی کلام لکھنویں میر تقی کو دکھایا تو میر صاحب نے کہا
 کہ اگر اس بڑے کو اتنا وکال نہ ہو سیدھے ہلستے پر ڈال دیتا تو لاجواب شاعر بن جاتے گا، ورنہ
 حاصل لکھنے لگے گا لیکن یہ بیان قطعاً قابل قبول نہیں، اس لیے کہ:-

۱۔ میر تقی کی وفات ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ (۲ ستمبر ۱۸۱۰ء) کو ہوئی گو یا اس
 وقت میرزا غالب صرف تیرہ برس ایک۔ چیلنے اور چند دن کے غصے اور اس عمر کے بچے کا
 کلام اگر ہ سے لے جا کر لکھنویں میر تقی جیسے کمند مشق استاد کو دکھانے کا خیال بھی کسی کو
 نہیں ہو سکتا تھا۔

۲۔ مستام الدین حیدر خاں دہلی میں رہتے تھے، غلامان لودا رو سے عموماً اور میرزا غالب
 کے شعر نواب الہی بخش خاں معروف سے خصوصاً ان کے بڑے گھرے تعلقات تھے۔ اسی وجہ
 سے غالب کے ساتھ خاص مراسم پیدا ہو گئے، لیکن انہیں یہ کیوں کہ معلوم ہو سکتا تھا کہ غالب
 کمسنی میں جیت آگیزہ شعر کہتے ہیں اور انہیں لکھنویں جا کر میر تقی کو دکھانا پڑا ہے۔ جبکہ غالب
 کی مستقل سکونت اگر دہلی تھی اور عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ تھی۔

۳۔ ۱۰ رجب ۱۲۲۵ھ (۱۰ اگست ۱۸۱۰ء) کو میرزا غالب کی شادی ہوئی۔ اگر

سمجھا جائے کہ اس وقت دہلی میں آمدورفت شروع ہوئی اور مستام الدین حیدر خاں کو بھی غالب

کے شعر سننے کا موقع ملا تو یہ تعادلت مہینے ڈیڑھ دو چھپنے کی قلیل سی مدت میں اس پہیلے نمبر کیوں کر پہنچ سکتا تھا کہ حسام الدین حیدر خاں میرزا کے اشعار لکھنؤ سے جا کر میر تقی کو دکھاتے اور ان کے متعلق تیرہ صاحب کی رائے آتے؟

۱۰۔ اس قول میں ایک سے زیادہ پہلو ایسے ہیں کہ بغیر تقی جیسے معرشتا اس شعر کی زبان پر وہ آج ہی نہ سکتے تھے۔

۱۱۔ ہر حال تیر کی بیان کردہ پیش گوئی کو بھی انہیں دست نوں میں شامہ کرنا چاہیے جو عجیب پسند لوگ غیر معمولی دل و دماغ کے آدمیوں کے متعلق وضع کر دیا کرتے ہیں اور شاید ہی کوئی بڑا آدمی گنہگار ہو جس کے گرد و پیش ایسی داستانوں کے بدلے قیام نہ کر دیئے گئے ہوں۔ میرزا غالب یقیناً ”لا جواب شاعر“ بن گئے مگر سیدھے راستے پر مہرینے کے لیے کسی استاد کی رہنمائی کے ممنون نہ ہوئے:

شعر غالب: ہمدردی و نہ گریختوں
توینہاں نتوان گفت کہ ایسا ہے ہست
اردو دیوان کی کہانی غالب کے اردو دیوان کی ترتیب و انتخاب کے متعلق بھی ایک افسانہ وضع کر دیا گیا، جسے مولانا محمد حسین آزاد و مرحوم نے ”آب حیات“ میں شامل کر کے حقیقت کے مد جسے پر پہنچا دیا۔ یعنی مولانا فضل بن ظہیر آبادی اور میرزا خاں کو قوال نے دوست ہونے کی حیثیت میں غالب کو سمجھایا کہ تمہارے اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ غالب نے کہا:

”اب اتنا کچھ کہ چکا، تدارک کیا ہو سکتا ہے، انھوں (مولانا و میرزا خاں) نے کہا
خیر، ”اوسو“، انتخاب کرو اور شکل شعر نکال ڈالو۔ میرزا نے دیوان حوالے کر دیا
دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا“ (آب حیات ص ۵۱)

اس اقتباس کا بے سرو پا ہونا کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ خود فرمائیے کہ:

۱۔ اگر شعر کے حسن و خوبی کا تمنا یہی معیار ہو تاکہ وہ عام لوگوں کی سمجھ میں آجائے تو صرفی نظیری وغیرہ کے مقابلے میں ہلالی کا مرتبہ بدتر جہا بلند تر ہوتا۔

۲۔ پھر یہ کیا قول ہے کہ ”اتنا کچھ کہ چکا، تدارک کیا ہو سکتا ہے“ اگر میرزا غالب اشعار

کی کم حیثیتی کے قائل ہونے کے لئے نورد فرماتے کہ ایسے اشعار نظم انداز کو دیکھ جائیں گے، مثلاً جو کچھ کتاب ہے، کیا اسے چھاپنا اور شائع کرنا قدرت کی طرف سے لازم ہو جاتا ہے؟

۳۔ مرزا خاں کو قوال کے باب میں کچھ معلوم نہیں، مولانا فضل حق یقیناً بہت بڑے عالم تھے، دیکھ کر کیا یہ بزرگ اشعار کی اچھائی یا برائی کو میرزا غالب سے بہتر سمجھتے تھے، جنہیں قدرت نے شعر گوئی ہی کے لیے پیدا کیا تھا اور جن کے متعلق قوال مصطفیٰ خاں شیعہ نے ”گلشن بے غار“ میں لکھا تھا کہ:

”مضامین شعری را کما ہر حقیقت فہم و بد جمیع نکات و لطائف پہلے سے برد و
 این قضیہ است است کہ مخصوص بعض اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس و ادبی،
 ہا میں بھرتے رہی۔ چہ خوش فکر کیاب است، اما خوش فہم کیاب تر خوش
 حال شخصے کہ اندر و دہ و شر ہے یافتہ و حقیقت برد و دہ۔ بالحد جنہیں بھرتے سخن نغز
 گفتار کم تر مرئی شد“ (گلشن بے غار ۱۳۹)

غرض یہ بیان بھی سراسر افسانہ ہے حقیقت یہ ہے کہ میرزا غالب نے تمیز فیک و بد
 ہونے کے بعد خود ہی شعروں کا انتخاب کیا۔ پھر وہ کلکتہ گئے تو وہاں ”گل رُ رعنا“ کے نام سے
 اپنے کلام کا ایک انتخاب تیار کیا۔ اس میں عرش صاحب کے بیانی کے مطابق اردو کے نکل
 ۳۵۴ شعریہ لکھے تھے۔ پھر ان میں مزید غزلیں شامل ہوئیں اور دیوان کی بقیہ سمر گزشت خلاصہ
 یہ ہے:

۱۔ اردو دیوان پہلی مرتبہ شعبان ۱۲۵۶ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں سید محمد خاں بہادر سرسید
 ”سوم کے طبع“ سید المطالع“ میں چھپا۔ یہ ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور اس میں کل ایک
 جزا پر پانچ شعر تھے۔

۲۔ پھر تیسری الاوی ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں مطبع دارالاسلام واقع حوض قاضی نے
 نواب امین احمد کھنوی کے زیر اہتمام دیوان دوسری مرتبہ چھاپا۔ اس میں کل ایک جزا ایک سو
 گیارہ شعر تھے، یعنی طبع اول سے صرف سولہ شعر زیادہ۔ پھر وہ شعر اس غزل کے تھے جو
 مراد عبد اردو دیوان کی آخری غزل ہے، یعنی ”جاں کے لیے“ آسمان کے لیے دو شعر یعنی دُئی

والے قطع کے تھے۔ گریہ سلسلہ سے سلسلہ تک اردو زبان میں ان کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر سلسلہ علیک طبع دیوان کی فہرست نہ آئی۔

۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک جو کچھ کہا تھا اردو ترمشور غزلیں اسی دور میں کہی گئی تھیں، وہ سب قلمی نسخوں میں مرقوم ہوا، جو سلسلہ کے جنگ میں تلف ہو گئے اور آغا نے ہنگامہ سے کچھ دست و پیشتر غالب نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ خوش نویس سے لکھوا کر ثواب یوسف علی خاں والی رام پور کے پاس بھیج دیا تھا۔ سلسلہ میں رام پور گئے تو اس نسخے کی نقل لے گئے اسے پہلے میر تقی میر میں چھپنے کے لیے دیا، پھر منشی شیونرائن آرم کے پاس اگر وہ بھیج دیا۔ وہاں طباعت میں تاخیر ہوئی تو مرزا غالب نے دیوان کا ایک اور نسخہ دہلی میں مولوی محمد حسین خاں تحسین کے حوالے کر دیا، چنانچہ دیوان تیسری مرتبہ طبع احمدی واقعہ شاہدہ دہلی، میں جاہتمام امور دیوان طبع ہو کر ۲۰۔ محرم الحرام ۱۲۷۷ھ ۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء کو شائع ہوا۔ اس میں کل ایک ہزار سات سو چھیانوے اشعار تھے۔

۴۔ اس دیوان کا خط بھی اچھا نہ تھا نیز غالب کی روش کے خلاف بہت سے الفاظ ملا کر لکھے گئے تھے۔ اور غلطیاں بہت رہ گئی تھیں، اس لیے کہ کاتب نے تصحیح کا پورا خیال نہیں کیا تھا۔ مرزا غالب نے مطبوعہ دیوان کی خود تصحیح کی اور اس میں چھ شعر بڑھا دیئے، جو غالباً مطبع احمدی والے نسخے کی طباعت کے بعد لکھے گئے تھے۔ یہ نسخہ مولوی محمد حسین خاں تحسین کے ہاتھ سے چلنے کے لیے مطبع نظامی واقعہ کان پور میں بھیج دیا جس کے ایک محمد عبدالرحمن خان بن حاجی محمد روشن خاں تھے۔ یہ دیوان ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں یعنی مطبع احمدی والے نسخے کے قریباً ۱۰ ماہ بعد چھپا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ اس کے کئی اشعار ایک ہزار آٹھ سو دو تھے۔ (۱۷۹۶ + ۶)

۵۔ اس دیوان میں منشی شیونرائن آرم نے بھی طباعت شروع کر دی تھی اور ان کے مطبع میں دیوان ۱۸۵۸ء میں مکمل ہوا۔ یہ دیوان نسخہ رام پور کے مطابق تھا۔

۶۔ لالہ جے نرائن صاحب کتب دہلی نے سید ظہیر دہلوی سے کہہ کر غالب، ذوق اور دکن کے دیوانوں کا انتخاب مرتب کرایا تھا، جس کا نام "نگارستان سخن" رکھا تھا، یہ کتاب بیہشت

مستفزیہ کالج دہلی کے طبع العلوم میں چھپتی شروع ہوئی تھی، مگر تحلیل طباعت مطبع احمدی میں ہوئی۔ اس میں غالب کی غزلیات کے صرف پینتیس اشعار چھوڑے گئے تھے۔ باقی سب انتخاب میں لے لیے گئے۔ "نگارستان سخن" ۲۷۔ مقررہ قطع ۱۲۷ (۱۲) اگست ۱۹۳۷ء کو شائع ہوئی۔

۱۔ پہلی مرتبہ اسی مجموعے میں شامل کیا گیا تھا، بعد ازاں دیوان میں شامل ہوا۔
 ۲۔ غالب کی زندگی میں اردو دیوان اتنی ہی مرتبہ چھپا، البتہ ان کی وفات کے بعد جو ایڈیشن نکلے، ان کا شمار ممکن نہیں۔ ان میں عام ایڈیشن بھی شامل ہیں اور نہایت پر تکلف، دیدہ زیب معرود ایڈیشن بھی۔ اردو نظم کے کسی مجموعے کو شاید ہی وہ ہر معرود ہی حاصل ہوئی ہو جو دیوان غالب کے حصے میں آئی اور اس پر جو شرحیں لکھی گئیں، ان کا شمار بھی آسان نہیں۔ موجودہ دیوان میں غزلت سے غالب کے دیوان کا ایک ایسا ایڈیشن مرتب کر دینے کا آرزو مند تھا، جو مختلف خصوصیات کا جامع ہو مثلاً:
 ۱۔ صحت کلہوڑا استقام کیا جائے۔

۲۔ بیشتر شعر صرف اس وجہ سے صحیح اور مشکل بن گئے تھے کہ ان میں علامات اوقاف صحیح مقامات پر لگانے کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ میرا خیال تھا، اگر اوقاف ٹھیک لگا دیے جائیں تو اغلب ہے اکثر اشعار کا مطلب بالکل واضح ہو جائے جنہیں عام طور پر مشکل سمجھا جاتا ہے اور بعض شاربین داغ سوزیوں کے باوجود ان کی صحیح شرح نہیں کر سکے، بلکہ مقتصر و شاعر سے دُور دور پڑتے پڑتے انھوں نے شعروں کو پستیاں بنا دیا۔

۳۔ اشعار میں ایسے الفاظ بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کے معنی تو اکثر اصحاب سمجھتے ہیں، لیکن ان کے تلفظ میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ایسے تمام الفاظ پر اعراب لگا دیئے جائیں تاکہ تلفظ میں غلطی سرزد نہ ہو اور یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ الفاظ غلط پڑھے جائیں تو شعر کی حقیقی حیثیت ہی ناک ہو جاتی ہے۔

۴۔ چنانچہ اشعار دیوان سے باہر رہے تھے اور وہ مختلف مقامات پر چھپ چکے تھے، انہیں اکٹھا کر کے بطور ضمیر شامل دیوان کر دیا جائے تاکہ ارباب ذوق کو ان کی لہ بہ لہ تعلیلات محبت عزیز جواب ملک نام صاحب زمرہ کے کی تحقیقات پہنچتی ہیں۔

تلاش میں دو سزے مآخذ کی طرف رجوع کی ضرورت نہ رہے۔

۵۔ آخر میں نسخہ مجید سے ایسے اشعار منتخب کر لیے جائیں جو کسی قدر سہل ہوں اور ان میں فکر و بیان کی کوئی خوبی پائی جائے۔

۶۔ اس میں مختلف غزلیات و قصائد کی تاریخیں مستند اخذ کی بنا پر متعین کر دی جائیں۔
میں اپنے مجوزہ دیوان کی ترتیب مکمل نہیں کر سکا تھا کہ ملک رام صاحب نے ایک دیوان شائع کر دیا جس میں تاریخوں کے تفصیلی اہتمام کے سوا، وہ خصوصیات کم و بیش موجود تھیں جو میر سے پیش نظر تھیں، خوب غور و فکر کے بعد میں اسی تہیہ پر پہنچا کہ نئے دیوان کی ترتیب بہ ہر حال ضروری ہے چنانچہ میں نے دیوان مرتب کر کے بطبع کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد فاضل حلیں و محبت محترم مولانا نقیاز علی خاں صاحب عرشی کا مرتبہ دیوان شائع ہو گیا جس کا دائرہ میر سے مجوزہ دیوان کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے اور اسے دیوان غالب کے بجائے کلیات غالب قرار دینا چاہیے، اس لیے کہ اس میں ”نسخہ مجید“ سے آخر تک وہ سب کچھ جمع کر دیا گیا، جس نے اردو میں غالب کے نام سے اقتساب پایا۔ پھر تاریخوں کا بھی اہتمام ہے اور اوقات و صحبت کا بھی۔ میں نے اپنے مرتبہ دیوان کی کتابت روک کر اس نسخہ بہتہ سے بھی بقدر صلاحیت استفادہ کیا۔

میر سے پیش نظر جامعیت کے بجائے یہ امر تھا کہ ان اشعار کو با اہتمام خاص مرتب کر دیا جائے، جی سے اردو و خزان اصحاب زیادہ سے زیادہ تعداد میں استفادہ کر سکیں۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے بعض الفاظ اسی طرح رکھتے ہیں جس طرح میرزا غالب کے زمانے میں استعمال ہونے لگے مثلاً ”آئے“ کو ”آئے“ اور فرماویں گے ”کو“ فرمایں گے“ نہیں بنایا۔ الفاظ کو ملا کر لکھنے سے احتراز کیا ہے، لیکن بعض مقامات پر رفع اشتباہ کی غرض سے اس کے خلاف بھی کچھ اشارے مثلاً ”سخت جانی ہئے“ کو ”سخت جانیہائے“ ہی لکھا۔ پہلی صورت میں میر سے انادے کے مطابق غلطی کا امکان بڑھ جاتا تھا۔ البتہ ”نالہائے ناز“ کو ”نالہائے ناز“ لکھا۔ اس بارے میں کوئی ایک قاعدہ بنایا جا سکتا ہے تو یہی بنایا جا سکتا ہے کہ خواندگان کو نام کو غلط قسمی یا اشتباہ سے حتی الامکان محفوظ رکھا جائے۔

کلام کی تاریخوں کا مسئلہ کلام کی تاریخوں کا مسئلہ بے مدام فضا۱۰۱ سطرے میں دو مرتبہ کہنے کے واضح قرینے موجود تھے مثلاً:

۱۔ نثر، عید یہ میں جو کلام ہے، وہ فی الجملہ پچیس برس کی عمر تک کا ہے، یعنی اس کی آخری تاریخ سن ۱۸۷۵ء تک ہی پائیے۔

۲۔ تذکرہ گلشن بے غار، سن ۱۸۷۳ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں جو منتخب شعرا آ گئے ہیں، ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ان اشعار کی غزلیں سن ۱۸۷۳ء سے پیشتر کی ہیں۔

۳۔ سن ۱۸۷۱ء میں اردو برہان پہلی مرتبہ چھپا۔ اس میں جو غزلیں ہیں، وہ بہر حال سن ۱۸۷۱ء تک کی ہیں۔

۴۔ سن ۱۸۷۶ء کے دیوان میں صرف سولہ شعر زادہ تھے اور ان کی تصریح پہلے کی جا چکی ہے۔

۵۔ سن ۱۸۷۹ء میں تیسری مرتبہ برہان چھپا۔ اس سے سن ۱۸۷۶ء اور سن ۱۸۷۱ء کی دو مہرانی مدت کے کلام کا پتا چل سکتا ہے۔

۶۔ باقی جو کچھ ہے، بعد کا ہے۔

ان اعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے پہلے دو بڑی تقسیمیں کیں، یعنی سن ۱۸۷۱ء تک کا کلام اور سن ۱۸۷۱ء تک کا کلام۔ پہلی تقسیم میں جا بجا۔ گلشن بے غار کے سولہ بھی دے دیئے تاکہ معلوم ہو جائے، وہ کلام مذکورہ مذکورہ کی تکمیل سے پیشتر کا ہے۔ ان بڑی تقسیموں کے بعد جن غزلوں کی معین تاریخیں معلوم ہوئیں، ان کے متعلق حواشی میں معیاد تصدیقات کیں اور ان کی تعداد خاص ہے، جیسا کہ دیوان ملاحظہ فرمائیے۔ واضح ہو گا۔ کاش تحقیق کا قدم آگے بڑھانے کے لیے کوئی نیا سہارا ملے تاکہ باقی کلام یا اس میں سے پیشتر حصے کی تاریخیں معین طور پر معلوم ہو جائیں جس پر ہمارا تھا کہ ہر روایت کی غزلیات تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کر دوں لیکن کلام کا خاصا بڑا حصہ چونکہ ایسا ہے جس کی معین تاریخ نہ حال معلوم نہیں ہو سکی لہذا ایک حصے کے متعلق معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے متداول ترتیب میں مذکور دل مناسب نظر نہ آیا۔

بعض غزلیات یا قطعات و قصائد وغیرہ کے اوقات داخلی یا خارجی شداوتوں کی بنا پر
 سبکی کر جیتے کے قریب موجود تھے۔ میں نے ان قرضوں سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی کمی نہیں
 کی۔ غرض اس دیوان کو ہر لحاظ سے مفید اور نفع بخش بنانے میں کوئی دقیقہ نہ سمی اٹھا نہیں
 رکھا۔ امید ہے، یہ تاخیر نہ سمی کلام غالب کے مطالعے اور اس سے استفادے کے واسطے
 کو وسیع تر کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

آخر میں چند الفاظ دیوان کی شرح کے متعلق بھی عرض کر دینے چاہئیں۔ اردو دیوان
 کی اتنی شرحیں ہو چکی تھیں کہ مجھے خیال بھی نہیں تھا، کوئی نئی شرح ضروری ہوگی اور یہ کام
 بھی مجھے انجام دینا پڑے گا۔ ہر اندازہ ہر پرانے کی شرحیں مرقعہ چلی آتی تھیں۔ ایسی ہی
 تھیں، جن میں صرف مشکل اشعار کی سرسری تشریح کی گئی تھی اور ایسی بھی، جن میں شعریہ
 شعر مفصل شرح کی گئی تھی، لیکن میرے عزیز دوست شیخ نیاز احمد صاحب (مالک شیخ
 غلام علی اینڈ سنز) کی رائے ابتدا سے یہ تھی کہ نئی شرح ہونی چاہیے۔ وہی اس پورے سلسلے
 کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں، وہی میری تمام تحریرات شائع فرماتے رہتے ہیں سالہا سال کے
 خاص تعلق سے ان کی رائے میرے نزدیک زیادہ توجہ کی مستحق رہی۔ میرے عزیز دوست
 دلاوری صاحب نے بھی شیخ صاحب ہی کی تائید کی، اس لیے میں نے شرح کا بیڑا اٹھایا۔
 کام شروع ہوا تو یقین ہو گیا کہ بیسیوں شرحیں چھپ جانے کے باوجود غالب کے مختصر سے
 اردو دیوان کی ترمیم و تشریح کا حق ادا نہیں ہوا اور اغلب ہے، اس کے بعد بھی اہل نگار
 نظر کا احساس ہی رہے۔

میں نے ذہن میں شرح کا جو سپانہ تجویز کیا تھا، وہ نہ زیادہ مختصر تھا اور نہ زیادہ مفصل۔
 آرزو یہ تھی کہ میرزا کے شعرا ایسے انداز میں پیش کئے جائیں، جس سے ان کی معنوی اہمیت و
 عظمت بخوبی واضح ہو جائے اور خواندگان کو کام اندازہ فرمائیں کہ میرزا کو اردو شعروادب
 میں یکاگی کا جو درجہ ملا اس کی بنیاد و اساس کیا ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ ہر شعر
 کی شرح خواہش و اطمینان کے مطابق کر سکا ہوں، لیکن اسے ملاحظہ فرما لیجئے کہ بعد یقین
 ضرور ہو جائے گا کہ میں نے شاعرین کی قابل قدر نکتہ نوازیوں سے استفادے کے ساتھ جو بکا

نکرو نظر کے لئے پہلو بھی پیش کیجئے ہیں اور کوشش برابر یہ رہی کہ میرزا کی شعر گوئی میں بیان ہر
تخیل کے جن کمالات کی جلوہ آرائیاں بکثرت نمایاں ہیں، ان تک رسائی کے لئے زیادہ سے زیادہ
سہل ہو جائے۔ میں ان شعروں پر نقد و تبصرہ کا رشتہ مستبعد نہیں سمجھتا، انکا عرض کر دیتا ہوں
کہ بری صفت میں خواجہ معانی مرحوم اور مولانا طبا طباطبائی مرحوم ہی کے ارشادات زیادہ تر محکم و
استوار نظر آئے، جیسا کہ خود کتاب کے ملاحظے سے یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔

علاوہ بری اس شرح کی چند اور خصوصیات بھی ہیں، جن کی طرف اجمالاً اشارہ کر دینا
غالباً غیر مناسب نہ سمجھا جائے۔

۱۔ امید ہے کہ اسے دیکھنے والوں کے بعد میرزا کے اشعار کی بلند حیثیت کا بہتر اندازہ ہو
سکے گا۔

۲۔ میں نے محض الفاظ و تراکیب ہی کی تشریح پر معاملہ نہیں چھوڑا، بلکہ افکار کے
مختلف پہلو بھی واضح کیے اور حقیقی امکان کوئی ضروری شکستہ نظر انداز نہ کیا۔
۳۔ اس امر کا خاص خیال رکھا کہ میرزا کے اشعار کو نثری تخیل طرازی نہ سمجھا جائے، بلکہ
حقیقی حیات سے ان کا ربط و تعلق واضح کیا جائے۔

۴۔ چند اصحاب نے میرزا کے بعض اشعار کو کسی نہ کسی فارسی شعر سے ماخوذ قرار دیا
میر سے علم میں ایسے جتنے اشعار آئے، ان کا موازنہ میرزا کے اشعار سے کر کے معنویت کا فرق
دکھایا جاتا ہے کہ بعض شعروں میں اگر گونا گونا گونہ اشتراک کے باوجود سابق میں مضمون جس طرح پیش
کیا گیا تھا، وہ یا تو ناقص تھا یا غیر طبعی۔ میرزا نے اسے صحیح انداز میں پیش کیا۔ اس وجہ سے
اگر وہ مضمون جزو کسی سابق شعر میں آ بھی چکا تھا تو میرزا نے اس کی حقیقی حیثیت کا اندازہ
کہتے ہوئے اسے کھل کر دیا اور طبعی بنا دیا۔

۵۔ میں نے اس امر کا بھی خیال رکھا کہ میرزا نے اردو میں بعض ایسے اشعار بھی کہے،
جن کا مضمون وہ پیشتر فارسی میں یا مذکورہ جگہ تھے جس نے وہ اشعار جا بجا نقل کر دیئے۔
تاکہ خواندگان کو کام اندازہ فراہم کیں، آیا اصل مضمون اردو میں بہتر طریق پر ہوا یا فارسی میں۔
۶۔ اس شرح میں انکشاف غالب کے مطالعے کا ذوق پیدا کرنا یہ طور خاص مد نظر رہا۔

۷۔ اصل دربان کے علاوہ غصیبوں کے اشعار کی شرح بھی کر دی گئی تاکہ خواندگان کرام ان اشعار سے بھی بہتر طریق پر بصیرت اندوز ہو سکیں۔

ان چند خصوصیات کا سرسری ذکر کر دینے کے بعد یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں، دربانِ غالب کی شرح کا اصل مقاصد یہی نہیں کہ ایک جلیل القدر شاعر کا کلام بخوبی سمجھ لیا جائے۔ غالبؔ اصل اردو شاعری کو جدید اسلوب پر لانے کا ذمہ دار تھا۔ اسے قدیم و جدید کے درمیان ایک نثر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے ندرت افروز فکر و بیان سے اردو زبان کو ایسا پروانہ دیا جس سے اس میں حسن اسالیب کے علاوہ دقیق حکیمانہ و فلسفیانہ اور دوسرے نکات و مطالب بے تکلف پیش کرنے کی صلاحیت نمایاں ہو گئی۔ اس کا مطالعہ ہماری قومی زندگی کے ممکنہ ارتقا سے استفادے کا ایک اہم جزو ہے جسے میں بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ خواندگانِ کرام یہ نگتہ ملحوظ رکھیں گے تو توقع ہے کہ اس کی گزارشات رائیگاں نہ جائیں گی اور جن خوشگوار امیدوں کی بنا پر ناچیز علم و فہم کے مطابق یہ کام انجام دیا گیا ہے، وہ گلدستہ و طاقِ نسیاں نہ بنیں گی۔

۱۔ لغات - نقش : نکست نقش ونگر کرتا، بیل برٹنے بتانا، نشان، تلوین، تصویر یہاں آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔

کافذی پیرمن : کافذی لباس، جو زمانہ قدیم کے ایران میں دادخواہ پہن جتے تھے۔ مرزا غالب نے لکھا ہے : ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل بن کوہلانا یا خون آلودہ کپڑا بالمش پر لٹکا کر لے جاتا : شعرائے ایران کے کام سے اس رسم کی تصدیق ہوتی ہے۔

مشرج : خود مرزا اس شرک شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں : مشرخیال کرتا ہے، نقش کسی کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرمن کافذی

حقتش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کافذی ہے پیرمن ہر سپیکر تصویر کا کاؤ کا دست یا مینائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا الانا ہے جوئے شیر کا جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا آگہی دام شہیدن جس قدر چاہئے پھلنے مدعا چلتا ہے اپنے عالم تقصیر کا بیکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا کوئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

ہے۔ یعنی بستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار بعض ہوا موجب رنج و ملال و آزار ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی وجود حقیقی یعنی خدا سے علیحدگی اور جہان کی باعث ہوئی۔ جہان سے پیشتر معرفت کی جو دولت و ولادت حاصل تھی، وہ باقی نہ رہی۔ دوحین پیدا کی گئی تھیں اور ان سے پوچھا گیا تھا : اہستہ بہتکبر کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ تو سب کی فطرت سے ایک صدا بلند ہوئی یعنی جلیٰ بیشک تو ہی ہمارا پروردگار ہے۔ دنیا کے کعبیڑوں سے سابقہ و وجود حقیقی سے قرب کی یہ کیفیت بھی جاتی رہی اور زندگی کے اقرار کا حق بھی ادا نہ ہو سکا۔ اسی حالت درد و غم نے جہتی کو فریاد پر عبور کر دیا۔ درد و غم کے دو سبب ہوئے : اول وجود حقیقی سے جہانی، دوم اس کے حکموں کی تعمیل میں کوتاہی۔ شاہد کتنا ہے کہ

نقش کسی کی شوقی تحریر کا مزیدادی ہے، جس کے باعث ہر تصویر نے کاغذی لباس پہن کیا ہے، ہستی کو تصویر اس لیے کہا کہ اس کا وجود حقیقی نہیں، غیر حقیقی اور اعتباری ہے، مگر اعتباری اور عارضی ہونے کے باوجود وہ اتنے رنج و ملال کا باعث ہوئی کہ ہر ہستی سراپا فریاد بن گئی۔

۲۔ لغات - کاو کاو : فارسی مصدر کا ویدن سے ہے، جس کے معنی ہیں کھودنا، کاوش، غلش، سخت محنت، رنج۔

سخت جانی : حدودِ جہ جفاکشی، ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنا۔
جھوٹے شیر : عام روایت کے مطابق دُہ نر، جو فراڈ تھے بے ستون پہاڑ کاٹ رہا تھا تھی تاکہ شیریں کے باغ تک پانی پہنچ جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حقیقتہً دودھ کی نر تھی۔ پہاڑوں پر سے سختی ندیاں نیچے اُترتی ہیں، ان کے پانی کا رنگ دُودھ سے عموماً سفید نظر آتا ہے، کیونکہ پانی پتھروں سے ٹکراتا ہوا آتا ہے اور اس میں جھاگ اٹھتے ہیں۔ لہذا وہ بہ لحاظِ منظر جوئے شیر مشہور ہو گئی۔

شرح : جدائی کی حالت میں جن جن کاوشوں، کاہشوں اور شقتوں کا میں تجربہ مشورہ بنا ہوا ہوں، ان کا حال کچھ نہ پوچھو۔ مذ میں بیان کر سکتا ہوں، نہ سخت جانی کے باعث دم لگتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ رات گزارنا اور شام کا صبح کرنا اتنا ہی دشوار ہے، جتنا فراڈ کے لیے بے ستون کو کاٹ کر جوئے شیر لانا دشوار تھا۔

اس شعر میں شاعر نے بہ حالتِ جدائی اپنی سخت جانی کو پہاڑ سے اور شام کے صبح کرنے کو جھوٹے شیر سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ لغات - شوق : یہاں اس سے مراد ہے شوقِ قتل۔

دُم : سامن، دم شیر سے مراد تلوار کی دھار ہے۔

شرح : میرے شوقِ قتل کا جذبہ جو اختیار سے باہر ہے، دیکھنے سے قتل رکھتا ہے۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ تلوار کا دم یعنی اس کی دھار کھینچ کر پیٹھ سے باہر نکل آتی ہے۔ چونکہ تلوار میں ایک گونہ جھکاؤ ہوتا ہے، اس لیے شاعر نے کہا کہ اس کی دھار (دُم،

کھج کر سینے سے باہر نکل آئی ہے۔ اس میں لطفت یہ ہے کہ لفظ دُم کے دونوں معنی شاعر کے پیش نظر رہے۔ عام سامع سینے کے اندر ہوتے ہیں، لیکن شوقِ قتل کا جذبہ تلوار کی دھار دُم، کھینچ کر سینے سے باہر لے آیا۔

۴۔ لغات - آگہی یعنی آگاہی : شعور، عقل، علم، واقعیت، باخبری۔
 عنقا : ایک فرمئی اور خیالی پرندہ۔ کہتے ہیں، اس کی گردن لمبی ہونے کے باعث یہ نام رکھا گیا ہے۔ نام موجود ہے، پرندہ ناپید ہے اس سے مراد ہے ناپیدا اور گم۔
 مشرح : آگہی یعنی عقل و علم ہمارا مقصد بیان کرنے کے لیے سماعت کے کتنے ہی مجال پھیلا دیں، مگر وہ ہمارے معنوم و مطالب کو بیان نہیں سکتے۔ لیکن ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کا معنوم و مطلب بلند ہے۔ اُسے عنقا کی طرح ناپید کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا۔
 شاعر کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں، اس کا مطلب کچھ نہیں۔ مفقود یہ ہے مگر ہمارا مطلب اتنا دقیق اور نازک ہوتا ہے کہ اس تک عام علم و عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

مرزا نے فارسی میں بھی اس مضمون کا ایک شعر کہا ہے۔

نما ہمائے گرم پروازیم، فیض ادا ما جو
 سایہ بچوں دوو بالائی رودار بال ما

یعنی ہم تیز اڑنے والے ہمارے اور ہماری پرواز میں اس قدر گرمی ہے کہ سایہ بھی زمین پر نہیں پڑتا، بلکہ دھواں بن کر اوپر نکل جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص ہم سے فیض حاصل کرنا چاہے، اُسے بلندی پر آنا چاہیے۔ اپنی جگہ بیٹھ کر ہمارے چنے اُترنے کا انتظار نہ کرنا چاہیے۔

۵۔ لغات - بسکہ : چونکہ۔

آتش زیر پا : لفظی معنی، جس کے پاؤں کے نیچے آگ ہو، محاورہ، مضطرب و بے قرار۔

مڑے آتش دیدہ : بال، جسے آگ نے چھڑا ہو۔ ایسا بال بلو کہا کرتے

منطقے کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔

مشرح : اے غائب ! میں قید میں بھی بے قرار ہوں اور جو زنجیر میرے پاؤں
پیش ڈالی گئی ہے ، اس کی ہر کڑی میرے آتش زبیر پا ہونے کے باعث اُس بال
کی سی جو گئی ہے ، جسے آگ چھو گئی ہو ، یعنی بالکل کمزور ہے اور میری بے قراری
کو روک نہیں سکتی ۔

شاعر کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ دنیا سے تعلق کی زنجیر میرے پاؤں میں پڑی ہوئی
ہے ۔ لیکن میرا عشق ربانی اس قدر گچھتہ ہے کہ وہ زنجیر بے حقیقی راستے سے روک
نہیں سکتی ۔



جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ۔ صحرا مگر بے تنگی چشم حسود تھا
آشفگی نے نقش سُوید کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہمنوز لیکن یہی کہ ”رفت“ گیا اور ”بود“ تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب بر منگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگ و جود تھا
تیشے بنیر مر نہ سکا ، کو بہن اُسدا ! سرگشتہ شمار رسوم و قیود تھا

۱۔ لغات ۔ قیس : مشہور عاشق مجنوں کا اصل نام ، جو نجد کے قبیلہ عامر
سے تھا اور یثرب کے ساتھ محبت کے باعث مالگیر شہرت پائی ۔ عام روایات کے
مطابق اس کی ساری عمر بیاہن کی خاک چھانٹنے میں بسر ہوئی ۔
بروئے کار آنا : نمایاں ہونا ۔ ہر سر کار آنا ۔

مثنوی : (ج پر زبر سین پر پیش) ثبت حد کرنے والا۔ زیرِ فکر شاعر ہی مثنوی استعمال کرتا ہے۔

مثنوی : (ج پر پیش، سین پر پیش) اول مصدر بمعنی حد کرنا، دوم ماسد کج شرح : عمریں گز رنگیں، قیس کے سوا کسی دوسرے آدمی نے جنوں عشق میں نمایاں حیثیت حاصل نہ کی اور اس کی طرح صحراگردی میں عمر نہ گزاری۔ اس سے معلوم ہوتا کہ صحرا بھی وسعت کے باوجود بہت حد کرنے والے شخص کی آنکھ کی طرح تنگ تھا۔

چشمِ ماسد کی تنگی اس لیے مشہور ہوئی کہ وہ اپنے سوا ہر شخص کی نعمت کا زوال چاہتا ہے، کسی کو چھوٹا پھلتا دیکھتا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ شاعر کہتا ہے کہ صحرا دیکھنے میں کتنا ہی وسیع اور کشادہ کیوں نہ ہو، لیکن جب ہم یہ حقیقت پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ قیس کے سوا کوئی اور فرد جنوں عشق کی سرکشگی میں صحرا کے اندر نہ پہنچ سکا تو معلوم ہوتا کہ صحرا چشمِ ماسد کی طرح تنگ ہے۔ یعنی وہاں کس دوسرے کو قدم رکھنے کے لیے جگہ نہ مل سکی۔

۲۔ لغات۔ آشفنگی : پریشانی۔

سُوید ا : دل کا سیاہ نقطہ۔ آسود کی تائید ہے۔ شاعر نے پریشانی اور آشفنگی کو دھوئیں سے دل کے سیاہ نقطے کو داغ سے تشبیہ دی ہے۔

شرح : عشق کی پریشانی کے باعث دل سے آہ و غناں کا دھواں اٹھتا رہتا تھا۔ اسی دھوئیں سے دل کے سیاہ نقطے کی صورت قائم ہو گئی، معلوم ہے جس مقام پر دھواں مسلسل لگتا رہے، وہاں سیاہی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کے نزدیک دل کے نقطے یعنی سودیا کی سیاہی آہ و غناں کے اسی دھوئیں کا کرشمہ تھی، جو عشق کی پریشانی و آشفنگی میں مسلسل اٹھتا رہتا ہے۔ اسی صورت حال پر شاعر نے اپنا عام مشاہدہ چہلن کر دیا یعنی یہ کہ داغ، کا اصل سرمایہ اور اس المالِ صرف دھواں ہوتا ہے کیونکہ کچھ جگہ دھواں مسلسل لگتا رہے وہ سیاہ ہو جاتی ہے۔

بشرح : اسے محبوب، عالم بیداری میں تو تیرے ساتھ عشقِ حبیب کے معاملے کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ تو خواب میں آجاتا ہے تو خیالِ تجھ سے معاملے کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ مثلاً کبھی اپنے شوق کی فراوانی پیش کر دی۔ کبھی عرض کر دیا کہ سچے جان بازوں سے بے تعلق نہ رہنا چاہیئے۔ کبھی شوقِ وصل کا اظہار کر دیا۔ محبوب عالمِ خواب میں ایسی کسی گزارش پر متوجہ نہیں ہوتا۔ پھر آنکھ کھل جاتی ہے اور خواب کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے تو شاعر پرواضح ہوتا ہے کہ نفع اور نقصان یا سود و زیاں کی جو بات چیت ہو رہی تھی، وہ تو خواب و خیال کی حیثیت رکھتی تھی۔ عالم بیداری میں تو کوئی معاملہ ہی پیش نہ آیا، لہذا سود و زیاں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کے ساتھ جو معاملے پیش آئے اور عیش و راحت یا رنج و ملال کے جن واقعات سے سابقہ پڑا، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمِ خواب میں خیال کے کرشمے تھے۔ جب آنکھ کھل گئی تو عیش و راحت اور رنج و ملال یعنی سود و زیاں میں سے کچھ بھی نہ رہا۔ کیونکہ خواب کی تمام باتوں کا اثر آنکھ کھلتے ہی ذائل ہو جاتا ہے۔

۴۔ شمرح : میں غمِ دل یعنی عشق کے کتب میں ابھی پڑھنے لگا ہوں اور میرا سبق بالکل ابتدائی حالت میں ہے، یعنی ابھی تک رقت (گیا)، اور بود (تھا)، یاد کر رہا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ عشق کی درس گاہ میں ابھی ابتدائی درجوں میں پہنچوں۔ قدم آگے بڑھے گا اور تعلیم کے ابتدائی درجوں سے ترقی کرتا ہوا اوپر کے درجوں میں پہنچوں گا تو خدا جانے کیا کیفیت رونما ہوگی۔

عشق کی ابتدائی حالت کے متعلق عرفی نے بھی ایک نہایت عمدہ شعر کہا ہے:

عشق یِ خواہم و می گریم زار
فضلِ ناواہم و اول سبقِ زار

یعنی میں عشق کا درس لے رہا ہوں اور زار زار زار رہ رہا ہوں۔ گویا میرا سبق پہلا

ہوں اور یہ میرا پہلا سبق ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں کو آزاد اور بہتر پھرتے مکتب میں بٹھا دیا جائے اور وہ پابند ہو جائیں تو پڑھتے پڑھتے رونا شروع کر دیتے ہیں۔
غائب اور عرفی دونوں نے عشق کی ابتدائی کیفیت پیش کرنے کے لئے درگاہ سے مثالیں لیں۔ لیکن اس کے سوا دونوں شروں میں کوئی کیسا ہی نہیں۔ عرفی کے شرعے واضح ہوتا ہے کہ اس نے جو پہلا سبق پڑھا، وہ عشق کا تھا۔ غائب اپنے عشق کی معرفت ابتدائی کیفیت پیش کر رہا ہے۔

۵۔ لغات۔ ننگ وجود : ہستی کے لیے ننگ و عار کا باعث۔

شرح : مجھ سے برہنہ ہونے کے جتنے عیب تھے، ان سب کا داغ کفن نے ڈھانپ لیا اور نہ میری حالت یہ تھی کہ کوئی بھی لباس پہن لیتا، ہستی اور انسانیت کے لیے شرم اور ننگ و عار کا باعث تھا۔

برہنگی کا مطلب ہے اخلاق محاسن اور انسانی شرف کے اوصاف سے خالی ہونا۔ لباس اس لیے پہنا جاتا ہے کہ انسان برہنہ نظر نہ آئے۔ شر کا مطلب یہ ہے کہ میں اعلیٰ اوصاف سے عاری ہونے کے باعث اپنے وجود یعنی ہستی اور انسانیت کے لیے باعث شرم ہو گیا۔ کوئی بھی لباس اختیار کرتا، برہنہ ہونے کے عیب چھپ نہ سکتے۔ زندگی اسی حالت میں گزر گئی۔ آخر موت آئی اور مجھے کفن پہنا یا گیا تو اس سے وہ عیب قطعاً نہیں چھپ سکتے تھے۔ جو زندگی میں شرف انسانیت سے محرومی کے باعث مجھ پر لگے، البتہ موت برہنہ ہونے کا داغ کفن نے ڈھانپ لیا۔

اس شعر سے خیالی قرآن مجید کی اس آیت کی طرف توجہ دیا جاتا ہے، جس میں فرمایا گیا ہے : " اے اولادِ آدم ! ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس دیا جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور ایسی چیزیں بھی دے دیں جو زیب و زینت کا ذریعہ ہیں۔ نیز پرہیزگاری کی راہ دکھا دی کہ تمام لباسوں سے بہتر لباس ہے (سورۃ احزاب) گویا خدا نے انسان کے لیے جسمانی لباس کے علاوہ ایک باطنی پوشاک بھی دے دی جو اخلاق و سیرت کے عیبوں کو ڈھانک سکتی ہے۔ یہ تقویٰ اور پرہیزگاری کا

پولٹک ہے جس کے بغیر انسان ہر دائرے میں زندگی اور انسانیت کے لیے باعزت ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں پرہیزگاری کا لباس اختیار نہ کر سکا تو میری ہستی باعث ننگ رہی اور میں انسانی شرف کا اہل نہ رہا۔ یہ حالت میری موت پر ختم ہوئی۔

۶۔ لغات۔ کو کہن : لغوی معنی، پہاڑ کا ٹھنڈا والا۔ فرزاؤ کا لقب جس نے پہاڑ کاٹ کر ہنر شیریں کے باغ تک پہنچائی تھی۔ قصہ مشہور ہے کہ فرزاؤ کو شیریں سے دُور رکھنے کے لیے کہا گیا تھا کہ پہاڑ کاٹ کر ہنرے آؤ گے تو شیریں تمہیں مل جائے گی۔ خیال یہ تھا کہ نہ پہاڑ کاٹے گا اور نہ شرط پوری کرنے کی نوبت آئے گی۔ فرزاؤ نے ہنر نکال لی تو اس کے پاس ایک بڑھیا کو یہ پیغام دے کر بھیجا گیا کہ شیریں مر گئی۔ فرزاؤ نے یہ سنا تو قیشہ ہاتھ میں تھا وہی سر پر مارا اور مر گیا۔ مرزا غالب نے دوسری جگہ کہا ہے :

دی سادگی سے جان، پڑوں کو کہن کے پاؤں

بہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزوں کے پاؤں

سرگشتہ : لغوی معنی، جس کا سر پھیر گیا ہو، یعنی حیران و پریشان

خمار : نشے کے آثار کی کیفیت۔ اس میں نشہ چینی واسے پر بے لطفی اور

اعضا شکنی سی طاری ہو جاتی ہے۔

رسم و قیود : رسم اور قید کی جمع، یعنی رسمیں اور پابندیاں۔

شرح : اے استاد! فرزاؤ تیشے کے بغیر جان نہ دے سکا۔ اس سے

عیاں ہے کہ وہ دنیوی رسم و رواج کی پابندیوں کے خمار میں حیران و پریشان تھا۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق صادق و کامل ہو تو عاشق کے لیے مرنے کے

اسباب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، جیسے فرزاؤ نے خود کشی کے لیے تیشہ استعمال

کيا۔ یہ رسم کی پابندی تھی حالانکہ ایسی پابندی عشق کامل کی آزادی کے کوئی مناسب نہیں

رکھتی۔ بیشمار کہ سر شخص مر سکتا ہے، اس میں فرزاؤ کے عشق نے کیا کمال دکھایا ہے۔

کمالی یہ تھا کہ وہ ایسی کسی چیز کا روادار نہ ہوتا، مثلاً ایک آو سر دھکینچا اور جان سے
 دیتا۔ انوس کہ اس نے انتظار کیا، ایک بڑھیا شیریں کی موت کی جھوٹی خبر لائے۔
 وہ مٹنے، پھر تیشہ مار کر اپنے آپ کو ہلاک کرے۔



کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا
 دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا
 عشق سے طبیعت نے زینت کا مزا پایا
 درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
 دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
 آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
 سادگی و پُرکاری: بخودی و ہشیاری
 حسن کو تغافل میں جبرأت آزما پایا
 غنچہ پھر لگا کھیلنے آج ہم نے اپنا دل
 محو کیا ہو ا دیکھا گم کیا ہوا پایا
 سالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
 ہم نے بار بار ڈھونڈھا تم نے بار بار پایا
 شورِ سپیدِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
 آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

۱۔ شرح : اسے محبوب، تم کہتے
 ہو کہ تیرا دل کہیں پڑا پائیں گے تو
 واپس نہ دیں گے، لیکن ہمارے پاس
 دل ہے ہی کہاں کہ گم ہو۔ وہ تو ہم پہلے
 ہی دے چکے ہیں، البتہ آپ کی اس بات
 کا مطلب ہم سمجھ گئے، یعنی یہ کہ ہمارا دل
 تمہارے پاس ہے اور ہمارا مدعا بھی یہی
 ہے کہ تمہارے ہی پاس رہے۔
 دو بے تکلف دوستوں میں سے کسی
 کی چیز گم ہو جائے اور دوسرے کے ہاتھ
 آجائے تو وہ اسے چھپائے رکھتا ہے
 اور انک سے کہتا ہے کہ اگر وہ چیز میں
 مل گئی تو سرگرم واپس نہ دیں گے۔ اسی
 عام معمول سے غالب نے ایک پرنکٹ
 مصنون پیدا کر لیا۔
 ہم نے مدعا پایا تاکہ دو مطلب ہیں
 اول یہ کہ ہم نے تمہارا مطلب سمجھ لیا
 یعنی دل تمہارے پاس ہے دوم یہ کہ دل
 کا تمہارے پاس رہنا ہمارا اصل صحیح

وہ مقصد ہم نے پایا۔

۲۔ **تشریح :** زندگی بے کیفیت اور بے لطف ہی نہیں، طرح طرح کی تکلیفوں اور دکھوں سے بھری ہوئی ہوتی۔ عشق آیا اور اس نے زندگی میں خاص لذت و کیفیت پیدا کر دی جس مقام درد اور دکھ مٹ گئے، کیونکہ عشق ان کے لیے دوا بن گیا، لیکن خود عشق ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔

زندگی کے بے کیفیت اور بے مزہ ہونے کا سبب بظاہر یہ ہے کہ کسی شے سے کوئی دلچسپی نہ ملتی۔ شتم ہشتم دن گزر رہے تھے۔ عشق نے خاص دلچسپی پیدا کر کے زندگی کو پر مزہ بنا دیا۔

یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں کہ زندگی گونا گوں آرزوؤں سے لبریز ہوتی ہے کوئی آرزو ایسی نہیں جسے پورا کرنے کے لیے محنت و مشقت سے کام نہ لینا پڑے۔ محنت و مشقت کے بعد بھی بعض آرزوئیں پوری ہوتی ہیں، بعض نہیں ہوتیں گویا ان آرزوؤں کے باعث زندگی دکھ درد کا موقع بن جاتی ہے۔ عشق آیا تو تمام دکھ مٹا دیئے۔ ہر حال عشق ہی زندگی میں لطف اور کیفیت پیدا کرتا ہے اور تمام دکھوں کا دہی علاج ہے لیکن خود اس کی دوا نہیں۔

بعض اصحاب نے یہ شعر غلوڑی کے اس مطلع سے دالبتہ کر دیا ہے :

شد طیب ما محبت شمش بر جان ما

محبت ما راحت ما درد ما و در ما

یعنی محبت نے ہمارے لیے طیب کا کام دیا۔ ہماری جان پر اس کا احسان ہے۔ ہمارا غم خوشی میں بدل گیا اور ہمارے دکھ کا علاج باقہ آگیا۔ سرسری نظر سے بھی واضح ہو سکتا ہے کہ غالب اور غلوڑی کے شعروں کا مضمون ایک نہیں۔ اسلوب بیان اور معنویت کے اعتبار سے مرزا غالب کا شعر زیادہ بلند ہے۔

۳۔ **تشریح :** جس سے ہم محبت کرتے ہیں، وہ ہماری جان کا دشمن نہیں ہے

اور دل بھی سہارا ساتھ چھوڑ کر اسی کا دوست بن گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب دل پر کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ دشمن سے دل کی دوستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے جتنی آپس کیں، وہ کوئی اثر پیدا نہ کر سکیں اور جتنے نامے کھینچے، وہ مقصد پر نہ پہنچ سکے۔

اس شعر میں مرزا نے بنائیت پر لطیف طریق پر اپنے عشق کی کیفیت بیان کر دی۔ عشق کا مرکز دل ہوتا ہے۔ وہ محبوب کے ساتھ ہے۔ مرزا اپنے آپ کو ایک الگ شخص فرض کر کے آہ و فغاں کی بے اثری کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ جب دل ہی ساتھ نہیں تو میرے رونے دھونے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے

۴۔ لغات - پرکاری : ہوشیاری -

بیخودی : اپنے آپ میں نہ رہنا، یعنی ہوش میں نہ رہنا۔ بے خبری -
زیر نظر شعر میں اس سے مراد تجاہل یعنی جان بوجھ کر امتحان بنتا ہے۔

جہرات آزما : حوصلے اور ہمت کا امتحان لینے والا۔

شرح : حبین بظاہر بڑے سادہ اور سہولے بجائے نظر آتے ہیں، لیکن اصل میں بہت ہوشیار اور چالاک ہیں۔ وہ کبھی کبھی جان بوجھ کر امتحان بن جاتے ہیں اور بے پروائی سے اختیار کر لیتے ہیں، مگر اس حالت میں بھی ہوشیاری اور خبرداری ترک نہیں کرتے۔ سہولے بن جانے سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دیکھیں، جو لوگ عشق کے متقی ہیں، ان کے حوصلے اور ہمت کا کیا حال ہے۔ صبر و استقلال کی کیا کیفیت ہے۔ آیا وہ ہماری سادگی سے فائدہ اٹھا کر کسی گستاخی پر تو نہیں اُتر آتے؟ گویا ان کی سادگی اور تجاہل سے مقصود حشاق کی آزمائش ہوتی ہے۔

۵۔ شرح - بہاد آگئی اور کھیاں کھینے لگیں۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ہمیں اپنا دل یاد آگیا، جو اسی طرح خون ہڑا تھا جس طرح کلی کھل کر سرفی کے باعث سراپا خون نظر آتی ہے۔ نیز ہم نے اپنا دل پا لیا، جو کھو گیا تھا۔

۶۔ شرح : ہمیں دل کا حال کچھ معلوم نہیں، صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم اسے برابر ڈھونڈتے رہے اور کبھی نہ پایا۔ تم نے اسے محبوب! ڈھونڈے بغیر

اسے ہمیشہ پایا۔

مطلب یہ کہ ہمارا دل جب سے آپ کے قبضے میں آیا، ہمیں کبھی نہ ملا اور آپ اس پر بار بار قابض رہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ دل کو محبوب کے پاس رہنے کا انتہائی شوق ہے۔ جب اسے ٹھوٹا جائے، وہ مشتاق ہی کو ملتا ہے۔ عاشق کو نہیں ملتا۔

۷۔ **تشریح :** ناصح نے ترکِ عشق کی نصیحت کر کے ہمارے زخم پر نمک چھڑا دیا۔ یعنی ہمیں حدودِ مجہول تک پہنچایا، کیونکہ ہم سے ترکِ عشق جو ہی نہیں سکتا۔ اس سے پوچھنا چاہیے کہ ایسی نصیحت کر کے تمہیں کیا مزہ ملا ؟ شور اور نمک کی مناسبت کسی تشریح کی محتاج نہیں، اگرچہ شعر میں شور سے مراد یہ ہے کہ ناصح نے نصیحت بڑے زور شور سے اور ہنگامہ آرائی کے انداز میں کی۔

⑤

۱۔ **لغات :** بے محابا : بے تحاشہ
بے خوف، بے دھڑک۔

آتشِ خاموش کی مانند گویا بجل گیا
دل میں فودقِ دل دیا دیا تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں مدیم سے بھی پرے ہوں مرنے فافل بارہا

آتشِ خاموش : وہی ہوئی آگ
جو بظاہر بجھی ہوئی معلوم ہو، لیکن
اندرا اندر جل رہی ہو۔

تشریح : میرا دل اُس سوز سے
جل گیا، جو اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا
ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ وہ اُس آگ کی
طرح جل گیا، جو بظاہر اکے معلوم ہوتی
ہے، لیکن اندر اندر برابر جلتی رہتی ہے
”خاموش“ اور گویا ”کی مناسبت
ظاہر ہے۔“

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں مدیم سے بھی پرے ہوں مرنے فافل بارہا
میری آو آتشیں سے بالِ غنقا جل گیا
عرض کیجیے جو بہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صبر اچھل گیا

سوں نہیں تجھ کو دکھا تاور نہ داغوں کی بہا
 عشق کی آگ کا میں طریقہ کچھ علم عاشق
 اس چراغوں کا کروں کیا کار فرما بل گیا
 صبر و ضبط سے کام لیتا ہے اور آگ
 میں ہوں اور افسروگی کی آرزو غالب کو دل
 خفیہ خفیہ اس کا دل بھلائی رہتی ہے۔
 دیکھ کر طرزِ تپاک اہل دنیا بھل گیا
 ۲۔ شرح : دل میں وصل کا شوق
 اور محبوب کی یاد تک باقی نہ رہی۔ یہی
 اس کی سب سے بڑھ کر قسمی اور عزیز
 متاعِ حقیقی۔ گویا اس گھر میں ایسی آگ لگی کہ جو کچھ بھی اس میں تھا، سارے کا سارا بھل
 کر بھسم ہو گیا۔

کہا جاسکتا ہے کہ وہ عشق کیا ہوا، جس میں محبوب کی یاد اور وصل کا شوق، بھی
 سلامت نہ بچا۔ معلوم ہے کہ یہ دونوں چیزیں عشق کا مرکز اور نصب العین ہیں۔ اس
 سلسلے میں شعر کی دو تاویلیں ہو سکتی ہیں : اول نفسِ عشق کی فراوانی نے دل میں اتنا
 غلبہ حاصل کر لیا کہ محبوب کی یاد اور وصل کے شوق کے لیے گنہائش ہی باقی نہ رہی
 گویا دل سراپا عشق بن گیا۔ دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ محبوب کی مسلسل بے اعتنائی
 اور تنگ دلی سے عاشق کی مایوسی و نا اُمیدی آخری حد تک پہنچ گئی، جس کے بیان
 کے لیے عاشق کو زیادہ مؤثر صودت بھی نظر آئی کہ جو چیزیں عشق کی جان بھتی ہیں انہیں
 بھی موجدِ موم قرار دے لے۔ وہ کہتا یہ چاہتا ہے کہ مایوسی ایسی صورت اختیار کر چکی
 ہے، جس کے پیشِ نظر فوقِ وصل اور یاد یار کا وجود ہی مقل نظر نہ گیا ہے۔

۳۔ شرح : میں عدم سے بھی آگے نکل گیا، یعنی اس درجہ معدوم ہو گیا کہ
 عدم بھی میرے مقام کے تعلق میں وجود کی حیثیت رکھتا ہے، ورنہ جب تک عدم
 میں عالمِ فنا میں تھا تو بارگاہِ الہیہ ہوا کہ میرے دل میں آگ برسانے والی چراغِ اظہار
 حقیقی، اس سے عفتا کے پر بل جاتے تھے۔

کہا گیا ہے کہ غالب کے اس شعر کا مضمون ہمدردی کے مندرجہ ذیل غصے
 و تباہی ہے :

جوہر عنقا بے نیاز عرض ایسا دیم ما

یعنی آں سوسے دم یک عالم آبادیما

اس کا ترجمہ یہ ہے : ہم عنقا کی طرح اپنی ایجاد یعنی وجود پذیری کو پیش کرنے سے بے پردا ہیں۔ ہم دم سے آگے رہتے ہیں اور بجائے خود ایک آباد دنیا میں ظاہر ہے کہ دونوں شعروں میں اس کے سوا اشتراک کا کوئی پہلو نہیں کہ غالب کی طرح بتدل کے شعری بھی عنقا اور دم کے لفظ آئے ہیں۔

۴۔ لغات - جوہر اندیشہ : سوچ بچار اور خود و فکر کا جوہر۔ جوہر اس چیز کو کہتے ہیں جو قائم بالذات ہو۔ اس سے مراد مادے کا وہ ذوقہ لیتے ہیں جس کا تجزیہ نہ ہو سکے، اسی لیے اسے جزو لا تجزئی کہتے تھے، لیکن مسلم ہے کہ یہ نظریہ مدت ہوئی غلط ثابت ہو چکا ہے اور اب جوہر یعنی ایٹم کا تجزیہ کر کے ایسی قوت دریافت کر لی گئی ہے جسے بے پناہ مانا جاتا ہے۔ عجیب امر یہ ہے کہ غالب نے اس شعری جوہر کا یہی پہلو پیش نظر رکھا ہے۔

تشریح : میں سوچ بچار اور خود و فکر کے جوہر کی گری کہاں ظاہر کروں ؟ کس مقام پر دکھاؤں ؟ کیونکہ معرین بیان میں لاؤں ؟ صمدیت حال یہ ہے کہ وحشت کا خیال آئے ہی صوابل کرناک ہو گیا۔ وحشت میں صوابل گروی ہی پیش نظر تھی، مگر صوابل جوہر اندیشہ کی گری کا تصور بھی برداشت نہ کر سکا۔

آج جوہر یعنی ایٹم کی قوت مرزا کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے یعنی دعا تھی ہونک ہے کہ کوئی شے اس کا تصور بھی دماغ میں لے آئے تو جہل کرنا کستر ہو جائے۔

۵۔ لغات - چراغ خاں : بہت سے چراغ، لیکن اس لفظ کو چراغ کی جمع نہ سمجھنا چاہیے۔

کار فرما : حاکم، دوسروں سے کام لینے والا۔

تشریح : میرے پاس دل ہی نہیں رہا، ورنہ تمہیں دکھاتا کہ پہنے کے داغوں کی ببار کا کیا رنگ ہے۔ میں کیا کروں، داغوں کے ان بے شمار چراغوں کا انتظام

کرنے والا اور ان سے کام لینے والا ہی باقی نہیں رہا۔

شعر میں سینے کے داغوں کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے اور دل کو اس چراغاں کا منظم و کارفرما بتایا ہے۔

۶۔ لغات - امسردگی : پژمردگی، دل بجھ جانا۔

تپاک - محبت کی گرم جوشی۔ اضطراب - بے قراری۔ ہیاں - طرز تپاک سے مراد اہل دنیا کی منافقت اور ریاکاری ہے، جس کی وجہ سے دل بجھ گیا۔

شرح : اہل دنیا کا ریاکارانہ ہر ناتواں دیکھ کر دل اس طرح جل بھجا ہے کہ اسے غائب ! تمام آرزوئیں اور تمناؤں ختم ہو گئی ہیں۔ صرف امسردگی و پژمردگی کی آہ و بکا باقی رہ گئی ہے۔

امسردگی اور تپاک کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔



شوق بے ہر رنگ رقیب سرو سامان نکلا

۱۔ لغات - شوق : عشق۔

بہر رنگ : ہر حال اور ہر صورت میں۔ بہر طور۔

زخم نے داد دے دی تنگی دل کی، یارب

رقیب : دشمن۔ مخالفت۔

تیر بھی سینہ بسل سے پُرا نشان نکلا

شرح : - اس شعر کی شرح خود

مرزا غالب نے اپنے شاگرد عبدالرزاق

بُٹے گل، ناز و دل، دود چراغ محفل

شاکر وکیل گوکہ پور کو یوں نکھیستی :

جو نثری جرم سے نکلا سو پریشاں نکلا

- نقیب مین من لعل مین شوق سرو سامان

کاذم ہے دلوں کے کہ قیس ہر رنگ میں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد
یہ تھا قصوں کے پردے میں بھی نگاہِ بکارت۔ لطف
کلامِ یاقوتوں کا، بقدر لب و دندانِ نکلا
یہ ہے کہ چینوں کی تصویر باتیں بکلا

اب اس کی تصویر جانتے ہیں تو اس میں ہیں اس دہانے کو برہت ہی پیش کرتے ہیں۔
دلگ، تصویر، پردے اور عریاں کی مناسبت واضح ہے،

۲۔ لغات - داد نہ دینا : زائل نہ کرنا۔

پُر افشاں : پُر جھاڑا ہوا۔ تیر کی نوک یعنی پیکان کے دونوں جانب پر سے
لگے ہوتے تھے تاکہ تیر کمان سے نکلنے ہی سیدھا نشانے پر جا بیٹھے۔

شرح : اس شعر کی شرح کرتے ہوئے غائب شاہ کو لکھتے ہیں :
"یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے، جیسا کہ اس شعر میں :

نہیں زخمِ تیر کی راحت جو راحتِ پیکان

وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دگلا کھینچے

یعنی زخمِ تیر کی تو ہین بہ سبب ایک زخم نہ ہونے کے اور تھوڑے زخم کی
تحسین بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔ " زخم نے داد نہ دتی تھی دل

کی " یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پر افشاں، بہ معنی بیتاب اور یہ لفظ تیر کے
مناسب حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگی دل کی داد کیا دیتا، وہ تو خود

ضیقِ مقام سے گھبرا کر پر افشاں لہر لہرا رہا نہ نکل گیا۔

تیز کا زخم اتنا معمول تھا کہ اس سے دل کی تنگی زائل نہ ہو سکی اور اس میں کوڑ
خراش و کشادگی پیدا نہ ہوئی۔ اس کے برعکس مشاہدہ بتاتا ہے کہ تیر دل کی تنگی کے

بہت حد سے پہچانتا ہوا باہر نکل گیا اور جاتے جاتے اس کے پر ہی حیرت۔

۳۔ شرح :- پھول کی خوشبو، دل کی آہ و فغاں اور چراغ کا دھواں، ان

جگہ سے جو بھی چیز تری بزم سے نکلی، آشفۃ و پریشاں ہی نکلی۔

شاعر نے عاشق کی پریشانی ظاہر کرنے کے لیے تین چیزیں ہیں جو اصلاً مختلف تھیں، لیکن ان میں ایک خاصیت یعنی پریشانی مشترک پائی گئی اور تینوں کو محبوب کی بزم سے خاص تعلق تھا۔ اول پھولوں کی خوشبو جس کا خاصہ ہی پریشاں ہونا ہے، دوم عاشق کے دل کا نالہ، سوم چراغ کا دھواں، مطلب یہ ہے کہ محبوب کی بزم سے جو بھی چیز نکلتی ہے، یعنی محبوب سے جدا ہوتی ہے، وہ پریشاں ہی پائی جاتی ہے۔

مشک ان تین چیزوں کی خاصیت ہی پریشانی ہے۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ مرزا نے شعر میں بزمِ محبوب سے نکلنے کو ان کی پریشانی کا موجب قرار دیا۔

۴۔ لغات - مائتہ : دسترخوان

شرح : میرا دل حسرت کا مارا ہوا تھا اس کے دسترخوان پر لذتِ درد کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ دوستوں نے اپنے دانتوں اور لبوں کی حیثیت، یعنی اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق ان کھانوں سے فائدہ اٹھایا۔ میرے پاس لذتِ درد کے سامان کی کمی نہ تھی۔ اس میں سے دوستوں نے اپنی اپنی قابلیت کے مطابق استغنا وہ کیا۔

شاعریہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ میرے اشعار میں غم و درد کے سرمائے کی کوئی کمی نہیں، لیکن ہر مزدِ لپورا سرمایہ نہیں سمیٹ سکتا۔ جس شخص میں جتنی ہمت، تاباوت اور ذوق ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق میرے دسترخوانِ درد سے وہ حصہ پاتا ہے۔ فیض کا درد ازہ کسی کے لیے بند نہیں، مگر فیض ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق ملتا ہے :

دینے میں بادہِ ظرفِ قدرِ خوار و کبیر

حرف ہے ۔

شرح :- میری ہمت مشکل کاموں کو بہت پسند کرتی تھی ۔ اگرچہ اس نے فنا کا سبق دیا تھا ، پڑھنا شروع کیا تھا ، لیکن مصیبت یہ پیش آئی کہ مبتدی اور نوآموز ہونے کے باوجود اسے یہ کام بھی بہت آسان معلوم ہوا ۔

مطلب یہ ہے کہ شاعر نے اپنے لیے فنا کا کام اختیار کیا تھا ، جو اس کے نزدیک اس لیے پسندیدہ تھا کہ اس کی ہمت مشکل کاموں ہی کو دلی رغبت سے اختیار کرتی تھی ، لیکن یہ حدود پر کھٹن کام بھی اس کی ہمت کو آسان نظر آیا اور نوآموزی کے باوجود وہ فنا کی منزل طے کر گئی ۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میری ہمت کے لیے ، جو فنا کو معمولی سا کام سمجھتی ہے ، کوئی ایسا مشغلہ چاہیے ، جو فنا سے بھی بدرجہا زیادہ کھٹن ہو ۔

اس شعر کے بعض نسخوں میں "مٹی" کے بجائے "اے" اور "ہے" ہے جس سے مسنون پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ "مٹی" رکھا جائے یا "اے" یا "ہے" شاعر جس اولوالعزمی کا داعی ہے ، وہ تینوں صورتوں میں درست و واضح رہتی ہے ۔

۶۔ شرح :- اے غائب ! میں نے گریہ ضبط کر رکھا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کی حیثیت قطرے جتنی بھی نہیں ، لیکن اب از سبزو گریے میں جوش و خروش رونما ہوا تو واضح ہو گیا کہ جسے میں قطرے سے بھی کم سمجھتا تھا ، وہ تو یکسر طوفان ہے ۔



دھمکی میں مر گیا ، جو نہ باب نبرد تھا	عشق ببرد پیشہ طلبہ کا بے مرد تھا
تھا تندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا	اڑنے سے پیشتر بھی مرارنگ دروہا
تا یف نذر ہائے وفا کر رہا تھا میں	مجموعہ خیال ابھی فسر و فسر تھا

دل تاجگر، کوسا سہل دریا ئے فوں بے لب اس دہ گز میں جلوۂ گل، آگئے گود تھا

جانی ہے کوئی، کشتکش اندوہ عشق کی دل بھی لگ گیا، تو وہی دل کا درد تھا

احباب پارہ سازی وحشت نہ کر سکے زنداں ہیں بھی خیال، سیابان نورو تھا

یہ لاش بے کفن اسیرِ غمتہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۱۔ لغات - باب نبرد : جنگ کے لائق، مقابلے کی صلاحیت رکھنے والا بہادر - جوانمرد۔

نبرد پیشہ : جنگجو، جس کا پیشہ جنگ ہو۔

شرح : جو شخص بہادر اور مرد میدان نہ تھا، وہ عشق کی سختیوں اور

مصیبتوں کے سیل کا صرغ خطرہ دیکھ کر دم توڑ بیٹھا۔ عشق کا پیشہ ہی جنگ و پیکار

ہے۔ اس کی مصیبتیں اور آفتیں وہی سہہ سکتا ہے، جو مرد کار ہو، یعنی جس میں

زیادہ سے زیادہ ہمت، مردانگی اور مصیبتوں کے مقابلے میں استقلال سے قدم

جمانے رکھنے کا جو ہر موجود ہو۔ تھکڑے آدمیوں کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ

میدانِ عشق میں قدم رکھیں۔

عراقی کا ایک مطلع ہے جس میں بھی یہی حقیقت پیش کی گئی ہے، اگرچہ انداز

مختلف ہے :

عشق اگر مرد است، مردے تاپ دیدار آورد

وہ نہ چوں موسیٰ ہے آورد بسیار آورد

۲۔ شرح :- مجھ پر زندگی بھروسہ کا خوف طاری رہا اور خوف کے باعث

انسان کا رنگ اصل حالت پر نہیں رہتا، اس میں زردی آجاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ

مرنے کے ساتھ چہرے پر جو زردی اور مڑنی چھا جاتی ہے، اس سے پہلے بھی میرا

ملوث ہے ۔

شرح :- میری بہت مشکل کاموں کو بہت پسند کرتی تھی ۔ اگرچہ اس نے فنا کا سبق دیا تھا پڑھنا شروع کیا تھا ، لیکن مصیبت یہ پیش آئی کہ مبتدی اور نوآموز ہونے کے باوجود اسے یہ کام بھی بہت آسان معلوم ہوا ۔

مطلب یہ ہے کہ شاعر نے اپنے لیے فنا کا کام اختیار کیا تھا ، جو اس کے نزدیک اس لیے پسندیدہ تھا کہ اس کی بہت مشکل کاموں ہی کو دلی رغبت سے اختیار کرتی تھی ، لیکن یہ حدود پر کٹھن کام بھی اس کی بہت کو آسان نظر آیا اور نوآموزی کے باوجود وہ فنا کی منزل طے کر گئی ۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میری بہت کے لیے جو فنا کو معمولی سا کام سمجھتی ہے ، کوئی ایسا مشغلہ چاہیے ، جو فنا سے بھی بدجہا زیادہ کٹھن ہو ۔

اس شعر کے بعض نسخوں میں "تھی" کہ جگہ "اے" اور "ہے" ہے جس سے مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ "تھی" دکھا جائے یا "اے" یا "ہے" شاعر جس ادوار الغزلی کا داعی ہے ، وہ تینوں صورتوں میں بدستور واضح رہتی ہے ۔

۶۔ شرح :- اے غالب ! میں نے گریہ ضبط کر رکھا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کی حیثیت قطر سے جتنی بھی نہیں ، لیکن اب از سر نو گریہ میں جوش و خروش رونما ہوا تو واضح ہو گیا کہ جسے میں قطر سے بھی کم سمجھتا تھا وہ تو یکسر طوفان ہے ۔



دھمکی میں مر گیا ، جونہ بابِ نبرد تھا	عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا نندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا	اڑنے سے شیر بھی مرانگ دردھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں	مجھ کو خیال ابھی فردِ فرد تھا

دل تاجگر کہ ساحلِ دریائے نخل ہے اب اس رہ گزریں جلوۂ گل، آگئے گم و گھٹا
 جاتی ہے کوئی ہکشمکش اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
 احباب چارہ سازیِ وحشت ذکر کے زنداں ہیں بھی خیال، سیابانِ نور و تھا
 یہ لاشِ بے کفن اسیدِ خستہ جاں کی ہے حقِ مغفرت کرے عجب آزادِ مرد تھا!
 ۱۔ لغات - بابِ نبرد : جنگ کے لائق، مقابلے کی صلاحیت رکھنے والا۔
 مآذ - جو انزو۔

نبردِ پیشہ : جنگ، جس کا پیشہ جنگ ہو۔

شرح : جو شخص بہادر اور مرد میدان نہ تھا، وہ عشق کی سختیوں اور
 مصیبتوں کے سبب کامرتِ خطرہ دیکھ کر دم توڑ بیٹھا۔ عشق کا پیشہ ہی جنگ و پیکار
 ہے۔ اس کی مصیبتیں اور آفتیں وہی سہہ سکتا ہے، جو مردِ کار ہو، یعنی جس میں
 زیادہ سے زیادہ ہمت، مردانگی اور مصیبتوں کے مقابلے میں استقلال سے قدم
 جمائے رکھنے کا جو ہر موجود ہو۔ تھڑ دے آدمیوں کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ
 میدانِ عشق میں قدم رکھیں۔

عربی کا ایک مطلع ہے جس میں یہی حقیقت پیش کی گئی ہے، اگرچہ انداز
 مختلف ہے :

عشق اگر مردِ است، مردے تاپ دیدارِ آرد
 دردِ چوں ہوئی بے آرد و بسیارِ آرد

۲۔ شرح :- مجھ پر زندگی بھر موت کا خوف طاری رہا اور موت کے باعث
 انسانِ کارنگ اصل حالت پر نہیں رہتا، اس میں زردی آجاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ
 مرنے کے ساتھ چہرے پر زردی اور مڑی چھا جاتی ہے، اس سے پہلے ہی میرا

بے درد ہی تھا، جو موت کے خوف سے پیدا ہوا تھا۔ خوف یہ کہ زندگی جیسی گزرائی جا بیٹھے تھی، نہ گزری۔ خدا جانے مرنے کے بعد کیا حالت پیش آئے اور کبھی گزرے۔
شعریں جو لفظی مناہنیں ہیں، وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

۳۔ لغات - تالیف : جمع کرنا - ترتیب دینا -

شرح :- جب میرے خیالات کا شیرازہ کبھرا ہوا تھا اور انکار کے اوراق
تشریح تھے۔ یعنی میں طفلی کے عالم میں تھا۔ معلوم ہے کہ طفلی کی حالت میں انسان کے
خیالات و انکار اکٹھے نہیں ہوتے، جیسے پختگی کی منزل پر پہنچ جانے کے ساتھ
اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ میں اس زمانے میں بھی وفا کی کتابیں مرتب کر رہا تھا۔ گویا
دور طفلی میں بھی مجھے عشق ہی سے دلچسپی تھی اور اس زمانے میں بھی پختہ کار عاشقوں
کی سی حیثیت حاصل تھی۔

۴۔ لغات - گرد تھا : بے حقیقت تھا - بیچ تھا -

شرح :- اب دل سے جگر تک خون کے دریا کا کنارہ بنا ہوا ہے۔ اس
راستے میں پہلے پھولوں کا جلوہ بھی بے حقیقت اور بے حیثیت معلوم ہوتا تھا یا یہ
کہ ہر راستے میں گرد و غبار ہوتا ہے۔ اس راستے میں پہلے پھولوں کے جلوے کو
گرد و غبار کی حیثیت حاصل تھی۔

دریائے خون کے بجائے ساحل دریائے خوں لانے سے بظاہر یہ مقصود ہے
کہ دل اور جگر دونوں خون ہوئے اور اس خون نے ایک دریا کی حیثیت حاصل کر
لی۔ خوں بہ چکا، اب صرف ساحل باقی رہ گیا ہے۔ اس سے اس مقام کی بے رونقی
اور ویرانی نمایاں ہوتی ہے۔

شعر کا مضمون یہ ہے کہ جہاں اب جانکا ہی اور جاگر گدازی کے سوا کچھ نظر
نہیں آتا، وہاں پیشتر عیش و نشاط کی بہترین بہار چھائی ہوئی تھی۔

۵۔ شرح - عاشق کو غم عشق کی کشمکش سے کبھی نجات نہیں ملتی اگر دل
پہلو سے نیل بھی گیا ہو تو اس کا نکل جانا ہی دل کا درد بن جاتا ہے۔ یعنی جب تک

دل پہنوس تھا، وہی غم و اندوہ کا مرکز تھا۔ دل چاہا تو اس کے جانے کا غم شروع ہو گیا ہے غرض کسی بھی صورت میں غم کی کھینچا تانی سے غلصہ نہیں ملتی۔

۶۔ لغات۔ چارہ سازی : علاج۔ دوا۔

بیابان نورد : صحرائیں آوارہ پھرنے والا۔

شرح :۔ دوست اور ہمدرد میری وحشت کی حالت میں علاج کی کوئی تدبیر نہ کر سکے۔ ان کے بس میں صرف یہ تھا کہ مجھے قید کر دیتے تاکہ بہ حالت دیوانگی باہر نکل کر بیابان میں فریج جاتا، اس طرح انہوں نے میرا جسم توقید میں ڈال دیا، لیکن میرا خیال برابر بیابان نوردی میں مصروف رہا۔

ظاہر ہے کہ وحشت و دیوانگی کا علاج محض جسم کو قید خانے میں ڈالنے سے نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ خیالات سے بھی وحشت دور کی جائے۔ مرزا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک تدبیر تو دوستوں نے کر لی، مگر دوسری کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔

۷۔ شرح :۔ یہ فحش، جسے کفن نصیب نہیں ہوا، اسد کی ہے پریشان حال تھا، اور جس کی جان زخموں سے چور تھی۔ اللہ تعالیٰ اسے بخشنے، وہ بڑا آزاد انسان تھا۔



۱۔ لغات۔ مُبْجَح : تیس۔ ۱۰

مرغوب : جس کی طرف رغبت ہو پسندیدہ

شرح :۔ ہمارے محبوب کو، جسے مشکل کام پسند ہی تیس پھرنے سے بھی رغبت ہے۔ اس طرح اسے سول ایک

شمارِ مبجَح، مرغوب بُتِ مشکل پسند آیا

تماشا مے بیک کُن بُرونِ صدولِ منڈا یا

پنضِ بے دلی، نو میدی جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا

ہی مرتبہ منشی میں لے لینے کا قاتل اپنا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اس کی تیج خوانی درود و تحفہ کے لیے نہیں، بلکہ وہ ٹوسو دل ایک ہی مرتبہ قبضے میں لے لینے کی مشق کرتا ہے۔
 ہوائے سیر گل، آئینہ بے ہرنی قاتل کہ اندازہ بخوں غلطیوں پہل پسند آیا
 جراحت تحفہ، الماس ارغماں، داغ بگرہ مبارک باد اسد غنوار جان درود مند آیا
 تیج کے سوداے ہوتے ہیں۔

محبوب کے ہاتھ میں تیج دیکھ کر دل باغیہ شاعر کو بہ خیال ہو ا کہ محبوب ٹوسو دل منشی میں لے رہا ہے۔
 لیکن اصحاب نے لکھا ہے کہ مرزا کا یہ شعر غنی کاشمیری کے شعر ذیل سے ماخوذ ہے۔

ہر گوشہ میں مدد از منقری تیج می آید
 کہ مدد مل مضطرب گردد چونیک دل یابد آرامی
 یعنی امام تیج سے یہ آواز منیرے کان میں آرہی ہے کہ ٹوسو دل پریشانی کا تحفہ مشق جنتے ہیں تو ایک دل کو آرام نصیب ہوتا ہے۔
 غنی کے پیش نظر یہ حقیقت ہے کہ تیج خوانی میں امام شامل نہیں ہوتا۔ سوداؤں پر ہاتھ پھرتا جاتا ہے اور امام الگ رہتا ہے۔ اس سے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ ٹوسو دلوں کے پریشان ہونے کے بعد ایک دل آرام پاتا ہے۔
 ظاہر ہے کہ دونوں شعروں میں ”مدد“ اور ”تیج“ کے لفظوں کے سوا کوئی وجہ اشتراک نہیں۔

۲۔ لغات - بیدلی : عاشقی، اندوگی، مایوسی

شرح - بیدلی کی برکت سے غم اتنے بے نیاز ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے ہمیشہ کی مایوسی و ناامیدی بھی سہل ہو گئی ہے اور اس کا برداشت کر لیا کہ ہر گ مشکل نہیں۔ کشائش یعنی عقدے سمجھانے کی صلاحیت کو ہمارا مشکل عقدہ بند آگیا ہے۔

اور وہ نہیں چاہتی کہ یہ عقدہ کھلے۔ وہ جس حالت میں ہے، ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا، کثود کار کی نوبت نہ آئے گی۔

۳۔ لغات - ہوا : آرزو - خواہش

یہ خون غلطیدن : خون میں لوٹنا، تڑپنا، است پت ہونا۔

شرح :- ہمارے قافل (محبوب) نے پھولوں کی سیر کے لیے خواہش کی

ہے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا مقصد تفریح ہے، بلکہ اسے خون میں سہلوں کے لوٹنے اور تڑپنے کا سماں پسند ہے۔ یہ خواہش اس کی بیدردی اور سنگدلی کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

پھولوں کے تختے میں نسیم پھرتی ہے تو سرخ سرخ پھول بنے لگتے ہیں۔ شاعر نے یہ منظر دیکھا تو اُسے یاد آگیا کہ سہل بھی خون میں اسی طرح لوٹا اور تڑپا کرتے ہیں چنانچہ اس نے سمجھ لیا کہ محبوب کے پیش نظر پھولوں کی سیر نہیں، بلکہ سہلوں کے تڑپنے اور لوٹنے کا نظارہ ہے، جو اُسے بہت پسند ہے اور یہی اس کی بے ہری کا ثبوت ہے۔

۴۔ لغات - جراحت : زخم

ارمغاں : تحفہ

شرح :- اے اسد! مبارک ہو کہ تیری دکھی جان کے لیے عشق ایسے

تحفے لایا ہے، جو اس کی غم خواری کریں گے۔ مثلاً زخم، الماس، جس سے زخم بڑھتے ہیں، جگر کے دارغ۔

یہ تمام چیزیں تکلیف و اذیت کا باعث ہیں اور درد مند جان کے لیے یہی موزوں تحفے ہو سکتے تھے، اس لیے شاعر نے اپنے آپ کو مبارک باد دی۔ یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ شعر بطور طنز کہا گیا ہے۔

دوسری نقش وفا و جبر تلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
 سبزہ خط سے ترا کا کل سرکش نہ دبا یہ زمرہ بھی حریف دم افنی نہ ہوا
 میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوڑ دے وہ سنگ مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
 دل گزر گا وہ خیال سے دسا غریبی سہی گریں جادو سے مر منزل تقویٰ نہ ہوا
 ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کچھ گوش منت کش گلبا نگب تلی نہ ہوا
 بس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجئے ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں اسودہ بھی نہ ہوا
 مر گیا صد نہ یک جنبش لب سے غالب ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا
 ۱۔ لغات و نقش : تحریر نام و نشان - تویذ - تصویر - یہاں بظاہر مراد
 نام و نشان ہے۔

شرمندہ معنی ہونا : معنی کی شرمندگی اٹھانا یا معنی ہونا۔

شرح : زمانے میں وفا کا نقش دل کے لیے تلی اور اطمینان کا باعث نہ ہوا۔ یہ تو ایسا لفظ معلوم ہوتا ہے جس کے کوئی معنی نہیں، بلکہ سراسر مہمل ہے۔ لفظ "وفا" کا تذکرہ زبانوں پر تو بہت ہے، مگر تین حرفوں کے اس مجبورے سے کسی کو اس وقت تک کیا تسکین ہو سکتی ہے جب تک اس کی حقیقت اور معنویت پر عمل نہ ہوا، یعنی لوگ وفا کا عملی مظاہرہ نہ کریں۔ اگر یہ ممکن نہیں تو یہ لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا اور بے وجہ زبانوں پر جاری رہتا ہے۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ آج زمانے میں وفا کی عملی تصویر کہیں نظر نہیں آتی، لوگ حرف ریاکاری سے یہ لفظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ غالب نے حسین بیان سے اس مضمون میں ایک خاص شان پیدا کر دی۔ سعدی نے یہی مضمون دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔

یا وفا خود نمود در عالم
یا کسے اندر میں زمانہ نکر دو

یعنی یا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں وفا کا وجود ہی نہ تھا یا ہمارے زمانے میں کسی نے اس پر عمل نہیں کیا۔ سعدیؒ نے دو صورتیں پیش نظر رکھیں، یعنی یا تو وفا جتنی ہی نہیں یا ہمارے زمانے میں ثابت ہو گئی۔ غالب کا بیان یہ ہے کہ وفا کا لفظ تو موجود ہے، مگر اس کی حقیقت گم ہے اور یہی حقیقت ہے۔

۲۔ لغات۔ کاکل : سر کے وہ بال جو دونوں جانب آگے کی طرف نکلے ہوتے ہیں۔ اس کی صفت سرکش قابل توجہ ہے۔

زمرود : ازام اور رقیوں پر پیش اور پر تشدید، بیش قیمت پتھروں میں سے ایک جس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ اسی لیے شعر میں اسے سبزۂ خط سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض اساتذہ نے رک کو مفتوح بھی باندا ہے۔
حرلیت : تہ مقابل۔ دشمن۔

افعی : کالا سانپ، جو بہت زہر مالا اور موزی ہوتا ہے۔ اسے کاکل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

شرح : اسے محبوب ! تیرا سبزۂ خط کاکل کو دبا نہ سکا، یعنی اس پر کچھ اثر نہ ڈال سکا اور اسے پیچھے نہ ہٹا سکا۔ اگرچہ اس کی حیثیت زمرود کی تھی، مگر یہ زمرود کا لے اور موزی سانپ کی پھینکار کا تہ مقابل نہ ہوا۔

شعر کا مضمون فارسی اور اردو ادب کی اس مشہور عام روایت پر مبنی ہے کہ زمرود کو دیکھ کر افعی سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ خود مرزا غالب صاحب عالم مارہروی کو کف الخضیب کے سلسلے میں قبول دعا کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ :

”مبغلوہ مصفا میں شغری ہے، جیسے کتان کا پر تو باہ میں پھٹ جانا اور

زمرود سے انٹی کا اندھا ہو جاتا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کے

منگوا یا اور قطعات زمرود اس کے مادی چشم رکھتے۔ اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔

ایران و روم و فرنگ سے انواع انواع کے کپڑے منگوائے چاندنی
میں پھیلائے، کوئی مسکا بھی نہیں۔

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے چہرے پر خطِ نکل آنے سے کامل کی
دلکشی دو آؤ پڑی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۳۔ شرح :- میں نے چاہا تھا کہ مر جاؤں اور اس طرح دنیا کے غم و درد
اور مصیبتوں سے سہات حاصل کر لوں اور وفاداری کے تقاضوں کو پورا کرنا نہایت
پریشانی اور کوفت کا باعث ہے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ محبوب کا پیشہ ہی علمِ نجوم
اور جود و جفا ہو، لیکن ظالم محبوب میرے مرنے پر بھی راضی نہ ہوا اور مجھے و فنا
کے رنج و غم سے غلصہ نہ مل سکی۔

شعر کا یہ پہلو خاص توجہ کا محتاج ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے جود و جفا کے
باد جود و فنا کے تقاضے پورے کر رہا ہے۔ جب وہ سمجھتا ہے کہ تقاضے پورے
کرنا ناقابلِ برداشت مصیبتوں کا سامان ہے اور ان سے رہائی پانا چاہتا ہے تو
اس حالت میں بھی اپنی خواہش پر محبوب کی رضا کو ترجیح دیتا ہے۔ یہی سچے عاشق
کا خاصہ ہے۔ محبوب عاشق کے مرنے پر غالباً اس لیے راضی نہ ہوا کہ یہ امر اس
کی بدنامی کا باعث تھا۔

۴۔ لغات - جادہ : راستہ - پگڈنڈی۔

تقویٰ : جسے شاعر نے ایرانیوں کے طریقے کے مطابق تقویٰ باندھا
ہے (مثلاً حبشی، بیسی، میل، بیلن) پر سیزگاری۔

شرح :- میرا دل شراب اور پیالے کے خیالات کی گزرگاہ ہی نہیں
اگر میرا سانس پر سیزگاری کی منزل کے لیے پگڈنڈی نہ بن سکتا تو کچھ مضائقہ نہیں۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر مجھے پر سیزگاری نصیب نہیں تو زندگی اور سانس
ہی ہوا ہوا ہواں میں سے ایک حالت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ نہ
لکھی ہو، نہ لکھو گاری۔

۵۔ لغات - منت کش : احسان اٹھانے والا۔ مہزون

گلبانگ : قلندروں اور شاطروں کی آواز۔ بیل کی آواز۔ اچھی آواز اور خوشخبری۔ وہ شور، جو خوشی کے موقع پر لوگوں میں اٹھتا ہے۔ مطلق آواز کے معنی میں مستقل ہے۔

شرح : اے محبوب! تو نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا۔ میں اس پر بھی راضی ہوں، کیونکہ میرے کان نے تسلی کی اس اچھی آواز کا احسان نہ اٹھایا۔ مطلب یہ ہے کہ تو وعدہ کر ہی لیتا تو اس کے پورا ہونے کی کوئی امید نہ تھی کیونکہ تیرا شیوہ یہی ہے کہ وعدے پورے نہ کیے جائیں۔ وعدہ نہ کرنے سے اتنا تو فائدہ ہوا کہ کان احسان سے محفوظ رہے۔ محبوب کا وعدہ کر لینا عمل دیا ہی تھا، جیسا وعدہ نہ کرنا۔

۶۔ شرح :۔ میں خوش نصیبی سے اس درجہ محروم ہوں کہ اس دنیا میں جس خواہش کے لیے شاید ہی کوئی تیار ہو، یعنی مرجانا، میں اس کے لیے بھی تیار تھا، لیکن یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی، یعنی مرنا بھی تیسرے آسکا۔ یہ محرومی دنیا کی انتہا ہے، مگر شکایت کس سے کی جائے؟ فریاد لے کر کس کے پاس جائیں؟

۷۔ لغات - جنبش لب : لب ہلانا۔ دم عیسیٰ : حضرت عیسیٰ کا دم یعنی تم باذن اللہ (اللہ کے حکم سے اٹھ) کہنا جس سے مردے زندہ ہو جاتے تھے۔

شرح :۔ غالب اس قدر ناتوان، ضعیف اور کمزور تھا کہ حضرت عیسیٰ نے معجزہ تم باذن اللہ سے کام لیتا چاہا۔ آپ کے لب ہلے تو اسی حد سے غریب غالب کی جان نکل گئی۔

ناتوانی اور ضعف کی انتہا ہے کہ زندگی بچھٹنے والا اعجاز ہی موت کا باعث بن گیا۔

۱۔ لغات ۔ ستائش گر :

تعریف کرنے والا ۔ مآج ۔

باغِ رضواں : داروغہ

بہشت کا باغ یعنی بہشت ۔

طاقِ نسیاں : وہ طاق ،

جس میں انسان کچھ رکھ کر بھول

جاتے ۔

شرح : ۔ زاہد جس

بہشت کی اس قدر تعریف کر دیا

ہے ، ہم بخودوں کے نزدیک

اس کی حیثیت صرف اتنی ہے ،

جیسے ایک گلدستہ ہو اور اسے

طاق پر رکھ کر بھول جائیں ۔

مولانا مآلی فرماتے ہیں کہ

”بہشت کو بخودوں کے گلدستہ

طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل

ایک زالی تشبیہ ہے ۔ جو کہیں

نہیں دیکھی گئی “ فارسی میں بھی

مرزا غالب نے جنت کو نقشِ نگار

طاقِ نسیاں کہا ہے :

رنگِ باچوں شد فراموشِ دیگر داشت

نقدِ نقشِ نگارِ طاقِ نسیاں کردہ ایم

غالب نے بہشت کو گلدستہ

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بخودوں کے طاقِ نسیاں کا

میاں کیا کیجیے بیدار کاوش ہائے مڑگاں کا

کہ ہر اک قطرہٴ مخوں دانہ ہے تیجِ مرجاں کا

د آئی سطوتِ قاتل بھی مانعِ میرے نالوں کو

بیا دانتوں میں جو تنکا ، ہوا ریشہٴ غیبتاں کا

دکھاؤں گا تماشا ، وہی اگر فرصت زمانے نے

مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہٴ تیرے جلوے نے

کرے جو پر تو خود شہیدِ عالمِ شہنشاہ کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورتِ خوابی کی

بیوٹی برقی خرم کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سوسنہ ، ویرانی تماشا کر

مدارِ آبِ کھوونے پر گھاس کے ہے میرے بیدار کا

خموشی میں منہاں خوں گشتہٴ لاکھوں آرزوئیں ہیں

چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گویاں کا

منور اک پر تو نقشِ خیالِ یار باقی ہے !
 دلِ افسردہ گویا تجڑہ ہے یوسف کے نڈاں کا
 بغل میں غیر کی آپ آج سوئے ہیں کہیں وہ
 سبب کیا بخواب میں اگر قسم اٹھائے نہیں کا
 نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
 قیامت ہے سرشک آلودہ ہو تا تیری شرکاک
 نظر میں ہے ہمارا ہی جادو راہِ فنا غالب
 کہ پر شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

طابقِ نسیاں کہہ کر حسنِ تشبیہ اور حسنِ بیان
 ہی کے کمالات نہیں دکھائے، بلکہ
 اجزائے اعمال کے متعلق اپنا فلسفہ
 بھی پیش کر دیا ہے۔ وہ یہ حقیقت
 واضح کرنا چاہتا ہے کہ ہم بخود اور
 خدمات اپنے اعمال کی جزا کے لیے
 بہشت کے خواہاں نہیں، ہم تو بہشت
 کی یاد ہی دل سے نکال چکے ہیں، اور
 اسے گلدستہ طابقِ نسیاں بنا چکے ہیں
 ہمارے پیش نظر ہر نعمتِ خدا کی رضا اور
 اس کے حکموں کی تعمیل ہے چنانچہ
 وہ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

طاقت میں تار ہے دے وا گلیں کی لاگ

دورخ میں ڈال دو کوئی سے کر بہشت کو

۲۔ لغات - مرجان : مولانا سمندر میں خاص قسم کے کیڑے مارا جاتا ہے اپنے لیے گھر بناتے ہیں جو سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ گھر وسیع چٹانوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جو شاخ و درشاخ دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگ مونگے کو جہادات و نباتات میں ایک انصافی کڑی سمجھتے تھے یعنی مونگے میں جہادات نے پہلے پہل نباتات کی شکل اختیار کی، چنانچہ وہ جہادیت سے بھی ملتا ہے، کیونکہ پتھر ہوتا ہے اور اس میں نباتات کی بھی خاصیت ہے، کیونکہ بڑھتا اور پھیلتا ہے۔

شرح :- محبوب کی پکوں نے سوئی بن کر دل میں کاوشوں کا ایک ایسا ہنگامہ
 بپا کر یا کہ ہر قطرہ خون کو چھید ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے جسم کا ایک ایک قطرہ غوی

موتگی کی تسبیح کا دائرہ بن گیا۔ چھیدنے کے لیے جامد جسم درکار ہے۔ لیکن مژگاں پیلید کی کاوش کا کمال یہ ہے کہ اس نے سیال قطروں میں سودا رخ کر دیے۔ کاوش کا ایسا نقشہ اور کہیں نظر نہیں آ سکتا۔

۳۔ لغات۔ سطوت : رعب۔ دہرہ

دانتوں میں تنکا لینا : زمانہ ماضی میں عجز کا اظہار کرنے کے لیے دانتوں میں تنکا لیا جاتا تھا، فارسی میں اسے "خس بود، نداں گرفتن" کہتے ہیں۔
نعمیتاں : سرکنڈے، بانس اور نرکل کا جنگل۔ بانس اور نرکل سے بانسری اور نئے بنتی ہیں، جن سے فٹے اور تالے نکلتے ہیں۔

مشرح : قاتل کا رعب اور دہرہ مجھے آہ و فغاں سے روک نہ سکا۔ میں نے اظہار عجز کے لیے جو تنکا اٹھا کر دانتوں میں دبایا، وہ بانس اور نرکل کے جنگل کا ریشہ بن گیا۔ یعنی اس سے نعمیتاں پیدا ہوئی، نعمیتاں سے نئے بنی۔ گویا اظہار عجز ہی کی تدبیر میرے لیے نادر و فغاں کا سامان بن گئی۔

قاتل یعنی محبوب چاہتا تھا کہ مجھے نالوں سے روکے۔ میں نے خود بھی عاجزی اختیار کرنی چاہی۔ وہی عاجزی نالوں کی کثرت کا ذریعہ بن گئی۔

۴۔ لغات۔ سرو چراغاں : چل چراغ۔ وہ جھانڈ جس میں بہت سے چراغ جلتے ہوں۔ پاک و ہند میں لکڑی یا دعوات سے سرو جیسی ٹیک چمیز بناتے تھے جس میں بے شمار چراغ جلانے کا انتظام کریتے تھے۔

مشرح :۔ اگر بچے زمانے نے مہلت دے دی تو میں ایسا تماشا دکھاؤں گا جو ہمیشہ یادگار رہے، کیونکہ میرے دل کا ہر داغ سرو چراغاں کا ایک بیج ہے۔

بے شمار دانتوں سے بے شمار سرو چراغاں پیدا ہو جائیں گے اور ان سب پر ہر کثرت چراغ جلتے لگیں گے تو واقعی ایک نادر منظر سامنے آ جائے گا۔

شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جنونِ عشق کی افزائش کا اظہار کیا ہے، کیونکہ ہر داغ دل میں سرو چراغاں کی نو ثابت کی ہے۔

۵۔ لغات۔ آئینہ خانہ : شیش محل۔ وہ گھر جس میں ہر طرف رنگ رنگ آئینے لگے ہوئے ہوں۔

شبستان : وہ مقام جہاں سبزے اور پودوں پر بہ کثرت شبنم پڑی ہوئی ہو۔

شرح :- اسے محبوب ! تیرے جلوۂ حسن نے آئینہ خانے میں وہی شان اور وہی کیفیت پیدا کر دی ہے، جو سورج کی شاعروں کے نور سے شبستان پر طاری ہو جاتی ہے۔

اس شعر کی حقیقی حیثیت کا اندازہ مشاہدے سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کو اٹھے اور کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیے، جہاں سبزے کا فرش ہو۔ ہا، ہجا پھولوں کی کیریاں ہوں اور ان پر خوب شبنم پڑی ہوئی ہو۔ جیسا کہ سر میں پڑتی ہے۔ پھر سورج نکلے اس کی شامیں شبنم کے قطروں پر پڑیں تو ہر قطرہ ایک چھوٹا سا قطرہ نظر آئے گا۔ جس میں چراغ کی سی روشنی ہوگی۔ آپ مختلف زاویوں سے دیکھیں گے تو ہر قطرے میں نور کے مختلف رنگوں کا جلوہ دکھائی دے گا۔ آپ دیکھتے جائیں ایسی بہار آپ کے سامنے ہوگی، جس کا نقشہ لفظوں میں نہیں کھینچا جاسکتا۔

شاعر کہتا ہے کہ اسے محبوب ! یہی کیفیت آئینہ خانے میں تیرے جلوے نے پیدا کر دی۔

واضح رہے کہ شعر میں غائب نے یہی مشاہدہ پیش کیا ہے۔ اسے سورج کے نکلنے پر شبنم کے اڑ جانے یا آئینے کا پانی خشک ہو جانے سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لغات۔ مضمحل : چھپا ہوا۔ پوشیدہ۔

ہمیولی : ہرادی چیز کی اصل مادی جسموں کی صورت حال ہے اور ہمیولی اس کا محل ہے۔

شرح :- میری آبادی اور بناوٹ ہی میں خرابی اور بربادی کی ایک صورت موجود ہے۔ لیکن کا خون محنت و مشقت میں گرم ہوتا ہے۔ وہی گرمی ایک مادہ ہے

موت کے کی قبیح کا دائرہ بن گیا۔ چھیدنے کے لیے ہاؤ جسم دو کا رہا ہے۔ لیکن مڑکا ہوا
کی کاوش کا کمال یہ ہے کہ اس نے سیال قطروں میں سوراخ کر دیے۔ کاوش کا ایسا
نقشہ اور کہیں نظر نہیں آ سکتا۔

۳۔ لغات۔ سطوت : رعب۔ دبدبہ

دانتوں میں ترنگا لینا : ناز و ماضی میں جھڑکا اظہار کرنے کے لیے دانتوں
میں ترنگا لیا جاتا تھا، فارسی میں اسے "خس بد ونداں گرافتن" کہتے ہیں۔
نمیستان : سرکنڈے، ہانسی اور نرگل کا جنگل۔ ہانسی اور نرگل سے بانسری
اور نئے بنتی ہیں، جن سے فغے اور تالے نکلتے ہیں۔

شرح : قاتل کا رعب اور دبدبہ مجھے آہ و فغاں سے روک نہ سکا۔ میں
نے اظہار جہز کے لیے جو ترنگا اٹھا کر دانتوں میں دبایا، وہ ہانسی اور نرگل کے جنگل کا ریشہ
بن گیا۔ یعنی اس سے نمیستان پیدا ہوا، نمیستان سے نئے بنی۔ گویا اظہار جہز ہی کی
تدبیر میرے لیے تالہ و فغاں کا سامان بن گئی۔

قاتل میں محبوب چاہتا تھا کہ مجھے ناؤں سے روکے۔ میں نے خود بھی عاجزی
استیاء کرنی چاہی۔ وہی عاجزی ناؤں کی کثرت کا ذریعہ بن گئی۔

۴۔ لغات۔ سرو چراغاں : چل چراغ۔ وہ جھانڈ جس میں بہت سے
چراغ جلنے ہوں۔ پاک و ہند میں لکڑی یا دھات سے سرو جیسی ایک چیز بنائیے تھے
جس میں بے شمار چراغ جلانے کا انتظام کریتے تھے۔

شرح :۔ اگر مجھے زمانے نے بہت دے دی تو میں ایسا تماشا دکھاؤں گا
جو ہمیشہ یادگار رہے، کیونکہ میرے دل کا ہر داغ سرو چراغاں کا ایک بیج ہے۔

بے شمار داغوں سے بے شمار سرو چراغاں پیدا ہو جائیں گے اور ان سب پر
بکثرت چراغ جلنے لگیں گے تو واقعی ایک تاور منظر سامنے آجائے گا۔

شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جنون عشق کی افزائش کا اظہار کیا ہے، کیونکہ
ہر داغ دل میں سرو چراغاں کی نو ثابت کی ہے۔

۵۔ لغات۔ آئینہ خانہ : شیش محل۔ وہ گھر جس میں سہرط رنگ رنگ آئینے لگے ہوئے ہوں۔

شبستان : وہ مقام جہاں سبزے اور پودوں پر بہ کثرت شبنم پڑی ہوئی ہو۔

شرح :۔ اے محبوب ! تیرے جلوہ حسن نے آئینہ خانے میں وہی شان اور وہی کیفیت پیدا کر دی ہے، جو سورج کی شاعروں کے نور سے شبستان پر طاری ہو جاتی ہے۔

اس شعر کی حقیقی حیثیت کا اندازہ مشاہدے سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کو اُٹھے اور کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیے، جہاں سبزے کا فرش ہو۔ جا بجا پھولوں کی کھالیاں ہوں اور ان پر خوب شبنم پڑی ہوئی ہو۔ جیسا کہ سر میں پڑتی ہے۔ پھر سورج نکلے اس کی شاہیں شبنم کے قطرہوں پر پڑیں تو ہر قطرہ ایک چھوٹا سا قطرہ نظر آئے گا۔ جس میں چراغ کی سی روشنی ہوگی۔ آپ مختلف زاویوں سے دیکھیں گے تو ہر قطرے میں نور کے مختلف رنگوں کا جلوہ دکھائی دے گا۔ آپ دیکھتے جائیں ایسی بار بار آپ کے سامنے ہوگی، جس کا نقشہ لفظوں میں نہیں کھینچا جاسکتا۔

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ! یہی کیفیت آئینہ خانے میں تیرے جلوے نے پیدا کر دی۔

واضح رہے کہ شعر میں غائب نے ہی مشاہدہ پیش کیا ہے۔ اے سورج کے نکلنے پر شبنم کے اُڑ جانے یا آئینے کا پانی خشک ہو جانے سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لغات۔ مضمحل : چھپا ہوا۔ پوشیدہ۔

ہمیولی : ہر مادی چیز کی اصل مادی جسموں کی صورت حال ہے اور ہیولی اس کا اصل ہے۔

شرح :۔ میری آبادی اور بنادٹ ہی میں خرابی اور بربادی کی ایک صورت موجود ہے۔ لیکن کا خون محنت و مشقت میں گرم ہوتا ہے۔ وہی گرمی ایک مادہ ہے

جس سے میرے حاصل کے لیے بھل جیتی ہے ۔

مرزا غالب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ دہقان کو فصل کے لیے جوتے بونے اور پانی دینے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور ریاست میں اس کا لہو گرم ہو جاتا ہے ۔ یہی گرمی ماس کو جلانے کے لیے بھلی کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔
گو یاس آبادی کے لیے جو کوشش کرتا ہوں وہی میری بربادی کا باعث بن جاتی ہے ۔

مولانا غلامحسین نے فرمایا ہے : یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حرارت غریزی جو باعث حیات ہے ، خود وہی ہر وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے ۔
اس شعر میں جو مسئلہ طلب مصنف نے نظم کیا ہے ، اسے آگے بھی کئی جگہ باندھا ہے مثلاً :
برقِ خرمن راحت خونِ گرم دہقان ہے ۔

۷۔ لغات ۔ مدار : لغوی معنی دورہ کرنے اور گھومنے کی جگہ ۔ مجازاً جس پر کسی بات کا ٹھہراؤ اور انحصار ہو ۔

شرح : گھر میں ہر طرف گھاس لگ آئی ہے ، جو بھانے خود اس امر کی دلیل ہے کہ گھر دیران دے آباد ہے ، کیونکہ وہاں ہر طرف گھاس اسی وقت اگتی ہے ، جب کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو اور نہ کوئی آتے نہائے ۔ درہن اس لیے مقرر کیے جاتے ہیں کہ گھر کے دروازے پر پیرا دیں اور اندر آنے والے ان کی اجازت کے بغیر نہ آسکیں ، لیکن میرے گھر میں تو دیرانی کے باعث کسی کی آمد و رفت کا امکان ہی نہیں اور درہن کا کام دروازے پر پیرا دینے کے بجائے گھاس کھسونا رہ گیا ہے ۔

۸۔ لغات ۔ خوں گشتہ : تھخون ہو چکی ہیں ، یعنی ان کے پورا ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی

چراغِ مژدہ : بجھا ہوا چراغ ، جسے چراغ خاموش بھی کہتے ہیں ۔
گورِ غریباں : اجنبیوں ، بے وطنوں اور مسافروں کی قبریں ۔

شرح :- میری خاموشی میں لاکھوں ایسی آرزوئیں اور تمنائیں چھپی ہوئی ہیں، جن کا خون ہر چمکا ہے اور ان کے پورا ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ میری مثال اس جگہ ہوئے دیجے کی ہے، جو کسی غریب، بے وطن اور مسافر کی قبر پر بھلایا گیا تھا۔ اور اس کی نوحہ ہو چکی۔

عام دستور ہے کہ لوگ عزیزوں کی قبروں پر چراغ روشن کر دیتے ہیں، اس طرح قبرستان کی خاموشی اور اداسی میں بھی آبادی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہیں لیکن جو لوگ باہر سے آئے اور مرکز سرزمین غیر میں بن ہو گئے، ان کا کوئی عزیز اور رشتہ دار موجود نہیں ہوتا۔ لہذا ان کی قبروں پر یا تو دیے جلاتے ہی نہیں جاتے یا کسی نے ایک آدھ مرتبہ بھلا بھی دیا اور وہ بچھڑ گیا تو کوئی اس کی پڑا نہیں کرتا۔

مرزا کہتے ہیں کہ میرے دل میں بے شمار تمنائیں تھیں، جو خون ہو چکیں اور میں چسپ بیٹھا ہوں۔ گویا وہ دیا ہوں، جو کسی مسافر کی قبر پر بھلایا گیا تھا، سبھا تو پھر کسی نے خبر نہ لی۔

شعری لفظی مناسبتیں، کمال تشبیہ اور تاثیر بیان ایک روشن کرامت ہے۔

۹۔ شرح :- میرا دل بچھڑ چکا ہے اور اس میں کوئی اُمید باقی نہیں، لیکن خیالِ محبوب کے نقش کی روشنی تمامال قائم ہے گویا دل افسردگی کے باعث ایک جڑ ہے، جس کے متعلق عام تصور تنگی و تار کی کا ہوتا ہے، لیکن خیالِ یار کے پرتو کی برکت سے یہ جڑ حضرت یوسفؑ کے قید خانے کا جڑ بن گیا یعنی وہ کوشری جس میں یوسفؑ بند تھے۔

دلِ افسردہ کو نقشِ یار کے پرتو سے زندہ ان یوسفؑ کا جڑ قرار دینا ایک نادر تشبیہ ہے، جس کی مثالیں شعرا و ادب میں بہت کم مل سکتی ہیں۔

۱۰۔ لغات :- تبسم ہائے پنہاں : زیر لب مسکراہٹیں۔

شرح :- معلوم ہوتا ہے کہ آج آپ رقیب کی بغل میں جاسوئے ہیں اور وہ خواب میں اگر زیر لب مسکراہٹ کا ادا کیا موقع ہو سکتا تھا۔

مطلب یہ ہوتا ہے کہ محبوب عاشق کے خواب میں آیا اور ایسی حالت میں کہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ عاشق کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ ہر معمولی سے معمولی بات پر اس کے دل میں جگمگانی پیدا ہو۔ محبوب کی زیر لب مسکراہٹ دیکھ کر عاشق کو فوراً خیال پیدا ہوا کہ ہونہ ہو محبوب غیر کی آغوش میں پہنچ گیا ہے۔

۱۱۔ لغات - لہو پانی ہونا : رنج و تکلیف میں مبتلا ہونا۔ جان ہلکانا

شرح :- خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تیری ہلکوں پر آسنا آجانے سے کس

کس کا لہو پانی ہوا ہوگا۔ کون کون انتہائی رنج و غم کا تختہ مشق بنا ہوگا۔

سچ ہے، محبوب کا ہلکا سا لال بھی عاشقوں کے لیے قیامت سے کم نہیں ہوتا۔

۱۲۔ لغات - شیرازہ : وہ بندش جس سے کتاب کے اوراق

ترتیب کے ساتھ یکجا کیے جاتے ہیں۔

شرح :- اے غالب! ہم راہِ فنا کی گنڈنڈی سے غافل نہیں اور اس

کی حقیقت خوب پہچانتے ہیں۔ یہی وہ بندش ہے جس کے ذریعے سے کائنات کے بکھرے ہوئے اجزاء کتاب کے ورقوں کی طرح اکٹھے کیے جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی نے اس دنیا میں بے شمار ٹکٹیں اختیار کیں۔ وہ ایک

دوسری سے اتنی مختلف ہیں کہ ان میں جوڑ میل پیدا کرنا ممکن نہیں، لیکن ان تمام

بکھری ہوئی شکلوں اور صورتوں کے لیے لازم ہے کہ فنا کی گنڈنڈی اختیار کریں۔

وہی گنڈنڈی دھاگے کی طرح ان تمام بکھرے ہوئے اجزاء کو باہم ہی دے گی۔

گویا موت کے بعد یہ سب چیزیں یک جا ہو جائیں گی، جو آج بکھری ہوئی نظر آتی

ہیں، اسی لیے ہم بھی راہِ فنا کی گنڈنڈی کو بھولے نہیں، ہر وقت اسی پر نظر ہے۔

دھوگا یک بیاباں ماندگی سے فوق کم میرا لغات :- یک بیاباں ماندگی :
 حساب موجب رفتار ہے نقش قدم میرا حدود مکان - اتنی مکان جو پورے
 محبت تھی چین سے، لیکن اب یہ بے مانگی ہے بیابان کی خاک چھاننے سے پیدا ہو
 کہ موج بونے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا فوق :- اس سے مراد ہے -
 جان، لیکن صحر اگر دی کا ذوق و شوق ہرگز کم نہ ہوگا۔ بیاباں گردی کا ذوق -
 کی لہروں پر بیلے بنے ہوتے ہیں - شرح :- میں کتنا ہی شک

شاعر نے اپنے چلنے کو موج سے اور نقش قدم کو حساب سے تشبیہ دی۔ کمال
 یہ کیا کہ نقش قدم کو، جس کا خاکا ہی اتنا دگی اور واما ندگی ہے، یعنی جو زمین پر جم کر
 بالکل بے حرکت ہو جاتا ہے۔ شاعر نے اسے اپنے ذوق رفتار کی برکت سے تحرک
 کر کے موج رفتار کا بلبل بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا نقش قدم رفتار کی لہر کا
 بلبل ہوگا، اس کی صحرانوردی کے شوق میں کسی کا کیا امکان ہو سکتا ہے اور تحکات
 اس پر کیا اثر ڈال سکتی ہے؟

۲۔ لغات - بے دماغی، پریشانی، ناخوشی، زودرنجی، جھڑپا،
 بد مزاجی - بیزار دی -

ناک میں دم آنا : نہایت تنگ اور بیزار ہونا -
 شرح :- ایک زمانے میں مجھے باغ اور اس کے اندر سیر و تفریح سے
 محبت تھی، لیکن اب بیزاری و نازک مزاجی سے یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ پھول
 کی خوشبو سے بھی میں سخت تنگ اور رنجیدہ ہو جاتا ہوں
 آخری مصرع میں خوبی یہ ہے کہ پھول ناک کے سامنے رکھ کر دم اندر کھینچا جائے
 تو خوشبو باغ تک پہنچتی ہے۔ یہاں پھول کی خوشبو سے ناک میں دم آنے کی مناسبت
 واضح ہے، اگرچہ یہاں ناک میں دم آنا بطور مآوردہ استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر کا

مضمون یہ ہے کہ میں بھی ایک زمانے میں شادمانی کے اسباب سے اسی طرح نادمہ اٹھاتا اور لذت اندوز ہوتا تھا، جس طرح عام لوگوں کا شیوہ ہے، مگر اب یاس و اندوگی نے یہ حالت پیدا کر دی ہے کہ پھول کی خوشبو سے بھی جو نہایت لطیف و فرحت بخش ہوتی ہے، میں بنیزار ہوں اور اس درجہ بنیزار ہوں، گو یا اس سے تاک میں دم آتا ہے۔

دلکش مناظر سے رغبت و محبت کے بھانے انتہائی نفرت و بنیزاری یہ بتاتی ہے کہ حالات میں کس درجہ عبرت انگیز انقلاب آگیا۔



الغفات - رہن : گرد
ناگزیر : مجبور، ناچار -
جس سے گریز ممکن نہ ہو۔

شرح :- میں سرے
پاؤں تک عشق کے پاس گرد ہوں
یعنی عشق میں مبتلا ہوں۔ ساتھ ہی زندگی کی الفت سے بھی دامن بچنا میرے لیے ممکن نہیں، یعنی جان کو بھی عزیز رکھتا ہوں۔ گو یا میری حالت اُس شخص کی سی ہے، جو بھلی کو مجبور بنائے بیٹھے ہو، رات دن اس کی بندگی کرتا ہو، یہ اس ہمد سے یہ امنوس ہو کہ حاصل برباد ہو گیا، سرمایہ جل بھجا، حالانکہ بھلی کا خاصہ یہی یہ ہے کہ حاصل کو بھلا ڈالے۔

مرزا یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جب انسان عشق کی نذر ہو جائے تو زندگی سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہتی چاہیے۔ اگر عشق کے ساتھ جان سلامت رکھنا منظور ہو تو یہ خواہش سرا سر غیر طبعی ہوگی، کیونکہ بھلی کو پوچ کر لپکے آپ کو بچائے رکھنے کی آرزو بالکل عبث ہے، عشق کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لیے زندگی کی ہر

شے سے الفت کا رشتہ کٹ جائے ۔

۲۔ لغات :- ظرف : حوصلہ گنہائش ۔ ساتی ۔

تشنہ کامی : پیاس ۔ اشتیاق ، خصوصاً اشتیاق ہے ۔

خیا زہ : انگڑائی ۔

شرح :- اے ساتی ! شراب کی پیاس اور طلب کی بے کیفی حوصلے کے

مطابق ہوتی ہے ۔ اگر تو لطف و کرم سے شراب کا دریا ہے تو میں اس دریا کے

سامل کی انگڑائی ہوں ۔

مطلب یہ ہے کہ ساتی میں لطف و کرم کا جتنا حوصلہ ہو پینے والے کی پیاس

بھی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے ۔ فرض کیجیے کہ ساتی شراب کا دریا بن گیا تو پینے والے

نے اس کے سامل کی شکل اختیار کر لی ۔ معلوم ہے کہ دریا کا جوش و خروش کتنا ہی

بڑھ جائے ، سامل اس جوش و خروش کو اپنے اندر سمائے رکھتا ہے ۔ بالکل یہی

کیفیت شراب نوشی کی ہے ، اس کی طلب ساتی کے لطف و کرم کے ساتھ ساتھ

زیادہ ہوتی جاتی ہے ۔



یاں در نہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

میں ، اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

طعم ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

ہر گوشہ بساط ہے ، سر شیشہ باز کا

ناخن پر قرض ، اس گر و نیم باز کا

سینہ ، کہ تھا دینہ گہرائے راز کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

نگہ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز

صرف ہے ضبطِ آہ میں میرا ، وگرنہ میں

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے

کلوش کا دل کرے ہے تقاسم کہ ہے ہنہ

تلا راج کا دوش غم ، بھراں ہوا اسد

۱۔ لغات - نوا ہائے راز : راز کے نغمے۔ راز سے مراد حقیقت کے بھائی۔
 شرح :- خواہ مخواہ نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے : راز
 کے نغموں سے تو خود ہی نا آشنا ہے، ورنہ دنیا میں بظاہر جو حجاب نظر آتے ہیں وہ
 بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے، بچ رہے اور اسرار الہی ظاہر کر رہے ہیں۔
 شاعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے میں حقیقت جلوہ گر ہے۔ ہر چیز قابلِ مطلق
 کے بھیدِ ظاہر کر رہی ہے اور معرفت کے نغمے سنا رہی ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ
 انسان ان نغموں کا محرم نہیں، وہ ہر شے کو حقیقت کا حجاب یعنی چھپا لینے والے
 پردے سمجھتا ہے۔ وہ تو ساز کے پردے ہیں، جن سے نغمے نکلتے ہیں، لیکن ان نغموں
 کو سننے کے لیے ایسے کان چاہئیں، جو ٹھیک ٹھیک سننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔
 عرفی کا مشہور شعر ہے :

ہر کس نہ شناسندہ راز است و گرنہ

اینها ہمہ راز است کہ معلوم حرام است

یعنی ہر شخص کو راز پہچان لینے کا ملکہ حاصل نہیں، ورنہ جو کچھ عام لوگ جانتے

ہیں، وہ بھی دراصل سارے کا سارا راز ہے۔

عرفی نے عوام کی معلومات کو راز بتایا، لیکن غالب اُن چیزوں کو حقیقت
 کے تراژوں کا مصدر قرار دیتا ہے، جنہیں سب لوگ حجاب یعنی حقیقت چھپا لینے والے
 پردے قرار دیتے ہیں۔

۲۔ لغات - رنگ شکستہ : اڑا ہوا رنگ، مراد ہے عاشق کا اڑا

ہوا رنگ۔

شرح :- محبوب کو دیکھتے ہی عاشق کا رنگ اڑ گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ

اڑا ہوا رنگ بہارِ نظارہ کی صبح ہے۔ صبح کے وقت پھول کھلتے ہیں اور جو صبح
 عاشق کے رنگِ شکستہ سے پیدا ہوتی، اس میں محبوب کے ناز و نغمے کے پھول
 کھلتے چاہئیں۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب کو دیکھ کر عاشق کا رنگ اڑ جاتا ہے اور محبوب اس ارٹ سے ہونے لگتا ہے کہ صبح قرار دے کر اپنے ناز و نیاز کے پھول کھلانے میں اور سرگرم ہو جاتا ہے۔

۳۔ شرح :- ٹو غیر کو غصے کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مجھے تیری لمبی پکوں کی اس تکلیف سے دکھ پہنچ رہا ہے۔

غیر کا دل پتھر کا ہے۔ اُسے چھیدنے میں تیری پکوں کو جو زحمت ہو رہی ہے وہ میرے لیے باعثِ اذیت ہے۔ تیری نگاہیں اس کے پتھر جیسے دل کے لیے نہیں بلکہ میرے زخم، ملامت اور نیاز مند دل کے لیے وقتِ رہی چاہئیں۔

ایک مضموم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب غیر کو تیز نظروں سے دیکھ رہا ہے اور عاشق کو رشک کے مارے دکھ پہنچ رہا ہے۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ محبوب کو خطاب یا توجہ کا رخ اس کے سوا کسی دوسری طرف پھرے۔

۴۔ لغات - صرف : فائدہ، کفایت شعاری - خرچ - طعمہ : لقمہ - ناز

شرح :- آہ کے ضبط کرنے میں میرا ہی فائدہ ہے، ورنہ میں ناقوانی اور لغات کے باعث جان کو گھسیٹا دینے والے ایک ہی سانس کا رزق بن جاؤں گا، یعنی معمولی سی آہ بھی مجھے گھسیٹ دینے کے لیے بالکل کافی ہوگی۔

۵۔ لغات - گوشہ لبساط : فرش کا کوٹنا یا حصہ۔

شیشہ باز : عام معنی شعبہ باز کے ہیں، یہاں اشارہ فنِ رقص کے ان اہلوں کی طرف ہے۔ جو شیشہ یا صراحی گلاب سے بھر کر سر پر رکھتے ہیں۔ حرکات کے باوجود کوئی چیز سر سے نہیں گرتی۔ اگر شیشہ یا صراحی ہل جائے تو اسے اصول کے مطابق حرکت کرتے ہوئے بازو پر سنبھال لیتے ہیں، پھر سبیل جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ میخانے میں خوبصورت لڑکے ساغر شراب سے بھر کر قس کرے ہوئے میخانہ کے پاس پہنچتے ہی اچھانل دیتے تھے، پھر خود ہی سنبھال کر میخانہ

کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اس رسم کی بعض چیزیں اب تک بھی شراب نوشوں کی محفل میں رائج ہیں۔ یورپ کے اندر طعام گاہوں یا شراب خانوں میں ایسی رسمیں کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ انہیں بھی شیشہ باز ہی کہتے تھے۔

شرح :- موسم بہار آگیا اور شراب کے جوش سے بوتلیں اور صراحیوں اس طرح اچھل رہی ہیں کہ شراب نوشی کی بزم میں فرش کا ہر گوشہ شیشہ باز کے سر کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔

۶۔ لغات۔ گرہ نیم باز : آدھ کھل گرہ، یعنی جو پوری نہ کھل ہو، بلکہ اس کے بیچ کا کچھ حصہ باقی ہو۔

شرح :- دل ابھی تک کاوش کا تقاضا کر رہا ہے، کیونکہ ناخن پر اس آدھ کھل گرہ کا قرص واجب الادا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میرا دل ابھی تک افسردہ و گرفتہ ہے۔ اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کی گئی، مگر پوری نہ کھل اور ناخن پر یہ قرص باقی رہ گیا، لہذا کاوش کا تقاضا جاری ہے اور وہ ختم نہیں ہو سکتا، جب تک دل کی گرہ پوری طرح کھل نہ جائے۔

۷۔ **شرح :-** اسے استاد امیر اسینہ ایسا تھا کہ اس میں راز کے گوہر دفن کیے ہوئے تھے، یعنی اس میں گونا گوں راز چھپے ہوئے تھے۔ لیکن محبوب کی مبدائی کے غم نے اس خزانے کو بڑی طرح تاراج و برباد کر ڈالا۔



۱۔ **شرح :-** شہنشاہ کی محفل میں شعروں کا دفتر کھل گیا، یعنی مشاعرے شروع ہو گیا۔ انہی آگاہیوں کے اس خزانے کا دوازدہ ہمیشہ کھلا رکھو شعر کا دوازدہ مصرعہ دعائیہ ہے مطلب

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھو یا رب ایہ در گنجینہ گوہر کھلا
شب ہوئی بھرا نجم روشنہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا تنگدے کا در کھلا

یہ ہے کہ فیض کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

۲۔ لغات۔ انجم :

نجم کی جمع۔ ستارے۔
رخشنده : چمکنے والے
روشن۔ تاباں۔

شرح : رات ہو گئی،
پھر روشن و تاباں ستاروں
کا ایک سماں آنکھوں کے
سامنے آشکارا ہو گیا اور اس
منظر کے کھلنے میں اہتمام اور
آرائش و زیبائش کا یہ عالم
ہے۔ گویا بتھانے کا دروازہ
کھل گیا۔

اہتمام اور آرائش میں
بتھانے کے دروازے کا
خیال شاعر کو یا تو اس وجہ
سے آیا کہ بتھانے خاص
اوقات میں عبارت کے لیے
کھلتے ہیں، بہر وقت کھلتے نہیں
رہتے، نیز ان میں جنوں کو
سبا کر رکھا جاتا ہے یا اس
وجہ سے کہ خود ستاروں کی

گرچہ تہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
اسٹین میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں، گو نہ پاؤں اسکا بصید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری سپر کھلا
ہے خیالِ حُسن میں، حُسنِ عمل کا سا خیال
غُلہ کا ایک در ہے، میری گور کے اندر کھلا
مُنہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کھلا
در پر رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا اپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کور ہے گا دیدۂ اختہ کھلا
کیا رہوں غُربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بُرا کثر کھلا
اس کی اُنت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کا اُبت
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

پرستش کو بخانے سے خاص نسبت و تعلق ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ چمکتے ہوئے ستاروں کا منظر سامنے آتے ہی یہ خیال آ جاتا ہے کہ بت خانوں میں ان کی پرستش ہوتی تھی۔ ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شام کے وقت بتخانوں میں پرستش شروع ہوتے ہی بہت سے چراغ روشن کر دیئے جاتے تھے، جنہیں ستاروں کے منظر سے اک گونہ مناسبت ہے۔

۳۔ لغات۔ دشمنہ : ایک قسم کا خنجر، کٹاری۔

شرح :- اگرچہ میں دیوانہ ہوں، لیکن دوست کا قریب نہیں کھا سکتا۔ اس نے ہاتھ میں تو کھلا ہوا نثر تمام رکھا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ میرا غم خوار ہے اور قصد لینے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ زائد خون نکل جائے اور میری دیوانگی جاتی رہے، لیکن اس نے آستین میں کٹاری چھپا رکھی ہے۔ تاکہ موقع پاتے ہی میرا کام تمام کر دے۔

مطلب یہ کہ آج کل کے دوست بظاہر غمخواری کا دم بھرتے ہیں، مگر ارادہ دشمنی کا ہوتا ہے۔ دوستوں کا ظاہر باطن ایک نہیں، میں ان کے نفاق سے غیب واقف ہوں۔ شعر میں دوست سے مراد بظاہر محبوب نہیں، بلکہ وہ شخص ہے۔ جو دکھا دے کی غرض سے دوستی کا دم بھرتا ہے۔

۴۔ لغات۔ کھلا : یہاں اس سے مراد بے حجاب ہوا، بے تکلف ہو گیا۔

شرح :- بیشک میں محبوب کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھتا یہ بھی نہیں جانتا کہ مجھ سے بے تکلف ہو جانے کا راز کیا ہے۔ میرے لیے تو یہی سب سے بڑی نعمت ہے کہ اس پری پیکر کا حجاب دُور ہو گیا اور اس نے مجھ سے بے تکلفی اختیار کر لی۔

اس میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ عاشق کے لیے محبوب کا خفیت سا اتفاقات بھی بھائے خود انتہائی مسرت کا باعث ہوتا ہے، اگرچہ وہ کہتے ہی رنج و غم کا پیش خیمہ ہو۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب کے اتفاقات میں عاشق کے لیے

کر دیکھ کر کوئی ضرورت نہیں اور کریدنا سبب بھی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُتھانی رینچ غم اُٹھا چکنے کے بعد محبوب نے بے تکلفی اختیار کر لی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اور کھل جائیگا اور عاشق کی تمام مرادیں پوری ہو جائیں گی۔

۵۔ شرح :- میں خشن یعنی چہرہ محبوب کے تصور کو نیک عمل اور نگو کا رسی سمجھتا ہوں۔ اسی تصور کی بدولت میری قبر کے اندر بہشت کا در پہر کھل گیا۔ بہشت اُن لوگوں کو ملتی ہے، جن کے پاس نیک عملوں کا سرمایہ ہو۔ میں نے محبوب کے حسین چہرے کے خیال میں عمر گزار دی اور وہی تصور میرا سرمایہ عمل تھا جو سرمایہ کی شمار ہوا اور اس کی برکت سے میری قبر کی تلخی ہی میں بہشت کی فضا میرے لیے دیتا ہو گئی۔

۶۔ لغات - منہ پر کھلنا : مراد ہے کسی چیز کا چہرے پر زیادہ خوش نما معلوم ہونا۔

شرح :- محبوب کا چہرہ نہ کھلنے پر بھی حسن و دلغزی کا وہ عالم ہے کہ آواز تک کہیں دیکھتے ہی میں نہیں آیا۔ پہلے زلفیں اس کے چہرے پر پڑی رہتی تھیں اور نہایت دلگدیز معلوم ہوتی تھیں۔ اب اس نے نقاب اوڑھ لی ہے اور نقاب نے زلفوں سے بھی بڑھ کر اس کے چہرے پر زیبائی اور خوش نمائی پیدا کر دی ہے۔ گویا نقاب کا حسن زلفوں سے بازی لے گیا ہے۔

۷۔ شرح :- میں نے درخواست کی کہ حضور! اور دانے پر پڑا رہنے کی اجازت دے دیجیے۔ اجازت مل گئی اور میں نے اپنا لپٹا ہوا بستر کھولنا شروع کیا۔ اس اُتھان میں محبوب قول سے پھر گیا اور مجھے بہ صد حسرت و یاس اپنا کھٹکا ہوا بستر پھر لیٹنا پڑا۔

اس شعر میں محبوب کی شوخی اتوں اور عاشق آزار کی کافتش نہایت دلکش انداز میں کہینچا گیا ہے۔

۸۔ شرح :- میری غم بھری رات اتنی اندھیری کیوں ہے کہ اس میں ستاروں

کے نشانے دیے بھی نظر نہیں آتے؛ پھر شاعر خود ہی اس سوال کا جواب دیتا ہوا سبب یہ بیان کرتا ہے۔ کہ عالم بالا سے روشنی زمین پر بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور ستارے دنیا کے آسمان کی طرف سے آنکھیں پھیر کر عالم بالا کو تنگ رہے ہیں۔ جدھر سے بلائیں اترتی ہیں۔ ستاروں کی آنکھیں اس منظر کی طرف سے ہٹ نہیں سکتیں۔ اور ان سے جو بھی روشنی حاصل ہو سکتی ہے، زمین کی طرف نہیں آ سکتی لہذا میری غم بھری رات سراسر اندھیری ہو گئی۔

شب غم کی کامل تاریکی کا یہ سبب بالکل نیا اور اچھوتا مضمون ہے۔ لطف یہ کہ یہ سبب بلاؤں کے نزول سے پیدا ہوا اور شب غم کی تاریکی میں درد انگیزی کا انا مذہب ہو گیا۔

۹۔ لغات و غربت : مسازمی۔ بے وطنی۔ پردیس۔

حوادث : حادثہ کی جمع یعنی آفتیں اور مصیبتیں۔

شرح : میرے لیے پردیس میں خوش رہنے کی کون سی صورت ہے، جب آفتوں اور مصیبتوں کا یہ عالم ہے کہ قاصد وطن سے جو خط لاتا ہے، وہ اکثر کھلا ہوا ہوتا ہے؟

دوسرے مصرع کا مضمون اس رسم پر مبنی ہے کہ جن خطوں میں کسی کی موت کی خبر ہوتی تھی، وہ اکثر کھلے بھیجے جاتے تھے یا ان کا کوئی گوشہ چاک کر دیتے تھے تاکہ مکتوب الیہ دیکھتے ہی سمجھ جائے، خط میں کوئی بُری خبر درج ہے۔ آج بھی یہ دستور ہے، جس شخص کے پاس وطن سے اکثر خط کھلے ہوئے آئیں، اس کا مسلسل رنج و غم میں مبتلا رہنا کسی تصریح کا محتاج نہیں۔ پردیس میں وطن سے خطوں کا آنا ہر مسافر کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے، لیکن جس شخص کو زیادہ تر خبر مرگ لانے والے خطوط ملیں، وہ کیونکر خوش رہ سکتا ہے۔ پردیس کے غم پر عزیزوں اور دوستوں کے مرنے کا غم اس کے لیے مزید قلق کا باعث بنا رہے گا۔

۱۰۔ لغات۔ گنبد بے در : ایسا گنبد، جس میں کوئی دروازہ نہ ہو،

مراد ہے آسمان ۔

شرح : - اے غالب ! میں تو کوہِ نین کے بادشاہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ہوں ، جس کے لیے معراج کی رات آسمان کے بند دروازے کھل گئے پھر میرے کام کیونکر بند رہ سکتے ہیں ؟ حیر لیے کارِ برآری میں کیونکر رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے ؟ جس مقدس ذات کے لیے یہ بے دروازہ گنبد رکاوٹ نہ بن سکا اس کے لطف و نوازش سے میری نوکونٹی بھی غرض رُکی نہیں رہ سکتی ۔



۱۔ لغات ۔ زُہرہ : پتہ ۔
 شعلہ جوالہ : جوالان کرتا یا پکڑ
 کھاتا ہوا شعلہ : طریقہ یہ ہے کہ
 ایک کٹڑی (جسے نبی کہتے ہیں)
 کے دونوں سروں پر یا تو مشعلیں
 باندھ لیجئے ہیں یا گیند سی باندھ
 کر اور آگ لگا کر گھاتے ہیں ۔
 اس طرح آگ کا ایک گول پکڑ
 پیدا ہو جاتا ہے ۔ آتش بازی میں
 ایک چرخے سے یہی کام لیا جاتا ہے ۔
شرح : راتِ غم بھریں
 میرے دل کی جلن سے جو بجلیاں
 نکل رہی تھیں ، انہوں نے بادل
 کا پتہ پانی پانی کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا
 کہ ایک سیلاب آگیا جس میں ماہی
 جھنڈ پیدا ہو گئے ۔ پانی کی بیکٹری ۔

شب کہ برقِ سوذول سے زہرہ ابر آب تھا
 شعلہ جوالہ ، بہر اک سلاخ گرداب تھا
 دلِ کرم کو مذہر بارش تھا عناں گیرِ خرام
 گریہ سے یاں پسینہ بالمش کفِ سیلاب تھا
 واں ، خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
 یاں هجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
 جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو
 یاں ، رواں مژگانِ چشم تر سے خونِ ناب تھا
 یاں سرِ پر شور بے خوابی سے تھا دیوارِ جو
 واں ، وہ فرقِ نازِ محو بالمش کم خواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
جلوہ گل داں بہا طِ محبتِ احباب تھا
فرش سے تاعرش، واں طوفاں تھا میچِ رنگ
یاں زمیں سے آسماں تک سو منق کا باب تھا
ناگماں اس رنگ سے خونِ ناپِ پکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذتِ یاب تھا

میرے سونے دروں پر کوئی اثر نہ ڈال
سکی، بلکہ میرے سونے پانی پراتنا
گہرا اثر ڈالا کہ بختور کا ہر حلقہ شعلہ
جوالہ بن گیا۔

گردابِ اور شعلہ جوالہ میں
تشبیہ گولاٹی پر موقوف ہے۔ جس
سونہ دل نے پانی کو آگ کی شکل
میں تبدیل کر دیا، حالانکہ پانی آگ
بھاتا ہے اس کی تیزی اور تندی
کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

ایسے اندازِ بیان کو عموماً مبالغہ آمیز قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ شاعر
کے گہرے تاثرات کا ایسا اظہار ہوتا ہے، جس کے بغیر وہ اپنے حقیقی محسوسات سننے والے
تک پہنچا نہیں سکتا۔

۲۔ لغات۔ عنان گیر : باگ تھا منے یعنی روکنے والا۔

پنبہ بالاش : نیکی کی روٹی۔

کعبِ سیلاب : سیلاب کا جھاگ

مشریح :- محبوب مجھ پر مہربان کا ارادہ کیجے بیٹھا تھا، مگر لیک ایک بارش
شروع ہو گئی اور اسے روائی سے روک جانے کا بہانہ مل گیا۔ یہاں یمن عاشق کے ہاں
دوتے دوتے ایک تیز و تند سیلاب آگیا اور اس کے نیکی کی روٹی اس سیلاب کا
جھاگ بن گئی۔

روٹی اور جھاگ کی مناسبت واضح ہے۔

۳۔ لغات۔ خود آرائی : بناؤ سنگار کرنا۔ بننا۔ ٹھننا۔

مشریح :- محبوب کو بناؤ سنگار کرنے اور بننے ٹھننے کے سلسلے میں یہ خیال

تھا کہ بال بال میں موتی پونے جاتیں۔ غریب عاشق کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان اس انداز میں بہ رہا تھا کہ نگاہ کا تار بھی گم ہو گیا تھا۔

چشتر اور بعد کے اشعار کی طرح اس شعر میں بھی شاعر نے محبوب اور عاشق کے ہاں کی متضاد کیفیتیں پیش کی ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر شعر میں دونوں کیفیتیں ہمیشیت مجموعی ملتی جلتی ہیں، اگرچہ دونوں مختلف حالتیں پیش کر رہی ہیں۔

۴۔ **تشریح :-** محبوب نے ہنر کے کنارے بزم عیش و نشاط آراستہ کر رکھی ہے ہر طرت تختہ ہائے گل نظر آ رہے ہیں۔ پھولوں کا عکس ہنر کے پانی میں پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پانی کے اندر چراغ جگمگا رہے ہیں۔ اس کے برعکس عاشق کے ہاں یہ نقشہ تھا کہ اس کی موتی موتی آنکھ کی پکوں سے خالص خون بہ رہا تھا۔ چراغاں اور خونِ تاب کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔

۵۔ **لغات :-** فرقِ ناز : محبوب کا سر جس نے ناز و نعمت اور لاڈ پیار کے سوا کچھ نہ دیکھا۔

زیبِ بالَش : بچے کے لیے باعثِ ذہنیت۔

کُتَاب : نعمت نگار اسے کتاب بھی کہتے ہیں اور کُتَاب بھی۔ ایک قسمی ریشمی کپڑا جو زری کے تار شامل کر کے بنایا جاتا ہے۔

تشریح : عاشق کی کیفیت یہ تھی کہ اسے نیند نہیں آتی تھی اور اس کا وحشت بھرا سر دیوار کی تلاش میں تھا تاکہ اس سے ٹکرا کر مر جائے۔ محبوب کے ہاں اس کے برعکس دوسرا ہی نقشہ تھا، یعنی وہ اپنا سر... جس نے ناز و نعمت اور عیش و نشاط کے سوا کبھی کچھ نہ دیکھا تھا... کتاب کے نیچے پر رکھتے ہوئے مزے سے سو رہا تھا۔

اس شعر کا ایک نسخہ "عجوبالش" کی جگہ "زیبِ بالَش" بھی ہے۔ اس میں بھی عاشق و محبت کی متضاد کیفیتیں قائم رہیں، فرق صرف یہ ہوا کہ پہلے شعر میں محبوب کا ذکر مقدم تھا اور عاشق کا مؤخر۔ اس میں یہ ترتیب بدل گئی۔

۶۔ **تشریح :-** عاشق کی بزمِ بیخودی میں اس کے سامنے نے شمع جلا رکھی تھی

محبوب کی بزمِ کفرش پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ دوستوں سے عیش و نشاط میں مشغول تھا۔

عاشق کے دل سے جو سوز اٹھتا تھا، اس نے سانس کو بھی سراپا آگ بنا دیا تھا، اس لیے سانس عاشق کی مجلسِ بخودی میں شمع بن گیا۔ محبوب کی بزم میں پھولوں کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا فرش جلوۂ گل کا نقشہ پیش کرنے لگا۔

۷۔ **تشریح** - محبوب کے ہاں فرش سے عرش تک رنگ کی لہروں کا طوفان تھا، یعنی عیش و نشاط اور رنگین و ناہی کی بہتات تھی۔ اس کے برعکس عاشق کے ہاں زمین سے آسمان تک ہر چیز جل جانے اور جلا دینے کے قابل تھی، یعنی محرومی اور انتہائی تنگینی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس شعر میں پھر محبوب اور عاشق کی کیفیت بیان کرنے کی ترتیب بدل گئی۔

۸۔ **لغات** - خونِ نابہ : خالص خون، یہاں مراد ہے خون کے آنسو۔

تشریح :- میرا دل ناخنِ غم کی کاوش سے لذت پائے ہوئے تھا۔ یہ متضاد حالت دیکھ کر کیا ایک جوش میں آیا اور آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکانے لگا۔

۱۔ **لغات** - سپند :

حرل کا کلا دانہ، جو نظر میں سے پہنچنے کے لیے آگ پر ڈالتے ہیں اور وہ چلتا ہے۔

تشریح : راتِ دل سے جو

نالہ اٹھتا رہا، اس میں تاثیرِ بالکل غائب تھی۔ جب میرا محبوب غیر کی بزم وصل کو آراستہ کیے ہوئے تھا تو نالہ اس گرجہ شاد میں جوں

نالہ دل میں شب، اندازِ اثرِ نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیرِ گو بے تاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاطِ آہنگ ہے

خانہ عاشقِ مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ آیامِ خاکسترِ نشینی، کس کی کہوں
پہلوئے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی، اپنے جنوں نار سائے، ورنہ یاں
 فترہ فترہ، روکش خورشیدِ عالم تاب تھا
 آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
 کل تک تیرا بھی دل بہر و فنا کا باب تھا
 یاد کرو وہ دن، کہ ہر اک حلقہ تیرے دم کا
 انتظارِ صید میں اک دیدہ بے خواب تھا
 میں نے رو کا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
 اس کے سیلِ گریہ میں گروں کفِ سیلاب تھا

کچھ کیا تو میرے خلاف کیا۔ اگر اس میں حقیقی تاثیرِ موتی تو خیر کو محبوب سے بزمِ وصل
 آراستہ کرنے ہی کی نوبت نہ آتی۔

۲۔ لغات - مقدم : آنا۔

آہنگ : آواز، نغمہ، طرز، روش، قاعدہ، تالون۔

سازِ صدا ئے آب : جلتِ رنگ۔ ایک ساز ہے جو سات پیالیوں میں پانی
 کی مختلف مقدار بھر کر سات سروں کے موافق بنا لیتے ہیں۔ پیالیوں کو کسی چیز سے
 بجاتے ہیں تو ان میں سے مختلف سُر نکلتے ہیں۔ ان کی ترتیب سے مختلف نغمے پیدا
 کیے جاتے ہیں۔

شرح - سیلاب کی آمد سے دل نے شادمانی کے گونا گوں نغمے گانے
 شروع کر دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق کا گھر جلتِ رنگ تھا۔ یعنی جس طرح پیالیوں
 میں پانی بھر کر مختلف سُر پیدا کیے جاتے ہیں، اسی طرح عاشق کا گھر سیلاب کی آمد

پر بھترنگ کی طرح بجھنے لگا۔

۳۔ لغات : نازش : فخر۔ ناز۔

خاکستر نشینی : خاک نشینی، فقر، درویشی، قناعت۔

سنجاب : برفستان کا ایک جانور، جس کا رنگ خاک کی مائل بہ سیاہ ہوتا ہے۔

اس کی کھال بیش قیمت ہوتی ہے، جس سے پرستین اور بعض دوسری چیزیں بناتے ہیں۔ کھال کو بھی سنباب ہی کہتے ہیں۔

شرح :- میں خاک نشینی اور درویشی کے زمانے کا حال کیا سناؤں۔

قناعت نے میرے لیے فخر و ناز کے سامان مزاہم کر رکھے ہیں۔ کسی کا احسان لینا گوارہ نہ تھا اور میرا خیال سنباب کے بستر پر لیٹا ہوا سڑے اڑا رہا تھا، یعنی جسم ہی نہیں، دل و دماغ پر بھی انتہائی راحت و شادمانی طاری تھی اور تشویش کوئی نہ تھی۔

۴۔ لغات : حجون نارسا : ناقام اور بے تاثیر عشق۔

ٹوکش : مقابل، حریف، مُنڈ پھیر دینے والا۔ شرمندہ کرنے والا۔ بڑھکر۔

شرح :- ہماری ہی ناقام عشق سے کچھ بن نہ آیا اور وہ خدا کی دی ہوئی

صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھا سکا، اور نہ عشق کی یہ برکت ہے کہ وہ جہاں پہنچا، اس نے فترے فترے کو اس درجہ درخشاں بنا دیا کہ پوری کائنات کو روشن کرنے والا سو درج بھی شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ اس کی آب و تاب ان فتروں کے آگے ماند پڑ گئی جنہیں عشق نے دوشنی بخش تھی۔

۵۔ شرح :- کچھ معلوم نہیں کہ آج تو ان لوگوں سے کیوں بے پروا ہو گیا

ہے جو تیرے عشق کے جال میں ہیں۔ کل تک تو یہ صورت نہ تھی اور تجھے بھی محبت و وفاداری کا سزا دار مانا جاتا تھا۔ یعنی تو محبت و وفاداری پر قائم تھا اور عاشقوں سے بے نیازی تیرا شیوہ نہ تھا۔

۶۔ شرح :- وہ دن یاد کرو، جب تیرے جال کا ایک ایک حلقہ شکار کے

انتظار میں اُس آنکھ کی طرح کھلا تھا، جو نیند سے محروم ہو۔

پتے شعر کی طرح اس میں بھی سابقہ و موجودہ حالت کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

۴۔ **شرح :**۔ رات میں نے غائب کو سمجھا سمجھا کر اشکباری سے روک دیا، وہ اتنا روتا، اتنا روتا اور رو کر ایسا سیلاب برپا کر دیتا کہ یہ آسمان بھی اُس پر جھاگ بن کر رہ جاتا۔



ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور باقی یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تنِ سال دار تھا
گیلوں میں میری نعش کو کھینچے پھر دو کہیں
جاں دادہ ہوائے سہرہ گزار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
سہرہ شدہ مثلِ جوہر تیغِ آب دار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پر غمِ روزگار تھا

۱۔ لغات۔ ودیعت : امانت

شرح : خواجہ حالی اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں : آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے، گویا جسم میں جتنا خون تھا، وہ مژگانِ یار کی امانت تھا، اس لیے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا پڑے گا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔

بظاہر شعر کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق روزِ ضبط نہ کر سکا اور اتنے آنسو بہانے کہ جگر کا سارا خون ختم ہو گیا۔ اب وہ اس غم و رنج میں مبتلا ہے کہ جگر کا خون تو محبوب کی پلکوں کی امانت تھا اور امانت میں خیانت ہونی ہی نہ چاہیے تھی۔ اب ایک ایک قطرے کا مجھ سے حساب لیا جا رہا ہے اور مجبور ہوں کہ حساب دوں۔ گویا عاشق ضبط میں ناکام رہا اور مصیبت یہ پیش آئی کہ اس لیے ضبطی میں مجرب

کی پکوں کی امانت بھی آنکھوں کے راستے نکل گئی۔

۲۔ لغات - یک شہر آرزو : آرزوں کا ایک شہر، مراد ہے آرزوں کی کثرت۔

تمثال دار : جس میں تصویر ہو۔

شرح : عاشق کا دل ایک ایسا آئینہ تھا، جس میں محبوب کی تصویر محفوظ تھی۔ محبوب نے وہ آئینہ توڑ دیا اور اس کے بے شمار ٹکڑے ہو گئے۔ ثابث آئینے میں صرف ایک عکس نظر آتا ہے، آئینہ ٹوٹا تو اس کے ہر ٹکڑے میں وہی عکس نظر آنے لگا۔ گویا سیکڑوں تصویریں عاشق کے سامنے آ گئیں اور ہر تصویر ایک آرزو کے خون کا باعث ہوئی۔ گویا محبوب نے عاشق کا آئینہ بول توڑ کر اسے سیکڑوں ہزاروں آرزوں کے ماتم میں مبتلا کر دیا۔

۳۔ لغات - جاندار وہ : جان دے دینے والا۔ جان قربان کر دینے والا ہوگا : آرزو۔ خواہش۔ محبت۔

شرح :- میں محبوب کی آمد و رفت کے راستے کی محبت و آرزو پر جان قربان کیے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں اور اسی سبب سے میری موت واقع ہوئی۔ اب مناسب یہ ہے کہ میری فحش کو گلیوں میں کھینچنے پھرتا کو مرنے کے بعد بھی ان راستوں پر پھرنے کی سعادت حاصل ہو جائے، جن پر محبوب کی آمد و رفت تھی۔ اسی طرح محبوب اتفاقیہ مجھے دیکھ لے اور اس پر آشکارا ہو جائے کہ میں نے کس سبب سے اور کس شوق میں جان دی۔

۴۔ لغات - سراب : گراں صحرا کی ریت پر سورج کی تیز کرنیں پڑتی ہیں تو دیکھنے والے کو دُور سے پانی لہریں لیتا نظر آتا ہے۔ اصل میں یہ نگاہ کا جھوٹا ہوتا ہے۔ بعض اوقات چاند کی روشنی میں بھی صحرا کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پانی کے اس بے بنیاد جلوے کو سراب کہتے ہیں۔

شرح :- دُعا کے صحرا میں سراب کی جوں جوں نظر آتی ہیں، ان کی کیفیت

کچھ نہ پوچھو۔ بس یہ سمجھ لو کہ جس ریت پر سورج کی روشنی پڑنے سے سراب پیدا ہو رہا تھا، اس کا فزہ فزہ تیز دھار والی تلوار کے جوہر کی مانند تھا۔

مراد یہ ہے کہ عشق میں دنیا کے تقاضے پورے کرنا بہت مشکل ہے۔ جس نے اس صحرا میں قدم رکھا، اس کے لیے پھنا ٹکڑا ہی نہیں، کیونکہ سراب پیدا ہونے والی ریت کا ایک ایک فزہ اس کے لیے تیز دھار والی تلوار سے کم نہیں ہوتا۔
۵۔ اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں :

۱۔ جب تک ہم نا تجربہ کار تھے، یہی سمجھتے تھے کہ عشق کا غم معمولی چیز ہے۔ ایسا نہیں کہ ہوا داشت نہ ہو سکے۔ اب تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ اسے کم بھی مان لیا جائے تو یہ دنیا بھر کے غموں کے برابر ہے۔

۲۔ ہم بھی ایک زمانے میں غم عشق کو زیادہ بڑی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اب تجربہ کیا تو معلوم ہوا کہ غم عشق کم ہو جائے تو دنیا کے دوسرے غم اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اس آخری شرح کی تائید مرزا غالب کے ایک اور شعر سے ہوتی ہے :

غم اگرچہ جاگل گل ہے پوچھیں کہاں کہ دل ہے

غم عشق اگر نہ ہوتا ، غم روزگار ہوتا

مرزا نے اس میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی ہے۔ عشق ایک لگن اور ایک دھن ہے۔ جب تک انسان اس دھن میں لگن رہے، اسے کسی دوسری چیز کا خیال نہیں آتا، گویا وہ تمام نشوونماؤں سے بالکل محظوظ رہتا ہے۔ اگر اسے کسی خاص کام کی دھن اور لگن نہ ہو تو دنیا کی چھوٹی چھوٹی حقیر باتیں اس کے لیے پریشانی کا باعث بنتی رہیں گی۔



۱۔ شرح : خواجہ حالی
مرحوم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں : بادی النظر
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

گریہ پا ہے ہے خرابی میرے گناہوں کی
 درد دیوار سے ٹپکے سے بیاہاں ہونا
 داتے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
 آپ بانا اُفصر اور آپ ہی حیراں ہونا
 جلوہ از لبس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
 جو ہر آئندہ بھی چاہے ہے مرگلاں ہونا
 عشرت قتل گم اہل تمنا مت پوچھ
 عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
 لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
 تو ہوا اور آپ ہمدردِ گلستاں ہونا
 عشرت پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا
 لذتِ پریش جگر، غرقِ نمکِ دال ہونا
 کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توہ
 ہائے اس زودِ پشیاں کا پشیاں ہونا
 حیف اس چارگرہ کپڑے کی قیمت غالب
 جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی
 ہے، مگر خود سے دیکھا جائے تو بالکل
 اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ
 دنیا میں آسان سے آسان کام بھی
 دشوار ہے، ہمدردی یہ ہے کہ آدمی
 جو عین انسان ہے، اس کا بھی انسان
 بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال
 نہیں، بلکہ شاعرانہ استدلال ہے،
 جس سے بہتر ایک شاعر استدلال
 نہیں کر سکتا: (یادگار غالبؒ)
 معلوم نہیں خواجہ مرحوم نے
 اس کے شاعرانہ استدلال ہونے
 پر کیوں زور دیا، کیونکہ استدلال
 ہر لحاظ سے معقول و محکم ہے، یعنی
 ہر آدمی نوع کے اعتبار سے یقیناً
 انسان ہے اور حضرت آدمؑ کی
 اولاد میں سے ہے، لیکن انسانیت
 کی حقیقی صفات ہر آدمی میں نظر
 نہیں آتیں۔ ہر آدمی کمال انسانیت
 کے درجے پر نہیں پہنچتا اور اخلاق
 فضائل کے اعتبار سے اشرف المخلوقات
 نہیں بنتا، لہذا یہ کہنا کہ ہر آدمی
 انسان ہونا میسر نہیں، اتنا بدیہی

ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل لانے کی ضرورت نہیں۔ دعوئی یہ نہیں کر دیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے، دعوئی یہ ہے کہ ہر آدمی انسان نہیں بنتا، لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ جن کاموں کو بظاہر ہر بہت آسان سمجھا جاتا ہے، وہ بھی سخت مشکل اور دشوار ہیں۔

اس سلسلے میں ایک شعر کا ذکر کیا گیا ہے، جسے عالمگیر اعظم نے اپنے رقصات میں ایک یا دو جگہ نقل کیا۔ بظاہر یہ خود عالمگیر کا شعر ہے۔
 آنچہ پر حسیتم کم دیدیم و درکار است و نیست
 نیست جز آدم درین عالم کو بسیار است و نیست

یہ حصن ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ دنیا میں انسان بہت ڈھونڈے، مگر کم ملے۔ یہ جنس ہے تو بہت زیادہ، لیکن حقیقتاً ناپید ہی ہے۔ مرزا غالب نے یہ حقیقت نہایت جدید انداز میں پیش کی اور اس کی بنا پر ایک مستقل اصول وضع کیا۔ دونوں شعروں میں کوئی مناسبت نہیں۔ مرزا کا شعر واقعی شعر ہے، لیکن رقصات عالمگیری کا شعر وزن، توافقی اور ردیف کے باوجود شعر نہیں۔

۲۔ شرح :- گرے یعنی رونے دھونے کی یہ کیفیت ہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ میرا گھر برباد کرنے کے واسطے ہے اور درود و وار سے صاف نمایاں ہوتا ہے کہ یہ سیل گرے میں بہ کر ناپید ہو جائیں گے اور دیر انداز گھر کی جگہ بے لے گا۔
 اگر یہ اور ٹپکے ہے، خرابی اور بیا بان کی مناسبت واضح ہے۔

۳۔ اپنے جنون عشق پر اظہارِ تاسف کے بجائے اور کیا کر سکتا ہوں۔ یہ میر وقت اور ہر سانس لینے میں مجھے مجبور کر کے محبوب کی طرف لے جاتا ہے۔ میں ہمارا ہوں اور سراپا حیرت بن جاتا ہوں۔

اسے محاذ کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنور، وحشہ

کے باعث عاشق کے دل میں ایک ہی جذبہ رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ ہر لحظہ محبوب
 کا رخ کرے اور اس سے مل سکے کے باعث حیرانی کا تھخہ عشق بنا رہے،
 حقیقت کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہر لحظہ اس ذات کا
 رخ کرتا ہوں، جو وجود اور زندگی کا سرچشمہ ہے لیکن غایبوں اور نارسائیوں کے
 باعث اس تک پہنچ نہیں سکتا اور حیران ہوتا ہوں۔ غالباً یہی حیرانی ہے، جسے
 صوفیہ کی اصطلاح میں مقام حیرت قرار دیا جاتا ہے۔

۴۔ لغات - آئینہ : یہاں اس سے مراد آئینہ مجلس نہیں، بلکہ آئینہ فولاد ہے۔
 جو ہر : فولادی آئینے کو صیقل کیا جاتا ہے تو اس میں خط سے پڑھ جاتے
 ہیں۔ جنہیں جوہر آئینہ کہتے ہیں۔ ایک ایک خط بال سے مشابہ ہوتا ہے لہذا انہیں
 مژگاں سے تشبیہ دی۔

شرح :- محبوب کا جلوہ حسن حکما کہ رہا ہے کہ مجھے دیکھو، کیونکہ میں اور
 صرف میں ہی دید کے لائق ہوں۔ یہ سن کر فولادی آئینے کے جوہروں پر بھی ایسی
 کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ آئینے کی آنکھ پر مژگاں بن جانا چاہتے ہیں تاکہ حسن کی
 دید سے لذت پاسکیں اور اس کا تقاضائے دید پورا کر سکیں۔

دائع رہے کہ یہ حسن کی طرف سے سوال نہیں، تقاضا ہے اور مطلب یہ ہے
 کہ واقعی اس کے سوا کوئی شے قابل دید نہیں، اسی لیے بے جان آئینے میں بھی
 وہ خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں جو آلود دید ہٹنے کے لیے ضروری ہیں۔

۵۔ لغات - اہل تمنا : اہل عشق، جنہیں محبوب پر قربان ہو جانے کی
 انتہائی آرزو ہوتی ہے۔

عبید نظامارہ : قوت دید، یعنی نگاہ کی عبید یا انتہائی شادمانی اور خوشی۔

شرح :- قتل گاہ میں پہنچ کر اہل عشق کو ہر خوشی اور شادمانی ہو رہی ہے، اس
 کی کیفیت کچھ بڑا چھپے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ جب تلواریاں سے نکلتی ہے اور تھکی
 کے لیے اسے بند کیا جاتا ہے تو نگاہ کے لیے وہی منظر پیدا ہو جاتا ہے جو ناکوگوں

میں میدان کے دل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کے لیے محبوب کے ہفتوں قتل ہونے سے بڑھ کر خوشی کا کوئی موقع نہیں۔

اس شعر کو قتل شمشیر وغیرہ کے الفاظ کے پیش نظر محض غزل کا عام شعر نہ سمجھا جائے اس کی ایک اصولی حیثیت بھی ہے۔ یعنی اہل حق کے لیے اپنے مقاصد و عزائم کے سلسلے میں قتل گاہ کے اندر پہنچنا اور قتل کے لیے شمشیر کا بلند ہونا ایسا ہی ہے، جیسے عید کا دن آجائے، کیونکہ وہ اپنے مقاصد کے لیے کوشش میں یہ سزا پاتے ہیں اور یہ سزا ان کے لیے سرخروئی کا پروانہ ہوتی ہے۔ نیز ایسی سزائیں اصل مقصد کی اہمیت واضح کرتی ہیں اور دوسرے لوگوں میں بھی دلولہ پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ **شرح :** اے محبوب! ہم تو مراد حاصل کیے بغیر قبر میں جا سوتے اور وصل سے جو شادمانی حاصل ہو سکتی تھی، اس کی آرزو کا داغ سینے میں لے گئے۔ اب تو جس طرح چاہے، باغ باغ ہو اور شاد و خرم رہ۔

۷۔ **لغات :** ریش : زخم۔

شرح : - دل کے ٹکڑے کی خوشی یہ ہے کہ اس پر آرزو کے زخم لگتے ہیں اور جگر کے زخم پر زیادہ سے زیادہ نمک چھڑک دیا جائے تو اسے لذت حاصل ہوتی ہے۔

زخم ہر شخص کے لیے دکھ اور درد کا موجب ہوتا ہے۔ اس پر نمک چھڑکا جائے تو تکلیف بہت بڑھ جاتی ہے، لیکن اہل عشق کو انھیں چیزوں میں مزہ آتا ہے اور وہ ایسی ہی باتوں میں خوش رہتے ہیں کہ نہ محض زخم لگائے جائیں، بلکہ ان پر زیادہ سے زیادہ نمک بھی چھڑکا جائے، یہاں تک کہ ایک ایک زخم کے لیے پورے لکڑی دان وقف کر دیا جائے۔

۸۔ **لغات :** زود پشیمان : جلد بچتا ہے والا۔

شرح : - محبوب نے مجھے قتل کرنے کے بعد جو روح جفا سے توبہ کرنی اور

ارادہ کر لیا کہ آئندہ کسی کو قتل نہ کرے گا۔ اے! اس جلد پہنچانے والے کو کس موقع پر پہنچانے کی سوجھی۔

شعر کے مطلب دو ہیں، اول محبوب کے جلد پہنچانے پر اس لیے افسوس ہے کہ قتل کے بعد اس پہنچانے سے مقتول کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا، دوم یہ کہ مجھے تو قتل کر دیا اور میں نے ثابت قدمی سے وفا کا ثبوت بہم پہنچا دیا، اب رقیبوں کی باری آئی تو محبوب نے جو رجحان سے توبہ کر لی۔ اس طرح ان کی آزمائش بھی نہ ہو سکی اور وہ محبوب کے لطف و کرم سے بے تکلف فائدہ بھی اٹھاتے رہے۔ بعض احباب نے اس شعر کے سلسلے میں خواجہ حافظ کا یہ شعر پیش کیا ہے!

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہرِ ثواب

کشتہ غمزدہ خود را بہ ناز آید

تیری نرم دل پر آفرین ہے کہ جسے تیرے غمزدہ نے قتل کیا، اس کی نماندہ جنازہ ادا کرنے کے لیے چلا آیا ہے تاکہ ثواب حاصل کرے۔

ظاہر ہے کہ دونوں شعروں کا معنوں ایک نہیں، پھر سب سے جڑی بات یہ ہے کہ حافظ نے اپنے معنوں کی قیادہ محبوب کے دلِ نرم اور شوقِ ثواب پر رکھی ہے اور غالب کے شعر میں زود و پشیمان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تیر نیکش کی طرح ”زود و پشیمان“ کا بھی کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

۹۔ شرح : اے غالب! اس چار گروہ کپڑے کی قیمت پر جتنا بھی افسوس کیا بلے کم ہے جس کی تقدیر میں عاشق کا گریباں بننا ہو، کیونکہ وہ ہمیشہ پاک ہوتا ہے گا۔ اود اس کی دھجیاں اڑتی رہیں گی۔

”آپ حیات“ میں ہے کہ مرزا غالب کو ایک آنفت ناگمانی کے سبب سے اسی طرح جیل میں رہنا پڑا۔ جس طرح حضرت یوسف کو مصر کے قید خانے میں رہنا پڑا۔ پڑتے میلے ہو گئے، جونیں پڑ گئیں۔ ایک دن ٹیپے جوٹیں چھن رہے تھے کہ ایک

نہیں مزاج پڑسی کے لیے گئے۔ پوچھا : کیا حال ہے ؟ مرزا نے یہ شعر پڑھا :

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتار ہوا ہیں !

کپڑوں میں جوئی بچیوں کے ٹاکوں کی جویں

جس دن جیل سے نکلنے گئے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرنا

وہیں پہنا کر پیٹیک دیا اور یہ شعر پڑھا : ہائے اس الخ

یہ واقعہ صحیح نہیں، کیونکہ قید میں مرزا غالب صرف نظر بند تھے اور مشقت

روپے دے کر معاف کر دی گئی تھی۔ انھیں کھانا گھر سے پہنچتا تھا اور نواب مصطفیٰ

خاں شیعہ قیسرے روز ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد

برحرم نے یہ قصہ نقل کرتے وقت اتنا بھی خیال نہ رکھا کہ اگر مرزا غالب کو عام

قیدیوں کا سا لباس ملتا تو انھیں یہ لباس پہناڑ پھینکنے کی اجازت کیونکر ہوتی ؟ ہمارے

زمانے تک یہ دستور رہا کہ قیدی میعاد قید گزارنے کے بعد جیل کا لباس اتار دیتے

تھے، پہناڑ کر نہیں پھینک سکتے تھے، البتہ لمبی قید میں کسی قیدی کے لباس کا پھٹ

جانا ممکن تھا۔ بہر حال جوڑوں والا شعر غالب کا نہیں بھی تو اس کا موقع اور محل ان

کی قید نہیں، بالکل یہی کیفیت دوسرے شعر کی ہے۔



۱۔ لغات۔ رستخیز اندازہ :

جو اندازے میں قیامت کے برابر ہو۔

قیامت مبیا۔ قیامت جتن۔

محیط : ہر چیز کو گھیرے میں لے

لینے والا۔ ہر چیز پر حاوی۔

شرح : رات ساقی کے شوق میں

خمار میں نشے کے آثار کی کیفیت ایسی

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا

تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درس دفتر ہر کان کھلا

جہادہ اجڑائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

جو گئی تھی، لگو یا قیامت آگئی۔ شراب
 نہاں جہاں اور جس جس ظرف میں تھی،
 انگڑائی کا تصویر خانہ بن گئی تھی یعنی ساقی
 موجود نہ تھا۔ میکشوں کا مجمع نشے کے
 آثار کی بے مزگی اعلیٰ لطف کا باعث
 سر اسٹیکل پریشانی کی ایسی حالت میں تھا
 جیسی قیامت کو رونما ہوگی۔ تمام میکش
 میں لمبی انگڑائیاں لے رہے تھے۔ ایسا
 معلوم ہو رہا تھا کہ ہر شراب خانہ اور لگا
 کا سر ظرف شراب... ساغر، مینہ، سیو، شم، سومن و غیرہ سراپا انگڑائیوں کا تخیل مشق بنا ہوا ہے
 میکانوں کو انگڑائیاں اس وقت آتی ہیں، جب نشہ اُتر رہا ہو اور شراب کی
 طلب، انہیں پریشان کرے۔ شراب صرت ساقی پاسکتا ہے، جس کا انتظار ہو رہا
 ہے۔ اسی لیے ہر شراب خانہ اور اس کی ہر شے خیال سے کی صورت اختیار کر گئی۔
 شاعر نے شعر میں صرت یہ بتایا ہے کہ پیئے وائے نہار میں مبتلا ہیں، ساقی موجود نہیں،
 اس کا انتظار ہو رہا ہے۔

۲۔ شرح :- ہم نے وحشت کی گپٹنڈی پر ایک ہی قدم اٹھایا تھا، یعنی
 ہم پر وحشت کی بالکل ابتدائی حالت طاری ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اس کائنات کی
 کتاب کا درس ہم پر واضح ہو گیا۔ یعنی ہم نے سمجھ لیا کہ اس کتاب میں کیا کچھ لکھا ہے اور
 جو کچھ سمجھا، اس کی حقیقت یہ ہے کہ وحشت یعنی شوق و شیطنت کی انتہائی حالت دونوں
 جہانوں کے اجزاء کا شیرازہ ہے۔

مطلب یہ کہ اگر دونوں جہانوں کے اجزاء کو کتاب کے اوراق فرض کیا جائے
 تو ان اوراق کا بندھن اور انہیں اکٹھا رکھنے والا رشتہ وہ گپٹنڈی، وہ راستہ ہے۔
 جس پر جنوں و عشق میں قدم رکھا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جنوں و عشق ہی اس

دشیا، حقیقت ہے اور اسی کے ذریعے سے سب اجزا یکجا ہوتے ہیں۔

۳۔ لغات - وحشت خرامی : بیابانوں میں پکڑ لگانا۔

صحرا گرد : بیابان میں پھرنے والا۔

شرح : معلوم نہیں، پہلی کو بیابان کا جکڑ لگانے سے کون سی چیز روک رہی تھی؟ غریب مجنوں کا گھر تو پورا بیابان تھا۔ وہ جنون کی حالت میں ہر جگہ دوڑا پھرتا تھا۔ اس کے گھر کا تو کوئی حدود و حدود نہ تھا، جو پہلی کے لیے روک بن سکتا۔

۴۔ لغات - استغنا : بے نیازی۔ بے پروائی، سیر حشی۔

مرہون : گرد۔

شرح : حسن بے نیازی اور بے پروائی کا دم بھرتا ہے، لیکن دیکھیے

یہ بے پروائی کس طرح رسوا ہوئی؟ حسن کے ہاتھ مندی سے رنگے ہوئے ہیں، چہرے پر غارہ لگا ہوا ہے۔

مطلب یہ کہ جب ہاتھ مندی کے احسان مند ہیں اور اس کے بغیر سرخ نہ ہو سکتے۔ اسی طرح رخسار گلگونے یا کریم اور پوڑ کے بغیر آب و تاب پیدا نہیں کر سکتے تو حسن کی بے نیازی کے لیے کون سی گنجائش باقی رہ گئی؟

مرزا کہتا ہے چاہتے ہیں کہ حقیقی حسن کو بناؤ سنگار کی کوئی حاجت نہیں۔ اسے نہ ہاتھوں میں مندی لگانی پڑتی ہے نہ چہرے پر آئینہ لٹکانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بناؤ سنگار وہیں کیا جاتا ہے، جہاں قدرتی حسن کی کمی محسوس ہو، حالانکہ مندی اور غارے سے کام لے کر فضا اور ستورنا حسن کی بے نیازی کے لیے رسوائی کا باعث ہے۔ یورپ میں رسوائی عام ہے اور دوسرے مقامات پر بھی رسوائی میں کوئی کمی نہیں رہی۔

۵۔ لغات - لخت دل : دل کے ٹکڑے

بباد وادون : اڑانا، ہوا کے حوالے کر دینا۔ پریشان و برباد کر ڈالنا۔

شرح : دل سے جو غارے اٹھتے رہے، انہوں نے دل کے ٹکڑے نکال رکھے۔

ہوئے۔ یہی ٹکڑے میرے شہ تھے۔ میرا دیوان ان ناموں ہی کی یادگار ہے۔ مگر اس کا شیرازہ کوئی نہیں اور ورق ورق الگ الگ ہے۔



دوست غنوار می میں میری سعی فرمائیں گے کیا زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور کب تک ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے کیا حضرت ناصح گرائیں، دیدہ و دل فریب راہ کوئی مجھ کو تو یہ سمجھائے کہ سمجھائیں گے کیا آج وال تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں ہیں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا: یوں ہی یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا خانہ زادِ زلف میں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا ہے اب اس معورہ میں قوطِ غمِ اُلفت اسد ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھانچے گے کیا

۱۔ شرح :- دوست اور ہمدرد میرا غم کھانے کے سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟ ان کے بس میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ میرے ناخن کوٹا دیں تاکہ میں اپنے زخم نہ چھیل سکوں، لیکن یہ تو سوچے کہ جب تک میرے زخم بھرنے لگیں گے، اس وقت تک ناخن نہ بڑھ جائیں گے اور میں زخموں کے سوز میں ہونے سے پہلے پہلے انھیں دوبارہ نہ چھیل ڈالوں گا یہ مطلب یہ ہے کہ جنوں عشق میں علاج کی کوئی بھی تدبیر کی ہلے اسے قطعی نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس میں ایک پہلو اچھا نکالے تو وہ عارضی ہے، جو قنوطی ویر میں ختم ہو جائے گا، پھر پہلی حالت عود کر آئے گی۔

۲۔ شرح :- (محبوب سے خطاب ہے،

آپ جی بے نیاز اور بے پروائی حد سے زبردستی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ میں بڑے شوق سے دل کا حال منانے کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ کچھ کہتا ہوں تو آپ تغافل سے کام لیتے ہوئے فرما دیتے ہیں کیا کہا ہے

شعر کا جو پہلو بہ طور خاص قابلِ توجہ ہے، یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو درجہ و امتنان منانے لگے اور سننے والا کہہ دے کہ کیا کہا تو دروہ مند کے بیان میں وہ تشر اور گہرائی ہی باقی نہیں رہتی، جو اس امتنان کے لیے ضروری ہے۔ غالب تھے آپ فرمائیں گے کیا، میں اسی نکتے پر زور دیا ہے۔

۳۔ لغات۔ ویدہ و دل فرش راہ : آنکھیں اور دل ان کے راستے میں بچھا دوں یعنی وہ سر آنکھوں پر تشریف لائیں۔

شرح : اگر حضرت ناصح و عطف و نصیحت کے لیے تشریف لانا چاہتے ہیں تو شوق سے تشریف لائیں۔ ان کا آنا سر آنکھوں پر میری طرف سے خیر مقدم میں کوتاہی نہ ہوگی، بلکہ آنکھیں اور دل ان کے راستے میں بچھا دوں گا، مگر کوئی مناسب یہ تو سمجھا دیں کہ وہ مجھے کیا سمجھائیں گے، یعنی بعد پر ان کی نصیحت کا اثر کیا ہو سکتا ہے؟ ناصح کے رسمی خیر مقدم میں ہرگز ثنائی نہیں۔ یقیناً نصیحت بہتری اور بہبودی کے لیے کی جاتی ہے، مگر اصل سوال اثر اور نتیجہ کا ہے۔ جب معلوم ہے کہ سمجھانے کا اثر کچھ نہ ہوگا تو ناصح کی عزت اور مرتبے کا احترام کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ ان کی تکلیف دہائی قطعاً بے نتیجہ ہوگی۔

۴۔ شرح :۔ آج میں تلوار اور کفن سے کہ محبوب کے پاس جا رہا ہوں۔ اس کے بعد ان کے لیے میرے قتل میں کون سا عذر باقی رہ جائے گا؟

بظاہر وہی عذر ہو سکتے تھے : اول یہ کہ تلوار نہیں، دوم یہ کہ قتل کے بعد کفن کا کیا انتظام ہوگا۔ یہی دونوں عذر سامنے رکھ کر تیغ و کفن کا انتظام ضروری کیا۔

۵۔ شرح :۔ ناصح نے ہمارے جنونِ عشق کو ختم کرنے کے لیے بھی قید میں ڈال دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا قید جنونِ عشق کے انداز ہم سے ٹھیکر سکتی ہے؟

مطلب یہ ہے کہ جنوں عشق ہماری فطرت میں سراست کر چکا ہے جس طرح فطرت کو تبدیل کرنا ممکن نہیں، اسی طرح جنوں عشق بھی ہم سے چھڑایا نہیں جاسکتا بیشک نصیحت کرنے اور راہ خیر خواہی تدبیر کے لیے انتہائی قدم اٹھالیا یعنی ہمیں قید میں ڈال دیا، لیکن جنوں عشق صحرا و زوئی پر موقوف نہیں، ہم سے اسیری میں بھی برابر اس کے مظاہرے سرزد ہوتے رہیں گے۔

بظاہر ناصح کا لفظ یہاں محض نظر معلوم ہوتا ہے، اس کی جگہ کوئی ایسا آدمی ہونا چاہیے، جو حکومت کی طرف سے غیر مناسب افعال کے اسناد پر مامور ہو، مثلاً محاسب، لیکن مرزا نے یہاں ”ناصح“ والہ نسبت استعمال کیا۔ ان کا مقصود وہ مزد ہے، جو اور راہ خیر خواہی یہ تدبیریں اختیار کر رہا ہے، لہذا یہاں ناصح ہی جنوں ہے۔ خود قید کرتا اس کا کام نہ ہو، مگر وہ قید کر سکتا ہے۔

اس شعر کا ایک معنوم اور بھی ہے۔ یعنی جو لوگ حق و صداقت سے سچا عشق رکھتے ہیں، اُن کے راستے میں جتنی ہی تکلیفیں اور مشقتیں آجائیں، وہ روگرداں نہیں ہوتے۔ ہر مصیبت صبر و سکون سے جھیل لیتے ہیں اور اپنے مقصد کے لیے ہر ممکن سعی پر بدستور قائم رہتے ہیں۔ گویا مرزا کا مطلب یہ ہے: ہمیں کسی بھی سلوک سے سابقہ پڑے، کتنی ہی تکلیفیں پیش آئیں، ہم حق و صداقت سے منہ نہیں موڑ سکتے۔

۶۔ لغات۔ خانہ زاد: جو کسی کے گھر میں پیدا ہوا ہو اور وہیں پلا

ہو۔ بظاہر اس کا مطلب ہے وہ شخص، جو کسی گھر سے خصوصی نسبت رکھتا ہو لیکن جاگیر داری کے دور میں اس کا اطلاق غلاموں یا ان کی اولاد پر ہوتا رہا۔

شرح: ہم زلف کے خانہ زاد ہیں، یعنی ہمیں زلف سے ایسی خصوصی نسبت ہے، جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی، اس لیے ہم زنجیر سے کیونکر ڈور بھاگ سکتے ہیں؟ اس مصرع میں زنجیر اور زلف کی مناسبت ظاہر ہے، نیز زلف کے پیچ کو خانہ قرار دے کر وابستگی کی بنا پر اپنا خانہ زاد ہونا ثابت کیا۔ خانہ زاد کے لفظ سے مرزا کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح خانہ زاد اس گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے،

میں وہ پیدا ہوا اور پرورش پائی اور اس گھر سے قطع تعلق کا تصور بھی نہیں کر سکتا، اور مکان کو اپنا مانسمجھ سکتا ہے، یہی کیفیت زلف کے تعلق میں ہماری ہے۔ پھر ہم وفا کے پابند اور اپنے عہد پر قائم و استوار ہیں۔ کون سی وجہ ہے کہ ہم قید خانے سے گھبرا اٹھیں گے؟

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ زلف محبوب سے گہری اور ناقابل شکست وابستگی ہمارا شیوہ ہے۔ اس بنا پر ہمیں زنجیری پینا دی جائیں تو کچھ پروا نہیں۔ اسی طرح ہم وفا کے راستے پر قدم جمائے کھڑے ہیں اور قید سے ہمیں کوئی باک نہیں۔ اگر زلف کو کسی اعلیٰ مقصد کی لطیف تعبیر قرار دے لیا ہے تو پورا شہر دعوت ^{بہاد} بن جاتا ہے۔ یعنی اعلیٰ مقاصد سے سچا عشق رکھنے والوں کا شیوہ یہ نہیں کر قید و بند سے ڈر جائیں یا گھبرا اٹھیں۔

۷۔ لغات - معرورہ : بستی۔ شہر آباد مقام یا زمین۔

شرح :- اسے اسدِ ادا میں تو غم عشق کا قحط پڑ گیا ہے، یعنی جس طرح قحط کے زمانے میں کھانے پینے کی جنسیں محدود رہ کر کیا جاتی ہیں، اسی طرح یہاں عشق کی جنس کیا جاتی ہو چکی ہے۔ ہمیں غم عشق کا ایسا مزہ پڑ گیا ہے کہ اس کے سوا ہمارا گزارا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس بستی میں مٹھرے نہیں تو سوال یہ ہے کہ ہم کھائیں گے کیا اور زندہ کیونکر رہ سکیں گے؟

غمِ العنت یعنی غمِ عشق سے مراد کسی خاص محبوب کا عشق نہیں۔ یعنی یہ غم خاص نہیں بلکہ عام ہے، خواہ وہ اعلیٰ مقاصد کا عشق ہو، محبوب کا عشق ہو، سمجھنوں کی باہم غمخواری، اخلاص اور ہمدردی ہو، غرض ہر چیز اس غمِ العنت میں شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بستی میں یہ جنس نامید ہو، جو انسانیت کا زلیلہ اور آدمیت کا جوہر ہے، وہاں رہ کر ہمارا گزارہ کس طرح ہو گا؟

یہ نہ تھی ہمارے قسمت کی قسمت کہ وصال ملے ہوتا
 اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
 ترے وعدے پر جسے ہم، تو یہ جان بھرتا
 کہ خوشی سے مر نہ جانے اگر اعتبار ہوتا
 تری ناز کی سے جانا، کہ بندھا تھا عہد بوا
 کبھی تُو نہ توڑ سکتا۔ اگر استوار ہوتا
 کوئی میرے دل سے پوچھے تیرا نیم کش کو
 یہ غلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
 یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
 کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
 رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھکتا
 جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
 غم اگر چہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
 غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
 کون کس سے ہیں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
 مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک چار ہوتا

۱۔ شرح : ہمارے قسمت
 میں محبوب کا وصال تھا ہی نہیں،
 اچھا بڑا کہ ہم مر گئے۔ اگر کچھ صبر
 اور جیتے رہتے تو وہ بھی اسی انتظار
 میں گزر جاتا۔

شر سادگی اور حسن بیان کے
 اعتبار سے نہایت اچھا ہے۔ اس
 میں سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے
 کہ اگر وصال یا یہ مقتدر نہ ہو تو زندگی
 سے موت ہی بہتر ہے۔ مشورہ رخل
 ہے۔ انتظارِ اشد من الموت
 یعنی انتظارِ موت سے بھی زیادہ
 سخت اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔
 انتظار اور وصلِ محبوب کا انتظار
 عاشق برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ
 تیغِ رومی و خنجرِ ہندی
 نہ کند آنچہ انتظار کند
 پھر جب مقتدر میں بھی نہیں تو
 لا حاصلِ انتظار کی نہ جیتیں اٹھانے
 سے کیا فائدہ ؟

۲۔ شرح : اگر بہتری
 طرف سے وصل کا وعدہ سن کر بھی
 حقدار رہے تو یقیناً جان لے کہ ہم

ہوتے مرنے کے ہم جوڑ سوا، ہوئے کیوں نہ غرق دیا
 نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کمیں مزار ہوتا
 نے اس وعدے کو کبھی سچا سمجھا
 اگر سچا سمجھ لیتے اور اس پر ہیں
 اعتبار ہوتا تو کیا خوشی کی فراوانی
 سے ہم پر شادی مرگ کی کیفیت
 طاری نہ ہو جاتی اور ہم جاں چن
 نہ ہو گئے ہوتے ؟

یہ مسائل نصوت ایہ ترا بیان غالب !
 عاشق کے لیے محبوب کے وعدہ
 منجھے ہم دلی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
 وصل سے بڑھ کر خوشی کی کوئی چیز
 نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی معلوم ہے کہ

جس طرح لوگ رنج و الم کی فراوانی برداشت نہ کر سکے اور مر گئے، اسی طرح ایسی
 مثالیں بھی ملتی ہیں کہ لوگوں کو اچانک انتہائی خوشی کی خبر پہنچی اور وہ خوشی میں آپے
 سے باہر ہو کر یا تو مر گئے یا داغ میں غلج آ گیا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ محبوب کے وعدہ
 وصل پر اعتبار ہوتا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمیں اس پیمانے پر خوشی حاصل ہوتی ہو یا
 ضبط و تحمل سے باہر ہوتی اور اس کا نتیجہ موت ہی ہو سکتا۔ چونکہ اصل وعدے کو جو بڑھ
 سمجھا اس لیے خوشی نہ ہوتی اور زندہ رہے۔

کہا گیا ہے کہ میلی ہر دی نے اسی مضمون کا ایک شعر کہا ہے :

بیم از وفا عار و بدہ وعدہ کہ من

از ذوق وعدہ تو بہ فرذا نمی رسم

یعنی تو میرے ساتھ وصل کا وعدہ کرے اور اسے پورا کرنے کا خوف دل سے
 نکال ڈال، کیونکہ تیرے وعدے سے جو خوشی ہوگی، وہ مجھے زندہ نہ رہنے دے گی۔
 بلاشبہ ہر دی نے وعدہ وصل کو انتہائی خوشی کا موجب قرار دیا ہے، جس
 سے عاشق مر سکتا ہے، لیکن شعر کی عام صورت غیر طبعی ہے۔ یعنی محبوب سے یہ
 کہنا کہ تو وعدہ کرے، میں اس خوشی میں مر جاؤں گا اور تجھے وعدہ پورا کرنے کی عزت

مڑے گی، فطری حالات سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ اُس وعدے سے شادی مرگ کیونکر ہو سکتی ہے، جس کے متعلق یقین ہو کہ اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری نہ آئے گی اور عاشق اس سے محظوظ ہو گا۔ غالب نے اس معنوں کو طبعی صورت دے دی کہ محبوب نے وعدہ کیا اور عاشق نے یقیناً سمجھ لیا کہ یہ وعدہ پورا نہ ہو گا، لہذا وہ خوشی ہی نہ ہوتی، جس کی فراوانی عاشق کو مار سکتی تھی۔ پھر کمال یہ ہے کہ حقیقت بھی بطور اصول پیش نہیں کی، بلکہ متعجب ہو کر محبوب سے سوال کرتے ہیں کہ وعدے کا یقین ہوتا تو خود سوچ کر ہم زندہ رہ سکتے تھے؟ خوشی میں ختم نہ کر دیتی؟

۳۔ **شرح :** محبوب سے خطاب ہے کہ تو سراپا نزاکت ہے، تیرا جسم نازک، تیرا مزاج نازک، اس حالت میں جو ہر میان باندھا جاتا، وہ بہر حال نازک اور کمزور ہی ہو سکتا تھا۔ اگر وہ پیمان مضبوط اور محکم ہوتا تو تجھے ایسا پاکیزہ نزاکت اسے ہرگز توڑ نہ سکتا۔

۴۔ **لغات :** تیرنیکیش : وہ تیر، جو کمان کو پورا نہیں، بلکہ آدھا کھینچ کر چھوڑا جائے۔ نشاۃ جتنی دُور ہوتا، اسی لحاظ سے کمان کھینچ کر تیر پھینکتے۔ اگر نشاۃ بہت قریب ہوتا تو کمان کھینچنے پر پورا زور صرف نہ کیا جاتا۔
خلش : کشن۔ چھن۔

شرح : اے محبوب! تو نے کمان آدھی کھینچ کر تیر پھینکا۔ وہ جگہ میں پست ہو گیا۔ چونکہ اس پر زور کم صرف ہوا تھا۔ اس لیے جگہ کو چھید کر باہر نہ نکل سکا، بیچ ہی میں اٹکا رہ گیا۔ اس کی خلش نے دل کو ایسا مزہ دیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اگر پورے زور سے تیر پھینکا جاتا اور وہ جگہ کو چھیدتا ہوا باہر نکل جاتا تو زخم مزور ہو جاتا، مگر مسلسل کشن نہ ہوتی۔ عاشق کے لیے مزہ اس کشن ہی میں ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے، کا جملہ لذتِ خلش کی ایسی کیفیت واضح کر رہا ہے جس کا کوئی اندازہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ **شرح :** دوستی کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ تمام درست نصیحت کریں گئے

ہیں۔ مجھے دماغ سناٹے رہتے ہیں کہ تمہیں یہ نہ کرنا چاہیے، وہ نہ کرنا چاہیے۔ نصیحت گری سے دوستی کا حق کیونکر ادا ہو سکتا ہے؟ حقیقی دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی مجھے آرام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرتا۔ میرے دل کے زخموں پر مرہم رکھتا۔ محبوب سے ملانے کا کوئی طریقہ سوچتا اور میرا غم غلط کرتا۔ تعجب یہ کہ دوستی کے یہ واضح طور طریقے چھوڑ کر اجنبی سے میرے ساتھ دوستوں کی ہمدردی ظاہر ہوتی، انہوں نے نصیحتیں شروع کر دیں ہیں، جو مجھے ناگوار گزرتی ہیں اور ان سے فائدہ بھی کچھ نہیں۔

۶۔ **تشریح :-** غم ایسی جانگداز اور ہلاکت خیز چیز ہے کہ اگر یہ چونکا رہی بن کر پتھر کی رنگوں میں داخل ہو جاتا تو اس سے یوں ہو بسنے لگتا کہ پھر روکے نہ دیتا۔ ظاہر ہے کہ جو چیز بے حس پتھر کی رنگوں سے بھی لہو شپکا سکتی ہے، اس سے انسانی قلب پر کیا کچھ گزرتی ہوگی، جو سراپا احساس ہے۔

۷۔ **لغات :-** جانگسل : جان کو ہلاک کر دینے والا، گھٹلا دینے والا۔
تشریح :- غم یقیناً جان کو گھٹلا دینے والا، تباہ کر دینے والا اور ہلاکت کے گھاٹ اتار دینے والا ہے، لیکن کیا کریں کہ معاملہ دل سے آپڑا ہے، اس لیے ہم غم سے بچ نہیں سکتے۔ فرض کریں گے کہ ہم نے عشق کا غم نہ لگایا، مگر دل کی فطرت و طبیعت ہی یہ ہے کہ کسی نہ کسی غم سے وابستگی کا رشتہ قائم رکھے۔ غم عشق نہ ہو گا تو وہ زمانے کے دوسرے غموں میں الجھ جائے گا۔ بہر حال دل غموں سے خالی نہیں رہ سکتا۔

شعری ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں غمنا غم عشق کو برتر و بالا قرار دے کر اس کی طرف یہ کہہ کر بلا لایا گیا ہے کہ اگر یہ غم قبول نہ کرو گے، تو دنیا کے دوسرے غموں میں مبتلا ہو جاؤ گے، مثلاً جان و مال کا غم، اہل و عیال کا غم، فراغتِ مال کا غم وغیرہ۔

۸۔ **تشریح :-** میں شبِ غم کی کیفیت کہوں تو کس سے کہوں؟ کوئی اہل ہی نظر نہیں آتا۔ اگر نظر بھی آئے اور اس سے کہوں تو کیا کہوں؟ اسے ٹھیک ٹھیک

بیان کرنے کا انداز کہاں سے لاؤں؟ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ نہایت بڑی بلا ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ایک ایک لمحہ جاگنی میں گزر رہا تھا۔ ہر سانس میں موت کی کیفیت مجھ پر گزرتی تھی۔ مرنے سے بس نہیں ڈرتا تھا، بشرطیکہ ایک ہی بار موت آتی اور میں ختم ہو جاتا، لیکن میرا ایک ایک لمحہ موت کے مُتھ میں گزرتا رہا۔ نہ مخلصی کی کوئی صورت تھی، نہ موت کی تکلیفوں میں کوئی کمی نظر آتی تھی۔ ایک بار مر جاتا بڑا نہ تھا، مگر شبِ غم نے تو مجھے ایسی حالت میں مبتلا کر دکھا تھا، گویا ہر آن موت کی تمام تکلیفیں مجھ پر طاری ہو رہی تھیں، لیکن جان نہیں نکلتی تھی، جان نکل باقی تو یہ لمحہ بہ لمحہ مرنے کی تکلیفیں پہنے سے رہائی پاتا تھا۔

دیکھیے، شاعر کا کمال کہ شبِ غم کے متعلق حقیقتہً کچھ نہیں کہا، مگر جو کچھ کہا ہوا سکتا تھا، وہ کہ گیا۔ لفظوں میں ایسی تصویر کینچ دی کہ کوئی بھی پہلو چھپا نہ رہا۔ پھر یہ کہ ایک بار موت آجاتی تو مجھے اس کے لیے تیار ہونے میں کیا مضائقہ تھا۔ اس میں شبِ غم کی پوری کیفیت سامنے آگئی۔

۹۔ شرح :- مرنے کے بعد ہماری جو رسوائی ہوئی، اس سے کہیں بہتر تھا کہ دریا یا سمندر میں ڈوب جاتے تاکہ نہ جنازہ اٹھانے کی فوجیت آتی اور نہ کہیں دفن ہوتے۔

ظاہر ہے کہ رسوائی کا نقشہ شاعر نے دوسرے مصرع میں پیش کیا ہے، یعنی جنازہ اٹھا تو کوئی متوہ نہ تھا اور بیکی کے ہوا کسی کی رفاقت حاصل نہ تھی۔ تربت بنی تو اس پر کوئی جھلانے والا یا اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ اس رسوائی سے محفوظ رہنے کا صرف ایک پہلو شاعر کو نظر آیا اور وہ یہ کہ ڈوب کر مر جانا۔

مرڈانے مرنے کے بعد بیکی کی ایک تصویر اور بھی کھینچی، جو اس سے کم حسرت ناک نہیں اور اس تصویر کی طرح وہ بھی خیالی و قیاسی نہیں، بلکہ میں حقیقت پر مبنی ہے، یعنی :

مادرِ ابد یا غیر میں مجھ کو وطن سے دور رکھ لی مرے خزانے مری بیکی کی شرم

جس طرح دیا یا سمندر میں ڈوب مرنے سے بے کسی کا ہر پہلو چسپا رہ سکتا تھا
اسی طرح وطن سے باہر کسی اجنبی ملک میں مرنے سے بھی یہ مقصد پورا ہو سکتا تھا
کیونکہ مسافر کے وطن یا اس کی حیثیت یا اس کے عزیزوں، رشتہ داروں اور
دوستوں کی حیثیت سے کوئی آگاہ نہیں ہوتا۔

۱۰۔ لغات - یگانہ : واحد۔ اکیلا۔ ایک

یکتا : بے مثل، بے نظیر۔

دوئی : وحدت کی منہادو ہونا (ایک کے، بہائے) کسی کا خدا کے ساتھ

شریک ہونا۔

دوچار ہونا : دکھائی دینا، نظر آنا۔

شرح :- خدا کو کون دیکھ سکتا ہے، کیونکہ وہ تو اپنی ذات میں اکیلا اور

بے مثل ہے۔ اُس جیسا دوسرا وجود کوئی نہیں۔ اگر اس میں دوئی کا خفیف سا شائبہ
بھی ہوتا تو ضرور کہیں نہ کہیں نظر آجاتا، لیکن اُس کی ذات تو غیرتیت اور دوئی
سے بہت بالا ہے۔ پھر اسے غاہری آنکھوں سے کون دیکھ سکتا ہے ؟

۱۱۔ شرح :- اسے غائب ! تو تصوف اور روحانیت کے مسئلے پیش کرتا

ہے۔ چرتیرا انداز بیان اتنا دلکش و دلآویز ہے کہ جو کچھ تو کہتا ہے، وہ دل میں
اُتر جاتا ہے۔ یہ تو ولیوں کی سی باتیں ہیں۔ اگر تو شراب نوش نہ ہوتا تو ہم تجھے بھی
ولی سمجھ لیتے۔

مرزا نے پہلے مصرع میں اپنی جو خصوصیتیں بیان کی ہیں، انہیں خود ستائی

یا سخن طرازی نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ وصف ان کے کلام میں بدرجہ اعلیٰ موجود تھے جنہیں
تصوف کے مسائل ہی نہیں، بلکہ حکمت و فلسفہ اور عام معاملات بحبت بھی وہ
ایسے نادر انداز میں پیش کرتے تھے، جس کی کوئی مثال مشکل سے ملے گی اور یہ
جو ہر ان میں فی الواقع موجود تھا۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں : ”بیان کیا جاتا ہے، ابو ظفر بہادر شاہ ثانی نے

مرزا کی اس غزل کا مقطع سنا تو کیا : بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے ، یعنی تم شکیب
نوش نہ ہوتے اور ایسے ہی مسائل اسی انداز میں بیان کرتے ، جب بھی تمہیں
ولی نہ مانتے ۔ مرزا نے معاف کیا : حضور تو اب بھی مجھے ولی ہی سمجھتے ہیں گریس
یہی ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر معذور نہ ہو جاؤں ۔



ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ؟	نہ ہو مرنا تو جینے کا سزا کیا ؟
تجرباںِ پیشگی سے مدعا کیا ؟	کہاں تک ، اے سراپا ناز کیا کیا
نوازش ہانے بے جا دیکھتا ہوں	شکایت ہائے زگیں کا ، گلا کیا ؟
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں	تغافل ہائے تمکیں آزا کیا
فروغِ شعلہٴ خن یک نفس ہے	ہوس کو پاس ناموسِ وفا کیا
نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے	تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطرِ پیرا ہن نہیں ہے	غمِ آوارگی ہائے صبا ، کیا
دل ہر قطرہ ہے ، سازا نا البحر	ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے ، میں فنا من ادھر دیکھ	شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا ؟
سُن ! اے فناءتِ گر جنسِ وفا سُن !	شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا ؟
کیا کس نے جگر واری کا دعوائے	شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

یہ قاتل و عدو صبر آزمایوں یہ کافر فتنہ طاقت ربا کیا ؟
 بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا

۱۔ لغات - نشاط کار : کام کرنے کی اُتنگ ، سعی و جہد کا جذبہ ۔

شرح :- خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”جہاں تک معلوم ہوا ہے ، یہ ایک نیا خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں
 بلکہ فیکٹ ہے ، کیونکہ دنیا میں جو کچھ چل پل ہے ، وہ صرف اس یقین کی
 بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے ۔ یہ انسان کی طبعی
 خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت فزیل ہو ، اسی قدر زیادہ سرگرمی
 سے کام کو سرا انجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے ، اسی قدر
 کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے ۔“

مطلب یہ ہوا کہ کام کرنے کا جوش اور دلولہ صرف اس وجہ سے ہے کہ موت سر
 پر کھڑی ہے ، معلوم نہیں کب آ رہے ، اس لیے انسان کی ہوس چاہتی ہے ، تمام کام
 جلد سے جلد پورے کرے ، گویا دنیا میں جو چل پل ہے ، وہ انسان کی ہوس کا نتیجہ ہے
 اور ہوس کی تمام سرگرمیاں اس پر موقوف ہیں کہ زندگی کے دن تھوڑے ہیں ۔ اس سے
 ثابت ہوا کہ زندگی کی پوری رونق اور لطیف و لذت صرف موت کا نتیجہ ہیں ۔ مرنا نہ ہوتا
 تو جینے میں کچھ مزہ نہ رہتا ، کیونکہ ساری چل پل ختم ہو جاتی ، جوش و سرگرمی کا ہنگامہ
 ٹھنڈا پڑ جاتا ۔

انسان کے جوش و دلولہ کو ہوس سے تعبیر کرنے کا مقصد غالباً یہ ہے کہ یہاں جو
 کچھ ہو رہا ہے ، وہ انسان کی خام آرزوؤں اور امیدوں کا کرشمہ ہے ۔

۲۔ لغات - تنجائیل پیشگی : جان بوجھ کر انجان بننے کی عادت ۔

شرح :- اے محبوب ! تم واقعی سراپا ناز ہو ، تمہاری ہر بات ایک ادا
 اور کرشمہ ہے ، لیکن یہ تو بتاؤ کہ جان بوجھ کر انجان بننے کی عادت سے تمہارا

مقصد یہ ہے ؛ میں جب کبھی اپنا دکھ درد بیان کرتا ہوں اور دل کا حال سناتا ہوں تو کہہ دیتے ہو ؛ کیا کہا ہے اور کوئی بھی بات تو تجھ سے نہیں سنتے ۔ اس سے آخر تمہارا راز کیا ہے ، تغافل کی کوئی وجہ اور سبب تو بتاؤ ؟

۳۔ شرح :- اے محبوب ! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے دلیلوں اور حریفوں پر ایسی نوازشیں اور ایسی مہربانیاں کر رہے ہو ، جن کے وہ ہرگز مستحق نہیں ۔ ایسی عنایتیں تو صرف مجھ پر ہونی چاہیے تھیں ، جو سچا عاشق ہے ۔ میں وہ بے موقع اور بے محل مہربانیاں دیکھ کر محبت بھرے انداز میں شکایت کرتا ہوں تو تم بگڑ شکوہ شروع کر دیتے ہو ، جب تمہیں یہ نوازشوں کا کچھ خیال نہیں تو میری محبت پر شکایت دلا کیوں کرتے ہو ؟

شاعر نے محبت بھری شکایتوں کو شکایت ہائے رنگیں قرار دیا ، کیونکہ عاشق کا ہزن ۔ سہ ہر شکایت محبت ہی کا کرشمہ ہوتی ہے ۔ یہ مقصد نہیں ہوتا کہ محبوب سے تعلق توڑ لیا جائے ۔ ایسی بات سچے عاشق کے خیال میں کبھی نہیں آسکتی ۔

۴۔ لغات :- بے محابا ؛ بے تکلف ، بے محاب ، بے خوف ۔
تغافل ہائے تمکین آزما ؛ جان بوجھ کر ایسی بے پروائی اختیار کرنا ، جس کا مدعا یہ ہو کہ عاشق کے صبر و شکیب کا امتحان لیا جائے ۔

شرح :- اے محبوب ! تمہارا شیوہ یہ ہو گیا ہے کہ مجھ سے تغافل برتو ۔ مجھ پر تو تجھ مذکورہ اور بے پروائی سے کام لیتے رہو ۔ اس طرح تم چاہتے ہو کہ میرے صبر و استقلال کو آزما دیا جائے ۔ امتحان لیا جائے کہ میں کتنے پانی میں ہوں ۔ یہ کیوں سمجھتے ہو کہ اس طرح میرے استقلال کا پیمانہ چھٹک جائے گا اور میں اپنی قوت برداشت کھو بیٹھوں گا ۔ اگر تم مجھے تڑپاتا اور لوٹاتا ہی چاہتے ہو تو تغافل چھوڑو اور ایک جبر لوہے بے باک نگاہ مجھ پر ڈالو ۔

۵۔ لغات :- فروغ ؛ حرارت ، گرمی ، روشنی
شعلہ خن ؛ وہ شعلہ جو تنکا جلنے سے اٹھتا ہے ، معلوم ہے کہ تنکا ایک

لے میں جل جھٹلتا ہے اور شعلہ بھی جلد سے جلد ختم ہو جاتا ہے ۔
مؤسس : یہاں مراد رقیب سے ہے ۔

شرح : جو شعلہ تنکے کے جلنے سے اٹھتا ہے ، اس کی حرارت اور روشنی کی مدت ایک سانس سے زیادہ نہیں ۔ یہی حالت ان رقیبوں کے دھوائے عشق کی ہے ، جنہیں محبت سے کوئی علامت نہیں ، البتہ ہوس سے ان کے سینے بھرے ہوئے ہیں ۔ اسے محبوب ! ایسے لوگوں سے آپ کیونکر امتیاز رکھ سکتے ہیں کہ وہ وفاداری کی عزت کا پاس کریں گے ، عشق میں وفاداری اور ثابت قدمی تو سچے عاشقوں کا کام ہے ۔ رقیبوں سے ایسی توقع کیونکر ہو سکتی ہے ؟

۴۔ **شرح :** اگر ساقی نے ہم سے بے پروائی اور بے نیازی اختیار کر رکھی ہے اور خراب نہیں دیتا تو ہم شکایت کیوں کریں ، جب ہمارا سانس مستی و بے ہوشی کے سمندر کی لہر بنا جڑا ہے ؟ یعنی ہم بے وقوف عشق ہی کی مستی میں گم ہیں ، ہمیں ساقی کی بے پروائی کا کیا گلہ ہو سکتا ہے ؟

۵۔ **لغات :** دماغ نہ ہونا : برداشت نہ ہونا ۔ گوارا نہ ہونا ۔

شرح : ہمیں پیراہن کی خوشبو سونگھنا گوارا ہی نہیں ، اس لیے اگر صبا اس خوشبو کو ادھر ادھر اڑائے پھرتی ہے ، تو ہمیں اس کا کیا غم ہو سکتا ہے اور ہمارے یہ شکایت کی کون سی وجہ ہے ؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کس کے پیراہن کی بو کا ذکر ہے ؟ اگر پیراہن محبوب مراد دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم محبوب کے طلب گار ہیں ، پیراہن محبوب کی خوشبو کے نہیں ۔ یہ خوشبو ہمارے لیے ہرگز وجہ تسکین نہیں ہو سکتی ۔ صبا بیشک اسے ہر طرف اڑائے لیے پھرے ، ہمیں اس سے کیا ؟ یہاں عرفی کا ایک ایسا ہی شعر یاد آگیا ، کہتا ہے :

قاخ ہو بوسے دوست نہ گردید ذوقی ما
 این جنس را بہ مفلس کنعان فروختیم

یعنی ہم دوست کی خوشبو پر قناعت نہیں کر سکتے۔ یہ جنس ہم نے حضرت یعقوب کے حوالے کر دی جو پیراہن پوش کی خوشبو پر خوش ہوئے تھے۔ غالب کے اس شعر کا مدعا بھی یہی ہو سکتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ محبوب کا پیراہن جس عطر میں بसा یا گیا ہے، وہ رقیب کا عطر ہے۔ گویا محبوب رقیب کے گھر گیا اور وہاں اس کے پیراہن کو عطر لگا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ عاشق کو یہ عطر اور یہ خوشبو کبھی پسند نہیں آ سکتی۔ صبا کا خاصہ ہی یہ ہے کہ خوشبو اپنے دامن میں سیٹ کر جا بجا بکھیرتی رہتی ہے۔ شاعر نے اس کے دور و سیر کو آوارگی سے تعبیر کیا، جو بظاہر اک گوند حقارت آمیز تعبیر ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کے لباس کو جو عطر لگا یا گیا، وہ عاشق کے لیے انتہائی نا پسندیدگی کا باعث تھا۔

۸۔ لغات - انا البحر : میں سمندر ہوں۔

شرح :- ہر قطرے کا دل انا البحر کا ساڑنا ہوا ہے، یعنی ہر قطرے کے اندر سے صدا اٹھ رہی ہے کہ میں سمندر ہوں مجھے حقیر چیز نہ سمجھنا چاہئے۔ اسی طرح ہماری انفرادی ہستی کو بھی سمول نہ جانو، ہماری عظمت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ جزو ہونے کے باوجود ہم جس کُل سے تعلق رکھتے ہیں، اس کی عظمت پر ہی کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ گویا قطرے کو جو نسبت سمندر سے ہے، وہی نسبت ہر وجود کو اس کے مبدی سے ہے۔

۹۔ لغات - محابا : خوف۔

خوشہا : خون کی قیمت۔ زمانہ قدیم میں دستور تھا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کو خون کی رقم ادا کر دیتا تھا۔ اسے ندیہ بھی کہتے ہیں۔

شرح :- اے محبوب! تجھے خوف کس بات کا ہے؟ آنکھ اٹھا کر میری

جھٹکا کہہ۔ میں ذمہ دار ہوں کہ تجھ سے کوئی باز ٹپس نہ ہوگی۔ بھلا یہ تو سوچ

بے حس دست کے شہیدوں کا بھی کوئی خوشہا ہوتا ہے؟

کسی کو قاتل ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس نے مقتول پر ضرب کا کوئی آلہ استعمال کیا ہو، تلوار یا خنجر یا کوئی اور چیز نگاہ ایسی چیز نہیں، جو آلہ ضرب سمجھی جاسکے، لہذا شاعر نے بے تکلف کہا کہ اسے محبوب! اگر تیرے ایک نظر دیکھ لینے سے میں یا کوئی دوسرا شہید ہو جائے تو تجھے پر خون کی قیمت ادا کرنے کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔

ادھر دیکھ میں ایک پہلو صرف تنبیہ کا ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ میری طرف دیکھ۔ گویا عاشق محبوب سے نگاہ التفات کا طلب گار ہے اگر اس وجہ سے شہید بھی ہو جائے تو وہ خود ذمہ دار ہو کر محبوب کو یقین دلاتا ہے کہ اطمینان رکھ اس کے لیے کوئی فدیہ طلب کیا ہی نہیں جاسکتا۔

۱۰۔ لغات - شکست قیمت : نارس میں اس کا مطلب یہ ہے، بہائم ہو جانا، قیمت گھٹ جانا۔

شرح :- اسے وفا کی جنس کو لوٹ لے جانے والے محبوب! سن اور توجہ سے سن کہ میرے دل کی قیمت تو اسی جنس کی بدولت تھی۔ یہ جنس نارت ہوئی تو دل کی کوئی قیمت ہی نہ رہی۔ اب تجھے کس بات کا خوف ہے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر چیز کے ٹوٹنے سے کوئی نہ کوئی آواز نکلتی ہے، لیکن قیمت دل کی شکست کی کوئی آواز نہیں۔

بعض نسخوں میں ”قیمت دل“ کی جگہ ”شیشہ دل“ درج ہے اور اس کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ محبوب کو شیشہ دل توڑنا یعنی دل شکنی کرنا پسند ہے، اس لیے اسے دعوت دی گئی ہے کہ شیشہ دل توڑتا رہ۔ لیکن صحیح ”شیشہ دل“ نہیں، بلکہ ”قیمت دل“ ہی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عاشق کے دل کی سب سے بڑی متاع محبوب کے صاف دونا اور عشق میں ثابت قدمی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔

۱۱۔ لغات - جگر داری : حوصلہ، استقلال، بہت۔

شکلیب : صبر۔

مشرح : اے محبوب ! تو میرے حوصلے اور استقلال کی آزمائش کر رہا ہے۔ ذرا یہ تو سوچ، میں نے ہمت اور ثابت قدمی کا دعویٰ کب کیا ؟ اگر میں ایسا دعویٰ کرتا تو واقعی امتحان لینا بالکل بجا ہوتا۔ بھلا عاشق کے دل کو صبر و سکون سے کیا واسطہ ؟

اس مقام میں شیخ سعدی کا شعر نہایت دلاویز ہے :

دے کہ عاشق و صابر بود، مگر سنگ است

ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

یعنی جس دل میں عشق ہو اور وہ صبر سے کام لینے کا بھی دعوئے کرے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ دل نہیں، پتھر کا ٹکڑا ہے۔ عشق اور صبر کے درمیان ہزاروں میل کی مسافت ہے، یعنی وہ ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے۔

۱۲۔ **مشرح :** اے قاتل ! یعنی محبوب ! تو ایسا وعدہ کیوں کرتا ہے، جو صبر کو آزمائش ہی ڈال دیتا ہے۔ یعنی قدم قدم پر صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ اے کافرا ! یعنی محبوب ! وہ قند کیوں برپا کرتا ہے، جو ہماری قوت و طاقت ہی چھین لے جانے والا ہے۔

۱۳۔ **مشرح :** اے غائب ! محبوب کی ہر بات میرے لیے بلائے ہوا ہے، یعنی سخت اضطراب و پریشانی کا باعث ہے، گویا جان لیوا ہے۔ خواہ اس کی باتیں (تخریری یا ذبانی) ہوں یا اشارے کنایے ہوں یا ادائیگیں ہوں۔



۱۔ **لغات :** درخور : درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سانہ ہوا
لائق : قابل۔ شایاں۔
مشرح : جب محبوب کے پھر غلط کیا سہجہ کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود میں ہیں، کہ ہم
اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر روانہ ہووا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
رُہ بُرد کوئی بے آئندہ سیما نہ ہووا
کم نہیں، نازش ہم نامی چشمِ خواباں
تیرا سبب، بُرا کیا ہے، اگر اچھا نہ ہووا
میں نے کا داغ ہے وہ نالہ، کہ لب تک گیا
خاک کا ندق ہے وہ قطرہ جو دریائے نہ ہووا
نام کا میرے ہے وہ دُکھ، کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہووا
ہر بُنِ نوسوم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمرہ کا نقشہ ہووا، عشق کا چرچا نہ ہووا
قطرے میں، دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہووا، دیدہ بینا نہ ہووا
تقی خیر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، اپے تماشا نہ ہووا

عقاب اور ستم کے لائق ہم جیسا
اور کوئی نہیں تو ہمارا یہ کتنا کیونکر
غلط قرار دیا جاسکتا ہے کہ ہمارا
مہر کوئی پیدا ہی نہیں ہوا؟

شکر کی یہ نشرِ معشوقِ مجازی
کے مطابق ہے، حقیقت کے

نقطہ نگار سے دیکھا جانے تو اس
میں انسان کو، حُرفِ انشودات ثابت
کیا گیا ہے، شاعر کتنا ہے کہ پورے
کائنات میں صرف ہم یعنی انسان
ہیں، جن سے اعمال کی پوچھ گچھ
ہوگی اور گنہگار عذاب کے سزاوار
ہوں گے۔ پھر ہمارے اس دعوے
کو کون غلط ثابت کر سکتا ہے کہ ہم
خدا کی مخلوق میں سب سے افضل
ہیں اور ہم جیسا دوسرا کوئی نہیں؟

۲۔ لغات - بندگی:

عبودیت۔ فرمانبرداری۔ عبادت
خود ہیں: صرف اپنے آپ
پر نظر رکھنے والا۔ اس کے معنی
مغرور و خود پسند بھی ہیں، لیکن
یہاں مراد ہے۔ خوددار۔ اپنی عزت
کا پاس کرنے والا اور اپنا وقار قائم

دیکھنے والا۔

شرح :- عبادت اور مرزا بنوداری میں بھی ہماری آزادہ روی اور خودداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حالت یہ ہے کہ ہم کبھی کی زیارت کے لیے جائیں اور دروازہ بند پائیں تو وہیں سے لوٹ آئیں گے۔ یہ گوارا نہ ہوگا کہ کسی سے دروازہ کھول دینے کی استدعا کریں۔

جو شخص دین اور عبادت میں بھی اتنا آزاد و خوددار ہے کہ کبھی کا دروازہ کھلنے کا انتظار گوارا نہیں کرتا اور نہ کسی سے درخواست گزار ہوتا ہے کہ دروازہ کھول دیا جائے، اسی ہرے کہ دینی کاموں میں بھی وہ کتنا باوقار اور عزت نفس کا پاسدار ہوگا۔ شعر کی دو خوبیاں خاص توجہ کی محتاج ہیں۔ اول یہ کہ خانہ کعبہ کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے اس کے کھلنے کے خاص حالات مقرر ہیں۔ دوم یہ کہ اس آزادی اور خودداری کے باوجود مرزا بنوداری کی شان قائم رکھی کہ کبھی سے لوٹ آئے، مگر کسی دوسرے گھر یا عبادت خانے کا رخ نہ کیا۔

ایسے ہی نامور اشعار مرزا غالب کی عظمت کے روشن نشان ہیں۔ خودداری کے سلسلے میں فارسی کا ایک شعر بھی قابل ذکر ہے، مرزا دیکھتے ہیں :

تشنہ لب بر سائل دریا ز غیرت ہاں ہم
گر بہ موج افتد گمان چہ پیشانی مرا

یعنی اگر دریا کی لہریں دیکھ کر میرے دل میں یہ شبہ بھی گزر جائے کہ دریا نے مجھے دیکھ کر پیشانی پر بل ڈال لیے ہیں تو میری غیرت کا یہ عالم ہے کہ پیاسا سائل پر جان دے دوں گا، مگر حلق تر نہ کروں گا۔

۳۔ لغات۔ آئینہ سیماء : آئینے جیسی روشن پیشانی والا۔

شرح :- حسن میں تیرے بے مثال دیکتا ہونے کا دعوے سب تسلیم کیے بیٹھے ہیں۔ اور اس سے کسی کو اختلاف کی جرأت نہیں۔ یہی سبب ہے کہ آئینے جیسی روشن پیشانی والا کوئی محبوب تیرے مقابل آنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

شعر کی خوبی ہے کہ آئینے جیسی روشن پیشانی والا کوئی محبوب سامنے آتا تو اس میں محبوب حقیقی کے حسن کا کس نمایاں ہو جاتا اور اس طرح اس کی کینا فی اور بے مثالی قائم نہ رہتی۔ ایسے محبوبوں کا مقابل آنے کی جرأت نہ کر سکتا شاید حقیقی کی کینا فی کی روشن دلیل ہے۔

۴۔ لغات۔ نازش : فخر۔ شرف۔

ہمنامی چشم خواباں : محبوبوں کی آنکھ کا ہمنام ہونا، یعنی بیمار ہونا۔ چشم محبوب کی ایک صفت بیمار بھی ہے، چشم بیمار یعنی فیصلی اور نثار آلود آنکھ۔
اچھا نہ ہوا : تندرست نہ ہوا۔

شرح :- تیرا بیمار تندرست نہ ہو سکا اور صحت نہ پاسکا تو اس میں کیا برائی ہے ؟ کیا یہ شرف اور یہ فخر کم ہے کہ اسے محبوبوں کی آنکھ کی ہمنامی کا مرتبہ مل گیا ؟ یعنی ان کی آنکھ کو چشم بیمار کہتے ہیں تو میں بھی بیمار ہوں۔
۵۔ شرح :- جو نالہ دل سے اٹھ کر لب تک نہ پہنچا، وہ سینے کا داغ ہے یعنی سینے کے لیے باعث ننگ ہے۔ جو قطرہ دریا نہ بنا، وہ خاک میں مل کر جذب ہو جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ جو شے اپنے مقصد تک نہ پہنچ سکے، وہ حقیقت کھو بیشتی ہے اور مٹ کر رہ جاتی ہے۔ نالے کا مقصد یہ ہے کہ وہ لب تک پہنچے، یعنی بلند ہو۔ قطرے کی غرض دفایت یہ ہے کہ وہ دریا میں شامل ہو کر دریا بن جائے۔ اگر نالہ گھٹ کر سینے کے اندر رہ جائے تو وہ اپنی حقیقت کھو کر سینے کا داغ بن جائے گا۔ اسی طرح جو قطرہ دریا میں شامل نہ ہو کر اپنی حقیقت سے محروم ہو جائیگا، اسے مٹی اپنے اندر جذب کر لے گی۔

۶۔ شرح :- جو دکھ درد اور رنج و غم کسی کو نہ ملا، وہ میرے لیے مقدم ہے اور جو فتنہ آج تک کہیں برپا نہ ہوا، وہ میرے کاروبار کے لیے وقف کر دیا گیا۔ یعنی دنیا بھر کے انکھے دکھ مجھے ملے اور دنیا بھر کے انکھے فتنے میرے پیچھے

لکھ دیے گئے۔

۷۔ لغات۔ بُرہنِ مو: ہر بال کی جڑ۔

حمزہ کا ققصہ: ایک ققصہ ہے جسے داستانِ امیر حمزہ کہتے ہیں، لیکن امیر حمزہ سے اسے کوئی تعلق نہیں، اس میں حمزہ، عمرو عیار اور لقاد وغیرہ مشہور کردار ہیں۔ لوگ عمواد پچھی اور تفریح کے لیے یہ داستان سنا کرتے ہیں۔ مجلس میں ایک شخص پڑھتا رہتا ہے اور باقی سب ہمہ تن گوش بنے رہتے ہیں۔

مشرح: کہیں یہ ممکن ہے کہ عشق کی کیفیت بیان کرنے پر ہر بال کی جڑ سے خالص خون نہ ٹپکنے لگے؟ اگر ایسا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عشق کی داستان نہیں بلکہ حمزہ کا ققصہ ہے، جسے لوگ تفریحاً سنتے اور ایک ایک واقعہ پر سو دھنتے ہیں۔

۸۔ لغات۔ دجلہ: عراق کا مشہور دریا، جو بغداد کے درمیان سے گزرتا ہے اور شہر اس کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔

دبدۂ دنیا: دیکھنے والی آنکھ۔ حقیقت پہچان لینے والی آنکھ۔

مشرح: حقیقت پہچان لینے والی آنکھ کا وصف یہ ہے کہ وہ قطرے میں دریائے دجلہ اور جزو میں کل کا اندازہ کر لیتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو اسے عارف کی حقیقت رس آنکھ نہیں، بلکہ بچوں کا کھیل سمجھنا چاہیے۔

دبدیا کوئی دریا حقیقت میں کیا ہے؟ محض قطروں کا مجموعہ ہے جو اکٹھے ہو کر بہتے ہیں تو دریا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، البتہ یہ حقیقت صرف عارفوں کی چشمِ بینا دیکھ سکتی ہے اور اسی کو جزو میں کل نظر آ سکتا ہے۔

۹۔ مشرح: یہ خبر نذرِ شود سے پھیل ہوئی تھی کہ آج غالب کے پڑے اڑائے جائیں گے، یعنی اسے سخت سزا دی جائے گی۔ ہم بھی یہ تناظر دیکھنے کے لیے پہنچے، مگر افسوس کہ اس کی نوبت نہ آئی۔

اسد! ہم وہ جنوں جولاں گداٹے بے سرو پا ہیں لغات :

کہ ہے ستر پنجہ مرثگان آہو، پشتِ خار اپنا جنوں جولاں :

دیوانگی کی حالت میں چکر لگانے والا۔ وہ شخص جو دیوانہ ہو اور ادھر ادھر بھاگتا دوڑتا پھرے۔

گداٹے بے سرو پا : وہ درویش، جس کے پاس کوئی سرو سامان نہ ہو
ستر پنجہ : پنجہ کا مزیدیلیہ۔ غلامی میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کسی لفظ پر
کوئی دوسرا لفظ بڑھا دیتے ہیں اس سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، مثلاً منزل
کا مزیدیلیہ سر منزل۔

پشتِ خار : پیٹھ کھانے کا آلہ۔ لوہے یا پتیل یا چاندی کی ایک چیز
تجیل کی شکل کی ہوتی ہے۔ اس میں ایک ٹونڈی لگائیے ہیں۔ اس سے امیر یا
غریب ضرورت کے وقت پیٹھ کھائیے ہیں۔

شرح : اسے اسد! ہم بے سرو سامان فقیر ہیں اور دیوانگی کی حالت میں
دشتِ دیباہ کے چکر لگا رہے ہیں، بے سامانی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے پاس
پیٹھ کھانے کا آلہ بھی نہیں۔ ہمیں ہرن کی مرثگان کا پنجہ ضرورت کے وقت یہ
کام دے دیتا ہے۔

شعر مرزا غالب کے ابتدائی دور کا ہے، جب وہ زیادہ تر خیالی مضامین
باندھا کرتے تھے۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ جنوں کی حالت میں دشتِ لوندی
کرتے ہوئے اتنے تیز چلے جا رہے ہیں کہ ہرن بھی، جو چوڑیاں بھرنے میں مشہور
ہیں، پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی مرثگان پشتِ خار کا کام دیتی ہیں۔

پے نذر کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا ۱۔ لغات۔ کرم : بیاں
بچوں علیحدہ صدر نگ دھولی پارسائی کا اس سے مراد کریم ہے، یعنی صاحب
کرم و بخشش، خدا۔

شرمِ نارسائی : خدا کے قرب میں نہ پہنچ سکے کی شرم، یعنی خدا نے جو حکم دیے تھے، انہیں پوری طرح بجا نہ لانے کی ندامت۔

بخون غلطیدہ صد رنگ : سَوَ طرحِ خون میں تھرا ہوا، یعنی سیکڑوں گناہوں کے باعث خون میں لت پت۔

مشرح :- میں رحیم و کریم خدا کی بارگاہ میں ایک تحفہ لایا ہوں۔

وہ تحفہ کیا ہے ؟ شرم اور ندامت کا تحفہ ہے، کیونکہ جو حکم خدا نے دے رکھے تھے، وہ مجھ سے پورے نہ ہو سکے۔ ضروری کام پورے نہ ہونے کا نتیجہ شرم و ندامت کے

سوا کیا ہو سکتا ہے ؟ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ میں نارسائی کا دعویٰ کر رہا ہوں لیکن وہ دعویٰ سَوَ طرحِ خون میں

لت پت ہے اور اس خون کے ذمہ دار میرے گناہ ہیں۔ یہی گناہ

میرے ہونے کی حقیقت ہیں جس نے مجھے خدا کی بارگاہ میں پہنچنے نہ دیا، اس لیے شرم و ندامت کے ساتھ اس اُمید پر حاضر ہوا ہوں کہ وہ صاحبِ کرم و بخشش مجھے اپنی رحمت سے

نہ ہو جس تماشا و دستِ رسوا بے وفائی کا

ہر مُرِ صد نظر ثابت ہے دعویِٰ نارسائی کا

زکاتِ حسن دے، اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا

چراغِ خانہ درویش ہو، کاسہ گدائی کا

نہ مار اجماع کر بے جرم، قاتلِ تیری گروں پر

وہاں مندِ بخون بے گنہ حق آشنائی کا

تمناؤں نے زباںِ موحسپاس بے زبانی ہے

مٹا جس سے تقاضا اشکوۂ بے دستِ پائی ہے

وہی اک بات ہے جو بیاںِ نفسِ واںِ نکبتِ گل ہے

چمن کا جلوہ باعث ہے سری زگیں نوائی کا

دلانِ ہر بُتِ پیغامِ جو، زنجیرِ رسوائی

مدمک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طولِ غالبِ مختصر لکھ دے

کہ حسرتِ سنج ہوں، عرصِ ستمِ ہائےِ جدائی کا

۱۰۰

معاف کر دے گا۔

۲۔ لغات - تماشا دوست : جسے نمود و نمائش پسند ہو جو اس امر کا مشتاق ہو کہ دنیا اسے دیکھے۔

شرح :- اس شعر کے مطلب وہ ہو سکتے ہیں :

۱۔ حسن حقیقی کا جلوہ ہر شے میں موجود ہے اور وہ اس امر کا مشتاق ہے کہ دنیا اسے دیکھے۔ ہر ایک کی نگاہ اس پر بھی ہوئی ہے، لیکن اس پر بے وفائی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا، بلکہ دیکھنے والوں میں سے ہر ایک کی نظر اس کی پاکیزگی اور پارسائی کے لیے ایک ٹھری دستاویز ہے۔ جس حسن کی پاکیزگی کے لیے بے شمار مہری دستاویزیں موجود ہوں، اس کے لیے نمود و نمائش کی پسند کے باوجود کوئی بے وفائی کا خیال دل میں لاسکتا ہے۔

۲۔ اگر شعر کو مجازی معنی میں لیا جائے تو اس کی حیثیت طنز کی ہے، یعنی جو حسن خود اس امر کا طلبگار ہے کہ اسے دیکھا جائے۔ جو ہر وقت تاک جھانک کا مرکز ہے اور اس پر سیکڑوں نگاہوں کی ٹھری لگی ہوئی ہیں۔ یہاں ہر بیوفائی کی رسوائی سے بچنا چاہیے اور پارسائی کا مدعی ہو تو اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے، مان لینا چاہیے کہ وہ بے وفائیاں اور اپنی پارسائی کے لیے سیکڑوں نظروں کی مہریں پیش کر رہا ہے، جو بجائے خود پارسائی کو بے حقیقت ثابت کر رہی ہیں۔

۳۔ لغات - جلوۂ بنیش : بینائی اور نظر کا لوز، یعنی محبوب۔

مہر آسا : سودج کی طرح۔

شرح :- اے میری بینائی کے لوز! اے میرے محبوب! مجھے بھی اپنے

عالم از دوحسن کی ذکاوت سے سرفراز کرتا کہ میرا بھی ایک کا کاہ میرے گھر کا چراغ میں لراے اسی طرح روشن کر دے، جس طرح سودج کی جلوہ ریزی سے پوری کائنات روشن ہو جاتی ہے۔

کاسنہ گوانی کو اس اعتبار سے آنکھ کا استعارہ سمجھا جاسکتا ہے کہ حسن سے استعارے کا اولین ذریعہ آنکھ ہے اور کاسر بہ لحاظ وضع آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے۔

۴۔ **شرح :-** خواجہ حالی اس شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لیے قتل نہیں کیا کہ خون بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے، مگر اب تیری گردن پر بجائے خون بے گناہ کے حق آشنائی کا رہے گا۔ اسے قاتل! تو نے مجھے اس وجہ سے قتل کرنا گوارا نہ کیا کہ میرا کوئی جرم اور کوئی قصور نہ تھا اور بے جرم وہ بے گناہ کو مارنے کا خون گردن پر سوار رہتا ہے، لیکن میں تیرے ہاتھوں شہادت پانے کا آرزو مند تھا اور دوستی کا حق بھی تھا کہ تو میری یہ آرزو پوری کر دیتا۔ تیرا خیال میری بے گناہی کی طرف گیا، مگر بے گناہ کے خون سے بچنے کے اضطراب میں دوستی کا حق تیری گردن پر رہ گیا۔"

۵۔ **شرح :-** بے دست و پائی اور بیچارگی تقاضا کر رہی تھی کہ اس حالت کی شکایت مزور کرنی چاہیے۔ میں بے زبان تھا۔ شکایت کی غرض سے یہ آرزو پیدا ہوئی کہ مجھے زبان مل جائے۔ اس آئند میں محبوب کو میری بیچارگی و بے زبانی پر رحم آگیا اور شکایت کی نہ محض ضرورت نہ رہی، بلکہ جس حالت کی شکایت کرنی تھی وہی عین میری مراد بن گئی۔ اس لیے زبان کی آرزو میری بے زبانی کے شکریے میں سرگرم ہے کہ کچھ کہنا نہ چاہتا اور اس کے بغیر ہی محبوب کا انتقام حاصل ہو گیا۔

۶۔ **شرح :-** چمن کے جلوے سے مراد فصل بہار کی آمد ہے، کیونکہ اسی سے چمن میں شادابی اور رونق پیدا ہوتی ہے۔ پھول کھلتے ہیں اور خوشبو ہر طرف بکھرنے لگتی ہے۔ بہار ہی کا موسم شاعر کے دل میں خاص جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے اور اس کے بیان میں رنگینی و شگفتگی آجاتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ وہی بہار ہے، جس نے چمن میں رونق تازہ کر دی اور میرے دل سے رنگین و لالہ دیز بننے اٹھنے لگے۔ گویا ایک ہی سبب ہے، یعنی بہار جس نے چمن میں پھول کی خوشبو کا رنگ اختیار کیا اور میرے لیے دلکش نعروں کا سامان دیتا کر دیا۔

۷۔ **سراغات** :- پیغامہ تجو : طعنے کاوش کرنے والا، طعنے دینے والا۔

شرح :- دھونڈو دھونڈو کر طعنے دینے والے ہر حسین کا وہن ایک سلقہ ہے اور بے شمار طعنے مل کر بدنامی کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ چونکہ حسینوں کے وہن کو تنگ کرتے کرتے شاعر ناپید اور مددوم کر چکے ہیں، اس لیے کہا کہ اسے بے وقاف تیری بے وقافی کا چرچا دم تک جا پہنچا اور حسینوں کے وہن مل کر رسوائی کی ترنجیر بن گئے۔

یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے، جس میں ہم نے پشت خاں والے شعر کو شمار کیا۔
۸۔ **لغات** :- حسرت سنج : حسرت رکھنے والا، ارمان رکھنے والا۔

شرح :- اسے غائب، بخل کو زیادہ طول دینے اور پھیلانے کی کیا ضرورت ہے؟ بس اتنا ہی کھد دنیا کافی ہے کہ فراق میں مجھ پر جو ظلم و ستم ہوئے، انہیں بیان کرنے کی حسرت دل میں بے میثا ہوں۔

ا۔ **شرح** : فراق کی رات ہے، عاشق چاند کو دیکھتا ہے۔
چاندنی رات میں محبوب سے یکجائی کا دلولہ بہت پر جوش ہے۔ ساتھ ہی فراق اسے باورس کر دیتا ہے۔
معاذے خیال آتا ہے کہ محبوب سے ملنے کی تو کوئی صورت نہیں، الفت کا راز اور فرقت کا درد چھپا یا نہیں جا سکتا۔ اگر میں نے چھپانے کی کوشش کی تو دیرانہ ہو جاؤں گا اور کسی کو بھی معلوم نہ ہو گا کہ میرے جنون اور ہیرا

گر نہ اندوہ شیبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہرِ دہاں ہو جائے گا
زہرہ گرا دیا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پر تو رہتا بیلِ خانماں ہو جائے گا
لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر ہو جائیگا
دل کو ہم صوفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذیر امتحان ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہو
 مجھ پہ گویا اک زمانہ مہربان ہو جائے گا
 گزرا گہ گرم فرماتی رہی - تسلیم ضبط
 شعلہ خس ہے جیسے غول رگ میں نہاں ہو جائیگا
 باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
 ہر گل ترا ایک چشم خوں نشاں ہو جائے گا
 دائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
 اب تک تو یہ توقع ہے کہ داں ہو جائیگا
 فائدہ کیا ہوسچ، آخر تو بھی دانہ ہے اسد
 دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائیگا
 ادا فروری کے باوجود ایک داغ نظر آنا چاہیے۔

نالت نے لکھ فارم، غول مل چکا ہے۔

از مر ضیا و تاب امید نظر مغیت

ایں تشت پر از آتش سوزاں پر ہم ہیز

یعنی جہاں کو روشن کر دینے والے سورج سے مجھے کسی مر ضیا افروز نظر کی امید
 نہیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو اسے سورج نہ سمجھنا چاہیے جس سے ہر شے
 بین ارتقا و باییدگی ہے، بلکہ یہ انگاروں سے بھرا ہوا ایک تشت ہے۔ ہمارے
 میرے صبر پر امتد دنیا چاہیے۔

دیوانگی کا اصل سبب کیا ہے۔
 میرے غدیوں، غمگساروں بلکہ
 محبوب تک کو بھی خبر نہ ہوگی۔
 گویا چاند جس کی روشنی بہ حالت
 فراق میرے دل میں جنوں دیوانگی
 کا تلام پیدا کر رہی ہے، سراپا
 ایک داغ بن کر میرے منہ پر
 مڑکی طرح لگ جائیگا۔

بہ ظاہر داغ مر سے وہ
 داغ مراد نہیں، جو چاند میں نظر
 آتا ہے۔ پورے چاند کا داغ
 بن کر مڑکی طرح منہ پر لگ
 جانا مراد ہے۔ اور پورے چاند
 کا داغ بن جانا اس لیے کہا کہ
 فراق کی حالت میں چاند بھی روشنی

غرض جب کوئی شے اپنا حقیقی ذلیقہ چھوچھیں ہے تو اسے اصل شے نہ سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح فراق میں پورا چاند داغ نظر آنے لگا۔

۲۔ لغات۔ زہرہ : پتا۔

تشریح :- اگر محبوب سے دوری کی شام ہو جانے پر ہر چیز کا پتا اسی طرح پانی پانی ہوتا ہے تو چاند کی روشنی پر بھی یقیناً اس کا یہی اثر پڑے گا اور وہ روشنی پانی کا ٹیل بن کر میرے گھر کو تباہ کر ڈالے گی۔ یعنی جو شے راحت و خوشگوار ی کا باعث ہوتی ہے وہ بھی انتہائی مصیبت کا سامان بن جائے گی۔

۳۔ تشریح :- محبوب سو رہا ہے، جی چاہتا ہے کہ فطر محبت سے اس کا پاؤں چوم لوں، لیکن یہ اندیشہ دامن گیر ہے کہ اس کے دل میں کوئی بُرا لگان نہ بیٹھ جائے۔ یہ نہ سمجھ لے کہ مجھے غافل پا کر یہ حد سے بڑھنے لگا یا اس نے پاک محبت کے جوہر کو کیے غصے، وہ سب جھوٹے بھلا۔

۴۔ تشریح :- ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہمارا دل غافلہٴ وفا کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وقف ہے۔ وہ وفا ہی کے راستے میں مٹ جائے گا، لیکن میں یہ کب معلوم تھا کہ محبوب کی طرف سے امتحان و آزمائش کی منزل پیش آئے گی تو سب سے پہلے وہ اسی آزمائش کی نذر ہو جائے گا اور وفا کے سلسلے میں جو کچھ ہم پر واجب ہے، اسے بجالانے کا دل کو موقع ہی نہ ملے گا۔

۵۔ تشریح :- بظاہر اس میں خطاب اللہ تعالیٰ سے ہے۔ یعنی اے ذات پاک! بہرول میں تیری جگہ ہے، ہر فن و تیری محبت کے لیے وقف ہے۔ اگر تو اپنے عاجز و گنہگار بندے سے راضی ہو جائے تو سارا زمانہ مجھ پر مہربانی ہو جائیگا کیونکہ سب تیری رضا اور تیری چشمِ کرم کے منتظر ہیں۔

۶۔ لغات۔ نگاہ گرم : غصے اور عتاب کی نگاہ۔

تشریح :- اگر تیرے عتاب اور غصے کی نگاہ محبت کی آگ کو غلابدھ رکھنے اور دل کو سنبھالے رہنے کے آداب سکھاتی رہی تو کھاس کے بھسے ہوئے چھ رہے

اسی طرح پوشیدہ ہو جائے گی، جس طرح سورگوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

سورگوں میں دوڑتا رہتا ہے، لیکن کسی کو نظر نہیں آتا۔ اگر گھاس کا تنکا، پکڑنے تو ایک لمحے میں جل بھیتا ہے۔ ضبط کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اپنی حالت پر قابو پایا جائے اور حقیقت کسی پر ظاہر نہ ہونے دی جائے۔ گویا شعلہ خس میں نمایاں نہ رہے، بلکہ اندر چھپ جائے۔ صبر و ضبط کے آداب محبوب نے عتاب اور خشکی کی نگاہ ڈال کر سکھائے۔ یعنی جب دیکھا کہ عاشق بیتاب ہو رہا ہے اور ضبط کے بند ٹوٹنے والے ہیں تو غصے سے بھری ہوئی نگاہ اس پر ڈال دی۔ وہ بیچارہ منہ جل گیا اور ضبط کے لیے جان لڑا دی۔

نگاہ گرم، شعلہ خس، خون اور رگ کی مناسبتیں تشریح کی محتاج نہیں۔

۷۔ تشریح - اے ہمد! مجھے باغ میں نہ لے جا، کیونکہ خشکی و اندوہ سے میری حالت اس درجہ تباہ ہے کہ ہر تازہ پھول مجھے دیکھتے ہی لہو رونے والی آنکھ بن جائے گا۔ یعنی میری حالت اتنی خراب ہے کہ جس مقام پر لوگ سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں، وہاں ماتم کی مجلس پایا ہو جائے گی اور ماتم بھی ایسا کہ آنسوؤں کی جگہ لہو رو دیا جائے گا۔

گل ترکو سرخی و تازگی کے باعث چشم خوں نشاں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۸۔ تشریح - میں تو اب تک یہی امید لگائے بیٹھا تھا کہ قیامت کے دن میرا تیرا انصاف ہو جائے گا۔ اور منصف حقیقی دونوں کے درمیان فیصلہ کر دیگا۔ لیکن وہاں بھی انصاف نہ ہوا تو حسرت و آنسوؤں کے سوا میرے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟

۹۔ تشریح - رفیق و غمخوار کہتا ہے کہ اے اسدا! تو خدا کا عقل مند اور سمجھ سونچ والا کچھ ہی ہے، لیکن خدا سوچ کہ تو ایک کسں محبوب سے دوستی کا رشتہ استوار کر رہا ہے؟ جیسے اونچ نیچ کی خبر نہیں اور وہ اچھائی برائی سوچ نہیں سکتا۔ نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا کہ تجھے جان کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

آخری مصرع میں مرزا نے مشورہ مثل سے کام لیا ہے، یعنی نادان کی دوستی بھی
 کا زیان! نیز اردو اور فارسی کے شعراء محبوب کی کم سنی پر زور دیتے دیتے یہاں
 تک آگے بڑھ گئے کہ اسے عقل و فکر سے عاری مان لیا۔

○

دردِ منت کشں دوا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟	اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا
ہم کہاں قیمت آزمانے جائیں؟	تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لبِ اکرِ قیب	گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی	آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا
کیا وہ نرود کی خدائی تھی؟	بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی	حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخمِ گردب گیا، لمونہ تھما	کام گردِ گ گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے، کہ دل ستانی ہے؟	سے کے دل، دل ستاں روا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں	آج غالب غزل سرا نہ ہوا

۱۔ لغات - منت کش : احسان اٹھانے والا احسان مند منون

شرح :- خدا کا شکر ہے کہ میرے درد نے احسان نہ اٹھایا اور میں
 جیسا بھی بیمار و درد رسیدہ تھا، ویسا ہی رہا۔ یہ حقیقت پیش نظر رکھی جاتے
 تو میرے تند و ست نہ ہوتے میں بھی کوئی برائی نہیں، کیونکہ اگر دوا کھاتا اور دوا کا گر

ہوتی تو وہ کہ ضرور زائل ہو جاتا، بیاری ضرور رفع ہو جاتی، لیکن مجھ پر دوا کا اصلاح
وہ جاتا جسے میری خود داری اصل بیماری سے زیادہ مصیبت خیز سمجھتی تھی۔

۲۔ شرح :- قاعدہ ہے کہ جب کسی معاملے کے متعلق فیصلے کی ضرورت
پیش آجائے تو پہنچ بچاؤ اور صلاح مشورے کے لیے چند آدمی بلا لیے جاتے ہیں
تاکہ ان کی وجہ سے اول فریقین کا جھگڑا کوئی نازک صورت اختیار نہ کرنے پاؤں،
دوم سمجھانے سمجھانے سے فیصلے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اب مرزا غالب شکایتیں
لے کر محبوب کی بارگاہ میں پہنچے اور گلے شکوے کی داستان شروع کر دی۔ محبوب
نے یہ کیفیت نہایت کے لیے چند آدمی بلا لینے مناسب سمجھے، مگر ستم ظریفی یہ کہ
غالب کے رقیبوں کو بلایا، جو پہلے ہی اس غریب کے خلاف اُٹھ کھڑے بیٹھے
تھے۔ اُن سے یہی امید ہو سکتی تھی کہ اول ہر معاملے میں غالب کی مخالفت اور
محبوب کی پاس داری کریں گے، دوم گلے شکوے کے سلسلے میں سنجیدگی سے بات
سننے لگ جائیں گے، یہ سب حقیقت تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن رقیبوں سے
یہی امید ہو سکتی تھی کہ غالب کی مخالفت میں ایک سنجیدہ معاملے کو تماشے کی صورت
دے دیں گے۔ وہ بچاؤ پریشان ہو کر کہتا ہے میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ
آپ نے میری وفاداری کے جواب میں کتنا بڑا سلوک کیا۔ آپ نے رقیبوں کو بلایا۔
بھلا سوچئے کہ ان کی کیا ضرورت ہے؟ کیا آپ میرے گلے شکوے کو تماشہ بنانا
چاہتے ہیں؟

لطفت کی بات یہ ہے کہ محبوب نے رقیبوں کو صرف بلایا ہے، وہ پہنچے نہیں
اور مرزا غالب احتجاج کر رہے ہیں کہ انھیں کیوں بلایا ہے جو؟

۳۔ شرح :- ہماری قسمت کا فیصلہ تو میرے نچر پر موقوف تھا۔ تو نے
اس سے کام ہی نہ لیا، یعنی ہم پر اسے آزمایا ہی نہیں۔ اب تو ہی بتا کہ ہم قسمت
کڑوائی کے لیے کہاں جاؤں؟

۴۔ لغات :- بے مزہ : بے لطفت، بد ذائقہ، رنجیدہ، کبیدہ، ناخوش۔

تشریح :- اسے محبوب! تیرے ہوں میں کتنی مٹھاس ہے کہ رقیب کو تو نے
برابر گایا دیں، مگر انھیں کھا کے بھی وہ بے طعف، رنجیدہ اور ناخوش نہ ہوا۔
یہ اس حقیقت کی روشنی دلیل ہے کہ تیرے ہونٹوں کی شیرینی نے گایوں میں بھی
اتنی مٹھاس پیدا کر دی، ان میں خدا بھی تعنی باقی درہی۔

شعر کا یہ پہلو بہ طور خاص قابلِ توجہ ہے کہ لبِ محبوب کی شیرینی کے باعث
گایاں رقیب کے لیے میٹھی بن گئیں، حالانکہ شاعروں کے مسلمات کے مطابق
رقیب سچا عاشق نہیں ہوتا۔ جو ہونٹ جھوٹے عاشقوں کے نزدیک اتنے شیریں
ہیں، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ سچے عاشقوں کے لیے کیا ہوں گے۔

۵۔ تشریح :- مشور ہے کہ محبوب میرے گھر آ رہا ہے، لیکن میری بے سمانی
کا یہ عالم ہے کہ بوردیا تک پاس نہیں، جسے بچھا کر اسے بٹھا سکتا اور بے سمانی
کی یہ کیفیت اسی روز ہوئی، جب محبوب کے آنے کی خبر گرم غن۔

۶۔ لغات۔ نمرود : زمانہ قدیم کا ایک بادشاہ، جس نے خدائی کا
دعوئی کیا تھا۔

بندگی : عبودیت۔ بندہ ہونا۔

تشریح :- خواجہ جمال اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں : کہتا ہے
میر کی بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ
پہنچا، یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں، بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی
خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

اس شعر کی تفسیر میں کہی ہو سکتی ہیں، مثلاً :

۱۔ خواجہ جمال کی تشریح کے مطابق ”وہ“ کا اشارہ بندگی کی طرف ہے، یعنی
کیا میری بندگی نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا، صرف نقصان
ہوا ؟

۲۔ ”وہ“ کا اشارہ خدائی کی طرف سمجھا جائے، یعنی میں جس خدائی میں بندگی کرتا

ربا لکھا وہ نمرود کی خدائی تھی، رب العالمین کی خدائی نہ تھی کہ اس میں مجھے ~~کچھ~~ کئے سوا کچھ حاصل نہ ہوا ؟

۲۔ پہلے مصرع کے آخر میں انتقام کے بہائے استغاب کی علامت کھینچ جائے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مجھے تو بندگی کا حق ادا کرتے رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا، لیکن نمرود کی طرف دیکھیے کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور پڑے رعب داب اور شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کرتا رہا۔

۳۔ لغات - پہلے حق کے معنی ہیں سچی بات، سچ، دوسرے "حق" کے معنی ہیں۔ واجب، فرض اور ذمہ۔

شرح :- میں نے جان راہ حق میں دے دی، لیکن اس میں میری کیا خوبی ہے ؟ جان میری نہ تھی، خدا نے مجھے عطا کی تھی۔ اس کا عطیہ اسے لوٹا دیا تو کمال کیا ہوا ؟ سچی بات یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ ہم پر واجب تھا، جو کچھ ہمارے ذمے عائد تھا، وہ تو پورا نہ ہو سکا، ہم اپنی کوئی چیز اس کی راہ میں قربان کرتے تو ایک بات تھی۔ اس صورت میں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے فرض ادا کر دیا۔ اب ایسا دعویٰ کیونکر دیا ہے ؟

نقطہ یہ کہ انسان کی انتہائی قربانی جان دے دینا ہے۔ مرزا اسے بھی ادائے حق قرار نہیں دیتے۔ سوچئے راہ خدا میں قربانی کا تصور اور حق ادا کرنے کا مقام کتنا بلند ہے۔

۸۔ شرح :- عام قاعدے کے مطابق زخم دبا دیا جائے تو لوہو ختم ہوتا ہے اور ررواں نہیں رہتا، لیکن غالب کو الٹی صورت پیش آئی۔ زخم بانہہ دیا گیا اور لوہو پھر بھی جاری رہا۔ اس کے برعکس میرے کام میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو وہ جاری نہ رہ سکا اور وہیں ٹپک گیا۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو بات میرے لیے فائدہ مند ہوتی ہے، وہ بچتی نہیں آتی جس میں نقصان کا پہلو ہو، وہی پیش آتی ہے۔ زخم بند ہو جائے تو لوہو

جاننا چاہیے تھا اور نہ کرکا۔ کام میں کوئی اٹکاؤ پیدا ہوا تھا تو اُسے دور جوہانا پیسے
تھا، مگر نہ ہوا۔

شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بد نصیبی اور سیاہ بختی کسی قاعدے کی پابندی نہیں کر جو
طریقہ اس نے سو کے معاملے میں اختیار کیا، وہی کام کے معاملے میں بھی اختیار کرتی اس کا
اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طریقے میں تکلیف و اذیت زیادہ ہو، وہی اختیار کر لے خون
کے معاملے میں ایک اور کام کے معاملے میں بالکل دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

۹۔ شرح :- یہ دل لینا ہے یا ڈاکہ مارنا۔ نہ گاؤں انداز دکھائے، نہ عاشق کو
دیوار سے جی بھر کر لٹکتا اندوز ہونے کا موقع دیا۔ پس آئے، دل پر ہاتھ مارا اور پل دیے۔
دل لینے کا یہ طریقہ تو بالکل الٹا ہے۔

۱۰۔ شرح :- اے غائب! کچھ تو پڑیے، کیونکہ لوگ کہتے ہیں، آج غائب نے
کوئی غزل نہ سنائی۔

اس غزل کے سلسلے میں ایک اٹکاؤ پیدا کر دیا گیا ہے کہ قطعے میں کسی شعر کو اس کے
مکان پر مشاعرہ ہوا تھا، مرزا نے طرح میں غزل نہیں کہی تھی، اسرار ہوا تو ظہیر طری غزل
پڑھ دی۔ مقطع پہلے سے اس صفحہ کا کٹہ بیا تھا، جیسا کہ خود واضح کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ہاجڑا اٹکاؤ ہے۔ شاعر مقطع میں روایت و قافیہ کی مناسبت سے
عموماً ایسے صفحہ باندھتے رہتے ہیں، جنہیں واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ غزل بھی
مع قطع اسی قبیل سے ہے۔ مرزا نے اکتوبر ۱۹۱۵ء میں حاتم علی بیگ، بہر کو ایک خط
میں لکھا: کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کو خوش آواز بھی ہے اور نرم مزہ پر داز بھی، ایک
غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھلایا، یقین سمجھا کہ دونا آیا۔
غزل تم کو بھیجتا ہوں اور سلسلے میں خط کا جواب چاہتا ہوں۔

غزل کے دس شعر ہیں، مرزا نے خط میں صرف آٹھ شعر کہے، باقی دو یا دو آئے
یا بعد میں شامل کر لیے گئے۔

۱۔ لغات :

شوق : عشق

شرح : عشق کو

دل جیسے سیح مقام میں بھی
محبہ کے تنگ ہونے کی شکایت
ہے۔ یعنی عشق دل میں اپنی
شوریدگی کا تماشا کھل کر نہیں
دکھا سکتا، حالانکہ دل کی صفت
میں پوری کائنات سما جاتی ہے
دوسری طرف سمندر کے اضطراب
اور جوش و خروش پر نظر ڈالیں
چاہیے کہ وہ موتی جیسی چھوٹی
سی چیز میں سما گیا اور اسے کون
بل گیا۔

شاعر کا مطلب یہ ہے

کہ سمندر کا اضطراب اور جوش
خروش اضطراب عشق کے ملنے
بالکل بے حقیقت ہے بیشک
سمندر میں آغوشوں پر تزیین و تلم
برپا رہتا ہے۔ طوفان آتے
ہیں اور کائنات کی کوئی دوسری
چیز اس مسلسل جنگ مہم آرائی کی
مثال پیش نہیں کر سکتی، لیکن

گلو ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں، کہ تُو اور پا۔ سیا کتب،
گر بستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ دریا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا
غمِ مزاق میں تکلیفِ سیرِ گلِ مستِ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے سجا کا
ہمزِ مدیِ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مٹو کامِ چشمِ دنیا کا
دل اس کو پہلے ہی ناز و اداسے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں، حُسن کے تقاضا کا
نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خسرِ دریا کا
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یادِ آمد
جفا میں اس کی ہے اندازِ کارِ مہرِ ما کا

دیکھیے۔ یہ پوری ہنگامہ آرائی موتی کے اخراج ہو گئی۔ معلوم ہے کہ موتی کی پرورش مندر
کی اسی ہنگامہ آرائی کا نتیجہ ہوتی ہے گو یا موتی اس ہنگامہ آرائی کو اپنے اخراج سمیٹ لیتا ہے
لیکن اضطراب عشق دل جیسے ہرگز یہ مقام میں بھی جگہ کی تشکیک کا گہر کر رہا ہے۔ موتی یا گہر کی
موتی کو ساکن قرار دینا شرف کا عام معنوں ہے۔ مثلاً :

چیں رہیں ز جنبش ہر خس نے کنند

دریا دلاں چو موج گہر آرمیدہ اندر

خواجه میر درد نے وجود حقیقی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا :

ارمن و سما کہاں تیری وسعت کو پا کے

میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما کے

مگر مرزا غالب کے نزدیک میر درد کا دعویٰ صحیح نہیں۔ دل وجود حقیقی کے عشق کا ہرگز
مستقل نہیں ہو سکتا اور وہ جگہ اس عشق کے جوش و خروش کی ناشی کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔
بعض اصحاب نے کہا ہے کہ غالب کا یہ شعر بیدل کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ ہے

دل آسودہ ما شور امکاں در نفس دارد

گہر ز دیدہ است این جہان موج دیا را

یعنی بہار اول آسودہ یا نفس مطمئنہ عالم امکاں کا شور و غوغا اپنے پنجے میں بند کیے
ہوئے ہے۔ پھر مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہاں موتی موج دریا کی باگ چرا کر لے آیا ہے۔
یعنی اس سمندر کے سارے جوش و خروش کو اپنے اخراج سمیٹ لیا ہے۔

معمولی تاقی سے بھی واضح ہو سکتا ہے کہ دونوں شعروں کے معنوں الگ الگ
ہیں۔ بیدل کے نزدیک شور امکاں دل میں سا گیا۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ سمندر کا جوش
خروش حقیقتاً موتی میں سما سکتا ہے۔ لیکن اضطراب عشق کے لیے دل جیسی ناپید اک راجگہ
میں سے ساقی کا کوئی امکان نہیں۔

۲۔ لغات : پاسخ : جواب

فوتی خامہ فرسا : ایسا فوتی جسے صرت تحریر و نگارش کی دھن ملی ہو۔

شرح :- بیشک میں جانتا ہوں کہ قومیہ خط کا جواب کہیں نہ کیے گا۔ ایسی انتہا قیامت تک ممکن نہیں، لیکن میں کیا کروں۔ قدرت نے میری فطرت میں ایسا ذوق جمود یا ہے جو مسلسل تحریر و نگارش کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ یہ ذوق مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ سداستم اسی نے ڈھار کھا ہے۔ اس کے ہاتھوں مفہوم بھی ہوں اور مجبور بھی جواب خط نہ کہنے کا یقین ہی بھی، مگر لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

بعض اصحاب نے فرمایا کہ یہ مصنون میر حسن نے بھی خوب بانداھا ہے :

گرچہ دل کو ہے یقین یہ خط نہیں پڑھے گا وہ

پر تقاضا شوق کا لکھنے سے کب رکنا ہے باز

یعنی یہ تو یقین ہے کہ محبوب میرا خط ہرگز نہیں پڑھے گا، لیکن عشق کا تقاضا مجھے لکھنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

میر حسن اردو کے مشہور استاد ہیں، مگر اس شعر میں انہوں نے ایسی بات کہ دی ہے جسے فطرت انسانی سے کوئی مناسبت نہیں۔ محبوب عاشق سے راضی ہو یا ناراض، لیکن جو کچھ لکھا ہو اس کے سامنے آجائے گا، اسے وہ مزور پڑھے گا، نہ پڑھنا خلافت تقاضائے فطرت ہے۔ مرزا نے یہ نہیں کہا کہ محبوب خط نہیں پڑھے گا، صرف یہ کہا ہے کہ جواب نہیں دے گا۔ یہی محبوب کی عادت کا بیج خاکہ ہے، اس لیے مرزا کا شعر میر حسن کے شعر سے بدرجہا بہتر ہے۔ مزید برآں مصنفوں کے محض جزوی اشتراک کو پورے شعر کا اشتراک قرار دے لینا ذوق کا کوئی امتیاز ثبوت نہیں۔

مبادا کسی کو خیال ہو کہ غائب نے بھی ایک جگہ ایسا مصنون بانداھا ہے، جو میر حسن کے مصنون سے قریب تر ہے۔ یعنی :

کھلے گا کس طرح مصنفوں سے مکتوب کا یارب

قسم کھاتی ہے اس کا فزنی کا فزنی کے مہلانے کی

ظاہر ہے کہ اس میں بھی مرزا نے کوئی بات طبعی حالات کے خلاف نہیں کہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عاشق ذوقِ حاضر فرمائی میں غلط پر خط لکھتا تھا یہاں تک کہ محبوب تنگ

آگیا۔ ہر خط میں وہی باتیں ہوتیں جو ہزاروں مرتبہ بیان ہو چکی تھیں، لہذا محبوب نے فیصلہ کر دیا کہ اب عاشق کی طرف سے جو بھی خط آئے، اسے بے توقفت چلا دیا جائے، کیونکہ اس میں نئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔

اس مضمون اور میسر حسن کے مضمون کا فرق تشریح کا محتاج نہیں:

۲۔ لغات : کلفت خاطر : دل کے لیے باعث رنج و کدورت

شرح : شاعر کہتا ہے کہ ازل بہار کا وجود ہی نہیں۔ بفرغ محال درجود تسلیم کر دیا جائے تو اس کی حیثیت ایسی ہے، جیسے خزاں کے پاؤں کو مندی لگا دی جائے۔ خزاں کے پاؤں کو مندی لگا دینے سے شاعر نے کئی پہلو پیدا کر لیے، مثلاً :

۱۔ مندی میں رنگینی ہوتی ہے اور بہار کی بھی سب سے نمایاں خصوصیت رنگینی اور تازگی ہی ہے۔

۲۔ جب کسی کے پاؤں کو مندی لگا دی جاتی ہے تو وہ چل پھر نہیں سکتا۔ شاعر کا تصور یہ ہے کہ خزاں کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو بہار آکر خزاں کے پاؤں کی مندی بن گئی۔ گو یا خزاں کے لیے رخصت ہونا ممکن ہی نہ رہا اور وہ بدستور موجود رہی۔

۳۔ مندی کا رنگ چند ہی روز میں اڑ جاتا ہے۔ اس سے شاعر نے بہار کی بے ثباتی اور بے حقیقتی اور خزاں کا ثبات و دوام واضح کیا۔

۴۔ پاؤں کو مندی لگا لی جائے تو چلنے پھرنے سے عاری ہو جانے کے باعث انسان کو کلفت ہوتی ہے۔

شعر کا دوسرا مصرع اس آخری پہلو پر مبنی ہے، یعنی دنیا کا عیش بالکل عارضی ہوتا ہے اور بہر حال تکلیف، مصیبت اور کدورت کا باعث بنتا ہے۔

مرزا نے مستقل خزاں کی خوبی کے مختلف پہلو پیدا کر لیے اور ایک جگہ اسے ایسی بہار قرار دے دیا، جو خزاں کے خوف سے بالکل آزاد ہو۔ فارسی میں کہتے ہیں :

زینہار از نعب آتش جاوید منترس

خوش بہار مصیبت کزو ہم خزاں برنجیزد

یعنی اگر دائی دوزخ کی تپش معقودہ ہے تو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، تو
سمجھ لے کہ تجھے ایسی بہار مل رہی ہے، جسے خزاں آہی نہیں سکتی۔

۴۔ لغات : غنڈہ ہٹنے، بیجا : بے موقع، بے محل اور بے سبب ہفتا۔
شرح : میں محبوب سے جدائی کے غم کا مارا ہوا ہوں، اس حالت میں مجھے
بارغ کی سیر کے لیے مجبور نہ کرو۔ وہاں کیا ہوگا، پھول ہوں گے، جو بے محل ہنسنے
ہیں، میں ایسی ہنسی برداشت نہیں کر سکتا۔

پھولوں کے کھلنے کو بے محل اور بے سبب ہنسی اس لیے کہا۔ کہ وہ نہ تو ہنسی
کا مناسب موقع دیکھ کر ہنسنے ہیں اور نہ ان کے ہنسنے کا کوئی معقول سبب ہوتا ہے۔
صبح کو نسیم چلتی ہے اور وہ کھل جاتے ہیں یہی ان کی ہنسی ہے۔

غالب نے اس شعر میں ایک اہم حقیقت بیان کی ہے۔ انسان خود رنج و الم
میں مبتلا ہو تو سیر و تفریح اور دلکش مناظر اس پر اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا دل بہتا
نہیں بلکہ زیادہ کڑھتا ہے۔ پھولوں کا کھلنا ہر سلیم الطبع انسان کے لیے یقیناً باعث
فرحت ہے۔ ان کے رنگ اور سازگاری و شادابی سے آنکھیں لطف اٹاتی ہیں، خوشبو
سے دماغ معطر ہوتا ہے، لیکن غمزدہ انسان کو ایسے فرحت انگیز منظر میں بھی خوشی
نہیں ہوتی، بلکہ اندر دگی و پریشانی ترقی کرتی ہے اور وہ اپنے دل سے رنج کے پہلو
پیدا کر لیتا ہے، جیسے اس شعر میں پھولوں کی شگفتگی کو بے محل اور بے سبب ہنسی
قرار دے دیا، جو کسی کے بھی نزدیک پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔

۵۔ شرح : اگرچہ میرے جسم کا ہر دو گنا ایسی آنکھ بن گیا ہے جو ہر چیز کی
حقیقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکتی ہے، مگر اس میں حسن کا محرم بن جانے کی سادہ
مجھے نصیب نہ ہوئی اور اس کے لیے ترس رہا ہوں۔

شعر میں عمری پر خاص زور ہے، جس کا مطلب ہے حسن کو بے پروہ دیکھ کر اس
کی حقیقت پاندیا اور کٹھنک پہنچ جانا۔ حسن سے اشارہ حسن حقیقی کی طرف ہے۔
شاعر کہتا ہے۔ یہ حسن کائنات کی ہر شے میں نمایاں ہے، تاہم انسان کے جسم کا انداز

رواں بھی حقیقت میں آنکھ بن جائے تو اس حسن کی محرمی نصیب نہیں ہو سکتی۔

بعض اصحاب نے اس شعر کے مقابلے میں فیضی کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے :

دہر ہرچیز کو کر می ہنی گوشش

نواۓ فیضی دوست و رجویش

یعنی تو کسی بھی رونگٹے پر کان دھرے، وہاں حسن حقیقی کے فیض کا نواۓ ہوشاں

ہو گا۔

ظاہر ہے کہ ہرچیز کو "کے سوا دونوں شعروں میں کوئی بھی چیز مشترک نہیں فیضی ہر شے میں حسن حقیقی کا فیض ثابت کر رہا ہے۔ غالب اس لیے تڑپ رہا ہے کہ رونگٹے کو چشم مینا بنا لینے کے باوجود حسن کا بے حجاب نظارہ نصیب نہ ہوا۔

۶۔ **شرح :** ہم نے حسن کو دیکھتے ہی دل اس کی تذکرہ دیا اور ہرگز انتظار نہ کیا کہ وہ (حسن) ناز و ادا سے کام لے کر مہرِ ادا لے کر لہنے کی کوشش کرے۔

گو یا شاعر کے نزدیک ناز و انداز دل چسپن لینے کے حصے ہیں، جن سے حسن کام لیتا ہے اور ان کے ذریعے سے دلبری کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ ہم ایسا تقاضا گوارا نہیں کر سکتے اور اس کے بغیر ہی حسن پر مر مٹے ہیں۔

غالب نے یہ مضمون ایک فارسی غزل میں بھی باندھا ہے :

کمن ناز و ادا چندیں اولے بتان دہانے ہم

دماغ نازک ما بر نمی تابد تقاضا را

یعنی اے محبوب ! تجھے ناز و انداز دکھانے میں اہتمام کی کیا ضرورت ہے ؟

یہ بے دل بھی حاضر ہے اور جان بھی۔ ہمارا دماغ اتنا نازک ہے کہ تقاضا برداشت ہی نہیں کر سکتا۔

۷۔ **شرح :** اے ہمدرد ! یہ نہ کہہ کہ میرا دنا دل کی حسرت کے ہیں

مطالب ہیں۔ رونے کے مقابلے میں حسرت تو بہت بڑھی ہوئی ہے۔ تو کہتا ہے

کہ کیا مدد کر دیا بہادری کا ؟ میں دریا کا مجمع و خراج جانتا ہوں۔ مجھے علم ہے اس

میں کتنا پانی آتا ہے اور کتنا سمندر میں جا رہا ہے۔ اگر میں دل کی حسرت کے مطابق دونا شروع کروں تو ایک دریا کیا خدا ہانے کتنے دریا بہ نکلیں اور کیا قیامت آجائے۔

۸۔ لغات : کار فرما : کام لینے والا۔ ہانک

شعر کے پہلے مصرعوں میں "اس" سے محبوب مراد ہے اور دوسرے مصرع کے "اس" سے نلک۔

شرح :- میں آسمان کے جو درجہ کو دیکھتا ہوں تو اسے استمد! بے اختیار محبوب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، کیونکہ آسمان کے جو درجہ میں محبوب ہی کے انداز ستم کی جھلک نمایاں ہے۔ گویا سمجھنا چاہیے وہی آسمان سے کام لے کر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔



۱۔ لغات : نفس پروردہ
لفظی معنی نفس پالنے والا مراد ہے بہتہ اور جہاں ہوا۔
قطرہ مے، میں کہ حیرت سے نفس پروردہ ہوا
خطِ جام مے سراسر رشتہ گوہر ہوا
خطِ جام مے : جام
اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
میں شراب کی پیاش کے لیے
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا
خط کھینچے ہوتے تھے اور اٹھیں
خطِ جام "یعنی" خطِ جام مے "کہتے تھے۔

شرح : ان خود مرزا غالب نے اس شعر کے متعلق کافی حد تک عجیب و غریب کو لکھا تھا : اس مطلع میں نیاں ہے دقیق، مگر کوہ کنڈن و کاہ بر آوردن یعنی لطف زیادہ نہیں۔ قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے۔ یہ قدر یک مشرہ بر ہم زدن ثبات و قرار ہے۔ حیرت اذالہ حرکت کرتی ہے۔ قطرہ مے ایذا طیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر بونہی، جو ختم کردہ گنیش تو پیالے کا خط بہ صورت اس تا گئے کے بن گیا، جس میں موتی پر دئے ہوں۔

سادہ الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ ساقی کے ملبوے نے شراب کے ہر قطرے کو حیرت میں مبتلا کر دیا چنانچہ قطرے ٹپکتا بھول گئے اور حیرت کے باعث خطِ حام پر برابر جمع ہوتے گئے۔ گویا خط نے دھاگے کی صورت اختیار کر لی اور جیسے جیسے قطرے اس دھاگے کے لیے روتی بن گئے۔

۲۔ شرح : محبوب کو غالب کے عشق صادق پر کامل اعتماد ہے، جو اس دوسرے پر پہنچا ہوا ہے کہ غیر کے منہ سے بھی آہ نکلے تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ آہ یقیناً طور پر غالب نے کی، لہذا اس پر خفا ہوتا ہے۔ گویا غالب کے لیے سچا عشق اور اس پر محبوب کا اعتماد بھی غارت خرابی اور مصیبت کا باعث بن گیا۔

اس میں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ بعض صورتوں میں سچے عشق کا اثر بھی اٹا ہوتا ہے۔



۱۔ لغات : تقریب : نزدیک
سبب : اجتماع کا موقع، مثلًا شادی
بیاہ یا حبش۔
محمل : کجاوہ۔ چارپائی سے ملتی
جلتی دو چیزیں رسوں کے ذریعے سے
باندھ کر اونٹ پر اس طرح رکھتے تھے
کہ دونوں حصے دونوں پہلوؤں پر
لٹک جاتے تھے۔ ان میں سواریاں
بالقابل بیٹھتی تھیں۔

شرح : جب محبوب نے سفر کی
نیاری کی اور سواری کے لیے کہا کہ
یا تو عاشق کی گرمی شوق کا یہ عالم تھا
کہ اس نے شوق کی ایک ایک ذرا
کھول کے دریا کو بھی سائل باندھا
کہ اس نے شوق کی ایک ایک ذرا
کھول کے دریا کو بھی سائل باندھا
کہ اس نے شوق کی ایک ایک ذرا
کھول کے دریا کو بھی سائل باندھا

پڑے۔ عاشق کے محبت جیسے دل پر پڑے۔

بظاہر مطلب یہ نہیں کہ واقعی ہر ذرے پر ایک ایک دل باندھا گیا۔ مطلب یہ ہے شوق کی بے قراری اور بے تابی ایسی صورت اختیار کر گئی تھی کہ خاک کا ذرہ ذرہ عاشق کا دل معلوم ہوتا تھا تاکہ سواری کا پاؤں اسی پر پڑے۔

بقول عباغبان فتوح کی جھلکا مہٹ اور تپش دل میں دھڑکنے لگا ہے۔

۲۔ لغات : اہل بنفش : اہل نظر۔ حقیقت میں۔

شعر میں آئینے سے مراد فولادی آئینہ ہے، اسی میں جوہر ہوتے ہیں جو رنگ رنگ ہانٹے سے سنہری مائل ہو جاتے ہیں۔ رنگ ہی کی بدولت انھیں طوطی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

شرح :- محبوب کے پیش نظر آئینہ تھا اور وہ تازہ انداز کی شوخیاں دکھا رہا تھا جن کی وجہ سے پورا منظر حیرت خانے میں تبدیل ہو گیا اور آئینے کے جوہر اہل نظر کے نزدیک بیتاب ہو کر طوطی بھل کی طرح ٹپ اٹھے۔ گویا آئینے کے جوہروں کو طوطی بھل قرار دے دیا ہے۔

۳۔ لغات - عربہ میداں : میدان جنگ۔

عجز بہت : بہت کی پستی۔

شرح : اتید اور نا اتیدی میں کشمکش شروع ہوئی اور اس نے میدان جنگ کا سا مہم بپا کر دیا۔ پست بہت ہی بے سوال کرنے والے کے دل کو اپنے ظلم میں جکڑ لیا۔

جب کوئی شخص سوالی بن کر کسی کے سامنے جاتا ہے تو اس کے دل میں امید نہایت کے درمیان کھینچ تان شروع ہو جاتی ہے۔ اتید یہ کہ کچھ مل جائے گا اور نا اتیدی یہ کہ شاید سوال ٹھکرا دیا جائے اور کچھ نہ ملے۔ یہ کشمکش اور یہ مہم بپا انسان کی پست بہت کا تاہم ہے۔ پست بہت ہی اسے سائل بناتی ہے اور سوال پر آمادہ کرتی ہے۔ اگر اس بہت ہو تو قوت بازو سے کام لے کر ہر مشکل کو دور کرے اور ہر کٹھن کام کو سمجھا

بنائے۔ اس حالت میں اسے اتید و نا اتیدی کے چکر میں پڑنے کی نوبت نہ آنے گی۔
مرزا غالب تو خود داری اور عزیمت پر اس درجہ مٹے ہوئے ہیں کہ کسی سے
عبرت حاصل کرنے کے بھی روادار نہیں، چنانچہ کہتے ہیں۔

ہنگامہ زبونی بہت ہے افعال

حاصل نہ کیجے دہرے، جہت ہی کیوں نہ ہو

۴۔ شرح :- اسے غالب اگرچہ ہم دل کھول کر اور انتہائی سخی و کوشش
سے کام لے کر عشق کی پیاس کے معنوں تکھتے رہے، یہاں تک کہ دریا کو بھی ساحل
قرار دے دیا، لیکن حق یہ ہے کہ ہم ان معنوں کی ترتیب و تحریر کا حق ادا نہ کر سکے
اور عشق کی تڑپ کے معنوں ہمارے ہاندھے نہ بندھ سکے۔

دریا کو ساحل ہاندھنے کا مطلب یہ ہے کہ ساحل ہر لمحہ دریا پر رہتا ہے، مگر اس
کی خشکی زائل نہیں ہوتی، گویا اس کی پیاس بدستور قائم رہتی ہے۔ دریا کو ساحل ہاندھنے
کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پورا دریا بھی ساحل ہی بنائے، یہاں تک کہ ایک قطرہ
بھی باقی نہ رہے، تو اس کی یعنی ساحل کی تشنہ بھی اور پیاس میں کوئی فرق نہ گئے گا،
وہ بدستور خشک کا خشک رہے گا۔

۵۔ میں اور بزم سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک نیر جہیں، دونوں چھوٹے پڑے ہیں
وہ دن گئے، کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درد ماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گر تھا ناخن گرہ کشا تھا

۱۔ شرح : سید محمد امجد بخاری
مردانی نے اس شعر کی شرح میں
بڑی تفصیل سے کام لیا ہے،
میں اسی کا خلاصہ اپنے لفظوں میں
پیش کر دیتا ہوں، کیونکہ اس شرح
میں شعر کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں
ہوا۔
لہذا فرماتے ہیں : اس شعر میں کئی

مکڑے معنی خیز ہیں، مثلاً :

۱۔ "میں اور" اس سے بھری آتا ہے کہ میکش بہت پیئے والا ہے۔ ساقی اور رندوں کا پورا گروہ اس کے رندانہ فضائل سے واقف ہے۔ شراب نہ پینے سے اسے اتنی تکلیف ہوئی، جتنی کسی دوسرے رند کو نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اسے رندوں میں اپنی بے آبروئی کا بھی دکھ تھا۔

۲۔ "بزم سے" اس مکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر تنہائی میں ساقی نے یہی برتاؤ کیا ہوتا تو ناگوار مزور لگتا مگر ذاتاً جتنا رندوں کی بھری محفل میں۔ وہ کہتا ہے۔ میں نے تو شراب اس لیے نہ مانگی کہ توبہ کر چکا تھا، لیکن ساقی نے ضیافت کیوں نہ کی؟ اس پلے کیوں نہ خیال کیا کہ رندوں کی توبہ ہی کیا ہوتی ہے؟ اور اگر پیئے کا فائدہ نہ ہوتا تو رندوں کے جھگڑے میں آتا ہی کیوں؟ اس کا مقصد یہ تھا کہ توبہ کی لاج بھی رہ جائے اور شراب بھی پی لے، مگر ساقی نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا۔

۳۔ "یوں" سے سننے والے کی نظر میں رند نام کام کی تصویر پھر جاتی ہے۔ اسے اپنی ناکامی پر مدد درجہ حلال ہی نہیں، خفتہ بھی ہے اور خمار کی تکلیف الگ جان لیے لیتی ہے۔ انگڑائی پر انگڑائی آ رہی ہے۔

۴۔ "تشنہ کام" سے خلق و زبان کے کانٹوں کا تصور ہونے لگتا ہے، جو شدت تشنگی کا ترجمان ہے۔

۵۔ "آؤں" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پُر امید دل سے کر بزم سے میں گیا، مگر تشنہ اور مایوس ٹوٹا۔

۶۔ "ساقی کو کیا ہوا تھا" اس کے بہت سے معنوم ہو سکتے ہیں، صرف لہجہ بولنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً

۱۔ کیا اس نے بھی توبہ کر لی تھی؟ (ب) کیا وہ ہوش میں نہ تھا؟ (ج) کیا حریفوں نے در اندازی کی؟ (د) اس کے لیے میکش کا احترام واجب تھا۔ (ه) صفے بیدردی اور سنگ دلی سے کام لیا۔ (و) رندوں کی حالت کا اندازہ کرنے

میں غلطی ہوئی (حز) شاید اس نے مجھے دیکھا نہیں (ح) کیا وہ میرے توبہ کرنے پر
سمت خفا ہو گیا؟ (ط) کیا وہ کسی اور خیال میں تھا؟ طرغی ایسے بہت سے سبب
ذہن میں آ سکتے ہیں اور ساقی کو کیا ہوا تھا۔ کتہہ کہ ان سب کا ذکر کر دیا گیا۔
بعض اصحاب نے کہا ہے کہ یہ مضمون بیگلی دختر امیر علی جلاڑ نے بھی بڑی خوبی
سے بھی باندا ہے :

من اگر توبہ نہ کر دہ ام اے سرو سہی !
تو خود این توبہ نہ کر دی کہ مرا می ندہی

یعنی اے سرو سہی ! اگر میں نے شراب سے توبہ کر لی ہے تو نے تو یہ توبہ نہیں
کی کہ مجھے شراب دے گا۔

اسی طرح حزبی کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے :

چہ شد از توبہ اگر دامن خشکے دارم
چیش ابر کرم پیر مغاں این ہمہ نیت

یعنی اگر توبہ کی وجہ سے میرا دامن خشک ہے تو کچھ پروا نہیں۔ پیر مغاں کا ابر کرم
میرے گاتو میری توبہ اور میرا دامن خشک سب بیچ رہ جائیں گے۔

حزبی کے شعر کو مرزا کے شعر سے کوئی مناسبت نہیں۔ بیگلی کا مضمون یقیناً
مرزا کے مضمون سے ملتا جلتا ہے، لیکن اسے مطلع بنانے کے سلسلے میں ساقی یا
محبوب کو سرو سہی کہنا سراسر تکلف ہے۔ نیز مرزا نے یہ مضمون پیش کرتے وقت
اس میں جتنی خوبیاں پیدا کر لی ہیں، ان سے بیگلی کا شعر خالی ہے۔

۲۔ **شرح** : اب وہ زمانہ نہیں رہا جب دل اور جگر ایک دوسرے

سے الگ الگ تھے۔ اب تو دونوں کو ایک ہی تیر نظر نے چھید رکھا ہے۔ اور
دونوں کی حالت یکساں ہے۔

دل کے چھیدنے کا نتیجہ ہوا کہ بے تابی کمال پر پہنچ گئی۔ مگر چھیدا تو مہر داستان
کی قوت شل ہو کر رہ گئی۔

۳۔ شرح : اسے غائب ! اب در ماندگی اور بے چارگی کی حالت طاری ہے۔ کچھ سچے میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ جب میرے ناخن میں مشکلات کی گرہیں کھولنے کی قوت تھی تو میرے رشتہ تقدیر میں کوئی گرہ موجود ہی نہ تھی۔ اب ناخن عقدہ کشائی کی قوت سے محروم ہو گیا تو مصیبتوں کا طوفان امنڈ آیا۔ یوں بیچارگی اور عاجزی کی حالت پیدا ہو گئی۔

خواہہ حالی فرماتے ہیں :

”دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی۔“

۱۔ شرح : ہمارے گھر کے دیرانی تو بہر حال میں مقدر تھی، اس میں ہمارے رونے کا کوئی دخل نہیں اب تو سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے رونے سے نسل آگیا اور گھر تباہ ہو گیا، لیکن اگر ہم ضبطِ گری سے کام لیتے تو گھر پھر بھی ویران ہو جاتا۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ سمندر نہ جوتا اور اس کا پانی بالکل خشک ہو جاتا تو اس کی جگہ بیابان نمل آتا، جہاں خاک اڑتی۔ پانی کی فراوانی بھی بربادی کا باعث ہے اور پانی کے تاپہ ہو جانے کا نتیجہ بھی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔ شرح : ہم دل کی تنگی کا گلہ کیا کریں ؟ اس کم بخت کی حالت ایسی ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشان ہوتا۔ تنگی اور پریشانی متضاد کیفیتیں ہیں۔ اگر ایک ہی

نہ ہوتی تو اس کی جگہ دوسری بستی، نتیجہ دونوں کا ایک ہے یعنی رنج و ملال۔

۳۔ لغات - درج : پرہیزگاری

رضوان : بہشت کا دربان۔

شرح : غالب اکثر اپنے شعروں میں بعض باتیں مقصد چھوڑ جاتے ہیں، جو بیک نظر واضح ہو جاتی ہیں۔ اس شعر میں بھی ایک حصہ مقصد ہے، یعنی ہم نے محبوب کے دربان کی ہزاروں منتیں کیں۔ اس سے مسلسل التجائیں کرتے رہے۔ محبوب سے دلی عقیدت و پرستاری کا واسطہ دیتے رہے، مگر اس نے کوئی بات نہ سنی اور ہمیں بار کا موقع ہی نہ دیا۔ کاش، رضوان محبوب کے گھر کا دربان ہوتا، کیونکہ وہ تو تقویٰ اور پرہیزگاری میں ایک عمر گزار دینے کے بعد بہشت کے اندر داخلے کی اجازت دے دیتا ہے۔ اگر اسے محبوب کے گھر کی درباری کا منصب حاصل ہوتا تو یقیناً ہم سے وہ سلوک نہ کرتا، جو محبوب کے دربان نے کیا۔



۱۔ شرح :- خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”بالکل نئے طریق سے بستی کو بستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پچھلے مصرع کے معنی تو ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے سے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کئے گا
نہ ہوتا اگر جدا تین سے، تو زانو پر دھرا ہوتا۔
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ سہراک بابت پر کہنا، کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا
اگر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی، مگر فانی کا مقصد یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا بدیہے کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ کہ خدا ہوتا، کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر۔“

کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

مقصود یہ ہے کہ وجود حقیقی ایک ہے اور وہ خدا ہے۔ اسی سہارے فیض سے ہر وجود پیدا ہوا، جس کی بستی غار مٹی ہے۔ اگر یہ وجود پیدا نہ ہوتے تو سہارے حقیقی میں شامل ہوتے اور اس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ کیونکہ جب کچھ نہیں تھا تو خدا تھا اور کچھ نہ ہوتا تو اس حالت میں بھی خدا ہوتا۔

۲۔ شرح :- جب غم کی فراوانی نے سر کو بے حس بنا دیا اور احساس کی صلاحیت ہی اس میں نہ رہی تو اس کے کٹ جانے کا کیا غم ہو سکتا ہے، کیونکہ اگر یہ تن سے جدا نہ ہوتا تو بے حس و حرکت ہونے کے باعث ذالو پر دھرا رہتا۔
اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی چیز بے حس اور سن ہو جائے تو اس کے کٹنے کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا۔

۳۔ شرح :- مدت ہوئی کہ غالب کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن وہ اس لیے بار بار یاد آتا ہے کہ ہر بات پر کہا کرتا تھا: ”یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا“
”یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا“ سے مختلف پہلو نکالے جا سکتے ہیں، مثلاً کسی کو کوئی صدمہ پیش آ گیا اور اس نے غالب سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! میں تو نصیبت کا شکار ہو گیا۔ غالب نے اس کی توجہ اصل واقعے کی طرف سے منحرف کرتے ہوئے کہا کہ اگر یوں نہ ہوتا اور یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا؟

دوسرا پہلو یہ ہے کہ کڑیدر غالب کی ایک فطری خصوصیت تھی۔ اسی بنا پر وہ ہر واقعے کے متعلق کہا کرتا تھا کہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ کڑیدر کے علاوہ اس میں تہمت و اربابان کا پہلو بھی نکلتا ہے۔



۱۔ شرح :- بہادر آگئی ہے

باغ کی زمین کا کوئی بھی ذرہ بیکار اور
جوش خروش سے خالی نہیں رہا۔ جگہ جگہ کثرت

ایک ذرہ زمین نہیں بے کار باغ کا
یاں مبادہ بھی، فقید ہے لائے کے باغ کا

سبز اور پھول موجود ہیں۔ نوکی
فراوانی سے روشنی کی یہ حالت
ہو گئی کہ پاؤں دھرنے کو جگہ نہیں
ملتی اور خالی جگہیں اس درجہ محدود
ہو گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ
روشنی نہیں۔ بلکہ داغ لالہ کے
چراغوں کے لیے قدرت نے تہیوں
کا انتظام کر دیا ہے۔

نورِ شمس بالکل تنگ ہو تو چراغ
کی جتنی سے اس کی تشبیہ نہایت غلط
اور بالکل اچھوتی ہے۔ صاف ظاہر
ہوتا ہے کہ اس تنگ اور محدود جگہ
میں بھی جو شمس نور پا یا ہوتا ہے جس
طرح جتنی شعلے کی جدوت و دشمنی کا
سرو سامان کرتی ہے۔

شر آہ بہار، پھولوں کی
کثرت، رنگ و بو کی فراوانی اور
نوکی بہشت کی ایک عمدہ تصویر ہے

بے غمے کے ہے طاقتِ آشوب آگہی
کھینچا ہے بحرِ حوصلہ نے خطِ ایام کا
بلبل کے کاروبار پر ہیں، خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے، نشہ فکری سخن مجھے
تربیا کی قدیم ہوں دُورِ چرخ کا
سوار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں، کہ دل ہی عدد ہے فراغ کا
بے خون دل ہے چشم میں بحرِ نگہ عباد
یہ نئے کدہ خراب ہے، نئے کے سراغ کا
باغِ گشتِ تیرا، بہاؤِ نشاطِ دل
ابر بہار، خم کدہ کس کے دماغ کا

۲۔ لغات : آشوب : فتنہ، ہنگامہ، طوفان، جوش و خروش۔

آگہی : شعور، واقفیت، ہوشیاری، علم

ایام : شراب کا پالیا، غلط سے مراد وہ خطوط ہیں، جو شراب کی مقدار جانچنے

کے لیے پیالے میں لگا دیئے جاتے تھے اور آج کل میں یہ پیمانہ میکروں اور دو خانوں
میں استعمال ہوتا ہے۔

کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

مقتضیہ ہے کہ وجود حقیقی ایک ہے اور وہ خدا ہے۔ اسی مبدائے فیض سے ہر وجود پیدا ہوا، جس کی بستی غار منی ہے۔ اگر یہ وجود پیدا نہ ہوتے تو مبدائے حقیقی میں شامل ہوتے اور اس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ کیونکہ جب کچھ نہیں تھا تو خدا تھا اور کچھ نہ ہوتا تو اس حالت میں بھی خدا ہوتا۔

۲۔ **شرح :-** جب غم کی فراوانی نے سر کو بے حس بنا دیا اور احساس کی صلاحیت ہی اس میں نہ رہی تو اس کے کٹ جانے کا کیا غم ہو سکتا ہے، کیونکہ اگر یہ تن سے جدا نہ ہوتا تو بے حس و حرکت ہونے کے باعث ڈالو پر دھرا رہتا۔ اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی چیز بے حس اور مرنے ہو جائے تو اس کے کٹنے کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا۔

۳۔ **شرح :-** مدت ہوئی کہ غالب کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن وہ اس لیے بار بار یاد آتا ہے کہ ہر بات پر کہا کرتا تھا: "لوں ہوتا تو کیا ہو جاتا" "لوں ہوتا تو کیا ہو جاتا" سے مختلف پہلو نکالے جا سکتے ہیں، مثلاً کسی کو کوئی صدمہ پیش آ گیا اور اس نے غالب سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! میں تو نصیب کا شکار ہو گیا۔ غالب نے اس کی توجہ اصل واقعے کی طرف سے منطقت کرتے جوش کہا کہ اگر یوں نہ ہوتا اور یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا؟

دوسرا پہلو یہ ہے کہ کڑید غالب کی ایک فطری خصوصیت تھی۔ اسی بنا پر وہ ہر واقعے کے متعلق کہا کرتا تھا کہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ کڑید کے علاوہ اس میں تہمت و ارمان کا پہلو بھی نکلتا ہے۔



۱۔ **شرح :-** بہاد آگئی ہے

باغ کی زمین کا کوئی بھی ذرہ بیکار اور
جوش خروش سے خالی نہیں رہا۔ جگہ جگہ کثرت

یک ذرہ زمین نہیں بے کار باغ کا
یاں جاوہ بھی، فقید ہے لائے کئے باغ کا

بے غمے کسے ہے طاقت آشوب آگہی
 کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایان کا
 بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
 کہتے ہیں جس کو عشق، غلغل ہے دماغ کا
 تازہ نہیں ہے، نشہ فکری سخن مجھے
 تریاکی قدیم ہوں دو وحی سراغ کا
 سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے
 پر کیا کریں کہ دل ہی درد ہے فراغ کا
 بے خواب دل ہے چشم میں بھوج نگہ غبار
 یسے کہہ خراب ہے، سن کے سراغ کا
 باغِ شگفتہ تیرا، بے باطن نشاطِ دل
 ابر بہار، خجکدہ کس کے دماغ کا

سبزہ اور پھول موجود ہیں۔ نوکی
 فراوانی سے روشنی کی یہ حالت
 ہو گئی کہ پاؤں دھرنے کو جگہ نہیں
 ملتی اور خالی جگہیں اس درجہ محدود
 ہو گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ
 روشنی نہیں، بلکہ دماغ لالہ کے
 چراغوں کے لیے قدرت نے بتیوں
 کا انتظام کر دیا ہے۔

دوش بالکل تنگ ہو تو چراغ
 کی جتن سے اس کی تشبیہ نہایت موزوں
 اور بالکل اچھوتی ہے۔ صاف ظاہر
 ہوتا ہے کہ اس تنگ اور محدود جگہ
 میں جس طرح غم یا یا مانتا ہے جس
 طرح جتنی شعلے کی جدوت روشنی کا
 سرو سامان کرتی ہے۔

شعر آبر بہار، پھولوں کی
 کثرت، رنگ و بو کی فراوانی اور
 نوکی بہتات کی ایک عمدہ تصویر ہے

۲۔ لغات : آشوب : فتنہ، ہنگامہ، طوفان، جوش و خروش۔

آگہی : شعور، واقفیت، ہوشیاری، علم

ایان : شراب کا پیالہ، خط سے مراد وہ خطوط ہیں جو شراب کی مقدار مانگنے

کے لیے پیالے میں لگا دیئے جاتے تھے اور آج کل بھی یہ پیاز میکیدوں اور دواخانوں
 میں استعمال ہوتا ہے۔

تشریح : شراب سے ہرست ہونے بغیر حقائق کائنات کے متعلق شعور اور علم کا فتنہ و جنگ کہ کس کا دل بوجہ اشت کر سکتا ہے ؟ لیکن معیبت یہ ہے کہ شراب پانے والے بے حوصلگی و کم غرائی سے کام لیتے ہیں۔ وہ ناپ تول و عقد اثر کے خط و کیکھ دیکھ کر شراب پلاتے ہیں، جس سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی کہ آشوب علم و آگاہی کا دکھ درد و بے چارے۔ مثلاً یہ دکھ کہ یہاں کی زندگی عارضی ہے اور انسان کو جلد رخت سفر با خطہ کر دوسری دنیا کی طرف روانہ ہونا ہے یا یہ دکھ کہ جن عزیزوں اور دوستوں سے ہمیں محبت ہے وہ بھی ہماری طرح آگے پیچھے یہاں سے رخصت ہو جائیں گے اور ہمیں ان کے فراق کا داغ برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ دکھ کہ دنیا میں حقیقی دوستی اور وفاداری بالکل ناپید نظر آتی ہے یہ اور اس قسم کی تمام چیزیں انسان کے لیے دکھ۔ پریشانی اور اذیت کا باعث ہوتی ہیں۔ شراب ہوش و حواس سے عاری کر دینے کا ایک ذریعہ ہے اور اس ذریعے سے کام لے بغیر حقیقتوں کا تحمل ممکن ہی نہیں۔ مرزا نے ایک اور شعر میں بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے، اگرچہ اس میں سراٹھا علم و آگاہی کا ذکر نہیں آیا !

مے سے غم من نشاط ہے کس رویا کو

اک گونہ بخودی مجھے دن رات چاہیے

صرف وہ شے اچھے اک گونہ بخودی قرار دیا گیا ہے، علم و آگاہی کے فتنہ و آشوب کو قابل برداشت بنا سکتی ہے۔

۴۔ لغات : کاروبار : مشغولیتیں، حرکتیں، پیشہ

تشریح :۔ بیل بھولوں کے ساتھ عشق کے باعث دیوانی ہو رہی ہے۔

اور بے اختیار آہ و فغاں کر رہی ہے، لیکن بھول اس کی ان حرکتوں اور مشغولیتوں کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ نہ بیل کو اس حالت کا کوئی احساس ہے اور نہ بھول ہنسی بیل کو لینے پر آمادہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، جس شے کو عشق کہتے ہیں، وہ دلہن کی خواہنی اور فتنہ کے سوا کچھ نہیں۔ خصوصیت سے اس لیے کہ عموماً دیوانوں ہی کی صحبت میں

جاتی ہے۔

۴۔ لغات۔ تریاکی : یہ لفظ تریاک سے بنا ہے، جسے ”ک“ اور ”ق“ دونوں سے لکھتے ہیں۔ ”ہمدیہ عم“ کا بیان ہے کہ تریاک کو اینون کے معنی میں استعمال کرنا بعد کا واقعہ ہے، پہلے محض زہر مٹرہ کے معنی تھے، لہذا یہاں تریاک پر معنی اینون ہے۔
بقول طباطبائی دو بوجہی و حواں استعارہ ہے فکر سخن کا اور چراغ استعارہ ہے کلام روشن کا۔

شرح :۱۔ میں نے حال میں شعر کو بنا شروع نہیں کیا، فکر سخن کا نشہ تو بہت پرانا ہے، یعنی میں مدت سے اینون چلا آتا ہوں اور روشن کلام کے لیے ابتدا سے فکر کا مادی ہوں۔

ایک تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تریاک سے چند ٹو مراد لیا جائے، چند و اینون کو پانی میں پکا کر بناتے ہیں اور بائش کی ایک نالی سے، جس کے ایک طرف چلم سی، بنی ہوتی ہے۔ جتنے کی طرح پیتے ہیں۔ چراغ کی نو سے چند ٹو کو آگ دی جاتی ہے چند سال پیشتر تک جنوبی ہند کے مختلف حصوں اور چین میں اس کا دستور عام تھا۔ چند ٹو پینے والا چند کش لے کر بالکل بیہوش سا ہو جاتا تھا اور بعض اوقات چند ٹو جلانے والے اس کا مال و متاع بھی ہتھیا لیتے تھے۔

اگر اینون کی جگہ یہاں چند ٹو سمجھا جائے تو اس صورت میں شعر کی مناسبتیں زیادہ واضح ہو جاتی ہیں۔ معنی دونوں صورتوں میں وہی ہیں، جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ لغات۔ فراغ : آزادی۔ بے فکری۔ فراغت۔

شرح :۱۔ سو مرتبہ ہم عشق کی بندشوں سے آزاد ہوئے، لیکن کیا کریں، ہمارے دل کو آزادی اور بے فکری سے اتنی دشمنی ہے کہ وہ پھر کوئی دُکھ کوئی آفت اور الجھن پیدا کر لیتا ہے۔

یہاں بند عشق سے مراد عشق حقیقی نہیں، بلکہ معاملات دنیا کا عشق ہے۔ یعنی کئی مرتبہ ہم نے دنیا کی الجھنوں سے دامن چھڑایا، لیکن دل پھر اسی جال میں جا

پہتا ہے :-

۶۔ **شرح :** مولانا حسرت موہانی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ،
 شاعر : دل میں خون کے نہ ہونے کا شاک ہے ، یعنی چاہتا ہے ، آنکھ
 میں اشکوں کی راہ خون دل آئے ، مگر نہیں آتا ۔ پس آنکھ میں موج نگاہ
 غبار بن گئی ، یعنی خون دل کے بغیر کچھ نظر نہیں آتا ۔ پھر خون دل کو
 مکرر یہ طور تشبیہ باہر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ میکہ (آنکھ) سے (خون دل)
 کے تجسس ہی میں خراب ہے ۔ شراب لے لو آباد ہو اور خون دل
 آئے تو غبار دور ہو ، کیونکہ تری سے غبار دور ہو جاتا ہے ۔ بہت
 پہلو دار اور نہایت نازک و بلیغ مضمون ہے ؟

مطلب یہ ہے کہ جس آنکھ سے خون دل نہیں بہتا ، وہ اس لیے اندھی ہو جاتی
 ہے کہ اس میں نگاہ کی لہریں غبار بن جاتی ہیں اور قوت بینائی ختم ہو جاتی ہے ۔ آئندہ
 یہ ہے کہ یہ شراب خانہ (آنکھ) پھر شراب (خون دل) سے آباد ہو ، اس کی خرابی
 اور ویرانی کی حالت ختم ہو جائے ۔ نگاہ غبار کی لہر نہ رہے ، بلکہ واقعی نگاہ بن جائے
 جس کا جوہر کمال بینائی ہے ۔

۷۔ **شرح :** تیرے حسن کا سرسبز و شاداب اور شگفتہ باغ میرے دل کی
 خوشی اور راحت کا سر و سامان ہے ۔ باقی رہا موسم بہار کا بادل تو کون کہہ سکتا ہے
 کہ یہ کس کے ذوق کا شراب خانہ ہے ، مجھے تو اس سے کوئی دلہنگی نہیں ، کیونکہ میری
 تو بہر راحت تیرے ہی باغ حسن سے وابستہ ہے ۔

الفاظ کی مناسبت ظاہر ہے اور مرزا غالب کا شاید ہی کوئی شعر ہو ، جو اس
 مناسبت سے خالی نظر آئے ۔ یہاں محکمہ یعنی شراب خانہ ابر بہار کی مناسبت سے
 لائے ہیں اور باغ سے نقشے کی مناسبت بھی محتاج تشریح نہیں ۔

وہ مری پین جیہیں سے، غم پنہاں سمجھا
 رازِ مکتوب ہر بے ربطی عنوان سمجھا
 یک الف بیش نہیں، صیقلِ آئینہ ہنوز
 چاک کرتا ہوں میں، جب کہ گریباں سمجھا
 شرحِ اسباب گرفتارِ محض، موت پوچھ
 اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
 بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام
 رنج پہ ہر قطرہ عرق، دیدہ حیراں سمجھا
 مجھ سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
 نبضِ شمس سے تپشِ شعلہ سوزاں سمجھا
 سفرِ عشق میں کی صنعت نے راحت طلبی
 ہر قدم سائے کوئی اپنے شبستان سمجھا
 تھا گریزاں مژدہ یار سے دلِ نادیم مرگ
 دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا
 دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار آہ
 غلطی کی کہ جو کانسر کو مشکاں سمجھا

۱۔ شرح :- محبوب نے
 میری پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی
 دیکھیں تو سمجھ گیا کہ مجھے غم نے
 بری طرح نشانہ لگا ہے۔ حالانکہ
 میں نے غم کو ضبط کرنے اور
 چھپائے رکھنے میں کوئی دقیقہ
 فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ یہ ایسی
 ہی بات ہوئی، جیسے کسی خط کا
 سرنامہ بے ربط سا ہو اور دیکھنے والا
 اندازہ کرے کہ خط کا مستنون
 کیا ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ عاشق نے
 تو ضبط میں کوئی کوتاہی نہ کی اور
 اس کی کوشش یہی تھی کہ غم
 کا راز محبوب پر ظاہر نہ ہو بلکہ
 پیشانی کی شکنوں نے یہ راز فاش
 کر دیا۔ شعر میں پیشانی کی شکنوں
 کو سرنامے کی ربطی سمجھے اور غم
 پنہاں کو رازِ مکتوب سے تشبیہ
 دی گئی ہے۔

۲۔ شرح :- خود مرزا
 غالب اس کی شرح کرتے ہوئے
 لکھتے ہیں :

پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے اور نہ جلی
آئینوں میں جو ہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جن چیزوں
کو صیقل کرو گے، بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی۔ اسے الف صیقل
کہتے ہیں، جب یہ مفہوم معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے۔

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
یعنی ابتدائے سن تیز سے مشق جنون ہے۔ اب تک کمالی فن حاصل
نہیں ہوا۔ آئینہ عام صاف نہیں ہو گیا۔ بس وہی ایک لکیر صیقل
کی موجود ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جب
آثار جنون میں سے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمیز اور شعور پیدا ہوتے ہی تحریک، گزریاں، چاک کرنے میں مشغول
ہو گیا اور آئینے کو جلا دینے اور رنگ صاف کر دینے میں لگ گیا، لیکن اب تک
صرف اتنا ہی ہو سکا کہ آئینے میں صفائی کی صورت ایک لکیر پڑی ہے، جسے صیقل گر
الف صیقل کہتے ہیں۔

مولانا طباطبائی شعر کا مطلب یوں فرماتے ہیں، جب سے مجھے اتنا شعور پیدا
ہوا کہ دنیا کے تعلقات قائم رکھتے ہوئے صفائے نفس حاصل نہیں ہو سکتی، میں نے
دنیا کو چھوڑ دیا اور دل کے آئینے کی صفائی میں مصروف ہو گیا، لیکن اب تک یہ آئینہ
پوری طرح صاف نہیں ہوا، البتہ اس میں صفائی کی ابتدائی علامت پیدا ہو گئی ہے۔
مضمون کا اصل نرد اس نکتے پر ہے کہ شعور و تمیز پیدا ہوتے ہی یہ کام شروع
کر دیا۔

۳۔ شرح :- میرے دل کے رنج و غم اور گرفتگی کے اسباب نہ پوچھیے
دل اتنا تنگ ہو گیا ہے کہ میں نے سمجھ لیا، یہ دل نہیں قید خانہ ہے۔

چونکہ قید خانے میں قیدی تنگ رہتے ہیں اور اس میں بجائے خود جہنم شق کا
پہلو نمایاں ہے، اس لیے اسے دل تنگی کی موزوں تشبیہ مان لیا گیا۔

۴۔ شرح : میری یعنی عاشق کی جدگانی کا یہ عالم ہے کہ گوارا نہیں، محبوب باہر نکل کر خرام تاز میں مصروف ہو۔ کیونکہ وہ چہل قدمی شروع کرے گا تو نزاکت کے باعث روئے اوند پر پینے کے قطرے آجائیں گے اور مجھے یہ گمان ہو گا کہ یہ پینے کے قطرے نہیں، بلکہ دیکھنے والوں کی آنکھیں ہیں، جو محبوب کا حسن دیکھ کر حیرت سے کھلی کھلی رہ گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر مرزا غالب کے قول کے مطابق کوہ کندن و گاہ بر آوردن کا مصداق ہے۔

۵۔ شرح : میں نے اپنی عاجزی سے جان لیا کہ محبوب تند خو اور شعلہ مزاج ہو گا۔ مثال یوں سمجھیے کہ تنکے کی بنف دیکھ کر جلتے ہوئے شعلے کی حرارت، گرمی اور تپش کا اندازہ کر لیا جائے۔
 یہاں اپنے عجز کو خس سے اور محبوب کی بر خوئی کو شعلہ سوزاں کی تپش سے تشبیہ دی۔

۶۔ لغات - شبستان : خواب گاہ۔ رات کو آرام کرنے کی جگہ۔
 شرح : عشق کی منزل میں سفر کرتے کرتے منع سے میرا یہ حال ہو گیا کہ ہر قدم پر اپنے ہی سایے کو خواب گاہ سمجھتا رہا۔
 ظاہر ہے کہ عشق کا سفر دشت و بیاباں ہی میں ہو سکتا تھا، جہاں دور دور تک مکان یا درخت کا نشان تک نہ تھا۔ اور منع کو ایک قدم بھی اٹھانا گوارا نہ تھا۔ اس بیکی اور بے سامانی کے عالم میں اپنا ہی سایہ آرام گاہ معلوم ہونے لگا۔ شعر میں منع اور بے سامانی کا نقشہ عجیب انداز میں کھینچا گیا ہے۔
 نیز اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر عشق کس قدر لمبا، قوت و طاقت کھینچ لینے والا اور مصیبت خیز ہوتا ہے۔

۷۔ شرح : دل محبوب کی پلوں کے تیر سے بچنے کی کوشش برابر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ موت آگئی، لیکن یہ تیر تو قضا کا تیر تھا، جس سے بچنا ممکن ہی نہ تھا، مگر دل نے نامہی سے بچنا آسان سمجھ لیا۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں کوئی دل لگن کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لگن ہی زندگی کا جو ہر ادا اس کی خوبی ہے۔ کوئی چاہے بھی تو اس سے محفوظ رہنا ممکن نہیں، البتہ موت آجائے تو لگن کا سوال ہی باقی نہیں رہے گا۔

۸۔ شرح : اے استاد! تو نے کیوں محبوب کو وفادار سمجھ کر دل دے دیا ہے تو ایسی غلطی تھی، جیسے کسی کا مڑ کو مسلمان سمجھ لیا جائے، یعنی محبوب سے وفا کی امید کبھی نہ رکھنی چاہیے، جس طرح کافر سے اسلام و ایمان کی امید نہیں رکھتی جگتا۔ لطف یہ کہ جب تک محبوب بے وفا ہے، عشق کی گرجوشتی اور ہنگامہ خیزی قائم ہے۔ محبوب وفا پر آمادہ ہو جائے تو عشق کی آگ خود بخود افسردہ ہو کر رہ جائے گی۔



دل جگر تشنہ فریاد آیا	پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا	دم لیا تھا نہ قیامت نے ہمنواز
پھر وہ نیزنگِ نظر یاد آیا	سادگی ہائے تنہا یعنی
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا	عذرا و اماندگی اے حسرتِ دل
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا	زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
گھر ترا خلد میں گریا دیا	کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا	آہ وہ جراتِ فریاد کہاں
دل گم گشتہ مگر یاد آیا	پھر تیرے کو چمے کو جاتا ہے خیال
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا	کوئی دیرانی سی دیرانی ہے!

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یا د آبا
۱۔ لغات : جگر تشنہ : تشنہ جگر جس کا جگر پیسا ہو یعنی پیاس
کی آخری حد۔

شرح : میرے دل میں فریاد کی انتہائی پیاس اور تڑپ پیدا ہوئی۔
ساتھ ہی رونے والی آنکھ یاد آگئی اور میں نے سمجھ لیا کہ دل کی اس پیاس اور
تڑپ کو صرف آنکھ ہی کی اشکباری بجھا اور مٹا سکتی ہے۔
۲۔ شرح :- خواجہ حاکم فرماتے ہیں :

”دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اس کے
چلے جانے کے بعد وہ رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اسے
قیامت کے دم لینے سے قہر کیا۔ ایسے بیخ شعراء دو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو
حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے، ان دوسو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی
ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا :

تیرے رخصت ہونے پر میرے لیے قیامت آگئی۔ ابھی وہ قیامت ٹھہری اور
رک نہ تھی کہ پھر تیرے رخصت ہونے کا وقت ذہن میں تازہ ہو گیا اور قیامت از
سرنو برپا ہو گئی۔

۳۔ لغات - نیرنگ : جادو، طلسم، فریب، حیلہ، محابب و غرائب
غالب نے شعر میں نیرنگ، نظر کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اسے نیرنگ نظر پر لکھا
یہی پڑھا جا سکتا ہے، یعنی وہ محبوب، جس کی نظر سرا پا طلسم اور سرا پا فریب ہے
نیرنگ نظر (بہ امتیاز) بھی پڑھ سکتے ہیں، یعنی وہ محبوب، جو نظر کے لیے سرا پا
طلسم اور سرا پا فریب ہے۔

شرح :- میری تنہا کی نادمی اور خواہش و آرزو کے جھوپن کو دیکھتے کہ پھر
وہی محبوب یاد آگیا، جس کی نظر سرا پا طلسم اور سرا پا فریب ہے۔
تنہا کی سادگی یہ ہے کہ جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے کوئی آدمی پوری نہیں

کر سکتا اور اس حالت کوئی امید بر نہیں آ سکتی، اسی کی تنہا کی جا رہی ہے اور اسی سے لطف و نوازش کی امید رکھتی جا رہی ہے۔

۴۔ لغات : واما ندگی : بیچارگی، بے بسی، مجبوری۔

شرح :- اسے دل کی حسرت : میری بیچارگی اور مجبوری کا مندر قبول کرے میں آہ و فغاں کے لیے تیار تھا مگر جگر کا خیال آ گیا کہ وہ تو ایک ہی آہ میں پھٹ جائے گا۔

واما ندگی کا نقشہ چند ہی لفظوں میں کس درجہ نادر طریقے پر کھینچ دیا کہ ایک طرف دل کی حسرت آہ و فغاں کا تقاضا کر رہی ہے اور اس کے بغیر وہ پوری نہیں ہو سکتی، دوسری طرف جگر کا معاملہ سامنے ہے کہ وہ آہ و فغاں برداشت نہیں کر سکتا۔

۵۔ شرح : زندگی تیری گزر گاہ کی یاد کے بغیر بھی بسر ہو ہی جاتی، لیکن اس یاد نے مجھے انتہائی رنج و الم کا تھوڑا مشق بنا دیا۔ سوچتا ہوں کہ یہ یاد میرے دل میں کیوں تازہ ہوتی ؟

شعر میں گزر جانے کا مفہوم ”مر جانا“ نہیں، جیسا کہ بعض شاعرین نے سمجھا ”بسر ہو جانا“ ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ گزر گاہ محبوب کی یاد کیوں تکلیف دہ دیت کا باعث بنی ہے حسرت کے نزدیک وہ گزر گاہ یاد آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عاشق گھر چھوڑ کر دیدار کے شوق میں گزر گاہ پر جا بیٹھا کہ گھر میں بھی بہر حال انتظار ہی انتظار ہے یہی انتظار گزر گاہ پر کرے گا۔ مولوی عبد اعلیٰ وادے کا خیال ہے کہ عاشق کی زندگی کے کچھ دن محبوب کی گزر گاہ پر بسر ہوئے تھے، وہ دور یاد آ گیا، جس کی وجہ سے زندگی کا گزر نادر و شاد ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ گزر گاہ محبوب کی یاد تازہ ہونا اس وجہ سے ناتواں برداشت ہو گیا کہ وہ گزر گاہ رقیب کے گھر کو حاقی تھی۔ یا رقیب کا گھر اس گزر گاہ پر تھا۔ عاشق سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، مگر رقیب پر محبوب کا خفیت سا بھی التفات برداشت نہیں کر سکتا، گزر گاہ یاد آنے کے خلاف فریاد کا اصل سبب یہی معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ شرح :- فرماتے ہیں "اے محبوب! تیرے گھر کی بار بار رونق اور دلکیزی

بہشت میں کہاں ہوگی؟ میں وہاں پہنچوں گا اور تیرے گھر کی یاد تازہ ہوگی تو بہشت کے دربان سے لازماً میری لڑائی شروع ہو جائے گی اور نہایت ہنگامہ خیز لڑائی ہوگی۔

لڑائی کے سبب دو ہو سکتے ہیں "اول میں کہوں گا، محبوب کا گھر بہشت سے جدا ہو کر ہے۔ رضوان کہے گا، تم غلط کہتے ہو، بہشت جیسی چیز کہیں موجود نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ میں بہشت سے نکلنا چاہوں گا تاکہ تیرے گھر پہنچ جاؤں اور رضوان روکے گا، مجھے نکلنے نہ دے گا، اس طرح لڑائی سے لڑائی کی نوبت ہو جائے گی۔

۷۔ شرح :- جب میرے پہلو میں جگر بھیج سالم موجود تھا تو اس کے بل بوتے پر جس طرح چاہتا تھا، مزید کر دیتا تھا۔ اب قدرت ہوئی، جگر خون ہو کر رہ گیا، صرف دل میرے پاس رہ گیا۔ اس میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ فریاد کی بنیاد بن سکے۔ نیز وہ اس لیے ساتھ نہیں دیتا کہ میں آہ و فریاد کروں گا تو محبوب کی رسوائی ہوگی۔ اس سے سخت تنگ آگیا ہوں اور مجھے جگر یاد آ رہا ہے۔

۸۔ شرح :- میرا خیال پھر تیرے کوچے کی طرف جا رہا ہے۔ شاید اسے گم شدہ دل یاد آگیا اور اس لیے اُدھر جا رہا ہے کہ دل وہاں مل جائے گا۔ کیونکہ اس کے گم ہونے کی اور کوئی جگہ تو موجود ہی نہیں سکتی۔

۹۔ شرح :- خواہر عالی فرماتے ہیں :

"اس شعر سے جو معنی فوراً مقابلاًد ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اسے دیکھ کر گھر یاد آتا ہے، یعنی خون معلوم ہوتا ہے۔ مگر فردا خود کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے، ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی، مگر دشت جی اس قدر ویران ہے کہ اسے دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔"

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : "دشت کی ویرانی میں مبالغہ اس لیے کیا کہ گھر کی ویرانی میں زیادتی لازم آئے، یعنی دشت میں ایسی ویرانی ہے، جیسی حسینہ میرے گھر

میں تھی، گویا یہ تشبیہ معکوس ہے۔

۱۰۔ **تشریح :** لڑکوں کا عام دستور یہ ہے کہ وہ دیوانوں کو اینٹ پتھر اترتے ہیں۔ اسے استاد میں نے بھی لڑکپن میں عام دستور کے مطابق مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا، ساتھ ہی مجھے اپنا سر یاد آ گیا۔ یعنی یا تو وہ پتھر اپنے ہی سر پر مار دیا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ لڑکپن ہی میں مجھے جنون شروع ہو گیا تھا یا یہ خیال آ گیا کہ جب مجھ پر اسی قسم کی کیفیت عادی ہوگی تو لڑکے مجھے بھی اسی طرح اینٹ پتھر دیں گے۔

محبوبی عبدالمعلیٰ دائرہ مزیاتے ہیں : ”اپنے سر کی چوٹ یاد آگئی، اس لیے طفلی میں مجنوں کے سر پر سنگ اندوزی نہ کی۔ گویا قائل نے لڑکپن سے اپنے آپ کو شدید مرزوقی کیا ہے، جس کے سبب سے سبب لفظوں کا مزہ چکھ چکا ہے۔“



۱۔ لغات : عنان گیر:

باگ تمام لینے والا۔ روک دینے والا مانع۔

تشریح : خطاب محبوب سے

ہے۔ مزیاتے ہیں : آپ کے آنے میں

دیر ہو گئی، مگر اس دیر کا کوئی نہ کوئی

سبب تو ہونا چاہیے۔ آپ کی سولاری

یقیناً مناسب موقع پر تیار ہو گئی تھی۔

اور آپ حسب وعدہ وقت پر آ سکتے

تھے، لیکن کہیں نے باگ تمام ل اور

آپ کے آنے میں رکاوٹ کا باعث

بنا، اس کشمکش میں دیر ہو گئی۔

شعر میں ”کوئی“ سے مراد اجڑ

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

آپ آتے تھے، مگر کوئی عنان گیر بھی تھا

تم سے بجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ

اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں

بکھی فتراک میں تیرے کوئی ننچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد

ہاں کچھ اک رنج گراں باری زنجیر بھی تھا

غیر اور رقیب ہے۔

۲۔ لغات : شائبہ :

آمنیزش، غلط، اشک، شبہ

شرح : بیگم میں تباہ ہو

گیا۔ لیکن اس کا کچھ شکوہ تم سے کرنا

تو یہ بالکل بیجا اور بے محل ہوگا

کیونکہ اسے محبوب ! تم میری تباہی

کا باعث نہ تھے، بلکہ اس میں میری

صفت کی خوبی بھی کارفرما تھی

گویا یہ تباہی میری تقدیر میں لکھی

ہوئی تھی جو تم سے شکایت کا کون

ساو قع ہے۔

بظاہر تقدیر کی خوبی یہاں طنزاً

استعمال ہوئی اور شعر سے ظاہر ہوتا

ہے کہ غالب کی تباہی کے دو

سبب ہوئے، ایک محبوب دوسرا

تقدیر، لیکن شاعر کی توجہ دونوں

میں سے خوبی تقدیر کی عورت ذیلہ ہے

۳۔ لغات : فتراک :

شکار بند بگھوٹے کی زمین سے

لگے ہوئے چرٹے کے تھے، جن

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے خیر موٹی

گر بڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غمیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا

نالہ کرتا تھا وے طالب تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فراد کو نام

ہم ہی آشفۃ مسروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا نہ سہی

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دم تحسیر بھی تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا

میں شکاری شکار ! اندھ کر لے آتے تھے۔

نچنچیر : شکار

شرح : ممکن نہیں کہ تو مجھے فراموش کر دے۔ اگر فراموش کر گیا ہو تو میں تاتا بتا دیتا ہوں کہ تیرے شکار بند میں کہیں ایک شکار بندھا ہوا تھا۔ میں وہی ہوں۔
 شعر میں دو نکتے خصوصیت سے قابلِ غور ہیں۔ اول پتا بتانے کے سلسلے میں واضح کر دیا کہ پہلے بھی محبوب کی طرف سے ظلم و ستم میں کوئی کمی نہ تھی، یہاں تک کہ مجھے شکار کے فتر تک میں باز نہ کر دیا۔ دوسرا نکتہ یہ کہ ظلم و ستم سہ لینے کے باوجود محبوب نے مجھے فراموش کر دیا تو یہ بھی ظلم ہی ہوگا۔

م۔ لغات - گرائیاری : بھاری ہوتا۔

شرح : تیری محبت کے دیوانے کو نہ بخیریں پہنا کر قید میں ڈال دیا گیا۔ لیکن اس حالت میں بھی زلفِ گرہ گیر کی یاد بہ دستور تازہ رہی۔ البتہ ساتھ ساتھ نہ بخیر کے بھاری ہونے کی بھی تھوڑی سی تکلیف تھی۔

قیدِ وحشی، زلفِ اور نہ بخیر کی مناسبت تشریح کی محتاج نہیں، جو بات دیوانگی کا باعث تھی اور اس سے قید ہوتا پڑا، اس میں کوئی فرق نہ آیا۔ اگر کوئی نئی چیز ہو تو صرف یہ کہ نہ بخیر کا اوجہ مستزاد ہوا۔

۵۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

”یہاں اس مطلب کو کہ مشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے، اس طرح ادا کیا ہے : بھل اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا۔“

محبوب نے اپنے جمال کی سبب اس طرح دکھائی، جیسے بھلی ایک آنکھوں کے آگے کو نہ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں، بھلا اس سے میرا دل کیہ مگر مطمئن ہو سکتا ہے؟ میں تو آپ کی باتیں سننے کا بھی پیاسا تھا۔ آپ آئے تھے تو میرے شوق کے مطابق جلوہ دکھاتے اور دوچار باتیں کرتے تو کسی قدر تسکین ہوتی۔

خواجہ حالی نے غائب کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ آپ نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو، جو ادبیت کی جان اور شاعری کا ایمان ہے، ریختہ میں اپنے فارسی کلام سے

نہایت کم استعمال نہیں کیا۔ رنجیت گوشتراء نے اس کی طرف کم توجہ کی ہے۔ استاد سے صرف محاورہ است اردو میں بلاشبہ استعمال ہوتے ہیں، لیکن استاد سے کے قصد سے نہیں، بلکہ محاورہ ہندی کے شوق میں استاد سے بلا قصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔

غالب نے ایسے کنیے استعمال کیے جو پوری عبارت اور پورے جملے کی شکل میں ہوں۔ اردو شاعری میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ ایسی ایک مدونہ مثال یہ شعر بھی ہے۔

۶۔ لغات : تعزیر : سزا

شرح :- میں نے محبوب کو کمال حسن کی بنا پر یوسف کہ دیا اور اس پہلو کا خیال نہ کیا کہ حضرت یوسف مصر پہنچے تھے تو عزیز مصر نے انہیں غلام کی حیثیت میں خرید لیا تھا۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے براہ مانا اور خیر گزری۔ اگر وہ ناراض ہو جاتے اور بگڑ بیٹھتے تو یقیناً میں سزا پانے کے قابل تھا۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میرا محبوب حسن میں یوسف سے بڑھا ہوا ہے۔ اگر وہ کمتر سے تشبیہ دینے پر بگڑ جاتا تو میں سزا کا مستحق تھا۔

۷۔ شرح : خیر کو دیکھ کر میرا کلیجہ کیوں ٹھنڈا نہ ہو ؟ وہ میری طرح آہ و فغاں کرنے لگا۔ لیکن اس میں تاثیر کوئی نہ تھی، کیونکہ وہ سچے عشق سے بے بہرہ تھا اور صرف ہوس اس کے تمام کاموں میں گمراہ تھی۔ اس کی آہ و فغاں کو بے اثر دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ سچے عاشق کے طور طریقوں کی پیروی کر کے اس کا درد سہ نہیں پا سکتا۔ لہذا اس سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور یہی امر کلیجے کی ٹھنڈک، نیز دل کے اطمینان کا باعث بن گیا۔

۸۔ لغات : نام رکھنا : عیب لگانا۔ الزام لگانا۔

آشفۃ سر : عاشق دیدار

جوانمیر : جوان مرگ۔ جوانی میں مر جانے والا۔

شرح : اگر فردا نے تیشہ چلانا اپنا پیشہ بنا لیا تو اس میں عیب کی کون سی

ہوت ہے ؟ اسے الزام کی بنیاد کیوں جاتے ہو ؟ اس کی شانِ مردانگی پر نظر ڈالو کہ جوانی ہی کے عالم میں انتہائی بے پروائی سے محبوب پر جان قربان کر دی۔ غرض وہ جوانمرد بھی ہمارے ہی زمرے میں شامل تھا، جنہوں نے عشق کو دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

۹۔ لغات : ترکش : تیردن، تیردکھنے کا قول۔

شرح : ہم تو مرنے کے لیے تیار کھڑے تھے اور جان دے دینے میں ہیں قطعاً دریغ نہ تھا، لیکن محبوب نے ہمارے پاس آنا گوارا نہ کیا اور اس کی تلوار ہماری زندگی کا فیصلہ اسی صدمت میں کر سکتی تھی کہ وہ ہمارے قریب ہوتا۔ لیکن اگر اسے کسی وجہ سے ہمارے قریب آنا منظور نہ تھا تو کوئی معافیہ نہ تھا، وہ دور سے ہمیں تیر کا نشانہ بنا سکتا تھا یہ بھی نہ ہوا۔ پھر کیا ہم یہ سمجھیں کہ اس کے ترکش میں کوئی تیر بھی نہ تھا۔

۱۰۔ لغات :- فرشتوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں کراما کا تہن کیا جاتا ہے۔ وہ ہر انسان کے دائیں بائیں مقرر ہیں اور اس کی نیکیاں یا بدیاں دیکھتے جاتے ہیں۔
شرح :- خواہ حال اس شعر کے سلسلے میں فرماتے ہیں :
ہمارے جرم کے ثبوت کے لیے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے امرت فرشتوں کا کھنکھانی نہیں :-

خدا کے مقرر کیے ہوئے فرشتوں کے متعلق خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی چیز خلافِ واقعہ لکھیں گے، لیکن غالب نے شوخی سے کام لے کر اس پر بے معانی کو عام انسانی حدائق کے دستور پڑھا لیا۔ یہاں کوئی بیان اُس وقت تک ثبوت کے درجے کو نہیں پہنچتا، جب تک اس کے لیے ایسے گواہ موجود نہ ہوں، جن کی گواہی جھٹکائی نہ جاسکے۔ چنانچہ غالب کہتے ہیں کہ کراما کا تہن کے کچھ ہوئے اعمال ناموں پر خواہ مخواہ ہمیں پکڑا اور مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، حالانکہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں، اس کے ثبوت کے لیے ہمارا بھی کوئی آدمی پاس ہوتا ہے، جس کے دستخط

تصدیق کے طور پر لے لیے جاتے ہوں ؛ اگر ایسا نہیں ہوتا تو فرشتوں کی مکھی ہوئی
تحریر یک طرفہ ہوگی اور اسے مسلم الثبوت نہیں مانا جا سکتا۔

۱۱۔ لغات : ریختہ : اردو کے اشعار۔ اردو کو ریختہ اس لیے کہنے
لگے کہ یہ مختلف زبانوں کی آمیزش سے بنی۔ جیسے دیوار اینٹ، مٹی، پچوٹے، سفیدی
سے پختہ کرتے ہیں، اردو بھی ہندی، فارسی، ترکی، عربی وغیرہ زبانوں کے الفاظ سے
مرکب ہے۔

شرح : منفعہ فخریہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اسے غائب! تھیں اور شاعری
کے استاد نہیں ہو۔ جو زمانہ گزر چکا اس میں اس شاعری کا ایک استاد میر تقی میر بھی تھا۔
بے شک اس میں میر کے کمالی سخن کا اعتراف کیا، لیکن غائب کی نکتہ نوازی
ملاحظہ ہو کہ اسے لوگوں کا قول قرار دیا۔ ”کہتے ہیں“ کا صاف مطلب یہی ہے۔

۱۔ لغات : دردِ تشنگی مردگان : لب خشک، دردِ تشنگی مردگان کا
وہ لوگ جو پیاسے مر گئے۔ جنہوں نے
پوری عمر عشق کی سختیاں سہتے سہتے گزار
دی اور ان کی کوئی بھی آمد و اس فنگ
میں پوری نہ ہوئی۔
دلِ آرزو گان : جن کے دل دکھے
ہوئے ہوں۔ تباہ حال عاشق۔

شرح :- میں اُن لوگوں کا خشک لب ہوں، جو پیاسے مر گئے۔ جنہوں نے
عشق و محبت میں سب کچھ شاد دیا اور ان کی کوئی آمد و پوری نہ ہوئی۔ میں ان کی اس ناکامی
وایوسی کی کھلی ہوئی اور روشن شہادت ہوں، کیونکہ پیاس سے مرے ہوئے لوگوں کی
موت کا سبب اس لب سے ظاہر ہو سکتا ہے، جس پر تری کا کوئی نشان نہ ہو۔ اسی
لیے میں ان عاشقوں کی زیارت گاہ بن گیا ہوں، جن کے دل دکھے ہوئے ہیں اور ستر

ثابت قدمی سے گزار دینے کے باوجود ان کی کوئی آرزو بر نہ آئی۔

۲۔ لغات : فرب و فخور دکان : دکان کا فرب کھائے ہوئے لوگ
یعنی وہ لوگ جنہیں ابتدا میں یقین ہو گیا تھا کہ محبوب محبت میں دنا داری کا ثبوت
دے گا، مگر اصل میں یہ یقین بے بنیاد تھا۔ وہ لوگ دھوکا کھا گئے اور فرب میں
آ گئے۔

شرح :- میں ان لوگوں کا دل ہوں، جو دنا کا فرب کھا چکے ہیں۔ ایسے
دل میں صرف دو چیزیں باقی رہ سکتی ہیں، اول سراسر نا اُمیدی، دوم سراسر دُگمانی۔
نا اُمیدی اس لیے کہ شروع میں دنا کا یقین پیدا ہوا تھا تو جتنی امیدیں دل
میں تھیں، وہ ایک ایک کر کے غون ہو گئیں۔ ایسا دل پھر کسی امید کا روادار نہیں ہو
سکتا اور وہ واقعی سراپا نا اُمیدی بن جاتا ہے۔ دُگمانی اس لیے کہ جب دنا کا یقین
ہوا تھا تو صرف ایک گمان تھا، لیکن جب واضح ہو گیا کہ یہ سراسر دھوکا اور فرب
تھا تو دُگمانی نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ کسی بھی چیز پر نیک گمان پیدا ہونے کی
گنجائش ہی نہ رہی۔

نفسیات کا بڑے سے بڑا ماہر دنا کا فرب کھائے ہوئے لوگوں کی طلب کی
کیفیات کا تجزیہ اس سے بہتر نہیں کر سکتا۔



تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا
اوروں پر ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا میرا خشب کی طرح دستِ قضا نے
خود شہید مہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

۱۔ شرح : اے شکر !
تو نے کسی سے بھی دوستی کا حق ادا نہ
کیا۔ جو ظلم مجھ پر نہ ہوا، وہ دوسروں
پر کیا گیا۔ آخری مصرع کی مختلف تفسیروں
ہو سکتی ہے، مثلاً :

۱۔ جو ظلم مجھ پر نہ کیے، ان کا نشانہ
دوسروں یعنی میرے رفیقوں کو بنایا یہ

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
 آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوسبر نہ ہوا تھا
 جب تک کہ نہ دیکھا تھا تقدیر کا عالم
 میں مقتدرِ فتنہ محشر نہ ہوا تھا
 میں سادہ دل، آزر دگی یار سے خوش ہوں
 یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا
 دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
 میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
 جاری تھی اسد داغِ جگر سے مرے تحصیل
 آتشِ کدہ، جاگیرِ سمن در نہ ہوا تھا

اس لیے ستم ہے کہ عاشق کو محبوب
 کا ظلم بھی دوسروں پر گوارا نہیں
 کیونکہ ظلم و ستم بھی بہر حال
 ربط و تعلق ہی کی ایک شکل ہے
 جس کا اندازہ مرزا نے ایک سے
 زیادہ مقامات پر کیا ہے، مثلاً:
 لاکھ ہواں کو تو ہم سمجھیں لگاؤ
 یا
 قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
 ۲۔ مجھ پر تو نے جو ظلم کیے
 وہ دوسروں پر نہ ہوئے۔ یعنی
 تو نے ظلم تو سب پر کیے اور
 تیری ستم گری یقیناً ستم ہے،
 اگرچہ مجھے بہت ظلم بنے میں دوسروں
 پر امتیاز حاصل ہے۔

۲۔ لغات - نغشب: ترکستان کا ایک شہر جسے ایرانی نغشب اور عربی
 نسف کہتے تھے۔ آج کل اس کا نام قرشی ہے۔ یہیں ابن المقفع کا مرکز تھا، جسے
 خراسان کا نقاب پوش مدعی نبوت قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے یہاں کئی کرشمے دکھا کر
 لوگوں کو اپنا معتقد بنایا تھا۔ ان میں سے ایک چیز کنوئیں سے باہر نکلتی تھی اور لوگ
 اسے چاند سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس کی شکل چاند سے ملتی جلتی تھی اور اس کی روشنی بھی
 مثنوی دودک ہوتی تھی۔ یہی چاند فارسی اور اردو ادبیات میں مر نغشب کہلایا اور
 ایرانی ابن المقفع کو سازندہ ماہِ مبین چاند بنانے والا کہنے لگے۔ یہ چاند مثنوی ہی نبوت
 کے بعد پھٹ کر برباد ہو گیا۔

شعر میں سورج کو اس لیے ماہِ نخب سے تشبیہ دی کہ غائب کے نزدیک وہ بھی ابھرنے کے چاند کی طرح ناقص الخلقیت ہے۔

شرح : سورج ابھی تک حسن و جمال میں میرے محبوب کے برابر نہیں پہنچا تھا کہ نخب کے چاند کی طرح نقصان کے باعث اسے ناقص بن چھوڑ دیا تاکہ وہ درجہ کمال کو پہنچے، میرے محبوب کے برابر آئے، میرے محبوب کی کیناٹی پر کوئی اثر پڑے۔

۳۔ **شرح :** خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں :

ہاں کل نیا، اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت معافی و عفو کی سے اسے ادا کیا ہے۔ دعویٰ ہے کہ جس قدر بہت عالی ہوتی ہے، اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرہ آبِ حیات آنکھوں میں جگہ ملی ہے، اگر اس کی بہت حب کہ وہ دریا میں تھا، موتی بننے پر تانی ہو جاتی تو اس کو، جیسا کہ ظاہر ہے، یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا؟

شعر کا بنیادی مضمون خواجہ حالی کے ارشاد کے مطابق یہی ہے کہ فطرتِ انزل سے ہر وجود کی تائید و حمایت اس کی بہت کے مطابق کرتی ہے۔ انسانوں میں مراتبِ عمل کا جو فرق ہے، وہ بھی بہت ہی کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے۔ اس کے لیے دلیل ایسی پیش کی جو ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ہے اور اس کے قبول میں کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر قطرہ دریا میں رہ کر اور آغوشِ صدف کی تربیت پا کر موتی بن جاتا تو اس کے لیے بھی بلندی حاصل کرنے کے کئی موقع تھے، جیسے ہار میں جگہ پا کر حسینوں کے گلے تک پہنچ جانا، دیود کی آرائش بن کر کانٹوں تک رسائی حاصل کر لینا، بادشہوں کے تاج میں شامل ہو کر مسر پر پہنچ جانا، لیکن اس نے ایسی کوئی رفعت قبول نہ کی، کیونکہ اس کی بہت بہت بلند تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے آسمان بن کر آنکھ میں جگہ پائی اور اس سے بلند تر رتہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ **شرح :-** قاسم محبوب کو عموماً قیامت سے تشبیہ دیتے ہیں، کیونکہ اس کائنات کی کوئی دوسری اٹھان قیامت محبوب کے مقابلے پر نہیں آ سکتی۔ اسی لحاظ سے محبوب کے خرام ناز کو فتنہ قیامت یا فتنہ محشر کہتے ہیں اور خود قیامت کو فتنے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ قیامت کے فتنے کی باتیں تو بار بار سنی تھیں، لیکن دل کو یقین نہیں آتا تھا جب قاسم محبوب کا رنگ ڈھنگ دیکھا تو یقین ہو گیا کہ واقعی فتنہ محشر کے متعلق جو کچھ کہا جاتا تھا، وہ بالکل درست ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی نادیدہ چیز کا یقین پیدا کرنے کے لیے کوئی ذکر فی مثبت شہادت سامنے ہونی چاہیے۔ تبو یار کے عالم نے شاعر کو فتنے کا مستند بنا دیا۔

۵۔ **شرح :-** میں سادہ دل اور سادہ لوح سا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب کے آئندہ ورنجیدہ ہو جانے پر خوش ہوتا ہوں، کیونکہ اس طرح معاملات عشق کا سبق دہرانے کا موقع مل جائے گا۔

شاعر کا مدعا یہ ہے کہ محبوب ورنجیدہ ہو گا تو مجھے موقع ملے گا کہ اس کے سامنے حاضر ہو کر اپنے عشق و محبت کی کیفیت بیان کروں۔ بتاؤں کہ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلے میں گلے شکوے بھی ہوں گے۔ یہ تمام باتیں پہلے مرحلے پر دلی خوشی کا باعث بنی تھیں، کیونکہ ورنجیدگی کے بعد محبوب سے صلح ہو گئی تھی۔ عاشق چاہتا ہے کہ وہ سدا اقصائے نئے سرے سے دہرایا جائے۔ لہذا اپنی سادہ دلی سے محبوب کو ورنجیدہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ محبت کا رشتہ نئے سرے سے استوار ہو گا تو اس میں زیادہ استحکام پیدا ہو جائے گا، جس طرح سبق دہرایا جائے تو خوب یاد ہو جاتا ہے۔ اس پوری آرزو کو سادہ دلی اس لیے کہا کہ عاشق یہ ادا ذہ نہ کر سکا۔ ایک مرتبہ تعلقات درست ہو جانے کے بعد ضروری نہیں کہ دوبارہ دہرایا رابطہ قائم ہو جائے۔

۶۔ **لغات۔ معاصی :-** معصیت کی جمع۔ گناہ

شنگ آملی : پانی کی کمی ۔

دوسرے مصرع میں " دامن تر نہ ہوا تھا میں ایک لطف " بھی ہے کہ محاورے میں " دامن تر " گنگاری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

شرح : - خواجہ عالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
- گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے صفا شنگ ہو گیا ، مگر اس میں ہمارے دامن کا پتہ تک نہیں بیگا ۔

گناہوں کے دریا میں شاید پانی تھوڑا تھا کہ وہ بالکل خشک ہو گیا ، حالانکہ ہم اس تک اپنے دامن کا ایک کونہ بھی جھگو نہیں سکے تھے ۔ شعر میں دو نکتے بطور خاص قابلِ غور ہیں ، اول یہ کہ گناہوں کے دریا میں حقیقتہً پانی کم نہ تھا ، لیکن گنگا کے دامن کا گوشہ اتنا پانی اپنے اندر جذب کر گیا کہ احساس ہوا ، شاید اس میں پانی ہی کم تھا ۔ اگر حقیقتہً پانی کم ہوتا تو اس کے لیے " دریا " کا لفظ استعمال کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی ۔ مطلب یہ کہ دریا میں پانی کی کمی نہ تھی ، مگر گنگا کی باحوصلگی نے اسے مزایا یہ بنا دیا ۔
دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ دریا دامن کا گوشہ یا کنارہ بھی تر نہ کر سکا ۔

۷۔ لغات : تحصیل : حاصل کرنا ، استفادہ

نُسندہ : بڑے چمچے کے برابر ایک جانور ، جس کے متعلق فارسی اور اردو ادب میں یہ امتیاز مشہور ہے کہ وہ آگ میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں رہتا ہے ، جیسے مچھلیاں اور دوسرے آبی جانور پانی میں رہتے ہیں اور آگ سے باہر نکالیں تو مر جاتا ہے ۔ بمعنی اسے پروا دہ جانور قرار دیتے ہیں ۔ اور اسی کا دوسرا نام مرغ آتش خوار ہے ۔ " سام " اور اندر سے مرکب ہے ۔ سام ، آگ اور اندر حرفِ ظرف ۔ ایسا کوئی جانور یا پرندہ اب تک دریافت نہیں ہوا ۔

انگریزی کا لفظ سالامندر SALAMANDER ، یعنی دیوتا فی لفظ سالامندر سے مشتق ہے ۔ یہ گرگٹ جیسا ایک جانور ہوتا ہے ، جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ آگ میں بھی زندہ رہتا ہے اگر یہ درست ہے تو ظاہر ہے کہ نُسندہ سالامندر سے بنا ہوا

کر سام اور اندر سے ۔

شرح :- اسے اسد امیرے جگر کا داغ اُسی وقت سے آگ کا سرچشمہ بنا ہوا ہے اور میں اس سے آگ حاصل کر رہا ہوں ، جب آتش کدے میں سفید نام جانور پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور آتش کدے کو اپنا خاص مرکز و مقام بنالینے کا معاملہ تو پیدا آتش کے بعد کا ہو سکتا ہے ۔

مطلب یہ کہ میں اس وقت سے آتش عشق میں غلج بھن رہا ہوں ، جب اس طرح جلنے بھننے والے معرمن وجود ہی میں نہیں آتے تھے ۔ گویا ازل سے میرا شہدہ ہیں ۔



۱۔ لغات : خلوت : تنہائی
عیدگی : وہ مقام ، جہاں کوئی دوسرا
نہ ہو ۔

ناموس : عزت ، آبرو
شرم : حیا ۔
رشتہ شمع : موم جی کے اندر
کا دھاگا ۔

کسوت : لباس ، کسوتِ فانوس
اس باریک کپڑے کو کہتے ہیں ، جو
فانوس پر چڑھا دیا جاتا ہے ۔ اور
آج کل بعض اوقات اسے بھلی
کے بیوں پر بھی چڑھا لیتے ہیں ۔

شب کہ وہ مجلسِ فرد ز خلوت ناموس تھا

رشتہ ہر شمع ، خوار کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جگہ گنتی ہے جانا

کس قدر یارب ! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو

دل بہ دل پیوستہ ، گویا اک لپٹِ ناموس تھا

کیا کویں بیمار جی غم کی فراغت کا بیان

جو کہ کھایا طوینِ دل بے منتِ کیوس تھا

شرح : نامت میرا محبوب عزت و حرمت اور شرم و حیا کی تنہائی میں بیٹھا ہوا

تھا اور پوری خلوت حسن و جمال کے جلوؤں سے جگمگا رہی تھی ۔ ہر طرف شمعیں بدھن تھیں

اور محبوب کی جلوہ آرائیاں دیکھ کر ندامت سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔ ان کے اندر جوہر جاگے تھے، وہ خانوس کے لباس میں کاتھوں کی طرح کشک رہے تھے۔ مراد یہ ہے، محبوب کی بزم خلوت میں مشرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ شمعیں گھسی جاد رہی تھیں اور خانوس کی بیقراری کا یہ عالم تھا، جیسے ان کے لباس میں کاتھے غلش کا سامان بن گئے۔

۲۔ لغات۔ مشرد : مقام شہادت۔

پابوس۔ قدم چومنا۔ پاؤں کو بوسہ دینا۔

شرح :- جس مقام پر عاشق نے شہادت پائی، وہاں ارد گرد کو سوں تک محدود رکھ رہی ہے۔ اس سے واضح ہو سکتا ہے، عاشق کے دل میں محبوب کے قدم چومنے کی حسرت کس قدر بھری ہوئی تھی کہ وہ جان یوں ثابت ہوئی۔ مہندی کے اُگنے سے شاعر نے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ یہ عاشق کے خون سے تیار ہوئی۔ اس کی آرزو یہ ہے کہ کٹے پے اور محبوب کے پاؤں میں لگائی جائے۔ اس طرح پاؤں چومنے کی حسرت کی تلافی ہو جائے۔

۳۔ لغات۔ شکست آرزو : آرزو کا ٹوٹنا۔ یعنی خون ہونا۔

شرح : محبت و الفت کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ دیکھا کہ آرزو کا خون ہوتا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جب محب و محبوب کے دل باہم ملتے ہیں تو وہ ایسے برس کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن سے لفظ امنوس نکلتے۔

شعر میں بظاہر خوبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ لفظ "امنوس" بولا جائے تو دونوں لب ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ یہاں "امنوس" کا لفظ لانے کا مقصد یہی ہے کہ دو دل پیوستہ ہو کر دو لب بنتے ہیں۔ مگر "امنوس" کہتے ہی جدا ہو جاتے ہیں۔ گویا محبت و محبوب کے دل ملنا ہی تفرقے اور جدائی کا سبب بن جاتا ہے۔

۴۔ لغات۔ کیموس : معدے میں غذا کی تحلیل کے دو مرحلے ہیں۔ اول

کیلوس، یعنی غذا معدے میں پہنچتی ہے۔ تو حرارت اسے پکا کر عرق نکال دیتی ہے۔

دوسرا سر ملے کیوس کا ہے۔ یہ عرق جگر میں پہنچتا ہے تو وہ اسے خون بنا دیتا ہے۔
اسے ہضم جگر ہی بھی کہتے ہیں۔ کیوس اور کیوس دونوں لفظ اصل میں یونانی ہیں۔
تشریح :- غم عشق کی بیماری سے جو فراغت نصیب ہوئی، اس کا کیا
بیان کروں۔ بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ میں نے جو خون کھایا، اس میں کیوس کا اسٹان
د اٹھایا۔

انسان بیمار ہو جائے تو اس کے ہضم پر بھی کم و بیش اثر پڑتا ہے، خصوصاً خاص
بیماریوں میں کیوس یعنی ہضم جگر ہی خراب ہو جاتا ہے، لیکن غم عشق کی بیماری ایسی
تھی کہ اس نے کیوس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اس کے بغیر ہی خون بن بن کر کھلنے
کو لگا گیا۔



۱۔ تشریح :- محبوب کو بڑا ادھولی
تھا کہ میں کسی کو دل نہیں دے سکتا
ساتھ ہی حیرت بھی تھی کہ ہر شخص
اس کا شیدائی کیوں بن جاتا ہے اور
کیوں کہا جاتا ہے کہ دل مجھے دے
بیٹھے۔ جب آئینے میں اپنا عکس دیکھا
تو اسے ایک نیا حسین سمجھ کر محبوب
اپنا سامنے لے کر رہ گیا، یعنی جھپٹ کر رہ گیا، کیونکہ اسے دل دیے اور اس کا
شیدائی ہو کے بغیر چارہ نہ رہا۔

اب سوچئے کہ حسن و جمال کے جس عکس پر محبوب فریفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ
سکتا، اس پر دوسرے دل و جان بچھاؤ کر کے بے تیار ہوں تو تعجب کا کون
ساقام ہے؟

۲۔ تشریح :- عاشق نے خط دے کر قاصد کو محبوب کے پاس بھیجا۔

کو اتنا غصہ آیا کہ اپنے ہاتھ سے قاصد کی گردن اڑانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اب عاشق پریشان ہو کر کہہ رہا ہے کہ اسے کیوں قتل کرتے ہیں، اس کی تو کوئی خطا نہیں، قصود اور تو میں ہوں۔ جو سزا دینی چاہتے ہیں، مجھے دیجیے۔

۱۰ اپنے ہاتھ سے گردن ڈمارے کے دو پہلو ہیں، اول رشک کا پہلو صنیعہ کہ محبوب کے ہاتھ سے قاصد کا قتل ہونا منظور نہیں اور عاشق چاہتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے مارا جائے، اور کسی پر اس کا ہاتھ نہ اٹھے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر محبوب نے اپنے ہاتھ سے قاصد کو قتل کیا تو مجرم وہ ٹھہرے گا۔



عرضِ نیاز و عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں دلِ غمِ حسرتِ ہستی بے ہوئے
ہوں شمعِ کُشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہیں
شایانِ دست و بازو نہ قائل نہیں رہا
بروئے شش چہمت در آئینہ باز ہے
یاں اقیانوسِ ناقص و کامل نہیں رہا
واکر دیئے ہیں شوق نے بند نقابِ سن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

۱۔ شرح :- میں عشق کی
نیاز مندی کے ذلیفے ادا کرنے کے
لائق نہیں رہا اور جس دل کے بل
پر یہ تمام ذلیفے ادا کرنے کا مجھے
فخر تھا، وہ دل ہی اصل صلاحیت
کھو بیٹھا ہے۔

عشق کی نیاز مندی کے فرائض
کیا ہیں؟ عاجزی، حیرانی، پریشانی
خاندیرانی، بے وفائی کے رنج،
فراق کی مصیبتیں، قحطِ قل کے سدے
محبوب کی طرف سے ہر قسم کی سختیاں
ہونے کے باوجود صبر سے کام لینا
بلکہ غیروں پر التفات کی جاگزا ادا
بھی برداشت کر لینا۔ یہ تمام صلاحیتیں
جاتی رہیں، کیونکہ دل کی پہلی حالت

گوں رہا رہیں ستم ہائے روزگار
ہی باقی نہ رہی، جس پر مجھے
فردناز تھا۔

۲۔ لغات - شمع کشتہ
بجھی ہوئی شمع -
دل سے ہوائے کشت و فامٹ گئی کرواں

حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد

جس دل پر ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
رہا ہوں - یعنی میں نے زندگی
میں کوئی راحت و آسائش نہ

دیکھی۔ میری کوئی آرزو پوری نہ ہوئی، ہر قدم پر نامرادی سے سابقہ چڑا، ہر تنہا
خون ہو کر رہتی رہی۔ ایسی زندگی کو حسرتِ زندگی کے وارغ کے سوا کیا کہا جاسکتا
ہے اور اس سے بہتر تعبیر جو بھی کیا سکتی ہے، میری حالت اس شمع کی سی ہے
جو گل ہو چکی ہو اور روشنی سے بالکل محروم ہو جائے۔ ایسی شمع کو کبھی بزم میں
رکھتے جانے کے لائق نہیں سمجھا جاتا اور سمجھتے ہی معاً اسے اٹھا دیا جاتا ہے۔

وارغِ حسرت ہستی کو بھی ہوئی شمع سے تعبیر کرنا سخنمندی کا ایسا کمال ہے جو بیان سے
کہیں زیادہ عمیق و فکر کا محتاج ہے۔ دیکھیے یہ ہے غالب کی حقیقی شاعری کے چند
الفاظ ہیں، اور ایک عام تشبیہ، لیکن شعر میں اتنا سوز اور درد بھردیا ہے کہ تفصیل
صبح سے شام تک کرتے جائیے، مگر اس کے معارف و محاسن ختم نہیں ہو سکتے۔

۳۔ شرح :- اے دل! اب مرنے کا کوئی اور ہی طریقہ اختیار کرنا
چاہیے، کیونکہ میری حالت اب ایسی نہیں رہی کہ محبوب کے دست و بازو کی
تبع آزمائی کے قابل سمجھا جاؤں۔

شعر میں خوبی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ عاشق خود اپنے آپ سے یہ سب
کچھ کہہ رہا ہے۔ یعنی اسے محبوب کے دست و بازو کے کمالات اور یگانگی کا بھی

پورا اندازہ ہے، پھر اپنی حیثیت بھی ٹھیک ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ دونوں چیزیں برابر رکھ کر انھیں توڑتے ہوئے کہتا ہے، میں تو اس قابل نہیں کہ محبوب مجھے قتل کرے، البتہ مرنا ضروری ہے، لہذا اس کی کوئی اور تدبیر کر لینی چاہیے۔ لطف یہ کہ کوئی تدبیر متین نہیں کی، سننے والے کو موقع دے دیا کہ جتنی تدبیریں اس کے ذہن میں آسکتی ہیں، لے آئے۔ ان تدبیروں میں ذہر کھا کر مرنے، ڈوب جانے، کسی بلندی سے چٹھے گرنے وغیرہ ہر قسم کی تدبیریں شامل ہیں۔ انھیں غیر متین چھوڑ دینے سے شر میں ایک نیا لطف پیدا ہو گیا۔

بعض اصحاب نے کہا ہے کہ غالب کا یہ شعر نظیری کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

آں شکارم من کہ لائق ہم بہ کشتن غیتم
شرم می آید مرا ہذا نکس کہ عیاد من است

میں وہ شکار ہوں کہ مارے جانے کے بھی لائق نہیں، مجھے اس شخص سے شرم آتی ہے، جو میرا شکاری بنے۔

ظاہر ہے کہ دونوں شعروں میں حقیقت کوئی مناسبت نہیں۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں مارے جانے کے بھی قابل نہیں، لہذا مجھے اپنے حیات سے شرم آتی ہے اور یہ ایک عام شعر ہے، جس کا تغزل محل نظر ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں محبوب کے ہاتھوں مارے جانے کے لائق تو نہیں رہا۔ پھر دل سے خطاب کرتا ہے کہ مرنے کی کوئی اور ہی تدبیر کرنی چاہیے۔

۴۔ لغات۔ شش صحبت : چھ طرفین یعنی دائیں بائیں آگے پیچھے

اور پیچھے، اس سے مراد ہے۔ عالم، کائنات۔

تشریح :- کائنات کے منہ پر آئینے کا دروازہ کھلا ہوا ہے، یعنی پوری

کائنات کے سامنے آئینہ دکھتا ہے۔ یہاں ناقص اور کامل، کھوٹے اور بھرے کے درمیان کوئی امتیاز اور کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

آئینے کی خاصیت، یہی ہے کہ جس چیز کا عکس اُس میں پڑے، اسے بے کم و کاست

آفتکار کر دیتا ہے۔ اگر ناقص اس میں اپنا چہرہ دیکھے گا تو تمام نقص واضح ہو جائیں گے۔ آگ کا عکس آگ ہی کی شکل میں نظر آئے گا۔ نہ کہ پانی کی شکل میں۔ ناقص و کامل، کھوٹے اور کھرے کے درمیان امتیاز ہو سکتے ہیں، لیکن کائنات کے آئینے میں کسی کے لیے کوئی امتیاز نہیں۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آئینہ سامنے کھلا رکھا ہے۔ ناقص ہو یا کامل دونوں اسے دیکھ کر حیران ہیں۔ کیونکہ حقیقت کا راز نہیں پا سکتے۔ راز نہ پا سکنے میں ناقص کامل کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

۵۔ لغات - حائل : بیچ میں آہانے والا، روک، آڑ۔

شرح :- حسن حقیقی کے شوقِ نمائش نے نقاب کے ہر دورے کی گرہ کھول دی ہے۔ یعنی تمام پردے اٹھا دیے ہیں۔ اب ہماری نگاہ کے سوا کوئی روک کوئی آڑ اور کوئی پردہ موجود نہیں رہا، یعنی ہماری نگاہ میں دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں وہ خود ایک پردہ بن گئی ہے، ورنہ حسن حقیقی نے تو جمال کی نمائش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

شعر میں قابلِ غور لفظ "شوق" ہے۔ اگر اس سے دیکھنے والے کا شوقِ بیتاب مراد لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس شوقِ بیتاب نے حسن کے تمام پردے اٹھا دیے، وہ اپنی نگاہ کا پردہ کیوں نہ اٹھا سکا اور اس میں بینائی کی صلاحیت کیوں پیدا نہ کر سکا؟ صحیح یہی ہے کہ شوق سے حسن کی نمود و نمائش کا شوق مراد لی جائے۔ یعنی حسن تو ذرے ذرے میں پھیلا ہوا ہے، مگر ہمارے پاس دیکھنے والی نگاہ ہی نہیں۔

۶۔ لغات - رہین : گزرو، وقت۔

شرح :- اگرچہ میں زمانے کے جو دو قسم میں گرو رہا، یعنی جو دو قسم نے مجھ پر بری طرح قابو پائے رکھا، لیکن اس حالت میں بھی میں اسے محبوب، اترے خیال سے غافل نہیں رہا۔ تیری یاد بدستور میرے دل میں تازہ رہی۔ زمانے کی کوئی گردش میرے عشق و محبت پر اثر انداز نہ ہو سکی۔

۷۔ لغات۔ ہوا : آرزو۔ خواہش

شرح :- اب میرے دل سے وفا کی کیفیت کی آرزو ہی مٹ گئی، کیونکہ میں سے حاصل یعنی پیداوار کی حسرت و ناامدادی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا۔
ظاہر ہے کہ جس فصل سے کچھ ہاتھ آنے اور کچھ بھل جانے کی امید نہ ہو، اسے جوٹے یا اس کی آبیاری کرنے کی آرزو سراسر لاعا حاصل ہوگی۔ ہم بھی وفا کی کثرت کا یہی سرگرم رہے۔ اس کے ساتھ ہماری بڑی آرزوئیں وابستہ تھیں، لیکن تجربے سے یہی ظاہر ہوا کہ یہ کیفیت کچھ پیداوار نہیں دے سکتی۔

”وفا“ کو عام معنی میں بھی استعمال کر سکتے ہیں، یعنی دوستوں کی وفا، خوفش و اتااب کی وفا اور وفائے محبوب بھی مراد لے سکتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ وفا سے حسرت کے سوا کچھ مل نہیں سکتا۔

۸۔ **شرح :-** اے استاد! میں ان تکلیفوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے ہرگز نہیں ڈرتا، جو عشق کا خاصہ ہیں اور کسی عاشق کو ان سے مفر نہیں، لیکن کیا کرنا کہ جس دل پر مجھے نوازنا تھا، وہی اپنی پہلی حیثیت کھو بیٹھا ہے اور میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔



۱۔ **شرح :** عاشق

کش کش میں پھنس گیا ہے۔

ایک طرف رشک اسے یہ بتاتا

ہے کہ محبوب نے دغیب سے

اخلاص، مہر و محبت اور میل

جول کی جو روش اختیار کر رکھی

ہے، وہ انوس کا باعث ہے

اور رشک کا تقاضا ہی یہ ہے

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف

عقل کہتی ہے، کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرہ ذرہ سا غرے خانہ نیرنگ ہے

گردش مجنوں، پرچم ہائے میلی آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازش ارباب عجز

ذرہ صخرہ دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

کہ وہ نہ تو محبوب سے کسی کی محبت برداشت کر سکتا ہے نہ کسی پر محبوب کے التفات کا ادا دار ہو سکتا ہے۔ اس استاد میں عقلِ سلیم رشک کی نفی کرتی ہے اور کہتی ہے جدا وہ محبوب، جو سراسر بے بہر ہے اور اس کی فطرت میں محبت کا جوہر موجود ہی نہیں کسی سے دوستی اور آشنائی بناہ سکتا ہے؛ کل ہم سے دوستی کا اظہار کیا بار بار تھا، پھر میں چھوڑ کر غیر پر توجہ شروع ہو گئی، ذرا غمزدہ اس سے بھی وہی سلوک ہوگا، جو ہم سے ہو چکا ہے۔ لہذا موجودہ صورت حال پر رشک کی کوئی وجہ نہیں۔

۲۔ لغات : نیرنگ : گردشِ آیام۔ انقلاب۔ سحر و ظلم۔ بوتلوئی۔ چشمک : آنکھ کا اشارہ۔

شرح : یہ نیرنگ زار یعنی یہ دنیا ہر وقت گردش و انقلاب میں ہے اور اس کا ہر ذرہ اسی طرح گردش و انقلاب کا پابند ہے، جن طرح شراب خانے میں ساغر گھوما کرتا ہے۔ اس کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ مجنوں کا صحرا میں مارے مارے پھرنا اس کی محبوبہ بیٹی کے اشارہ چشم کا نتیجہ ہے، یعنی میں جس طرف مجنوں کی باگ موڑ دیتی ہے وہ اسی طرف ٹھرتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت اس عالم کی ہے اور اس کی گردش بھی ایک محبوب کے اشارہ چشم کا کرشمہ ہے، جسے ہم محبوب حقیقی کہتے ہیں۔

۳۔ لغات : سامانِ طراز : سامانِ آراستہ کرنے والا۔

نیں، اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کھے عاقبت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا شکوہ سنج رشک ہم دیگر نہ رہنا چاہیے میرا زانو مونس، اور آئینہ تیرا آشنا ربط یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار سبزہ میگاہ، صبا آوارہ، گلِ نا آشنا کوہ کن، نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد سنگ سے سمرار کر جووے نہ پیدا آشنا

پھر میں چھوڑ کر غیر پر توجہ شروع ہو گئی، ذرا غمزدہ اس سے بھی وہی سلوک ہوگا، جو ہم سے ہو چکا ہے۔ لہذا موجودہ صورت حال پر رشک کی کوئی وجہ نہیں۔

۲۔ لغات : نیرنگ : گردشِ آیام۔ انقلاب۔ سحر و ظلم۔ بوتلوئی۔ چشمک : آنکھ کا اشارہ۔

شرح : یہ نیرنگ زار یعنی یہ دنیا ہر وقت گردش و انقلاب میں ہے اور اس کا ہر ذرہ اسی طرح گردش و انقلاب کا پابند ہے، جن طرح شراب خانے میں ساغر گھوما کرتا ہے۔ اس کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ مجنوں کا صحرا میں مارے مارے پھرنا اس کی محبوبہ بیٹی کے اشارہ چشم کا نتیجہ ہے، یعنی میں جس طرف مجنوں کی باگ موڑ دیتی ہے وہ اسی طرف ٹھرتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت اس عالم کی ہے اور اس کی گردش بھی ایک محبوب کے اشارہ چشم کا کرشمہ ہے، جسے ہم محبوب حقیقی کہتے ہیں۔

۳۔ لغات : سامانِ طراز : سامانِ آراستہ کرنے والا۔

دستگاہ : قدرت . قوت .

شرح : عاجزوں کے لیے غم کا سامان ہم پہنچانے کا ذمہ دار ان کا دلہلہ شوق اور جذبہ عشق ہے ۔ اسی کی بدولت وہ درجہ کمال پر پہنچ جاتے ہیں یہاں تک کہ ذرے میں صحرا کی سی وسعت و قدت پیدا ہو جاتی اور قطرہ دریا کے جوش و خروش کا رنگ اختیار کر لیتا ہے ۔

یہ شعر ایک ایسی حقیقت کا آئینہ دار ہے ، جس سے کسی کو اختلاف ہو ہی نہیں سکتا ۔ اس دنیا کی زندگی میں کوئی شے بجائے خود نہ اعلیٰ ہے نہ ادنیٰ ، نہ معزز ہے ، نہ حقیر ، صرف جذبہ عشق کی بنا پر جو عمل و حرکت کا سرچشمہ اور سرمایہ ہے ، ہر شے کی قدر و قیمت اور ہر وجود کا درجہ رفعت و پستی متعین ہوتا ہے ۔ جھوٹی سے جھوٹی ، حقیر سے حقیر اور بے حقیقت سے بے حقیقت شے کو بھی جذبہ عشق و عمل راستی بلند ہی عطا کر سکتا ہے کہ اس سے زیادہ بلندی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ۔ یعنی ذرہ صحرا بن جاتا ہے ، جو اس کے لیے منتہائے کمال ہے اور قطرہ دریا کی صورت اختیار کر سکتا ہے ، جو اس کے لیے ترقی کی معراج ہے ۔ گویا نظر وجود کی ظاہری حیثیت پر نہیں ، بلکہ اس کے جذبہ عشق و عمل پر مبنی چاہیے ۔ اسی طرح انسان جذبہ عشق و عمل کی بنا پر ترقی کرتے کرتے انشرفیت کا وہ مقام حاصل کر سکتا ہے ، جو باری تعالیٰ نے پہلے سے اس کے لیے مقدر کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے آدم کو پوری مخلوقات پر کرامت و فضیلت بخشی گئی ۔

۴ - شرح : - المینان و دلجمی کا دور ختم ہو گیا ۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ میں ہوں اور میرا دل ، جو وحشت میں ڈوبا ہوا ہے اور آفت و مصیبت کا پرکارہ بن کر میرے لیے وبال جاں ہو گیا ہے ۔ اس کا حال کیا بیان کروں ؟ عافیت اور راحت و آسائش سے اسے دشمنی ہے ، آوارگی اور بے مقصد گردش سے اُسے خاص دل بنگی ہے ۔

ظاہر ہے کہ جس دل میں وحشت بھری ہو ، وہ آرام و المینان سے بٹھینا کبھی پسند نہ

نہ کرے گا اور آوارگی ہرگز نہ چھوڑے گا۔

۵۔ لغات - شکوہ سنخ : بگڑ کرنے والا۔

مونس : اُنس رکھنے والا۔ دوست۔ بہدم۔

تشریح : ہمیں رشک اور بدگانی کے باعث ایک دوسرے کے گلے میں

مشغول نہ رہنا چاہیے۔ اگر میں نے نانا کو بہدم بنا لیا ہے، یعنی ہر وقت گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہتا ہوں تو تو نے بھی آئینے کو اپنا دوست بنا لیا ہے۔ ہر وقت سامنے دکھ کر تو اسی کو دیکھتا رہتا ہے۔

بدگانی کی کیفیت یہ ہے کہ محبوب نے عاشق کو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا دیکھا تو خیال ہوا کہ یہ کسی اور پر عاشق ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس کی نظریں ہر لحظہ تجھ پر جمی رہتی چاہئیں۔ عاشق کو یہ بدگانی پیدا ہوئی کہ محبوب ہر وقت آئینہ دیکھتا رہتا ہے۔ عذرا یہ کسی دوسرے پر مرثا ہے۔ اور اس نے کسی اور سے دشمنی محبت جوڑ رکھا ہے۔

۶۔ لغات - شیرازہ : سلسلہ۔ بندش، خصوصاً وہ بندش جس سے کتب

کے اجزاء باہم چوست کیے جاتے ہیں۔

سبزہ بیگانہ : خود رو سبزہ۔ اسے بیگانہ اس لیے کہتے ہیں کہ بے موقع و

بے محل آگتا ہے اور اسے کاٹ کر باہر پھینک دیتے ہیں۔

تشریح :- ہمارے تمام اجزاء وحشت کی ایک بندش میں بندھے ہوئے ہیں

یعنی ان سب میں صرف ایک شے مشترک ہے اور وہ وحشت ہے۔ مثلاً ہمارے اجزاء

میں سے ایک سبزہ ہے، جسے بیگانہ کہا جاتا ہے اور بیگانہ وہ ہوتا ہے، جو کسی کا آشنا

نہ ہو، یہ وحشت کی علامت ہے۔ دوسرا جزو صبا یعنی صبح کو چلنے والی نرم نرم ہوا ہے

جس سے پھول کھلتے ہیں۔ اسے دیکھیے کہ ادھر ادھر پھرتی ہے اور اس کا کوئی طور

طریقہ اور تاعدہ نہیں۔ تیسرا جزو پھول ہے، وہ بھی کسی سے آشنائی پیدا نہیں کرتا۔

ابھی نکلا اور تھوڑے ہی وقت میں اندر و پڑ مردہ ہو کر رخصت ہو گیا۔ غرض ان تمام

جزوہوں سے صاف وحشت ٹپکتی ہی ہے اور وحشت ہی ان کے درمیان ایک مشترک

پیرچہ

۷۔ لغات - کوکبن : پہاڑ کاٹنے والا۔ مزار۔

نقاش : نقش بنانے والا۔ مصور۔

تمثال : تصویر۔ مجسمہ۔

شرح :- اے استاد! مزار و سچا عاشق نہ تھا اس کی خواہش صرف یہ تھی کہ سنگتراش کی حیثیت میں شیریں کی تصویر تیار کر دے۔ درد کیا یہ ممکن تھا کہ پتھر سے سر پھوڑ کر محبوب پیدا نہ کر لیا جائے ؟ مزار نے سر مزدور پھوڑا اور مر گیا، تاہم شیریں اُسے نہ ملی۔

جو معنی بیان کیے گئے ہیں، وہ اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں کہ دوسرا مصرع استقبالی قرار دیا جائے، لیکن اگر اسے حسرت و افسوس کے انداز میں پڑھا جائے تو یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ مزار و شیریں کا مجسمہ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے پتھر سے پھوڑ لیا اور مجسمہ نہ بنا سکا۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ پتھر سے سر پھوڑ کر محبوب پیدا نہیں ہو سکتا۔

○

۱۔ شرح :- اس پری

جیسے محبوب کا ذکر تھا، پھر میری
جادو بیانی اور تاداد الکلامی نے
ایسا ساں بنا دیا کہ جس شخص کو
میں نے اپنا راز داں اور حکسار
بنایا تھا، وہی میرا رقیب اور
دشمن بن گیا، یعنی میرے بیان
سے اتنا متاثر ہوا کہ دیکھے بغیر
میں پر عاشق ہو گیا۔

ذکر اُس پری و ش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا
مئے وہ کیوں نہایت چمتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

خواجہ حالی اس شعر کی شرح

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

میں فرماتے ہیں :

بارے آشنا لکلاؤں کا پاسباں اپنا

”میں نے جو معشوق کے

دروہ دل لکھوں کب تک ؟ جاؤں ان کو لکھلاؤں

میرا محرم داز اور ہم نشین تھا،

انگلیاں نگار اپنی، خامہ خوشچکاں اپنا

وہی سن کر میرا رقیب بن گیا

گھٹتے گھٹتے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا

کیونکہ اول تو ایسے پریوش

تنگ سجدہ سے میرے سنگ آستان اپنا

کی تعریف نفی اور وہ بھی مجھ

تا کرے نہ غمنازی، کر لیا ہے دشمن کو

جیسے جادو بیان کی زبان سے

دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

پہلے مصرع کا دوسرا رکھ یعنی

ہم کہاں کے دانائے، کس ہنر میں یکتا تھے

اور پھر بیاں اپنا ”سارے شعر

بے سبب ہو ا غالب دشمن آسماں اپنا

کی جان ہے، جس کی غول بغیر

میں اتنی خراب پی لی، جس کی حدود نہایت نہیں۔

ذوقِ سلیم کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

یہی کہ وہ خمیرہ کی محفل میں امتحان لینا چاہتے تھے،

۲۔ شرح ۱۔ اس شعر

طاری ہو سکتی ہے۔ یعنی کھنے ساغر چڑھا کر وہ مدہوش ہوتے ہیں۔

کے دو مہنوم بالکل واضح ہیں :

میں ایسی صورت حال کا پیدا ہونا عاشق کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

۱۔ محبوب نے خیر کی محفل

۲۔ محبوب جب تک خمیرہ کی محفل میں تھا اسے زیادہ شراب پینے کا خیال ہی

نہ آیا، لیکن میرے گھر آتے ہی اندھا دھند پی گیا۔

اس سے مقصود یہ تھا کہ دیکھے اور

چاہئے، آیا اس کی بدستی اور مدہوشی کے عالم میں میری طرف سے کوئی نازیبا حرکت

تو نہیں ہوتی، یعنی مجھے آزمائے کے لیے اس نے زیادہ شراب پی لی۔

۳۔ لغات - منظر : حمبرد کا ایسی اونچی جگہ جہاں سے نیچے کی تمام

چیزیں دیکھی جاسکیں ۔

شرح :- اگر ہمارا مکان عرش سے نیچے ہوتا تو ہم بلند ی پر جا کر ایک اور حمبرد کا یا شرفین بنا لیتے ، جہاں سے اپنے مکان اور اپنی حقیقت و حیثیت کا اندازہ کر سکتے ۔ کاش ایسا ہوتا ، لیکن نہ ہوا ، کیونکہ عرش ہی ہمارا مکان ہے ۔

بظاہر شعر کا مفہوم یہ ہے ۔ بلند ی پر منظر بنانے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہم صرف اپنے مقام اور مرتبے کا صحیح اندازہ کر لیتے اور حقیقت سے آگاہ ہو جاتے ۔ اب ہمیں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ عرش ہمارا مقام ہے ، یعنی ہم وجود مطلق ہی کا ایک جزو یا پر تو ہیں ۔ اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ایسے مقام کا انتظام ضروری تھا ، جہاں سے سب کچھ ٹھیک ٹھیک نظر آسکتا ، مگر یہ نہ ہوا اور بھڑ اتنا جاننے کے کہ ہمارا مقام عرش ہے اور کوئی حقیقت ہم پر آشکارا نہ ہو سکی ۔

۴۔ شرح :- خواجہ جانی فرماتے ہیں :

” غروب ہی ہوا کہ محبوب کے در کا پاس بان ہمارا جان پہچان نکلا ۔
اب ہمارے لیے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے
ہم کو ذلت دے ، ہم اس کو سہنی میں ٹال دیتے رہیں گے اور یہ ظاہر
کریں گے کہ ہمارا قدیم آشنایہ ہے اور ہمارا اس کا قدیم سے یہی
برتاؤ ہے ۔“

عاشق نے یہ تو پہلے ہی سے طے کر دیا ہے کہ محبوب کے دروازے کا چوکیدار
ہمیں ضرور بڑا بھلا کہے گا اور ہماری ذلت و رسوائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا
لیکن اس رسوائی کو انگیز کر لینے کا ایک بہانہ نکل آیا ، یعنی چوکیدار پہلے کا جان پہچان
نکلا ۔ عاشق مطمئن ہو گیا کہ اب ہماری جتنی بھی ذلت ہوگی اسے یہ کہہ کر سہنی میں
ٹال دیتے ہائیں گے کہ یہ پہلے سے ہمارا بے تکلف دوست ہے اور اس کے ساتھ وصول

دھبے اور پانڈھی کا سلسلہ پہلے سے چلا رہا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، جس پر پریشانی اور تذہیل کا احتمال ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے اشعار دوادہین میں ڈھونڈنے سے نظر نہیں آتے۔

۵۔ لغات - فگار : زخمی -

شرح :- دل کا درد دیکھتے دیکھتے انگلیاں زخمی ہو گئیں، قلم سے غون گونے لگا۔ میں کب تک اسی طرح لکھ لکھ کر بھیجتا جاؤں؟ دل میں سوچتے ہیں، یہ کیوں نہ کہوں کہ خود ان کے پاس پہنچ جاؤں اور دکھا دوں، میری زخمی انگلیاں اور خوشچمکاں قلم دیکھ کر میری حالت کا اندازہ فرمایا بھیجے۔ اسی سے آپ پر میرے درد و دل کی کیفیت آشکارا ہو جائے گی۔

۶۔ شرح :- عاشق نے محبوب کی دہلیز پر سجدہ کر دیا۔ اس سے محبوب کو اس قدر عار محسوس ہوئی کہ دہلیز کا پتھر نکال کر اس کی جگہ دوسرا لگایا۔ عاشق مجروح و نیاز سے کہتا ہے کہ آپ نے بے سبب پتھر بدلنے کی زحمت اٹھائی میں بدستور سجدے کرتا جاتا، یہاں تک کہ پہلا پتھر گھس گھس کر ناپسید ہو جاتا۔ اس وقت آپ نیا پتھر لگائیے۔

۷۔ لغات - غمازی : چٹلی کھانا -

شرح :- ہم نے رقیب کے پاس محبوب کی شکایت ایسے انداز میں کی کہ وہ ہمارا ہنوا بن گیا۔ اس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن اتنا تو بڑا کہ اس کے لیے چٹلی کھانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا، کیونکہ چٹلی اسی صورت میں کھا سکتا تھا کہ خود اسے محبوب سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔

یہ مرزا کے کلمات ہیں، یہاں رقیب کو باتوں سے ہنوا بنایا۔ ایک اور مقام پر مرزا یا کہ مجھے محبوب کو فریب دینا بھی خوب آتا ہے۔

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام

مجھوں کو بڑا کہتی ہے میں مرے آگے

۸۔ مشعر : - خواجہ جاتی فرماتے ہیں :

”آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بنائے ہیں اور اپنی دانائی و

ہنرمندی کس خوب صورتی سے ثابت کی ہے۔“

شاعر نے پہلے یہ حقیقت مسلم مان لی ہے کہ آسمان انھیں لوگوں کا دشمن ہوتا ہے، جو دانا اور دانشمند ہوں، نیز کسی نہ کسی ہنرمیں انھیں کیتائی کا درجہ حاصل ہو۔ پھر حسرت زدہ ہو کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے حسرت و افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ ہم تو دانشمند نہ تھے اور کسی ہنرمیں کیتائی بھی ہمیں حاصل نہ تھی، پھر اسے غائب آسمان نے ہم سے کیوں بے وجہ دشمنی کی؟

بعض اصحاب نے فرمایا ہے کہ اس شعر کا مضمون عرفی کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ ہے ۔

از من بگیر عبرت و کسب ہنرمیں

با بخت خرد عداوت بہت آسمان خواہ

مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کر اور ہنرمیں پیدا کرنے کا خیال چھوڑ دے۔ تجھے کیوں پسند ہے کہ اپنے ساتھ سات آسمان کی دشمنی مول لے لے۔

ظاہر ہے کہ عرفی کے شعر میں وہ حقیقت بیان کی گئی ہے، جسے غائب نے مسلم مان کر مقدمہ چھوڑ دیا اور اس مضمون کو پرتا شیر شعریت کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے کہا کہ ہم نہ عالم تھے، نہ عقل و دانش کے پیکر تھے، نہ کسی فن میں ہمیں کمال حاصل تھا پھر آسمان نے ہم سے کیوں دشمنی کی؟ عرفی کا شعر صرف فلسفہ و حکمت رہ گیا، غائب نے اسے پرتا شیر شعریت کا لباس پہنا دیا۔

بخود کی تشریح کے مطابق غائب کے شعر کے دو پہلو ہیں :

۱۔ یہ قول مشہور ہے کہ آسمان اہل دانش و عینش اور اہل باب ہنر کا دشمن ہوتا ہے۔ ہماری حالت دیکھیے کہ ہم میں کوئی خاص چیز موجود نہیں، پھر بھی زمانے کے ہاتھوں پامال ہو رہے ہیں۔ دنیا میں اس کی سیکنڈوں مثالیں مل جائیں گی۔

۲۔ زیادہ لطیف پہلو ہے کہ شاعر نے درجہ کمال حاصل کر لینے کے باوجود مجاز و انکسار سے ان جوہروں کی نفی کر دی، جو آسمان کی دشمنی کا باعث مانے جاتے ہیں اور یہ بھی اس کے کمال کی دلیل ہے۔

نیز اس امر کی دلیل ہے کہ درجہ کمال حاصل کر لینے کے باوجود اس پر مطمئن نہیں۔ ارتقاء کی تشنگی موجود ہے۔ جو کچھ حاصل کر چکا ہے، اسے خستہ کمال نہیں سمجھتا، بلکہ مزید رفعت کا طلب گار ہے۔



۱۔ لغات۔ سرمہ صفت نظر:

وہ سرمہ جو صفت دے دیا جائے اور کوئی قیمت وصول نہ کی جائے۔
شرح :- میں وہ سرمہ ہوں جو صفت سب میں ثبتا ہوں اور اس کی قیمت کوئی نہیں۔ میری قیمت صرف اتنی ہے کہ جو بھی

سرمہ صفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے کہ بے چشم خریدار پر احساں میرا رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم تیرے چہرے سے ہو ظاہرِ غم نہاں میرا یہ سرمہ استعمال کرے، اس کی آنکھ پر میرا احسان رہ جائے۔

مطلب :- ہے کہ در و جوہر کی شکل میں میرے کلام کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ کمالِ الجواہر صفت لوگوں میں بانٹ رہا ہوں اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اس فیض عام سے سب فائدہ اٹھائیں۔

۲۔ **شرح :-** اسے ظالم محبوب! مجھے رونے دھونے اور آہ و فغاں کرنے کی اجازت دے دے۔ اندیشہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو غم میرے دل میں چھپا ہوا ہے، اگر رو دھو کر اسے بکا کر لینے کی رخصت نہ ملی تو مجھ پر ایسی حالت طاری ہو جائے گی، جسے دیکھ کر لوگوں میں چرمیگوئیاں ہونے لگیں گی اور سب کہیں گے کہ یہ شخص فلاں پر فزافیت ہے، اسی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ اس طرح تیری

بدنامی و رسوائی ہوگی اور میرا غم چنناں تیرے چہرے سے ظاہر ہونے لگے گا۔



۱۔ لغات : طمرۃ :

زلف، کاکل، چوٹی، طمرۃ کلاہ،

پسند نا اور کلنی، طمرۃ دستار،

کلنی۔

شرح :۔ غفلت کا نام

انسان اپنی کاروائی اور کارکردگی

پر غفلت و ناز کے وہم میں مبتلا ہو

گیا ہے، اس لیے خود آرائی یعنی

اپنے آپ کو ہاکمال سمجھتے ہوئے

پھولا بیٹھا ہے، حالانکہ اس کائنات

کی کوئی شے ایسی نہیں جس کے

یہ قدرت نے ضروری سامان

بہم نہ پہنچا دے ہوں۔ آپ گھاس

جیسی حقیر چیز پر نظر ڈالیں۔ اس

کی زلفوں میں کنگھی کر کے آراستہ

کر دینے کے لیے نرم رو ہوا موجد ہے۔

گھاس کی مثال اس لیے لائی گئی کہ یہ عام ہے اور ہر فرد اسے دیکھتا اور دیکھ

سکتا ہے۔ اس کی آرائش کے لیے ہوا ہی شانے کا کام دیتی ہے۔ یہ مثال اس لیے

بھی لائے کہ خود انسان گھاس کے تنکے کی طرح بے حقیقت ہے اور اس کی جڑ حقیقت

ظاہر کرنے کے لیے اس سے بہتر مثال کوئی نہ تھی۔

بیشک انسان کے لیے یہی دریا ہے کہ ہر وقت جدوجہد میں رہا رہے۔

غافل، بدہم ناز خود آرا ہے، ورنہ یاں

بے شانہ صبا نہیں طمرہ گیہا کا

بزمِ قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ

صیدِ دامِ حبتہ ہے اس دام گاہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بے سید ہے

شرمندگی سے عُذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہے

پُرگل، خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد

پردانہ ہے وکیل، ترے داد خواہ کا

صبر و استقامت سے کام کرے۔ لیکن اس کے لیے یہ دنیا نہیں کہ سب کچھ اپنی صلاحیت اور کارکردگی کا نتیجہ قرار دے دے۔ اس کا فرمائے حقیقی کو بھونڈ چاہیے۔ جو دنیا کے تمام کاموں کا کفیل، سب کی پناہ گاہ اور سب کے لیے فریج کامیابی ہے۔

۲۔ لغات : بزمِ قدح : شراب نوشی کی محفل۔
رنگ : خوشی، خوشحالی۔

صیدِ زوامِ جست : وہ شکار جو جال میں پھنس کر نکل گیا ہو۔
دامِ گاہ : وہ مقام، جہاں شکار کے لیے جال بچھا ہوا ہو۔ یہاں اشارہ ہے : ”بزمِ قدح“ کی طرف۔

شرح :۔ شراب نوشی کی محفل عام تصور کے مطابق عیش و عشرت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، لیکن شاعر کہتا ہے کہ اس محفل سے بھی حش کی تہذیب رکھنی چاہیے، کیونکہ اس کی خوشی، شادمانی اور خوشحالی ایک ایسا شکار ہے، جو اس شکار گاہ کے جال میں پھنس کر نکل چکا ہے۔

جو شکار جال میں پھنس کر نکل جائے، وہ پھر آسانی سے نہیں پھنس سکتا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں شراب نوشی کی محفل عیش و عشرت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ عیش بھی حدودِ رجمِ عارضی اور کجیئت ہے۔ شعر میں ”رنگ“ کا لفظ لانے سے ایک مقصود تو یہ ہے کہ عیش اور بزمِ شراب سے اسے خاص مناسبت ہے، دوسرے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ شراب پی کر چہرے پر جو رونق و رنگینی سی منو، ا رہوتی ہے، وہ بھی عارضی ہی ہوتی ہے۔

۳۔ شرح :۔ میں نے اتنے گناہ کیے ہیں کہ شرم و ندامت کے باعث ان کے لیے عذر پیش کرنے کی بھی تہمت نہیں رکھتا اگر خدا کی رحمت گناہ کے لیے عذر پیش کرنے کے بجائے اسی شرم و ندامت کو قبول فرمائے تو کچھ عجیب بات نہ ہوگی۔

شاعر کے حسن بیان کا کمال یہ ہے کہ گناہ کے عذر کی حقیقت پیش کر دے۔
جسے تک انسان کو اپنے کسی فعل پر ندامت نہ ہو وہ اسے ناجائز نہیں سمجھتا اور اس کے لیے عذر
پہنیں کرتے ہی آواز نہیں ہوگا شرم و ندامت کہ بچائے خود عذر گناہ ہے، کیونکہ نفعاً عمل اپنے
افعال کو محدود و محدود بناتا ہے۔ گویا محض شرم و ندامت عذر گناہ کی
بہترین صورت ہے۔ پھر خدا کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ اسے قبول کرے۔
۴۔ لغات - مقتل : قتل گاہ - شہادت گاہ۔

شرح : مجھے محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے کی بشارت مل چکی ہے۔
دیکھیے، میں کس خوشی اور شادمانی سے قتل گاہ کی طرف جا رہا ہوں۔ معلوم ہوتا
ہے کہ زخموں کا خیال آتے ہی میری نگاہ کا دامن پھولوں سے بھر گیا ہے خوشی
کی یہ آخری حد ہے۔ اس کے سبب دو ہیں، اول یہ کہ محبوب کے ہاتھ سے قتل
ہو گا، دوم یہ کہ عشق و محبت میں جن کہیں ختم نہ ہونے والی مصیبتوں سے سابقہ
پڑا رہا، وہ ختم ہو جائیں گی اور ان کا جہنماں کٹ جائے گا۔ زخموں کو پھولوں
سے رنگینی کی بنا پر تشبیہ دی گئی ہے۔

۵۔ لغات - ہوا : شوق - لگن۔

شرح :- اے محبوب! اسد کو تیری ایک نگاہ گرم کی آرزو ہے اور
اسی آرزو میں اس کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ تیرے نگاہ گرم ڈالتے ہی وہ جل مرے گا
اور تیرے اس فریادی یعنی اسد نے پروانے کو اپنا وکیل بنایا ہے۔ وجہ یہ کہ
وہ بھی شمع کی لپیٹ میں جسے شمع کی نگاہ گرم کہنا چاہیے، جل مرتا ہے۔ لہذا جو
شخص محبوب کی نگاہ گرم کا مشتاق ہو، اس کے لیے پروانے سے بہتر وکیل نہیں
مل سکتا۔



۱۔ شرح :- محبوب
نے ظلم و ستم سے اٹھ اٹھا
یا اور عاشق کے ساتھ سختی
بجود سے باز آئے پروا باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو مُسنہ دکھلا میں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرا میں کس

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں، لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے، پر دیکھیے دکھلائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

کوئی بتلاؤ کہ ہم مبتلا میں کس

سے پیش آنا چھوڑ دیا، لیکن
کیا ہفتہ اٹھایا، حقیقتِ ظلم کب
چھوڑا؟ اور جو رے دست بردار
کب اختیار کی؟ اب محبوب
کہ رہا ہے مجھے ظلم و ستم پرانی
پیشانی جوئی اور اتنی شرم آئی
کہ اب تجھے منہ نہیں دکھا سکتا
یہ پیشانی اور یہ شرم سب سے
بڑا ظلم بن گئی، کیونکہ عاشق
کے لیے محبوب کا منہ نہ دکھانا
سراسر ناقابلِ برداشت ہے۔
ایسے نکتے غالب ہی پیدا
کر سکتا ہے کہ ظلم سے محبوب
کی دست کشی کو بھی بے اصل
قرار دینے کی ایک معقول وجہ
نکال لی۔

۲۔ شرح :- ساتوں

آسمان رات دن گردش کر

رہے ہیں۔ اسی گردش سے دنیا کے تمام کام پورے ہو رہے ہیں۔ گردش سے
واسخ ہوتا ہے کہ کسی حالت کو ثبات و قرار نہیں۔ دمدم سب کچھ ہوتا چلا جا
رہا ہے۔ اگر آج ہم حرم و الم اور مصیبت میں مبتلا ہیں تو گھبرانے کی کون سی وجہ
ہے۔ آسمانوں کی گردش جاری ہے۔ جس طرح پہلی حالت باقی نہیں رہی، یہ بھی
باقی نہ رہے گی۔ کچھ نہ کچھ تو ہو ہی رہے گا۔ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ ہوگا، اچھا

ہی ہوگا، پھر پریشان کیوں ہوں؟

۳۔ لغات۔ لاگ : دشمنی۔ عداوت۔

لگاؤ : محبت۔ دل کا ربط و تعلق۔

تشریح :- خواجہ حالی اس شعر کی تشریح میں فرماتے ہیں :

”یہ مضمون عجیب نہیں، کسی اور نے بھی باندھا ہو، مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی و لطافت سے ہرگز نہ باندھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے، نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لیے کہ اس میں ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے، ہم اسی کو دوستی سمجھتے، لیکن جب نہ دوستی ہو، نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں؟

”قطع نظر خیال کی حمد کی اور ندرت کے ”لاگ“ اور ”لگاؤ“ ایسے لفظ ہم پہنچائے ہیں، جن کا تاخذ متقد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے، جس نے خیال کی خوبی کو چار چند کر دیا ہے۔“

خواجہ حالی کی تشریح میں اٹانہ بالکل غیر مندرجہ معلوم ہوتا ہے، اتنا ہم یہاں اتنا بتا دینا چاہیے کہ غائب نے یہی مضمون ایک اور شعر میں بھی پیش کیا ہے جسے پڑھ کر معنی زیادہ بہتر طریق پر ذہن نشین ہو جائیں گے، یعنی :

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی یہی

دوسرے لفظوں میں مرتد اس کے قول کے مطابق تعلق کی، دو صورتیں ہیں

اول دوستی، جسے خوشگوار تعلق سمجھنا چاہیے، دوم دشمنی، یعنی ناخوشگوار تعلق۔

تعلق دونوں ہیں۔ اسی نکتے پر مرزا کا زور ہے۔ وہ محبوب سے رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے اگرچہ محبوب دشمنی ہی کرے۔ عاشق اپنے دل کو فریب دے سکتا ہے کہ محبوب دشمنی نہیں، دوستی کر رہا ہے۔ سمجھ سکتا ہے کہ محبوب نے اس

کے ساتھ امتیازی برتاؤ اختیار کیا، لیکن جب دشمنی اور دوستی دونوں ناپید ہوئی تو دھوکا کھانے اور فریب میں مبتلا ہونے کی کون سی وجہ رہ جاتی ہے ؟

۴۔ **شرح :-** محبوب کو خط لکھا اور حالت اضطراب میں قاصد کے ساتھ محبوب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ منزل طے کر چکنے کے بعد خیال آیا کہ یہ ہم سے کسی حرکت سرزد ہوئی ؟ بیشک یہ گمان تھا کہ قاصد خط کہیں راستے ہی میں منقطع نہ کر دے یا یہ آرزو تھی کہ جواب کے انتظار میں نہیں بیٹھیں گے، وہیں جواب لے لیں گے، لیکن راستے میں سوچ رہے ہیں کہ کیا اپنا خط ہم خود پہنچائیں، جو سراسر باعث جنگ اور شقاق دستور ہے ؟

دوسرے مصرع سے ایک معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ اگر ہم قاصد کے ساتھ ساتھ محبوب کے دوست کسے پر پہنچ گئے تو وہ تو ہماری صورت سے بھی بیزار ہے، پھر خط اسے پہنچانے کی کون سی صورت رہ جائے گی ؟ یہاں کیا - یہ معنی - کیونکر - بھی جانے لگا اور - یاد - استغراب کے لیے ہے ۔

۵۔ **شرح :-** جب محبوب کے دروازے پر میٹھ گئے تو دواں سے اٹھنا عاشق کے لیے باعث تنگ ہے۔ کہتے ہی عادتہ پیش آجائیں، کتنی ہی مصیبتیں نازل ہونے لگیں، یہاں تک کہ خون کی ندی بہ نکلے اور وہ ہمارے سر سے بھی گزرتا ہے ہم اس آستانے کو نہ چھوڑیں گے ۔

۶۔ **شرح :-** خواہجہ عالی فرماتے ہیں :
- دکھلائیں کامرج نذا کو عطر ایا ہے۔ کتا ہے کہ عمر بھرموت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے سرزد بہتر ہوگی۔ اب دیکھیے مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں، جس کا تمام عمر منتظر دکھتا ہے :

مراد یہ ہے زندگی بھر اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آتی رہیں کہ اکتا کر موت کا راستہ دیکھنے لگے۔ کیونکہ زندگی میں تو ان تکلیفوں اور مصیبتوں سے خجالت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر سوچتے ہیں کہ دیکھیے، مرنے کے بعد ہمارے سامنے کیا

صورت آتی ہے۔ آیا مصیبتوں کی کوئی تلافی ہوگی یا نہ ہوگی۔ ذکر اٹھانے کا کوئی صلہ ملے گا یا نہیں؟

۷۔ شرح :- وہ یعنی محبوب پوچھتا ہے کہ غالب کون ہے؟ اب کوئی نہیں بتانے کہ ہم کیا بتائیں اور اس سوال کا جواب کیا دیں؟ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ غالب کا یہ شعر نصرت خان عالی کے مندرجہ ذیل شعر سے اخذ ہے:

زمر دم یار می پرسد کہ عالی کیفیت طالع ہیں!

کہ حرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

محبوب لوگوں سے پوچھتا ہے کہ عالی کون ہے؟ قسمت دیکھیے کہ ساری عمرت میں گزر گئی اور معاملہ یہاں تک آپہنچا۔ یعنی اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ عالی کون ہے؟ مرزا غالب کا شعر بظاہر اس سے ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتہً اس سے بالکل جہاگذاذ حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں:

۱۔ پہلے مصرع سے ظاہر ہے کہ محبوب کے سامنے غالب کا ذکر آیا اور اس نے انتہائی تجاہل کا ثبوت دیتے ہوئے پوچھا، غالب کون ہے؟

۲۔ یہ معاملہ بھری محفل میں پیش آیا، جس میں خود غالب بھی موجود تھا۔

۳۔ یہ سوال سنتے ہی بخود کے قول کے مطابق غالب پر پہلی سی گری اور گھبرا کر اس مجمع سے خطاب کیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ میں کیا جواب دوں، شعر کا شعر بیان واقعہ نہیں واقعہ ہے۔

۴۔ جان بوجہ کہ امتحان بنا اور یہ سوال کیا، گویا اسے محبوب کی طرف سے ایک چھیڑ بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

۵۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال سنتے ہی غالب بے تکلف یہ جواب دینے پر آمادہ ہو گئے کہ میں وہی ہوں، جو آپ پر جان دے رہا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے اس طرح محبوب خفا ہو جائے۔

۶۔ چنانچہ محبوب کی ہزم میں بیٹھنے والوں سے پوچھا کہ تمہیں محبوب کی عادات

کا علم ہے۔ بنا تو وہ مجھے اس سوال کا جواب کیا دینا چاہیے، جو خلافِ مصلحت اور ممانعتی قرار دیا جاوے۔

عالمی کے شعر میں اس قسم کی حالت تو پیدا کر لی گئی، لیکن سارا معاملہ اس یا اس پر عزم کروایا گیا کہ محبت کا نتیجہ نکلا۔ غالب کے شعر کا معنوں حد درجہ پہلو وار ہے اور اسلوب بیان پر غور و تدبیر ہی ختم ہے۔



- ۱۔ لغات۔ لطافت :
لطیف ہونا، مدحیت۔ یہ لفظ ان چیزوں کے لیے بھی مستعمل ہے، جو نظر نہ آئیں، جیسے روح۔
کثافت : گاڑھاں، جھپاں، ماتیت، وہ شے جو نظر آئے، جیسے جسم۔
زنگار : وہ مسالا، جو شیشے کی پشت پر لگا دیتے ہیں اور وہ آئینہ بن جاتا ہے، جس میں عکس نظر آنے لگتا ہے۔ وہ سبزی مائل شے، جو نمی کے باعث فوادی چیزوں پر جم جاتی ہے۔
- شرح :- شاعر نے پہلے حکیمانہ اصول پیش کیا کہ کوئی لطیف شے جب تک کثافت اختیار نہ کرے، ایسا جلوہ پیدا نہیں کر سکتی، کہ سب کو نظر آئے جیسے روح کسی کو نظر نہیں آتی، لیکن جب وہ کسی جسم میں جاری و جاری ہوتی ہے تو جسم کی تمام حرکات و سکنات اس کی بدولت نظر آتی ہیں اور لوگ کہتے ہیں، 'نفلان شے زندہ ہے' اور اس میں روح موجود ہے۔ گو یا روح جسم کی کثافت سے وابستگی کیے بغیر جلوہ آرا، نہ ہو سکی۔ شاعر نے اپنے دعوے کے لیے یہ دلیل قرار دی کہ دیکھیں نفل ہمارا آتی ہے اور اس کا کوئی مادی وجود نہیں کہ نظر آ سکے، البتہ اس کی آمد سے بارغ میں شادابی و تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر طوط سبزہ آگ آتا ہے۔ پودے ہرے ہو جاتے ہیں۔

پھول نکل آتے ہیں۔ یہ سب کچھ فصل بہار کی آمد کا روشن ثبوت ہے۔ یوں ثابت ہو گیا کہ طمانت کثافت کے بغیر جلوہ نہیں دکھا سکتی اور اگر ہم فصل بہار کو آئینہ مزمن کریں تو اس میں عکس پیدا کرنے کے لیے پشت پر جو سالانگہ یا جاتا ہے، وہ چین ہے۔ اگر مزمن کریں کہ فصل بہار کے آئینے سے مقصود فولادی آئینہ ہے تو چین اس کا رنگار ہے یہاں دجہ شبہ سبزی ہے۔

۲۔ شرح :- خواہجہ عالی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں،

• ساحل لاگہ اپنے تین بچائے، مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو

ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں توسا قی ہو وہاں ہوشیاری کا دعوئے نہیں چل سکتا۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔

دریا جوش میں آتا ہے اور اس میں تلام پیدا ہوتا ہے تو کنارے اس کے لیے روک نہیں بن سکتے۔ وہ اپنے کچھ کو کتا ہی بچائیں، مگر پانی اچھل کر کناروں سے باہر آ جائے گا اور دور دور تک پھیل جائے گا۔ یہ بدیہی منظر ہے، جس سے ہر شخص آگاہ ہے۔ اسی کو سامنے رکھ کر شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! جس فصل میں توسا قی بن جائے اور تیرے ہاتھوں زندوں کو شراب بٹھنے لگے تو سب پی پی کرست دیخو ہو جائیں گے اور کوئی بھی ہوش کا دعوئے نہ کر سکے گا۔

محبوب کی ساقی گری کو دور یا کے جوش و تلاطم سے اور اپنے جوش کو ساحل کی خود داری سے تشبیہ دی ہے۔ عام مشاہدہ یہی ہے کہ جب تک دریا میں جوش نہ ہو کنارے اس کے پانی کو ایک مقررہ بہاؤ پر چلاتے ہیں اور ادھر ادھر نہیں ہونے دیتے لیکن تلاطم کی حالت میں وہ بھی بے بس رہ جاتے ہیں۔



عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ تغزل ایکبد تھا لکھا بات کے بنتے ہی مجھ ہو جانا

دل ہوا کشکش چارہ زحمت میں تمام مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا دھڑلانا
 اب جھانکے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ! اس قدر دشمن ارباب و فنا ہو جانا!
 صنعت سے گرے مُبَدَل بدوم سر ہو جانا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
 دل سے مٹا تری انگشتِ خنائی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا
 ہے مجھ ابیرِ باری کا برس کر کھلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
 گر نہیں نکستِ گل کو ترے کوچے کی ہوس کیوں ہے گردہ جولانِ صبا ہو جانا
 بختے ہے جلوہ گلِ ادوقِ تماشا غائب چشم کو چاہئے ہر رنگ میں دا ہو جانا
 تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوا سے صیقل دیکھ برسات میں سبز آنے کا ہو جانا

۱۔ شرح :- خواہر سائی فرماتے ہیں :

”جب دردِ حد سے گزر جائے گا تو مرجائیں گے، یعنی فنا ہو جائیں گے
 گویا قطرہ دریا میں کھپ جائے گا اور یہی اس کا مقصود ہے۔ پس
 درد کا حد سے گزر جانا ہی اس کا دوا ہو جانا ہے۔“

قطرے کے لیے جو نصب العینِ انتہائی مسرت و شادمانی کا باعث ہے
 ہے کہ دریا میں گم ہو جائے۔ یعنی اپنی مختصر سی ہستی کو جو جزو کی حیثیت رکھتی
 ہے، شکل میں شامل کر دے۔ دردِ حد سے گزر جائے گا تو خیر اس کے سوا کیا ہو گا
 کہ موت آجائے گی۔ یہی حقیقی مقصود ہے۔ کیونکہ اس کے سوا جزو کل میں شامل نہیں
 ہو سکتا اور مراد کو نہیں پہنچ سکتا، لہذا ثابت ہوا کہ درد کا حد سے گزرنا ہی حقیقت
 میں اس کی دوا اور اس کا علاج ہے۔

۲۔ لغات - قفلِ اسجد : ایک قسم کا قفل، جو کبھی کے بغیر کھلتا اور

بند ہوتا ہے۔ اس قفل کے چلتے میں، جو کنڈے کے اندر رہتا ہے چند چھتے پڑے ہوتے ہیں، جن پر مختلف حروفِ کندہ کر دیے جاتے ہیں۔ قفل بنانے والا ہر خریدار کو بتا دیتا ہے کہ فلاں لفظ بننے سے یہ قفل کھلے گا، چنانچہ وہ شخص چھتے گھسا کر مطلوب لفظ بنا لیتا ہے اور قفل کھل جاتا ہے۔ پھر اسے دبا کر بند کر دیتے ہیں، جیسے آج کل قفلوں کی ایک قسم میں کھولنے کے لئے تو کبھی استعمال کی جاتی ہے، بند کرنے کے لئے کبھی کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی، اجنبی شخص چھتوں کو بکتا ہی گھسائے اصل لفظ بنا لینے میں شاید ہی کامیاب ہو سکے۔

بات کا بننا : بظاہر یہ الفاظ قفلِ اسجد کا مطلوب لفظ بنا لینے کی مناسبت سے لائے گئے ہیں۔ یہاں ان سے مراد ہے تدبیر کا کامیاب ہونا، یعنی محبوب سے رابطہ ضبط پیدا کرنے کا راستہ نکال لینا۔

شرح :- اسے محبوب، امیری قسمت ہی میں یہ لکھا تھا کہ بات بن جائے اور میری تدبیر کا کامیاب ہو جائے تو میں تجھ سے جدا ہو جاؤں۔ یہ بالکل ایسی ہی صورت ہوئی، جیسے ابجد کے قفل میں معین لفظ بن جائے تو وہ کھل جاتا ہے، گویا الگ ہو جاتا ہے۔

۳۔ شرح :- دل درد و غم میں مبتلا تھا۔ اسے دور کرنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں۔ ان سے فائدہ تو کچھ نہ ہوا، لیکن اس کشاکش میں دل ہی ختم ہو گیا۔ گویا ایک گرہ تھی، جسے کھولنے کی ہر کوشش میں وہ گھستی گئی کھل تو نہ سکی، البتہ بار بار کی کوششوں میں گھستے گھستے وہ بالکل مٹ گئی۔

۴۔ شرح :- مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

”مطلب ظاہر ہے اور تعریف اس کی اسکان سے باہر ہے۔ معشوق کی خفگی کی تصویر ہے اور خفگی بھی خاص طرح کی اور یہ مصنوع بھی خاص مصنف ہی کا ہے۔“

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں :

تعریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ ایسے ہی اشعار کی وجہ سے جن کی تعداد اس چھوٹے سے دیوان میں کثیر ہے اور اتنی تعداد دوسروں کے ضخیم دیوانوں میں بھی نہیں ملتی، حضرت غالب قابلِ درج ہیں اور خدائے سخن کبہ جانے کے مستحق۔

اسے محبوب، آپ کا لطف و کرم تو مدت ہوئی، ختم ہو چکا تھا اور ظلم و ستم کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ ہم اس پر بھی خوش تھے کہ تعلق تو بہر حال قائم ہے لیکن اب ہم حقا سے بھی محروم ہو گئے۔ اشد اشد! وفا کیشوں کا اس تندر و دشمن ہو جانا آپ کے لیے زیا ہے؟ ایک لفظ بھی ”نے“ اس پورے مقدمہ جتنے کو واضح کر دیا، جسے صرف سرسری طور پر یہاں پیش کیا گیا ہے۔ پھر دوسرے مصرع میں جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے، اس کی ندرت اور تاثیر فوق سے تعلق رکھتی ہے، لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

۵۔ لغات - مہذُل : تبدیل کیا گیا۔

دمِ سرود : ٹھنڈا سانس، آہِ سرود۔

شرح :- ہماری کمزوری اور ناتوانی اس حد پر پہنچ گئی کہ روٹھ گئی کوئی صدمت نہ رہی، اس کی جگہ ٹھنڈے سانس لینے اور سرود آہیں بھرنے لگے۔ یعنی رونے نے دمِ سرود کی شکل اختیار کر لی۔ یہ برسی واقعہ دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ واقعی پانی شکل بدل کر جزا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۶۔ لغات : انگشتِ حسائی : وہ انگلی جسے ہندی لگی ہوئی ہو۔

شرح :- اسے محبوب اتیری ہندی لگی انگلی کی یاد کا دل سے مٹ جانا اسی طرح ناممکن ہے، جس طرح ناخن سے گوشت کا جدا ہونا ناممکن ہے۔

۷۔ شرح :- محبوب کی جدائی کے غم میں روتے روتے مر جانا میرے نزدیک ایسا ہی پر لطف ہے، جیسے موسمِ بہار کا بادل برس کر کھل جائے۔

موسمِ بہار کا بادل برستا ہے تو درختوں، شاخوں، پودوں، فصلوں اور سبزے

پر سے خزاں کے تمام اثرات دُھل جاتے ہیں۔ افسردگی تاریکی سے بدل جاتی ہے، ابرہہ شاخوں میں شگولے نکل آتے ہیں۔ پتوں کی شادابی دلاویز بن جاتی ہے۔ ہر طرف سبزہ آگ آتا ہے۔ گویا ایک ایک شے شگفتگی و شادمانی کا پیکر بن جاتی ہے اور چمن کی سیر زیادہ پر لُطف ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت محبوب کی عبادت کے غم میں مرجانے سے عاشق کی ہوتی ہے۔

یہاں بھی پس منظر میں شاعر کا وہی تصور کار فرما ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی جزو کا مٹ کر نکل میں شامل ہو جانا اور ہر وجود کا اپنے مبداء سے جا ملنا۔ یہاں فنا ہو جانا حقیقت میں محبوب سے مل جانا ہے، اسی لیے اس واقعے کو اہرہباری کا برس کر کھل جانا قرار دیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر نے معاملہ صرف تشبیہ تک محدود رکھا ہو، یعنی غمِ فرقت میں دوتے دوتے مرجانا میرے نزدیک ایسا ہی ہے، جیسے اہرہبار برسے اور برس کر کھل جائے۔ یہ تشبیہ تام ہے، یعنی دونا اور فنا ہو جانا، جیسے بادل برس کر ختم ہو جاتا ہے۔ گویا عاشق کے نزدیک محبوب کے فراق میں دوتے دوتے مرجانا کوئی ایسا مرحلہ نہیں کہ اس کے لیے مشکل یا تشویش انگیز ہو۔

۸۔ لغات - نکبت : خوشبو۔

جولان : دوڑ، تیز رفتاری

شرح :- اگر پھول کی خوشبو کو تیرے کوچے میں پہنچنے اور تجھ سے فیض حاصل کرنے کی ہوس نہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ صبا کی دوڑ اور تیزی رفتار کے راستے کی گرد بنی ہوئی ہے؟ یعنی صبا میں کمالی خاکساری کے ساتھ شامل ہو کر ادھر ادھر پکڑ لگا رہی ہے۔ یقیناً اس کی آرزو یہی ہے کہ اے محبوب! تجھ تک پہنچے اور تیرے گیسوے منبر سے فیض حاصل کر کے اور معطر ہو جائے۔

۹۔ لغات - اعجاز : لفظی معنی، دوسرے کو عاجز کرتا، مجبور۔ کرشمہ۔

ہکڑا : آدو

صیقل : چلا، چمک، صفائی۔

شرح :- آئینے سے مراد فولادی آئینہ ہے۔ ہر وجود کو چلا پانے، روشن ہونے اور ہر دروغ و حبا غو کر دینے کا عشق ہے اور اس عشق کی کرشمہ کاری نے ہر شے کو اتنا مسخو کر رکھا ہے کہ وہ چاہتی ہے، کوئی داغ لگے اور اسے صاف کیا جائے۔ دیکھیے فولادی آئینہ برسات میں نمی کی وجہ سے سبز مچھاتا یعنی اسے رنگ لگ جاتا ہے۔ وہ بھی صرف اس لیے رنگ آلود ہوتا ہے کہ صیقل گر کے پاس پہنچے اور اسے صاف، روشن اور مچھلا کیا جائے۔

شاعر کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ چلا کی آلود ہر قلب میں انتہا پر پہنچی ہوئی ہے اور ہر دل سر مشق چلا بننے کے لیے مضطرب ہے۔

۱۰۔ شرح :- اسے غالب! پھولوں کا جلوہ دیکھنے سے دل میں چیزوں کے دیکھنے کا ذوق تربیت پاتا ہے اور جلوہ گل کا حقیقی مقصد ہی یہ ہے کہ انسان میں دیکھنے کا ذوق ترقی کرے۔ کوئی بھی منظر سامنے آئے، اس کا رنگ روپ کیسا ہی ہو، آنکھ کو چاہیے کہ ہر حال میں کھلی رہے اور اسے دیکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حب تک آنکھ میں دیکھنے کا ذوق اور دل میں ہر شے سے فائدہ اٹھانے کی تڑپ موجود ہوتی ہے، اس کائنات کے حقائق انسان پر نہیں کھل سکتے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو بصارت و بصیرت عطا کی ہے، اس سے گورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

○ پھر ٹوڑا وقت کہ ہو بال کشا، موجِ شراب
وے بطئے کو دل دوستِ شتا، موجِ شراب
بوجھِ مست و جبرِ سیدِ مستی اربابِ چمن
ساکِ چمک میں ہوتی ہے، ہوا، موجِ شراب

ان اشعار میں برسات کے مناظر
پیش نظر رکھتے گئے ہیں اور برسات
کو مرزا غالب ہندوستان کی
ہمارے سمجھتے تھے، چنانچہ وہ خود
فارس کی ایک غزل کے منقطع

میں کہتے ہیں :
 ہمارے ہندو بود برشکال ہاں غالب
 وہیں غزناں کدہ ہم موسم شراب جنت
 ۱۔ لغات ۔ بال کشا ہونا
 اڑنے کے لیے پرتون۔
 بھٹے : شراب کی مڑی
 جس کی شکل بطن کی سی ہوتی ہے
 اس قسم کی صراحیاں حوالہ اس
 وقت استعمال کی جاتی تھیں ،
 جب بزم شراب کسی حوض یا
 ندی کے کنارے آراستہ ہوتی تھی
 دل و دوست ثنا :
 تیرنے کا دل اور ہاتھ یعنی سیر
 اور قوت ۔
 شرح : پھر وقت آ
 گیا کہ موج شراب اڑنے کے
 لیے پرتوں اور شراب کی بطن
 نما صراحی میں تیرتے کا حوصلہ
 اور قوت پیدا ہو ۔
 شراب کی صراحی کو تیرنے
 کا حوصلہ اور قوت دینے کا فکر
 اس لیے کیا کہ شراب کی مفل
 حوض کے کنارے آراستہ کی جاتی
 جو ہوا غرق نہی ، بخت رسا رکھتا ہے ۔
 سر سے گزرے پر بھی ہے بال بہا موج شراب
 ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
 موج بستی کو کرے فیض ہوا ، موج شراب
 پار موج اٹھتی ہے طوفانہ ، طرب سے ہر مڑ
 موج گل ، موج شفق ، موج صبا ، موج شراب
 جس قدر روح نجاتی ہے جگر تشنہ ناز
 دے ہے تسکین بہ دم آب بقا ، موج شراب
 بسکہ دوڑے ہے رگ تہاں میں غل ہو ہو کر
 شیر رنگ سے ہے بال کشا ، موج شراب
 موج گل سے چراغاں ہے گزر گاؤ خیال
 ہے تصور میں زلس جلوہ نما ، موج شراب
 نشے کے پردے میں ہے محو تاشائے دماغ
 بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما ، موج شراب
 ایک عالم پر ہیں طوفانی کیفیت فصل
 بود سبزہ فو خیز سے تا موج شراب

میں کہتے ہیں :
 ہمارے ہندو بود برشکال ہاں غالب
 وہیں غزناں کدہ ہم موسم شراب جنت
 ۱۔ لغات ۔ بال کشا ہونا
 اڑنے کے لیے پرتون۔

بھٹے : شراب کی مڑی
 جس کی شکل بطن کی سی ہوتی ہے
 اس قسم کی صراحیاں حوالہ اس
 وقت استعمال کی جاتی تھیں ،
 جب بزم شراب کسی حوض یا
 ندی کے کنارے آراستہ ہوتی تھی
 دل و دوست ثنا :
 تیرنے کا دل اور ہاتھ یعنی سیر
 اور قوت ۔

شرح : پھر وقت آ
 گیا کہ موج شراب اڑنے کے
 لیے پرتوں اور شراب کی بطن
 نما صراحی میں تیرتے کا حوصلہ
 اور قوت پیدا ہو ۔

شراب کی صراحی کو تیرنے
 کا حوصلہ اور قوت دینے کا فکر
 اس لیے کیا کہ شراب کی مفل
 حوض کے کنارے آراستہ کی جاتی

شراب پر نگاہ مستی ہے، نہ ہے، موسم گل
 سدا اور بطنِ ناصرا میں خاص
 ہر سبز صوبہ دریا ہے، خوشا! موجِ شرب
 ہمیشہ تڑپتی رہتی ہیں، جن افراد
 ہوش ملا تے ہیں مرے، جلوۂ گل دیکھ، اسدا
 کے سامنے مرا می آجاتی ہے۔
 پھر مجاہدقت کہ ہو بال کشا، موجِ شرب
 وہ اس سے ضرورت کے مطابق
 ہر شراب اپنے اپنے پیالوں میں
 انٹریلی لیتے ہیں اور صراحی کو آگے
 دھکا دیتے ہیں۔ یہاں بطنِ ناصرا کی اسی گردش کا ذکر ہے۔

۴۔ لغات - تاک : انگور کی بیل، انگور

شرح : یہ خط پوچھیے کہ چین والوں میں انتہائی مستی کس دہ سے پیدا ہو گئی
 حالت یہ ہے کہ ہوا انگور کی بیل کے سامنے میں پہنچتی ہے تو شراب کی لہر بن
 جاتی ہے۔

سیاہ مستی اس لیے کہا کہ برسات میں درختوں کے پتے اتنے سبز ہو جاتے
 کہ ان کی سبزی میں ہلکی سی سیاہی آجاتی ہے۔ شاعر نے یہ کیفیت دیکھی، ساتھ ہی
 برسات کی ہواؤں میں ان کے جھونے پر نظر پڑی۔ آدھر آسمان پر سیاہ گھٹائیں
 دکھائی دیں تو یہ احساس پیدا ہوا کہ بارغ کے چھوٹے بڑے درختوں اور چودوں
 پر انتہائی مستی چھائی ہوئی ہے۔ اس مستی کا یہ اثر ہے کہ انگور سے شراب بننے
 اور بے بک پہنچنے کی حاجت نہیں، بلکہ ہوا انگور کی بیل کے نیچے پہنچتے ہی
 موجِ شراب بن جاتی ہے۔ جب حالت یہ ہو تو ہوا سے اور باپ چین کی سیاہی
 کا سبب پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ہوا انگور کی بیل
 کے نیچے سے گزرتی ہے اور موجِ شراب بن کر تمام درختوں اور چودوں کو مدھوش
 کر رہی ہے۔

۲۔ لغات - غرقے : شراب میں ٹوٹا ہوا یعنی مدھوش۔

مخت رسا : بلند اقبال اور خوش نصیبی۔

بالِ بَہا : بَہا کا پَر۔ مشہور ہے کہ بَہا کا سایہ کسی پر پڑ جائے تو وہ بلند اقبال سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

شرح : جو شخص شراب میں غرق ہو گیا، یعنی پی پی کر اسے کچھ ہوش نہ رہا، یہ سمجھ لیجیے کہ وہ نہایت بلند اقبال اور خوش نصیب ہے۔ شراب کی لہریں عجیب چیز ہے کہ اگر سر کے اوپر سے بھی گزر جائے تو کتنا چاہیے کہ بھاگے پر کی سعادت اور بلند بختی نصیب ہوئی۔

مے میں غرق ہونے کی مناسبت سے موج شراب کا سر سے گزنا لائے۔ کوئی شخص پانی میں ڈوب جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا اور پانی سر سے گزر جائے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ انسان ڈوب گیا اور مرزا کے نزدیک شراب کا اثر بالکل اٹا ہوتا ہے۔ یعنی اگر اس میں ڈوب جائے تو وہ خوش نصیب ہے اور شراب سر سے گزر جائے تو سمجھنا چاہیے کہ بالی بھاگایا سر پر پڑا ہے۔

۴۔ برسات کا موسم اتنا خوشگوار اور کیفیت آگیز ہے کہ اگر ہوا کے فیض سے زندگی کی موج یعنی زندگی شراب کی لہریں جاتے تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ برسات نے ہوا میں ایک خاص کیفیت اور نشہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ نشہ ہر شے پر اثر ڈال رہا ہے، لہذا زندگی کی لہر شراب کی لہر بن جاتے تو کیوں تعجب ہو؟

۵۔ شرح : بہر طر مسرت و شادمانی کا طوفان برپا ہے۔ اس طوفان میں چار موجیں بہ طور خاص بلند و نمایاں ہیں، اول موج گل، دوم موج شفق، سوم موج صبا چارم موج شراب۔

بلاشبہ برسات میں بے شمار بھول پیدا ہوتے ہیں، خصوصاً بہادر پر اور ان کے

داسی میں۔

پھر برسات میں گرد و غبار دُھل کر فضا بالکل پاک و صاف ہو جاتی ہے، اس

یہ شفق کی سرخی میں زیادہ گہرائی اور دلکاشی نظر آتی ہے۔ یہ دوسری موج ہوا
میری موج مہالی، جو موسم کی قدرت کم ہو جانے کے باعث زیادہ خوشگوار بن جاتی
ہے اور چوتھی موج یعنی موج شراب کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ ہر طرف خوشی کا
جو طوفان اٹھ اٹھا ہے، یہی چار موجیں اس کے خاص اجزاء ہیں۔

۶۔ لغات : روحِ نباتی : قوتِ نامیہ، جس سے تمام نباتات میں نشوونما
کا رفرما ہے۔

جگر تشہ ناز : لفظی معنی وہ شے جس کا جگر ناز کا پیسا ہو، یعنی لہلہانے
کے لیے بیتابی و بے قراری۔

دمِ آبِ بقا : آبِ حیات کا گھونٹ۔

تشریح : نباتات میں نشوونما کی جو قوت ہے، وہ اس لیے جیات ہے کہ
جلد سے جلد بڑھے اور لہلہانے لگے۔ موج شراب اس کی بے قراری دُور کرنے کی غرض
سے آبِ حیات کے گھونٹ پلا پلا کر تسکین و اطمینان کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ روحِ نباتی لہلہانے اور اکھیدیاں کرنے کے لیے جس قدر
مضطرب ہے، موج شراب اسے آبِ بقا پلا پلا کر تسکین دے رہی ہے یعنی صحت
کر رہی ہے۔ گویا شاعر کے نزدیک ایک طرف حسن میں آب و تاب پیدا کرنے کا موجب
نہجۂ دوسری طرف یہ برسات کے موسم ہر سر ہے۔

غولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ قوتِ نامیہ :

”انسان میں بھی ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم میں شراب سے جو انگ

اور جوش پیدا ہوتا ہے، وہ قوتِ نامیہ کی حرکت سے ہے، یعنی شراب

قوتِ نامیہ کے حق میں وہ کام کرتی ہے، جو کام کہ باطنِ نباتات کے حق

میں کرتی ہے اور ناز سے یہاں اینٹنا اور تنقا مقصود ہے، جو لازمِ فخر و ناز

سے اور نشوونما کے خواص سے ہے۔“

۷۔ تشریح : شراب کی موج انگور کی بیل کی رگوں میں خون بن کر دو رہا ہے۔

ہے۔ اس نے رنگ سے شہپرے لیا اور اڑنے کے لیے پر تول لیے ۔
مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

”جس طرح خونِ رگوں میں دوڑتا ہے ، اسی طرح بیلوں میں مادہٴ ظہر آب
دوڑتا ہے اور اس کے سبب سے بیلیں سرسبز و شاداب ہیں۔ گویا
اس کا دوڑنا پردانہ ہوا اور کھسکی درگینی شہپر پر دانہ ہے“

۸۔ لغات - موجبہ گل : پھولوں کا جوش اور کثرت۔

شرح : ہمارے تصور میں شراب کی موج اس کثرت سے جلوے دکھا
رہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ، دود و درنگ پھولوں کا جوش ہے اور ہر طرف پھولوں
ہی کے جھنڈے لکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر پھولوں کے جلوے نے خیالی کی گزرگاہ
میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے ۔

مولانا طباطبائی بالکل بجا فرماتے ہیں کہ اس شعر میں موجِ شراب کو پہلے موجِ گل
سے ، پھر چراغاں سے تشبیہ کی اور پھر چراغاں کی مناسبت کے پیش نظر خیالی کو گزرگاہ
سے تعبیر کیا۔ صحیح ہے :

”موجِ شراب کو چراغاں سے اگر تشبیہ دیں تو کوئی وجہ شبہ نہیں ، اس
موجِ شراب کو موجِ گل سے تشبیہ دیں تو وجہ شبہ رنگ و بو میں
نہیں ہے اور موجِ گل کو چراغاں سے تشبیہ تام ہے ، یعنی ہر گل کی
افروختگی شعلہٴ چراغ سے مشابہ ہے ۔“

۹۔ شرح : موجِ شراب و ماغ کو نشوونما دینے کا اتنا خیال رکھتی ہے
کہ نشے کا پردہ اختیار کر کے وہ و ماغ میں پہنچی اور پوری محویت سے دیکھ رہی ہے کہ
یہ کیونکر جڑتا ہے اور ترقی پاتا ہے ۔

گویا غائب کے نزدیک موجِ شراب اس لیے نشہ بن کر و ماغ پر اثر انداز
ہوئی کہ خوب دیکھ بھال کرتی ہوئی اس کے نشوونما کا فریضہ انجام دے ۔
اس شعر میں ”سر و ماغ“ اور ”پردہ“ کی مناسبت متبادلتاً تشریح نہیں۔

۱۰۔ لغات - طوفانی - طوفان اٹھانے والے، طوفان آفرین -

سبزہ نوشینز : نیا آگاہ سبزہ -

شرح : نئے آگے ہوئے سبزے کی موج شراب تک ہر موج نے برسات کے موسم کی کیفیت کا ایک ایسا طوفان بپا کر دیا ہے، جو دنیا کے ہر حصے پر چایا ہوا نظر آتا ہے۔ یعنی برسات ہر جگہ ہے۔ ہر طرف سبزہ لہریں لے رہا ہے۔ شراب کی عینیں آراستہ ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقشے کا طوفان اُٹھ آیا ہے جس نے ساری دنیا کو آغوش میں لے لیا ہے۔

۱۱۔ شرح : پھولوں کا موسم کتنا اچھا ہے کہ اس سے ہستی کے ہنگامے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ شراب کی موج کتنی مشرت خیز ہے کہ قطرے کی رہنمائی دیا کی طرف کر دیتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ برسات میں ہر طرف سبزہ آگ آیا۔ پھول کھل گئے، درختوں پر ہمارا آگئی۔ ان سب چیزوں سے ثابت ہو گیا کہ زندگی کا ہنگامہ بھی اسی طرح گرم ہوا۔ پھر اس میں شاعر نے ایک خاص پہلو یہ دکھا کہ جب خزاں کا موسم آتا ہے تو یہ سب چیزیں ناپید ہو جاتی ہیں اور موسم گل میں از سر نو پیدا ہو گئیں۔ اس سے ہنگامہ ہستی کی بے ثباتی ثابت کی، گویا وہی شے ہے جسے عرکی نے ہر دن حدوث قرار دیا، یعنی از سر نو پیدا ہوتا اور یہی اس کی بے ثباتی کی دلیل ہے، کیونکہ وہ مستقل اور قائم باوقات نہیں۔ موج شراب اس دم سے قطرے کے لیے دریا کی طرف رہبر بن گئی کہ اس کا خاتمہ ہی نشہ پیدا کر دیتا ہے اور انسان درجوش ہو جائے تو وہ بخود اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یوں گرد و پیش کی ہر شے سے بے تعلق ہو کر اپنے مبداء کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ قطرے کا مبداء دریا، انسان کا مبداء ذات باری تعالیٰ ہے۔

۱۲۔ شرح : اے استاد! پھولوں کا جلوہ دیکھ کر میرے ہوش اُڑ رہے ہیں۔ پھر دقت آگیا ہے کہ موج شراب اُڑنے کے قصد سے پڑ تو لے۔ یعنی پھولوں کے عام جلوے نے یاد دلادیا کہ شراب کا دور چلنا چاہیے۔

۱۔ لغات : دیدیاں : افسوس کہ دیدیاں کا کیا رزق فلک نے

دُودہ کی جج، اکپڑے۔

جن لوگوں کی سنی درخور عقیدہ گھر، انگشت

عقیدہ گھر : موتیوں کی

کافی ہے نشانی تری، چھلے کا نہ دنیا

لاڑی۔

خالی مجھے دکھلا کے بد وقت سفر، انگشت

شرح : انہوں نے جن

لکھتا ہوں اسد! سوزش دل سے سخن گرم

لوگوں کی ہر انگلی موتیوں کی ڈی

تارکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

کے لائق سنی، یعنی ہے ہر لحظہ

دودگو ہری سے سروکار ہونا

چاہیے تھا، آسمان نے اسے کیڑوں

کا ذرق بنا دیا۔ یعنی وہ مر گئے اور ان کے جسم اور انگلیاں کیڑوں کی نذر ہو گئیں۔

ایک نسخہ "دیدیاں" کی جگہ "دعاں" ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ جن

لوگوں کو مال و دولت سے سرفراز رہنا چاہیے تھا۔ انہیں آسمان نے اس درجہ جمال

و نامراد رکھا کہ وہ حسرت سے اپنی انگلیاں کاٹ رہے ہیں۔

شعری وضع و اسلوب کے پیش نظر "صح" "دیدیاں" ہی ہے نہ کہ "دعاں"۔

۲۔ شرح : سفر کے وقت کوئی چیز نشانی کے طور پر دینے کا عام دستور ہے۔

غائب نے بھی محبوب کے رخصت ہوتے وقت اس سے نشانی کے طور پر چھلے مانگا

لیکن محبوب نے خالی انگلی دکھا دی، گویا بتا دیا کہ چھلے میرے پاس ہے ہی نہیں، جو

نشانی کے طور پر دے دوں۔ مرزا کہتے ہیں کہ تیرا چھلے نہ دینا اور خالی انگلی دکھانا

ہی میرے لیے ایسی نشانی ہے کہ اور کسی نشانی کی ضرورت نہیں۔

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے، ہو سکتا ہے کہ محبوب نے رخصت ہوتے وقت

شوخی سے انگوٹھا دکھا دیا۔

۳۔ لغات : سخن گرم : غریبوں سے بھرا ہوا کلام، اعلیٰ درجے کے اشد

انگشت رکھنا : حبیب لکان، اعتراض کرتا۔

شرح : اے اسد! میں سوزِ دل سے نہایت شگفتہ اور خربوں سے بہرِ نیت شکر کرتا ہوں کہ کوئی شخص میرے ایک حرف پر بھی انگلی نہ رکھ سکے۔
ذکرِ کمال کے ۔

”سفسذِ دل“ اور ”سمنِ گرم“ اس لیے لائے کہ گرم چیز پر کوئی شخص انگلی نہیں رکھ سکتا۔ گویا یہ شعر عبادوں کے علاوہ بقا ہر بھی بالکل درست رہا۔

رہا اگر کوئی تا قیامت ، سلامت پھر اک روز مرنے ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے ، عشقِ خوننا بہ مشرب لکھے ہے ”خداوندِ نعمت“ سلامت
علی الرغم دشمنِ شہیدِ وفا ہوں مبارک مبارک ! سلامت سلامت !
نہیں گر سروِ برگِ اوداکِ معنی تماشا ہے نیزنگِ صورتِ سلامت !

۱۔ **شرح :** اگر کوئی شخص قیامت تک بھی سلامت رہا تو جناب والا! اہلِ حق سے تو مفر نہیں۔ بہر حال کسی نہ کسی دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہی پڑے گا۔ یعنی موتِ برحق ہے اور کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ آگے چہچہے سب کو مرنے ہے۔

۲۔ **لغات :** خوننا بہ مشرب : جس کا مشربِ خون پینا۔ خون پینے کا رسیا یا عادی ۔

شرح : عشقِ کاکام ہی یہ ہے کہ خون پیے ، وہ اسی شغل کا رسیا ہے۔ میرے جگر سے اس نے خون پی کر خوب پرورش پائی ہے۔ اب وہ جگر کو خط لکھتا ہے تو خداوندِ نعمت سلامت لکھتا ہے یعنی اسے اپنا آقا و مرقدیٰ سمجھتا ہے۔

۳۔ **لغات :** علی الرغم : برخلاف ، برعکس ۔

شرح : میں رقیب کی روش اور خواہش کے خلاف وفا کے راستے کا شہید ہوں۔ میں نے وفاداری کے تقاضے پورے کرنے میں جان دی ہے ، لہذا میرے

اس امتیاز پر دینا مبارک اور سلامت کو رہی ہے۔ مبارک اس لیے کہ دفا کے سلسلے میں شہادت پائی، سلامت اس لیے کہ شہیدوں کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہوتی ہے خواہ حافطہ فرماتے ہیں:

ہرگز نہ میرا نگر دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر حیدرۂ عالم دوام

ہم - لغات - سرور برگ : سامان

اوراک : پاتا - سمجھنا - دریافت -

شرح : اگر حقیقت کاراز پالینے اور سمجھنے کا سامان تیسر نہیں تو نہ ہی، صورت کی نیرنگیوں کے تماشے ہی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

حقیقت پالینا اور سمجھنا معرفت کا درجہ کمال ہے، لیکن اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو اس کائنات کی تمام اشیاء میں رات دن جو نیرنگیاں نمود پزیر ہوتی ہیں، ان پر توجہ جمانے رکھنے سے بھی بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ بھی درحقیقت معرفت ہی کی طرف لے جاتی ہیں، بشرطیکہ ہم توجہ سے انھیں دیکھیں اور غور کریں۔

مند گئیں، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غائب

یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت؟

۱ - لغات - مُند جانا : بند ہو جانا

بالیں : سر پانا۔

شرح : اے غائب آنکھیں بند ہو گئیں یعنی موت آگئی۔ انھیں کھلا رکھنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ دیکھیے دوست احباب محبوب کو کیسے وقت میرے سرانے لائے۔

مراد یہ ہے کہ دوستوں نے مجھ پر احسان تو کیا، مگر ایسے وقت میں، جب میں اسی

احسان سے قائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہا۔

یہ مضمون مرزا نے تقریباً انہیں الفاظ میں ایک اور جگہ بھی لکھا ہے :

منہ گشیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے

خوب وقت آئے تم اس عاشق بہار کے پاس



آمدِ خط سے ہوا ہے سر و جو بازارِ دوست

دو دُشمن کشتہ تھا، شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناماقتباز اندیشِ ضبطِ شوق کر

کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ رخسارِ دوست

خانہ ویراں سازِ حیرت، تماشا کیجیے

صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتارِ دوست

عشق میں بیدارِ شکِ خیر نے مارا مجھے

کُشتہ دشمن ہوں آخر اگرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ مارِ روشن، کہ اُس بیدار کا دل شاد ہے

دیدۂ پُر خوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

غیز یوں کرتا ہے میری پریشاں کے سحر میں

بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمِ خوارِ دوست

۱۔ لغات - بازارِ سر دہونا :

منہ پڑھانا - بے رونق ہونا -

شرح - محبوب کے خطِ نکل

آیا اور اس کے حسن و جمال کا بازار

منہ پڑ گیا - شاید اس کے رخسار

کا خط بھی ہوئی شمع کا دھواں تھا۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے

دھواں اٹھتا ہے، گویا دھوئیں

کا اٹھنا شمع کے ٹچہ مہانے کی دلیل

ہوتا ہے - مرزا نے دو کو خط

سے، شمع کو حسن و جمال اور شمع

کشتہ کو حسن و جمال کی انفرادی

سے تشبیہ دی۔

۲۔ شرح : اے دل !

تو نے کیوں اپنے انجام کی طرف

سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں ؟

بہتر یہی ہے کہ تو شوقِ نثار

میں جیاب نہ ہو، صبر و ضبط سے

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی دامن تک
 مجھ کو دیتا ہے پیام وعدہ دیدار دوست
 جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعفِ دماغ
 سر کرے ہے وہ حدیث زلفِ عنبر بار دوست
 چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
 ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتار دوست
 مہرِ انہماکِ دشمن کی شکایت کیجیے
 یا بیاں کیجیے سپاسِ لذتِ آزار دوست ؟
 یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
 ہے رولیفِ شعر میں غالبِ زمیں تکرار دوست
 نہیں ہوتا جیسا نقش پڑ گیا۔ ویسا ہی رہتا ہے جب عاشق خود نقشِ قدم کی طرح سراپا
 حیرت بن کر محبوب کی رفتار پر مرثا اور اسے گھر کی سوجھ بوجھ نہ رہی تو ظاہر ہے
 کہ یہی حیرت اس کا گھر برباد کرنے کا موجب بن گئی۔

۴۔ لغات - بیماریار دوست : محبوب کا بیدار یعنی عاشق۔

شرح : میں محبوب کی محبت میں بیدار تھا اور اسی بیماری میں مجھے مرنا
 چاہیے تھا، لیکن اس اثناء میں محبوب نے رقیب پر مہربانیاں شروع کر دیں۔ ان
 مہربانیوں پر رشک نے مجھے اس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا کہ میں جان بچھڑا کر
 گویا اگرچہ بیدار دوست تھا، مگر کشتہ دشمن بن گیا۔

کام لے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ
 دوست کے جلوے کی تاب کوئی
 نہیں لاسکتا، کیا حضرت موسیٰ کا
 واقعہ تجھے یاد نہیں کہ کس طرح
 وہ بیہوش ہو کر گر گئے تھے ؟

۳۔ لغات - خانہ
 ویراں سازی : گھر اُجاڑنا،
 گھر کو ویراں کرنا۔

رفتہ : والد و شہداء بٹا ہوا
 شرح : دیکھیے حیرت
 نے میرا گھر کس طرح اُجاڑ دیا ہے ؟
 میں نقشِ پا کی طرح محبوب کی رفتار
 پر مٹا ہوا ہوں۔

نقشِ قدم کو حیرت زدہ ہیں
 ایسے کہا کہ اس میں کوئی حس و حرکت

نہیں ہوتی۔ جیسا نقش پڑ گیا۔ ویسا ہی رہتا ہے جب عاشق خود نقشِ قدم کی طرح سراپا
 حیرت بن کر محبوب کی رفتار پر مرثا اور اسے گھر کی سوجھ بوجھ نہ رہی تو ظاہر ہے
 کہ یہی حیرت اس کا گھر برباد کرنے کا موجب بن گئی۔

۴۔ لغات - بیماریار دوست : محبوب کا بیدار یعنی عاشق۔

شرح : میں محبوب کی محبت میں بیدار تھا اور اسی بیماری میں مجھے مرنا
 چاہیے تھا، لیکن اس اثناء میں محبوب نے رقیب پر مہربانیاں شروع کر دیں۔ ان
 مہربانیوں پر رشک نے مجھے اس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا کہ میں جان بچھڑا کر
 گویا اگرچہ بیدار دوست تھا، مگر کشتہ دشمن بن گیا۔

۵۔ لغات : چشم ماروشن : ہماری آنکھ خوش ہو۔ فارسی کا یہ کلمہ خوشی کے موقع پر بولتے ہیں۔

سافر سرشار : بھرا ہوا اور باب پناہ۔

شرح : ہمارے بیدار و محبوب کا دل خوش ہے تو ہمیں کیوں خوش نہ ہو؟ ہماری لہو سے بھری ہوئی آنکھیں محبوب کے نزدیک شراب کے باب ساغر ہیں۔
 ”دیدہ پرخوں“ کی مناسبت سے ”چشم ماروشن“ کہا اور دل کی شادمانی کے لیے سافر سرشار لائے۔

۶۔ شعر نمبر ۶۱۸۰۷۱ مسلسل ہیں، انہیں قطعہ بند سمجھنا چاہیے۔

شرح : رقیب مجدد فرقت کے مارے کا حال اس طرح پرچتا ہے۔ جیسے کوئی دوست دوسرے دوست کی غم خواری کر رہا ہو۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تکلیف و اذیت کی حالت میں غم خواری انسان کو ہمیشہ پسندیدہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مرزا اس پر سخت پریشان ہیں، کیونکہ انہیں رشک تڑپا رہا ہے۔

۷۔ شرح : رقیب مجھے آکر پیغام دیتا ہے کہ محبوب نے دیدار کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس پیغام سے اس کا مقصد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ میں جان لوں۔ اسے بھی محبوب تک رسائی حاصل ہے۔

۸۔ لغات۔ سر کرنا : فارسی سر کردن سے ہے یعنی شروع کرنا۔ اس کے معنی توپ، ہندوق چھوڑنا اور فتح کرنا بھی ہیں۔

شرح : جب میں یہ شکایت کرتا ہوں کہ میرا داغ کمزور ہے اور میں باتوں کی تاب نہیں لاسکتا تو رقیب محبوب کی عنبر بار زلفوں کا قہقہہ چھڑ دیتا ہے۔

خوشبو کو ضعفِ داغ کا علاج سمجھا جاتا ہے، چنانچہ جب کوئی بیہوش ہو جاتا ہے تو اسے لٹکھڑنگھڑاتے ہیں، جو مختلف خوشبوؤں سے تیار کیا جاتا ہے۔ رقیب بھی زلفِ عنبر بار کی بات اس لیے شروع کرتا ہے کہ ضعفِ داغ کا مراد

ہو جائے۔

سرا داغ، زلف، عنبر بار وغیرہ کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔

۹۔ شرح : جب وہ مجھے چمکے چمکے آنسو بہاتے ہوئے دیکھتا ہے تو خود

ہنس کر محبوب کی شوخی گفتار کا بیان شروع کر دیتا ہے۔

اس شعر میں بھی رونے کے مقابل ہنسنا اور چمکے چمکے کے مقابل بیان شوخی گفتار

لائے۔

رقیب نے محبوب کی شوخی گفتار کا بیان یقیناً اس وجہ سے شروع کیا کہ عاشق

کے لیے اس شوخی گفتار سے بڑھ کر دلاویز و دلپند چیز کوئی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن

اس میں ستم ظریفی کا پہلو بالکل واضح ہے اور عاشق کی نظر اسی پر ہے۔ یعنی رقیب

یہ سب کچھ عاشق کو بلانے کی غرض سے کڑا رہا ہے۔

۱۰۔ لغات۔ سپاس : شکریہ

شرح : یہ پوری کیفیت بیان کر چکنے کے بعد مرزا افزاتے ہیں : اب بتائیے

آیا رقیب کی مہرانیوں کی شکایت کریں یا محبوب عاشق کو دیکھ پہنچانے کی جس لذت

کا خوگر ہے، اس کا شکر بجالائیں؟

دشمن یعنی رقیب کی مہرانیوں ہی عاشق کے لیے شکایت ہی کا باعث ہوتی ہیں

کیونکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، مقصود یہ ہوتا ہے کہ عاشق کو تکلیف پہنچے، اُس کا

دل دکھے اور محبوب کی آزار رسانی بھی بہر حال شکر ہی کا موجب ہوتی ہے۔

۱۱۔ شرح : اے غالب ! یہ غزل مجھے دل سے پسند آتی ہے، کیونکہ اس

کی ردیف میں بار بار دوست یعنی محبوب کا لفظ آیا ہے اور عاشق اس لفظ کی تکرار

سے بھی خوش ہوتا ہے۔

گلشن میں بند و بست ہو رنگ و گز ہے آج
۱۔ لغات - ہر رنگ و گز :
دوسرے رنگ کا، جہاں گز طرز کا۔
قرنی کا طوق، حلقہ بیرونِ در ہے آج
قرنی : ناخن کی ایک قسم جس
کی گردن میں طوق یعنی حلقہ سبنا
ہٹا ہوتا ہے۔ شراد اسے سرو کا
عاشق قرار دیتے ہیں۔

اے عافیت! کنارہ کر اے انتظام! چل
حلقہ بیرونِ در : دروازے
کے باہر کی کنڈی۔
سیلاب گریہ درپے دیوار و در ہے آج
شرح : مولانا طباطبائی فرماتے
ہیں : جس شخص کو محفل میں بار نہ ہو اور اسے باہر ہی روک دیا گیا ہو اسے بھی
حلقہ بیرونِ در کہتے ہیں۔

آج باغ میں نئی وضع کا اختتام کیا گیا ہے اور قرنی کو بھی جو باغ کا مشہور پرندہ
ہے، باہر نکال دیا گیا ہے۔ گویا اس کا طوق باغ کے بیرونی دروازے کی کنڈی بنا
ہوا ہے۔ بقلا ہر شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ محبوب باغ میں آ رہا ہے جس کا قدر
سرو و ششاد کے لیے بھی باعثِ صدمہ و شک ہے۔ اس وجہ سے اختتام کی صورت
بالکل دوسری ہو گئی، جیسے کسی بڑی ہستی کی آمد پر خصوصی انتظامات کر لینے کا دستور
ہے۔ اس سلسلے میں قرنی تک کو باہر نکال دیا گیا ہے۔

۲۔ لغات - پارہ : ٹکڑا

شرح : آج ہر آہ کے ساتھ دل کا ایک ٹکڑا چلا کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ
میرے سانس کا تار اثر کو چھانسنے کے لیے کند بن گیا ہے یعنی میرا سانس آج اپنے اندر
اثر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے دل کے ٹکڑے آہوں کے ساتھ باہر آ رہے ہیں۔

۳۔ شرح : اے آرام و راحت! الگ ہو جاؤ اور اے نظم و ضبط بالکل ہٹاؤ کیونکہ
میرے دل نے سے جو بے پناہ سیلاب آیا ہے، وہ آج میرے گھر کے دیوار و در سلامت نہ

پھوٹے گا۔

مرزا عاقبت اور انتقام کو اس لیے لانے کہ جو گھر ٹھہے جانے والا ہو اور اس کے دیوار و در برباد ہو جانے والے ہوں، وہاں عاقبت کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی اور نظم و انتقام ناپید ہو جاتا ہے۔



۱۔ لغات۔ تیار : غمخواری
کرنا : بیمار کی دیکھ بھال۔ تیار دار اس
شخص کو کہتے ہیں جو بیمار کی دیکھ بھال
کرتا ہو۔ مصل نسوڑ میں "تیار دار" کی جگہ "بیار دار" ہے اور حضرت عیسیٰ کے مرتبہ نسخے
کے مطابق اصل لفظ "بیار دار" ہی تھا۔ اس کے معنی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

شرح : ہم سمجھتے ہیں کہ عشق کے بیمار کا کوئی علاج نہیں۔ اگر تمہیں یہ سارے
علاج کرانے پر اصرار ہے تو مضائقہ نہیں، ہم عشق کے بیمار کی دیکھ بھال اپنے ذمے
لے لیتے ہیں، لیکن یہ بتا دو، اگر بیمار کو کوئی فائدہ نہ ہوا تو میسا کے ساتھ کیا برتاؤ دینا چاہیے
آخری مصرع کے مفہوم دو ہو سکتے ہیں، اول وہی، جو اوپر پیش کر دیا گیا، دوم یہ کہ
اگر مریض عشق کو کوئی فائدہ نہ پہنچا تو میسا کے علاج کی حقیقت کیا رہ جائے گی؟ وہ علاج
کس کام کا مستعد ہو گا۔ یعنی پہلی صورت میں "کیا" بہ طور استغناء استعمال ہوا اور دوسری
صورت میں اسے تحقیق کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ماضی کھینچ
کمال گری سبھی تلاشِ دید نہ پوچھ
بہ رنگِ خار مرے آٹنے سے جوہر کھینچ
تجھے بہانہ راحت ہے انتظارِ دل!
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ ستر کھینچ
تیری طرف ہے بہ حسرت، انتظارِ رنگس
بہ کوری دل چشمِ رقیب، ماضی کھینچ

یونیم غمزہ ادا کر حق و ولایت ناز
نیام پروہ زخم جگر سے فخر کھینچ
برے قدر میں ہے صبا نے آتش پہنا
بروئے سفر کباب و دل مند کھینچ

۱۔ لغات - انتظار کھینچنا : انتظار کرنا۔

شرح : ایک سالن بھی آرزو کی انجن سے باہر نکال، یعنی آرزو کا دم
بھرے جا اور اس کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھ۔ اگر فی الحال تجھے شراب میسر نہیں آتی
تو کچھ پروا نہ کر۔ ساغر کے دور کا انتظار کرتا رہ اور یقین رکھ کہ کسی وقت تیری باری
بھی آجائے گی۔

اس شعر میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان کو آرزو کا دامن کبھی نہ چھوڑنا
چاہیے اور کتنی ہی تکلیفیں پیش آئیں، صبر و استقلال کے ساتھ پیش نظر مقصد کے لیے
کوشش جاری رکھنا لازم ہے، کیونکہ کامیابی اسی پر موقوف ہے۔ تھکاوٹ سے
یہاں کام نہیں چل سکتا۔ اقبالؒ کیا خوب فرما گئے ہیں۔

زندگی جدوجہد و استحقاق نیست

۲۔ لغات - کمال گرمی سعی تلاش وید : کسی صاحب بصیرت قدردان
کی تلاش میں سرگرم کوششوں کو انتہا پر پہنچا دینا۔

شرح : میں نے صاحب بصیرت قدردان کی تلاش میں جو دوڑ و صوب اور
ٹھک و دو کی اور اسے انتہا پر پہنچا دیا اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھ۔ میں کیا بتا
سکتا ہوں کہ اس دوڑ و صوب میں مجھ پر کیا گزری؟ اب بالکل بالوس ہو چکا ہوں۔ لمبے
ہجوم! تو اگر کوئی خدمت انجام دے سکتا ہے تو صرف یہ ہے کہ میرے آئینہ فطرت
میں کمال کے جوہر ہیں، انہیں اسی طرح نکال ڈال ہیں طرح کسی کے پاؤں سے کٹنے،
نکالے جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ جب کوئی قد و شناس ہی نہیں اور کسی کو اندازہ ہی
نہیں ہو سکتا کہ فطرت نے مجھ میں کون کون سے کمالات بھر رکھے ہیں تو ان جوہروں کی
حقیقت بھی کانٹوں کی سی رہ گئی ہے، پھر کیوں نہ انہیں نکال باہر کیا جائے؟

۲۔ شرح : اے دل ! تو نے محبوب کے انتظار کو راحت و آسائش کا بہانہ بنالیا ہے۔ تجھے کس نے اشارہ کیا کہ بستر پر لیٹ رہ اور اسی کے ناز کھینچنے میں عمر بسر کر دے ؟ عاشق کو راحت سے کیا واسطہ ؟ اس کا کام یہ نہیں کہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں دودانے پر لگائے رکھے، اس کا کام یہ ہے کہ آہ و فزا د کرے، صبحا کے پکر لگائے جیب و دامن تارتا رکھے دیوانوں کی طرح پھرے۔ محبوب تک پہنچنا آسان ہے ؟ اس شعر میں بھی عمل کا درس دیا گیا ہے۔ کوئی مقصد ہو، وہ جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا یہ طریقہ نہیں کہ بستر پر لیٹ گئے اور سمجھ لیا کہ سب کچھ خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ یہ منزل انتہائی جانفشانی اور جفا کشی کی ہے، تن آسائوں کو اس میں قدم نہ رکھنا چاہیے۔

۴۔ شرح : اے محبوب ! زکس تجھے حسرت سے تنگ رہی ہے، گویا یہ بھی میری رقیب بن گئی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا دل بھی اندھا ہے، کیونکہ اس میں شوق و محبت کی جب تک ہلک موجود نہیں اور اس کی آنکھ بھی اندھی ہے، کیونکہ بظاہر آنکھ ہونے کے باوجود وہ نورِ لہارت سے محروم ہے۔ لہذا اس رقیب سے، جس کے دل اور آنکھ دونوں اندھے ہیں، بالکل بے پروا ہو کر شراب کا ساغر پی جا۔

ہ کو ری دل چشم رقیب بد دعا کے لیے بھی بولتے ہیں اور نظر بد کا اثر دور کرنے کے لیے بھی۔

۵۔ لغات - ودیعت : امانت یعنی کسی شخص کے پاس کوئی چیز حفاظت کی غرض سے رکھ دینا۔

نیا م : میان، تلوار وغیرہ کا غلاف۔

شرح : تیرے ناز میرے پاس امانت کے طور پر رہے، میرے زخمِ جگر کے پردے نے ان کے لیے میان کا کام دیا۔ اب تو پورا نہیں، بلکہ نصف غمرہ دکھا کر اس امانت کا حق ادا کر دے، یعنی خنجر کو میرے زخمِ جگر کے غلاف سے باہر کھینچنے

نیم غمزہ اس لیے کہا کہ خنجر کی ضرب لگاتے وقت تو پورے غمزے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن خنجر باہر کھینچنے کے لیے صرف نیم غمزے ہی کی تلاش کافی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اس طرح محبوب ناز و ادا کا خنجر بگڑے کھینچنے کے لیے سامنے آئے گا اور دیدار کی آرزو پوری ہو جائے گی۔

۶۔ لغات۔ قدح : پیالہ۔ ساغر۔

صبا : شراب۔

آتش پناہاں : چھپی ہوئی آگ۔

سفرہ : دسترخوان

شرح : میرے ساغر میں چھپی ہوئی شراب کی آگ بھری ہے، یعنی آتش عشق کی شراب ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ دسترخوان پر سند کا دل کباب کر کے رکھا جائے، کیونکہ اس کی زندگی آگ ہی میں گزرتی ہے۔ وہی کباب آتش عشق کی شراب کا موزوں نقل بن سکتے ہیں۔

①

حسن غمزے کی کشاکش سے چُٹنا، میرے بعد

بارے، آرام سے ہیں اہل جفا، میرے بعد

منصب شیفگی کے کوئی قابل نہ رہا

ہوئی معزولی انداز و ادا، میرے بعد

شرح بھرتی ہے تو اس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے

شعلہ عشق سیر پوش ہوا، میرے بعد

۱۔ لغات۔ غمزہ : نفی

معنی چشم و ابرو کا اشارہ، مطلب

ہے محبوبوں کی دلغریب ادائیں،

جن سے وہ عاشقوں کو اور زیادہ

مفتون و گرویدہ کریتے ہیں۔

کشاکش : کھینچنا۔

اہل جفا : ظالم، یعنی محبوب۔

شرح : میں دنیا سے خواہش

ہو گیا، اب حسن بین حسینوں کو

نازدادوں کے کمالات دکھانے

کاگوئی موقع نہ رہا۔ یعنی حسن کو
 غمزدے کے لیے اہتمام میں جو کچھ
 کرنا چاہتا تھا، اس کی ضرورت
 ختم ہو گئی۔ غمزدے کے لیے کشاکش
 ہی باقی نہ رہی اور اسے سہی و
 کوشش سے فراغت مل گئی۔
 مقام ٹھکر ہے کہ مجاہدوں اور جیسوں
 کو آرام مل گیا، کیونکہ میرے بعد
 تازہ وارد کے جو رجحان کو انگیر
 کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔
 شعر میں قابلِ غور نکتہ یہ
 ہے کہ غمزدے کے لیے سہی و کوشش
 سے فراغت صرف اس حسین
 تک محدود نہ رہی، جس پر مرزا
 غالب فریفتہ تھے، بلکہ پورے
 عالمِ حسن کو اس کشاکش سے نہات
 مل گئی اور تمام جیسوں کو آرام
 حاصل ہو گیا۔ گو یا حقیقی عشق کا
 حامل محض ایک غالب تھا۔ اس کے سوا کسی میں محبت کے لوازم پورے کرنے کی
 صلاحیت موجود نہ تھی۔

۲۔ شرح : اس شعر میں پہلے شعر کا مضمون نئے دلکش انداز سے دہرایا گیا
 ہے۔ فرماتے ہیں، عشق کے واجبات بجالانے کے لائق کوئی نہ رہا۔ یہ سب کچھ میرے
 ساتھ ختم ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تازہ وارد کے لیے بھی کار فرمائی کا کوئی موقع باقی نہ رہا

خوں ہے دل خاک میں احوالِ تباں پر، یعنی
 اُن کے ناخن ہونے محتاجِ حنا، میرے بعد
 درخورِ عرض نہیں، جو بہرِ بیداد کو سجا
 نگہ ناز ہے سرے سے خفا، میرے بعد
 ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
 پاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، میرے بعد
 کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردِ انگنِ عشق
 ہے مکرِ لبِ ساقی پہ صلا، میرے بعد
 غم سے مرنے والوں کو اتنا نہیں دنیا میں کوئی
 کہ کرے تعزیتِ ہر دو فنا، میرے بعد
 آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
 کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا، میرے بعد
 کس کے سوا کسی میں محبت کے لوازم پورے کرنے کی

چنانچہ ان کا کام بھی ختم ہو گیا اور جس منصب کا ذلیفہ ختم ہو جائے، اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ ایک غالب تھا، جو مزارعینِ عشق ادا کر سکتا تھا۔ وہ نہ رہا تو حسن و عشق کا پورا ہنگامہ سرد پڑ گیا۔

اس شعر میں لفظ "معزولی" منصب کی رعایت سے آیا ہے۔

۳۔ لغات۔ سیاہ پوش : سیاہ لباس پہننے والا۔ یہ لباس عموماً سوگ میں

پہنا جاتا ہے۔

شرح : جب شمع بجھتی ہے تو اس کے رشتے سے دھوئیں کی لہرائیں اُٹھتی ہیں۔

اس سے شاعر نے یہ نتیجہ نکالا کہ شمع کے بجھنے پر اس کے شعلے نے سیاہ ماتی لباس پہن لیا۔ اسی طرح جب میری شمع حیات گل ہوئی، جو شعلہ عشق کا مرکز و ماسن تھی تو اس کے ماتم میں شعلہ عشق نے بھی سیاہ لباس ہی پسند کیا۔

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ عشق کی حرارت و رونق صرف میرے دم سے تھی، میری ہی شمع حیات سے عشق کی انجمن میں روشنی کا سرو سامان تھا۔ میں دنیا سے رخصت ہو گیا تو اب خود عشق کے شعلے کو سوگ میں سیاہ لباس پہننے کی ضرورت پیش آگئی۔

شمع کا بجھنا روزانہ لاکھوں آدمی دیکھتے ہیں، مگر اس سے یہ معنون کسی نے پیدا نہ کیا۔ یہ شعر بھی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ غالب کا مشاہدہ کس قدر گہرا اور حقیقت پسندانہ تھا۔

۴۔ شرح : جب میں زندہ تھا تو حسنینوں کو منہدی کا محتاج ہونے کی کوئی

ضرورت نہ تھی۔ وہ میرے خون و دل سے اپنے ناخن رنگ لیتے تھے۔ اب میں دنیا میں نہ رہا تو انہیں منہدی کی ضرورت پیش آئی۔ یہ کیفیت دیکھ کر قہر میں میرا دل خون ٹھرا جاتا ہے۔ میرے ہوتے انہیں کسی کی محتاجی نہیں کرنی پڑتی تھی۔

۵۔ لغات۔ درخویرِ عرض : پیش ہونے کے لائق۔ نمایاں ہونے کے قابل۔

جو بہرِ بیداد : ظلم کا جو بہر۔ شعر میں اشارہ شریعے کی طرف معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حسنینوں کی آنکھیں جب تک سرگم نہ ہوں، ان کی نگاہیں دلدوزی میں رہیں گی۔

کو نہیں پہنچتیں۔ اگر جو بہرہ یاد سے اشارہ غمزہ و عشوہ کی طرف سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ سرگیں آنکھوں کے اشارے قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

شرح : میرے مرنے کے بعد کوئی جاگہ ہی باقی نہ رہی، جہاں سرگیں آنکھوں کا غمزہ و عشوہ اپنے کمالات دکھا سکے اور اپنے جوہر کی نمائش کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نگاہ تازہ سرے سے خفا ہو گئی، یعنی حسینوں نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا۔

سرمہ لگانا چھوڑ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی کہ حسینوں نے مرزا کے ماتم میں یہ شیوہ اختیار کیا، کیونکہ مرزا کے بعد کوئی ایسا فرد باقی نہ رہا، جسے وہ اپنے عشوہ دادا کا تحفہ مشق بنا سکیں۔

۶۔ لغات۔ آغوش و دارع : رخصت کے وقت دوستوں اور رفیقوں کا بغل گیر ہونا۔

شرح : میرے مرنے کے بعد دیوانگی اہل جنوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہی ہے اور بغل گیری کی غرض سے اس نے ہانہیں پھیلا دی ہیں، یعنی اب دیوانگی کسی کو نصیب نہ ہو گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہے۔ جب تک میں باقی تھا دیوانگی کے تمام سامان موجود تھے، یعنی گریبان چاک ہوتے تھے۔ اب یہ سامان بھی جا رہا ہے۔ چاک گریبان سے الگ ہو رہا ہے، آئندہ واسن تار تار نہیں ہوں گے۔ گویا مرزا کے ساتھ عشق کے علاوہ جنون بھی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

۷۔ لغات۔ مے مرد انگن : مردوں کو بیہوش کر کے گرا دینے والی شراب۔
حصلا : کھانے یا شراب پینے کے لیے بلانے کی صدا۔ عام دعوت اور پکار کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ پنجابی میں اس لفظ نے ”صلح“ کی صورت اختیار کی۔ بولتے ہیں کہ فلاں نے مجھے کھانے کی ”صلح“ بھی نہ کی یعنی کھانے کے لیے بلا یا ہی نہیں۔

شرح : خواجہ عاتق فرماتے ہیں :

”اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں مے مرد انگن عشق کا ساتھی یعنی معشوقی بار بار ملا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شراب عشق کی

طرت بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔ اس لیے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے، اگر زیادہ عجز کرنے کے بعد، جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے، اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع ہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں :

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد انگلیں عشق

اور اس مصرع کو وہ کمر پڑھتا ہے ایک دفعہ بلانے کے لیے میں پڑھتا ہے :

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد انگلیں عشق ؟

یعنی کوئی ہے، جو مے مرد انگلیں عشق کا حریف ہو ؟ جب اس آواز پر

کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لیے میں کمر پڑھتا ہے !

کون پڑھتا ہے حریفِ مے مرد انگلیں عشق !

یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لیے اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو

بلانے کا لہجہ کوئی اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز

ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کر دو گے تو فوراً یہ معنی

ذہن نشین ہو جائیں گے :

خواجہ حالی کی تشریح پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں، البتہ یہ عرض کر دینا ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ پورا مصرع ایسے انداز میں مرتب کر لینا بے مدد و شواہد ہے جسے

پڑھتے وقت صرف لہجہ بدل لینے سے دو مختلف معنی پیدا ہو جائیں۔ یہ شعر اس اعتبار

سے بالکل یگانہ نظر آتا ہے۔

۸۔ لغات - تعزیت : ماتم پرسی، پڑسا دینا، ماتم دسوگ۔

تشریح : میں مرنے سے پہلے اس غم میں گھل گھل کر مرا عمارِ دہلیوں کو دنیا

کی وسعت میں کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا، جس سے امید رکھی جا سکے وہ میرے سر

نے کے بعد مردِ محبت اور دانا و استواری کی ماتم پرسی کر سکے، کیونکہ میں مرناؤں گا

تو ساتھ ہی مہرودنا پر بھی موت طاری ہو جائے گی۔ اُن کی ماتم پر سی وہی کر سکتا ہے جسے زندگی کی اس نہایت قیمتی متاع کا صحیح اندازہ ہو۔ ان کے حق تو کون پورے کرے گا؟ یہ بھی ممکن نہیں کہ ان کے مرجانے پر سوگوار سی ہی کا فرض ادا کر دے۔ اپنے دم کے ساتھ مہرودنا کی عظمت اور اپنے بعد ان بیش بہا اوصاف کی ناقدری و کس مہر سی کا کتنا بڑا تاثر نقشہ کھینچ دیا ہے۔

ایک مضموم، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مہرودنا تو موت سے موجود ہی نہ تھے۔ میں ان پر آنسو بہاتا رہتا تھا، اب میرے بعد کوئی اتنا بھی نہیں کہ ان کا ماتم کرتا رہے۔

۹۔ شرح : اے غالب ! جب تک میں زندہ ہوں، عشق کے سیلاب بلا کو سنبھالے بیٹھا ہوں، لیکن جب میں مرجاؤں گا تو یہ سیلاب کس کے گھر کا رخ کر لگا؟ کوئی گھر ایسا نظر نہیں آتا، جو اس کا امن بن سکے۔ انوس، میرے بعد عشق اس قدر بکس رہ جائے گا کہ اس کے تصور ہی پر بے اختیار رونے آ جاتا ہے۔

اردو میں ایسی غزلیں بہت کم ملتی ہیں، جن کے تمام اشعار مسلسل ہوں اور ایک ہی مضمون کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب سے بیان کیے گئے ہوں۔ مرزا غالب کی یہ غزل بھی مسلسل اشعار کا ایک نہایت نادر نمونہ ہے۔



بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر، در و دیوار

نگاہ شوق کو ہیں، بال و پر، در و دیوار

و فوراً شک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ

کہ ہو گئے ہرے دیوار دور، در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدم یا ر

گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار

۱۔ شرح : اگر در دیوار

ہمارے لیے محبوب تک پہنچنے

میں رکاوٹ بن گئے ہیں تو ہماری

بلا سے، ہمیں ان کی کیا پدا ہے؟

نگاہ شوق کے لیے تو یہ در و دیوار

بال و پر ہیں، جن سے نگاہ میں

پدا ز کی قوت پیدا ہو گئی ہے؟

جو اسے اڑا کر محبوب تک پہنچا

سکتی ہے اور کوئی رکاوٹ دامگیر نہیں ہو سکتی۔

کسی مقصد کے لیے سچا بند بدل میں موجود ہو تو رکاوٹ جذبے کو تیز تر کر دیتی ہے۔ عربی کی مشورہ مثل ہے : الانسان خور میں ملنا مانع ، یعنی انسان کو جس چیز سے روکا جائے ، اس کے لیے وہ اور حریص ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے ، خصوصاً عشق کے معاملات میں تو یہ عام چیز ہے۔ بچے عشق —

لیے ہر رکاوٹ اس کی آگ کو بہتر کاموجب ہوتی ہے۔ یہی حقیقت مرزا لے اس شعر میں بیان کی ہے۔ رکاوٹ کے باعث زور تیز تر ہو جانے کا مضمون مرزا نے ایک اور شعر میں بھی کہا ہے :

پاتے نہیں جب راہ تو چلے جلتے ہیں تائے
دکھتی ہے سری طبع تو ہوتی ہے دھان اور

۲۔ لغات - و نور :

کثرت - زیادتی۔

رنگ : حالت ، کیفیت ۔

○
ہوئی ہے کس قدر اور زانیئے جلوہ

کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سر سوداے انتظار ، تو آ

کہ میں دکان متاع نظر ، در و دیوار
ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے

کہ گر پڑے نہ ہرے پاؤں پر ، در و دیوار
وہ آ رہے ہمسائے میں تو سایے سے

ہوئے فدا در و دیوار پر ، در و دیوار
نظر میں کشکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی

ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ پوچھ بے خودی عیش مقدم سیلاب

کہ ناچتے ہیں پڑے ، سرسبز ، در و دیوار
دکھ کسی سے کہ غالب ! انہیں زمانے میں

حریف راز محبت ، مگر ، در و دیوار

شرح : آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور ایسا نیل ہر نکلا کہ میرے مکان کی ہر شے چمپٹ ہو گئی۔ جہاں دروازہ تھا ، وہاں لمبے کا ڈھیر لگ جانے سے وہ پٹ گیا اور جہاں دیوار تھی ، اس میں شکاف پڑ گئے اور اندر آنے جانے کے راستے پیدا ہو گئے۔ گویا دروازے دیواریں بن گئے اور دیواروں نے دروازوں کی شکل اختیار کر لی

دیکھیے بد لغظوں کے اٹل پھیر سے کتنا وسیع مصنوع اور کس طرح اسلوبی سے پیش کر دیا۔

۳۔ لغات۔ نوید : خوشخبری۔

مقدم : آمد ، تشریف آوری۔

شرح : میرے گھر کے دیوار و در کا جو سایہ پڑ رہا ہے ، اسے سایہ نہیں سمجھنا چاہیے ، بلکہ محبوب کی تشریف آوری کی خبر پہنچی تو در و دیوار پیشوائی اور خیر مقدم کے لیے چند قدم آگے بڑھ گئے۔

معلوم ہے کہ خاص بہتیوں کا استقبال ہمیشہ چند قدم آگے بڑھ کر کیا جاتا ہے ، چنانچہ مرزا کے در و دیوار بھی سایے کی شکل میں آگے بڑھ گئے۔

۴۔ لغات۔ ارذانی : ستاپن۔

شرح : اے محبوب ! خیری شراب دیدار اس قدر سستی اور عام ہو گئی ہے کہ اس سے تیرے کو پے کا ہر در و دیوار مست ہو گیا ہے۔

محبوب کو پے میں آتا ہے تو ہر گز یہی اس کے ساکن ملوہ دیدار سے شاد کام ہوتے ہیں۔ یہ شراب ان پرستی ظاہری کر دیتی ہے ، لہذا یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ جسے دیکھیے ، وہ اسی شراب سے بخود نظر آتا ہے۔

۵۔ لغات۔ متاع : مال و اسباب

شرح : اے محبوب ! اگر تجھے انتظار کا سودا خریدنا منظور ہے تو آ اور دیکھ تیرے گھر کے در و دیوار پر ایسی دکائیں آراستہ ہو گئی ہیں ، جن میں صرف نظر کا مال ، بھٹو

ہوتا ہے۔

محبوب کو دیکھنے کے لیے سزاؤں لگا ہیں قیاب ہیں وہ اس کے درد دیوار پر جم گئی ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ شاید اس کے حسن کی کوئی جھلک نظر آجائے اور ان کے لیے ٹیکنک کا سامان ہم پہنچے۔ اب محبوب کو دعوت دے رہے ہیں کہ یہاں صرف انتظار۔ کاسودا بکتا ہے اور خوبی یہ ہے کہ اس دعوت میں اپنا مطلب بھی پیش نظر ہے۔ یعنی محبوب آئے گا تو بہر حال اس کے دیدار سے شرف پانے کا موقع مل جائے گا۔

۶۔ شرح : جب کہیں میرے دل میں گرے کا طوفان اٹھا اور میں ہونے پر آمادہ ہوا تو میرے درد دیوار فوراً پاؤں پر گر پڑے اور منت و خوشامد شروع کر دی کہ خدا کے لیے رُک جا، اور نہ ہمارا کوئی شکنا باقی نہیں رہے گا۔ تو روئے گھڑا شکوں کا ایک نیل بہ نکلے گا، جو ہمیں بہاے جائے گا۔

شعر میں لطفت کا خاص پہلو یہ ہے کہ درد دیوار کا پاؤں پر گرنا بہانے خود ان کے تباہ ہوجانے کا نقشہ پیش کرتا ہے، یعنی شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جب میں نے روئے کاسودا سامان کیا تو درد دیوار میرے اشکوں کے نیل میں نہ گئے۔

۷۔ شرح : محبوب میرے گھر کے پاس آ رہا، اب کیفیت یہ ہے کہ میرے درد دیوار کا سایہ اس کی قیام گاہ پر پڑ رہا ہے۔ اس طرح میرے درد دیوار سائے کے ذریعے سے محبوب کے درد دیوار پر قربان ہونے لگے۔

۸۔ شرح : اے محبوب اتیرے بغیر ہمیں اپنے گھر کا آباد رہنا بڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہ آبادی نگاہوں میں کشکٹ رہی ہے اور کشکٹ کا خاتمہ ہی یہ ہے کہ آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ گویا جب ہماری نظر درد دیوار پر پڑتی ہے تو ساقی ہی رونما آجاتا ہے۔ رونے کا سبب خود بیان کر دیا، یعنی محبوب کے بغیر گھر نظروں میں کشکٹا ہے لیکن درد دیوار کو دیکھ کر ہمیشہ رونے سے یہ مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے کہ مسلسل رونا اور آنسو بہانا آخر اضمیٰں بہاے جانے گا اور درد دیوار بہ جائیں گے تو گھر آباد نہیں رہے گا، برابر جو رہا ہے گا۔ گویا گھر کا برا انجام بھی رونے کا ایک سبب بنا۔

۹۔ شرح : سیلاب آرہا ہے اور اس کے آنے کی خوشی میں درو دیوار پر جو بخودی طاری ہو گئی ہے، اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھیے میں یہ سمجھ لیجے کہ انہوں نے سراسر تانپنا شروع کر دیا ہے۔

درو دیوار کے سرسبز تاجنے سے عیاں ہے کہ سیلاب نے فیادیں ملا دیں اور ایک ایک چیز پریم متزلزل ہو کر گر رہی گئی۔ گو یا سیلاب گھر میں جو کیفیت پیدا کر سکتا تھا وہ عملی شکل اختیار کر گئی۔

۱۰۔ شرح : اے غالب! تو راز محبت کسی سے بیان نہ کر، کیونکہ دنیا میں کوئی بھی اس راز کو چھپائے رکھنے کا اہل نہیں اور کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، ہاں درو دیوار کو قابل اعتماد سمجھا جاسکتا ہے، لیکن ان سے بات چیت کا فائدہ کچھ نہیں۔ کیونکہ وہ سنتے ہیں، نہ بیان کر سکتے ہیں۔

یہ جو ماحول نے کہا ہے : ”دیوار ہم گوش دار وہ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ واقعی دیوار کے کان ہوتے ہیں، بلکہ یہ راز کو چھپائے رکھنے میں مبالغے کی ایک صورت ہے۔“

گھر جب بنایا ترے در پر، کبے بغیر
ہانے گا اب بھی تُو نہ برا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جاؤں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر؟
کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
یوے نہ کوئی نام، ستمگر کہے بغیر

۱۔ شرح : میں جب کبھی
محبوب کو اپنے گھر آنے کی دعوت
دیتا تھا تو وہ جواب دیتا کہ ہم نہیں
جانتے، تیرا گھر کہاں ہے؟ آخر
مجبور ہو کر میں نے محبوب کے دروازے
پر دھوئی رسالی اور وہیں گھر بنا
لیا۔ کہتے ہیں کہ اے محبوب! تجھ
سے اجازت لیے بغیر تیرے دروازے
پر گھر بنا لیا ہے، لیکن تیرے تعلق
اور بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ جب

تک بتاؤں، یہ میرا گھر ہے،
تجھے اس کا پتہ نہ چلے گا اور تو نہ
جانے گا کہ یہ میرا گھر ہے۔

۲۔ شرح : جب تک

مجھ میں بات کرنے کی تاب و توان
ہتی، میں مالِ دل نہاتا تھا اور
محبوب کو اس پر کوئی توجہ نہ ہتی۔

خود اس نے کہیں پوچھا ہی نہیں
کہ خستہ و در ماندہ عاشق کا حال

کیا ہے۔ اب صنف اور ناتوانی

کے باعث مجھ میں بات کرنے کی

بھی قوت نہ رہی اور اس نے

میرے حال سے بے خبر رہنے

کے لیے یہ ترش ترشیا یا بہانہ پیش

کر دیا کہ میں بتانے بغیر کسی کے

دل کی بات کیونکر جانوں؟ تم

کچھ کہو تو مجھے معلوم ہو کہ کیا چاہتے

ہو؟ حالانکہ جانتا ہے، مجھ میں کچھ

کہنے کی طاقت ہی نہیں۔ محبوب کی طرف سے یہ انتہائی ستم ظریفی ہے۔

۳۔ شرح : تقدیر سے میرا معاملہ ایسے محبوب کے ساتھ آ پڑا ہے، جس

کا نام لیتے وقت ہر شخص اسے شکر کہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو محبوب دنیا بھر کے نزدیک ظالم و شکر ہوا، اس سے عاشق کی

کوئی امید کیونکر آ سکتی ہے؟

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے لوگ نہ ہم

سہر جائے یا رہے، نہ رہیں پر اکھے بغیر

پھوڑوں گائیں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا

پھوڑے نہ خلق، گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، اُسے گفتگو میں کام

چلتی نہیں ہے دشمن و خضر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو

جنتی نہیں ہے بارہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہوا اتفاقات

سنا نہیں ہوں بات، کمزور کہے بغیر

غالب! نہ کہ حضور میں تو بار بار عرض

ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر اکھے بغیر

کہنے کی طاقت ہی نہیں۔ محبوب کی طرف سے یہ انتہائی ستم ظریفی ہے۔

۴۔ شرح : تقدیر سے میرا معاملہ ایسے محبوب کے ساتھ آ پڑا ہے، جس

کا نام لیتے وقت ہر شخص اسے شکر کہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو محبوب دنیا بھر کے نزدیک ظالم و شکر ہوا، اس سے عاشق کی

کوئی امید کیونکر آ سکتی ہے؟

۴۔ **شرح :** ہم غاموش ہیں تو یہ سبب نہیں کہ کسی سے ڈرتے ہیں یا اپنا کرکٹ جانے کا خوف ہے، ہرگز نہیں۔ ہمارے دل میں کوئی چیز ہے ہی نہیں، ورنہ ہم دُھن کے ایسے پکتے اور سر پھرے ہیں کہ جان بھی چل جائے تو سچ کہہ دینے میں کبھی تاثر نہ کریں گے۔

۵۔ **شرح :** میں اپنے محبوب کو جسے ساری دنیا بُتِ کافر کہتی ہے، پوجنا ہرگز نہ چھوڑوں گا، براہِ اس کی پرستش میں میں مصروف رہوں گا۔ اگر دنیا اس پر مجھے کافر قرار دینے میں بھی تاثر نہ کرے تو کچھ پروا نہیں۔ میری پرستش کا سلسلہ بدستور قائم رہے گا۔

یہ ثابت قدمی اور وفاداری کی آخری حد ہے کہ اپنے محبوب کے مقابلے میں بڑی سے بڑی آفت جھیل لینے میں بھی ہرگز تاثر نہیں۔

۶، ۷۔ **لغات :** دشمنہ : کٹار۔ خنجر
ولے : دلیک کا مختلف، لیکن، مگر۔

مشاہدۂ حق : ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار دیکھنا۔

شرح : اگرچہ ہمارا مقصد ناز و غمزہ کا ذکر ہوتا ہے، لیکن باتِ چیت کرتے وقت ہم ان کے لیے کٹار اور خنجر کی اصطلاحیں استعمال کیے بغیر مطلب واضح نہیں کر سکتے۔

جیشک ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار دیکھنے کا معاملہ ہو، مگر جب اسے معرضِ بیان میں لائیں گے تو شراب اور ساغر کا ذکر کیے بغیر بات نہیں بنے گی۔

ان دو شعروں میں مرزا غالب نے یہ حقیقت انتہائی خوش اسلوبی سے واضح کی ہے کہ حقیقت کا اظہار محاذ کا لباس اختیار کیے بغیر ممکن نہیں اور جو چیزیں نظر نہیں آتیں یا حواس کے ذریعے سے ہم ان کا ادراک نہیں کر سکتے، انہیں مشہود و محسوس چیزوں کے رنگ میں پیش کیے بغیر دل کی کیفیت واضح نہیں ہو سکتی۔ دیکھیے ناز و غمزہ کا ذکر آئے گا تو تشبیہ یا استعارے میں کٹار اور خنجر کہ کر کام چلائیں گے، حقیقتاً ناز و غمزہ

وہی کام انجام دیتے ہیں، جو کنار اور منجر سے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رومانی
الوار یا محبت باری قتانی کے معاملات پوری طرح واضح کرنے کے لیے بارہ و ساغر
سے کام لیا جاتا ہے، کیونکہ ان الوار کی کیفیت معنوی اعتبار سے شراب سے ملتی جلتی
مرزا نے دوسری جگہ یہی حقیقت ایک اور انداز میں پیش کی ہے :

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

۸۔ لغات - التفات : توجہ۔ لطفت و کرم

شرح : یہ شعر دراصل ایک قصے کا آخری حصہ ہے جو مرزا کے اسلوب
بیان سے بے تکلف سامنے آ جاتا ہے۔ مرزا اور محبوب کے درمیان گفتگو جاری ہے
مرزا اپنا حال بیان کرتے ہیں، محبوب کہتا ہے : ”کیا کہتے ہو، ہماری سمجھ میں کچھ نہیں
آتا“ پھر محبوب کوئی بات کہتا ہے تو مرزا کی سمجھ میں نہیں آتی۔ دوبارہ پوچھتا ہے
ہے تو محبوب جواب دیتا ہے : ”ہرے ہو کہ بار بار پوچھتے ہو ؟ یہ سن کر مرزا کہتے ہیں
کہ اگر میں بہرا ہوں تو چاہیے، آپ کی توجہ اور لطفت و لوازش مجھ پر دو چند ہو جائے۔
کیونکہ جب تک بات بار بار نہ کہی جائے، میں بہرا ہونے کے باعث اسے سمجھ نہیں سکتا۔

۹۔ شرح : حضور سے مراد ابو ظفر بہادر شاہ ہیں۔ کہتے ہیں اسے غائب ! تو
بادشاہ سلامت کے حضور بار بار کیوں گزارشیں پیش کر رہا ہے ؟ کیوں کر رہا ہے کچھ
پرخاص توجہ فرمائیے، میرے پاس فلاں چیز نہیں ہے، فلاں شے کی ضرورت ہے،
فلاں تکلیف ہے، فلاں پریشانی ہے، تیرا تو پورا حال کبے بغیر ہی حضور پر واضح ہے۔
یہ شعر بیان کی لذت کا ایک دلکش مرقع ہے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن
وہ سب کچھ کہہ دیا ہو کہا جاسکتا تھا۔ یہ اجمال ہر اس تفصیل پر حاوی ہے، جس کی
سمانی ایک خیمہ و فتر میں بھی دھو سکے۔

کیوں جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھ کر
 جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
 آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
 سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
 کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
 رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
 آتا ہے میرے قتل کو، پر جوش رشک سے
 مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
 ثابت ہوا ہے گردن مینا پر خونِ خُلق
 لرزے ہے موجِ نئے تری رفتار دیکھ کر
 وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
 ہم کو حرمیں لذت آزار دیکھ کر
 پک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
 لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر
 زنار باندھ، شجرِ صد دانہ توڑ ڈال
 دہر و چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

۱۔ شرح : یں محبوب
 کے رونے دل افروز کی آبِ دیا
 دیکھ کر جل کیوں نہ گیا، میرے
 لیے صبحِ راستہ ہی تھا کہ عشق میں
 فنا حاصل کرنے کا جو مقام سامنے
 آیا تھا، اسے طے کر لیا اور
 جل کر خاکِ سیاہ ہو جاتا۔ اب
 میرے نہ جل مرنے کا نتیجہ نکلا
 ہے کہ اپنی تاب دیدار پر رشک
 سے جل رہا ہوں اور پہلی ناصافی
 کی سزایوں، محبتِ رہا ہوں۔
 مرزا غالب نے مضامین
 شراب کی طرح رشک کے معذرت
 میں بھی وہ کمال کیا ہے، جس کی
 مثال شاید ہی کسی دوسرے شاعر
 کے ہاں مل سکے۔ ان میں سے ایک
 شعر یہ بھی ہے اور اس غزل
 نیز آئندہ غزلوں میں ایسے کئی
 مضامین آئیں گے، لیکن ایک
 حقیقت واضح کر دینی چاہیے
 کہ بیشک ہم ایسے مضامین کو
 رشک سے تعبیر کرنے میں حق
 بہ جانب میں، تاہم عشق کے مقام

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
 جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر
 کیا درگاہاں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
 غوطی کا عکس سمجھ ہے، زنگار دیکھ کر
 گرئی تھی ہم پر برقِ تجلی، نہ طور پر
 دیتے ہیں باد، غروبِ قدحِ خوار دیکھ کر
 سرسبز ٹنڈو غائبِ شوریہ سماں کا
 یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر
 شش سوں کو معلوم ہے کہ عشق میں
 ایک قدر عاشق پر ایسا بھی طاری
 ہوتا ہے، جب وہ اپنا آئینوں
 اور امازون کو بھی محبوب کے
 مقابلے میں پس پشت ڈال دیتا
 ہے اور محبوب ہی اس کے پیش نظر
 رہ جاتا ہے، یہ عشق و محبت کا
 انتہائی مقام ہے کہ دوسروں
 کا محبوب کو دیکھتا تو ایک طرف
 اپنا دیکھتا بھی گوارا نہیں،
 جو آگوار مرزا نے محبت کے
 اس خاص مقام کی بات کی ہے۔

اگرچہ ہم اپنی اصطلاحات کے مطابق اسے رنگ ہی کہیں گے۔

مرزا نے ایک اور نغز میں بھی یہ معنوں باندھا ہے :

دیکھنا قسمت کو آپ اپنے پر رنگ آجانے ہے

میں اُسے دیکھوں، جدا کب مجھ سے دیکھا جانے ہے

۲۔ شرح : چونکہ میں رات دن ایسے نامے سر کرنے میں سرگرم رہتا ہوں جن سے شے ہستے ہیں، اس لیے اہل جہاں نے مجھے آتش پرست قرار دے لیا ہے۔ یعنی اس فرقے کا آدمی، جن کے نزدیک دنیا کا مقدس ترین عنصر آگ ہے اور وہ اسی کی پرستش میں سرگرم رہتے ہیں۔

آتش، سرگرم اور شرور باری کی رعایت محتاج تفسیر نہیں۔

۳۔ لغات - بے سبب آزار : بے وجہ تانے والا، بے سبب اذیت

پہنچانے والا۔

شرح : جہاں جو روح جفا عام ہو جائے، کوئی وجہ، کوئی سبب اور کوئی علت پیش نظر نہ رہے، وہاں عشق کی آبرو کیونکر قائم رہ سکتی ہے؟ اسے محبوب! میں تجھے بے دم اور بے سبب ستانے والا پاتا ہوں، اس لیے تدریب میں چڑجاتا ہوں کہ آیا محبت کے واسطے میں تجھے قدم آگے بڑھانا چاہیے؟

عاشق کے نزدیک محبوب کی طرف سے جو روح جفا کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے اور وہ خود عشق ہے نیز عاشق محبوب کے لطف و فوازش ہی نہیں، بلکہ جو روح جفا کو بھی صرف پانا حق سمجھتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو اس میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں، ایسی جب محبوب سرکس و ناکس پر یکساں جو روح جفا شروع کر دے۔ اہل ہوس کو بھی اسی طرح ظلم و ستم کا تجربہ مشق بنائے، جس طرح عاشق ہمیشہ تیار رہتا ہے تو عشق کے لیے اقیاد کی کون سی وجہ باقی رہی؟ اس کی عزت و آبرو اور یکساں کیونکر برقرار رہ سکتی ہے؟ اس صورت حال نے عاشق پر ثائق کی کیفیت ظاہر کر دی۔

شعر کی ایک خوبی اس کی عمومیت و آفاقیت ہے، یعنی مضمون صرف عام عشق تک محدود نہیں، بلکہ اسے سیاست میں بھی بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے اور مرزا غالب کے اکثر اشعار کا ایک اقیانوس پہلو یہ بھی ہے۔

۴۔ شرح : محبوب میرے قتل کے لیے شمشیر سمیت آ رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی جنگ اس لیے جوش میں آگیا کہ محبوب کا ہاتھ میری گردن میں شامل ہونا چاہیے تھا، اس میں تلوار کیوں پہنچ گئی؟ لطف یہ کہ ابھی قتل کی ذبت نہیں آئی، بلکہ ہی عاشق کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔

لفظی مناسبتیں تشریح کی محتاج نہیں۔

۵۔ لغات - گردن مینا : صراحی کا بالائی حصہ نچلے حصے کے مقابلے میں تنگ

ہوتا ہے، جیسے بوتلوں میں اور پرکا حصہ تنگ ہوتا ہے، اسے صراحی کی گردن کہتے ہیں۔

شرح : تو نے شراب پی کر عالم سرور میں ایسی مستانہ حال اختیار کی کہ خلعت کا خون ہو گیا۔ مینا پر نظر ڈالنے میں تو تیری چال سے اس پر لڑہاڑا رہا ہے۔ وہ اس لیے

کہ نہ تو شراب پیتا، نہ تیری چال میں معلق خود اکا خون کر دینے والی مستی پیدا ہوتی۔ گویا خلق خدا کا خون تیری شراب نوشی کا نتیجہ ہے اور اس خون کا دعویٰ مینا کی گردن پر ثابت ہو گیا۔ اس کی سوچ کے رز نے سے اس دعوے کا ثبوت ہم پہنچ گیا۔ مین وہ عزت سے کانپ رہی ہے کہ آخر میں مجرم ٹھہری۔

۶۔ لغات - واحسرتا: انتہائی حسرت و امنوس کا کلمہ۔

شرح: انتہائی حسرت و امنوس کا مقام ہے کہ جب محبوب نے دیکھا ہم

اس کے ظلم و ستم اور ایذا سے لذت اٹھا رہے ہیں اور اس لذت کے ہم بہت دلدادہ ہیں تو اس نے غم و ستم سے ہاتھ اٹھالیا اور بیدار ہو جفا ترک کر دی۔

انسان طبعاً لطف و نوازش پسند کرتا ہے اور جو درد و ستم سے گریز اس رہتا ہے،

لیکن عاشق اپنے آپ کو جو درد و ستم کا خوگر بنا لیتے ہیں اور معشوق کی طریت سے جو دکھ

اٹھیں پسپتا ہے، اس میں غاس لذت پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے یہ جو درد و ستم کا رنگ

جانا انتہائی دکھ کا باعث ہے، مگر وہ دکھ نہیں جس میں لذت لے۔ مرزا کے انتہائی

حسرت و امنوس کا اصل سبب یہی ہے۔

۷۔ لغات - حیار: کسوٹی۔

شرح: ہم اپنے کلام کے ساتھ خود خریدار کے ہاتھ پک جاتے ہیں، یعنی اس

کے دلدادہ ہو جاتے ہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ خریدار کی طبیعت کی کسوٹی کا اندازہ

ہو جائے۔ یعنی یہ جانچ لیں کہ اسے کھرے کھوٹے کی تیز ہے یا نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو ہمیں ہمارے کلام کا خریدار ہوگا، سخن شناس اور قدروانی میں

اس کا پایہ بلند ہونا چاہیئے۔ ایسے باکمال خریدار کے ہاتھ بکنے میں ہمیں کیا تامل ہو سکتا

ہے؟ وہ ہمارا کلام نہیں، بلکہ خود ہمیں مول لے لیتا ہے۔

۸۔ لغات - گرتار: جینو۔ وہ ٹٹا ہوا دھماکا۔ جو ہندو اور آتش پرست لوگ

گلے میں آڑا تر چاڑا رہتے ہیں اور اسے مذہبی نشان سمجھا جاتا ہے۔

تفسیر: صد دانہ: بیج جس میں ایک نو دانے ہوتے ہیں۔

شرح : توڑ تار بہن کے اور سہ اولوں کی قبیح توڑ کر پیٹک دے، کیونکہ راستہ چلنے والا یعنی مسافر سبب صاف اور سہوار راستہ پسند کرتا ہے۔ وہ راستہ پسند نہیں کرتا جس میں اونچ نیچ اور نشیب و فراز ہوں۔

اس شعر میں دو باتیں خاص توجہ کی محتاج ہیں :

- ۱۔ قبیح کے مانے بھی دھاگے ہی ہیں پوئے جاتے ہیں، جب اسے پھیرا جائے تو سہرا نہ ایک لہدی بن جاتا ہے، پھر دوسرے مانے تک نشیب آ جاتا ہے اور یہی سلسلہ آخر تک جاری رہتا ہے، اس وجہ سے قبیح کا راستہ نشیب و فراز والا راستہ ہو گیا، جس میں قدم قدم پر اونچ نیچ ہے اور مسافر کو ایسا راستہ پسند نہ کرنا چاہیے۔
- ۲۔ اگر قبیح توڑ کر دانے نکال دیے جائیں تو اصل رشتہ نہ تار سے مشابہ ہو جاتا ہے۔

یہی قبیح کا توڑنا ہی راستے کو نشیب و فراز سے پاک کر دیتا ہے۔

۹۔ شرح : میرے پاؤں میں چھپاے پڑ گئے تھے اور میں سخت گھبرا رہا تھا کہ ان کا کیا علاج ہو۔ یکایک سامنے کانٹوں بھرا راستہ آ گیا۔ دل خوش ہو گیا کہ اب چھپاؤں کا علاج ہو جائے گا۔ یعنی اس بات کا شے جنھیں گے اور پانی نکل جائے گا۔ تو چھپاے دب جائیں گے۔

طعن کی بات یہ ہے کہ ایک دکھ دینے والی چیز کا علاج دوسری دکھ دینے والی چیز سے کیا ہو سکتا ہے؟ ایذا پہنچا دیتی ہے کہ وہ اپنے لیے سہل اور راحت بخش طریقہ اختیار کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے ہیں۔

۱۰۔ شرح : دیکھیے، محبوب مجھ سے کس قدر بدگمان ہے کہ میرے فولادی آئینے میں رنگ لگ گیا، جس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ محبوب نے سمجھ لیا کہ یہ تو طوطی کا عکس ہے کیونکہ اس کا رنگ بھی سبز ہوتا ہے۔

بدگمانی یہ ہوتی کہ محبوب نے سمجھ لیا، میری محبت میں کیسوی اور یک جہتی نہیں، بلکہ مجھ نے طوطی میں بھی ہل رکھا ہے۔

طوطی اور آئینے کی مناسبت قدرے تشریح کی محتاج ہے، طوطی کو بولنا سکھانے

کے لیے آئینہ رکھ لیتے تھے اور اس کے سامنے طوطی کا پتھر رکھ دیتے تھے۔ لکھناے^{۱۱} آئینے کی پشت پر بیٹھتا تھا۔ درمیان میں چھوٹا سا پتھر رکھ لیتا تھا۔ پتھے کے ذریعے سے جو کچھ بولنا، طوطی آئینے میں عکس دیکھ کر سمجھتا کہ کوئی دوسرا ہم جنس بول رہا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی ہم جنس کی نقل شروع کر دیتا اور اس طرح بولنا سیکھ جاتا۔ اس شعر سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ عاشق نے محبوب کے گمان کے مطابق کسی اور سے بھی رشتہ محبت وابستہ کر رکھا ہے۔

۱۱۔ لغات - تجلی : ذات باری تعالیٰ کا جلوہ جو حضرت موسیٰ کو طور پر دکھایا گیا تھا۔

طور : جزیرہ، مانے سینا کا مشہور پہاڑ، جس کی چوٹی پر حضرت موسیٰ نے ذات باری کا جلوہ دیکھا تھا، نیز انہیں قرأت کے دس احکام ملے تھے۔

ظرف : صافیت، تابعدیت۔

قدح خوار : پیالہ پینے والا یعنی میکش، شراب نوش۔

شرح : ظاہر ہے کہ شعر یہ برقی تجلی کو شراب سے تشبیہ دی گئی ہے اور طور شاعر کے تصور کے مطابق ایسا شراب نوش ہے، جس کا ظرف یعنی صلاحیت عالی نہیں۔ دیکھیے ۱۔

جنتی نہیں ہے بادہ وساغر کیے بغیر

کی کتنی عمدہ مثال سامنے آگئی۔

خواہر حالی فرماتے ہیں :

”اس شعر میں اُس آیت کے معنوں کی طرف اشارہ ہے کہ ”ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اس کے مستحق نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھالیا“ شاعر کہتا ہے کہ برقی تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کہ کوہ طور، کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق شراب دی جاتی ہے، پس کوہ طور، جو

منجد جہادات کے ہے، وہ کیونکر تختی الہی کا مستقل ہو سکتا ہے ؟
آخر میں فرماتے ہیں، یہ خیال بھی بچ اس تشبیل کے جو اس میں بیان ہوئی۔
بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے ۔

خواجہ صاحب کی تشریح میں کسی انسانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن یہ عرض
کر دینا چاہیے کہ طور تختی کا مستحق نہ تھا، اس لیے پھٹ گیا۔ یعنی جو شراب اسے ملی وہ
اس کے طوف سے بہت زیادہ تھی، البتہ ہم پر وہ بجلی گرتی تو اسے برداشت کر سکتے
تھے۔ یہاں ہم سے مراد مرزا غالب نہیں، بلکہ نوبع انسانی ہے۔ اس شعر سے مرزا نے
تمام مخلوقات پر نوبع انسانی کے اشرف و اعلیٰ ہونے کا روشن ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

۱۲۔ لغات۔ مشوریدہ حال : پریشانی حال۔ دیوانہ۔

شرح : اسے محبوب! میں نے نیری دیوار دیکھی تو یاد آ گیا کہ میں دیوار تھی
جس سے پریشانی حال اور دیوانہ غائب نے سر پھوڑا تھا۔

وہ تھے دو باتوں کا اظہار مقصود ہے، اول یہ ایک مشہور و معروف واقعہ ہے
جو پیش آیا، دوم اس سے پورے واقعے کی یاد تازہ کرنا مقصود ہے۔ شعر میں خوبی
کا ایک پہلو یہ ہے کہ دیوار بیشک محبوب کی تھی، لیکن اس کے سلسلہ میں جو واقعہ سب
سے بڑھ کر قابل ذکر پیش آیا، وہ غالب کا سر پھوڑنا تھا، لہذا دیوار دیکھتے ہی ذہن
سب سے پہلے اس واقعے کی طرف منتقل ہوا۔

○

۱۔ شرح : میرادل

روشن سویرج کی تکلیف و زحمت
پر کانپ رہا ہے۔ میں اہل کی
وہ بوند ہوں، جو بیابان کے
کانٹے کی ٹوک پر ہو۔

لرزتا ہے مرا دل، زحمت مہر و رخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبہم، جو ہوشیار بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

مطلب یہ ہے کہ شبہم

فنا تعلیم درس بے خود می ہوں، اُس زمانے سے
 کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستان پر
 فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
 بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نکداں پر
 نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
 کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہرِ حنواں پر
 مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود، یاد آیا
 کہ فرقت میں تری، آتشِ برستی تھی گلستاں پر
 بجز پردازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
 قیامت اک ہوائے تند ہے، خاکِ شہیداں پر
 نہ ٹامسح سے غالب کیا ہوا، گر اُس نے شدائی
 ہمارا بھ، تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر
 سکتا، کانٹے کو ذرا سی جنبش ہوگی تو قطرہ گر جانے گا، لہذا ایسی بے حقیقت چیز کے
 لیے سودج کو تکلیف اٹھانے کی کوئی حاجت نہیں۔

کی اس حقیر لوند کے لیے
 سودج جیسے عظیم القدر وجود
 کو زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت
 ہے اور لوند بھی ایسی، بو
 صحرا کے کانٹے کی نوک پر
 ہو، سودجِ شبنم کو جذب
 کرنے کے لیے اپنی شادیں
 پھیلاتا ہے، جو حرارتِ پنیہ
 کو شبنم کو اڑا لے جاتی ہیں،
 لیکن شاعر کہتا ہے کہ جو قطرہ
 شبنم خارِ بیاباں پر ہے، اس
 کے لیے زحمت اٹھانا کس
 بنا پر گوارا کیا جائے؟
 اس سلسلے میں دو ہیہ قابلِ
 غور ہیں۔

۱۔ شبنم کا جو قطرہ کانٹے
 کی نوک پر ہو، وہ زیادہ
 دیر تک اپنی جگہ ٹھہر نہیں
 سکتا، کانٹے کو ذرا سی جنبش ہوگی تو قطرہ گر جانے گا، لہذا ایسی بے حقیقت چیز کے

۲۔ جو قطرہ کانٹے کی نوک پر ہو، وہ ہر لحظہ کا پناہ جتا ہے، کیونکہ اس کا مقام
 بے حد تنگ اور ٹھیکڑا ہوتا ہے۔ جو قطرہ چٹوں پر ہو، اس کی کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ مرزا
 نے لڑتا ہے مراد "کھینٹے وقت نوک خار کے قطرے کی یہ کیفیت بھی پیش نظر رکھتی۔"

گو یا رزقے کے، مضموم ہونے، اول فطرے کی حالت کا عام نقشہ، دوم اس کی مضمومی پریشانی جو، حج کی تکلیف سے پیدا ہوتی۔

شعر میں اسی مضموم کی بے انتہی و مبدائے حقیقی کی عظمت و استواری کا اظہار کرتے ہوئے تباہ کردہ رحم و کرم ذات اولیٰ اسے اولیٰ اور حقیرے حقیر شے کے معاملات پر بھی کبھی نگاہِ لطیف و گہنی ہے۔

۲۔ لغات۔ خاندان آرائی : لکھ کی آرائش۔

سفیدی : یہاں، اس کے دو مضموم ہیں، اول وہ سفیدی، جو لکھ کی آرائشی اور آرائش کے لیے عموماً کی جاتی ہے، دوم وہ سفیدی، جو حضرت یعقوب کی آنکھوں میں حضرت یوسف کی جدائی پر روتے روتے پیدا ہو گئی تھی۔

تشریح : حضرت یوسف قید خانے میں پہنچ گئے، لیکن وہاں بھی انہوں نے منزل کو سہانے اور سنوارنے کا شیوہ قائم رکھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت یعقوب کی آنکھیں جو روتے روتے سفید ہو گئی تھیں، اپنے محبوب فرزند کی داخل میں قید خانے کی دیواروں پر چہرہ ہی تھیں۔ اسی کو عام سفیدی قرار دیتے ہوئے مرزا نے خاندان آرائی کا ثبوت پیش کر دیا۔

۳۔ لغات۔ فنا تعلیم : فنا کی تعلیم پایا ہوا۔ وہ شخص جو فنا کی تعلیم حاصل کر چکا ہو۔

دوسری بیخودی : اپنے آپ سے بے خبر ہو جانے کا سبق۔

لام الف : لا جو عربی میں حرف نفی ہے اور یہاں اسے فنا کی دلیل بنایا گیا۔

دبستان : ادبستان کا مخفف۔ کتب۔ تعلیم پانے کی جگہ۔

تشریح : میں بیخودی کا سبق لیتا ہوں اس زمانے سے فنا کی تعلیم پائی ہوئی

جب مجھوں یعنی قیس عامری ابھی کتب کی دلیوار پر لام الف کہنے کی مشق کر رہا تھا شعر میں مجھوں پر اپنی فضیلت و سبقت ظاہر کی ہے، لیکن کمال یہ کیا کہ کتب میں پڑھنے والے بچوں کا عام طریقہ بطور خاص پیش نظر رکھا۔ وہ جب فتور بہت کسا

سیکھتے ہیں تو کوئی یاد رکھنا مشق کے کر لیجئے جوئے حروف دیواروں پر لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور سب سے بڑا کر کتب ہی کی دیواریں ان کا تھنہ مشق جتنی ہیں پھر محض سے ابجد نہیں لکھوائی، بلکہ لام الف کھوایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ مجنوں نے فنا کا صرف ابتدائی سبق لیا تھا، جب میں پوری تعلیم پا کر فراغت حاصل کر چکا تھا۔

۴۔ لغات - تشویش : رنج، محنت، پریشانی، ترقو، دوڑ و دوپ۔

بارہ ہائے دل : دل کے ٹکڑے۔

شرح : اگر میرے دل کے ٹکڑے نکلداں پر صلح کر لیتے، یعنی سب اس امر

پر راضی ہو جاتے کہ ان پر نیک چہرہ کا جاتا۔۔۔ ہے تو کتنا اچھا ہوتا؟ میں مرہم کے لیے دوڑ و دوپ اور ترقو سے بالکل فارغ ہو جاتا، لیکن دل کے ٹکڑوں کو نیک چہرہ کے سے ایسی لذت ملی کہ ان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے سخت جھگڑے شروع ہو گئے۔ ہر ٹکڑا یہ کہنے لگا کہ سارا نیک مجھے ملنا چاہیے۔ اس لڑائی جھگڑے کو ختم کرنے کی ایک صورت یہ نظر آئی کہ ان ٹکڑوں کو نیک کی لذت سے محروم کر دیا جائے، لہذا مرہم کی تلاش کا خیال آیا۔

دماغ رہے کہ شاعر نے مرہم تلاش نہیں کیا بلکہ دل کے ٹکڑوں کو اس لذت سے محروم کر دینے کی ایک تدبیر سوچی، جس نے ان کے درمیان مدد و مد کش کش اور کھینچ پکھنچ پیدا کر دی تھی اور شاعر کے لیے زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ گویا یہاں بھی بنیادی چیز ایذا الہی کے سوا کچھ نہ تھی۔

۵۔ لغات - طومار : کاغذ کا ٹٹھا، نامہ، دفتر۔ یہ لفظ ان خطوں کے لیے

بھی استعمال ہوتا تھا، جنہیں دفتر کی شکل میں مرتب کر لیتے تھے یا جوڑ جوڑ کر ایک لمبا کاغذ تیار کر لیتے تھے، جسے گول کر کے چونگے یعنی بانس یا ٹیٹن کے خول میں رکھتے تھے، مقصود یہ ہوتا تھا کہ بچوں کو وہ خط پڑھائے جائیں تاکہ وہ مختلف وضع کے رسم، لفظ اور اسلوب تحریر سے آگاہ ہو جائیں۔ ضروری کاغذات کے رجسٹروں یا دفتروں کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل تھا۔

پشت چشم : چشم پوشی، آنکھ پھیر لینا۔

ٹھہر : یہاں صرف یہ حقیقت ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ٹھہر کی شکل فی الجہد آنکھ سے ملتی جلتی ہے۔

شرح : محبت و الفت کی ولایت میں تازہ انداز اور حسنیوں کی ادائیگی کا کوئی ایسا طرار یا صیغہ یا دفتر موجود نہیں جس کی پیشانی پر چشم پوشی ہے مگر یہاں چھوٹی کی طرف نسبت ہو۔

مطلب یہ کہ محبت کی رسم و راہ میں محبوب جو کچھ بھی کرتے ہیں، وہ عاشقوں سے ملتی جلتی ہے پروائی اور تعامل کے سوا کچھ نہیں جوتا۔ یہ اس مقام کی عام رسمیں ہیں اور ان پر کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے، لیکن سچے عاشقوں نے ہمیشہ یہ سب کچھ برداشت کیا ہے اور یقیناً برداشت کرتے رہیں گے۔

۶۔ لغات - ایر شفق آلود : وہ بادل جس پر آفتاب کے طلوع و غروب کی شاعروں سے سرخی چھا گئی ہو۔

شرح : اب میں نے شفق کی سرخی سے عالم نام ابر کو دیکھا تو یاد آگیا کہ جب اسے محبوب! میں تجھ سے جدا تھا تو باغ پر آگ برس رہی تھی۔

مولانا طہطائی نے بالکل بجا فرمایا کہ لفظ "اب" اس شعر میں کثیر المعنی ہے یعنی یہ کہنا کہ اب یاد آ رہا ہے کہ پہلے یہ بات بھولی ہوئی تھی۔ عاشق نے پھر اس صدمے اٹھائے، وہ محبوب کو دیکھ کر انتہائی خوشی اور محبت میں سب کے سب یاد نہیں رہ سکتے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد ایک ایک چیز یاد آ رہی ہے اور لطف یہ کہ کوئی شک کوئی دو شک منظر دیکھ کر ہی پرانی یادیں تازہ ہوتی ہیں اور پتا چلتا ہے کہ جو مناظر ہر لمحہ سے دلگیر تھے، محبوب کی جدائی میں وہ بھی سراسر رنج و مصیبت اور دھڑکی و دلہری کا باعث بن گئے۔ مثلاً یہی شفق کا منظر، جب وہ بادلوں پر چھا جاتی ہے، کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب محبوب سے جدائی تھی تو یہی منظر، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باغ پر آسمان سے آگ برس رہی ہے۔

اس شعر سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ گرد و پیش سے مناظر کی دلاؤ دہری سہائے خود کو فی خاص حیثیت نہیں رکھتی بلکہ سب کچھ انسان کی دلی کیفیت پر موقوف ہے۔ اگر وہ خوش ہے تو غیر دلچسپ مناظر سے بھی شادمانی کے اسباب پیدا کرے گا۔ اگر وہ ناخوش، رنجیدہ اور مصیبت زدہ ہے تو بہتر سے بہتر منظر بھی اس کے لیے سوزش اور جلن کا باعث ہو گا۔

شعراء ابرہ شفق آلود کے لیے عالم رنج و غم میں گھلتاں پر آگ برسنے سے تشبیہ دینا بدیع تشبیہ ہے۔ یعنی جو شے اس عالم اسباب میں زیادہ سے زیادہ محنت افزا ہے اور بھی آتش باری کا مرکز معلوم ہوتی ہے۔ ۱۔

۷۔ **شرح :** شہید قبروں میں جا سونے۔ ان کے جسم مٹی میں مل گئے۔ قیامت کے دن مردے زندہ کیے جائیں گے، لیکن شہیدوں کی خاک میں اس کے سوا کیا باقی رہ گیا ہو گا کہ جلوہ سرا پائے کے شوق میں انتہائی بے قرار ہو، لہذا قیامت شہیدوں کی قبر پر سے گزرے گی تو اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ہوا کے ایک تند و تیز بھونکے کی سی ہوگی، جو اس خاک کو اٹا لے گا۔ جو پہلے ہی ناز و محبوب کے شوق میں ہمدانگ کے لیے بیکراں ہے۔

حق یہ ہے کہ اس قسم کے بے رحم حقیقت شعرا تنے دل پذیر اور پُر تاثیر انداز میں کہتے ہیں۔

۸۔ **شرح :** اسے غائب : اگر نصیحت کرنے والے نے ستم و درشتی سے کام لیا تو اس پر لڑنے کی کون سی وجہ ہے، ہمارے پاس اپنا گریبان ہے، اسے پھاڑ سکتے ہیں اور تار تار کر سکتے ہیں۔ اپنا زور لڑنے پر کیوں صرف کریں، گریبان پر کیوں ڈکائیں؟ کیا اس طرح بھی تسکین کا وہ سامان ہم نہ پہنچے گا، جو ہم ناصح سے لڑ کر ہم پہنچا پا جاتے ہیں؟ اس شعر میں قابل غور نکتہ ہے کہ جس وقت کے مقابلے میں انسان بے دست و پا ہو، اس میں تسکین کے لیے اپنا نقصان کر لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ناصح نے درشت کلام سے کام لیا تو بہر حال

چھاڑ کر اسے بچا سکتے ہیں کہ عشق و محبت کے معاملات۔۔۔ ساری نصیحت پارے لیے بالکل بے حقیقت اور مہرے اثر ہے۔

○ ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشان اُور کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اُور یارب! وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اُور ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو چومو مہر ہے قیرِ مقدر، مگر اُس کی ہے کہاں اُور تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اُنھیں گے لے آئیں گے بازار سے، جا کر دل و جان اُور ہر چند سبکدست ہو سے بُت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سب گراں اُور ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے دوتا ہوتے جو کئی دیدہ و خوشاں نشان اُور مڑتا ہوں اُس آواز پہ، ہر چند سر اڑ جائے جلاؤ کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اُور"

۱۔ نکات - نشان :
میاں اس کے معنی پتا، نکتہ اور جھیر ہیں۔
بسکہ : چونکہ۔
شرح : چونکہ ان کے ہر اشارے میں کوئی اُور ہی نکتہ اور ہی جھیر پایا جاتا ہے، اس لیے وہ محبت بھی کرتے ہیں تو بہارِ خیال و دوسری ہی طرف جاتا ہے۔
یعنی ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں بھی کوئی نہ کوئی چال اور فریب ہے۔
عاشقِ محبوب کی ادائیں دیکھ دیکھ کر اتنا پریشان ہو چکا ہے کہ اس کے دل میں کسی بھی بات کے لیے یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ وہ یقین کا جو ہر ہی کھوپکا ہے، لہذا محبوب بننا ہر محبت بھی کرے تو عاشق کے لیے اطمینان کی کوئی صورت نہیں بنتی۔ بد حال وہ ہے سمجھ سکتا ہے کہ محبت کا خاتمہ

لوگوں کو ہے خود شہید جہاں تاب، کا دھوکا

بہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ ہنساں اُور

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دُوم نہیں

کرتا جو نہ مرنا، کوئی دن آہ و فغاں اُور

پاتے نہیں جب، راہ تو چڑھ جاتے ہیں نامے

وگھتی ہے مری طبع تو جوتی ہے رواں اُور

ہیں اُور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ ”غائب“ کا ہے اندازِ بیاں اُور“

اس لیے کہ ہے۔ ہیں۔ مجھے اپنے

دام میں خوب اچھائیں۔ پھر محبوبانہ

نازد و ناز سے ہری طرح خبریں۔

۲۔ شرح : بظاہر معلوم

ہوتا ہے کہ محبوب سے غلوں میں

ملامت کی درخواست کی جا رہی

ہے، لیکن صاف صاف اور

گھل کر اس لیے نہیں کر سکتے

کہ شاید عتاب نازل ہو۔ اشارہ

کناہوں سے مطلب سمجھا پا جاتے

ہیں اور محبوب سمجھتا نہیں، لہذا

بجود ہو کہ خدا سے دعا کرتے ہیں

کہ اگر مجھے دوسری زبان نہیں مل سکتی، جو اپنا دماغ ٹھیک ٹھیک سمجھا سکے تو محبوب ہی کو

کوئی اور دل دے دے، جو آسانی سے میری بات سمجھ سکے۔

اس شعر کا تعلق محبوب کے ساتھ معامات کی صفائی سے بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی محبوب

نے بعض حرکتوں پر ناراضگی نہ ہر کی، ناشق نے اپنی طرف سے صفائی پیش کی۔ عاشق کھروقت

محبوب کی سمجھ میں نہیں آتا اور عاشق پریشان ہو کر کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھے دوسری زبان

نہیں مل سکتی تو محبوب ہی کو دوسرا دل دے دے۔

خواجہ عاتق فرماتے ہیں کہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے، مگر اس میں درحقیقت

ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم سمجھتے تھے۔

اس صورت میں مرزا کی مراد یہ ہے کہ اگر لوگوں نے میری باتیں سمجھیں، افسانہ

بھی ان سے سمجھنے کی امید نہیں، کتنی جا سکتی تو خدا کی بارگاہ میں یہی گزارش پیش کی جا سکتی

ہے کہ مجھے دوسری زبان نہیں مل سکتی تو ان لوگوں کو دوسرے دل دے دیے جائیں۔

مشکل و مطلب کے درمیان مبادلہ افکار کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دونوں کے دل و زبان میں اک گونہ مناسبت ہو۔ اگر مناسبت نہ ہوگی تو یہی ہر جہے کہ مبادلے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ مرزا نے شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔

۳۔ لغات - چوند : علاوہ تعلق، جوڑ

مقررہ : ضرور، بالمشبہ، یقیناً۔

شرح : محبوب کی نگاہ تاز کو بھلا ابرو سے کیا تعلق ہو سکتا ہے ؟ یعنی یہ تیر ابرو کی کمان سے نہیں نکل سکتا۔ اس کا تعلق کسی آؤد ہی کمان سے ہے، یہ کسی دوسری ہی کمان سے نکلا ہے اور وہ کمان بنظاہر حسن کی و لغز ہی دو لادیزی ہے، لیکن اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ شعر کی ایک اور خوبی ہے کہ ہر فرد کو موقع دے دیا۔ وہ اپنے احوال و نظرت کے مطابق اس کمان کا تعلق کرے۔

دیکھیے کمان و ابرو اور تیر و نگاہ کی تشبیہ بہت پرانی اور فرسودہ تھی، مگر مرزا نے کمان بہت سے کام لے کر اس میں نئی تازگی اور نیا حسن پیدا کر دیا۔

۴۔ شرح : اے محبوب ! جب تم شہر میں موجود ہو تو ہمیں دل و جان کا کیا غم ہے ؟ کیونکہ جب اٹھیں گے، بازار سے نئے دل و جان خرید لائیں گے، تھکے ہوئے ہر شخص کے لیے دل و جان دو بھر بھرا ہے اور وہ سستے داموں بیچ دینے کے لیے تیار ہیں۔ جو جس بازار میں زیادہ آجائے، اسے وہ مطلب کے اصول کے مطابق وہ اوزاں جو جاتی ہے۔

اس شعر کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دل و جان لینے میں محبوب کی مشاقتی نے اس جس کا بازار آراستہ کر دیا ہے، جہاں یہ بہ کثرت بک رہی ہے۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ محبوب جس شہر میں موجود ہو، وہاں کون اس سے دل و جان بچا کر رکھنے کے لیے تیار ہوگا ؟ سب اس شاعر عزیز کو اٹھائے بہ طور نذر پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔

یہ شاعر کا اسلوب بیان ہے، جس نے اصل موضوع کو اس رنگ میں پیش کر دیا۔

۵۔ لغات - سبکدست : چابک دست، مشاق۔ ماہر

شرح : خواب مائی فرماتے ہیں :

”اس شعر میں سارا زور ”ہم“ کے لفظ پر ہے۔ یعنی جب تک ہماری
 ہستی باقی ہے، اُس وقت تک ماہ معرفت الہی میں ایک اور سنگ گراں
 سہارا ہے۔ پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو
 کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بُت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو ادھوس کے بُت توڑنے میں خوب مشاقی اور مہارت
 حاصل کر لی، جو بھی بُت سلنے آیا ”ا“ سے چکنا چور کر کے رکھ دیا، لیکن خود ہماری ہستی
 کا بُت جو بڑے بھاری پتھر کی حیثیت رکھتا ہے، ہمارا راستہ بدستور روکے ہوئے
 ہے۔ جب تک یہ نہ ٹوٹے اور اس کا قطع قیع نہ ہو، نہ راستہ صاف ہو سکتا ہے نہ ہم
 قدم آگے بڑھا سکتے ہیں اور نہ معرفت کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ تنہا جو ادھوس
 کے بُت توڑتے سے فراغت حاصل نہیں ہوتی اور معرفت کا راستہ نہیں کھلتا کیونکہ
 جب تک ہم موجود ہیں، جو ادھوس کا سلسلہ ساتھ رہے گا، البتہ ہمارے وجود کا بت
 ٹوٹنے کا مقصود پر پہنچنے کا دروازہ کھلے گا۔

۶۔ لغات - ویدۂ خوشنا بہ نقشاں : خون برسانے اور رونے والی آنکھیں۔

شرح : جگر کا خون جوش میں آگیا ہے، یہ غم بھر اور یادِ محبوب کا نتیجہ ہے۔
 اگر میرے پاس لہروں نے اور خون برسانے والی کئی آنکھیں ہوتیں تو جی بھر کے رو لیتا۔
 یہ معنوں خاص مرزا غالب کا ہے کہ کبھی ان کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور خوشی بھر
 کا جوش نکالنے کے لیے کئی آنکھوں کی ضرورت پیش آئی، کیونکہ خدا کی عطا کی ہوئی دو
 آنکھوں کے لیے یہ وظیفہ اوکرنا ممکن نہیں، اصل کام ان کی بساط سے بہت زیادہ ہے یہی
 طرح جب غزل کی مزا وافی ہوئی اور اس نے سیل کی سی صورت اختیار کر لی تو فرمایا
 میری سمت میں غم گرا تا تھا
 دل بھی یادِ ب کئی دیے ہوئے

گو یا جس طرح غم کی مزا وافی کے انھار کے لیے یہ کہا کہ اس کا حتمی کئی دلوں کا

تعامت کرتا ہے، اسی طرح خونِ جگر کے جوش کی طوفانی کیفیت کے اظہار کے لیے یہ پیرایہ اختیار کیا کہ اسے نزو کرنا منظور ہو تو وہ نہیں، بلکہ کئی خون رونے والی آنکھیں درکار ہیں۔ مرزا کے نزدیک دل اور آنکھیں دکھ سنے اور رونے کا ایک پیانہ ہیں۔ اب جتنے دکھ زیادہ ہوں گے اور طوفانِ جگر کا جوش جتنے زوروں پر ہو گا، اسی کے مطابق پیانے درکار ہوں گے۔

۷۔ شرح : میں تو محبوب کی آواز پر قربان ہوا جاتا ہوں۔ بیشک سر اڑتا ہے تو اڑ جائے، گردن کٹتی ہے تو کٹ جائے، لیکن وہ جلاؤ کی سہر سرب پر کبے جاش کہ "ہاں اُدر لگا" یہ آواز اتنی دلکش و لغزیب ہے کہ اس پر میں بے تکلف جان قربان کر سکتا ہوں۔

دیکھیے، یہاں بھی مقصود سر کٹنا نہیں، بلکہ محبوب کی دلغزیب آواز کی کیفیت پیش کرنا منظور ہے، اس کے لیے جلاؤ کا ڈراما تیار کیا گیا۔ گویا اتنے نازک حالات میں بھی جب جان جا رہی ہو، آواز محبوب کی دلغزیبی سہر شے پر غافل ہے۔ اور اسی کے سننے کی آرزو ہے۔

۸۔ شرح : میں ہر روز اپنا نیا چھپا ہوا داغ دکھا دیتا ہوں۔ لوگوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میرے ہر داغ کی حرارت، جہان بینی اور حقیقت بالکل سورج سے مشابہ ہے۔ اتنی مشابہ ہے کہ لوگ دیکھتے ہیں تو اول نظر میں سمجھ لیتے ہیں کہ سورج نکل آیا، البتہ کچھ مدت بعد انہیں دھوکے کا احساس ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو مرزا غالب کے سینے کا ایک نیا داغ محنت تھا، جس پر سورج کا دھوکا ہوا ہے۔

۹۔ شرح : خود مرزا غالب کے اس شعر کی شرح میں قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی کو لکھتے ہیں :

"یہ بہت لطیف تقدیر ہے۔ لیتا کو رابطہ ہے چین سے، کرتا مربوط ہے

آہ و فغاں سے، عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں مصدب ہیں، فارسی میں تعقید معنوی اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح و بلیغ رہنمائی تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ کہ اگر دل نہیں نہ دیتا تو کوئی دم نہیں لیتا۔ اگر نہ مرنے تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔

فارسی میں لفظی تعقید جائز یا فصیح و بلیغ ہو تو ہو، لیکن تعقید لفظی ہو یا معنوی، بہر حال عیب ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ردیف کی پابندی نے مرزا غالب کو اس تعقید لفظی پر مجبور کیا۔ مقصود یہ نہیں کہ ردیف و تاقیہ کی پابندی پر اعتراض کیا جائے اس کے بغیر شعر کی تین چوتھائی موسیقی ختم ہو جاتی ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ بعض اوقات شاعر تعقید پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن ایسا شعر، جیسا مرزا کا ہے، یہ آسانی چھوڑا جا سکتا تھا، کیونکہ اس میں کوئی خاص بات ہی نہیں، اس طرح تعقید ختم ہو سکتی تھی۔

۱۔ شرح : خواجہ عالی فرماتے ہیں :

”ناملے یعنی نندی ناملے، آہ و فغاں۔ مثال کس قدر مثل لڑکے مطابق ہے اور معنوں کتنا مطابق واقعہ کے ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رنجی ہے اسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے، خصوصاً جو معنوں وہ اس وقت اپنے حال کھتا ہے، وہ نہایت مؤثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔“

شعر میں مرزا نے اپنی طبع رواں کو نندی ناملے سے تشبیہ دی ہے۔ پہاڑی نندی نالوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آس پاس سے بڑے بڑے پتھر بیچ میں آگرتے ہیں اور نندی کا ہلکا ٹوک مارتا ہے، لیکن رکاوٹ پر مینج کا پانی نہیں رکتا، وہ جستور آتا رہتا ہے اور جمع ہو کر اتنا زور پیدا کر لیتا ہے کہ یا تو ان پتھروں کو ہالے جاتے، جو راستے میں رکاوٹ بنیں یا اس رکاوٹ کے اوپر سے بننے لگے اور آہستہ آہستہ اسے ختم کر دے۔ اس صورت میں نندی ناملے کا ہلکا اور تیز ہو جاتا ہے۔

دوسرے دریاے سندھ میں آیا، دقت پیش آیا کہ ارد گرد کی برغانی چٹانیں دریا میں آگئیں اور بہاؤ ٹوک گیا، یہاں تک کہ آگے دریا بالکل پایاب رہ گیا۔ پھر جمع شدہ پانی نے یکایک برغانی چٹانوں کو توڑ دیا اور اتنا پانی آیا کہ دریا کے اصل بہاؤ سے تیسویں حصہ اور بچا بنے گا۔ اس پاس کی اکثر بستیاں تباہ ہو گئیں۔

یہی مثال مرزا نے اپنی طبع وداں کے لیے اختیار کی فرماتے ہیں کہ اگر کسی مصیبت یا رنج و غم کے باعث طبیعت میں رکاوٹ پیدا ہوتا ہے تو ندی تالوں اور دریاؤں کی طرح اس کی روانی تیز تر ہو جاتی ہے اور بہتر سے بہتر اور پر تاثیر مصنفین تراویں کرتے ہیں۔

۱۱۔ شرح : دنیا میں اُرد بھی اچھے اچھے شاعر اور سخنور موجود ہیں، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ غالب کا انداز بیان ان سب سے الگ اور اچھوتا ہے۔

اس شعر میں بھی بیان کی حدت طرازی کا کمال دکھا دیا، یعنی اپنے انداز کے اچھوتا ہونے کی کہانی خود نہ کہی، دوسروں کی زبان سے کہلائی اور وہ بھی اس طرح کہ لوگوں میں عام چہ چار ہے، عام شہرت ہے، غالب کا انداز بیان سب سے الگ ہے۔

۱۔ لغات۔ آبِ برجامندہ : صفائے حیرت آئینہ ہے، سامانِ رنگِ آخر
اپنی جگہ ٹھہرا جو اپنی، جیسے حوض
تغیر، آبِ برجامندہ کا، پاتا ہے رنگِ آخر
اور تالاب کا پانی نہ وہ جاری نہیں
نہ کی سامانِ عیش و بہا نے تدبیر و دشت کی
ہوتا۔ جگہ ٹھہرا رہتا ہے۔

شرح : آئینے کی حیرت
اور صفائی ہی اس کے لیے آخر
جو اجامِ زُمرّد بھی مجھے، دایخِ پلنگِ آخر

رنگ کا سامان ہی جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ جو پانی اپنی جگہ ٹھہرا رہے گا اور جاری نہ ہوگا، اس کا رنگ بدل جائے گا اور کافی جم جانے سے اس کی صفائی اور پاکیزگی باقی نہ رہے گی۔

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے، اندک جو دو کا جو چیز یا جو وجود اپنی جگہ ٹھہرا رہے، وہ بہر حال زندگی کی حقیقت سے محروم ہو جائے گا۔ جس طرح پانی نہایت صاف و پاکیزہ شے ہے۔ جلدی رہے گا تو اس کی پاکیزگی قائم رہے گی ٹھہر جائے گا تو پاکیزگی سے محروم ہو جائے گا۔ ٹھیک اسی طرح آئینہ بھی ایک حالت پر رہے گا تو اس کی صفائی ختم ہو جائے گی اور اس میں رنگ رنگ ہو جائے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر انسان مدت العمر اسی مقام میں رہے گا جسے صوفیہ مقام حیرت قرار دیتے ہیں تو اس کی صفائی اور پاکیزگی زائل ہو جائے گا۔ مرحوم بجزوری کے قول کے مطابق "وادی حیرت کا راستہ نہایت پر خطر ہے۔ بہت سے طالب حقیقت اس سے آگے نہیں پہنچ پاتے۔ یہ سراب اور تشرنوبلی کی حقیقت ہے۔۔۔ لیکن جو اہل ظرف ہیں، وہ بہر ویر و وقت اس وادی کو طے کر جاتے ہیں۔"

۲۔ شرح : عیش و بہار کا سامان بھی وحشت کا علاج نہ کر سکا اور دلوانگی زائل نہ ہو سکی۔ دنیا کی دولت اور بہار وحشت پہنچے عاشق کو راو عشق سے باز نہیں رکھ سکتی۔ نہ تو کا پیالہ دولت و وحشت کا نشان ہے، جو تنہا عاشق ہے، اسے یہ پیالہ بھی پیتے کے جسم کا داغ نظر آتا ہے، جو، بھائے خود وحشت کی علامت ہے، کیونکہ پیتے آبادیوں میں نہیں، جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں ہی میں ملتے ہیں۔



۱۔ لغات - دستگیری:

مدد، اعانت، حمایت۔

گریبان چاک، شکافتہ

بھی مانا جاسکتا ہے، جیسے گریبان

چاک، چٹا ہوا گریبان اور صاف

منقلب بھی ہو سکتی ہے، یعنی

چاک گریبان۔

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، اگر ہو نہ عریانی

گریبان چاک کا حق ہو گیا ہے، میری گردن پر

بہ رنگ کاغذ آتش زدہ، نیرنگ بقیانی

ہزار آئینہ دل باندھے ہے، بال یک پدید

شرح : برہنگی کے سوا

جنون کا ہاتھ کون تمام سکتا ہے ؟
کون اس کا حامی و مددگار ہو سکتا
ہے ؟ عریانی گریبان چھاڑنے یا
چاک ہونے کا نتیجہ ہے ۔ لہذا اس
چاک کا حق احسان میری گردن پر
رہ گیا ۔ اسی نے عریانی پیدا کی ،
جس کی وجہ سے جنون کی دھکیگیری
ہوئی اور میری حالت جنون قائم
رہی ۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بڑھ کو سمجھے ہوئے ہیں قرضِ اربابِ نر پر
ہم اور وہ بے سبب رنج ، آشنا دشمن ، کہ رکھتا ہے
شمارِ بہرے ، تہمتِ نگہ کی چشمِ روزن پر
فنا کو سوئے ، اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ ناشاک ہے موقوفِ گلشن پر
اسدِ مسل ہے کس انداز کا ، قاتل سے کتا ہے

۴۔ لغات ۔ کاغذ آتش ناز ؟

وہ کاغذ جسے آگ لگائی گئی ہو ۔

تو مشتقِ نازک ، خونِ دو عالم میری گردن پر

نیرنگ بیتابی : اضطراب اور تڑپ کی نیرنگی میں بدتموئی ۔

بال : ہر ۔ بازو

تہیدین : تڑپنا ۔

شرح : میرے اضطراب اور تڑپ کی نیرنگی اس کاغذ کی طرح جسے آگ لگا دی

گئی ہو ۔ ایک ایک تڑپ کے بازو پر دل کے ہزار ہزار آئینے باندھتی ہے ۔

عبدالرحمن بجنوری مرحوم کاغذ آتشِ زہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ،

”حدوتِ آشنا کاغذ گویا جگہ زندہ ہوتا ہے ۔ کاغذ چونکہ کلامِ ربی اور کلمات

مشری کا حامل ہے اس لیے کاغذ کے جلانے کو عیب خیال کیا جاتا ہے ،

لیکن کاغذ کی تحریر مستقل سند ہوتی ہے ، اس لیے شہادت کو تلفت کرنے

کی غرض سے کاغذ کا مٹانے کر نابا اوقات لازمی ہو جاتا ہے ۔ معشوق ابتدا

سے نامہ دے عشاق کو جلاتے آئے ہیں ، لیکن کسی شاعر کے مشاہدے میں

یہ نہ آیا کہ کاغذ کے جلنے میں کیا کیا شاعرانہ کیفیات ہوں، بلکہ عیاں ہیں جب کاغذ کو آگ میں ڈالا جاتا ہے تو ذرا سی دیر آتش بلند ہو کر شعلہ بجھ جاتا ہے اور سرخ و سیاہ رنگ کاغذ کا نیم جان جسم رہ جاتا ہے، جس میں سکرات اور نزع کی تمام علامات نظر آتی ہیں۔ یہ ارتعاشی حیات بھی مزد ہو جاتا ہے اور سراپا جل چکنے کے بعد ہزاروں نقطہ ہائے روشنی کا فز پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ آخر کار کاغذ خاکستر ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

آتش زدہ کاغذ کی اسی کیفیت کے پیش نظر مرزا نے اپنے نیرنگ بیتابی کے عمل سے تشبیہ دی جو روشنی نقطے آخر میں کاغذ کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں، ان کی حیثیت ٹٹاٹے تاروں کی سی ہوتی ہے۔

یہی کیفیت مرزا نے یوں پیش کی، گو یا ایک ایک تڑپ کے بازو پر ہزار ہزار آئینے باندھ دیے گئے ہیں۔ دل اس لیے لائے کہ احساس دل کی خاصیت ہے، تڑپنا اور لوٹنا دل ہی پر موقوف ہے۔ مشاہدے کے کمال کے علاوہ شاعر نے تشبیہ، پھر اس کیفیت کے بیان میں حیرت انگیز کمال دکھایا۔

ایک صاحب فرماتے ہیں، آتش زدہ کاغذ میں سکرٹنے اور سیٹنے کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس سے بیتابی کو تشبیہ دی ہے اور ایسے کاغذ میں جو روشنی نقطے، نمودار ہوتے ہیں، ان کی مناسبت سے ہزار کہا۔ مطلب یہ کہ تکلیف و بقراری میں اگر کوئی شے موجب تسکین ہوتی ہے تو وہ تڑپنا اور لوٹنا ہے۔

۳۔ لغات - حبشہ رفتہ : گزرے ہوئے زمانے کی راحت و آسائش۔

منابع بُردہ : جھینچا ہوا مال، لوٹا ہوا مال۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

”یہ معنوں میں بالکل وقوعیات میں سے ہے۔ جو شخص آسودگی کے بعد غفلت

ہو جاتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے تئیں مفلوم، ستم رسیدہ اور غمگین زدہ سمجھا

کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ مزد کہیں

نہ کہیں ہمارا انصاف ہو گا اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا :

ہم اپنی گوری ہوئی راحت و آسائش کے لیے آسمان سے کیا کیا تقاضے کر رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم سے چھین گیا، وہ واپس مل جائے تاکہ پھر اس بین کی زندگی بسر کریں، لیکن اتنا نہیں سمجھتے کہ آسمان کی حیثیت ڈاکو اور قزاق کی ہے۔ وہ جو مال متاع لوٹ کر لے گیا ہے، اسے ہم سادہ لوحی سے رہزن پر قرض بھیجے بیٹھے ہیں، کہ جب چاہیں گے، وصول کر لیں گے یا تقاضا کر کے لے لیں گے، حالانکہ رہزنوں سے ٹوٹا ہوا مال کبھی واپس نہیں ملتا۔

۴۔ لغات۔ بے سبب رنج : بغیر کسی سبب کے خفا ہونے والا، بلا وجہ

ناراض ہو جانے والا۔

آشنا دشمن : دوست کا دشمن، محبت کرنے والے سے عداوت رکھنے والا۔

روزن : روشن دان۔

شرح : ہمارا معاملہ ایسے محبوب سے آپڑا ہے، جو بغیر کسی سبب کے

ناراض ہو جاتا ہے۔ دوستوں اور خیر خواہوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ اس کی بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کے گھر کے روشن دان میں سے سورج کی کرن اندر چل جائے تو فوراً غصے سے پکارا ٹھٹھا ہے کہ روشن دان کی آنکھ نے نگاہ پیدا کر کے مجھے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ سورج قسمت ہے۔ کیونکہ نہ روزن کی آنکھ ہوتی ہے اور نہ سورج کی کرن ایسی نگاہ دیتی ہے۔ یا یہ کہ عاشق روزن کی آنکھ سے مجھے جھانک رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی قسمت لگانا بھائے خود بلا وجہ ناراض ہونے اور دوست سے دشمنی رکھنے کا ثبوت ہے جس کی بدگمانی کا یہ عالم ہو اس کے باب میں عاشق کیا کہے۔

۵۔ لغات۔ مزورغ طالع : قسمت کے سارے کا چمکنا، خوش نصیبی۔

خاشاک : کوڑا کرکٹ، گھاس پھوس۔

گلخن : گل یعنی آتش، خن خانے کا غصہ یعنی بھٹی۔

شرح۔ اگر تو اپنی حقیقت تک پہنچنے کا مشاقق ہے تو اپنے آپ کو فنا کے

حاصل کر دے، یعنی فنا ہو جا اور اپنے آپ کو مٹا دے۔ دیکھ، گھاس پھوس اور کوڑے کرکٹ کی کیا حیثیت ہے؟ لیکن جب یہی حقیقت چیزیں بھٹی میں پہنچتی ہیں تو شیط کو بلند کرنے اور آگ بھڑکانے کا موجب ہوتی ہیں۔ گویا ان کے فیصلے کا پیمانہ بھٹی میں پہنچ جانے پر موقوف ہے۔ تیرا فیصلہ بھی اسی صورت میں چمکے گا اور تو بھی اپنی حقیقت پر اُسی حالت میں پہنچے گا؛ جب اپنی ہستی فنا کر کے اصل و مبداء میں گم ہو جائے گا۔

بجنوری مرحوم کہتے ہیں :

”مرزا غالب ان نابولت بردوش فلسفیوں میں نہیں، جو زندگی کو ماتم غم اور اہل دنیا کو اہل جنازہ خیال کرتے ہیں اور مدت الوجود کے فلسفے کا پہلا سبق یہی ہے کہ خدا اور ماسوا صرف عارضی طور پر جدا ہیں اور وعدا الموت یہ جدائی ختم ہو جاتی ہے۔“

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

انسان خود کو اپنی غلط بینی کے باعث امزاد سے علیحدہ اور ماحول سے جدا گانہ خیال کرنے لگتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ میں دنیا میں اجنبی ہوں اور مخالفت اشخاص و قوانین میں گھبر ہوا ہوں، لیکن انسان اور علاوہ میں حقیقتہً کوئی رخنہ حائل نہیں، یہاں تک کہ موت بھی اس میں کوئی رخنہ پیدا نہیں کرتی۔ اُپنشدوں میں لکھا ہے : ”موت اور بقا اس کا سایہ ہیں۔ موت اور حیات میں کوئی فرق نہیں، نہ تضاد ہے، بلکہ حیات میں موت ہے۔ حیات کی آمد زندگی اور رفت موت ہے۔ موت حیاتِ عارضی کو دائمی کو دیتی ہے۔“

۶۔ شرح : ”کس“ استفہام کے لیے نہیں، تعجب کے لیے ہے ،

اسد کس درجہ حیرت انگیز بسمل ہے کہ خود خاک و خون میں لوٹ رہا ہے، لیکن قائل (محبوب) سے کہتا ہے کہ تو نازکی مشق کیے جا، انداز و ادا دکھائے جا۔ اگر لوگوں کا خون ہوتا ہے تو تجھ سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی، تیرے خلاف کوئی

دعویٰ نہ ہوگا۔ دونوں جہانوں کے خون کی فتر داری میں اپنے اوپرے لینے کے لیے
تیار بیٹھا ہوں۔



۱۔ لغات - ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خواباں تجھ پہ عاشق میں
شکش : ظلم و ستم کا نام
خواباں : حسین۔ تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سارقیب آخر
تکلف برطرف : تکلف اٹھا رکھیے۔ یہ ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں جب کوئی
بات صاف صاف اور لگی پیش رکھتے بغیر کہنی مقصود ہو۔

شرح : میں تیرے ظلم و ستم ستا ہوں اور اس میں میرے سامنے ایک مصلحت
ہے۔ وہ یہ کہ اسے محبوب : حسین لوگ تجھ پر عاشق ہیں۔ سچی اور صاف بات ہے کہ
کسی نہ کسی وقت ان میں سے کوئی ایک تیرے ظلم و ستم سے کہ میرا مہنوا اور بہدرو بن
جائے گا اور یہ میرے بھوکہ دل کو اطمینان دینا رہوں گا کہ حسن حسن کو بھی جھوٹا بیدا کا تحفہ عشق
بنانے میں تامل نہیں کرتا۔ پھر عشق کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے ؟
یہ کہنا کہ ان حسین عاشقوں میں سے غالب کسی ایک سے دل لگا کر تسکین حاصل
کرے گا۔ غالب کی شعر گوئی کی سراسر تضحیک ہے۔



تہمید : یہ غزل نہیں
بلکہ مرثیہ یا نوحہ ہے جو زبانی
اعا بدین خاں عادت کی جو انگری
پر کہا گیا۔ عادت مرزا صاحب
کی بیوی کے بھانجے آبادی
بیگم اور شرف الدولہ نواب
غلام حسین خاں بہادر صاحب

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائیگا سر، گر ترا چتر نہ گیسے گا
ہوں در پر ترے نامید فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ تجاؤں
 مانا، کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن آؤں
 جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے۔
 کیا خوب قیامت کا ہے، گویا کوئی دن اور
 ہاں، اے فلک پیر اجواں تھا ابھی عارف
 کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن آؤں
 تم ماہ شب چار وہم تھے، میرے گھر کے
 پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا، کوئی دن آؤں
 تم کون سے تھے ایسے گھرے دادوستد کے
 کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن آؤں
 مجھ سے تمہیں نفرت بھی، نیر سے لڑائی
 بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن آؤں
 گندی نہ بہر حال یہ وقت، خوش و ناخوش
 کرنا تھا، اجواں مرگ اگر ارا کوئی دن آؤں
 ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالباً
 قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن آؤں

مخلص بہ مسرور (ابن فیض اللہ
 خاں) کے صاحبزادے تھے۔
 مسرور میں پیدا ہوئے۔ چونکہ
 آبادی بیگم اور مسرور کے تعلقات
 بگڑ گئے تھے، اس لیے بیگم اپنے
 دونوں بیٹوں عارف اور حمید حسن
 کو لے کر الگ ہو گئی۔ عارف
 خوش ذوق شاعر تھے۔ مرزا غالب
 نے انہیں بیٹا بتایا تھا۔ شروع
 میں وہ شاہ نصیر سے اصلاح لیتے
 تھے، پھر غالب کی شاگردی اختیار
 کر لی۔ غالب نے فارسی میں عارف
 کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔
 ایک جگہ فرماتے ہیں:-

مباحث ہوں دل عارف منترہ
 فیض چوں دم غالب منبر
 ایک مستقل قطعہ عارف کی مدح
 میں لکھا ہے :

آل پندیہ غوسے عارف نام
 کہ رخش شیخ دوداں غست
 از نشاط نگار سش نامش
 خامہ رقاص در بان غست
 آہنگ در بزم قرب و خلوت انس
 فلکسار و مزاج دایہ غست

ہم زکلیب تو خوش و لم خوشدل کال نہالی شرفشانِ منت
بریقین داں کہ غیر من نبود گر نظیر تو در گمانِ منت
اسے کہ میراثِ خوار من باشی
اندر اردو کہ آن زبانِ منت

عارف نے صرف چئیس چئیس برس کی عمر میں وفات پائی ^{۱۲۶۴ھ} ۱۸۵۲ء عادت کے بیٹوں باقر علی خاں کا قیام اور حسین علی خاں شاداں کو مرزا غالب نے اپنے بیٹے بنا لیا تھا۔ ان کا ذکر غالب کے خطوں میں جا بجا آیا ہے۔

مرضیہ یا نوحہ ایسا ہے کہ اس کی مثال اردو زبان میں ملنا مشکل ہے۔

۱۔ شرح : اسے عارف! تمہارے لیے لازم تھا کہ کچھ دن اور میرا دستہ دیکھتے، یعنی میری موت کا انتظار کرتے تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ دوسری دنیا کو روانہ ہوتا، لیکن تم نے جلدی کی اور تمہارا روانہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ دن اور تمہارا ہو، یہاں تک کہ میں مروں اور تمہارے پاس پہنچوں۔

۲۔ لغات : تاصیہ فرسا : ماتھا رگڑنے والا۔

شرح : میں تیرے دو دانے پر یعنی تیری قبر پر کچھ دن اور ماتھا رگڑوں اگر اس طرح تیرا پتھر نہیں گھسے گا تو میرا سر یقیناً ختم ہو جائیگا، یعنی دو چیزیں باہم رگڑا کھاتی رہیں تو ایک نہ ایک ضرور ختم ہو جائے گی۔

مرزا کا مقصود ہے کہ میرے لیے اب تیری قبر سے سر ٹکرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس میں یا تیری قبر ختم ہوگی اور وہ مادی حجاب دور ہو جائے گا جو تم میں اور مجھ میں مائل ہے۔ یا میرا سر مٹ جائے گا اور میں سر کر تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔

۳۔ شرح : ابھی کل تو تم اس دنیا میں آئے تھے یعنی کوئی زیادہ عمر تو نہیں ہوئی تھی اور اب جانے کی تیاری کر لی اور کہتے ہو کہ آج ہی چلا جاؤں گا۔ اچھا بھئی! جانا ہی منظور ہے اور ہمیشہ نہیں رہ سکتے تو کچھ دن تو اور ٹھہرو۔

اس شعر میں مکالمے کا طریقہ اختیار کر لیا اور باتیں ایسی کہیں، جو مسافروں اور سیر بازوں میں معمول ہیں۔ اس سے شعر کی تاثیر بہت بڑھ گئی، کیونکہ بالکل فطری اور طبعی حالت پیدا ہو جانے سے ایسی صورت نمایاں ہو گئی، گویا عارف سامنے بیٹھے ہیں وہ شخصیت کا تقاضا کر رہے ہیں اور مرثیہ انھیں سنھرانے کی تدبیروں میں سرگرم ہیں۔

۴۔ **شرح :** جاتے ہوئے ہمیں سناتے ہو کہ اب قیامت کو ملاقات ہوگی واہ ! گویا قیامت کا دن کوئی اور ہوگا، ہمارے لیے تو تمھارا جانا ہی قیامت ہے۔

۵۔ **شرح :** اب آسمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے بوڑھے ! جانے تو ابھی حیران تھا۔ اگر یہ کچھ دن اور زندہ رہتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا؟ تجھے کون سا نقصان پہنچ جاتا؟

۶۔ **لغات :** ماہِ شب چار و بزم : چودھویں رات کا چاند، یعنی پورا چاند۔

شرح : اے عارف اتم میرے گھر کے لیے چودھویں رات کا چاند تھے اور تمھاری ہی وجہ سے اس گھر کا ذرہ ذرہ جگمگا رہا تھا، لیکن یہ بات مجھ میں نہ آئی کہ تمھارے ہاتھ ہی میرے گھر میں اندھیرا کیوں چھا گیا اور روشنی کی کوئی بھی جھلک کیوں باقی نہ رہی؟ چودھویں کا چاند ہر شب تھوڑا تھوڑا گھٹتا ہے اور جینے کے آخر تک اس کی کچھ نہ کچھ روشنی قائم رہتی ہے۔ تمھاری روشنی تو رفتہ رفتہ کم نہ ہوئی ایک نعت تاریکی چھا گئی۔

عارف کو چودھویں کے چاند سے اس لیے تشبیہ دی کہ بزرگوں میں بچوں اور عزیزوں کے لیے یہی تشبیہ معمول ہے۔ پھر اس سے مصنفوں پر یاد کیا کہ روشنی رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی، ایک نعت اندھیرا کیوں چھا گیا۔

۷۔ **لغات :** داد و ستد : لین دین۔

ملک الموت : موت کا فرشتہ

شرح : تم لین دین کے ایسے کھرے کیوں بن گئے کہ اُنھر موت کے فرشتے نے اگر کہا کہ تمھاری زندگی کے دن پورے ہو گئے اور تم نے جانے کی تیاری کر لی۔

کاش، ایسا ہوتا کہ تم زندگی کا خاتمہ فوراً قبول نہ کر لیتے، جو لین دین میں کھرے لوگوں کا شیوہ ہے، بلکہ فرشتے کو کچھ دن اور مستعار زندگی خواہے کر دینے کے لیے تقاضا کرنے دیتے۔

مرزا نے یہاں زندگی کو عام لین دین کے طریقے پر ڈھال لیا، جیسے کسی کے ذمے قرض ہو اور قرض خواہ تقاضا کرے تو مقروض عذر معذرت کر کر کے کچھ دقت گزارے۔

۸۔ لغات - نیر: ضیاء الدین احمد رضا نیر، جواہر الدین احمد رضا والی لوہارو کے چھوٹے بھائی، بیگم غالب کے برادرِ حم زاد اور فارسی میں مرزا کے خلیفہ تھے۔

شرح : پہلے مصرع کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ عاقبت کو غالب سے نفرت تھی یا نیر سے ان کی لڑائی ہو گئی تھی۔ یہ محض دوسرے مصرع کے لیے ایک مناسب حال گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ یعنی اگر بہ فرزند محال مان بھی دیا جائے کہ مجھ سے تمہیں نفرت تھی، اس لیے تڑموڑ کر چل دیے یا نیر سے تمہاری لڑائی ہو گئی تھی، لہذا اس سے دُور چلے جانے کی تدبیر کر لی۔ ان انہونی باتوں کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو کم سے کم تمہارے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کا تو کوئی گناہ نہ تھا۔ نہ ان سے نفرت ہو سکتی تھی نہ لڑائی کا کوئی امکان تھا۔ پھر ان کا تماشہ کوئی دن اور کیوں نہ دیکھا۔

۹۔ شرح : تم نے اس دنیا میں بڑے جملے پتیس سال تو گزار دیے۔ ان میں خوشی کے موقع بھی آئے اور غم کے بھی۔ اسے جراتی میں موت کا داغ دے جانے والے اسی طرح کچھ دن اور گزار کر لینا تھا۔

۱۰۔ شرح : جو لوگ کہتے ہیں کہ اے غالب ! اب تک کیوں جی رہے ہو؟ اتنا بڑا صدرِ پیش آیا ۱۰۰ سے برداشت کر لیا اور مر ڈگئے؟ یہ ناراضی اور ناگہمی کی بات ہے۔ میری قسمت ہی میں یہ کھسا ہے کہ کچھ دن اور مرنے کی تنہا کروں۔

مدمر بیشک ہواشت کر بیا، لیکن زندگی میں کوئی لطف باقی نہ رہا۔ جتنی
بھی رہ گئی، صرف اس لیے رہ گئی کہ موت کی تمنا کرتے رہیں۔



فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و ہر
ہے داغِ عشق، ازینتِ جیبِ کفنِ ہنوز
ہے نازِ مفلساں زرازدستِ رفتہ پر
ہوں گلِ فروشِ شوخیِ داغِ کہنِ ہنوز
سے خاندِ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمایازہ کھینچے ہے بُتِ بیدادِ فنِ ہنوز
ایک دوسرے کے بغیر دلوں کا تصور ہو نہیں ہو سکتا۔ نیز جس طرح سورج سے
صبح کے لیے زیب و زینت حاصل ہے، اسی طرح اب تک میرے کفن کے گریبان
کی زینتِ عشق کا داغ ہے۔

مطلب یہ کہ زندگی ختم ہو جانے کے بعد بھی داغِ عشق بدستور روشن و
سینہ تاب ہے۔

غالب ہے کہ صبح کو برحفاظِ سفیدی کفن سے اور سورج کو بہ اعتبارِ حرارت و
داغِ عشق سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ پہلو بہ طورِ خاص پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ صبح
کے ساتھ سورج کو جو کبھی منقطع نہ ہونے والا رابطہ ہے، وہی کفن کے ساتھ داغِ
عشق کو ہے۔

۲۔ لغات : زرازدستِ رفتہ : اتھ سے گیا بڑا مال، کھوئی
ہوئی دولت۔

گل فروش : پھول بیچنے والا۔

دارغ کہن : عشق کا پرانا دارغ۔

مشرح : قاعدہ ہے کہ جو دولت مند لوگ غریب ہو جائیں اور ان کا مال ہاتھ سے نکل جائے تو وہ ہمیشہ اس کھوئی ہوئی دولت پر فخر و تازکیا کرتے ہیں کہ ہم کسی زمانے میں ایسے تھے، ایسے تھے اور ایسے تھے، وہی کیفیت میری ہے۔ میں بھی اب تک عشق و محبت کے پرانے دارغوں کی آب و تاب اور چمک دمک کے پھول بیچ رہا ہوں یعنی میرا ناز و فخر بھی محبت کے پرانے دارغوں پر ہے۔

دیکھیے شاعر کا کمال کہ ہاتھ سے گئے ہونے والی تشبیہ پیش نظر رکھتے ہوئے دارغ کہن کی گلفروشی نہ کیا، بلکہ شوخی دارغ کہن کی گلفروشی کیا، یعنی محبت کے دارغ پھولوں کی صورت میں نہیں بیچتا بلکہ ان کی شوخی بیچ رہا ہے کیونکہ دارغ تو زرازدست رفتہ ہو گئے۔

۳۔ لغات۔ خمیازہ کھینچنا : انگڑائیاں لینا۔

نُبت بیدار فن : وہ محبوب، جس کا عام طریقہ اور شیوہ عظم و جبر ہو، یعنی جس نے عظم و جبر کے فن میں کمال حاصل کر لیا ہو۔

خاک بھی نہیں : اس کے ایک معنی عام ہیں، دوسرے معنی محاورے کے ہیں، دونوں بیاں ٹھیک ٹھیک چسپاں ہوتے ہیں۔

مشرح : میرے جگر کے شراب خانے میں خون کی شراب تو رہی ایک طرف، مفتی بھی موجود تھیں یا یہ سمجھ لیجیے کہ کچھ بھی نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ میرا عظام و دستر محبوب انگڑائیاں لے رہا ہے اور اس پر ہمارا طاری ہے، کیونکہ میرے جگر کے میخانے سے خون کی شراب پینے کا وہ عادی تھا۔ اب وہاں کچھ نہیں رہا تو اس پر نشے کے آثار کی حالت طاری ہو گئی۔

صاف مطلب یہ ہے کہ میرا محبوب جس عظم و ستم کا عادی ہے، اس کا پورا ہونا تو اب مشکل ہے۔ کیونکہ مجھ میں اب اتنی ہی طاقت ہی نہیں رہی کہ عظم و ستم کا ساتھ دے سکوں۔ میری

تاب و تڑاں ختم ہو گئی، لیکن اس کی بیدار آری کے جوش میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا۔



حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فنونِ نیاز
 دعا قبول ہو یا رب، کہ عمرِ خضر دراز!
 نہ ہو پہ ہرزہ، سیاہاں نورِ وہم وجود
 ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
 وصال، جلوہ تماشا ہے، پر دیاغ کہاں
 کہ دیجے آئینہ انتظار کو پرواز
 ہر ایک قدّہ عاشق ہے آفتاب پرست
 گئی نہ خاک ہوے پر ہوائے جلوہ ناز
 نہ پوچھو وسعتِ مئے خانہ جنوں، غالب
 جہاں یہ کاسہ گروں ہے ایک خاک انداز
 ۱۔ لغات، حریف :
 حل کرنے والا، مرد و نیچے والا،
 معاون، رفیق۔
 مطلبِ مشکل : کوئی مشکل
 کام جو آڑے۔
 فنونِ نیاز : مجبوز نیاز
 کا منتر۔
 عمرِ خضر دراز : خضر کی عمر
 لمبی ہو۔ یہ محاورہ ایسے موقع
 پر بولتے ہیں، جب کوئی چیز
 پہلے ہی سے موجود ہو۔
 شرح : خواجہ حاتم
 فرماتے ہیں :

”چونکہ خیال وسیع تھا اور
 مصنون مطلع میں بندھنے کا مقصد

تھا، اس لیے پہلا مصرع اور روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے،
 مگر بالکل ایک نئی شونہی ہے، جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہو گی۔ کہتا ہے
 کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو مجبوز نیاز کا منتر کچھ کام
 نہیں دیتا، لہذا اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی! خضر کی عمر دراز ہو

یعنی ایسی چیز طلب کریں گے۔ جو پہلے ہی دی جا چکی ہو۔
خضر سے ظاہر ہے کہ شاعر کے نزدیک عجز و نیاز کے سوا مفصل حاصل کرنے کی
کوئی صورت نہیں۔ لہذا وہ کہتا ہے کہ عجز و نیاز کا ہمارا تو کسی مشکل کام کے پودے
ہونے میں ممانعت نہیں بن سکتا۔ اس سے تو کوئی الجھا ہوا کام سلجھ نہیں سکتا اور کوئی
پچیدہ عقدہ حل نہیں ہو سکتا اور ہمارے پاس عجز و نیاز کے سوا کوئی تدبیر بھی نہیں
لہذا ہمارا گاہ باری تعالیٰ میں التجا کرتے ہیں (اور التجا بذات خود عجز و نیاز کی ایک شکل ہے)
کہ خضر کی عمر لمبی ہو اور یہ التجا پہلے ہی سے پوری ہو چکی ہے۔

۲۔ لغات۔ بہرہ : بیہودہ طریق پر، فضول۔

بیابان نورد : صحرا و بیابان میں پھرنے والا۔

مشرع : نتیجہ وجود کے سلسلے میں وہم و گمان کی خاک نہ چھپانی چاہیے جس
سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ اگر تو ایسا کرنا چاہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیرے تصور میں
ابھی تک اونچ نیچ باقی ہے۔

وجود کے سلسلے میں اوہام کا شکار ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ خود وجود
کے مراتب مسلم مانے جائیں، یعنی اس کا سب سے اونچا مرتبہ وجود کا ہے اور سب
سے نیچا اسکان کا۔ یہی اونچ نیچ ہے اور ظاہر ہے کہ جس راستے میں اونچ نیچ ہوا
وہ مسافر کے لیے پریشانی اور مصیبت کا باعث ہوتا ہے۔

دہر و چلے ہے راہ کو بہار و کیکہ کر

دوسری صورت یہ ہے کہ خود وجود حقیقی کے سوا کسی دوسرے وجود کو تسلیم کیا
جائے۔ وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک یہ بھی وہم و گمان ہی کے
بیابان کی خاک چھپانا ہے۔ اسے بھی اونچ نیچ کے تصور کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انسان
کی طبیعت افراط و تفریط سے پاک ہو کر اعتدال و توازن پر آ جائے تو اس قسم کے
اوہام کا خاتمہ ہو جائیگا۔ صرف ایک ہی وجود باقی رہ جائے گا، جو وجود حقیقی ہے،
باقی سب مٹ جائیں گے، جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں اور صرف وہم کی تخلیق ہیں۔

اسی طرح نشیب و فراز ختم ہو گا اور یہی نظری اعتدال و توازن کی روشن دلیل ہے۔
۳۔ لغات۔ جلوہ تماشا : حسن کا تماشا دکھانے والا۔ وہ حسن جو دیکھے جانے کے قابل ہے۔

پہرہ دار : چلا، صیقل، آرائش۔

شرح : یقیناً محبوب کا وصال حسن کے جوئے دکھانے والا ہے، یعنی وصال ہیں، ہمیں حسن سے بہرہ ور ہونے کا پورا موقع ملے گا۔ یہ درست سہی، لیکن ہماری طبیعت کب برداشت کر سکتی ہے کہ انتظار کے آئینے کو صیقل کرتے اور چلا دیتے ہیں مطلب یہ کہ وصال کتنی ہی محبوبیوں کا مرکز ہو، مگر ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ حد درجہ لمبی مدت تک انتظار کرتے رہیں۔

۴۔ لغات۔ آفتاب پرست : سورج کو پوجنے والا۔

شرح : عاشق کی خاک کا ذرہ ذرہ بدستور سورج کو پوج رہا ہے۔ دیکھیے خاک ہونے اور مر جانے پر بھی جلوہ تازہ کا شوق زائل نہ ہوا۔

ذرے کے آفتاب پرست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ذرہ وجود حقیقی پر مغفون ہے۔ اسی سے چمک دمک حاصل کرتا ہے اور اسی میں مل جانے کا آرزو مند ہے۔

۵۔ لغات۔ کاسۂ گردوں : آسمان کا کاسہ۔

خاک انداز : وہ غلط جس میں فرخ کی صفائی کے بعد کوڑا کرکٹ ڈال کر باہر پھینکتے ہیں۔

شرح : اے غائب ! جنوں کے شراب خانے کی وسعت و کشادگی کا حال کچھ نہ پوچھ۔ بس اتنا سمجھ لے کہ یہ آسمان جو ایک ساغرِ ناظرت ہے اس میں جانے میں صرف اتنی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں کوڑا کرکٹ ڈال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔

مولانا طہطائی درست فرماتے ہیں کہ آسمان کو مٹی یا کوڑا کرکٹ ڈال کر باہر پھینکنے کا کہنا بے مقصود ہے کہ وہ نہایت حقیر چیز ہے۔

”کاسۂ گردوں اس اعتبار سے کہ کرۂ خاک کو محیط ہے، خاک انداز کی

طرح خاک سے بھرا ہوا ہے۔ فرض میخانہ جنوں میں کا سہ گروں کی اتنی بھی وقعت نہیں کہ کا سہ اُسے شراب میں اس کا شمار ہو، بلکہ خاک انداز ہے۔ ایک کا لفظ اردو میں تنکیر کے لیے ہوتا ہے، یہاں تنکیر سے تحقیر مقصود ہے کہ تنکیر کے ایک معنی یہ بھی ہیں :-

اب غور فرمائیے، جس میخانہ جنوں میں آسمان کو خاک انداز کی حیثیت حاصل ہے اس کی وسعت کا اندازہ کون کر سکتا ہے اور آسمان کو اس اعتبار سے بھی خاک انداز کہنا بہت موزوں ہے کہ زمین جو سراپا خاک ہے یہ ظاہر اسی ظرف میں پڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

①

۱۔ لغات : وسعت : وسعت سبی کرم دیکھو، کہ سرتاسر خاک
سبی کرم : سخاوت و بخشش
گزرے ہے آبلہ پا، ابرو گہر بار ہنوز
کی کوشش کا پھیلاؤ۔
سرتاسر خاک : ذین
ایک قلم کا نذر آتش زدہ ہے صفحہ دشت
کے ایک سرے سے دوسرے
نقش پا میں ہے تپ گرمی رفتار ہنوز
سرے تک۔

آبلہ پا : جس کے پاؤں میں مچالے ہوں۔ یہ عموماً زیادہ چلنے سے پیدا ہوتے ہیں
ابرو گہر بار : موقی برسانے والا بادل۔

شرح : قدرت کے طاعت و نوازش کی وسعت دیکھو کہ روئے زمین کے ایک
سرے سے دوسرے سرے تک بادل اب تک موقی برسا رہا ہے، اگرچہ مسلسل چلتے
چلتے اس کے پاؤں میں مچالے پڑ گئے ہیں۔

مطلب یہ کہ خدائے کریم کی بخشش و نوازش کی کوئی حد نہیں۔ وہ اپنی رحمت
سے بادل اٹھاتا ہے اور زمین کو بارش سے یکسر سبزہ قرار بنا دیتا ہے۔

پانی کے قطروں کو پہلے موتیوں سے تشبیہ دی یعنی جو قطرے برستے ہیں، ان کی حیثیت

موتیوں کی ہے۔ کیونکہ جہاں جہاں برستے جلتے ہیں، زمین کا دامن دولت کے موتیوں سے بھرتے جاتے ہیں۔ پھر سخی و کوشش اور لگ و دو کے پیش نظر انھیں قطروں کو پاؤں کے چھالوں سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی اگرچہ زمین تر کرنے کی کوشش میں بادل کو لگ و دو کرنی پڑتی ہے، جس سے اس کے پاؤں میں مچالے پڑ گئے ہیں، تاہم باری تعالیٰ کی رحمت کا فیض بدستور بہر حال ہر خطے کے لیے جاری ہے۔

۲۔ **تشریح :** دشت و بیابان کا پورا صحفہ یکسر اس کاغذ کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے، جسے آگ لگ گئی ہو۔ کاغذ آتش زدہ کی کیفیت تفصیل کے ساتھ پہلے پیش کی جا چکی ہے اور آگ لگنے سے جو منظر پیدا ہوتا ہے، وہ بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اسے پیش نظر رکھیے اور خود فرمائیے کہ پاؤں کے نقش میں اب تک تیز رفتاری کی حرارت باقی ہے۔

مطلب کہ انتہائی تیز رفتاری سے یہ بیابان میں پھر نکلا۔ تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں جہاں پاؤں کے نقش پڑے، ان میں اب تک اتنی حرارت باقی ہے کہ ان سے چنگاریاں ابھر رہی ہیں۔ گو یا پورا بیابان آتش زدہ کاغذ کی طرح شعلہ زار بن گیا ہے۔ قلم کاغذ اور صحفہ کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔ اسی طرح گرمی رفتار میں حرارت نقش پاکے اندر محفوظ ہونے کے باعث پورے دشت کو کاغذ آتش زدہ سے تشبیہ دینا انتہائی کمال ہے اور ایسی تشبیہات بڑے بڑے شعراء کے دیوانوں میں بھی نہیں ملتی۔

○
کیوں کر اس بُت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟

دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے ہے ترے تیر کا پیکان، عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالب ! واقعہ سخت ہے اور بان عزیز

۱۔ **تشریح :** خواجہ حاکم فرماتے ہیں :

”اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو

وہ ایمان لے لے گا اس لیے جان کو عزیز نہیں رکھتا اور دوسرے
لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بہت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے، پھر
اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جاسکتی ہے ؟

گویا یہ شعر غالب کے ان اشعار میں سے ہے جنہیں خواجہ عاتقی پہلو دار کہتے ہیں
کہ بادی النظر میں کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر عجز کرنے کے بعد ایک دوسرے معنی
رہا بیت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ لطف نہیں اٹھا سکتے، جو ظاہری
معنی پر قناعت کر لیتے ہیں۔

۲۔ شرح : یہ ٹھیک ہے کہ تیرے تیر کا پیکان دل سے نکل گیا، مگر اس کی
لذات اب تک دل میں بدستور باقی ہے، اسی لیے دل اس کی یاد سے معمور ہے۔ اس
کا مطلب یہ ہے، تیرا پیکان اس قدر عزیز ہے کہ دل سے نکل جانے کے باوجود
وہ نہیں نکلا۔

۳۔ شرح : اسے غالب ! جو حادثہ پیش آگیا ہے، وہ بہت سخت ہے۔ اتنا
سخت ہے کہ جی چاہتا ہے، مرجائیں، مگر جان بھی عزیز ہے، اس لیے صبر کرنا، اسی
پڑے گا اور حادثے کو برداشت کیے بغیر چارہ نہیں۔

○
نے گلِ نغمہ ہوں، نہ پروہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خیم کا گل میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لاٹ تمکین، فریبِ ساوہ دلی ہم میں اور رازِ ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتِ افسانہ صیاد ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اُس ستم گر سے ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرہ نوں جس سے مڑگاں ہوئی نہ ہو گلِ باد

اے ترا غمزہ، یک قلم انگیزا : اے ترا ظلم، سرسبز انداز
 تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو ! ریش سجود جبیں نیاز
 مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا : میں غریب اور تو غریب نواز
 استاد خداں تمام ہوا : اے درینا ! وہ دندر شاید باز
 شرح : میں نہ تو نئے کا پھول ہوں، نہ ساز کا پردہ، صرف اپنی ہلکت
 کی آواز ہوں۔

نئے کے پھول وہاں بستے ہیں، جہاں ہمیشہ راحت کی مجلسیں گرم ہوں، کیونکہ
 وہیں نئے لگائے جلتے ہیں وہیں ساز کے پردوں سے دلاویز ترانے نکلتے ہیں۔ میں
 سراپا درد ہوں، مصیبت کا مارا ہوا ہوں اور اپنی بربادی و ویرانی کا فوسزبان حال
 سے سنا تا ہوں، جس طرح کسی شے کے ٹوٹنے وقت اس میں سے آواز نکلتی ہے۔
 ۲۔ شرح : اے محبوب! تو اپنی زلفوں کے بیچ دھم سنوانے میں مصروف
 ہے، تجھے عاشق کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا خیال کب آ سکتا ہے؟ میں ایسے
 تفکرات میں الجھا ہوا ہوں، جن کا سلسلہ بہت دُور تک پھیلا ہوا ہے۔

وہ تفکرات کیا ہیں؟ شاعر نے واضح نہ کیے۔ غالباً اس لیے کہ ہر شخص اپنے
 احوال کے مطابق ان کی تعبیر کرے۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی کی رائے میں ایک
 اندیشہ یہ ہو سکتا ہے، محبوب نے زلفوں کے بیچ دھم کی آرائش اس لیے ضروری
 سمجھی کہ عاشق کو اس آرائش کے ذریعے سے وفا کے رشتے میں جکڑا رکھتے۔ گویا اسے
 بدگمانی پیدا ہو گئی کہ شاید عاشق کو مجھ سے پہلے کی سی محبت نہیں رہی۔ عاشق اس
 بدگمانی کو اپنے عشق کے لیے باعثِ تنگ سمجھتا ہے۔ طباطبائی کے نزدیک اس
 آرائش سے محبوب کا مطلب یہ ہے کہ دیکھیے، اب کون کون عاشق ہے، عاشق کے
 لیے ایک اندیشہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس طرح دو سروں کو بناؤ سنگار دکھانا مقصود

ہے۔ غرض ان دور و دراز اندیشوں کی کوئی مدد نہایت نہیں اور یہی شاعر کا کمال ہے کہ بتایا کچھ نہیں، مگر وہ سب کچھ بتا گیا، جو خیال میں آ سکتا ہے۔

۳۔ لغات - تمکین : وقار - شایعہ شیط -

سینہ گداز : سینے کو گھٹا دینے والا۔

شرح : عشق میں صبر و ضبط کی ڈیگیں مارنا سادہ لوحی کا ایک فریب ہے۔ یعنی انسان سادہ دل سے اس قسم کے دھوکوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن عاشق کے سینے میں ایسے راز ایسے بھید ہوتے ہیں، جو سینہ گھٹا کر دکھ دیتے ہیں۔ کون ہے جو ان حالات میں صبر و ضبط کا دعویٰ کر سکے اور سادہ لوحی سے اس فریب میں مبتلا ہو جائے ؟

۴۔ شرح : مجھے متیاد کی الفت نے گرفتار کر رکھا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میرے بازوؤں میں اڑنے کی طاقت موجود نہیں۔ میں اڑ سکتا ہوں، لیکن متیاد کی الفت نے مجھے قید کر رکھا ہے۔

شعرا کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دنیوی تعلقات میں الجھے رہنا صرف دنیا سے محبت کا نتیجہ ہے اور نہ انسان چاہے تو یہ تمام بندھن توڑ کر آزاد ہو سکتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں ان بندھنوں کے توڑنے کی قوت موجود نہیں۔

۵۔ شرح : الٹی اکاش وہ دن بھی آہائے کہ میں اپنے سنگر محبوب کے ناز و انداز سے بہرہ حاصل کروں، ابھی تک صرف ناز و انداز کی حسرت کا تجربہ مشق بنا ہوا ہوں۔

۶۔ لغات - گلہ باز : پھوٹوں سے کہینے والا۔

شرح : میرے دل میں خون کا ایک بھی قطرہ ایسا نہیں، جس سے میری پلکوں نے پھوٹوں کی جہلی نہ کیلی ہو۔ یعنی دل میں جو بھی قطرہ خون تھا وہ آگکھوں میں پٹپٹا اور پلکوں نے پھول سمجھ کر اس سے کھیلنا شروع کر دیا۔
الغلبہ نوعین کو گلہ بازی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۷۔ لغات - انگیز : اٹھانے والا۔ جذبات برانگیختہ کرنے والا۔

شرح : اے محبوب اتیرا ہر جلوہ سرا سر جذبات برانگیختہ کرنے والا ہے اور تیرا ہر ظلم عین آزار و انداز ہے۔

۸۔ لغات - ریزش : گرنا۔

شرح : تُو نے اپنا جلوہ دکھایا۔ اس پر نیازمندی کی پیشانی کا سجدے میں گر جانا مبارک ہو۔

۹۔ شرح : اے محبوب اگر تُو نے میرا حال پوچھ لیا تو کچھ پُرانہ ہوا۔ میں غریب ہوں اور تو غریبوں پر لطف و نوازش کرنے والا ہے۔

۱۰۔ شرح : اسدا شداں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی زندگی خاتمے پر پہنچ گئی۔ آہ ! انوس اور دندا جو حیضوں سے محبت رکھتا تھا جس کا شیوہ حسن پرستی تھا۔ ایسا کون ہے جو اس کی جگہ لے سکے ؟

اسد کی جگہ پورا نام استمال کیا۔ شاید کہا جائے ہے تکلف شعری آسکتا تھا۔ حقیقت یہ نہیں۔ مرزا غالب کے شعروں کو اس طرح نہ دیکھنا چاہیے۔ یہاں اسدا شداں میں جو خفاست، بزرگی اور بلندی مرتبہ نمایاں ہے وہ تمنا اسد میں موجود نہیں اور یہاں رخصت ہونے یا تمام ہونے والے وجود کی خفاست نمایاں کرنا مضمون شعر کا خاص پہلو ہے۔ بالکل اسی طرح دوسری جگہ کہا گیا :

اما دانا نے اسدا شداں تمیں

وہ دوسے کہاں ، وہ جوانی کھر گئی



مژدہ ، اے ذوقِ اسیری ! کہ نظر آتا ہے ۱۔ شرح : اس شعر کے
دوسرے مصرع میں شکاریوں
دام خالی قضی مرغِ گرفتار کے پاس
کی ایک رسم کا ذکر ہے ، جو

جگر تشنہ آزار، تسلی نہ ہوا
 جوئے خوں ہم نے بہانی بُن سہرا کے پاس
 مند گیس کھوتے ہی کھوتے آنکھیں نہ ہے
 خوب وقت آئے تم اس عاشق بھار کے پاس
 میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے پلے
 دشناک تیز سا ہوتا، سرے غمخوار کے پاس
 دہن شیر میں جا بیٹھے، لیکن اسے دل !
 نہ کھڑے ہو جیسے خوبانِ دل آزار کے پاس
 دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ منو کرتا ہے
 خود بخود پہنچے ہے گل، گوشہ دستار کے پاس
 مر گیا پھوٹ کے سر غالبِ وحشی ہے، ہے !
 بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

تھوڑی سی تفصیل کا محتاج
 ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ
 شکار کے لیے ہلتے وقت
 جس جانور کا شکار منظور ہو،
 اس کے ایک یا ایک سے
 زیادہ بھبھوں کو پتھروں میں
 ڈال کر ساتھ لے جاتے ہیں
 حال بچا کر قریب ہی جانور یا
 کے پتھرے رکھ دیتے ہیں۔
 وہ ہونا شروع کرتے ہیں تو
 فصل یا جنگل سے دوسرے
 پرندے آواز سن کر آ جاتے
 ہیں اور اس طرح حال میں
 چس جاتے ہیں۔ دوسرے
 جانوروں کے شکار کے علاوہ
 بیڑوں کے شکار کے لیے
 اب تک بھی طریقہ رائج ہے
 پالتو بیڑوں کو سدھالیا جاتا

ہے۔ جب ان کے پتھرے ایک نصب کردہ بانس میں لٹکا دیے جاتے ہیں تو وہ ہونا
 شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں جہاں تک ان کی آواز جاتی ہے، بیڑین اڑ اڑ کر آتی ہیں
 اور حال میں چس جاتی ہیں۔

شرح : اسے اسمیری کے ذوق ! تجھے خوشخبری ہو، کیونکہ تیرے سامنے
 یہ منظر رونما ہے۔ حال بچا ہوا ہے، مگر غالی ہے، اس میں کوئی پرندہ ابھی تک نہیں

پینا۔ پاس ہی پہلے سے پکڑے ہوئے پرندے کا پنجرہ پڑا ہے۔ وہ ہب کو قید و بند کی دعوت دے رہا ہے۔ گویا تیرے لیے تسکین کا پورا سامان موجود ہے تو بھی تنہا پوری کر لے۔

اگر دام خالی نہ ہوتا تو ذوق اسیری کی تسکین کا معاملہ مشتبه رہ جاتا، کیونکہ ممکن ہے پہلے اتنے پرندے چن چکے ہوتے کہ کسی نئے مشتاق اسیری کے لیے گنجائش ہی نہ رہتی، اس لیے دام کے خالی ہونے کا پہلو بطور خاص پیش نظر لایا گیا۔

۲۔ لغات - جگر قشہ آزار : وہ جگر جو دکھ سننے اور اذیت برداشت کرنے کا پیاسا ہو۔

بُج ہر خار : ہر خار دار جھاڑی کی جڑ۔

شرح : ہمارا جگر ایذا اور تکلیف کا اتنا پیاسا تھا کہ کانٹوں والی ہر جھاڑی کی جڑیں خون کی ندی بہا دی، لیکن جگر کی تسلی نہ ہوئی۔ اس کے ذوق ایذا کی تسکین کا سامان ہم نہ پہنچ سکا۔

خود فرمایئے کہ جس جگر کے ذوق ایذا کی تسکین کے لیے کانٹوں والی ایک ایک جھاڑی کی جڑ میں لہو کی ندی بہا دی گئی، پھر بھی اس کی تسلی نہ ہوئی، اس کا ذوق کس پیانے پر پہنچا ہوا ہو گا؟

شاعر کا مدعا یہ نہیں کہ جہاں کانٹوں والی کوئی جھاڑی دیکھی، وہاں خون بہانا شروع کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ کانٹوں والی ہر جھاڑی میں الجھ الجھ کر کانٹے جسم میں چبھو لیے اور زخموں سے اتنا خون بہایا کہ ندی جاری ہو گئی۔

۳۔ شرح : شعر کے پہلے مصرع کی شرح پیشتر بھی ہو چکی ہے، یعنی صفت اتنا ہو چکا تھا کہ نظارہ محبوب کے لیے آنکھیں کھولنے کی جتنی بھی کوشش کی گئی، کامیاب نہ ہوئی اور آنکھیں بند ہو گئیں، جان جسم سے مفارقت کر گئی دیکھیے محبوب اپنے بیاد عاشق کے پاس کیسے وقت میں آیا، اس نے اتنا گرم فرمایا

لیکن ایسے وقت پر، جب اس کے کرم سے عاشق کوئی غائدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔

۴۔ **شرح :** غم کھانے والے دوست نے عین آخری وقت میں لعنت ملاست شروع کر دی، طعنہ دیے، ساتھ ساتھ نصیحت بھی کی کہ تمہیں اپنے آپ کو عشق میں اس طرح برباد نہ کرنا چاہیے تھا اور میری جان رک رک کر نکلتی رہی آہ! کاش غمخوار کے پاس زبان کی تیزی کے بجائے ایک تیز خنجر ہوتا، جو مارتا اور پس رگ رگ کر مرنے کے بجائے فوراً ختم ہو جاتا۔

غالب کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے، غمخوار کی نصیحتیں یا ملامتیں اس قدر دل آزار ہوتی ہیں کہ کسی کا تیز خنجر مار کر ختم کر دینا بھی اس سے بدتر جہا بہتر نظر آتا ہے۔

۵۔ **شرح :** اے دل! ان حسینوں کے پاس نہ بیٹھنا چاہیے، جو ہر وقت عاشقوں کو ستانے کے وہ پے رہتے ہیں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان شیر کے منہ میں جا بیٹھے۔

مطلب یہ ہے کہ شیر کے منہ میں جا بیٹھنے سے فوری موت واقع ہوگی اور حسینوں سے دل لگانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آہستہ آہستہ دکھ پہنچا پہنچا کر موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔

۶۔ **لغات :** نو کرنا : بڑھانا، بالیدہ ہونا۔

شرح : اے محبوب! تجھے دیکھ کر ہمیں اس قدر بالیدگی پیدا ہوتی ہے، ہر چیز اس طرح بڑھنے لگتی ہے، کہ پھول خود بخود دستار کے گوشے کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ گوشہ دستار پھولوں کے پودوں سے بہت اوجھا ہوتا ہے۔ جب تک ہمیں غیر معمولی بالیدگی اور نو پیدا نہ ہو، پھول گوشہ دستار تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

۷۔ **شرح :** دیوانہ غالب سر پھوڑ کر مر گیا ہے، بڑا امنوس ہے! وہ ہر سزا آ کر تیری دیوار کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ اُس کا وہ بیٹھنا اب یاد آ رہا ہے۔ مولانا طباطبائی نے بالکل سمجھا دیا ہے کہ شعر میں خبر سے زیادہ انشائلیت

پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاق شاعر خبر کو بھی انشا بنالیتا ہے۔ مثلاً اگر کہا جاتا کہ وہ تیری دیوار کے پاس آکر بیٹھتا تھا۔ تو یہ خبر ہوتی، لیکن موجودہ صورت میں جملہ انشائیہ بن گیا۔ پھر لفظ ”وہ“ سے اشارہ اس طرف ہے کہ جس محبوب سے خطاب ہے، وہ اس واقعے سے بے خبر ہے اور ”وہ“ کو ”کرا“ سے غالب دیوانہ کا شیوہ یاد دلایا گیا ہے۔ لفظ ”آکر“ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس دیوانے کا دستور یہ تھا کہ جن اوقات میں اسے جمالِ محبوب دیکھنے یا آوازِ محبوب سننے کی امید ہوتی تھی، اس لی دیوار کے پاس آ بیٹھتا تھا۔ اگر ”آکر“ اس مصرع میں نہ ہوتا تو فقط اس کے بیٹھے رہنے کا واقعہ ضرور تازہ ہو جاتا، مگر غالب دیوانہ کا آکر بیٹھتا پیش نظر نہ آتا اور شعر کا حسن کم ہو جاتا، کیونکہ آکر بیٹھنا ایک حرکت اور ایک اداسہ، محض بیٹھے رہنا سکون و طمانیت ہے اور دونوں کا فرق ظاہر ہے۔



نہ یوے گر خس جو ہر اطر اوت سبزہ خط سے
لگا دے غائۂ آئینہ میں روے نگار آتش
فروغِ حُسن سے ہوتی ہے جلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پاسے، نکالے گردِ خار آتش
تکے جلد آگ پکڑ لیتے اور جل اٹھتے ہیں۔
روے نگار : محبوب کا چہرہ۔

شرح : محبوب آئینہ دیکھ رہا ہے۔ شاعر کو معانیِ خیال آیا کہ ایسے آتشیں رخسارِ محبوب کا عکس تو جو ہر آئینہ کے تنکوں کو آگ لگا سکتا ہے اور غائۂ آئینہ آگ کی نذر ہو سکتا ہے۔ پھر خیال آیا، جو ہر کے تنکے اس لیے آگ

نہیں پکڑتے کہ محبوب کے سبڑ خط سے ان تگنوں کو عراوہ مستہ پہنچ رہی ہے اور جوئے
نہم آلود ہو جائے، وہ آگ نہیں پکڑتی۔

پورے شعر سے مقصود صرف یہ ہے کہ محبوب کے جہاں کا نقشہ پیش کیا جائے،
جو دوسروں کے نزدیک ممکن ہے، مبالغے پر مبنی ہو، مگر عاشق کے نزدیک احساسات
کا زیادہ سے زیادہ صحیح مرتب ہوتا ہے۔

۲۔ شرح : سن کی جلوہ آرائی ہی سے عاشق کی ہر مشکل دور ہوتی ہے
اور اس سے حمد برآ ہونے کا راستہ نکل آتا ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے
ہیں کہ شمع کے اندر جو دھواں لگا ہوتا ہے، وہ کانٹے کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ہر
ہے کہ وہ کانٹا آگ ہی نکالتی ہے۔ یعنی شمع روشن ہو تو دھواں کا بلبلا رہتا ہے، موم
پگھل پگھل کر ختم ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ شمع ختم ہو جاتی ہے اور دھواں بھی
باقی نہیں رہتا۔ اس حالت کی تعبیر یوں کی گئی کہ شمع کے پاؤں سے کانٹا نکل گیا۔
معاذیہ کہ جس طرح آگ شمع کے پاؤں سے کانٹا نکالتی ہے، اسی طرح سن
کی جلوہ آرائی عاشق کی مشکلیں حل کر دیتی ہے۔



۱۔ لغات : خور : جادہ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع

خورشید - سورج ۔
واکرنا : کھولنا ۔
چرخ واکرنا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

وداع : رخصت ۔

شرح : اس شعر میں سورج کے غروب اور ہلال کے نکلنے کا منظر پیش
کیا گیا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ کرن کا تار سورج کے لیے سفر کا راستہ بن گیا
ہے۔ افق پر نیا چاند طلوع ہو گیا ہے، چونکہ اس میں صبح کا وقت ہوتا ہے، اس لیے
اسے آغوش سے تشبیہ دی گئی ہے اور فرمایا گیا کہ یہ نیا چاند نہیں، بلکہ آسمان نے
سورج کو رخصت کرنے کے لیے آغوش کھول دی ہے۔

عام دستور ہے کہ رخصت کے وقت درختی نفل گیسر ہوتے ہیں گویا نفل کھول کر
بھٹتے ہیں۔ اسی طرح سورج کو رخصت کرنے کے لیے آسمان نے ماہ نور سے نفل کھول دی۔

۱۔ لغات۔ آتش گل :
لغوی معنی پھول کی آگ، یہاں
اشارہ ہے محبوب کی سرخی رخسار
کی طرف جو آگ سے مشابہ ہے۔
شرح : شمع میں جو متعل
سوز اور ملین موجود ہے، وہ محبوب
کے رخسار کی وجہ سے ہے۔ یہی
آتش گل ہے جو شمع کے لیے
آپ حیات بن گئی ہے، یعنی محبوب
کے رخسار ہی کی بدولت شمع میں
روشنی ہے۔
شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے
کہ محبوب کے حسن پر حسد کے بلوٹ
شمع میں جلن پیدا ہو گئی گویا اس
کے جلنے کی وجہ رخسار محبوب کا حسد
ہے۔ دوسرے مصرع کا مطلب
اس صورت میں بھی وہی رہے گا
جو بیان ہو چکا ہے، یعنی یہی رخسار
جسے ہر اعتباراً طاعت و لایز
پھول اور ڈنڈہ ہانے کے باعث

سرخ نگارے ہے سوزِ حساب و ادائی شمع
ہوئی ہے آتش گل، آپ زندگانی شمع
زبانِ اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع
کرے ہے صرف بہ ایسا شعلہ، قصہ تمام
بطرز اہل قدا ہے فسانہ خوانی شمع
غم اس کو حسرت پروانہ کا ہے لے سعد
ترے رزقے سے ظاہر ہے تا تو انی شمع
ترے خیال سے روح اتہزائے کرتی ہے
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پر فشانی شمع
نشاط داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ
فلک فلک ہے شہید گلِ خزانہ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھے کو
نہ کیوں ہو دل پر مرے داغ بدگمانی شمع

انگ سمجھنا چاہیے، شمع کے لیے آب حیات بن گیا۔

۲۔ **شرح :** اہل زبان کے معادے میں موت چپ ہو جانے کا نام ہے یہ حقیقت مجلس میں شمع کی زبانی روشن و آشکارا ہوئی۔

شعر میں کلمہ صرٹ اتنا ہے کہ شمع کے بجھنے کو خاموش ہو جانا بھی کہتے ہیں جس طرح موت چپ ہو جانا ہے، اسی طرح شمع کا بجھنا اس کے لیے موت ہے، لیکن وہ روشن ہو تو اسے زندہ مانا جاتا ہے۔ محفل اس کی روشنی سے فائدہ اٹاتی ہے۔ یہ حقیقت بھی شمع نے بزم میں روشنی سے آشکار کر دی۔ اگر وہ روشن نہ ہوتی اور بجھ جاتی تو بزم میں اسے پارہی نہ ملتا۔

مرگ، خاموشی، بزم، روشن، شمع کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

۳۔ **لغات :** ابتدا : اشارہ۔

شرح : دیکھیے شمع صرٹ شعلے کا اشارہ پاتے ہی اپنا قصہ تمام کر دیتی ہے، یعنی جل بجھتی ہے۔ گویا شمع کی انسانہ خوانی میں بھی اہل فنا کا طریقہ نایاں ہے۔ جس طرح بہت دور لوگ حلق حقیقی کی نورنگا کر فانی الذات ہو جاتے ہیں، اسی طرح شمع شعلے کا اشارہ پاتے ہی سر سے پاؤں تک گھٹ کر غم ہو جاتی ہے۔

قصہ اور مناد خوانی کی مناسبت نکلا ہے۔

۴۔ **شرح :** آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ موسم جی بھلائی جائے تو اس کی نور لڑاں ہوتی ہے۔ اسے شعلے کا لڑنا قرار دیا۔ کہتے ہیں کہ اسے شعلہ اتیرے لڑنے سے نکلا ہے کہ شمع بے حد کمزور و ناتواں ہو گئی ہے۔ پھر خود ہی وجہ بیان کرتے ہیں کہ اسے پروانے کی حسرت کا غم کھا گیا، وہی غم اس کی ناتوانی کا سبب بنا۔

۵۔ **لغات :** استہزاز : لغوی معنی جنبش، حرکت۔ چونکہ سرور و نشاط میں بھی جسم کے اندر ایک خاص چستی اور حرکت پیدا ہوتی ہے اس لیے یہ لفظ سرور و نشاط کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

مجلوہ ریزی باو : ہوا کا جلوہ دکھانا یعنی چلنا۔

پرفشانی شمع : شمع کا چمڑا یا مین جھلانا ۔

شرح : اسے محبوب : تیرے خیال سے روح میں اسی طرح جذبش و حرکت پیدا ہوتی ہے جس طرح ہوا کے چلنے سے شمع جھلانا لگتی ہے ۔

دوسرے مصرع میں ہوا کے چلنے اور شمع کے جھلانا کو تسمیہ اخلاص میں کہا ۔ یعنی دونوں کے ساتھ فارسی کا ۔ یہ تسمیہ لگایا ۔ مطلب یہ ہوا کہ یقیناً تیرے خیال سے روح رقص کرنے لگتی ہے اور اس کے لیے ہم ہوا کے چلنے اور شمع کے جھلانا کی قسم کھاتے ہیں ۔ مطلب : ہر حال دی ہے جو چاہئے بیان ہو چکا ۔

۶۔ لغات ۔ گل خزانہ : وہ پھول جس پر خزاں نے اثر کیا ہو ۔

شرح : غم عشق کے داغ سے ہمیں جو سرد و تشا ط حاصل ہے ، اس کی بہار کے بارے میں کچھ نہ پوچھ ۔ یہ سمجھ لے کہ شمع کے خزاں دیدہ یعنی المنورہ و چمڑہ پھول پر شگفتگی قربان ہو رہی ہے ۔ شمع کا خزاں دیدہ پھول وہ گل ہوتا ہے جو اس کے چلنے سے پیدا ہوتا ہے ۔ اسے داغ غم عشق سے تشبیہ دی گئی ، بہار تشا ط کے لیے شگفتگی دے ۔

۷۔ لغات ۔ بالین : سرانا ۔

شرح : شمع مجھے محبوب کے سر ہانے دیکھ کر حسد سے جل رہی ہے ، یعنی وہ مجھے اپنا رقیب سمجھ رہی ہے ۔ اس کی ہد گانی کا داغ میرے دل سے مٹ نہیں سکتا ۔

بیم رقیب سے نہیں کرتے دواغ ہوش
مجبوریوں تک جوے لے اختیار حیف !
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
لے ناتما می نفس شعلہ بار ، حیف !
شرح : ہمارا ہی تو یہ چاہتا
ہمیں کہ ہوش و حواس کو رخصت کر دیں
اور دیوانے بن کر مٹیہ جائیں ، لیکن
رقیب کے ڈرنے مجبور کر دیا ۔ اور
ہوش و حواس کو رخصت نہ کیا ۔
اسے اختیار ! تجھ پر انوس !

ڈرے ہے کہ یا تو ہوش و حواس کو دینے سے رقیب پر راز عشق فاش ہو جائے گا یا

یہ اندیشہ ہے کہ ہم بوش ہر اس کھو بیٹے تو رقیب محبوب کے انتقام سے بے تکلف
 فائدہ اٹھائے گا۔ اختیار پر انوس کا سبب یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو ہم یقیناً بوش دھکا
 کھو بیٹھتے کہتے ہیں، اب ہم اس درجہ مجبور ہو گئے کہ ہوش دھکا اس کو بھی رخصت نہیں
 کر سکتے۔ اس لحاظ سے اختیار پر انوس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے کام نہیں لے سکتے
 ایسے اختیار اور بے اختیاری میں کوئی فرق نہ رہا۔

۲۔ شرح : ہمارا دل اس پر گڑھنا ہے کہ سانس نے کیوں ایسی آگ نہ
 برساتی جو ہمیں ایک ہی دفعہ جلا دیتی۔ آہ ! اس آگ برسانے والے سانس کی
 ناکامی اور ادھر اور اپن کر وہ ہلکی ہلکی آگ برساتا ہے، جو نہ ہمیں جلا سکی اور نہ جلنے
 سے نجات دلا سکی۔

○
 زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلان بے پروا تک
 کیا مزہ ہوتا، اگر سچر میں بھی ہوتا تک
 گرد و آوارہ ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
 ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا تک
 مجھ کو آرزوئی ہے، تجھ کو مبارک ہو جو
 نالہ لبیل کا درد اور خندہ گل کا تک
 شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
 گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجِ دریا تک

۱۔ شرح : لڑکوں کی
 بے پروائی اور لالچالی پن سے
 کہاں اتید ہو سکتی ہے کہ زخموں
 پر تک چھڑکیں گے، وہ تو دیوانے
 کو سچر مار مار کر ایذا پہنچے اور
 خوش ہونے کے عادی ہیں۔ کاش
 سچر تو، میں بھی تک ہوتا، لڑکے
 مجھے سچر مارتے اور خوش ہوتے۔
 اس طرح ایذا کے علاوہ زخموں
 کے لیے تک کا انتقام بھی ہوتا
 جاتا اور خوب نطف آتا۔

۲۔ شرح : زخمِ دل
 کے لیے غم و ناز کا سامانِ محبوب

داو دیتا ہے سرے زخم جگر کی 'واہ' واہ!
 یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس ٹانگ
 چھوڑ کر جاتا تھ مجروح عاشق حیف ہے
 دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا
 غیر کی مرثیہ نہ کھینچوں گا پے تو فیر درد
 زخم، مثل خندۂ قاتل ہے، ستر پانک
 یاد میں غالب! تجھے وہ دن؟ کہ وہی فدق
 زخم سے گرتا تو میں پلوں سے پھٹتا تھا، ٹانگ
 دوسرے مصرع کے پہلے ٹکڑے سے ہے اور پہلے مصرع کے دوسرے مصرع

کے سامنے کی گرو ہے۔ اُسی گرو
 سے زخموں کو ٹانگ کا مڑہ مل سکتا
 ہے، اُسی سے وہ بھر سکتے ہیں
 وہ نہ دنیا میں اتنا ٹانگ کہاں پیدا
 ہوتا ہے کہ زخم دل کے لیے برقرار
 فدق لذت اور اندام کا سامان
 دیتا ہو سکے۔

۳۔ لغات۔ ارذانی

نصیب رہے، مٹا رہے۔

شرح : شعر میں

لف و نشر مرثیہ ہے۔ یعنی پہلے
 مصرع کے پہلے ٹکڑے کا تعلق

دوسرے مصرع کے پہلے ٹکڑے سے ہے اور پہلے مصرع کے دوسرے مصرع

مطلب یہ کہ مجھے نالہ بیل کا درد نصیب رہے، میرے لیے یہی مناسب ہے اور
 اسی کو زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں اور اسے محبوب! تجھے خندۂ گل کا ٹانگ مبارک ہو۔
 خندۂ گل سے سراو پھولوں کا بھلنا ہے، جسے چھوؤں کی ہنسی قرار دیا جاتا ہے
 اور محبوبوں کی ہنسی شاعروں کے نزدیک ٹانگ کا حکم رکھتی ہے، خصوصاً اس حالت
 میں کہ عاشق پریشاں حال اور وسط سے لاچار ہوں، یہاں بہر محبوبوں کی ہنسی میں فرق
 نہ آئے۔ یہ کیفیت گل و بیل کے معاملے میں بالکل آشکارا ہے۔ یعنی بیل کے دل
 سے درد ٹانگ صدا نہیں بلند ہوتی ہیں۔ پھول بدستور کھلتے رہتے ہیں اور ان کی ہنسی
 بیل کے زخم دل پر ٹانگ چھڑکتی رہتی ہے۔

۴۔ لغات : شوریہ جولاں : گھوڑا دوڑانے اور شمسواری کرنے

کا شور۔

شرح : آفتِ سمندر کے کنارے کس کے گھوڑا دوڑانے کا شور بپاؤ ہو کہ ساحل کی مٹی سوچا دریا کے زخم کے لیے نلک بن گئی ؟ شور سے یہاں دو معنی مراد لیے ، اول غوغا و ہنگامہ دوم نلکینی ۔ پھر سمندر کا کنارہ لائے اور اس کے اندر جو موجیں اٹھتی تھیں ، ان میں زخمِ فرض کیے اور ان کے لیے ساحل کی مٹی کو نلک بنا دیا ، جس میں حقیقتہً محبوب کے گھوڑا دوڑانے سے ملاحمت پیدا ہو گئی تھی ۔

مرزا نے خود عبدالرزاق شاکر کو لکھا ہے :

”پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مسما میں خیالی نکاح کیا دس برس میں بڑا دیوان بنے ہو گیا ۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا ۔ اور اسی قلم چاک کیے ۔ دس پندرہ شعروں سے نونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے ۔“

مرزا نے نہیں بتایا کہ وہ کون کون سے شعر تھے جو نونے کی عرض سے باقی رکھے ؟ لیکن وہ ایسے ہی ہوں گے ، جیسے یہ شعر یا پوری غزل ، جس کی روایت نلک پھر فرمائی ۔

۵۔ شرح : واہ وا محبوب میرے زخمِ جگر کی خوب داد دیتا ہے جہاں کہیں نلک دیکھتا ہے ، میں اسے یاد آجاتا ہوں ۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے ، سارا نلک میرے زخمِ جگر کے لیے وقف ہو جائے ۔ دوسرے معنی یوں پیدا ہوتے ہیں کہ یاد کرنے سے مراد بلا لیتا ہوا جانے ، یعنی محبوب کو جہاں نلک نظر آتا ہے ، مجھے بلا لیتا ہے کہ میرے زخمِ جگر پر چھڑک دے یا اس میں تھوڑا مقصد کہ دنیا بھر کا نلک بھی میرے زخمِ جگر کے لیے کافی نہیں ۔ محبوب کو اس حقیقت کا علم ہے اور وہ میرے زخم کی داد پوری فراخ حوصلگی سے دے رہا ہے ۔

۶۔ لغات - تن مجروح : زخموں سے چوڑ جسم ۔

شرح : اسے محبوب عاشق کے جسم کو 'جو زخموں سے چوڑ ہے' یوں چھوڑ جانا قابلِ افسوس ہے ۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ اور زخم لگیں ۔ اعضا چاہتے ہیں کہ ان پر خوب نمک چھڑکا جائے ۔ گویا عاشق کے زخم تو لگا دیے گئے ، لیکن جتنے زخموں کا وہ طلب گار تھا ، اتنے نہ لگائے گئے اور ان پر نمک پاشی بھی نہ ہوئی ۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جسم کو تو مجروح کر دیا ، لیکن دل پر کوئی چرکا نہ لگا ، حالانکہ وہ بھی زخموں کا طلب گار ہے اور اعضاء کو نمک بھی نصیب نہ ہوا ، غرض عاشق کی لذتِ ایذا کے لیے تسکین کا کوئی سامان نہ ہوا ۔

۷۔ مرثت کھینچنا : احسان اٹھانا ۔

توفیر : دانہ کرنا ، زیادہ کرنا ۔

شرح : میں اپنا درد بڑھانے اور زیادہ کرنے کے لیے غیر کا احسان نہ اٹھاؤں گا ۔ میرا زخم خود بخود تاقی یعنی محبوب کی ہنسی کی طرح سرا سرنم ہی ہے ۔ اس لیے خود بخود میرے درد میں اضافہ ہو رہا ہے ، پھر غیر کا احسان کیوں اٹھاؤں ؟

۸۔ لغات - وجہ ذوق : لطف کی سرسستی اور لذت کی بھوڑی ۔

شرح : اس شعر میں ایک پرانا خیال شاعر نے پیش نظر رکھا ، جو عموماً عورتوں میں رائج تھا ۔ یعنی نمک کے سسلے میں امتیاض کی غرض سے کہا کرتی تھیں کہ دیکھنا ، نمک گرنے نہ پائے ، ورنہ قیامت کے دن پلوں سے ٹپٹنا پڑے گا ۔

یہ خیال غالباً یوں پیدا ہوا کہ زمانہ قدیم میں ان حصّوں کے اندر نمک کیاب تھا ، جو ساحلِ بحر یا نمک کی کانوں سے دور تھے ۔ اس لیے نمک کی حفاظت زیادہ سے زیادہ ضروری تھی ۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے غالب ! تجھے وہ دن بھی یاد ہیں ، جب لطف

کی سرسختی اور لذت کی بخودی میں میری حالت یہ تھی کہ اگر تک زخم سے گر جاتا تھا تو میں اسے پلوں سے چٹتا تھا ؟

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ یا تو ”تجھے“ کی جگہ ”مجھے“ ہونا چاہیے یا ”میں“ کی جگہ ”تو“ لیکن اس تغیر کی کوئی ضرورت نہیں۔ دو آدمی ایک کیفیت دیکھ چکے ہوں تو ایک دوسرے کو مخاطب کر کے وہ کیفیت یاد دلایا جاتا ہے۔ شاعر نے غائب کو اپنا رفیق اور ساتھی قرار دے کر یہ سب کچھ کہہ دیا کہ تو تو اس کیفیت سے واقف ہے، میں ایک زمانے میں زخموں سے گرتا ہوا تک پلوں سے چٹتا تھا۔



۱۔ لغات۔ سر ہونا:

اس محاورے کے معنی میں اختلاف ہے اور کسی ایک معنی کو ترجیح دینے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔ فارسی میں ”سر شدن“ شروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ سر شدنِ قلم کا مطلب ہے قلم بن جانا۔ مولانا طہطائی نے اس کے معنی سمجھنے اور باخبر ہونے کے لکھے ہیں۔ نور اللغات میں مرزا غالب کا یہ شعر ہے طویر سند پیش کر کے سر جوئے کے معنی پہنچ گھٹنے کے بتائے ہیں۔ ساتھ ہی لکھ دیا ہے کہ اب یہ معنی متروک ہیں۔ اس

آہ کو چاہیے اک عمر، اثر ہونے تک کون جیتا ہے، تری زلف کے سر جوئے تک دام ہر موج میں ہے، حلقہ صد کام ہنسنگ دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرے پہ، گزر جوئے تک عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک بہنے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر جوئے تک پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تسلیم میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر جوئے تک

ایک نظر بیش نہیں فرصت ہستی، اغافل ! کے ایک عام معنی مسخر کرنا بھی

گر ہی بزم ہے اک رقص شر ہو نیلک شرح : آہ کے اثر پذیر ہے

غم ہستی کا اسد ! کس سے ہو جو مرگ علاج ہونے کے لیے ایک مرد کار

شع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک ہے ۔ اب محبوب اتیری زلف کے ہر ہونے تک کون جیتا

رہے گا : زندگی ختم ہو جانے کی اور تیری زلف بدستور عاشقوں کے حال زار سے

بے خبر رہے گی ۔ اس کے خبردار ہونے یا پہنچ و غم کھلنے تک ہمارے یا کسی دوسرے

کے زندہ رہنے کی امید ہی کب ہے ؟ یا کون کہہ سکتا ہے کہ تیری زلف کب مسخر

ہوگی اور ہم اس وقت تک جیتے رہیں گے ۔ ۲۔ لغات : کام ننگ : گرچہ کا حلق ۔

شرح : خواہر عاکی دڑاتے ہیں : جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے " وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان

کو درجن کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس دنیا میں حوادث کے جو طوفان اٹھتے رہتے ہیں ان میں سے ۔

صبر و ہمت کے ساتھ گزرتے ہوئے کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا بہت مشکل ہے اور

ہر انسان کسی بلند و شایان مقصد پر نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہر قسم کی مصیبتیں

برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے ۔ زندگی ایک ایسا سمندر ہے جس میں

قدم قدم پر جال بچھے ہوئے ہیں اور ان کے حلقے ڈوروں سے تیار نہیں ہوئے

بلکہ ان کی جگہ مگر مچھروں کے حلق رکھ دیے گئے ہیں ۔ پھر ایک ایک قدم پر سیکڑوں

مگرچہ حلق کھوے بیٹھے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان مصائب کو اگلینا کرتے ہوئے کسی بلند

مقصد کی طرف بڑھنا ہرگز سہل نہیں ۔ مرزا نے پہلے مصرع میں خطرات کا منظر

پیش کیا ۔ دوسرے میں اصل مقصد واضح کیا ۔ پوری کیفیت کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ زندگی کے سمندر کی ہر موج ایک جہاں کی حیثیت رکھتی ہے۔ موج کو جہاں سے تشبیہ دینا عام مشاہدہ ہے۔

۲۔ یہ جہاں ڈور لہروں سے تیار نہیں ہوئے، بلکہ سیکڑوں مگر چھوٹے کھول کر میٹھے گئے، اس طرح ان کے حلقوں کے قوار سے جہاں تیار ہو گئے۔

۳۔ خطروں اور چاکتوں کی یہ کیفیت سامنے رکھ کر وہ سوچتے ہیں کہ ان میں سے گزرتے ہوئے قطروں کو موقی بننا ہے۔

۴۔ قطرہ سمندر سے باہر نکلے گا تو مٹی میں جذب ہو جائے گا۔ اندر ہی رہ کر اسے اوج کمال تک پہنچنا ہے۔

۵۔ ظاہر ہے کہ وہ جب تک خطروں کے مقابلے کے لیے صبر اور اپنے مقصد کے لیے استقامت پیدا نہ کرے گا، منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے گا۔

۶۔ مرزا کا کمال یہ ہے کہ خطرات زیادہ سے زیادہ معین شکل میں پیش کر دیے۔ باقی رہا یہ امر کہ عمل اور تقاریر میں قطرے پر کون کون سی آفتیں آئیں گی ان کا کوئی تعین نہ کیا اور تعین ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ ہر قطرے کو یکساں حالتیں پیش نہیں آسکتیں اور ان کا اندازہ ہر پڑھنے والا خطرات پیش نظر رکھتے ہوئے خود کر سکتا ہے۔ حقیقتاً شعر میں عدم تعین بھی لطیف اندوزی کا ایک خاص عامل ہے۔

بطور خاص عز طلب نکتہ یہ ہے کہ ان تمام خطرات میں نصب العین قطرے کا گوہر بننا ہے، جسے شاعر قطرے کے لیے منتہائے کمال قرار دیتا ہے۔

۳۔ لغات - رنگ : مال - کیفیت۔

شرح : عشق کے لیے مہر کے سوا چارہ نہیں اور متناجی قرار ہے،

یعنی جانتی ہے کہ ہر مقصد ابھی پورا ہو جائے۔ اب حیران ہوں کہ جگر کا خون ہونے تک دل کا کیا حال کروں؟

متنا کا مقام دل ہے اور مہر کا مقام جگر اور مرزا نے دل و جگر کے یہ دلیلیں

الگ الگ واضح کر دیے۔ صبر کا خاصہ یہ ہے کہ جگر پر زیادہ سے زیادہ بار پڑے اور وہ خون ہو جو کہ بہتا جانے۔ مرد اچھے چھتے ہیں کہ صبر کی آخری منزل پر پہنچنے تک میں دل کو یہ نہ بولتا ہوں کہ میں لافوں ؟

شعر میں بے تکلفی سے جتنی مناسبتیں جمع کر دی گئی ہیں، وہ دراصل احوال و سنواری کا ایک کرشمہ ہیں۔

۴۔ شرح : عاشق محبوب سے اپنا حال بیان کر رہا ہے۔ محبوب کتنا ہے ؟ فکر ذکر وہ میں تمہارے حال سے تفاعل نہ برقرار نہ کر سکتا ہوں کہ آپ تفاعل نہیں کریں گے، لیکن یہ بھی تو بلا ہر ہے کہ جب تک آپ کو ہماری خبر ملے گی اور آپ ہمارے حال پر توجہ فرمائیں گے، اس وقت تک تو ہم ختم ہو کر نہ محض قبر میں جا سکیں بلکہ ہمارا جسم بھی مٹی میں مل جائے گا۔

شعر میں دراصل محبوب کے تفاعل کا نقشہ عنایت پر تاثیر انداز اور عنایت و انشیں الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ کوئی مصور اس ذہنی کیفیت کی تصویر نہیں کھینچ سکتا اور مردانے چند لفظوں میں اسے ایسا پرداز دے دیا ہے کہ ہر فرد کے سامنے پوری کیفیت آ جاتی ہے۔

۵۔ لغات۔ پر تو خور : سورج کا جلوہ، جس کی مدت اور تمامت شبہم کو اڑا لے جاتی ہے۔

شرح : سورج کی روشنی شبہم کے لیے فنا کا سبق ہے، یعنی کرنیں پڑتے ہی شبہم کے قطرے اڑا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ گویا سورج کی کرنیں انھیں فنا کے فنا پر پہنچا دیتی ہیں۔ اے محبوب ! اسی طرح میری مہتی بھی عنایت کی مرث ایک نظر پہلے تک باقی ہے، جب آپ کی نظر عنایت مجھ پر پڑ جائے گی، جس طرح سورج کی کرنیں شبہم پر پڑتی ہیں، میں بھی اسی طرح فنا کے گھاٹ اتر جاؤں گا۔

شاعر نے دوسرے مصرع میں کوئی معین مطالب نہیں رکھا۔ بلکہ ہر اس سے مقصود و مجہد حقیقی ہے، جس کی نظر عنایت تمام غیر حقیقی اور اعتباری ہستیوں کو اپنے

اندروں پر کر سکتی ہے۔

۴۔ شرح : اے غافل انسان ! زندگی کی مدت ایک نظر سے زیادہ نہیں۔ یعنی نظر اٹھاؤ، دیکھنا اور ختم ہو گئی۔ دوسرے لمحوں میں کر سکتے ہیں کہ یہ فرصت چمک چمکنے تک محدود ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ بستی ایک بزم اور ایک انجمن ہے، اس کی گرمی اور رونق صرف اتنی ہوتی ہے، جتنی دیر میں چمکری تڑپ کر اٹھے اور ختم ہو جائے۔

۵۔ شرح : خواہ بہ حال فرماتے ہیں :

”انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی، غم سے نجات نہیں ہوتی، شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی، وہ برابر جلتی رہتی ہے۔“
 ساتھ ہی فرماتے ہیں :

”اس قسم کی تاؤ و بد پرچ تہنات سے مرزا کے دونوں دیوان، اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں۔“

اے استاد ! زندگی کے غم کا علاج موت کے سوا کون کر سکتا ہے ؟ یہ بیماری مرنے ہی پر ختم ہوگی۔ دیکھیے، شمع کو رات کے وقت جلاتے ہیں اور جب تک صبح نہ ہو جائے، وہ برابر جلتی رہتی ہے۔ یعنی اس کی سوزش کا خاتمہ صبح طلوع ہو جانے پر ہوتا ہے۔ یہی کیفیت غم بستی کی ہے اے بھی ایک شمع سمجھنا چاہیے، جو کابر جلتی رہے گی اور صرف موت اسے بجھائے گی، کیونکہ غم بستی کی شمع کے لیے موت ہی صبح کا حکم رکھتی ہے۔

۱۔ لغات : اجابت : گرتھ کو ہے یقین ہا بابت، دوا نہ مانگ
 قبول ہونا۔ منظور ہونا۔
 یعنی بغیر تک دِل بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یا د ! دل بے مدعا : ایسا دل جس
مجھ سے مرے گنہ کا حساب لے خدا ! نہ مانگ
کا کوئی مدعا نہ ہو جو ہر غرض
سے پاک ہو۔

شرح : اگر تجھے دعا کے قبول ہونے کا یقین ہے تو ایک ایک چیز کے
یہ دعا مانگ۔ اگر مانگنا چاہتا ہے تو خدا سے ایسا دل مانگ لے جس کا کوئی مدعا
نہ ہو جو غرض سے بالکل پاک ہو، جب ایسا دل مل جائے گا تو کبھی کسی چیز کے یہ
دعا مانگنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ کیونکہ وہ بے مدعا ہونے کے باعث کسی شے پر
ملفقت ہی نہ ہو گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرزا نے دل بے مدعا مانگنے کے یہ قبول ہونے کے
یقین کی شرط کیوں لگائی، یعنی کیوں کہا کہ اگر تجھے دعا قبول ہونے کا یقین ہے تو یہ
مانگ اور یہ نہ مانگ ؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص کو یقین اجابت ہو تو دعا مانگے
مطلب صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر واقعی کسی کی کو قرآن سے اجابت کا یقین ہو
جائے تو دل بے مدعا مانگنا چاہیے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل بے مدعا کیوں مانگا جائے ؟ آیا واقعی مرزا غالب
لوگوں کو دعا سے روک رہے ہیں اور اسی لیے امنوں نے دل بے مدعا مانگنے کی
تلقین کی ؟ مبض اہل تحقیق نے فرمایا ہے : خدا عالم الغیب ہے، لہذا جو تمنا کسی
کے دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کا علم عالم الغیب کو ہو جاتا ہے، پھر مانگنا فعل عبث
ہے۔ اگر وہ تمنا پوری نہیں ہو سکتی تو اس کا بھی علم ہے اور مانگنا اس صورت میں
بھی بیکار ہو گا، لیکن یہ سب تکلفات ہیں۔ مرزا نے دعا سے نہیں روکا، بلکہ ہر لحظہ
ہر وقت ایک ایک چیز کے لیے دعائیں مانگنے سے روکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دینی،
مقامی اور دنیاوی کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ انسان مانگنے پر آتا ہے تو مانگتا جا۔
ہے۔ دل میں استقامت پیدا کرنی چاہیے۔ دنیا کی چیزوں سے زیادہ وابستگی نامناسب
ہے اس غرض سے دل بے مدعا مانگ لینا بہتر ہے۔

دل بے مدعا سے بھی مرزا کا مدعا یہ نہیں کہ دل میں کوئی آرزو کوئی تمنا باقی ہی نہ رہے، مدعا صرف یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں کے لیے جن کی حیثیت سراسر دنیوی ہے، مانگنا مناسب نہیں۔

۲۔ **شرح :** اے خدا! مجھ کے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، کیونکہ جب حساب کا سامنا سامنے آئے گا تو گناہوں کے ساتھ مجھے یہ بھی یاد آتا ہائے گا کہ کون کون سی حسرتیں دل میں رہ گئیں اور گناہ بھی بہ اندازِ شایاں ذکر سکا۔ ان حسرتوں کے داغ دل پر موجود ہیں اور گناہوں کا حساب دیتے وقت وہ تمام داغ تازہ ہو جائیں گے۔

مرزا کو یہ مضمون بہت پسند ہے۔ اردو میں وہ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

ناگروہ گناہوں کی بھی حسرت کی طے داو

یاد ب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

پھر فارسی کی ایک غزل میں مزیاتے ہیں :

اندہ آں روز کہ پرستش روز از ہر چہ گوشت

کاش ہاں سخن از حسرت مانیز کفند

یعنی جس روز اعمال کی پرستش ہوگی، کاش اُس روز میری حسرتوں کے متعلق

بھی بات چیت کر لی جائے۔

مشنوی "ابرگر باز" میں یہ مضمون تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ خواجہ

حالی مرحوم نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے "یادگار غالب" میں پیش کر دیا ہے۔

خواجہ مرحوم مزیاتے ہیں :

"بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا! مجھ سے میرے گناہوں کا

حساب نہ مانگ اور درپودہ الزام دینا ہے۔ گویا کہتا ہے کہ گناہوں کا

حساب کیونکر دوں؟ وہ شمار ہیں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار

کرتا ہوں تو وہ داغ جو کونے دنیا میں دیے ہیں اور جو شمار میں اسی

کثرت سے ہیں جن کثرت سے میرے گناہ ہیں۔ ان کی گنتی یاد آ جاتی ہے۔

”گناہوں اور انہوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھتی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بہ سبب ہدم استطاعت کے اسے خاطر خواہ نہ کر سکا۔ کوئی نہ کوئی حسرت منورہ باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو دسل نصیب نہ ہوا، دسل تیسرا آیا تو شراب نہ ملی۔“

”ایم گمبار“ کی مناجات میں کم و بیش فوتے اشعار اسی موضوع پر ہیں اور وہ اس قابل ہیں کہ انہیں پڑھ کر مرزا غالب کے نقطہ نگاہ کا صحیح اندازہ کیا جائے۔ گناہوں کے سلسلے میں بے استطاعتی کے باعث حسرت رہ جانے کا قصہ اس سوز و درد سے بیان کیا ہے کہ انسان کے لیے اسے الہینان سے پڑھنا مشکل ہے اور لطف یہ کہ ہندگی اور عبودیت کا کوئی بھی پہلو باقی نہیں چھوڑا۔ آخر میں کہتے ہیں۔

بہر جرم کز درد سے دفتر رسد	فمن حسرتے در برابر رسد
بفرما کے کیں داوری چوں بود	کہ از جرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ بچوں منے را بمند	تلائی فراخورد بود نے گزند
بدی مویہ در روز امید و بیم	بگویم ہد انسان کہ عرش عظیم
شود از تو سیلاب را چارہ جو	تو بخشی ہواں گریہ ام آبرو

مطلب یہ کہ جو جرم میرے اعمال نامے سے پیش کیا جائے گا، میں اس کے مقابلے میں ایک حسرت پیش کر دوں گا۔ اب مزائیے، فیصلہ کیونکر ہوگا؟ میری حسرتیں تو جرموں سے بڑھ جائیں گی۔ میرے لیے تو سزا کے بجائے تلائی کا سروساہا ہونا چاہیے۔ قیامت کے دن میں اس درد سے روؤں گا کہ عرش عظیم تجھ سے خواہاں ہوگا، مجھے سیلاب سے بچائیے۔

پھر کہتے ہیں کہ میں رند ہوں، پارستانی کی کوئی چیز مجھ میں موجود نہیں، میری فکر کچھ ہے اور میں آتش پرست ہوں، جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے، لیکن

میں تیری کتاب کا پرستار اور تیرے پاک بنی کا محب ہوں، میرے لیے آزادی کا فرمان صادر کر دے۔

یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ مرزا غالب ناسزا امور میں بھی برابر سزاوار طریقے کے قائل رہے، مثلاً وہ فرماتے ہیں :

بادہ ہوا دم خوردہ و زربہ قمار باختہ

وہ کہ زبہر چہ ناسزا است ہم بہ سزا نہ کر دہ ایم

یعنی شراب اُدھار پیتے رہے اور پیسے جوئے میں ہار دیے، انوس کہ ہم نے غیر شایاں افعال بھی شایاں طریق پر نہ کیے۔ جو پیسے جوئے میں ہارے، وہ شراب کی قیمت میں ادا کیے جاسکتے تھے، یہ شایاں طریقہ تھا۔

ہے کس قدر ہلاک فریب و فائے گل

بہل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

آزادی نسیم مبارک کہ بہر طرف

ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دامِ ہولے گل

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا

اسے ولے نالہ لب خونیں نوا سے گل

خوش حال اس حریفِ سیر مست کا کہ جو

رکھتا ہو، مثلِ سایہ گل، سر بہ پائے گل

۱۔ لغات - ہلاک :

مٹا ہوا، والہ و شیفٹہ۔

شرح : اس شعر کا

دوسرا مصرع پہلے ایک غزل

میں آچکا ہے، یعنی :

بہل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

کہتے ہیں جس کو عشق اٹھل ہے و باغ کا

شعر کا مطلب یہ ہے کہ بہل

کی حالت دیکھیے، وہ پھولوں کے

عشق کے فریب میں مر رہا ہے۔

پھول و فاداری کریں گے حالانکہ

حسن اور وفا ایک جگہ جمع نہیں ہو

سکتے۔ یہ بہل کی فریبِ خودِ دگی

ہے۔ پھولوں کی کیفیت یہ ہے کہ
اُس غریب کے کاروبار کی ہنسی
اڑا رہے ہیں۔

پھولوں کے کھلنے کو ان کا خندہ
یعنی ہنسی قرار دیا اور شاعر کے
تصور کے مطابق یہ ہنسی میل کی
نادانی اور فریب خوردگی پر ہے
کہ پھولوں کی محبت پر مٹی جا رہی
ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسے
غوب فریب دیا۔

ایک لحاظ سے ہر عشق کی
کیفیت یہی ہے کہ حق ناشناس
لوگ اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔
خواہ اس عشق کا تعلق کسی فرد
سے ہو یا مقصد ہے۔

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے، نفسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باو بہار سے
میناے بے شراب و دل بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوہ حسنِ غیور کی
خوں ہے سری نگاہ میں رنگِ اولے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ گنج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل اور قفا سے گل
غالب! مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیبِ قبلے گل

۲۔ شکر نسیم کے بے آزادی بلکہ چونکہ پھولوں کے اشتیاق و آرزو کا جو بال بچا ہوا چاس
کے حلقے ٹوٹے پڑے ہیں۔ اس شعر میں چند امور غور طلب ہیں :

۱۔ پھولوں کے اشتیاق و آرزو کا جو بال بچا ہوا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ بہار آئی تھی۔ جس میں پھولوں کی کثرت تھی اور لوگ شوق سے پھول دیکھنے آتے تھے

۲۔ اس دام کے حلقے ٹوٹے پڑے ہیں مراد یہ ہے کہ بہار ختم ہو گئی اور خزاں
آگئی۔

۳۔ جب پھولوں کی کثرت تھی، نسیم کو پابندی سے ان کی خدمت بجا لانی پڑتی تھی
کیونکہ پھول نسیم ہی کے چلنے سے کھلتے تھے اور وہی ان کی خوشبو ما بجا لیے پھرتی تھی۔

۴۔ جب پھول نہ رہے تو نسیم کے لیے پابندی بھی ختم ہو گئی لہذا فرمایا اسے
آزادی مبادک وہ جہاں چاہے جائے۔ جس طرف چاہے چلے۔

۵۔ جہاں کے حلقے ٹوٹ جائیں تو وہ اس قابل نہیں رہتا کہ فکار اس میں پھنسے۔

نسیم اس اعتبار سے بھی آزاد ہو گئی

۶۔ تقریباً تمام شاعریوں نے نسیم کے معنی خوشبو کے کر شرح کی ہے، جو موزوں
معلوم نہیں ہوتی۔ اگر خوشبو ہی مراد تھی تو مرزا نے نسیم کی جگہ شیم کیوں نہ لکھا؟

۷۔ لغات : لب خوشنیں نوا : وہ لب جس سے لبو بھری صدائیں نکلتی ہیں۔

شرح : جسے دیکھو، وہ رنگ کی لہر بہر کے دھوکے میں پھنس گیا۔ آہ!

پھول کا وہ الم کسی نے نہ مٹا، جو لبو بھری صدائیں بلند کرنے والے لب پر جاری تھا۔

مطلب : یہ کہ ہر شخص خواہ بریں البھا جو اسے، انہیں چیزوں پر نظر رکھتا

ہے، جو تو اس کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، لیکن حقیقت پر کسی کی نظر نہیں۔ پھول کے

اندسے بھی خون بھری نغماں بلند ہو رہی ہے اس پر کسی کی توجہ نہیں اور رنگ

بدستب شے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ محض دھوکا ہے، محض ظلم ہے، جو جلد سے

جلد ٹوٹ جائے گا۔

۸۔ شرح : وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے، جو عشق کی سیاہ مستی میں

پھول کے سائے کی طرح اپنا سر پھول کے پاؤں پر رکھتے رہتا ہے۔

ہیاں پھول سے مراد محبوب ہے۔ یعنی خوش نصیب وہی عاشق ہے، جو ہر

تعلق سے کنارہ کش ہو کر، بخود مدہوش آدمی کی طرح اپنے محبوب کے قدم نہ

چھوڑے اور سایے کی طرح اس کے قدموں پر جھکا رہے۔

۹۔ لغات : نفسِ عطر سائے گل : پھول کا عطر بھرا سانس یعنی اس

کی دلآویز خوشبو۔

شرح : اسے محبوب میں جانتا ہوں کہ بہار نے پھول صرف تیرے لیے پیدا

کیے ہیں کہ تو ان سے کام لے۔ مثلاً مار بنا کر لگے میں ڈالے، زلف و کاکل میں لگائے۔

بستر پر بچپائے۔ ان کی خوشبو سونگھئے، ان سے نکلا ہوا عطر جسم پر لے۔ پھول کا مستوا
معبر سانس میرا قریب بن گیا ہے اور مجھے اس کی حالت پر رشک آرہا ہے۔ کہ وہ
ہر لحظہ تیرے ساتھ رہتا ہے اور میں تجھ سے دُور ہوں۔

۶۔ **شرح :** میری صراحتی شراب سے خالی ہے۔ دل میں پھولوں کی سیر
کا کوئی دلولہ نہیں۔ یہ حالت میرے لیے مفصل بہار کے سامنے شرمندگی اور خواست
کا باعث ہے۔

بہار کا تقاضا ہی یہ ہے کہ شراب پی جائے اور پھولوں کی سیر کی جائے، لیکن
میرے پاس مفصل بہار کے غیر مقدم کا یہ سامان موجود ہی نہیں، اس لیے میں شرمندہ
ہو رہا ہوں۔

مولانا طہا سبانی کے ارشاد کے مطابق شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے سوالیہ
کا جواب سمجھ لیا جائے، یعنی میرا شراب پینا اور باخوں کی سیر کرنا لوگ بُرا سمجھتے ہیں
مگر ایسا کروں تو مجھے یاد بہار سے شرمندگی ہوتی ہے، لہذا میں شرمندگی گوارا
نہیں کر سکتا اور اپنا مشقہ ضرور جاری رکھوں گا۔

۷۔ **لغات :** سطوت : وجہ۔

شرح : اے محبوب! تیرا حسنِ غیور اس امر کی تاب نہیں لاسکتا کہ تیرے عاشق
کی نظر کسی اور طرف اٹھے، اسی حسنِ غیور کے وسیع فنی میری نگاہوں میں پھول کے رنگ
کو لبو بنا دیا۔ یعنی میں اس کی رنگینی کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا اور یہ سب کچھ تیرے
غیور بلوہ حسن کے رعب اور وجہ ہے کا کرشمہ ہے۔

۸۔ **لغات :** گل در تقاضے گل : پھول کے چمچے پھول۔

شرح : اے محبوب! یہ تیرے ہی بلوے کا دھوکا ہے کہ آج تک اس
دھوکے میں مبتلا ہو کر پھول کیے عید و دیگرے بے اختیار دوڑے چلے آ رہے ہیں کہ شاید
اُس بلوے سے فیضیاب ہو سکیں۔

مطلب یہ ہے کہ روئے زمین پر پھولوں کی خواہش و ادنیٰ اور شگفتگی کا جو کبھی ختم

نہ ہونے والا سلسلہ جاری ہے ، اس کا سبب یہ ہے کہ تیرے بلوے کے اشتیاق میں یہ بجزو اندہ پہنے کر ہے میں ، حالانکہ وہ بھی ملبوہ نہیں ، بلکہ اس کا مزید اٹھیں کھینچنے لیے کر رہے ۔

۹ - شرح : اے غالب ! مجھے اس محبوب سے ہم بھل ہونے کی آرزو ہے ، جس کا خیال بھی بھول کی جیپ قبا کے لیے ایک آزمائشی بھول کی حیثیت رکھتا ہے ۔ عام طریقہ ہے کہ قبا کی زیب و زینت کے لیے مناسب مقامات پر بھول کا رٹو لیے جاتے ہیں ۔ غالب کا محبوب ایسا ہے ، جس کا خیال اور تصور بھول کی قبا کے لیے زینت کا باعث ہے ۔

۱ - شرح : بجزوی مرحوم فرماتے ہیں :
 دنیا کی تکالیف ملائق سے
 ہیں ۔ جو لوگ امانت و نسبت سے
 بڑی ہیں ، وہ الم سے بھی سکدوش
 ہیں ۔ آزداد کا ہر می سب سے زیادہ
 آزداد پاتے اور رنج اٹھاتے ہیں اور
 شب و روز تاریک ماتم خانے میں
 رہتے ہیں لیکن واقعہ ہم کا اثر
 ان پر علامتی اور غوی ہوتا ہے
 مرزا اپنے اس سکون طبیعت کی
 کیا فرق انہیں مثال دیتے ہیں کہ جب
 برق ہاگرتی ہے تو ہم بھائے خوف
 اور پریشان ہونے کے کمال طبعین

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
 برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
 محضیں برہم کرے ہے گنجہ باز خیال
 ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بتخانہ ہم
 باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
 ہیں چراغان شہستان دل پروانہ ہم
 ضعف سے ہے انے قناعت یہ ترک جستجو
 ہیں وبال تکیہ کا و تہمت مردانہ ہم
 دشم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
 جانتے ہیں سیدہ پر خوں کو زنداں خانہ ہم

سے اٹھ کر جزائے برق سے اپنے الم کدے کی خاموش و گشتہ شمع روشن کر لیتے ہیں۔

بلاشبہ اس دنیا میں انسان کے لیے رنج و غم ملائق کی بنا پر ہے اور آزاد لوگ وہی کہلاتے ہیں، جن کا دامن ملائق سے پاک ہو بیشک غم انہیں بھی جوتا ہے کیونکہ جب تک زندگی باقی ہے، ملائق سے کامل میلہ کی ناممکن ہے چونکہ ان کا دل کسی شے سے گہری وابستگی نہیں رکھتا، اس لیے غم بھی پاؤں اور نہیں ہو سکتا اور مرزا کے قول کے مطابق وہ صرف دم بھر کے لیے متاثر ہوتے ہیں مصائب کی چو بھلیاں ان پر گرتی ہیں انہیں کو اپنے ماتم خانے کی شمع بنا لیتے ہیں۔ یعنی بھل چکی، گری، ایک لمحے میں غائب ہو گئی۔ بس یہی کیفیت آزاد لوگوں کے غم کی ہے۔

ایک اور پہلو بھی الفاظ سے واضح ہے۔ یعنی دنیا، بھلنے لڑنے اور کاہنچا ہے ہمارے لیے اس کی حیثیت ایک دیاسلائی کی ہے۔ بھل چکی اور ہم نے سہو کیا کہ ہمارے ماتم خانے کے لیے روشنی کا سامان ملتا ہو گیا۔

۲۔ لغات۔ گنجفہ : تاش کی طرح کا ایک کھیل، جس کے پتے تاش کے پتوں کے برعکس گول ہوتے ہیں، نیز ان کی تعداد باؤں کے بجائے چھیانوے ہوتی ہے اور آٹھ آدمی اسے مل کر کھیلتے ہیں۔ گنجفہ باز، گنجفہ کھیلنے والا۔

دوق گردانی : تاش یا گنجفہ کے پتے پھینٹنا اور ہاتھوں میں پھیرانا۔
نیرنگ : محائب۔

ثبت خانہ : مراد ہے آرزوؤں اور تمناؤں کا ثبت خانہ

شرح : ہمارے سامنے تمناؤں اور آرزوؤں کا ایک ثبت خانہ محائب و

غرائب سے آراستہ ہے۔ اس کی دوق گردانی کا نقشہ ہم بنے ہوئے ہیں۔ خیال کا گنجفہ باز ان پتوں کو برابر پلٹتا جا رہا ہے۔ ایک نقشہ آتا ہے اور وہ برہم ہو جاتا ہے، پھر دوسرا نقشہ سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح مغفلیں قائم ہوتی اور بھرتی چلی جا رہی ہیں۔ یہی انسانی زندگی کا عام نقشہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس نقشے کو

پیش کرنے کی یہ ایک بہترین صورت ہے ۔

۳۔ لغات ۔ پیدائی : ظور ۔ نور و نفاش ۔

شرح : ہماری حیثیت پر نظر ڈالیے ، دنیا بھر کا ہنگامہ بپا کر رکھا ہے لیکن نور و نفاش ہیج ہے ، اس کا کہیں بپا ہی نہیں چلتا ۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ہم دل پروانہ کے شبستان میں چراغاں کی طرح ہیں ۔

پروانے کے دل کو ایک شبستان فرما دیا ، پھر اس میں چراغاں کا انتظام ہوا ۔ گویا ایک سوہوم دروہوم صحت پیدا ہو گئی ۔

جس طرح شمع روشن ہوتے ہی پروانے کے دل میں شوق وصال کی بخیر و سی ہنگامہ بپا کر دیتی ہے اور وہ اگر ایک لمحے میں اپنے محبوب یعنی شمع پر قربان ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح ہم نے دنیا بھر کے ہنگامے کا سرو سامان کر رکھا ہے ، لیکن پروانے کے شوقیہ صال کی محفل میں چراغاں کا خارجی وجود کوئی نہیں ، وہی حیثیت ہماری ہے ۔

۴۔ لغات ۔ تکیہ گاہ : سارے کی جگہ ، ٹیک لگانے کا مقام ۔

شرح : ہم نے تکیہ گاہ و دو چھوڑی ہے تو اس لیے نہیں کہ ہم میں قناعت پیدا ہو گئی ہے ، بلکہ ہم اتنے کمزور و ناتواں ہو چکے ہیں کہ تکیہ گاہ و دو کو ہی نہیں سکتے ۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ہم بہت مردانہ کی تکیہ گاہ کے لیے باعث تکیہ ہیں ، یعنی ہمارا مرتفع ایسا نہیں ، جسے مردانگی کے نزدیک ذیبا سمجھا جا سکے ، مردانگی کا تقاضا یہ تھا کہ ہم آرزوؤں پر قابو پاتے ۔ اور کم سے کم پر قناعت کر لیتے ، مگر ہماری جاگ دوڑ اس وقت تک نہ رکے ، جب تک ہماری قوت و طاقت ختم نہ ہو گئی ۔ یعنی ہم جاگ دوڑ کے قابل ہی نہ رہے ۔ پھر بہت مردانہ کے لیے ہم وبال ثابت ہوئے تو اس پر تعجب کیا ہے ؟

۵۔ لغات : دائم الحبس : ہمیشہ کے لیے قید ، عمر قیدی ۔

شرح : اے استاد ! ہم اپنے کو بھرے سینے کو قید خانہ سمجھتے ہیں ، کیونکہ اس میں لاکھوں تمنائیں ہمیشہ کے لیے قید ہیں اور انہیں کے خون ہوتے ہانے سے

سینہ لہو سے بھر گیا ہے ۔

بہ نالہ حاصل دل بستی مزا حسم کر
 ۱۔ لغات۔ دل بستی :
 دل کا تعلق ۔
 متاعِ خانہ زنجیر ، جز صد ا ، معلوم
 شرح : اسے عاشق ! تو بہر
 آہ و فغاں کر کیونکہ دل لگانے اور محبوب سے عشق کرنے کا حاصل اس کے سوا کچھ
 نہیں ۔ تیری حیثیت زنجیر کی ہے ۔ زنجیر کے گھر کا مال و متاع آواز کے سوا کچھ
 نہیں ہوتا ۔

مجھ کو دیارِ غیبر میں مارا ، وطن سے دُور
 ۱۔ شرح : خوابِ عالی
 مزا تے ہیں :
 رکھ لی ہرے خدا نے ، مری بیکسی کی شرم
 تیردیس میں مرنا ، جو ہر شخص
 وہ حلقہ ہائے زلف ، کہیں میں ہیں ، اے خدا
 کہ ناگوار ہوتا ہے ، اس پر خدا
 رکھ لہجو میرے دعویٰ وارستگی کی شرم
 کا شکر اس بے کرتا ہے کہ اگر
 وہاں بے گورد گھن پڑے ہے

تو کچھ معافیہ نہیں ، کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا
 آدمی تھا ، لیکن وطن میں مرنا ، جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو اور
 خبردار و غمخوار ایک بھی نہ ہو ، وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب
 ہونی سخت رسوائی اور ذلت کا باعث ہے ۔ پس خدا کا شکر ہے کہ
 اس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم دکھ لی ۔ اس میں گونہ ظاہر
 خدا کا شکر ہے ، اگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے ،
 جس کو ایک خاص پیرایے میں ظاہر کیا ۔

اتنا طعن کر دینا ضروری ہے کہ شعر کا نمایاں پہلو بیکسی کی شرم رکھ لہجو ہے ۔

خدا کا شکر نہیں، نمایاں پہلو یہی ہے کہ اہل وطن میری حقیقی حیثیت سے نا آشنا ہے
انہیں کچھ خیال نہ آیا کہ میں کس قدر و منزلت کا مستحق تھا۔ اس ناقدری اور کس پرہی
کی حالت میں ہی بہتر ہو کہ مجھے اہل وطن سے بہت دور ایک اجنبی ملک میں موت
آئی۔ اس طرح میرے رحیم و کریم خدا نے میری بیگسی کی شرم دکھ لی۔

مرزا نے اس سے ملتے جلتے شعر بھی کہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں
اہل وطن کی ناقدری کا بہت گہرا احساس تھا!

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو عزت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشیتِ خس کہ گلشن میں نہیں

نیز :

کرتے کس منہ سے ہو عزت کی شکایت غالب!
تم کو بے ہری یارانِ وطن یاد نہیں؟

۲۔ لغات - کہیں : گھات -

دارنگی : آزادی -

شرح : اے خدا! محبوب کی زلفت کے ملتے گھات میں بیٹھے ہیں اور مجھے

پھانس لینے کے درپے ہیں۔ میں آزادی کا ترخی ہوں۔ اب اس دعوے کی شرم
دکھ لینا تیرے ہی ہاتھ ہے۔

شعر کا مقصود یہ ہے کہ محبوب کے ملتے گھاتِ گرفت سے بچنے کی کوئی امید نہیں

اب بیمارگی کی حالت میں اپنے دعوے آزادی کی شرم محفوظ رکھنے کے لیے کوٹھل
ہیں۔



لوں دام بختِ خفتہ سے ایک خوابِ خوش دے

غالب! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں؟

۱۔ لغات : دام :

قرض - اُدھار

خوابِ خوش : بے نگری

کی نیند۔ گہری نیند، جس میں نخل کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔

شرح : میرا نصیب گہری نیند سورا ہے اور میری حالت یہ ہے کہ نیند آتی ہی نہیں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ نصیب ہی سے ایک آدھ نیند ادا ہوگے، لیکن اسے غائب! غوث یہ ہے کہ یہ فرض ادا کناں سے کروں گا؟ شعر کا مقصد صرف یہ ہے کہ بد نصیبی کا اظہار کیا جائے، جو انتہا پر پہنچی ہوئی ہے اور نصیب کے اس طرح سو جاتا یقیناً انتہائی بد نصیبی ہے۔



وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟	وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟
فرصتِ کار و بارِ شوق کے	ذوقِ نظارہ جمال کہاں؟
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا	شودِ سوداے خط و خال کہاں؟
تمہی وہ اک شخص کے تصور سے	اب وہ رحمتِ بی خیال کہاں؟
ایسا آساں نہیں ہو رہا!	دل میں طاقت، جگر میں مال کہاں؟
ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق	واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں؟
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں	میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟
مضمل ہو گئے قوی، غائب!	وہ عناصر میں اعتماد کہاں؟

یہ پوری غزل اس گزرے ہوئے زمانہ کی یاد میں کہی گئی ہے، جب عشق اپنے رنگ میں تھا اور پوری غزل مسلسل چلی جا رہی ہے۔

۱۔ **شرح :** وہ سے اشارہ اسی گزرے ہوئے زمانہ کی طرف ہے، جس

کی یاد اس غزل میں تازہ کی گئی ہے ۔

وہ دور اب کہاں ، جب فراق کو فراق اور وصال کو وصال سمجھتا تھا ،
یعنی جب عشق کا زور تھا ، محبوب سے جدائی تڑپاتی تھی اور اس کا وصال آرزوؤں
اور تمنائوں کے لیے روزِ عید تھا ۔ وہ راتیں ، وہ دن ، وہ ٹہینے اور وہ سال اب
کہاں ہیں ؟ سب رخصت ہو گئے ۔

۲۔ شرح : اب یہ حالت ہے کہ شوق کے کاروبار اور اس میں مشغولیت
کے لیے فرصت ہی نہیں رہی ۔ محبوب کے جمال سے لذت اندوز ہونے کا ذوق
ہی باقی نہیں رہا ۔

۳۔ شرح : دل کا تو ذکر ہی کیا ، پہلے جیسا دماغ بھی باقی نہیں رہا جس
کے خط و خال دیکھ کر جو بخودی اور دیوانگی طاری ہوتی تھی ، وہ اب کہاں باقی ہے ؟

۴۔ شرح : جب عشق نوروں پر تھا تو خیالات میں رنگینی ، رعنائی اور
شوخی نمایاں تھی ۔ اب وہ حالت کہاں ؟ یہ کیفیت صرف ایک شخص کے تصور پر
موقوف تھی ۔

مولانا طہطائی نے صحیح فرمایا ہے کہ اس شعر میں ”اک شخص“ کا لفظ بہت
بینغ ہے ۔ اگر اس کی جگہ ”اک شوخ“ کہا ہوتا تو یقیناً محبوب کی تعریف نکلتی ، لیکن
ساتھ ہی ظاہر ہوتا کہ ابھی تک ذوق و شوق باقی ہے ، لیکن یہ مقننہ اسے مقام کے
غلام ہوتا ، کیونکہ یہاں ذوق و شوق کی نفی منظور ہے اور اس کا تقاضا یہی ہے کہ
گلوں کی ضعیف سی کیفیت بھی باقی نہ رہے ۔

۵۔ شرح : لہو و نا آسان نہ سمجھا جائے ، دل میں طاقت و قوت ہو اور
جگر اپنے اصل حال میں ہو ، یعنی اس میں خون موجزن ہو ، اس وقت لہو رو یا جاسکتا
ہے ۔ جب دل و جگر اپنی ہر چیز کھو چکے ہیں تو لہو کیونکر رو یا جائے ۔

اس مقام پر لفظ ”آسان“ نے نظیر ہی کا ایک شعر بے اختیار یاد دلایا :

نیمت آسان بر صفت آتش زدن می نماید گرچہ از پروان خوش

یعنی متعدد افروز آگ پر مردانہ وار جاگنا سہل کام نہیں، اگرچہ پودانے کا بل
مرد دیکھنے والے کو بڑا اچھا منظر معلوم ہوتا ہے۔

۷۔ لغات - قمار خانہ : جو کھیلنے کی جگہ۔

تشریح : ہم سے عشق کا جوا گھر چھوٹ گیا، وہاں جایش تو ہمارے پاس
مال کہاں ہے، جو داؤ پر لگائیں ؟ نکلتے نوازوں نے خوب کہا کہ نہ نقد دل پاس ہے
نہ داغ ہیں، جو امیروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ نہ زرد چہرہ ہے جسے نہ سمجھا جانے
اور نہ صبر و شکیب کی دولت ہے۔ عاشق کے لیے یہی مال و متاع ہے، جسے لے کر
وہ عشق کے قلعہ خانے میں بازی لگانے جاتا ہے۔

۸۔ شرح : اب دنیا کی پریشانیوں میں الجھا رہتا ہوں، حالانکہ مجھے اس
دہال باں مشغلے سے کوئی مناسبت نہ تھی۔

۹۔ لغات - مضطرب : کمزور، سست، ضعیف۔
قوی : قوت کی جمع۔

عناصر : عنصر کی جمع یعنی وہ اجزاء جن سے اجسام مرکب ہوتے ہیں۔

تشریح : اے نائبِ اجماعی قوتیں ضعیف، کمزور اور سست ہو گئیں

اب اجزائے وجود میں اعتدال باقی نہ رہا۔

اجزائے وجود کا اعتدال قوتوں کے اونچے کمال کا نام ہے۔ یہ اعتدال عموماً
اہلِ شباب میں اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے، جب شباب گیا، بڑھاپا آیا تو قوتوں کا ضعف
اور ان کا ماتم باقی رہ گیا۔

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو حنفا کہتے ہیں
ہوئی آئی ہے کہ اچھٹوں کو بُرا کہتے ہیں۔
شرح : محبوب نے ہم
سے وفا کا آغاز کیا تو غیروں
اور رقیبوں نے وفا کو حنفا کا
نام دے دیا۔ ان کا مقصد

یہ خاک محبوب کے حسِ سلوک
پر نکتہ چینی کر کے اسے
برگشتہ کر دیں تاکہ وہ وفا
خاک کر دے۔ عاشق کو یہ
اندیشہ پیدا ہوا تو اس نے
کہا کہ غیروں کی نکتہ چینی
کوئی بات نہیں۔ دنیا کے
لوگوں کا دستِ ہمیشہ سے
یہی چلا آتا ہے کہ وہ احمقوں
کو بڑا کہتے ہیں اور نیک
کام کی خدمت کرتے ہیں۔

۲۔ شرح : ہم

نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دل
کی پریشانی کا حال محبوب
سے جا کر کڑا آئیں۔ کہنے
جاتے تو ہیں، لیکن دیکھیے،
کیا کہتے ہیں۔

دوسرے مصرعے کے
دو مطلب ہیں :

۱۔ ہم دل کی پریشانی
محبوب سے کہنے کے لیے
جاتے تو ہیں، لیکن دیکھیے
جہاں جا کر کچھ کہا جا سکے گا

آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے، کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو بے دخلی کو، اندر رہا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصتِ غش سے
اور پھر کون سے نامے کو رسا کہتے ہیں
بے پے سرحدِ ادراک سے اپنا مجھو
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پاؤں افکار پر جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم میسر گیا، کہتے ہیں
اک شرِ دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگِ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاقی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں
وحشت و شیفۃ اب مرثیہ کہو، شاید
مر گیا غالب آشفتبہ نوا کہتے

یا محبوب کو دیکھ کر ایسی محویت طاری ہو گئی کہ زبان پر کچھ آ ہی نہ سکے گا۔
میر تقی نے کہا ہے :

یہ کہتے، وہ کہتے ہم، متبادل میں جو یاد آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہنا ہوتا

یعنی جب تک یاد سامنے نہ تھا، دل میں یہی کہتے تھے کہ یہ بات بھی اسے سنائیں گے
وہ بات بھی اسے سنائیں گے، لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، وہ سامنے آتا تو کچھ
بھی نہ کہنا ہوتا۔

۲۔ ہم کہنے جاتے تو ہیں، مگر دیکھیے وہ یعنی محبوب شن کر کیا کرتا ہے۔

۳۔ لغات - اندر وہ ڈبا : غم و در کرنے والا۔

شرح : جو لوگ کہتے ہیں کہ شراب اور گانے سے غم و در ہو جاتا ہے۔
وہ پرانے زمانے کے بھولے بھالے اور سادہ لوح لوگ ہیں۔ جنہیں اصل حقیقت
سے آگاہی نہیں۔ انہیں کچھ کہنے یا سمجھانے کا کیا فائدہ ہے ؟ وہ اصل حقیقت کا
اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔

مطلب یہ ہے کہ شراب اور راگ رنگ غم عشق کو زائل نہیں کر سکتے اور دل
کی لگی نہیں بچھا سکتے، بلکہ ان سے غم اور بڑھتا ہے۔

۴۔ لغات - نالہ رسا : ایسی مزید و فغاں جو مقصد پر پہنچ جائے،

یعنی جس میں تاثیر ہو۔

شرح : میں آہ و فغاں کرتا ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ آہ و فغاں بے اثر
ہے، کیونکہ مقصد پر نہیں پہنچتی، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ آہ کہتے ہی مجھ پر غشی طاری
ہو جاتی ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوتی ہے تو پھر نالہ دل میں آ جاتا ہے۔ اب بتاؤ
کہ اگر یہ نہیں تو کون سے نالے کو رسا کہا جاسکتا ہے، جس میں اثر ہو اور جو مقصد کو
پہنچ جائے۔ عاشق محبوب کے طریق سلوک سے اتنا یاس ہو چکا ہے کہ ہوش آتے
ہی نالے کا دل میں آ جاتا اس کی رسائی تصور کیے بیٹھتا ہے۔

۵۔ لغات - ادراک : پالینا ، عقل ، سمجھ ۔

سجود : جسے سجدہ کیا جائے ۔

قبیلہ نما : ایک آلہ جو قبلے یعنی کعبے کا رخ بتاتا ہے ، جیسے قطب نما قطب کا رخ بتاتا ہے ۔ یہاں قبیلہ نما سے مراد وہ مقام ہے ، جو حقیقی قبلے کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔

شرح : ہم کعبے کی طرف سجدہ نہیں کرتے ۔ بلکہ سجدہ تو اس وجود حقیقی کی طرف ہے ، جو عقل اور سمجھ کی حدوں سے باہر ہے اور ہمارے ادنیٰ حواس اسے پا نہیں سکتے ۔ جس مقام کو عام اصطلاح میں قبلہ کہا جاتا ہے ، یعنی کعبہ ، اس کے باوجود میں تو اہل علم و بصیرت کا قول یہ ہے کہ وہ حقیقی قبلے کی طرف رہنمائی کرنے والا ایک مقام ہے ۔

مولانا طیباً لبائی فرماتے ہیں ، مرزا نے یہاں :

” اس مسئلے کو نظم کیا ہے کہ کعبے کی طرف سجدہ کرنے سے کعبے کو سجدہ کرنا مفسود نہیں ۔ جسے ہم سجدہ گزے ہیں ، وہ جہات سے منزہ ہے اور سجدے کے لیے جہت مزدبہ ہے ۔ اس سبب سے جہت کعبہ کو زمین کر لیا ہے ۔۔۔۔ وہ جہت بہ منزلہ قبلہ نما ہے ۔

۶۔ لغات : پائے انگار : زخمی پاؤں ۔

مہر گیا : ایک نہایت جس کی خاصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی جڑ جس کے پاس ہو ، لوگ اس پر مہربان ہوتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں ۔

’ شرح : اسے صہرب امیرے پاؤں تیرے راستے کے کانٹوں سے زخمی ہو گئے ، انھیں لہو مان دیکھتے ہی تجھے رحم آ گیا ۔ ہم نے اسی وقت سے تیرے راستے کے کانٹوں کو ” مہر گیا “ کہنا شروع کر دیا ، کیونکہ انھیں کی دم سے دم نے تیرے دل میں جوش ملدا ۔

۷۔ شرح : مولانا طیباً لبائی فرماتے ہیں :

”یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ روح حیوانی جو دل میں ہے، اس کی حرارت سے گھبرا کر انسان کو سانس لینے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ اور اس کا اشتغال مطلوب ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ جو اشتغال منہور تہ میں داخل ہے (ایسی چھ چیزیں جن کے بغیر زندگی ممکن نہیں) تاکہ بار بار سانس لینے سے حرارت عزیزی کا اشتغال ہوتا رہے۔ اس معنوں کو مصنف نے تو ایک تفسیر شریعہ کی طرح نظم کر دیا، لیکن دوسرا بنی ثنوں کا مسئلہ جب سے ثابت ہوا، اس سے ظاہر ہو گیا کہ واقع میں ایسا ہی ہے۔ ہر سانس میں جو اسے روح حیوانی کو اشتغال مطلوب ہے اور جو ہوا نکلتی ہے، بعینہ وہی ہے، جیسی ہوا چراغ کی کوسے پیدا ہوتی ہے۔ اس شعر سے مصنف کے فلسفیانہ مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔“

ہمارے دل میں عشق یا زندگی کی جو چنگاری ہے، اس سے ہم کیا گھبراہٹیں گے؟ ہم ہوا کے نہیں، آگ کے خواہاں ہیں اور ہوا سے مقصود یہ ہے کہ یہ آگ کو خوب بجڑ کا دے، کیونکہ ایک چنگاری سے ہمارے ذوق کی تسکین نہیں ہوتی، ہمیں تو زبردست اشتغال درکار ہے اور وہ ہوا کے بغیر ممکن نہیں۔
شعر کے فلسفیانہ پہلو پر جو روشنی مولانا طہا طہاٹائی نے ڈالی ہے، اس میں کسی امتناع کی ضرورت نہیں۔

۸۔ لغات - نام خُدا : دعائیہ کلمہ یعنی ماشاء اللہ چشم بدُور۔
شرح : ہم محبوب کی بات بات پر نامِ خدا، ماشاء اللہ، چشم بدُور کہہ رہے ہیں اور اس کا کتبتر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دیکھیے، یہ کتبتر، یہ غرور آخر کیا رنگ لاتا ہے اور کیا گل کھلاتا ہے۔

۹۔ لغات - وحشت : سید ظلام علی خاں وحشت۔ دہلی کے متاثر لوگوں میں سے تھے، والد کا نام سید فرحت اللہ خاں۔ خود وحشت مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے داماد تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہنایت خوش بیان تھے۔ شعر کا مذاق

بہت بلند تھا۔ پہلے سرکار انگریزی میں ملازم رہے، پھر اوروں میں فوجیاء ہو گئے۔ بعد ازاں لکھنؤ چلے گئے اور ایک معزز خدمت پر مامور ہوئے۔ ~~مصلحت~~ کے بعد سرشتہ تعلیم میں منک ہو گئے تھے۔ مصطفیٰ خاں شیخہ کے ہنایت عزیز دوست تھے۔ غالب سے بھی گہرے تعلقات تھے۔

شیخہ : زاب مصطفیٰ خاں، اوروں میں شیخہ اور فارسی میں حسرت کی تخلص۔

~~مصلحت~~ : ~~مصلحت~~ موتی کے بعد غالب سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ ہنایت عزیز دوست تھے، جنہوں نے ہر موقع پر غالب کی مدد کی۔

آشفہ نوا : جس کی نواؤں سے پریشانی ٹپکتی ہو، درد بھرے نغمے سنانے والا۔

شرح : درد بھرے نغمے سنانے والا۔ غالب دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اب شاید وحشت اور شیخہ اس کا مرثیہ کہیں، کیونکہ وہ اس کے ہنایت عزیز دوست تھے۔



۱۔ لغات :

ننگ پیراہن : لباس

کے لیے باعث ننگ عدا

شرح :

پھول کی عورت و آبرو کیا

ہر سکتی ہے جو باغ میں

نہ ہو ؟ کیونکہ پھول باغ

ہی میں بچلے گئے ہیں ،

جہاں لوگ سہر و تفریح

کے لیے جاتے ہیں۔ ان

کے رنگ، خوشبو اور طراوت

سے لطف اٹھاتے ہیں۔

آبرو کیا خاک اُس گل کہ گلشن میں نہیں

ہے گریباں ننگ پیراہن، جو دامن میں نہیں

صنعت سے الگ گزیرے ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگاہ آفتاب

دوسے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تار کی زندانِ غم، اندھیر ہے

پنہ نور صبح سے کم، جس کے روزن میں نہیں

رونی ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
 انجمن بے شمع ہے، اگر برق خرمن میں نہیں
 زخم سلوانے سے، مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
 غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں
 بسکہ ہم ہیں اک بہار ناز کے مارے جو سے
 جلوہ گل کے ہوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں
 قطرہ قطرہ اک ہیوئی ہے نئے ناسور کا
 خوں بھی، فوق درد سے، خارِ برے تن میں نہیں
 لے گئی ساقی کی نخوت، قلم آشی بری
 موج نئے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں
 ہونشہ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
 قد کے مکنے کی بھی گنجائش برے تن میں نہیں
 تخی وطن میں شان کیا، غالب اک ہو عزت میں قلند
 بے تکلف، ہوں وہ مشتِ خس کہ گھن میں نہیں

بالکل یہی کیفیت گریبان
 کی ہے۔ اگر وہ پھٹ کر
 دامن تک پہنچ جائے تو
 سمجھ لینا چاہیے کہ لباس
 کے باغ میں ایک پھول
 کھلا اور اس نے عزت کو
 کا مقام حاصل کر لیا۔ اگر
 وہ پھٹ کر دامن تک نہیں
 پہنچ سکتا تو لباس کے لیے
 باعث ننگ و عار بن جاتا
 اور اس کی حیثیت وہی
 ہو گی، جو باغ سے باہر
 پھول کی ہوتی ہے۔ یعنی
 وہ ٹھکانے سے محروم ہو
 جاتا ہے۔

شعر میں پہلے گریبان کے
 پھٹ کر دامن تک آنے
 کو پھول کے کھلنے سے
 تشبیہ دی اور کوئی شبہ نہیں
 کہ جس لباس کو پارہ پارہ
 کر کے دامن تک پہنچا دیا

جائے، وہ کھلے ہوئے پھول سے مشابہ ہو گا، کیونکہ اس کی پتیاں بھی کھلنے کے لیے
 ویسی ہی شکل اختیار کر لیتی ہیں، چر دامن کے گھیرے کو گلشن کے برابر رکھتا، جس میں ہر

گریبان کے پھول کھلے رہتے ہیں۔

۲۔ **تشریح :** اسے گریہ ! کمزوری نے میرے بدن میں کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ جب جسم میں طاقت تھی، میں خون بھی دوڑاتا تھا اور وہ خون آنسو بن کر بھی آنکھوں سے بہتا تھا۔ جب طاقت ہی نہ رہی تو روؤں کیونکر؟ میرے رونے میں جو خون پہلے بہا تھا اور دامن کو اس نے رنگین کر دیا تھا، وہ بھی رنگ بن کر اڑ گیا۔ غرض معنیٰ نے کچھ بھی میرے پاس نہ چھوڑا۔

۳۔ **تشریح :** محبوب کے گھر کی دیواروں میں جو روشن دان ہیں، ان میں ذرے نقصان نظر آتے ہیں۔ اصل میں یہ ذرے نہیں، بلکہ سورج نے اپنی نگاہ کے اجزا پسپا دیے ہیں تاکہ کسی طرح محبوب کے جمال کی ایک جھلک دیکھ لے۔

جب سورج کی کرنیں دیوار کے روشن دان سے گزرتی ہیں تو روشنی میں نہایت چھوٹے چھوٹے ذرے رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مرزا نے ان ذروں کو آفتاب کی نگاہ کے اجزاء قرار دیا۔ آفتاب اتنی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ نگاہ کو اصل حالت میں روزن سے گزار دے، لہذا اس نے نگاہ کا تجزیہ کیا اور ذرے بنا کر اسے روزن میں پہنچا دیا تاکہ وہ براہ راست، دیدار کے الزام سے بری رہے۔

۴۔ **لغات - پنبہ :** پ پر زبر اور پیش سے دو فوں طرح مستقل ہے، معنی روئی، روئی کا چھوٹا سا گالا یا گولا، جو پرانے زمانے میں میاے سے پر بھی دکتے تھے اور کافوں میں رکھنا اب تک رائج ہے۔

تشریح : غم کے قید خانے کی تاریکی کا حال کیا بتاؤں؟ اس بلا کا اندھیرا ہے کہ اگر اس کے روزن میں روئی کا چھوٹا سا گولا رکھ دیا جائے تو ایسا معلوم ہو کہ سپیدۂ سحر طلوع ہو۔

جب تاریکی انتہا پر پہنچ جائے تو چھوٹی سے چھوٹی سفید ٹہنے بھی اس میں روشن دتا ہاں نظر آتی ہے۔

۵۔ لغات - خانہ ویراں ساز : گھر برباد کر دینے والا۔

شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں۔

” دنیا میں جو رونق اور چہل پس ہے، وہ عشق و محبت کی بدولت ہے

خواہ زن و فرزند کی محبت ہو، خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت

کی خواہ کسی اور چیز کی۔ پس اگر خرمین میں برقی بینی دلوں میں محبت

نہیں تو اس کی مثالی اس انجمن کی ہے، جس میں شمع کی روشنی نہیں۔“

یقیناً عشق گھر بھی برباد کرتا ہے یعنی انسان کو کسی چیز کی لگن ہو تو وہ اپنے

نفع نقصان کی کوئی پروا نہیں کرتا، لیکن یہی عشق ہے جس سے دنیا کے کارخانے میں

رونق پیدا ہوتی ہے، عشق کہ ہر انسان عمل کی راہ میں جو بھی قدم اٹھاتا ہے، وہ

عشق و محبت ہی کے بل پر اٹھتا ہے۔ پھر عشق کی قسمیں ہیں اور مقاصد کی بنا پر

اس کے درجے ہیں، مگر اس کے بغیر ہستی کی کارگاہ میں رونق ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر

عشق نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہستی کے خرمین پر بجلی نہیں گری۔ اگر اس خرمین پر بجلی

نہ گرسے تو یقین کر لینا چاہیے کہ یہ ایک ایسی محفل اور ایسی انجمن ہوگی، جو شمع سے

محروم ہو اور معلوم ہے کہ دنیا کی کوئی انجمن شمع کے بغیر جم ہی نہیں سکتی۔

دیکھیے آٹھ آٹھ لفظوں کے دو سرے ہیں لیکن زندگی کی کتنی بڑی حقیقت

انہیں لفظوں میں پیش کر دی اور مطلب یہ کہ اس سلسلے میں شاعری کے تمام کمالات

محفوظ رکھے۔ ساتھ ہی ایک حقیقت کے سلسلے میں کئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا

پھر مثال بالکل انوکھی کہ اگر بجلی خرمین میں نہ ہو تو انجمن بے شمع رہ جائے گی۔

۶۔ شرح : میں نے زخم سلوا لیے، خیروں نے طعنہ دیا کہ دیکھو کہ یہ عاشق

ہو کہ زخموں کا علاج کرانے کے درپے ہے، حالانکہ عشق صادق ہو تو وہ چارہ دہو جوتی

کار دادر ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن خیر حقیقت کو کیا سمجھ سکتے ہیں؟ انہیں یہ خیال ہو

نہیں ہو سکتا کہ زخم سینے کے لیے سوئی سے کام لیا جاتا ہے اور خود سوئی بھی جلد

جھیدتی ہے۔ میں ان زخموں کی لذت سے کہہ کر محروم رہ سکتا ہوں؟ خیر اس کے

انداز و شناس نہیں ہو سکتے۔

دیکھیے، چادر جوئی میں بھی لذت آزار کا پہلو پیدا کر لیا۔

۷۔ **شرح :** ہم ایسے محبوب پر مرٹے ہیں، جو سراپا ناز و انداز کی بہار ہے، اس لیے ہماری لہر میں جو گرد نظر آتی ہے، یہ گرد نہیں، بلکہ پھولوں کا جلوہ ہے اور بہار ناز نے ذرت سے ذرتے میں پھول ہی کھلا دیئے۔

۸۔ **لغات :** میوٹی : وہ مادہ جو ہستی کی صورتوں کا محل سمجھا جاتا ہے مثلاً مٹی سے کرپٹے ٹھوڑا بنایا، پھر اسی مٹی سے ایک پرندہ تیار کر لیا۔ گھوڑے اور پرندے کا میوٹی وہ مٹی ہے، جس سے یہ بنے۔

ناسور : وہ زخم جو ہمیشہ رستا رہے اور کبھی اچھا نہ ہو۔

شرح : میرے جسم میں جو خون ہے، وہ بھی درد کی لذت میں ڈوبا ہوا ہے اور اس لذت سے اسے فراغت حاصل نہیں۔ وہیل یہ ہے کہ اس خون کی ایک ایک بوند ایک نئے ناسور کا میوٹی بنی ہوئی ہے۔ گویا جسم کا ایک ایک قطرہ خون ناسور بن جانے والا ہے، جو ہمیشہ رستا رہے گا اور کبھی اچھا نہ ہوگا۔

۹۔ **لغات :** خنجر : خنجر۔ غرور۔

تلمذ آشامی : سمندر پی جاتا، یعنی پی جانے کی ہر حد توڑ دیتا۔

شرح : ساقی کو اپنی بخشش و عطا پر بڑا غرور تھا، لیکن میں سمندر کے سمندر اٹھ لیٹنے والا بادہ کش آگیا تو ساقی کا تکبر و غرور ختم ہو گیا۔ ثبوت یہ ہے، آج مینا کی گردن میں سوچ شراب کی کوئی دگ نظر نہیں آتی، یعنی صراحیوں شراب سے بالکل خالی نظر آتی ہیں۔

ساقی کا دعویٰ یہ تھا کہ میری شراب پینا سہل نہیں، غالب کی بادہ نوشی نے یہ دعویٰ باطل کر دیا۔ دوسرے مصرع میں سوچ سے کی دگ مینا کی گردن میں نہیں، اس لیے کہا کہ کسی کا غرور ٹوٹ جاتا ہے تو گردن جھک جاتی ہے اور دگ گردن میں اکر باقی نہیں رہتی۔ چونکہ غالب کثرت سے شراب پی گیا، صراحیوں خالی ہو گئیں

گویا ان کی گردنیں موج سے کی رگ سے محروم رہ گئیں۔ اب وہ اکڑ نہیں سکتیں۔

۱۰۔ لغات - فشار : ہر طرف سے بھینچنا، چاروں طرف سے دباؤ۔

شرح : صفت اور کمزوری نے مجھے چاروں طرف سے اس طرح بھینچ رکھا ہے کہ میرا قد جبک بھی نہیں سکتا، جو ناقوانی کی جیسی علامت ہے۔ اب مزاج ہے، اس فشار میں میں جبک کیونکر سکتا ہوں اور میری ناقوانی دنیا پر آشکارا کیونکر ہو سکتی ہے ؟

۱۱۔ شرح : خواہجہ جاتی مرحوم فرماتے ہیں :

”اپنے تین خس یعنی پھوس وغیرہ سے اور وطن کو گلشن سے تشبیہی

ہے، یعنی جس طرح پھوس گلشن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلشن میں

نہیں جوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی، یہی حال میرا ہے کہ وطن میں

نقا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔“

اسے غالب ! وطن میں میری کون سی شان تھی کہ غربت یعنی مسافری اور ملک

غیر میں میری قدر ہو ؟ میری مثال گھاس پھوس کی اس شخص کی ہے، جو گھریا باغ

میں ہو تو اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیتے ہیں، پھر بھٹی میں جلا دیتے ہیں، یعنی

گھاس پھوس یا کانٹے بھٹی سے باہر ہوئے تو جب بھی حقیر سمجھے جاتے ہیں اور

بھٹی میں ہوئے تو جب بھی ان کی منت میں جلتا اور دکھ اٹھاتا ہی ہے۔

کمال یہ ہے کہ وطن اور غربت دونوں جگہ بے قدری اور تکلیف و اذیت

کے لیے مثال ایسی تلاش کی، جو سب کے سامنے ہے مگر کبھی کسی کو سوچھی نہیں۔

یہی غالب کی بالغ نظری ہے۔

آخر میں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ یہ مقلع خیالی غربت سے تعلق نہیں رکھتا،

بلکہ حب مرزاپنشن کے مقدمے کے لیے حکمت گئے تھے تو یہ غزل باندہ کے ایک

مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔ گویا اس شعر میں جو کچھ کہا، وہ عالم غربت میں کہا۔ اس

کی تصدیق اس دیوان غالب سے ہوتی ہے، جس کا خلی نسخہ حافظ شیرانی مرحوم

نے مزاہم کیا تھا اور اب وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ دیوان کے
حاشیے پر لکھا ہے کہ یہ غزل باندہ میں کہی گئی۔



۱۔ شرح : میں
تازو اندازہ محبوب کی شائش
سے حمد بر آئے ہو سکا۔ اگر
اس کی ادا ایک ہوتی تو
میں کہہ سکتا تھا کہ میرے
یہ قصا کا حکم رکھتی ہے،
لیکن یہاں تو خدا جانے
کتنی ادائیں ہیں؟ اب میں
ایک ایک کے پارے میں
کیا کہوں؟ بس یہ سمجھ لیجے
کہ اس تازو اندازہ اور غمزہ
ادا کی طرح کے لیے مجھ
میں طاقت ہی نہیں۔

۲۔ لغات۔ نگہ سرمہ سا : سرگین آنکھ کی نظر، سرمہ آلود نگاہ۔
شرح : میرے محبوب کی زلف میں جو گرہیں نظر آتی ہیں، ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ وہ گرہیں نہیں، بلکہ کھلی ہوئی آنکھوں کے حلقے ہیں، جی کا رخ دل کی
طرف ہے۔ ان آنکھوں میں زلف کے ہر تار کو ایسی نگاہ کی حیثیت حاصل
ہے، جو سرگین آنکھ سے نکل رہی ہو۔

۳۔ لغات۔ نہ شنیدن : نہ سنا۔

شرح : میرے دل سے لاکھوں آہیں اٹھ رہی ہیں، جو جگر کو چیرھاؤں گے

ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہیں۔ اسے محبوب! تیری حالت یہ ہے کہ تو ایک بھی آہ
سننے کے لیے تیار نہیں اور ضد پر اڑا بیٹھا ہے۔ ایسے حالات میں میرے لیے
کچھ کہنے کی کیا گنجائش ہے ؟

۴۔ لغات - منفعل : شرمندہ - منفعل نہ چاہ۔ دراصل "منفعل مخذوہ"
کا اردو ترجمہ ہے اور یہ شعر یقیناً اُسی دور کے ہیں جب مرزا پر قارسیٹ قابو تھی۔
خدا نہ کر دہ : خدا نہ کرے۔

تشریح : اسے ظالم محبوب! میرا گمان تو تجھے بے وفا سمجھا بیٹھا تھا لیکن
میں نے تیرے حق میں ایسا خیال گوارا نہ کیا۔ اب خدا کے لیے مجھے میرے گمان
سے تو شرمندہ نہ ہونے دے کہ میں بے بس ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤں، تو واقعی
بے وفا ہے۔

اس شعر کی لفظی اور معنوی خوبیاں بیان کرنا مشکل ہے۔ مثلاً محبوب کو ظالم
کہہ کر خطاب کیا، گویا ایک لفظ میں بتا دیا کہ وہ برابر ظلم کر رہا ہے اور وفا کا اسے
کچھ خیال نہیں۔ پھر فرمایا کہ گمان پہلے ہی یہی کہہ رہا تھا لیکن میں گمان کی بات
ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ پھر فرمایا کہ اب میں شرمندگی سے دوچار ہو
رہا ہوں، کیونکہ گمان سچا نکلا اور میں جھوٹا ثابت ہوا۔ اس حالت میں وفا کی
دیتے ہیں کہ کچھ سوچ، کچھ خیال کر، ہے ہے! خدا نہ کرے میں تجھے بیوفا کہوں!



مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، پیا ہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سمر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
۱۔ تشریح : اسے محبوب!
تو نے سختی کی، میں دل برداشتہ
ہو کر الگ بیٹھ گیا۔ کیا تو
نے مجھ یا کہ میں دوبارہ
تیرے پاس نہیں آ سکتا ؟
یہ بالکل غلط ہے۔ خدا مہربانی

فرمائے اور مجھے بلا لیجیے۔ زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستمگر! ورنہ
 بیٹک گزرا ہو اوقت و عبادہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں
 نہیں آ سکتا، لیکن کیا میں گزرا ہو اوقت ہوں کہ دوبارہ آ بھی نہ سکوں؟

۲۔ شرح : بیٹک مجھ پر انتہائی صنعت طاری ہے اور غیر طعنے دے
 رہے ہیں۔ ان طعنوں کی کیا شکایت کروں؟ طعنے محض باتیں ہیں، پھر کیا باتیں
 کوئی سرہیں کہ اٹھا بھی نہ سکوں؟
 مطلب یہ کہ خیروں کے طعنے اٹھا سکتا ہوں یعنی برداشت کر سکتا ہوں،
 البتہ مجھ میں صنعت کبر باعث سر اٹھانے کی تاب نہیں۔

۳۔ لغات - ملنے کی قسم کھا لینا : ملنے سے انکار کر دینا۔
 شرح : خواجہ عاتق فرماتے ہیں۔

”جب کہا جاتا ہے کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے
 یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس
 عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے؟ کہتا ہے کہ زہر
 کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں کہ اس کو کھا نہ سکوں۔ چونکہ وہ ملتا نہیں،
 اس لیے نہیں کھا سکتا۔“

اے غلام! مجھے زہر ملتا ہی کہاں ہے؟ ورنہ کیا وہ تیرے ملنے کی قسم ہے
 جو کھا بھی نہ سکوں؟

ان تینوں شعروں میں افعال ایسے لائے، جن کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی
 دوسرے مجازی یعنی ایک از روئے لغت، دوسرے از روئے محاورہ۔ مثلاً
 آتا وقت کا بھی ہو سکتا ہے اور اپنا بھی اٹھانا بات کا بھی ہو سکتا ہے اور سر
 کا بھی، کھانا زہر کا بھی ہو سکتا ہے اور محبوب سے ملنے کی قسم کا بھی۔ اس
 قسم کے اشعار اساتذہ کے دیوانوں میں شاف ہی ملتے ہیں۔

ہم سے کھل جاؤ بروقت سے پرستی، ایک دن
 ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کر غدرِ مستی، ایک دن
 عکسۂ اوج بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
 اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی، ایک دن
 قرص کی پتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
 رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی، ایک دن
 نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل! غنیمت جانے
 بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی، ایک دن
 دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
 ہم ہی کر بیٹھے تھے، غائبِ اپیشِ دستی، ایک دن
 شراب پی لی تھی، ہوش دھواس قائم نہیں تھے۔ ارادے کی باگ ڈور بے اختیار
 کے حواسے ہو گئی تھی۔ اگر کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد ہو گئی تو سمجھ لو کہ جلا ارادہ
 ہو گئی اور مستی میں انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہ سکتا۔
 ۲۔ لغات : عرۃ : عزور، گھنڈ، ناز، فخر۔
 بنا : بنیاد۔

عالمِ امکاں : ممکنات کی دنیا یعنی یہ کائنات جو بہر حال فنا ہو جائے گی۔
 دنیا۔

تشریح : اس دنیا کی بنیاد کے بلند ہونے پر غور ہرگز ذیبا نہیں، کیونکہ

۱۔ لغات۔ کھل جاؤ:
 بے تکلف ہو جاؤ۔

مے پرستی : شراب نوشی۔

تشریح : اے محبوب!

کسی روز شراب نوشی کے

وقت ہمارے ساتھ بیٹھ

کر بے تکلف ہو جاؤ، اور

ہم مستی اور مدھوشی کا بہانہ

بنا کر تمہیں چھیڑنے لگیں گے

اس طرح چھیڑ کر وہی

کیفیت پیدا کر دیں گے،

جو بے تکلفی میں ہمارے

پیشِ نظر ہے۔ اگر کچھ

کہو گے یا اعتراض کرو گے

تو ہم کڑی دیں گے کہ بھائی!

اس بلندی کی قسمت میں ایک دن پستی ملتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ کائنات جس ہنس ہو جائے گی۔ اس کی بلند عمارتیں، عایشان قصر، وسیع اور فرحت افزا باغ، عرض جو کچھ اس میں غرور کا باعث ہو سکتا ہے، وہ سب مٹ جائے گا۔ پھر اس پر غرور و ناز کی کون سی وجہ ہے؟

۳۔ لغات۔ فائقہ مستی : اس کے دو معنی ہیں، اول فائقہ و تنگدستی میں بھی مست رہنا اور تنگی کو محسوس نہ کرنا، ”مہنگی کی وجہ قرض لے کر شراب پینا اور مست رہنا۔

شرح : ہم قرض کی شراب پیتے تھے، لیکن اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ یہ ہماری فائقہ مستی ایک دن لازماً ناک لائے گی اور غرور گل بھلائے گی۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ مرزا قاتل پر قرض کے سلسلے میں دہلی وار ہوا۔ مقدمہ مفتی صدر الدین آزاد نے سنا، جو صدر الصدور تھے۔ مرزا کے بیان کی باری آئی تو یہی شعر پڑھ دیا۔ صدر الصدور شعر سن کر مسکرائے، ڈگری قاتل کے خلاف کردی اور قرض کا روپیہ اپنی جیب سے دے دیا۔

۳۱، قفے کے سلسلے میں یہ تفسیر کر دینی چاہیے کہ اگر ایسا ہوا تو کوئی چھوٹے سے قرض کا مقدمہ ہوگا، کیونکہ مرزا پر قرض کی جو بڑی رقمیں واجب تھیں، وہ انھوں نے خود ہی ادا کیں۔

۴۔ شرح : اسے دل؛ اگر مسرت و شادمانی کے نئے سننا ہمارے مقدمہ میں نہیں تو غم ہی کے نغموں کو غنیمت سمجھو، کیونکہ آخر مہتی کا یہ ساز ایک دن بے آواز رہ جائے گا اور اس سے مسرت و شادمانی ہی نہیں، غم کے نئے بھی نکلنے بند ہو جائیں گے۔

بلاشبہ ایک زمانے کے بعد راحت باقی رہے گی، نہ رنج، نہ زندگی کے ساز سے نشاط کے نئے بلند ہوں گے، نہ درد کے۔ اگر ایک چیز نہیں ملتی، تو

دوسری ہی ہیں۔

دوسری جگہ مرزا نے اس سے ملنا ملنا شعر کہا ہے۔

ایک ہٹکے پر موقوف ہے گھر کی رونق

نومذہب غم ہی سہی، نغمہ شادی نہ سہی

لیکن واضح ہو کہ زیرِ غور شعر میں نومذہب ہائے غم نہیں، نغمہ ہائے غم ہی کہا، یعنی

دونوں اصلاً فغنے میں۔ ایک مسرت پیدا کرتا ہے، دوسرا غم۔ پھر یہاں گھر کی رونق

پیشِ نظر نہ تھی، بلکہ سازِ ہستی کا بے صدا ہو جانا پیشِ نظر تھا۔ لہذا جو کچھ بھی نصیب

ہوا اسی کو غنیمت سمجھنا ضروری ہو گیا۔

۵۔ شرح : اے غالب ! میرے سراپا نازِ محبوب کا طریقہ تو یہ نہیں کہ

وصولِ دھپتے سے کام لے اور زرد و کوب تک تو بہت پہنچائے، مصیبت نہ پیش آئی

کہ ہمیں سے ایک روز دستِ درازی میں پہل ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا اب اُسے

برداشت ہی کرنا ہو گا، شکوہ شکایت سے کچھ نہیں بن سکتا۔



ہم پر جفا سے، ترکِ وفا کا لگائیں نہیں

اک چھپر ہے، وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے، اس لطفِ خاص کا

پدِ سس ہے اور پائے سخنِ درمیاں نہیں

ہم کو ستمِ عزیز، ستمِ گر کو ستمِ عزیز

نامرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

۱۔ شرح : محبوب

ہم پر جفا کر رہے تو اس

کا مطلب یہ ہے کہ اسے

جدا سے سچے عشق پر پورا

بھروسہ ہے اور خیال بھی

نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی صورت

میں وفا چھوڑ دیں گے اور اس

سے رشتہ توڑ لیں گے۔ اسی

یقین نے اسے بے پروا بنا

بوسہ نہیں، نہ دیکھیے، دشنام ہی سہی
 آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گردباں نہیں
 ہر چند جانگداز قہر و عتاب ہے
 ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں
 جاں، مطرب ترا نہ کھل، جن مژند ہے
 لب، پردہ سنج زمزمہ، الاماں نہیں
 خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم
 دل میں چھری چھو، مژہ گر خوں چکاں نہیں
 ہے ننگ سینہ دل، اگر آتش کدہ نہ ہو
 ہے عابدِ دل نفس، اگر آذر فشاں نہیں
 نقصان نہیں، جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
 سو گز میں کے بدلے، بیاباں گراں نہیں
 کہتے ہو؟ کیا لکھا ہے تری سر نوشت میں؟
 گویا جیس پہ سجدہ بُت کا نشان نہیں
 پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
 رُوح القدس اگر ہے مرا ہمزباں نہیں

ویسا ہے، جفا کا مطلب یہ بھی
 نہیں کہ ہمارا امتحان مقصود
 ہے، یعنی محبوب یہ بھی نہیں
 چاہتا کہ ہمارے عشق کے
 غلوں کی آزمائش کرے۔
 جب دلوں چیزیں ختم ہو
 گئیں، یعنی نہ ہم پر ترک و نا
 کا گمان ہے اور نہ امتحان
 مقصود ہے تو ہا ہر ہے کہ
 جو بھی جفا وہ کر رہا ہے وہ
 محض ایک پھیڑ ہے، ایک
 محبوبانہ اداس ہے اور یہ بھی
 منہ ان چیزوں کے ہے،
 جن پر ہم فریفتہ و فدا ہیں۔
 ۲۔ لغات -

پائے سخن در میان نہیں:
 بات کا پاؤں در میان نہیں
 یعنی بات کوئی نہیں کی منہ
 سے کچھ نہیں کہا۔

شرح: محبوب
 کے اس خاص لطف و نوازش
 کا شکر ادا کرنے کے لیے منہ
 کہاں سے لاؤں؟ مجھ میں

جاں ہے بہاے بوساؤ لے کیوں کہے، ابھی ادا ئے شکر کی مہال اور تبت
 غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں کہاں ہے بہ لطف و قناریں
 یہ کہ اشاروں اور اداؤں سے حال پوچھ رہے ہیں۔ لیکن مجھ سے کچھ نہیں کہا، بات کوئی نہیں۔

- لطف خاص: اس لیے کہا کہ حال پوچھنے کا یہ طریقہ محبوب نے صرف شاعر
 کے لیے مخصوص رکھا، اوروں کے تعلق میں اس سے کام نہیں لیا۔

۳۔ شرح - ہم اپنی ایذا دوستی کے باعث محبوب کے جو دوستم کو پسند
 کرتے ہیں۔ اس کے برعکس محبوب ہمیں عزیز رکھتا ہے اور جو دوستم اس پیمانے
 پر نہیں کرتا کہ ہمارا وجود ہی ختم ہو جائے، اس لیے ناہر ہے کہ اگر وہ ہم پر ہر بات
 نہیں تو ناہر مان بھی نہیں۔

شعر بہت سہل اور واضح ہے، مثالیں بھی مل جائیں گی کہ شاعروں نے لفظوں
 کے الٹ پھیر سے بڑے اچھے شعر کہے ہیں، لیکن ایسے شعر کی مثالیں بہت کم نظر
 آئیں گی کہ صرف دو لفظوں پر پورا مضمون قائم ہے، یعنی "ستم" اور "نہرمان"۔ زیادہ
 سے زیادہ ایک لفظ "عزیز" اور شامل کر لیجیے۔ جو حقیقت بنا کے شعر نہیں، بلکہ
 مضمون شعر کا لازمہ ہے۔

۴۔ شرح: دہن کی تنگی کو لازمِ حسن میں سے ہے، مگر شاعروں نے
 مبالغہ کرتے کرتے محبوب کے دہن کو ایک نقطہ مفہوم بنا دیا، بلکہ معدومیت تک
 پہنچا دیا۔ مرزا نے بھی اس شعر میں شاعروں کے اسی قصور سے کام لیا ہے۔ کہتے
 ہیں کہ اسے محبوب: بوسہ دینے کا بہانہ تو یہ ہو گیا کہ ہمارا منہ ہے نہیں، جو بوسہ
 دیں۔ لیکن بوسہ نہیں دیتے تو گالی ہی دیجیے، کیونکہ آپ کا منہ معدوم ہے تو زبان
 تو موجود ہے، اس سے تو کام لیا جاسکتا ہے۔

۵۔ ۶۔ لغات - پشت گرمی، یادری، درد، تقویت، بہارا، ساقیہ۔

مغرب: گانے والا۔

بل من مزید : قرآن بید کی ایک آیت کا ٹکڑا جس کے معنی ہیں : کیا کچھ اور بھی ہے ؟ یہ ٹکڑا سورۃ ق سے ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔

وَنَقُولُ لَهُ جَهَنَّمَ هَلِ امْلَكْتُ
وَنَقُولُ لَهُ هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ
کیا تو صبر رکھتی ؟ اور وہ کہے گی : کیا کچھ اور بھی ہے ؟

پہرہ پہنچ : ساز کے پردے سے کام لینے والا یعنی نذرانہ ، ڈاگر ۔

الامان : پناہ ۔ رحم ۔

شرح : اگرچہ محبوب کا غضب اور غصہ جان گھلائے جا رہا ہے ، اگرچہ طاقت و قوت ساتھ دینے اور سہارا دینا کرنے کے لیے تیار نہیں ، پھر بھی جان بل من مزید کا قرآن گارہی ہے یعنی چاہتی ہے کہ غضب اور غصہ اور زیادہ ہو اور مجھے مزید شدت سے ان کا تختہ مشق بنایا جائے ۔ ساتھ ہی لب کی یہ حالت ہے کہ اس پر پناہ یا رحم کا زمرہ کبھی نہیں آیا ۔

مطلب یہ کہ جان ٹھنکی جا رہی ہے ، جسم کی طاقت جواب دے چکی ہے ، لیکن عشق مزید قہر و عتاب کا طلب گار ہے ۔ لب شدت اور سختی سے پناہ مانگنے کے لیے تیار نہیں ۔

۷ ۔ لغات ۔ دو نیم ۔ دو ٹکڑے ۔

شرح : اگر تیرا دل عشق و محبت میں دو ٹکڑے نہ ہو ، تو تجھے چاہیے کہ خنجر سے سینہ چیرے ۔ اگر پلوں سے خون نہیں ٹپکتا تو ضروری ہے کہ دل میں چھری چھو دے ۔

دل اسی طرح پارہ پارہ ہو سکتا ہے کہ سینہ خنجر سے چیر دیا جائے اور آنکھوں

سے اُردو میں جہنم اور دوزخ ذکر استعمال ہوتے ہیں : عربی میں جہنم مؤنث ہے ، لہذا قرآن میں قرآن مجید ہی کی پیروی کی گئی ۔

ہے اور اسی وقت شے کے گاہب پھری چھوٹنے سے دل ٹھن ہو جائے گا، لیکن مرزا غالب کا مطلب یہ نہیں کہ واقعہ ایسا کیا جائے، مطلب صرف یہ ہے کہ دل کو جلال و پارہ اور پیکوں کو بہر حال خوشچکان ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو سینہ اس قابل ہے کہ اسے شجر سے چیر دیا جائے اور دل اس لائق ہے کہ اس میں چھری چھب دی جائے یہ حقیقت اگلے شعر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

۸۔ لغات - آتشکدے : آتش کا گھر۔ آتش پرستوں کا عبادت خانہ، جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔

آذر فشاں : آگ جھاڑنے اور برسانے والا۔

شرح : جو دل آتش عشق سے سراپا آتش کہہ دینا چاہئے، وہ سینے کے لیے باعث ننگ ہے اور جو سامن آگ نہ اُگلے، وہ دل کے لیے عار اور شرم کا موجب ہے۔

۹۔ شرح : دلوانگی کی حالت میں گھر خراب ہوتا ہے تو ہونے دو، میں بیابان کے چکر لگاؤں گا تو گھر کی دیکھ بھال کرنے والا کون ہوگا؟ اس حالت میں وہ اچڑھتا ہے تو اچڑھتا ہے۔ اس میں میرا کیا نقصان ہے؟ گھر کی زمین زیادہ سے زیادہ سو گز ہوگی۔ اس کے بدلے میں مجھے بیابان ملتا ہے، جس کی وسعت اور پیمائی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

نفاہر ہے کہ مرزا نے گھر اور بیابان کا موازنہ کرتے وقت صرف رقبہ پیش نظر رکھا اور انداز بیان ایسا اختیار کیا کہ پڑھنے والے کو کسی دوسری چیز کا احساس ہی نہیں ہو سکتا۔ یہی شاعر کا کمال ہے، ورنہ گھر اور بیابان کے موازنے کی یہ کوئی اچھی صورت قطعاً نہیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اگر ویرانی میں دونوں کیساں ہوں تو ترجیح کا فیصلہ وسعت رقبہ ہی کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

۱۰۔ لغات - سر نوشت : تقدیر، قسمت، خط پیشانی یعنی پیش آنے والے

حالات کی نبی تحریر۔ مقتدر۔

شرح : اے محبوب! تم پوچھتے ہو کہ تیری قسمت میں کیا کچھ لکھا ہے؟
مقام حیرت ہے کہ تمہیں میری پیشانی پر نبوت کے سجدے کا نشان نظر نہیں آیا؛
اپنے محبوب کو سجدے کرتے کرتے میرے ماتھے پر تو گنا چڑ گیا اور پوچھتے ہو کہ
تیرے خطِ پیشانی میں کیا کچھ لکھا ہے؟ حالانکہ ماتھے کا نشان خود میرا خطِ پیشانی
اور میری تقدیر واضح کر رہا ہے اور اسی پر مجھے ناز ہے۔

۱۱۔ لغات۔ روح القدس : حضرت جبریلؑ۔

شرح : اگرچہ جبریلؑ میرا ہم زبان نہیں، یعنی جو زبان مجھے ملی ہے وہ
اسے نہیں ملی، لیکن اس سے اپنے کلام کی کچھ داد پاتا ہوں، یعنی وہ پورا تو نہیں
کچھ کچھ میرا کلام سمجھتا ہے۔

مطلب یہ کہ میرے شعر سرا سرا وہی ہیں، مگر ہندوستان کی وسعت سرزمین
میں ان کے سمجھنے اور داد دینے والے کہاں ملتے ہیں، صرف روح الامیت سے
کچھ داد پاتا ہوں۔

خواجہ حالی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ہنر زبان کے لفظ میں ایہام ہے، غلامی
معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی، ورنہ اس میں
یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے، ویسی صریح القدس کی نہیں۔

۱۲۔ لغات۔ بہا : قیمت، معاوضہ۔

شرح : بیشک محبوب نے بوسے کی قیمت جان رکھ دی ہے، یعنی بوسے
کے عوض میں وہ جان طلب کرتا ہے، لیکن ابھی اس کے اعلان کے لیے تیار
نہیں اور کیوں اعلان کرے، جب جانتا ہے کہ ابھی غالب نیم جاں نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ جب پوری جان بوسے کی قیمت شہری تو غالب فوراً ادا
کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا، حالانکہ محبوب کی مرضی یہ نہیں، چنانچہ وہ انتظار
میں بیٹھا ہے کہ غالب عشق کی سختیاں سہہ کر نیم جاں ہو جائے۔ اس وقت پکار
کر کہ دے گا کہ اب جان دے کر بوسہ دیا جاسکتا ہے اور غالب نیم جانی کے باعث

نہ مقررہ قیمت ادا کر سکے گا اور نہ یوسے کا حق دار بنے گا۔

○ مابعد دشت نوروی کوئی تدبیر نہیں

ایک پکڑے ہوئے پاؤں میں، زنجیر نہیں
شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں

جادو غیر از نگہ ویدہ تصویر نہیں

حسرت لذتِ آزار رہی جاتی ہے

جادو راہِ وفا، جز دمِ شمشیر نہیں

رہنچِ نومیدی جادوید! گوارا رہو

خوش ہوں، گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھاتا ہے، جہاں زخمِ سراچھا ہو جائے

لذتِ سنگ، بہ اندازہٴ تقریر نہیں

جب کرمِ رخصت بے باکی دگستاخی سے

کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قولِ ناسخ

آپ بے برہ ہے، جو معتقدِ میر نہیں

۱۔ لقات - دشت نوروی:

بیابان کی خاک چھانتا، سبکل جکل
پھرنا، صحرا گردی۔

پکڑے: پھرنے کی کٹ، گردش

کا عادتِ ثانیہ بن جاتا۔

شرح: مجھے کوئی تدبیر

صحرا و بیابان کی خاک چھاننے

سے روکنے والی نہیں۔ دیوانے

کو زنجیریں اس لیے پہنائی جاتی

ہیں کہ وہ باہر پھرنے سکے، گویا

یہ ایک تدبیر ہوتی ہے، جو

اسے صحرا گردی سے روک دیتی

ہے، لیکن جس شخص کے پاؤں

کی زنجیر خود ایک پکڑ بن جائے

اسے زنجیر یا ایسی ہی کوئی دوسری

تدبیر کیونکر روک سکتی ہے؟

جو شخص ہر وقت پھرتا رہے،

اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس

کے پاؤں میں پکڑ ہے، جس شخص

کے پاؤں میں زنجیر پکڑ بن جائے

یعنی گردش سے روکنے والی چیز

خود گردش بن جائے، اسے کون روک سکتا ہے ؟

۲۔ شرح : عشق مجھے اس صحرا میں دوڑا رہا ہے، جہاں کوئی راستہ ہے تو صرف ایک اور وہ تصویر کی آنکھ کی نگاہ ہے، گویا بالکل موحوم ہے۔
- بھنوری مرحوم اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

- دشتِ وفا میں عشق کی نگہ دو دو کا انجم موت ہے۔ اس بھر سراب کا کوئی ساحل نہیں، کوئی جادہ نہیں، جس سے مسافر جان سلامت لے جاسکے۔ واہ عدم کو مرزا کمال شاعری سے یوں بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک راستہ ہے اور وہ نگہ دیدہ تصویر ہے، یعنی کوئی راستہ نہیں۔ عدم کو وجود کے لباس میں کیا خوب جلوہ گر کیا ؟

۳۔ شرح : خواجہ مائی فرماتے ہیں :
- جادہ یعنی بیٹا (پگڈنڈی)، کو دم شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے، وہی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متنع ہوں، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے، اس لیے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذت آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

تلوار کی دھار پر جو بھی قدم رکھتے گا، وہ یقیناً کٹ مرے گا اور وفا کا راستہ تلوار کی دھار کے سوا کوئی ہے بھی نہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ عاشق دکھ اٹھانے اور ایذا سہنے کی جس لذت کے رسیا میں، تلوار کی دھار پر چلنے سے وہ پوری موتی نظر نہیں آتی، لہذا صورتِ حال یہ ہے کہ نہ وفا کو چھوڑ سکتے ہیں نہ دم شمشیر پر چلنے میں متاثر ہو سکتے ہیں، نہ تو کھد کی لذت بہ قدرِ ذوق حاصل کر سکتے ہیں اس لذت کی حسرت دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

۴۔ لغات - زبونی : بے بسی، لاپیاری، ذلت، عاجزی، ذہنی کش

کے معنی ہیں ذلت اٹھانے والا۔

شرح : اے ہمیشہ کی مایوسی اور نامرادی کے رنج ! مجھے تو ہی خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے تو ہی مجھے نصیب رہے۔ میں اس بات پر خوش ہوں کہ میری آمد و رفتوں نے تاثیر کی ذلت نہ اٹھائی۔
ہمیشہ کی مایوسی کا رنج گوارا کر لیا۔ مگر تاثیر کا احسان نہ اٹھایا۔

۵۔ لغات۔ بہ اندازہ تقریر : وہ بات جو تقریر میں نہ سانسکے۔
جس کی حقیقت کا اظہار لفظوں سے متباد نہ ہو۔ یعنی لفظوں میں بیان نہ کیا جاسکے۔

شرح : سر کا زخم اچھا ہو جاتا ہے تو سر کھانے لگتا ہے۔ یعنی اسے پھر یہی آندو پیدا ہوتی ہے کہ پھر برساتے جاؤں اور وہ از سر نو زخموں سے بچد ہو جائے۔ پھر کھانے میں ایسی لذت ہے کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ تقریر کا لباس نہیں پہنایا جاسکتا۔

”سر کھاتا ہے“ میں خونی کا ایک پہوہ بھی ہے کہ جب زخم اچھا ہو جاتا ہے اور کھرنڈ بن جاتا ہے تو مقام زخم پر کھلی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کھلی کو عام لوگ زخم کے اندام کی دلیل سمجھتے ہیں۔
۶۔ لغات۔ خجلیت : شرمندگی۔

شرح : جب محبوب کا لطف و کرم بیباکی و گستاخی کی اجازت دے دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ کوتاہی پر شرمساری کے سوا اور کوئی کوتاہی نہیں۔
مطلب یہ ہے کہ جب محبوب نے ازراہ کرم اجازت دے دی کہ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کرو تو جو بھی اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں توقف نہ کریگا وہ گنہگار ہوگا، کیونکہ اس نے محبوب کے کرم سے فائدہ نہ اٹھایا۔

شعر میں دراصل اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ اصل شے محبوب کی رضا اور خواہش ہے۔ گناہ وہی ہے جو محبوب کی رضا کے خلاف ہو۔ جن امور کو اس

نے ازراہ لطف و نوازش گناہوں سے خارج کر دیا، ان کا نہ کرنا یقیناً گناہ سمجھا جانا چاہیے۔

۷۔ شرح : اے غالب ! ناسخ کے قول کے مطابق ہمارا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص میر تقی میر سے عقیدت نہیں رکھتا، وہ دراصل خود شاعری سے بے بہرہ ہے۔ یعنی میر سے عقیدت ہر شخص کے لیے لازم ہے۔

نسخہ حمید یہ میں اس شعر کا پہلا مصرع یوں بھی ہے۔

رہنختے کا وہ ظہور ہے، قولِ ناسخ

و اس زمین میں ایک اور شعر بھی غالب سے منسوب ہے، یعنی :

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب !

جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

۱۔ لغات :
مردمک دیدہ : آنکھ
میں جمع سوید اے دلِ چشم میں آہیں
کی پتلی ۔
سُویدا : دل کا
سیاہ نقطہ ۔

شرح : یہ نہ سمجھیے کہ آنکھ کی پتلی میں نگاہیں موجود ہیں، یہ کیسے کہ آنکھ کے دل میں جو ایک سیاہ نقطہ موجود ہے، اس میں آہیں جمع ہو گئی ہیں۔
یہ کوہِ کندن دکاہ بر آردون کی عجیب مثال ہے۔ پہلے آنکھ کی پتلی کو آنکھ کا دل قرار دیا، پھر نگاہوں کو اس دل کے سیاہ نقطے میں آہیں کیا۔

برشکال گرئیہ عاشق ہے، دیکھا چاہیے
 ۱۔ لغات - برشکال :
 برکھادت - برسات -
 شرح : عاشق کی آنکھوں
 نے جو جھڑی لگا رکھی ہے
 دیکھیے وہ کیا رنگ لائے ،
 باغ کی دیوار سو جگہ سے پھول
 سر وہ ہے باد صغیر آزادی گرفتار چمن
 کی مانند کھیل گئی ہے ۔

مولانا طہطائی کی یہ دانتے خاص توجہ کی مستحق ہے کہ ہے " کی جگہ اصل میں نابا
 "جی" کا لفظ تھا۔ کاتب نے غلطی سے "جی" کی جگہ ہے " بنا دیا۔ یعنی عام برساتیں
 تو دیکھ چکے۔ اب فردا دیدہ عاشق کی برکھادت بھی دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ یہ کیا
 رنگ لائے گی ۔

دوسرے مصرع میں لفظ کھل "اور کھیل" دونوں طرح معنی دیتا ہے۔ دیوار سے
 مناسبت کھل جانے یعنی پھٹ جانے یا شکافتہ ہو جانے کو ہے اور پھول سے تشبیہ
 کا تقاضا یہ ہے کہ اسے "کھیل" پڑھا جائے ، معنی دونوں صورتوں میں ایک ہے ۔
 شعر کا مفہوم بظاہر یہ ہے کہ دیدہ عاشق کی جس برسات نے دیوار چمن کو پھول
 کی مانند سو جگہ سے کھلا دیا ، اس نے چمن میں خدا جانے کیا گل کھلے ہوں ۔
 ۲۔ لغات - وار شگی : آزادی ۔

شرح : خواہ مخواہ عاتق مڑاتے ہیں ؛
 مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد اور مستہ مزاج ہو ، دنیا میں عشق و محبت
 کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا ۔

پھول کی محبت ہے آزادی حاصل کرنے اور چھٹکارا پانے کا دعویٰ بالکل
 غلط ہے۔ سر وہ دیکھیے اسے آزاد کہا جاتا ہے ، لیکن آزادی کے باوجود وہ باغ
 میں قید ہے۔ گویا باغ کے دائم محبت میں گرفتار ہے ۔

صحیح ہے کہ زندگی میں انسان دنیوی مصلحت سے چھٹکارا نہیں پاسکتا۔ اس کے مزاج میں کتنی بے پروائی اور بے نیازی ہو، لیکن اس کا رشتہ محبت دنیا سے بہر حال قائم رہے گا۔

مفتی صرف درجوں کا ہوتا ہے، کسی کی گرفتاری کا درجہ بہت بڑھ جاتا ہے اور کسی کا کم رہتا ہے۔ کوئی ان درجوں میں سرسٹا پا جکڑا جاتا ہے کسی کو نسبتِ نزہت حاصل ہوتی ہے، مگر کامل آزادی کا دعویٰ صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔

عشقِ تاثیر سے نومید نہیں	جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنتِ دست بہ دست آئی ہے	جاہِ مے، خاتمِ حبشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود	دترہ بے پروا تو نورِ شید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے	ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے	عجب محرومی جاوید نہیں
کہتے ہیں، جیتے ہیں اُمید پر لوگ	بہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

۱۔ لغات۔ جاں سپاری : جان سوئپ دینا، یعنی جان قربان کر دینا،

جاں نشانی، جاں بازی۔

شجرِ بید : بید کا درخت۔ بید میں کوئی پھل نہیں لگتا، اس لیے اسے بے ثمر درخت کہا جاتا ہے۔ چونکہ شعر کے مصنف کو اس پہلو سے خاص تعلق ہے، اس لیے تصریح ضروری ہوئی۔

شرح : عشقِ تاثیر سے ناامید نہیں ہو سکتا، لازم ہے کہ وہ مراد پر پہنچے

اور کامیابی حاصل کرے۔ جان پر کھیل جانا اور زندگی سے ہاتھ دھو لینا بید کا درست نہیں کہ اسے کوئی پھل نہ ملے اور بالکل بے ثمر و بے نتیجہ ہے۔

بمخوری مرحوم فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نے افلاطون کے اتنا دستخط کی طرح زہراب کو ہمیشہ خوش شیریں پر ترجیح دی۔ غالب کا علم الاخلاق ہاں سپاری ہے اور :

ہاں سپاری شجر بید نہیں

مرزا نے اس شعر میں ایک بہت بڑی حقیقت واضح کی ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی کام ہوئے ہو رہے ہیں یا آئندہ ہوں گے، ان کی تہ میں عشق کا مرزا ہے۔ لوگ ہواؤں کی بلند ترین چوٹیوں پر پہنچے، انھوں نے اقصاء سمندر کھنگال ڈالے، بڑا عظم آباد کر دیے، صحراؤں کو گلزار بنا دیا، قطبین کے راز معلوم کر لیے۔ ایک دوسرے سے جڑ کر حیرت انگیز ایجادیں کرتے کرتے انھوں نے زمین کا اندر نہ بھی دیکھ لیا۔ اب ستاروں کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کون سا کارنامہ ہے، جو عشق یعنی ایک خاص مگن کے بغیر انجام پایا اور مگن بھی ایسی کہ ایک کے بعد ایک پشت ہا پشت تک ایک کام کی دھن میں مصروف رہا، یہاں تک کہ کئی پشتوں کے بعد راز ملا اور منزلی مقصود تک رسائی نصیب ہوئی۔ اگر عشق تاثیر سے نا اُمید ہو جاتا اور جاننا زمی و جانفشانی چھوڑ دیتا تو یہ سب کچھ کیونکر ہو سکتا؟ انسان کسی مقصد کے لیے جان دینے پر آمادہ ہو جائے تو وہ یقیناً حصول مقصد میں تامل نہ کرے گا۔ اور انسانی سر و کوشش کی صورت ایک تسلسلے کی ہے۔ ہر انسان قدم بہ قدم آگے بڑھتا جاتا ہے۔ جہاں ایک کی زندگی ختم ہوتی ہے، دوسرا اس کا کام سنبھال لیتا ہے۔ اسی طرح منزلی مقصود سامنے آ جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے، جو آٹھ دس مفکروں میں مرزا غالب نے پیش کر دی۔

اس شعر کی عاقبت دو کلمات حقیقت کا یہ حال ہے کہ عشق بھاری و عشق بھاری

علم و حکمت، سیاست و ملک داری، ایجاد و اکتشاف سب پر کیاں چسپاں کر سکتے ہیں۔

۲۔ لغات۔ جمشید : ایران کا بادشاہ، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ

اس نے سب سے پہلے شراب بنائی۔

خاتم : وہ انگشتری، جس پر مالک کا نام کندہ ہو۔

سلطنت سے اشارہ جام سے کی طرف ہے۔

شرح : جام سے کی حیثیت ایک سلطنت کی ہے اور یہ سلطنت باقول

باقہ چکر کھاتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ آج ایک کے پاس ہے اور کل دوسرے کے

پاس، ہم کیوں سمجھیں کہ جام سے جمشید کی انگشتری ہے، جس پر اس کا نام کندہ

تھا اور وہ اسی کے لیے مخصوص تھی۔ یہاں تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ کسی زمانے

میں جمشید اس سلطنت کا مالک تھا، آج ہم مالک ہیں۔

۳۔ شرح : اسے مالک حقیقی، تیری ہی جلوہ نمائی سے وجود کو

سرد سامان نصیب ہوا، یعنی کائنات وجود میں آئی۔ بے شک اس کی حیثیت

ایک ذرے کی ہے، لیکن کوئی ذرہ سورج کے جلوے کے بغیر تباہ

کا حامل نہیں ہو سکتا۔

۴۔ شرح : خواجہ عالی فرماتے ہیں :

”بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور

خواہ پوشیدہ قباححت ہو، یہاں پوشیدہ قباححت مراد ہے۔ اگر مر جانے

کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے

ہو جاتے۔“

مطلب یہ ہے کہ میرے مر جانے میں کوئی پوشیدہ قباححت موجود نہیں صرف

یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اس طرح کہیں محبوب کا راز ناش نہ ہو جائے اور اس

کی رسوائی نہ ہو۔ یعنی لوگ یہ نہ کہیں کہ دیکھو اس شخص کے مر جانے کا باعث

فلاں یعنی محبوب ہے۔ اس طرح مجھے اس سے جو عشق ہے، وہ سب یکمحل
جائے گا۔ یہ تو محبوب کی رسوائی ہوئی۔ خود مجھے لوگ یہ طعنے دیں گے کہ دیکھو
عشق کا تہی تھا اور اس کی کڑیاں سہہ نہ سکا۔ یہ طعنے میرے علاوہ محبوب کے
یہ عزت کا باعث نہ ہوں گے۔ اگر ان تباہوں کا ڈر نہ ہوتا تو میرے لیے ہر
جانا کون سا مشکل کام تھا؟ میں تو موت کا خیر مقدم کرتا، کیونکہ غلوں اور مصیبتوں
سے نجات مل جاتی۔ لیکن کروں کیا، راز محبوب کے کھل جانے کا خوف پریشان
کر رہا ہے۔

۵۔ شرح : ڈر ہے تو یہ کہ عیش و نشاط کا عالم بدل جائے گا۔ یہ گروش
کی نذر ہو جائے گا اور ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا، لہذا میں عیش و نشاط کا خواہاں
ہی نہیں، کیونکہ جو چیز آج ہے اور کل نہیں ہوگی، اسے لے کر کیا خوشی ہو
سکتی ہے اور وہ حاصل بھی ہو جائے تو سہر لحظہ اس کے بدل جانے اور ختم ہو
جانے کا وغیرہ دیکھا رہے گا، اس وجہ سے عیش و نشاط حاصل ہونے کی حالت
میں بھی اطمینان سے فائدہ نہ اٹھایا جاسکے گا۔ اس کے برعکس ہمیشہ کی محرومی
کا کوئی غم ہی نہیں، کیونکہ برابر ایک حالت قائم رہے گی اور اس میں تبدیلی کا
کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔

مرزا نے یہ مضمون ایک فارسی شعر میں بھی نہایت عمدہ طریق پر باندھا ہے۔

زینار از لقب آتش جاوید مترس

خوش بہار میت کز دیم خزاں بر خیزد

یعنی ہمیشہ کے لیے آگ میں جلنے کی سزا ملنے کا اندیشہ ہو تو خوفزدہ ہونے
کی کوئی وجہ نہیں۔ اس بہار کی اچھائی میں کسے کلام ہو سکتا ہے، جس پر کبھی خزاں
نہ آئے۔

۶۔ شرح : مشورہ ہے کہ لوگ اُمید پر جیتے ہیں، دنیا ہ اُمید قائم، گویا
اُمید جینے کا سہارا ہے۔ لیکن یہاں خود زندگی ہی معرضِ خطر میں ہے۔ یعنی جو چیز

کے لیے امید سہارا بن سکتی ہے، وہ چیز ہی بچتی نظر نہیں آتی تو ہمارے لیے
 امید کیونکر تکیہ گاہ بن سکتی ہے۔ خواہ عالی نے بالکل درست فرمایا ہے :
 "یہ شعر سہل متنع ہے" یعنی اتنا سہل ہے کہ بظاہر معلوم ہو، ایسا کہ
 لینا کہ مشکل نہیں۔ مگر جب کوئی کہنے بیٹھے تو کڑکے۔ یقیناً اس زمین
 میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں	خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
دل آشفٹگاں خالی کنج دہن کے	سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
توڑے سروِ قیامت اک قدمِ آدم	قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر، اے محو آئینہ داری	حجے کس تناسل سے ہم دیکھتے ہیں
سراخِ قلبِ نالہ لے داغِ دل سے	کہ شبِ رو کا نقش قدم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیں غالب	تماشا لے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۱۔ لغات۔ خیاباں : پھولوں کی کیدری، باغ کی روش، تختہ محل۔
 فارسی کے کسی لفظ کی تکرار کثرت کے معنی دیتی ہے، یعنی خیابان خیابان کے
 معنی ہیں، کثرت تختہ ہائے گل۔

اِرم : ایک قدم شہر کا نام، جو شداد سے منسوب تھا اور وہیں اس کا شہر
 آفاق باغ جایا تھا۔ اب یہ لفظ مطلق بہشت کے معنی میں مستعمل ہے۔

شرح : اے محبوب! جہاں کہیں ہم چلے گئے پاؤں کے نقش دیکھتے ہیں :
 ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ ہر طرف بہشت کی کیاریاں پھیلی ہوئی ہیں، جن میں کثرت

سے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ بین مرزا نے محبوب کے نقش قدم کو بہشت کی ایسی کیاری کے تشبیہ دی، جس کا دامن پھولوں سے بھرا ہوا ہو۔

۲۔ لغات۔ دل آشفگان : آشفہ دل، وہ لوگ جن کے دل بہت سے پریشان ہوں۔ مشتاق۔

غالب کچھ دہن : وہ تہل، جو دہن کے کسی ایک سرے پر ہو۔
 شرح : شعر کا پورا مضمون شاعروں کے اس مبالغہ آمیز تصور پر مبنی ہے کہ محبوب کا دہن تنگی کے سبب معدوم ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جو لوگ تیرے دہن کے سرے کے تہل کی محبت میں دل کھو بیٹھے ہیں، وہ اپنے دل کے سیاہ لفظوں میں عدم کی سیر کرتے ہیں۔

چونکہ دہن ناپید ہے، اس لیے اسے عدم قرار دیا۔ تہل کو سویدہ سے مناسبت ہے۔ لہذا سویدہ میں بیٹھ کر عدم کی سیر ہو رہی ہے۔

۳۔ شرح : خواجہ حاتمی فرماتے ہیں :
 اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے قندہ قیامت کتر ہے۔ دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے، اس لیے وہ ایک قد آدم کم ہو گیا۔

قامت، قیامت، سرو، قد، قندہ وغیرہ الفاظ کی مناسبت ظاہر ہے۔ دیکھیے چھوٹی سی بھر کے شعر میں بھی دو معنی پیدا کر لیے اور کم سے کم لفظوں میں بھی شعر کہتے تلفظ پہلو وار بنا دیا۔ یہ کمالات حمزہ و فکر اور ریاضت سے حاصل نہیں کیے۔

یہ اس کی دین ہے جسے پردہ گاروے

۴۔ لغات۔ آئینہ دار سی : آئینہ سامنے رکھنا۔ شعر میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ آئینہ سامنے رکھ کر اس میں عکس ہو جاتا۔

شرح : اسے آئینہ سامنے رکھ کر اپنے حسن و جمال میں عکس ہو جانے والے محبوب ! فدا ہے بھی تو دیکھ کہ ہم تجھے کس ذوق و شوق سے دیکھ رہے ہیں۔

اس شعر میں ایک خاص منظر پیش کیا ہے۔ جب تک اسے پیشِ نظر نہ رکھ لیا جائے، شعر کی معنویت واضح نہیں ہو سکتی۔ محبوب آئینہ رکھ کر اپنے جمال میں محو ہے۔ عاشق بار بار چاہتا ہے کہ محبوب کی نظر اُس کی طرف اٹھے، مگر محبوب پر دستِ محویت کا عالم طاری ہے۔ آخر پریشان ہو کر عاشق پکار اٹھتا ہے کہ اے اپنے حسن و جمال میں محو جانے والے! ذرا ہمیں بھی نگاہِ مہفت سے شاد کام کر دیکھو۔ ہم کس آرزو اور کس محویت سے تجھے دیکھ رہے ہیں؟ محض اس لیے کہ تیری نگاہِ مہفت اُٹھے گی تو ہماری آرزوؤں کے چمن میں تازگی و شادابی کی بہار آ جائے گی۔

۵۔ لغات - قُب نالہ : آہ و فغاں۔

شبِ رُو : رات کو چلنے والا۔ یہ لفظ عموماً بچوں کے لیے مستعمل ہے اور یہاں بھی اس سے چھڑ ہی مراد ہے۔

شرح : اگر تو ہماری آہ و فغاں کی گرمی اور پیشِ کا کھوج لگانا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ ہمارا داغِ دل دیکھو، کیونکہ عام قاعدہ ہے، چور کا کھوج لگانا جو تو اس کے پاؤں کے نشان دیکھتے ہیں۔ گویا دل کا داغ ہماری گرم آہ و فغاں کا ایک نقشِ پا ہے۔

نالے کو شبِ رُو اس لیے کہا کہ آہ و فغاں عموماً رات ہی کو کی جاتی ہے۔

۶۔ شرح : اے غائب! ہم نے اہلِ کرم کے خوف اور شانِ کرم کا اندازہ کرنے کے لیے فقروں کا بھیس بنا لیا ہے۔ ہمیں مانگنے کی ضرورت نہ تھی، درویشی اختیار کر لینے پر مجبور نہ تھے، محض اس لیے درویشی کا بھیس بدل لیا کہ دیکھیں، اہلِ کرم کی داد و دہش کا کیا حال ہے؟ وہ فقیروں سے کیا برتاؤ کرتے ہیں؟ ان کے دینے کا انداز ایسا ہے کہ انہیں واقعی اہلِ کرم میں شمار کیا جائے؟

اہلِ کرم کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے علاوہ شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ ہم محتاج نہ تھے، لیکن محض اس لیے درویشی اختیار کر لی کہ ہمیں اہلِ کرم

کا انازہ بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ہمارا دل بھال لیا اور ہم فقیر بن گئے۔
شعر میں "تاشا" بمعنی "سیر" ہے۔

بہتی ہے خوشے یار سے نار، التہاب میں
کافر ہوں، اگر نہ ملتی ہو راحت، عذاب میں
کب سے ہوں؟ کیا تہاؤں؟ جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گہ حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں غیند آئے غم بھر
آنے کا حمد کر گئے، آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور بلکہ رکھوں
میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکر و قاہر، فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے بار میں
میں مضطرب ہوں وصل میں خوب رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس بیچ و تاب میں

۱۔ لغات۔ التہاب؛
اشتعال۔ شعلوں کا بھڑک اٹھنا۔
شرح : مجھے دوزخ میں
ڈال دیا گیا، جہاں سہرط آگ
بھڑک رہی ہے اور آنگارے
دبک رہے ہیں۔ یہ اشتعال
میرے محبوب کی طبیعت و عادت
سے ملتا جلتا ہے۔ اس لیے
مجھے جتنا عذاب ہوتا ہے، اتنی
ہی راحت نصیب ہوتی ہے
کیونکہ میں اپنے آگ بھجور کا محبوب
کے غیظ و غضب کا مادی پتلا
آتا ہوں۔ اگر اس عذاب میں
راحت نہ ملے تو سمجھ لینا چاہیے
کہ میرا ایمان جاتا رہا اور میں
کافر ہو گیا۔

۲۔ شرح : میں کیا تباہ
کہ اس جہانِ خراب میں کب سے
مقیم ہوں؟ اگر ہجر کی مالتوں
کو بھی حساب میں شامل کروں۔

میں اور خطِ وصل ؛ خدا ساز بات ہے
 ہاں نذر دینی بھول گیا ، اضطراب میں
 ہے تیوری چڑھی ہوئی ، اندر نقاب کے
 ہے اک شکن پڑی ہوئی ، طرفِ نقاب میں
 لاکھوں لگاؤ ، ایک چرانا لگا ہوا
 لاکھوں بناؤ ، ایک بگڑنا عتاب میں
 وہ نالہ دل میں خُش کے برابر جگہ نہ پائے
 جس نالے سے شکاف پڑے آفتاب میں
 وہ سحرِ اقدارِ طلبی میں نہ کام آئے
 جس سحر سے سفینہ رواں ہو سرباب میں
 غالب چھٹی شراب ، پر اب بھی کبھی کبھی
 پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ مابستاب میں

جو درازی میں اپنی مثال آپ
 ہوتی ہیں تو میرے لیے اس دنیا
 میں رہنے کا اندازہ لگن ہی نہیں
 یہ معاملہ حساب میں آئی نہیں لگتا
 اند کوئی وقت معین ہو ہی نہیں
 سکتا ۔

اس شعر میں مرزا نے شہانے
 بھر کی درازی کا معنوں کا مکمل
 اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے ۔
 اس سلسلے میں دو شعر پیش
 کیے جاتے ہیں ، جن میں مرزا کے
 اس شعر کا نغمہ قرار دیا جاتا
 ہے ۔ اول امیر خسرو کا شعر :
 ذبے عمر دراز عاشقانِ گر
 شبِ بھراں حسابِ عمر گیرند
 یعنی وہ عاشقوں کی عمر
 کتنی دراز ہے ، بشرطیکہ بھر کی راتیں
 ہیں عمر میں شمار کی جائیں ۔

دوم کمالِ اصفہانی کا شعر :

ذخیرۂ عمر قزوں است عشقِ بازاں را

اگر ز عمر شمارند روزِ بھراں را

عاشقوں کی عمر خسرو سے بھی بڑھ جائے ، اگر وہ بھر کے دنوں کو بھی عمر میں شمار

کر لیں ۔

امیر خسرو کے شعر میں حیرت کی راتوں کا ذکر یقیناً ہے۔ مگر سارا انداز عاشقوں کی ذرا ذرا بھڑک پر ہے۔ کمال اصفہانی کے شعر میں ”روڈ بھراں“ رکھا، حالانکہ مقام کا اقتضا ”شب بھراں“ تھا۔ بھرتیقین کر دیا کہ عاشقوں کی عمر خسرو سے بڑھی ہوئی ہے۔

ملاوہ بری دونوں شعروں میں شہرت جس درجے کی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ ان دونوں کے برعکس مرزا نے پہلے مصرع میں دو ابہام پیدا کیے، اولیٰ یہ کہ ”کب سے ہوں“ دوسرا یہ کہ کیا تباؤں“ اور دنیا کو تہان خراب کیا۔ خواہ اس لیے کہ یہ ہے ہی خراب، خواہ اس لیے کہ مرزا کو پھر وفاق کے مصائب کے باعث یہ جہاں سازگار نہ ہوئی۔ یہ دو ابہام اس امر کے گواہ ہیں کہ شہنائے حیراں کو حساب میں شامل کر لینے کے بعد نہ کوئی مدت، نہ کھر کی رسائی میں آتی ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی مستین بات زبان پر لائی جاسکتی ہے۔ بھرہ حیثیت مجموعی شہرت کمال پر پہنچا دی۔

اگر فرض میں بھی کر دیا جائے کہ مرزا نے اصل معنی امیر خسرو ابھی کمال اصفہانی سے لیا تو اس میں کیا کلام ہے کہ اسے ایسے انداز میں پیش کیا، جو اس کا حق ہے ساتھ ہی واضح ہو گیا کہ امیر خسرو اور کمالی اصفہانی اصل معنی پر پہنچ جانے کے باوجود اس کے بیان کا حق ادا نہ کر سکے۔

۳۔ شرح : میں محبوب کا انتظار کرتے کرتے سو گیا، لیکن اس شوخ کو میرا سونا پسند نہ آیا۔ چنانچہ خواب میں آیا اور وعدہ کر گیا کہ میں آؤں گا۔ یوں اس کا مقصد یہ تھا کہ اسی انتظار میں میری عمر گزر جائے۔ نرود وعدہ پورا کرے اور نہ مجھے نیند آئے۔

مولانا طہطاہی فرماتے ہیں کہ شعر میں مرزا نے ”وہ“ کا لفظ ترک کیا۔ اس ترک سے یہ لطیف معنی پیدا ہوئے، جیسے ہم سب جانتے ہیں کہ اس کے سوا کسی کا ذکر نہیں کرتے یا یوں سمجھو، جیسے دل سے محبوب کی باتیں کرتے کرتے یہ بات زبان سے نکل گئی اور ضمیر دل ہی میں رہ گئی۔

۴۔ مشرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

دوسرے مصرع میں بہ طور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے۔ مجھے معلوم ہے، یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے، اس لیے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں :-

شعر کا مطلب صاف ہے، یعنی میں جانتا ہوں کہ وہ جواب میں کچھ نہیں لکھیں گے، پھر قاصد کے واپس آتے آتے کیوں نہ ایک اور خط لکھ رکھوں ؟

بعض اصحاب نے اس شعر کا آغاز مرزا ابیدل کا مندرجہ ذیل شعر قرار دیا ہے،

آئینا جواب نامہ عاشقِ تنافل است

بیہودہ انتظارِ خبر می کشیم

یعنی محبوب کے ہاں عاشق کے خط کا جواب تنافل کے سوا کچھ نہیں، ظاہر

ہے کہ ہم خواہ مخواہ خبر کا انتظار کر رہے ہیں۔

مرزا ابیدل کا شعر اچھا ہو یا بُرا، لیکن اسے غالب کے شعرے کوئی تعلق

نہیں۔ بیدل نے صرف یہ کہا کہ محبوب کا پیش ہی تنافل ہے، وہ عاشق کے خط

کا جواب کچھ دے گا اور تنافل برتے گا۔ لہذا ہماری طرف سے کسی خبر کا انتظار

فصول ہے۔ غالب کے ہاں مضمون بتاتا جلتا ضرور ہے، لیکن انھوں نے خود لکھنا

ضروری سمجھا۔ اگرچہ ہاتھ ہی انھیں علم ہے کہ محبوب کچھ جواب نہ دے گا۔ خواہ اس

کی وجہ یہ ہو جو غالب نے خود ایک جگہ بیان کی۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ کتب

مگر ستمزدہ ہوں فوقِ قاصدِ فرسا کا۔

خواہ یہ ہو کہ :

خط لکھیں گے۔ اگرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مولانا طہطائی فرماتے ہیں کہ یہ شعر بہت بلیغ ہے۔ معاملاتِ عشق میں اپنا

صاحب تجربہ اور معشوق کا مزاج دان ہونا اور معشوق کا بد عہد و حید ہونا، یہ سب معنی اس سے سمجھ میں آتے ہیں۔

۵۔ شرح : خواجہ جاتی فرماتے ہیں :

”اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے، ”پھر آج جو خلافت عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے۔“ اس محذوف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا محذوف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ محذوف کیے گئے ہیں، وہ بغیر ذکر کیے دونوں مصرعوں میں ہوں رہے ہوں، محضات شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔“

خود مرزا غالب تفسیر کو لکھتے ہیں۔

”اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں ”ڈرتا ہوں“ یہ پورا جملہ مقدمہ ہے میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا مانے گا کہ جملے کے جملے مقدمہ چھوڑ جاتا ہوں۔“

محبوب کی بزم میں پہلے تو دور جام کبھی نہیں آیا تھا، یعنی مجھے شراب نہیں پلائی گئی تھی۔ پھر آج جو خلافت عادت مجھ پر نوازش ہوئی ہے کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ ساقی یعنی محبوب نے شراب میں کچھ ملا دیا ہو؟

مرزا نے خود نہیں بتایا کہ کیا ملا دیا؟ صرف اتنا کہا کہ ”کچھ ملا دیا ہو“ یہاں بظاہر قرینہ زہر کا ہے۔ لیکن قرائن کا دودا زہ کھلا ہوا ہے۔ جس شے کی آمیزش تصور میں آئے، وہی فرمن کر لیجیے۔

۶۔ شعر میں دوست سے مراد محبوب ہے اور دشمن سے مراد رقیب۔

شرح : محبوب و وفا کا منکر ہے۔ نہ خود اس نے کسی سے وفا کی اور نہ دوسروں کی وفا کا کبھی اسے یقین ہوا۔ اگر اس نے رقیب سے میل جول شروع کر دیا ہے تو میرے لیے ہنگامی کی کوئی وجہ نہیں۔ جب میں جانتا ہوں کہ وہ کسی کا بھی ہو کہ نہیں رہ سکتا اور اسے کوئی فریب نہیں دے سکتا تو میرے لیے رقیب سے اس کا

کامیل جول پریشانی کا باعث کیوں ہوا اور میں کیوں یہ خیال کروں کہ رقیب نے اسے
دام فریب میں الجھایا ہے ؟

کمال یہ ہے کہ مرزا کے نزدیک رقیب کے پاس مزیب کے سوا اور کوئی
تدبیر ہے ہی نہیں، لیکن جو محبوب وفا کا منکر ہے، اس پر کسی کا فریب کیونکر کارگر
ہو سکتا ہے ؟

۷۔ شرح : مجھ پر تو وصل میں اس لیے اضطراب طاری ہے کہ کہیں رقیب
اس موقع پر نہ آ جائے اور رنگ میں بھٹک نہ پڑ جائے۔ تمہیں کس وہم نصیج و تاب
میں ڈال رکھا ہے ؟

عاشق اس لیے پریشان ہے کہ بڑی مشکل سے محبوب کے ساتھ ملاقات کا
موقع ملتا آیا ہے۔ اگر اس موقع پر رقیب آ گیا تو لطف صحبت برباد ہو جائے گا۔
محبوب یہ سمجھتا ہے کہ عاشق نے کسی اور سے دشمنی محبت استوار کر رکھا ہے اس
لیے اس پر گھبراہٹ طاری ہے۔ عاشق اسے محبوب کا وہیم قرار دے کر حقیقت
واضح کر رہا ہے تاکہ جس بیچ و تاب میں وہ مبتلا ہے، وہ نہ اُٹل ہو جائے۔

۸۔ لغات۔ خدا ساز : خدا کا بنایا ہوا کام، خدا کی دی ہوئی نعمت،
خدا داد۔

شرح : میرے نصیب ایسے کہاں کہ وصل کا حقد حاصل ہوتا ہے تو
خدا کا بنایا ہوا کام تھا، اس کی عطا کی ہوئی نعمت تھی۔ اس خوشی میں شادی مرگ
ہو جاتا تبعد نہ تھا۔ مگر مجھ پر ایسی گھبراہٹ اور حیرت طاری ہوئی کہ جان بہ طور
تذکرہ پیش کرتا بھول گیا۔

ملاقات کے یہ دقیق پہلو اس حسن و خوبی اور اس قادر الکلامی سے بے تکلف
پیش کر دیتا مرزا غائب پر ختم ہے۔ وصل کی خدا ساز نعمت و شادی مرگ کی قربت
کیوں نہ آتی ؟ صرف اس لیے کہ مجھ پر اتنے بڑے، غیر معمولی اور سراسر غیر متوقع
واقعے سے حیرت طاری ہو گئی اور اس عالم میں جان کی نذر دینا بھول گیا۔

۹۔ شرح : عاشق محبوب کے دیدار سے فیض یاب ہونے کا مشتق ہے لیکن محبوب نے عاشق کو دیکھتے ہی غصے سے توری چڑھائی اور چتون پر بل ڈال دیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نقاب کے گوشے میں ٹکس چڑ گئی۔ یہ دیکھتے ہی عاشق پر محبوب کا عتاب واضح ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ دیدار کی تورا بر آنے کا کوئی امکان نہیں۔ محبوب کے عتاب کی شان ملاحظہ فرمائیے کہ اس کی چتون کا بل نقاب میں ٹکس ہو کر ابھر آیا۔

۱۰۔ شرح : خواجہ عالی فرماتے ہیں :

۔ یہاں لگاؤ سے مراد لگاؤٹ ہے۔ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا، جس سے اس کا التفات اور میلان طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاؤٹیں ایک طرف۔ اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر میں سہل تمنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پدمصرے ہم پہنچ گئے، جن میں حسین تر صبیح کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ بانہا گیا ہے، جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان گزرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاؤٹ عاشق کے لیے ست بڑی چیز ہے، مگر اس کا آنکھ چراتا، جو لگاؤٹ کی ضد ہے، عاشق کی نظر میں لگاؤٹ سے بہت زیادہ و عزیز دو لاویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بیشک دو بالا ہو جاتا ہے، مگر اس کا غصے میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوش نما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی و جدائی ہے، جس کو صاحب ذوق کے ہوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔“

مولانا صاحبانِ مزاراتے ہیں : جملوں کی ترکیب میں تماشل اور لفظوں کی نشست میں سخن تقابلی کی مثالیں شاذ ملتی ہیں۔ اُردو میں یہ شعر بھی اس تماشل و تقابلی کی بنیاد بنا اور مثال ہے ۔

۱۲۰۱۱ - لغات - مدعا طلبی : مقصد حاصل کرنا مطلب برآری ۔
سفینہ : کشتی ۔

شرح : جس فغاں سے آفتاب میں شگاف پڑ جائے وہ محبوب کے دل میں غم کے برابر بھی نہیں سمجھی جاتی ، یعنی اس کی حیثیت بیچ ہے ، کیونکہ غم اس کی حقیقت شے ہے ۔

وہ باد و مقصد حاصل کرنے میں کچھ کام نہیں دے سکتا ، جس کے غم سے سراب میں کشتی چلائی جاسکے ۔

مطلب یہ ہے کہ جن تہیروں کو زود اور تاثیر کے اعتبار سے غیر معمولی حیثیت حاصل ہے ، مثلاً مزایہ و فغاں آفتاب میں شگاف پیدا کر دیتی ہے ، حالانکہ یہ بلا ہٹ غیر ممکن ہے اور سراب میں کشتی چلائی جاسکتی ہے ، حالانکہ اس کا بھی کوئی امکان نہیں ، ایسی پُر زور اور پُر تاثیر تہیروں بھی نہ محبوب کے دل پر کوئی اثر رکھتی ہیں ۔ نہ ان سے مطلب برآری کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے ۔

۱۳ - **شرح :** اے غالب ! شراب تو چھوٹ گئی ، اس کا بالاتزام پینا تو ختم کر دیا ، لیکن اب بھی کبھی پی لیتا ہوں ۔ پینے کے دو موقع ہیں ۔ دن کے وقت جب ابر چھایا ہو ، اور ترشح ہو رہا ہو ۔ رات کو جب چاندنی چھیل چھوٹی ہو ۔

ہاں اور ہر رات کے موقع پر پینے کا ذکر غالب کی زبان سے پہلے بھی آ

چکا ہے ، یعنی :

بہارِ بہند بود برشکال ہاں غالب !
دریں خزانِ کرہ ہم موہمِ شرابِ بہت

شبِ مہتاب کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

پتی جس قدر لے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغی مزاج کو گزری ہی راس ہے

نیز :

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابرو باد نہیں

مقطع میں شراب چھوڑنے کا جو ذکر ہے، وہ محض سخن گستری ہے، کیونکہ مرثیہ کی زندگی میں انوارے شراب کا مستند واقعہ صرف ایک ہے، یعنی ۲۲۔ جون بخشہ سے ۱۰۔ جولائی تک، جیسا کہ علاقائی کے نام ایک مکتوب سے واضح ہے۔ یہ دو غزلہ بظاہر ششماہ کا ہے، کیونکہ اس زمین میں موسم کی بھٹی ایک غزلہ ہے اور فتنہ کے بھی چند شعر ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ سب ایک طرہی مٹا کرے کا کلام ہے۔ موسم کا انتقال مئی ششماہ میں ہوا اور یہ دو غزلہ اس سے پیشتر کا ہونا چاہیے۔ گویا مقطع میں کسی واقعے کی طرف اشارہ نہیں، محض سخن طرازی کی گئی ہے۔

لغات : نخست : پہلے

کبروی : کبریا

سود و ظن : غیر شایانِ گمان

شرح : غلامِ مہتابی فرماتے

ہیں :

آج اہلِ نعت سے شراب

دہی کہ کل نہ لے گی، ساقی کوثر

کی فیاضی پر سود و ظن کرتا ہے۔

کل کے لیے کہ آج نہ خشتِ شراب میں

یہ سود و ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل ؛ کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ بہارِ جناب میں

جہاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع

گر وہ صدا سنائی ہے چنگ و درباب میں

رُومیں ہے رُخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھے
 نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
 آتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُد ہے۔
 پتا کہ وہمِ غیر سے ہوں بیچ و تاب میں
 اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
 حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
 ہے مُشْتَبِلِ نَمُوزِ مَوَد پر دُجُو دِ بَحْر
 یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
 شرمِ اک ادا ہے ناز ہے، اپنے ہی سے ہی
 ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
 آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
 پیشِ نظر ہے آئینہ و ائیمِ نقاب میں
 ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
 ہیں خواب میں ہنوز، جو باگے ہیں خواب میں
 غالب! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوے دست
 مشغولِ حق ہوں بندگی بُدِ تراب میں

- کل کے نیسے تھے دو
 مطلب ہو سکتے ہیں، ایک
 مودِ قیامت کے لیے، دوسرا
 مودِ آئندہ یعنی مودِ اک کے لیے۔
 پہلے مضموم کے مطابق شعر کا
 مطلب یہ ہے کہ مودِ قیامت
 کے خیال سے شراب پلانے ہیں
 بُخلِ ذکر۔ عوام کا عقیدہ ہے
 کہ جو لوگ یہاں شراب سے
 پرہیز کریں گے، انہیں قیامت
 کے دن حضرت ساقی کو شراب
 بطور پلائیں گے۔ مرزا کہتے ہیں
 کہ ساقی کو شراب کی نیا مٹی مام ہے
 اس میں کسی کے لیے کام کی
 گنجائش نہیں۔ یہ اس پکائش
 کے متعلق غیر شاہد گمان ہے
 کہ وہ کسی کو اپنی مام نیا مٹی
 سے محروم رکھنا گوارا فرمائیں گے
 اس مضموم کے مطابق
 لفظ خست یعنی بُخل کا مطلب
 کیا ہو گا؟ کیا بُخل سے مود
 یہ ہے کہ پلانے والا دل کھول
 کر نہیں پلاتا، مٹوڑی مٹوڑی

دیتا ہے۔ یا اس سے چلانے کی مطلق نفی مراد ہے ؟

دوسرا مضمون یہ ہو سکتا ہے کہ مرزا نے اپنے داروغے سے شراب مانگی جسے بقول جاتی تاکید کر دی گئی تھی کہ نشے کی حالت میں دیا وہ شراب مانگوں تو ہرگز نہ دینا۔ داروغے نے غدر کر دیا کہ کل، یعنی فدا کے لیے بھی کچھ رکھ لیجیے، مرزا کہتے ہیں کہ دیکھ تو کل کا غدر رکھ کر شراب دینے میں بخل نہ کر۔ یہ ساقی کوڑے باب میں غیر شایاں گمان ہے۔ جس طرح اب تک شراب ملتی رہی، اسی طرح ساقی کوڑے کی مہربانی سے آئندہ بھی ملتی جائے گی۔ اس پاک خات کی مہربانی کے متعلق دل میں غلط گمان کو جبکہ نہ دے۔ یعنی دنیا میں جو کچھ پیئے کو ملتا ہے یہ بھی ساقی کوڑے ہی کی مہربانی ہے۔ جس طرح قیامت کے دن جو کچھ عطا ہوگا، وہ بھی ساقی کوڑے ہی کی مہربانی سے عطا ہوگا۔

۲۔ لغات - کل : اس سے مراد یوم السبت ہے، جس روز روحوں سے بندگی کا اقرار لیا گیا تھا اور انسانوں کے ابراہا با حضرت آدم کی جناب میں سجدہ نہ کرنے پر عزا زیل کو، جو فرشتوں میں محسوب ہوتا تھا، سزا دی تھی۔ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا تھا یعنی آدم کی عظمت تسلیم کر لی تھی، کیونکہ آدم ہی حقائق اشیاء بیان کر سکے تھے۔

شرح : کہتے ہیں کہ آج ہم یعنی انسان اتنے ذلیل کیوں ہو گئے کہ کوئی ہماری بات بھی نہیں پوچھتا۔ یوم السبت میں تو فرشتوں کو بھی مجال نہ تھی کہ ہماری شان میں گستاخی کریں

یہ شعر حقیقۂ شرف انسانی کے لیے ایک دعوت ہے، یعنی مرزا بہر انسان کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا مرتبہ فرشتوں سے بھی بالاتر تھا، لیکن اعمال بد کے باعث ہم ذلیل ہو گئے اور اپنے مقام شرف سے گر گئے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہوا اور ان اعمال سے دست کش ہو جانا چاہیے، جو تذلیل کا باعث ہوئے۔

اس شعر میں لفظ ”کیوں“ استعمال کے لیے نہیں، بلکہ تنبیہ کے لیے ہے۔
خواجہ حاکمی فرماتے ہیں :

”اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیزیت تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت گستاخی کرتا تو اسے گوارا نہ ہوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اس قصے کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید میں موجود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عالم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا : ”کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے، جو اس میں فساد اور فحشاء پھیل کرے؟“ وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے، جو کچھ میں جانتا ہوں پھر آدم سے ان کو ذک و لواطی اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں، کل تک تو ہماری ایسی عزت ہوگی۔“

۳۔ لغات - سماع : راگ۔

چنگ : ایک باجا جو ستار کی قسم سے ہے۔

رباب : سازنگی کی ایک قسم۔

شرح : اس شعر میں بھی ”کیوں“ استعمال کے لیے نہیں تنبیہ کے لیے ہے،

اگر چنگ و رباب میں جو آلات موسیقی ہیں، محبوب حقیقی ہی کی صدا سنائی ہوئی

ہے تو عجیب بات ہے کہ یہ صدا سننے ہی بدن سے جان کیوں نکلنے لگتی ہے ؟

وہ صدا تو ہر حال میں ہر شخص اور حیات افراد جوئی پا جائے، کیونکہ حقیقی

محبوب کی صدا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رباب و جود و مال اس صدا پر پورا اعتقاد

نہیں رکھتے۔ اگر اعتقاد ہو تو ان کی روحوں میں بالیدگی آئے، لیکن وہ تڑپنے اور

لوٹنے لگتے ہیں۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر باب و جہد و حال اپنے محبوب کی صداشن کر اس میں جذب ہو جانے کے لیے متیاب ہو جاتے ہیں اور ان کا تڑپنا اور لوٹنا اسی کیفیت کا نتیجہ ہے۔

۴۔ لغات۔ کو : راہ، رفتار، پانی کا بہاؤ، دھارا۔ یہاں اس کے معنی گرم رو اور تیز رو کے ہیں۔

رخش : گھوڑا، رستم کے گھوڑے کا نام ہیں تھا۔

شرح : عمر کا گھوڑا تیزی سے دوڑا جا رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کہاں پہنچ کر ٹھہرے ؟ ہم اس پر سوار ہیں، لیکن حالت یہ ہے، نہ باگ پر ہاتھ ہے۔ نہ پاؤں رکاب میں ہے۔

انسانی زندگی کی بے بسی اور بے اختیاری کا نقشہ اس سے بہتر الفاظ میں کھینچنا غالباً ممکن نہیں، گھوڑے پر انسان سوار ہوا مگر نہ باگ قبضے میں ہو، نہ رکاب قابو میں اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ گھوڑا سرپٹ دوڑا جا رہا ہے، اس کا رخ کس طرف ہے اور وہ کہاں پہنچ کر رکھنے والا ہے ؟ اس سے بڑھ کر سوار کی بے اختیاری کیا ہوگی ؟ اور انسانی زندگی کا یہ نہایت صحیح نقشہ ہے۔

خواہر معافی فرماتے ہیں :

”سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اس کے قابو سے باہر ہو جانا اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو دیکھتے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسن تشبیہ کا حق ادا کر دیتا ہے۔“

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ مصوّر موقوف سے جو تصویر بنا دیتا ہے، اس میں قلب و نظر کے لیے زیادہ سے زیادہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ مجسم نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور ایسے معاملات میں الفاظ ایسا کام نہیں دے سکتے، لیکن مرزا غالب نے الفاظ میں جو نقشہ پیش کر دیا ہے، اس میں بڑے سے بڑا دستور رنگ و روغن کے ذریعے سے وہ تاثیر پیدا نہیں کر سکتا جو مرزا نے لفظوں کے

فریضے سے پیدا کر دی ہے۔ غالب کے جن شعروں کی تصویر بنانا بظاہر دشوار ہی نہیں، محال ہے، ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے۔ ایسا ہی شعر یہ ہے۔

منجھنے دے مجھے لے تا امید ی! کیا قیامت ہے

کہ دامنِ خیالی یار چھوٹا جانے ہے مجھ سے

۵۔ لغات - بُعد : دوری۔

شرح : عبدالرحمن بجنوری اس شعر کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

”روح اور مادے کا امتیاز حقیقت میں ایک فریب خیال ہے، ورنہ

مادہ محض مایا ہے، جب اور اک کامل اور عقل رسا ہو جاتی ہے تو

مادے کی غیر تبت خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔“

میں غیر کے دہم میں جتنا پہنچ کتاب کھاتا ہوں اور جس قدر اس خیالی گور کہ

دھندے میں الجھتا رہتا ہوں۔ اتنا ہی اپنی حقیقت یعنی وجود حقیقی سے دور

ہوتا جاتا ہوں۔

خواجہ حاکمی فرماتے ہیں :

”غیر سے یہاں اسوی اللہ مراد ہے، جو صوفیہ کے نزدیک بالکل

معدوم ہے، اس لیے کہ وہ وجود واحد کے سوا سب کو معدوم

سمجھتے ہیں۔“

۶۔ لغات - شہود : دیکھنا۔ رویت اصطلاح صوفیہ میں ایک درجہ ہے،

جس میں سالک مراقب کثرت اور مہربوات صدی سے گزر کر ایسے مرتبے پر

پہنچ جاتا ہے کہ اسے ساری موجودات میں جلوۂ حق بلکہ ہر شے میں حق نظر آنے لگتی ہے۔

شاید : دیکھنے والا، شہادت دینے والا۔

مشہود : جسے دیکھا جائے۔

مشاہدہ : دیکھنا، معائنہ کرنا۔

تشریح : جب مشہور، شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے (اور یہ تینوں لفظ ایک ہی مادے سے ہیں) تو حیرت کا مقام ہے کہ مشاہدے کو کیا سمجھا جائے اور اسے کس وجہ سے میں رکھا جائے ؟

پوری کائنات صرف وجود و احمد یعنی وجود حقیقی کی وجہ سے قائم ہے تو شاہد و مشہود ایک ہی ہوتے۔ اس کے سوا دوسرا وجود نہیں۔ جو بھی شے ہے وہ سراسر حین ذات ہے، کیونکہ ذات اور وجود میں غیریت نہیں ہو سکتی۔ مشاہدہ اسی حالت میں ہوگا، جب شاہد و مشہود میں غیریت ہوگی۔ جب غیریت ہے ہی نہیں تو مشاہدہ کہاں رہا۔ وجود خدا کا نزد وجودوں کا تقاضا کرتا ہے ؟

۴۔ لغات - مشتعل : شال - میط۔

نمود : ظهور، وجود، نمائش۔

صُور : صورت کی جمع۔

تشریح : خواجہ قالی فرماتے ہیں :

”ایہ شعر، وحدت وجود اور کثرت موصوم کی تشبیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے بیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ ”یاں کیا دھرا ہے“ مستعارے بلاغت ہے۔“

قطرے، موج اور ٹیلے کی اپنی کوئی بستی نہیں، یہ تو سمندر میں چند صورتیں ہیں، جو ماضی طور پر نمایاں ہو گئیں اور ان کی بستی سمندر ہی پر موقوف ہے۔

شعر میں یہ طور تشبیل یہ بتایا گیا ہے کہ حقیقی بستی صرف واجب الوجود کی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ ممکنات میں شامل ہے۔ ممکنات اسی وقت تک ہیں،

جب تک سمندر ہے۔ سمندر نہ ہو تو یہ بھی ناپید ہو جائیں۔ گویا ہندس، لہریں اور ٹیلے سمندر کی ذات سے الگ وجود نہیں رکھتے۔ لہذا انہیں کون وجود شمار کر سکتا ہے

اس کی ایک مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ قوت نامیہ زمین کی ہر روئیدگی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا ظہور و ختم ہونا، پودوں اور فصلوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ لیکن اصل نامیہ ایک

شے ہے۔ ممکنات واجب کے مختلف شیوں ہیں، ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔
مولانا طباطبائی کے قول کے مطابق اس تمثیل کی غرض یہ ہے کہ ممکنات کی ہستی
کو وجود واجب کے ضمن میں ثابت کیا جائے۔

۸۔ شرح : بیشک محبوب حقیقی کا شرانا اور سامنے نہ آنا ایک محبوبانہ ادا
ہے۔ اگرچہ یہ ادا اپنے ہی ساتھ ہے، کیونکہ بیاں دوسرا کوئی موجود ہی نہیں۔ گویا ان
کا پردہ اختیار کرنا اور محاب میں رہنا بھی تو بے حجابی ہی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ وجود واجب نے کائنات کے اندر مختلف صورتوں میں ظہور کیا
لیکن شرم و محاب کا یہ عالم ہے کہ اب تک کھل کر سامنے نہ آیا، حالانکہ اس کا پردہ
میں رہنا اور محاب کرنا بھی ادا سے ناز کی حیثیت میں بے حجابی ہی ہے۔ یعنی نہ کھل
کر سامنے آتا ہے، نہ پوری طرح مستور رہتا ہے، بین بین رہ کر عشاق کو تپاتا ہے۔
۹۔ شرح : بجنودی مرحوم فرماتے ہیں :

”مشتوقِ عالم، جو موجودات کے نقاب میں پناہ ہے، برابر اپنی حال آرائی
میں مصروف ہے اور آئینہ نقاب ہی میں بیسے ہوئے اپنے غامضے کو
درست کر رہا ہے۔ جب عالم تکمیل کو پہنچ جائے گا تو نقاب اٹ ویگا
عالم کو دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی چیز کی کمی ہے بیشش
حسب آراءتہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں“

مطلب یہ ہے کہ ابھی تک کائنات کی تکمیل نہیں ہوئی اور اس کی آرائش کا سلسلہ
برابر جاری ہے۔ اس کا خالق یعنی وجود واجب نقاب میں بھی آئینہ سامنے رکھتے
ہوئے ہے، گویا بننا سنونا بدستور جاری ہے اور آرائشِ حال سے فراغت حاصل
نہیں ہوئی۔ قرآن مجید کی آیت : *حَلَّوْا حُلُوْفَہُمْ شَانَہُمْ* (ہر روز وہ ایک شان
میں ہے ابھی اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

۱۰۔ لغات - غیب غیب : اس سے مراد مرتبہ احدیت ہے، جہاں
تک عقل، ادراک اور بصیرت رسائی ممکن نہیں۔

شرح : خواب ہوائی مڑاتے ہیں :

۔ سانگ کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے تو اسے شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے، جو عقل و ادراک اور بصیر و بصیرت سے وراء الورد ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھتے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری مثال ایسی ہے، جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں، پس گودہ اپنے تیش بیدار سمجھتا ہے، مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لیے نہیں ہو سکتی :

مطلب یہ ہے کہ ذات احدیت حقیقتہً غیب الغیب ہے یعنی غیب کے اندر غیب ہے، لیکن ہم اسے شہود سمجھتے ہوئے ہیں، یعنی یہ قرار دیتے بیٹھے ہیں کہ اس نے ظہور اختیار کیا۔ ہماری مثال ایسی ہے، گویا کوئی شخص سویا ہوا ہو اور خواب دیکھے کہ جاگ رہا ہے، ظاہر ہے کہ محض جاگنے کا خواب دیکھ لینے سے اسے بیدار نہیں سمجھا جاسکتا۔ ایسا سمجھنا سراسر دھوکا ہے۔

۱۱۔ لغات - تدیم : ہم نشین، ہدم، رفیق۔

بوتراپ : حضرت علیؑ کی کنیت۔ اگرچہ صورت کنیت کی ہے، لیکن حقیقت میں یہ ان کا لقب ہے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ مسجد نبویؐ میں فرشِ خاک پر سوئے ہوئے تھا اور آپ کے کپڑے خاک آلود ہو گئے تھے۔

۔ رسول اللہ (صلعم) تشریف لائے تو فرمایا :

۔ اے بوتراپ! (خاک میں پٹے ہوئے یا خاک آلود) اٹھ۔ پس اسی وقت سے حضرت علیؑ کا یہ لقب مشہر گیا۔

شرح : پہلے مصرع میں ”دوست“ سے دونوں جگہ خدا مراد ہے۔

اے غالب ! دوست (خدا) کے رفیق اور ہم نشین (حضرت علیؑ) سے دوست

(خدا) ہی کی خوشبو آتی ہے۔ میں حضرت علیؓ کی بندگی میں مصروف ہوں اور اس طرح میں خدا کی بندگی کر رہا ہوں۔

۱۔ شرح : میرے

دل اور جگر دونوں پر کاری نہیں
لگ چکی ہیں۔ دونوں پر گریز
نوعہ مزدی ہے، لیکن میں
ہر ایک وقت دونوں کے سلسلے
میں یہ فرض ادا نہیں کر سکتا۔
استقامت ہو تو ایک ماتم
کرنے والا ساتھ رکھ لوں تاکہ
میں اپنے دل پکاروں اور وہ
ہائے جگر کتا جائے۔ اس طرح
دونوں کے ماتم کا حق ادا ہوگا
مرزا کا مقصود صرف
یہ ظاہر کرتا ہے کہ عشق میں دل
اور جگر دونوں فنا ہو گئے ہیں
کے سوا جو کچھ ہے، وہ اسلوب
بیان ہے، جس نے شعر کی
حیثیت کچھ سے کچھ بنا دی۔

اسلام سے پیشتر عرب
میں یہ دستور تھا کہ گنے والوں
کی طرح نوعہ کرنے والوں کے

حیراں ہوں، دل کو روٹوں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوعہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
سہراک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کہ صحر کو میں؟
جانا پڑا رقیب کے در پر، ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ تری رگزر کو میں
ہے کیا؟ جو کس کے باندھے؟ میری بلاؤں سے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں؟
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو کٹا تا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دُور سہراک تیرے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی، راہبر کو بھی
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوچھتا ہوں اُس بُت بیداد گر کو میں؟

ہر بخودی میں بھول گیا، راہ کو سے نیا
 جاتا دگر نہ ایک دن اپنی خبر کو میں
 اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
 سمجھا ہوں دل پذیر، متاع ہنر کو میں
 غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندر ناز
 دیکھوں علی بہادر عالی گٹر کو میں
 بھی ملائے ہوتے تھے جنہیں
 ماتم کے موقع پر بٹایا جاتا تھا
 اور وہ ماتم کر کے گھروالوں کو
 خوب دلا کرتے تھے، کچھ مدت
 پیشتر تک ہندوستان میں بھی
 پیشہ وراتمی عورتیں موجود تھیں۔
 مرزا بھی کسی ایسے ہی سے لڑا
 کے خواہاں تھے تاکہ دل و مگر
 دونوں کا ماتم بیک وقت ہو سکے

۲۔ شرح : عاشق بیزار ہو کر گھر سے نکل آیا ہے۔ اس کا دل کسی صورت
 عینیبہ پر بند ہے، حیدر چور ہے، بیاقول ہو کر صباؤں و نسبین کا تمام
 صرف محبوب کا گھر ہے، لیکن رشک کے مارے اس کا نام نہیں دیتا اور یو جی پکارے
 جا رہا ہے، اگر صحر کو جاؤں؟ کس طرف کا رخ کروں؟ رشک یہ کہ میں نے محبوب کا نام
 لے لیا تو دوسرا شخص بھی اس سے واقف ہو جائے گا۔ اغریہ ہے کہ دیکھتے ہی وہ
 محبوب پر عاشق ہو کر رقیب بن جائے گا۔ اس قدر کے مارے محبوب کا نام نہیں لیتا۔

۳۔ شرح : تیری آمد و رفت کے واسطے سے میرا واقف ہو جانا غضب
 ہو گیا۔ وہ راستہ رقیب کے گھر کے سامنے سے گزرتا ہے۔ تیرے شوق و بیار میں
 مجھے ہزار مرتبہ وہاں جانا اور رقیب کے گھر کا دروازہ دیکھنا پڑا۔ اتنی کوفت ہوئی۔
 دل پر ایسی پھریاں چلیں کہ آرزو ہو رہی ہے، کاش! مجھے تیری دنگر کا علم نہ ہوتا۔

۴۔ شرح : پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شاعروں نے جس طرح محبوب کے
 دہن کی تنگی میں مبالغہ کرتے کرتے اسے معدوم قرار دے دیا، اسی طرح کر کے نازک
 اور پتلے ہونے پر زور دیتے دیتے اسے ناپید کر دیا۔ اب محبوب غالب سے کہ رہا
 ہے کہ میں نے تیرے قتل کے لیے کمر کس لیا ہے یعنی پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ تجھے نہیں

چھوڑوں گا۔ جواب دتا ہے کہ آپ کی کمر ہے کیا مجھے کس کے باندھا ہائے؟ کیا میں اس کی حقیقی حیثیت سے واقف نہیں؟ یعنی جو کمر اتنی پتلی ہے کہ اسے موبہوم مانا جاتا ہے، اسے آپ کس کر کیا باندھیں گے؟

۵۔ **مشریح :** میں نے محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے گھربار ٹا دیا اور اپنی حیثیت بگاڑ لی۔ اس پر دوسروں کا طعنے دینا تو تعجب کا مقام نہ تھا لیکن دیکھیے، محبوب میں یہی کڑوا ہے کہ یہ ایک بے ننگ و نام شخص ہے۔ اس کی کوئی حیثیت ہے، نہ معاشرے میں کوئی مرتبہ ہے۔ نہ اسے کوئی امتیاز حاصل ہے، اب میں ایسے شخص سے کیا ملوں، جس کے پاس نہ گھر ہے، نہ شریفیوں کا ساند سامان ہے اور مال اسباب ہے۔

شعر کا اسلوب ایسا ہے کہ اسے مضامین غزل کے بجائے زندگی کی ہر صورت حال پر بوجھال سکتے ہیں۔ مثلاً سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے قوموں اور ملکوں کی بہتری برتری کے لیے اپنا سب کچھ ٹا دیا اور انھیں لوگوں کی نظروں میں بے وقعت اور ذلیل ہوئے، جن کی خاطر قربانیاں کی تھیں، غرض شعر میں عمومیت ہے اور اس کا اطلاق مختلف حالات پر ہو سکتا ہے۔ مرزا کے غیر فانی شعروں میں ایک یہ بھی ہے۔

۶۔ **مشریح :** خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

”طالب را وہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے، اس کو اس تشیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اول اول جس شخص میں کوئی کوشش یا وجہ و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے، اسی کے ہاتھ پر سمیٹ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے ہٹ کر نظر آتا ہے تو اس کا مقابلہ کرتا ہے، وہ تم جڑا اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی تو ہے کہ وہ کالین کو پہچان نہیں سکتا۔“

یہ شعر کا صرف ایک پہلو ہے۔ زندگی کے ہر دائرے میں ایسے ہی حالات پیش آتے رہتے ہیں کہ انسان جس شخص کو دوسروں کے مقابلے میں ذرا تیز چلنے والا پاتا ہے،

اس کا دامن اس امید پر تمام لیتا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ بھی منزل مقصود پہ پہنچ جائے گا۔ بخوشی نا چلتے تک ساتھ چلتا رہتا ہے، پھر واضح ہو جاتا ہے کہ منزل بہت دور ہے اور یہ شخص تو وہاں تک نہیں پہنچائے گا۔ بعد ازاں کسی دوسرے تیز رفتار کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت تک جاری رہتی ہے، جب تک حقیقی رہنما اور رہبر کی پہچان نہیں ہو جاتے۔ قومی خدمت کے دائرے میں ایسی مثالیں عموماً زیادہ ملتی ہیں۔

اس مرتبے کے اشعار اساتذہ کے دواوین میں بہت کم ملتے ہیں۔

۷۔ **شرح :** میں تو اپنے ظالم محبوب کی محض پیادہ میں مبتلا ہوں۔ عقل کے

اندھوں اور احمقوں نے اسے پرستش قرار دے لیا یعنی یہ سمجھ لیا کہ میں اسے خدا سمجھ کر پوج رہا ہوں۔ یہ کتنا اندھیر اور کیسی آن ہونی بات ہے؛

شعر کی اصل خوبی یہ ہے کہ خود عاشق کو پرستش اور خواہش کے درمیان ہندی کی تیز نہیں۔ وہ جس شے کو خواہش قرار دے رہا ہے، حلاً وہ پرستش کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ عاشق نے محبوب کو پوجنا شروع کر دیا، لیکن عاشق حقیقی حالت سے بے خبری کے عالم میں اسی بات پر زور دے جا رہا ہے کہ میرے دل میں تو اس کے لیے صرف پیادہ ہے اور جو لوگ پرستش کا طعنہ دیتے ہیں، انہیں احمق قرار دے کر اپنے دعوے کو قوت پہنچا رہا ہے۔

۸۔ **شرح :** عاشق ایک مرتبہ محبوب کے کوچے میں پہنچا اور اپنا سب

کچھ کھوکھو کر بیخود وہیں آگیا۔ اسی عالم میں اس نے کئی مرتبہ کوئے یار کا تعہد کیا، لیکن بخودی کے عالم میں راستہ بھول جاتا، اور کہیں کا کہیں جا پہنچا۔ اب وہ پریشانی ہو کر کہتا ہے کہ دیکھیے، میں نے پھر کوئے یار کا تعہد کیا تھا اور بخودی کے باعث راستہ بھول گیا، اور نہ وہاں ضرور جاتا اور اپنی خبر بے کر آتا۔

چونکہ پہلی مرتبہ وہاں جاتے ہی بخود ہو گیا تھا، یعنی اپنا آپ وہاں کھو آیا

تھا، اس لیے خود تو اسے کچھ خبر نہیں۔ وہاں جاتے تو اپنا پتا لے کر کیا حالت ہوتی۔

شعر میں بخودی کے لفظ سے جو دقیق معنی پیدا کیے ہیں وہ مرزا غالب ہی کا حصہ ہے۔

۹۔ لغات - دل پذیر : دل میں سما جانے والا۔ دل میں آ کر جانے والا۔
 شرح : میں عقل و دانش اور بصیرت و ادراک کو دل میں اتر جانے والی چیز سمجھتا ہوں۔ یہ ایسی متاع ہے جس کے حسن و خوبی اور فضیلت پر ہر آدمی شجاعت نہیں۔ اپنے آپ پر قیاس کرتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے لوگوں کی یہی کیفیت ہے، لیکن یہ میری غلط فہمی ہے، حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اہل دنیا کے نزدیک یہ چیزیں کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتیں اور میرے لیے ساری دنیا کو اپنا بھائی، ہم مشرب اور ہم ذوق سمجھنا قطعاً درست نہ تھا۔
 اس شعر میں انتہائی خوش اسلوبی سے علم و ہنر کی بے وقعتی اور قدر ناشناسی کا اظہار کیا ہے اور یہ طریق اظہار بھی مرزا غالب ہی کا حصہ ہے۔

۱۰۔ لغات - علی بہادر : اس سے مراد نواب علی بہادر بن ذوالفقار بہادر نواب بنگالہ ہے۔ علی بہادر ۱۷۴۲ء میں سند نشین ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں مجاہدین آزادی کے ساتھ مل گیا۔ نومبر ۱۷۵۷ء میں کلکتہ و کٹورا کے اردن محاصرہ کی بنا پر اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے ریاست چھین لی اور اندور میں نظر بند کر دیا۔ صرف تین سو روپیہ مال و غنیمت دیتے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کو کچھ خیال آیا اور اسے بیٹی نکال کر وادار میں بیکر دی گئی۔ ۱۷۵۷ء میں وفات پائی۔
 شیر شاہ آبادی کو نواب علی بہادر سے ولی تعلق تھا۔ اس کی وفات پر جو تاریخ لکھی، اس میں نواب کی پوری سیرت کا نقشہ پیش کر دیا۔

نواب علی بہادر : اسے بھر کر م
 یوسف طلعت شجاع کیا ہے جدا
 اسے قدر شناس و نامزد و وار میر
 اسے اہل سخن کے عزت افزا ہے جدا
 اسے بزم کرم کے مستعد آرا ہے جدا

اٹھ جاتے جہاں جو توڑنے سے لگے مدحیف، افسوس، اور لپٹا ہے ہے !
 تاریخ تری یہ دور کہ کتا ہے شیر قیامت زماں، امیرِ دنیا، ہے ہے !!
 بڑا فیاض اور دوست نواز تھا۔ مرزا غالب کے ساتھ شخصیات کے ذریعے سے
 رشتہ داری بھی تھی۔ لکھتے جاتے جوئے مرزا اسی رشتہ داری کے باعث بانو شمرے
 تھے۔ غالباً اس زمانے میں ذوالفقار بہادر نواب تھا۔ اسی کے لیے غالب نے غامی
 میں کہا ہے :

نواب ذوالفقار بہادر کہ بودہ است

نام تو در مصافح فلک ذوالفقار میں

شرح : اسے غالب اندا کرے کہ میں اپنے عزیزِ نواب علی بہادر کو، جس
 کا خاندان بہت بلند ہے، فخرِ اقبیاء کے گھوڑے پر سوار دیکھوں۔

۱۔ شرح : محبوب کو یہ

بھی منظور نہیں کہ کوئی شخص

اس کی محفل میں میرا ذکرِ برائی

کے ساتھ کرے۔ یعنی اسے

اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ کسی

بھی شکل میں میرا نام سننا

گوارا نہیں کرتا۔ رقیبِ بادی

ہے کہ اس سے میرا ذکرِ برائی

کے ساتھ کرے۔ اب اس

پر محبوب بگڑ جائے اور رقیب

کو بھی قہر و عتاب کا تحفہ مشق

بنائے تو کچھ معیہ نہیں۔

ذکرِ میرا، بے بدی بھی، اسے منظور نہیں

غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

وعدہ سیرِ گلستان ہے خوشا طالع شوق !

مرثۂ قتلِ مقدر ہے، جو مذکور نہیں

نابہرِ بستی، مطلق کی کر ہے، عالم

لوگ کہتے ہیں کہ ہے ”پر بھی منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن

ہم کو تقلیدِ تنگِ ظرفِ منصور نہیں

۲۔ لغات - مقتدر:

ہات کرتے یا کہتے وقت ایسے الفاظ چھوڑنا، جو قرینے سے سمجھ میں آجائیں۔ پوشیدہ مراد۔

شرح: میرے

عشق کی کتنی خوش نصیبی ہے کہ محبوب نے بارغ کی سیر کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس وعدے میں ایک بات مقتدر چھوڑی اور اس کا ذکر نہ کیا۔ یعنی ختم قتل کی خوشخبری بھی ستادی۔

مطلب یہ ہے کہ سیر

بارغ سے حقیقتہً سیر مقصود۔

حسرت الے فوق خرابی؛ کہ وہ طاقت خمر ہی
عشق پر عہدہ کی گویا تن رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعزت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم جو نہیں

تظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تلافی میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دُردی کش پیا نہ بزم میں، ہم لوگ
واسے وہ بادہ کہ افسردہ انگور نہیں
ہوں ظوری کے مقابل میں خفا فی غالب

میر نے دعوے پر یہ ٹجھت ہے کہ مشہور نہیں

نہیں، بلکہ میرا خون بہانا مقصود ہے تاکہ اس کی سرخی سے گرد و پیش پھول کھلے برے نظر آئیں اور زمین میرے خون سے انی طرح آراستہ ہو جائے، جس طرح بارغ پھولوں سے آراستہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ عاشق نے سیر گلستان کے وعدے سے سمجھا، یعنی سیر گلستان کا ذکر ہوا اور عاشق نے اسے مژدہ قتل سمجھ لیا۔ مذکورہ سیر گلستان ہوائی اور مقتدر مژدہ قتل۔

۳۔ لغات - شاہد ہستی مطلق: وہ محبوب، جو علی الاطلاق موجود ہے

یعنی محبوب حقیقی۔

منظور: مولانا طہطا بانی نے اسے مہر و مرئی (یعنی دیکھا گیا) کے

معنی پر لیا ہے، پھر فرمایا ہے کہ محاورہ ساتھ نہیں دیتا۔

لیکن اس تکلف کی ضرورت کیا ہے؟ ”منقول نہیں“ کو عام معنی

میں کیوں استعمال نہ کیا جائے؟ یعنی ہم نہیں مانتے، ہمیں یہ تسلیم نہیں۔

شرح : لوگ کہتے ہیں کہ یہ دنیا محبوب حقیقی کی کمر ہے، جو شاعروں کے

نزدیک موجود مانی جاتی ہے۔ یقیناً اس طرح ہستی دنیا کی نفی تو ہو گئی، لیکن لوگ

ساتھ ہی ”ہے“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جس سے اثبات کا پہلو نکلتا ہے، لہذا

ہم ان کا قول تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ دنیا اس درجہ معدوم ہے کہ اس کی نفی کرتے

ہوئے بھی کوئی اثباتی لفظ لانا قابل قبول نہیں سمجھا جاتا۔

۴۔ لغات :- تنگ ظرفی : ظرف کا تنگ ہونا، کم حوصلہ اور بے بہت ہونا

منصور : اصل نام حسین تھا، منصور اس کے والد کا نام تھا، لیکن شعرا میں

اصل نام کے بجائے باپ ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ روایت ہے کہ اس نے

”انا الحق“ کہا، یعنی میں خدا ہوں اور موت کی سزا پائی۔

شرح : یقیناً ہمدانی ہستی کا قطرہ بھی سمندر میں مل کر مندر بن چکا ہے،

یعنی ہمیں بھی فنا فی الذات کا مقام حاصل ہو چکا ہے، لیکن ہمارا ظرف منصور کی

طرح تنگ نہیں کہ چھلک جائیں اور ”انا الحق“ پکار اٹھیں۔ ہم اس کم حوصلہ اور بے بہت

کی پیروی نہیں کر سکتے، جو فنا فی الذات کے مقام پر پہنچ جانے کے بعد اپنے آپ

پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور صبر و ضبط نہ کر سکا۔

۵۔ لغات :- پُر عمر بدہ : جنگو، لڑاکا، ہنگامہ آرا۔

گوں : روش، ڈھب، قابل، لائق۔

رنجور : بیمار، کمزور، ناتواں۔

شرح : اسے خرابی کے ذوق و شوق ! انوس کہ پہلے کی سی طاقت باقی

نہ رہی۔ میرا جسم عشق کے صدمے سے تھک کر اس درجہ بیمار، کمزور اور ناتواں ہو گیا کہ

اب عشق کی معرکہ آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے قابل نہیں رہا۔

حسرت اس امر پر ہے کہ مزید تباہ و برباد ہونے کا ذوق باقی ہے، لیکن جسم اب ساتھ نہیں دیتا۔ عشق ایسی بلا ہے کہ اس کے لیے ہر قسم کی سختیاں سہنے کی تاب ہوتی چاہیے۔ میرے جسم میں اب یہ خصوصیت باقی نہیں رہی۔

۶۔ لغات : رعونت : عذوہ - تکبر۔

شرح : جب میں اپنے محبوب سے کتنا ہوں کہ قیامت کے دن جزاؤں کا فیصلہ ہو گا۔ ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں ملیں گی تو ہم کہیں گے کہ ہمارا محبوب ہی ہمیں دے دیجے اور تمہیں کو ہم لے لیں گے تو دیکھیے، کس عذوہ و تکبر سے جواب دیتے ہیں! جناب! ہم حور نہیں، کہ آپ ہمیں لے سکیں۔

اس شعر میں بھی اچھوتے انداز سے محبوب کو حوروں سے اتنا برتر ثابت کیا گیا ہے کہ وہ نفرت بھرے عذوہ سے اپنے حور ہونے کا منکر ہے، گویا حور کو ایک حقیر چیز سمجھتا ہے۔

۷۔ لغات : دریغ آنا : دریغ ہونا، تامل کرنا، بخل سے کام لینا۔

معذور : عذر کیا گیا۔ مجبور۔ ناچار۔ معافی کے قابل۔

شرح : اے محبوب! اگر تجھے لطف و کرم میں تامل ہے اور اسے میرے لیے گوارا نہیں کرتا تو ظلم ہی کرتا جا۔ ظلم کی تکرار سے مقصود تاکید ہے کہ عذوہ و تکبر ہی کر۔ لیکن تو تامل سے کام لینا چاہتا ہے۔ اس بارے میں تیرا کون غافل تسلیم نہیں سمجھا جاسکتا۔

تامل کا مطلب یہ ہو گا کہ تجھے ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہمیں منکوحہ نہیں۔ دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کرے۔ تو ہمیں ہربانی کے قابل نہیں سمجھتا تو نہ ہیں۔ ہم ظلم سہنے کے لیے تیار ہیں۔ ان حالتوں میں تجھ سے تعلق قائم رہتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ مرزا نے کہا ہے :

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عدوت ہی ہے

نیز :

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

۸۔ لغات - وردی کش : تمھیں پینے والا۔

بحم : حبشہ، ایران کا بادشاہ جس سے شراب کی ایجاد منسوب ہے۔

افشرۃ انگور : انگور کا پھول عرق۔

شرح : ہم لوگ حبشہ کے پیالے کی تمھیں پینے والے ہیں۔ اس شراب

پر انوس جو انگور کے عرق سے تیار نہ کی گئی ہو۔

اپنی شراب نوشی کو حبشہ سے منسوب کر کے اس کا رتبہ حد درجہ بلند کر دیا۔ پھر

کہا کہ اس رتبے کے میکشوں کے لیے عرق انگور کے سوا جو شراب ملے، وہ باعث

انوس ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرزا کو ویسی شراب سے سخت نفرت تھی، جو گڑ اور بول

کی چھال سے تیار کی جاتی تھی۔ وہ خود ایک خط میں لکھتے ہیں : ”یہ گڑ چھال کی

شراب مجھے پسند نہیں، یہ مجھے مسخرت کرتی ہے“ فارسی میں بھی کہا ہے :

غالب : شراب قندی مندم کباب کرد

زہی بعد بارہ اسے گوارا کشیدہ باد

نیز :

شراب قندی مندم دشتاں و ماغم سوخت

دشیر و خاۃ کشمیر آوردند شراب

اسی لیے وہ انگوری شراب کے رسیا تھے، لہذا کہا :

واسے وہ بارہ کہ افشرۃ انگور نہیں۔

۹۔ لغات - ظھوری : لفظی معنی صاحب ظہور، یعنی ظاہر و آشکار اور

مشہور۔ فارسی کا ایک مشہور شاعر و ادیب، جس نے زندگی کا بڑا حصہ بجا لیا، ”بگزارا

اور وہیں وفات پائی ۔

خفائی : لفظی معنی چھپا ہوا اور پوشیدہ ، یعنی جو شہرت سے محروم ہو۔
شرح : اے غالب ! میں خفائی ہونے کے باوجود ظہوری کی ٹکڑیاں ہوں
 میرے دعوے پر دلیل یہ ہے کہ مجھے شہرت حاصل نہیں۔
 چونکہ میں مشہور نہیں ، اس لیے ظہوری کے مقابلے میں مجھے خفائی کہنا چاہیے ،
 لیکن مشہور نہ ہونے کے باوجود میں ظہوری کا یہ مقابل ہوں۔
 ”ظہور“ اور ”خفا“ : نیز ظہوری اور خفائی کا تقابل بالکل واضح ہے ۔

۱۔ لغات ۔

حُسنِ طلب : کون چیز
 اچھے طریقے پر طلب کرنا۔

ستم ایجاو : وہ محبوب ،
 جو ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے
 نکالتا ہے ۔

شرح : اے

ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے
 نکالنے والے محبوب ! اگر
 میں آہ و فغاں کرتا ہوں تو
 اس سے تیرے ظلم و ستم
 کی شکایت مقصود نہیں ، بلکہ

یہ تو حسنِ طلب ہے ۔ میرا
 مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ تجھ
 سے مزید جو دردِ جفا کا تقاضا

نالہ ، جزِ حُسنِ طلب ، اے ستم ایجاو ! نہیں
 ہے تقاضاے جفا ، شکوہٴ بیداد نہیں
 عشق و مزدوریِ عشرت گر خسرو کیا خوب !
 ہم کو تسلیم نہ کو تا می فر باد نہیں
 کم نہیں وہ بھی خرابی میں ، پر وسعت معلوم
 دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر باد نہیں
 اہلِ مینش کو ہے طوفانِ حوادث ، مکتب
 نظر موج کم از سیلِ استاد نہیں
 دے ! محرومیِ تسلیم و بدادِ حال و نا
 جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ مزید نہیں

رنگ تمکین گل و لالہ پریشاں کیوں ہے ؟
 گر چہ راخان سہر بگنیز باد نہیں
 سب گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
 مژدہ، اسے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
 نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
 دی ہے جاسے دُہن اس کو دم ایسا د نہیں
 کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
 یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں
 کرتے کس ثنہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
 تم کو بے مری یارانِ وطن یاد نہیں

کروں۔ لیکن ایسے طریق پر
 جو اچھا اور پسندیدہ ہو۔
 مطلب یہ ہے کہ اور جو حجاب
 کا تقاضا یوں کیا کہ آہ و فغاں
 شروع کر دی تاکہ محبوب
 ناراض ہو اور غصے میں آ
 کر مزید بیدار کرنے لگے۔
 گویا آہ و فغاں مزید جو حجاب
 کی غلبی کا ایک اچھا اور
 احسن ذریعہ ہی گئی۔

۲۔ لغات خسرو:
 ایران کا ایک بادشاہ،
 جسے خسرو پر دیکھتے ہیں
 مشہور حسینہ شیریں اس کی
 بیوی تھی۔

عشرت گہ : وہ مقام، جہاں عیش و عشرت کی جاسے۔ یہاں اس سے
 مقصود خسرو کا محل اور باغ ہیں۔ یہ بتا دینا چاہیے کہ بغداد سے ہمدان کی
 طرف بائیں تو غنائین، و حلوان کے درمیان پہاڑوں میں ایک مقام
 آتا ہے، جہاں ایک مقام اب تک قصر شیریں کے نام سے معروف
 ہے۔ یہی مقام تھا، جسے "عشرت گہ خسرو" کہا جاسکتا ہے۔ اب اس
 کے صرف کھنڈر رہ گئے ہیں۔

مژ باد : شیریں کا عاشق، جس کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسے
 شیریں کے باغ کے لیے پہاڑ چیر کر ہنر لانے کا حکم دیا گیا تھا اور وہ عدد

کر لیا گیا تھا کہ نہ مکمل ہوتے ہی شیریں تھیں مل جائے گی۔ مزاد نے نہ مکمل کر دی، لیکن اسے شیریں کے مرجانے کی جھوٹی خبر سنا کر خود کشتی پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ عام انسان ہے غدار یعنی حقائق سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ سمجھا جاسکتا ہے کہ پانی ضرور پہاڑ سے لایا گی۔ مگر پہاڑ کاٹ کر نہیں زیادہ تر ویسی ہی عمارتی گورنگا یہی بنا کر جیسی دہی پانی لانے کے لیے سنگ و گچ سے بنایا کرتے تھے۔

مشریح : مرزا کہتے ہیں کہ مزاد تو عشق کا دعویٰ رکھتا تھا، پھر اس نے اپنے رقیب خسرو پر دین کے باغ اور محل کے لیے پہاڑ کاٹ کر نہر لانے کی مزدوری کیوں قبول کی؟ عہدہ سچے عاشق بھی رقیبوں کی عیش و عشرت کے لیے مزدوری کر کے مزدوری سرور سامان بہم پہنچاتے ہیں، حق یہ ہے کہ ہم تو مزاد کی نیک نامی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

بحث یہ نہیں کہ مزاد اچھا تھا یا بُرا، اس کا رتبہ بلند تھا یا نہیں تھا۔ یہاں بحث صرف یہ ہے کہ مزاد نے مزاد کے انسانے سے ایک نکتہ ایسا پیدا کر لیا، جو یقیناً اس مسکین کے لیے نیک نامی کا باعث نہیں سمجھا جاسکتا۔ یعنی عاشق ہو کر رقیب کی عیش و عشرت کے لیے مزدوری پر آمادہ ہو جانا کون سی خوبی کی بات ہے؟ اگر کہا جائے کہ مزاد شیریں کے لیے نہر نکالنے پر آمادہ ہوا تھا تو شیریں خسرو پر دین کی جو ہی تھی، اس کے محل اور باغ کے لیے جو نہر لانی گئی، وہ بہر حال خسرو پر دین ہی کی عشرت گاہ کے لیے تھی۔

۳۔ **مشریح :** پہلے مصرع میں ”وہ“ کا اشارہ گھر کی طرف ہے، تصریح اس لیے مزدوری ہوئی کہ مرزا غالباً ضرورت شعری سے مجبور ہو کر ”دشت“ کو ”گھر“ سے پہلے لائے۔

جسٹک میرا گھر بھی خرابی و ویرانی کے اعتبار سے دشت کے مقابلے میں کم ثنیت نہیں رکھتا، لیکن اس میں وہ پنائی اور کشادگی کہاں، جو دشت میں ہے؟

گھر کا پتہ زیادہ سے زیادہ سوگزن اور دشت کے طول و عرض کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس بے دشت میں میری زندگی ایسی خوش اسلوبی سے گزر رہی ہے اور میں اتنا خوش ہوں کہ گھر مجھ یاد ہی نہیں۔

۴۔ لغات۔ اہل بغیش : اہل بصیرت، اہل عقل و دانش، دیدہ ویر۔
حوادث : حادثہ کی جمع۔

نظم : نظم

سیلی : طمانچہ۔ لپڑ۔

شرح : حادثوں کے جو طوفان اٹھتے ہیں وہ اہل نظر و بصیرت کے لیے ایک درس گاہ ہیں، جہاں انھیں زندگی کے سرمدی سبق ملتے ہیں، جیسا کہ ان سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو تباہی پھیل جاتا ہے کسی معاملے میں ٹھیک تدبیر نہ کر سکے ہوں، اس لیے نقصان اٹھایا ہو تو حقیقت ان پر واضح ہو جاتی ہے۔ گویا تمام آفتیں اور حادثے ان کے لیے دھبہری اور رہنمائی کا سامان ہیں اور ہر حادثے کی لہر سے ان پر جو ضرب لگتی ہے، وہ دراصل استاد کا لپڑ ہوتا ہے، جو شاگرد کو غلطی پر تہہ کرتا ہے اور اس میں سراسر شفقت کا پہلو ہوتا ہے۔

مرزا نے طوفانِ حوادث کو کتب قراء دینے میں حقیقت اس طرح واضح کر دی کہ اس سے زیادہ توضیح ممکن نہ تھی، مثلاً :

۱۔ جس طرح حصولِ علم کے لیے کتب میں جانا ضروری ہے، اسی طرح زندگی کے مراحل میں طوفانِ حوادث سے گزرنے بغیر چارہ نہیں۔

۲۔ جس طرح کتب کا ماحول شاگرد کے لیے شفقت و تربیت اور علم و بصیرت کا ماحول ہوتا ہے، اسی طرح حوادث کو بھی خوف یا کراہت سے نہ دیکھنا چاہیے، قدرت کی طرف سے ان کا انتظام اس لیے ہوتا ہے کہ انسانوں نے جو باتیں سیکھی نہیں یا سیکھیں اور بھول گئے یا انھوں نے غم و بصیرت سے ٹھیک ٹھیک کام نہ لیا، حوادث کے فریب سے ان کی یہ کمی پوری کر دی جائے۔ گویا زندگی کے مراحل میں حوادث کی حیثیت وہی ہے

جو کتب میں اسٹاویا اساتذہ کی ہوتی ہے۔

۲۔ طوفانِ حوادث کو کتب قرار دیتے ہیں۔ ان کی تلخی، ناخوشگواری اور دہشت زائل کردی اور یہ بتا دیا کہ ان سے مزید علم حاصل کرنا چاہیے اور حوادث کے بغیر علم تجربہ میں پختگی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

۳۔ یہ حقیقت آشکارا کر دی کہ زندگی میں انسان کے لیے کتنے ہی ناخوشگوار واقعات پیش آئیں۔ اگر حقیقت پر نظر ہو تو وہ تمام واقعات درگاہ میں ہیں جن سے سبق لیکھا جاتا ہے تاکہ زندگی زیادہ کامیابی سے بسر کی جاسکے۔

۵۔ لغات۔ بدرا : بہت بُرا۔ امنوس۔

شرح : آہ ! تسلیم و رضا کا مظہم ہونا اور امنوس ادفا کی بد حالی، ہم تو اس لیے غامض ہیں کہ محبوب سے وفاداری پر کوئی حرف نہ آئے اور اس کے دوبارہ تسلیم و رضا میں غفلت نہ پڑے، لیکن اس نے یہ سمجھ لیا کہ ہم میں آہ و فغاں کی طاقت ہی نہیں رہی۔ گویا ہم نے جو طریقہ عشق و محبت کے تقاضوں کی بنا پر اختیار کیا، محبوب سمجھتا ہے کہ وہ ہماری بیچارگی و ناتوانی کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ تسلیم و رضا کی مطلوبی اور ادفا کی بد حالی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی ؟

۶۔ لغات۔ تمکین : تھکن۔ شہراؤ، جماؤ، قرار۔

شرح : اگر لالہ گل جو ا کے راستے پر چراغاں کی حیثیت نہیں رکھتے تو ان کے شہراؤ، جماؤ اور قرار کا رنگ پریشان کیوں ہے ؟

جو چراغ راستے پر جلا یا جائے اور راستہ بھی ہو ا کا ہو، وہ کسی طبی طریق پر روشن نہیں رہ سکتا، براہِ جھلکا تا رہے گا اور جلد بجھ جائے گا۔ بالکل یہی کیفیت لالہ گل کی ہے۔ ان کی حیثیت بھی جو ا کے راستے کے چراغوں کی ہے۔ وہ بھی جلد بجھ جانے والے ہیں اور ایسے چراغوں میں قیام و قرار کا رنگ لانا پریشان ہوگا، یعنی ان کے لیے قیام و بقا کی کوئی صورت نہیں۔ آج کھلتے ہیں، تھوڑی دیر میں پتکڑیاں ایک ایک کر کے الگ ہو جائیں گی اور وہ ناپید ہو جائیں گے۔ ایسی چیزوں کے لیے ثبات کا رنگ

بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

جو چیزیں زندگی میں حسن و جمال کے اعتبار سے بہت عزیز سمجھی جاتی ہیں، ان کی بے ثباتی ایسے عمدہ اور مناسب حال انداز میں پیش کی گئی ہے کہ اس سے بہتر طریقہ ذہن میں نہیں آ سکتا۔

۷۔ لغات - سُبْدِ گُل : وہ نوکری جس میں پھول چن چن کر جمع کیے جاتے ہیں۔

شرح : اسے پرندے، خوشخبری ہو کہ کھچیں یعنی پھول چننے والا تجھے پھولوں کی نوکری کے نیچے بند کر رہا ہے اور صیاد بارغ میں موجود نہیں۔

مرغ سے مراد بظاہر بمبیل ہے۔ پھولوں کی نوکری میں بند کر دینے سے اول بجنے کے سختیاں ختم ہوئیں، دوم پھولوں سے نہ محض قرب حاصل ہوا، بلکہ بمیل کے اور گرد ہر طرف پھول ہی پھول ہوں گے اور صیاد جو پرندے کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے، موجود نہیں۔

جس صورت حال پر اس کا اطلاق نہایت موزوں طریق پر ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر وہ مرثیہ کے سامنے نہ تھی، مثلاً انگریزی تسلط کے آخری دور کو سمجھ لے۔ آزادی کا مذہب عام ہو گیا تھا۔ انگریزوں کے لیے اطمینان سے مستطرد بننے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ انھوں نے اصلاحات کا خاکہ تیار کیا۔ اور اسے نافذ کر دیا۔ یہ پرندے کو سب گُل کے تلے بند کرنے کی صورت تھی اور ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ صیاد بارغ سے نکل گیا ہے یا اس نے صیاد کی جگہ گھمبیری اختیار کر لی ہے یعنی اب پہلے کی طرح شکار نہیں کرتا تجارت کے بل پر محکوموں کو نہیں دباتا صرف مالی فائدے اٹھاتا ہے، یعنی پھول چنتا ہے۔ ایسی صورتیں مختلف احوال میں مختلف مقامات پر پیش آئیں۔

۸۔ لغات - نفی و اثبات - نفی کے معنی "نہیں" اثبات کے معنی

"ہاں"۔ اصطلاح میں ان دونوں لفظوں کے معنی وسیع ہیں۔ کلہ فیتیہ میں انھیں دونوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے کلہ نفی ہے یعنی لا الہ (کوئی معبود نہیں) پھر کلہ اثبات ہے یعنی اِلَّا اللہ (اللہ کے سوا) نفی اصطلاح تصوف میں اپنے آپ کو وجود حقیقی میں فنا کر دینے

اور اس طرح اس وجود کا اثبات کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اذکار میں ذکر نفی و اثبات سے مقصود کلثم طیبہ کا ذکر ہے۔

تراوش : چپکنا، نکلنا، ظاہر ہونا۔

شرح : جس طرح کلثم تو حید میں نفی سے اثبات کا علم ہوتا ہے، وہی کیفیت ہمارے محبوب میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے وقت اسے وہن تو دیا ہی نہیں، اس کی جگہ "نہیں" دے دی یہی وہ ہر بات پر اذکار کرتا ہے اور کلثم نفی استعمال کرتا اس کا شیوہ ہے۔ اسی نہیں سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کا وہن ہے، گویا نفی سے اثبات کا ظہور ہوتا ہے۔

بیشمار اصحاب نے اعتراض کیا ہے کہ مرزا نے یہاں اثبات کو مؤثر استعمال کیا، حالانکہ یہ ذکر ہے اور مرزا خود کہہ گئے ہیں :

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

لیکن جن الفاظ کی تذکیر و تائید محض اعتباری ہے، ان میں زیادہ میں میکر نہیں نکالنی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرزا نے ایک معنوں پیدا کیا اور "اثبات کرتا ہے" لاتے تو "کرتا" کا الف دب جاتا اور مرزا نے خود متیاح کے نام لکھا ہے کہ جہاں الف دبتا ہے، میرے کیلجے میں ایک تیر لگتا ہے۔ یقیناً اسی وجہ سے "کرتا ہے" کے بجائے "کرتی ہے" لکھ دیا اور اعتباری تذکیر و تائید میں اسے قابلِ گرفت نہ سمجھنا چاہیے۔

۹۔ شرح : ظاہری جلوہ آسمانی میں بہشت جی تیرے کو چمے کے ہم نہیں۔

نقشہ تو واقعی یہی ہے، لیکن وہ اس اتنی آبادی نہیں۔

مطلب یہ کہ محبوب کے کوچے میں عشاق کا جو جوم رہتا ہے، ویسا جوم بہشت

میں نظر نہیں آتا۔

ایک پہلو یہ نکالا جاسکتا ہے کہ محبوب حقیقی کے شیدا یوں کا جو جوم اس کا جلوہ دیکھنے کا مشتاق ہے، وہ تعداد میں اتنا زیادہ ہے کہ بہشت میں جانے والوں کی تعداد کو اس سے کوئی مناسبت نہیں۔ مرزا غالب کے فلسفے کے مطابق بہشت میں وہ بہشتی لگے

جو ایک عمل کی جزا پائیں گے، لیکن دیار کے آمد و آمد سبب سے نوبی سروکار نہ رکھیں گے اور دیار ہی کے منتظر رہیں گے۔ ان کی تعداد صحنِ عمل کی جزا پانے والوں سے بہت زیادہ ہوگی۔

۱۰۔ شرح : اے غالب ! تم کس منہ سے بے وطنی کی شکایت کر رہے ہو؟ کیا تمہیں یاد نہیں کہ وطن کے دوستوں اور رفیقوں نے کیسی بے مہری سے کام لیا اور تمہاری قدر و منزلت پہچاننے سے کس وجہ غفلت برتی۔

وطن سے محبت اہل وطن کی مہربانی، قدر شناسی اور ہمدردی کی بنا پر ہے۔ جہاں یہ چیزیں ناپید ہوں، وہاں وطن اور بے وطنی میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ مرزا غالب بھی بے وطنی کی شکایت اسی بنا پر بجا قرار دیتے ہیں کہ یارانِ وطن سے بے مہری کے انتہائی حد سے اٹھا چکے ہیں۔

دیوانِ غالب کا جو نسخہ میثرائی مرحوم نے فراہم کیا تھا، اس کے حاشیے کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ غزل بھی بانہ میں لپی گئی تھی، جب مرزا غالب لکھتے جاتے ہوئے بانہ میں میٹھرے تھے اور اقلب ہے، وہاں کے کسی مشاعرے میں پڑھی گئی ہو، لہذا مقطع کی مناسبت کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

۱۔ شرح : غلامِ حاکمی

فرماتے ہیں :

اپنی مزاح و مسکلی اور اس

کے ساتھ مشرافتِ نفس کا

ظہار ہے۔ یعنی میں جو دونوں

جہان سے گرفتار ہوں

کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان

پر قانع ہو گیا، بلکہ مجھ کو زیادہ

دونوں جہان دے کے، وہ سمجھے یہ خوش رہا

یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

تیرا پتا نہ بتائیں تو ناچار کیا کریں؟

کیا شمع کے نہیں ہیں جو انوارِ اہل بزم؟

ہو غم ہی جاں گداز تو غمِ حواری کیا کریں؟

مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی، اس لیے خاموشی اختیار کر لی :

اللہ تعالیٰ سے انسان کو وہ نوس جہان دے دیے۔ دنیوی زندگی کی شادمانیاں اور کامرانیاں بھی عطا کی، اُخروی زندگی کی نعمتیں بھی بخشیں اور انھیں انسان کے لیے خوشی کا سامان قرار دیا۔ انسان ان پر تباہت نہیں کر سکتا تھا، دل سے خوش نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ نعمتیں ذات سے جبرائی قبول کرنے کی صورت میں مل رہی تھیں، لیکن یہاں یہ شرم و افسوس جوئی کہ اب عطا کرنے والے سے تکرار کیا کریں۔ کیا کہیں کہ ہمیں ان نعمتوں کے بجائے صرف ذات میں شرم ہی رہنا منظور ہے۔ واقعی خواہجہ حالی کے ارشاد کے مطابق یہ فراخ صعلی اور مشرانت نفس کا اظہار ہے اور اسے انسان کی بندگی و عبودیت کا بھی ایک کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مل گیا۔ اگرچہ اس پر تباہت کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن عطا کرنے والے سے تکرار کو عبودیت کے منافی سمجھا اور شرم کے اسے چُپ رہا۔

۲۔ **مشرع :** تیرے شیدائی تیری تلاش میں نکلے، لیکن دو دو چار چار سلوک و معرفت کی منزلوں میں شک شک کر ٹھہرتے گئے۔ تو ہی مزا کہ تیرا پتا نہ ملے تو یہ بے بس اور بے چارہ لوگ کیا کریں ؟

مطلب یہ ہے کہ سلوک و معرفت کی کتنی ہی منزلیں ملے کر لی جائیں، لیکن انسان کے لیے حقیقت تک پہنچنا مشکل ہے۔ جسے دیکھو سفر سے چور ہو کر کسی نہ کسی منزل پر ٹوک گیا ہے، آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں رہی۔

۳۔ **لغات :-** ہوا خواہ : خیر خواہ، ہمدرد، انگسار۔

مشرع : کیا تم بھگتے ہو کہ اہل بزم کے دل میں شمع کی خیر خواہی، ہمدردی اور انگساری کا کوئی جذبہ موجود نہیں ؟ یہ غلط ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ جب ہم ہی جان گھٹا دینے والا ہو تو ہمارے غمخواروں کے بس میں کیا رہ جاتا ہے ؟

محفل کا ہمارا صرف شمع کے روشن رہنے پر موقوف ہے۔ شمع نہ ہو تو محفل جم ہی نہیں سکتی۔ اس صورت میں کون کر سکتا ہے کہ اہل محفل شمع کے ہمدرد نہیں ؟ لیکن اس کے لیے قدرت نے ہم کا ایسا سوز مقدر کر دیا ہے۔ ۴۰، ۴۱ کی روشنی کا لازمہ ہے۔

وہ جب تک روشن رہے گی۔ بگھلنے جانے گی۔ اس جان گھلا دینے والے ختم کا علاج غمخوار نہیں کر سکتے۔ علاج یہ ہے کہ شمع بجھا دی جائے۔ شمع بجھ جانے کی تو محفل ہی باقی نہیں رہے گی۔

اس شعر میں ایک حقیقت یہ بیان کی ہے کہ ہر شے کا وجود کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہے۔ شمع کے وجود کا مقصد یہ ہے کہ محفل میں روشنی کرے۔ روشنی ہوگی تو وہ گھسے گی اور غمخواروں کی ہمدردی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ اسے مقصد سے ہٹانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہستی ختم ہو جائے۔ اسی طرح کائنات کا ہر وجود قدرت کا مقرر کیا ہوا مقصد پورا کر رہا ہے اور تکمیل مقصد کے چلو لازم ہیں، ان سے وہ بچ نہیں سکتا۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کا رگر
۱۔ شرح : غیر کی خوش بانی
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانون پر نہیں
اور چکنی چٹری باتیں محبوب کے
دل پر اثر کر گئی ہیں اور اس نے
غیر کو اپنا سچا عاشق سمجھ لیا ہے۔ ہم اپنے بارے میں کچھ کہنے سے اتنا پرہیز کر رہے ہیں کہ کنا
چاہیے، ہم بے زبان ہیں۔ ہم واقعی اس کے سچے عاشق ہیں، لیکن ہم پر اسے عشق کا لگن
تک نہیں۔

اس شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ بسا اوقات انسان ظاہری نمود و نمائش کا
اثر قبول کر لیتا ہے اور وہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس وجہ سے منافق
درجہ اعتبار حاصل کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے متعلق بے تکلف بے چوڑے دعوے کرتے رہتے
ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ غفلت میں اور غلوں کی بنا پر زبانی دعووں کو کوئی وقعت نہیں
دیتے، وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ زندگی کے ہر دائرے میں اس صورت حال کی بے شمار
مثالیں موجود ہیں۔

۱۔ شرح : عاشق

نے محبوب کو رام کرنے کی غرض سے مجنوں اور میل کا قبضہ ستایا

جب یہ بتایا کہ میل قیس کی

دلدار ہی کے لیے اس کے

پاس صحرا میں پہنچ گئی تھی تو

ستم دیکھیے کہ اس پر محبوب کے دل میں کوئی مہربانی اور کوئی غائبت پیدا نہ ہوئی، بلکہ

وہ تعجب سے بولا کہ آیا دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے ! یعنی یہ بھی ہوتا ہے کہ محبوب

بے حجاب ہو کر عاشق کے پاس پہنچ جائے ۔

مولانا طہا عباتی نے اس شعر سے لزوم کا ایک طویل سلسلہ پیدا کیا ہے ۔ فرماتے

ہیں، میل کے اس ضل پر تعجب کا سبب یہ ہوا کہ محبوب نے ایسا شرم و حیا کے غلات

سمجھا۔ شرم و حیا کے غلات سمجھنے سے یہ معنی لازم آئے کہ میل پر اس نے تشبیہ کی

یعنی اسے طعنہ دیا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ خود محبوب کے نزدیک عاشق کی خبر

لینے میں شرم و حیا مانع ہے۔ غرض اس شعر میں بلا غلت کی وجہ یہی سلسلہ لزوم ہے ۔

۲۔ شرح : اے غائب ! مجھے محبوب کے نازک دل پر رحم آتا ہے ۔

بہتر یہی ہے کہ تو اس کا مزہ کو عشق کی آزمائش میں سرگرم نہ کر۔

مطلب یہ کہ عاشق عشق کا امتحان دینے کے لیے زعمض تیار ہے، بلکہ محبوب کو

آبادہ کر رہا ہے کہ وہ اٹھے اور جس طریقے پر چاہتا ہے، آزمائش کر لے۔ آزمائش کا سب

سے بڑا اندبیر وہ ہے، جس میں عاشق کو جان قربان کر دینے کی نوبت آئے۔ عاشق اس

کے لیے بھی ہمد تن تیار ہے، لیکن اس کا رفیق اور مددیم عاشق کو سمجھا رہا ہے کہ بھئی !

تو تو جان نثاری سے اپنے عشق کا ثبوت دے دے گا، مگر محبوب کا دل نازک ہے۔ مجھے

قند ہے کہ وہ تیرے جان و دے دینے پر پیشیاں و ملول ہو گا اور اس کا نازک دل ملل

بمرداشت نہ کر سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تو اسے عشق کی آزمائش پر آمادہ نہ کر تا کہ اس

قیامت ہے کہ سُنِ میل کا دشتِ قیس میں آنا

تعجب سے وہ بولا : یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں !

دلِ نازک پر اُس کے رحم آتا ہے مجھے، غائب !

نہ کر سرگرم اُس کا مزہ کو اُلفت آزمائے میں

مولانا طہا عباتی نے اس شعر سے لزوم کا ایک طویل سلسلہ پیدا کیا ہے ۔ فرماتے

ہیں، میل کے اس ضل پر تعجب کا سبب یہ ہوا کہ محبوب نے ایسا شرم و حیا کے غلات

سمجھا۔ شرم و حیا کے غلات سمجھنے سے یہ معنی لازم آئے کہ میل پر اس نے تشبیہ کی

یعنی اسے طعنہ دیا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ خود محبوب کے نزدیک عاشق کی خبر

لینے میں شرم و حیا مانع ہے۔ غرض اس شعر میں بلا غلت کی وجہ یہی سلسلہ لزوم ہے ۔

۲۔ شرح : اے غائب ! مجھے محبوب کے نازک دل پر رحم آتا ہے ۔

بہتر یہی ہے کہ تو اس کا مزہ کو عشق کی آزمائش میں سرگرم نہ کر۔

مطلب یہ کہ عاشق عشق کا امتحان دینے کے لیے زعمض تیار ہے، بلکہ محبوب کو

آبادہ کر رہا ہے کہ وہ اٹھے اور جس طریقے پر چاہتا ہے، آزمائش کر لے۔ آزمائش کا سب

سے بڑا اندبیر وہ ہے، جس میں عاشق کو جان قربان کر دینے کی نوبت آئے۔ عاشق اس

کے لیے بھی ہمد تن تیار ہے، لیکن اس کا رفیق اور مددیم عاشق کو سمجھا رہا ہے کہ بھئی !

تو تو جان نثاری سے اپنے عشق کا ثبوت دے دے گا، مگر محبوب کا دل نازک ہے۔ مجھے

قند ہے کہ وہ تیرے جان و دے دینے پر پیشیاں و ملول ہو گا اور اس کا نازک دل ملل

بمرداشت نہ کر سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تو اسے عشق کی آزمائش پر آمادہ نہ کر تا کہ اس

قیامت ہے کہ سُنِ میل کا دشتِ قیس میں آنا

تعجب سے وہ بولا : یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں !

دلِ نازک پر اُس کے رحم آتا ہے مجھے، غائب !

نہ کر سرگرم اُس کا مزہ کو اُلفت آزمائے میں

کا دل صدمہ اور مہر اندیشے سے محفوظ رہے۔

۱۔ شرح : محبوب بھی
 دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
 آخر کسی سے دل لگا بیٹھا
 بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پاٹی داڑیاں
 یعنی کسی پر عاشق ہو گیا۔
 میں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
 اب وہ بھی غم عشق میں تنہا
 بیٹھا رہتا ہے۔ بارے
 مہر گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ یادِ بیاں
 اس طرح ہمیں اپنی بیکسی
 اور تنہائی کی داو مل گئی یعنی
 جس طرح ہم عاشق ہو کر سب سے الگ تنگ بیٹھے رہتے تھے وہی کیفیت
 اب ہمارے محبوب کی ہے۔

۲۔ لغات : زوال آمادہ : فنا ہو جانے پر آمادہ، یعنی فنا ہو
 جانے والا۔

آفرینش : پیدائش۔ مخلوق۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

- یہاں سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے
 اور تمام اجزائے عالم آمادہ زوال و فنا میں، چراغِ رہ گزارِ بادے
 تشبیہ دی ہے، جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان کے لیے فنا ہو جانا مقدر ہے۔ ﴿لَا
 مَن دَلَّ عَلٰی مَا نَدَّ عَلٰی وَجْهِ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ﴾ ان چیزوں میں نظامِ
 سب سے بڑا اور نمایاں وجود سورج کا ہے جس پر پورے نظامِ شمس کا انحصار
 ہے، لہذا مردانے فنا کا ثبوت دینے کے لیے اسی کو بطور مثال چنا اور بتایا
 کہ یہ سورج جو آسمان پر روشن نظر آ رہا ہے، یہ کیا ہے ؟ ایک ایسا چراغ ہے

جو ہوا کے راستے میں روشن ہے۔ کیا کہا جاسکتا ہے کہ کس وقت کون سا ہنر کا
آگے گا جو اسے گلے کر دے گا؟ اور ظاہر ہے کہ جو چراغ ہوا کی گزر گاہ میں
روشن ہو گا، اس کا زیادہ دیر تک جلتے رہنا ممکن ہی نہیں۔ جب سب سے
بڑے وجود کا یہ حال ہے تو باقی اشیاء کا مسالہ قابلِ توجہ بھی نہیں۔

مولانا طیب اللہ بانی فرماتے ہیں :

”بادِ استعارہ ہے زمانے کے تجدد و مرد سے، غیر محسوس کو
محسوس سے تشبیہ دی ہے، پھر وجہِ شے حرکت ہے۔ اس سبب
سے یہ استعارہ بہت ہی بدیع ہے“

۱۔ شرح :

حالتِ فراق میں ہادی نظریں
دیوار اور دروازے پر
جگی ہوئی ہیں۔ دیوار پر
اس لیے کہ شاید صبا ہمارے
یہ کوئی پیغام لے آئے۔
دروازے پر اس لیے کہ
شاید ہمارا خط پہنچا تھا
جو اب سے کہ آجائے۔
صبا بھی شاعروں
کی خبر رساں اور نامہ پر
ہے۔ وہ دیوار ہی کے
ادھر سے آسکتی ہے۔

یہ ہم جو ہجر میں، دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو، کبھی نامہ پر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے!
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں میرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرٹ کلا کو کسی دیکھیں
ہم ادج طایعِ معل و گوہر کو دیکھتے ہیں

لہذا فراقِ زود عاشق کی نظریں بار بار دیوار کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ قاصدِ درد کو

ہی سے آئے گا اس لیے دوداؤہ بھی عاشق کی نظروں کا مرکز بنا ہوا ہے ۔
اصل مقصد صرف یہ واضح کرتا ہے کہ حالت فراق میں ہیں محبوب کی طرف
سے کوئی نہ کوئی پیغام پہنچنے کا کتنا اشتیاق و انتظار ہے اور یہ طبعی حالت کا
منایت عمدہ نقش ہے کہ نظریں دیوار و در پر جمی ہوئی ہیں ۔

۲۔ شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

۱۔ اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوتی
ہے ۔ دوسرے مصرع میں اس کا کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے ، یعنی
کب تک معشوق کو دیکھتا ہے ، کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس
گھر میں اور کیا شخص وارد ہوگا ؟

مطلب یہ ہے کہ عاشق کو اپنے گھر میں محبوب کی آمد کا یقین نہیں آتا ،
اگرچہ وہ آچکا ہے ۔ عشق یہ حیرت کا عالم طاری ہے ۔ کبھی اپنے گھر کی حالت
دیکھتا ہے ، کبھی محبوب کو نظر ڈالتا ہے ۔ کبھی یہ شہر پیدا ہوتا ہے کہ گھر میرا
نہیں ، کسی اور کا ہے ۔ کبھی یہ خیال دامگیر ہو جاتا ہے کہ محبوب نہیں آیا ، کوئی
اور آیا ہے ۔ جہاں کہیں بالکل غیر معمولی اور بظاہر غیر ممکن الوقوع واقعہ پیش
آ رہے ، وہاں صاحب خانہ کی کیفیت جو ہو بھی جاتی ہے ۔

۳۔ شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

عشق سب سے پہلے ہو یا محاذی ، اس کے زخم کی گہرائی اس سے بہتر

کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی ۔

لوگ کیوں آ کر میرے جگر کا گھاؤ دیکھ رہے ہیں ، جو عدد درجہ گہرا ہے ؟
مشتاق ناوک نکلن ایسا ہی زخم لگا سکتا تھا ۔ مجھے یہ ڈر ہے ، کہیں زخم کی گہرائی
کا ستائش آمیز ذکر کرنے سے میرے محبوب کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے
عام قاعدہ یہی ہے کہ جب کسی کی تعریف کرتے ہیں تو نظر بد کا اثر دیکھنے کے
لیے کوئی نہ کوئی کلمہ کہہ لیتے ہیں ، مثلاً چشم بد دور ، ماشاء اللہ وغیرہ ۔ عاشق کی

جہاں شاعری اور محبت کے کمالات ملاحظہ ہوں کہ اپنے کاری زخم کا کوئی خیال نہیں، صرف یہ خیال ہے کہ محبوب کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے۔

مولانا طباطبائی بالکل بجا فرماتے ہیں :

”اس شعر کی خوبی بیان سے باہر ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر شعراء کے دیوانوں میں اس کا جواب نہیں نکل سکتا۔“

بعض لوگوں نے اس کا آخذ شاعری کا مندرجہ ذیل شعر قرار دیا ہے :

بہر کس کہ زخم کاری مارا نظارہ کرد

تا حشر دست و بازو سے اوراد عاکند

ظاہر ہے کہ اس شعر کو مرزا کے شعر سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں اس کے مصنفوں اور مرزا کے مصنفوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ بڑی مولویت ہے، وہ خالص عشق ہے۔

۴۔ لغات۔ طرفِ گلہ : ٹوپی کا گوشہ۔ جہاں رقیع کلنی وغیرہ لگا لیتے ہیں۔

شرح : تو نے اپنے کلاہ کی کلنی میں جو اسیرات ٹانگ لیے ہیں۔ ہمارے لیے ان سے تیرے سخن میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا کہ انھیں بار بار دیکھیں، البتہ یہ ضرور دیکھ رہے ہیں کہ ماشاء اللہ لعل و گہر کی قسمت کتنی اونچی ہے کہ انھیں تیری طرف کلاہ میں جگہ نصیب ہوئی۔ مقصود بہر حال وہی ہے۔ لیکن مرزا غالب جب ذکر کریں گے تو طرف کلاہ کی آرائش نہیں، بلکہ لعل و گہر کی بلند فضا ہی کا ذکر کریں گے۔

۱۔ لغات۔ روزِ جزا :

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں

وہ دن جب اعمال کا بدلہ لائے گا

شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

یعنی روزِ قیامت۔

کوئی کہے کہ شبہ میں کیا بُرائی ہے؟

بلا سے، آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو سر جانتے کہیں

جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گداے کو چڑے خانہ نامہ مراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام

دیبا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم کہہ دے کا ذکر ان سے کیوں کرو غائب

یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

یہ تو جاؤ کہ چاندنی رات میں محفلِ ناز و نس جہاں

مرزا غائب ہی نہیں، بلکہ ہر صاحبِ ذوق کے لیے عرقِ نوشی کے دو

ہی بوتلے ہیں۔ یادوں کے وقت ابر چھایا ہوا ہو، ترشحِ حور ہوا ہو اور ٹھنڈی

ہوا چل رہی ہو یا رات کے وقت جب چاندنی چٹکی ہوئی ہو۔ اس شعر میں

مشرع : یہ کس نے کہا کہ

میں قیامت کا منکر ہو گیا ہوں؟

یہ غلط ہے میرا اعتقاد قیامت

پر بدستور قائم ہے، البتہ یہ

ضرور کہتا ہوں کہ بدلائی کی رات

میں جو مصیبتیں اور مشقتیں عاشق

پر گزری ہیں، ویسی قیامت کے

دن پیش نہیں آ سکتیں، اس

لیے قیامت کا دن سحر کی رات

سے بڑھا ہوا نہیں۔

کتنا سہول اور عام مضمون

ہے، لیکن محض بیان کی خوبی سے

اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔

۲۔ شرح : اگر آج دنِ محنت

بادل نہیں چھائے اور ٹھنڈی

مرزا غائب چل جاتا ہے۔

نیک ذکر کر دیا۔

۳۔ لغات - مرجبا : دمانہ کمرہ، کمرہ تحسین۔ یہ مرحب سے ہے جس کے معنی ہیں کشائش اور فراخی۔ مرجبا کہا جاتا ہے تو مقصود یہ ہوتا ہے کہ آنے والے کو بتایا جائے، ہمارا گھر وسیع اور کشادہ ہے، آپ کے لیے کوئی تنگی نہ ہوگی۔
غیر باد : خیریت ہو، اچھے ہو۔

دونوں میں سے مرجبا، کسو، کے آخر وقت، آخر باد میں تو وقت کہنے کا مستور ہے۔
تشریح : مرزا اس شعر میں محبوب کی منتہی بے توجہی اور بے اتفاقی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اس کے سامنے ہاتا ہوں تو کبھی اس کی زبان پر مرجبا کا لفظ نہیں آیا اور اس کے پاس سے کسی طرف ہاتا ہوں تو کبھی اس نے غیر باد نہیں کیا۔ اس سے بڑھ کر بے نیازی اور بے پرواہی کیا ہوگی۔
۴۔ تشریح : پہلے شعر سے ظاہر شعر ہے، یعنی اگر محبوب کو کسی وقت میرا خیال آ بھی جاتا ہے تو وہ یوں ذکر کرتا ہے کہ کیا بات ہے، آج ہماری مینا

کافی فتنہ و فساد لفظ نہیں آتا تو آہم میں چنچ جاتے تھے تو ہر ایک سے بڑھتے۔
مطلب یہ ہے کہ جب آہم میں کسی کی زبان سے کوئی بات نکل گئی تو مرزا جھگڑتے رہتے تھے۔ کبھی بے تکلفی میں کسی کی زبان سے کوئی بات نکل گئی تو مرزا الجھ پڑتے تھے۔ کبھی کسی نے شوخ نظروں سے محبوب کو دیکھ لیا تو مرزا نے لڑائی چھیڑ دی۔ یوں محبوب کی ہزم میں ایک ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ مرزا موجود نہیں ہوتے تھے تو ہر طرف سکون و اطمینان نظر آتا تھا۔ بس یہی کیفیت اس شعر میں پیش کی گئی ہے۔

۵۔ تشریح : عید کے دن تمام فیضوں میں خیرات ہوتی ہے، لیکن مینا ہر کا دستور یہ نہیں کہ خیرات کے لیے خاص دن کا تعین ہو۔ وہاں ہر وقت سلسلہ داد و دہش جاری رہتا ہے۔ مینا نے کے کوچے میں جو درویش پھرتے ہیں، ان کی مراد ہوا بھاتی رہتی ہے۔ گویا شراب خانہ، زمانے کے عام دستوروں سے بالکل الگ اپنے خاص دستور رکھتا ہے، جنہیں زمانے کے عام دستوروں پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔

۶۔ شرح : اس شعر میں غمزدگی کی انتہائی صورت پیش کی گئی ہے۔ دنیا میں خوشی اور غم نے جلے آتے ہیں۔ آج خوشی ہے تو کل غم ہے۔ آج غم ہے تو کل خوشی ہے۔ خزاں کے بعد بہار اور بہار کے بعد خزاں آتی رہتی ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں یہ دستور رائج ہو گا۔ شادی اور غم یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہونگے، لیکن ہمیں ان سے کیا غرض ہے ؟ بہاری حالت تو یہ ہے کہ خدا نے جو دل ہمیں عنایت کر دیا ہے، اس میں شادی اور مسرت کی کوئی صلاحیت باقی نہیں۔ وہ سراپا غم ہے، لہذا ہمیں غم کے ساتھ نشاط و مسرت کی کوئی اتیدہ رکھنی چاہیے۔

مولانا طالعباتی فرماتے ہیں۔

”دنیا میں غم، شادی کا بہم ہونا اس مقام پر ذکر کرتے ہیں، جہاں دنیا کے سرور، خوشی سے نفرت ظاہر کرنا منظور ہو۔ اس شعر میں مصنف نے تازگی یہ پیدا کی ہے کہ غم و مشغولی کے بہم مرنے پر حسرت ظاہر کی ہے۔ کہتے ہیں، ہمیں کیا کام ؟ مینی ہم تو محروم ہیں۔ ہم کو تو کبھی ایسی خوشی حاصل نہیں، جو غم سے متصل ہو اور شادی مخلوط بہ غم کی حسرت کرنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ شاعر کو انتہائی غمزدگی ہے کہ ایسی ہیچ و ناکارہ خوشی کی تئنا دکھتا ہے اور یہی وجہ بلاغت ہے اس شعر میں۔“

ماہوش بیک محبوب نے وعدہ کیا اور اسے پورا نہ کیا۔ اسے غائب ! اب اس وعدے کا ذکر محبوب سے کیوں کرتے ہو ؟ ذکر کرو گے تو نتیجہ کیا ہو گا ؟ یہ کہ وہ کر دیں گے، ہمیں یاد نہیں رہا۔ پھر اس سے کیا فائدہ ہو گا ؟ بہتر یہ ہے کہ اس ذکر ہی سے دست بردار ہو جاؤ۔

مولانا طالعباتی فرماتے ہیں :

”معتوق کی جرحہ دی و وعدہ خلافی کو جو لوگ الٹ پلٹ کر کہا کرتے

میں وہ اس شعر میں تامل کریں کہ اس مضمون کہنے کو کیا آب و ہوا
 دیا ہے ! مطلب تو یہ ہے کہ میں جیب انھیں وعدہ یا دو لایا ہوں
 تو، گتے ہیں، یاد نہیں، مگر اس مطلب کو ظامت گر کی زبان سے
 کیا ہے، یہی خبر کے پہلو کو ترک کر کے مضمون کو انشاء کے
 سانچے میں ڈھالا ہے ۔

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں	ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے	ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر!	برق کو پا پہ حسنا باندھتے ہیں
قیدِ بستی سے رہائی معلوم	اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں
نشرِ رنگ سے ہے واشدِ گل	مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطیہائے مضامین، مت پوچھ	لوگ تالے کو رسا باندھتے ہیں
اہل تدبیر کی دامانڈ گسٹیاں	آہلوں پر بھی حسنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خواباں، غالب!	ہم سے پریمانِ وفا باندھتے ہیں

۱۔ لغات ۔ توسن : گھوڑا۔ کلیں کرنے والا گھوڑا۔

ہوا باندھنا : جھوٹی ساکھ قائم کرنا۔

مشرع :- اے محبوب! جس کلیں کرنے والے گھوڑے پر تو سوار ہے
 ہم نے اسے مہاکے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اس طرح اپنے مضمون کے لیے

جھوٹی ساکھ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی یہ تشبیہ ایسی نہیں کہ ہم اس پر فخر کر سکیں۔

توسن : وہ با اور ہوا کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

۲۔ لغات - ہوا باندرھنا : رعب جانا، زور دکھانا۔

شرح : ہم آہ تو کرتے ہیں، لیکن اس کے اثر کی حقیقت ہم پر بخوبی واضح ہے۔ آج تک تو اس کا اثر دیکھا نہیں۔ بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح ہم محبوب کے دل پر رعب جاتے اور اسے اپنا زور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، نتیجہ معلوم۔ شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ فرمایا : آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ؟ یقین اپنی آہ تو بے اثر ہے ہی، مگر اس کی بے اثری کا ایسا یقین دل میں پیوست ہو گیا ہے کہ کسی دوسرے کی آہ کا اثر بھی قابل قبول نہیں سمجھا جاسکتا۔

۳۔ لغات - پا بہ جتا : جس کے پاؤں میں منہدی لگی ہو۔

شرح : اسے عمراتیری فرصت اتنی کم، بلکہ بے حقیقت ہے۔ کہ اس کے مقابلے میں بھلی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے پاؤں کو منہدی لگی ہوئی ہے۔

مطلب یہ کہ بھلی کی چٹنگ سے زیادہ کم فرصت کوئی چیز نہیں، لیکن عمر اس کے مقابلے میں بھی اتنی کم فرصت ہے کہ بھلی کے پاؤں کو بھی گویا منہدی لگی ہوئی ہے۔

جس کے پاؤں کو منہدی لگ جائے، وہ اول تو چل ہی نہیں سکتا، چلے گا تو تیز ہلکے نہیں چلے گا۔ جس کے مقابلے میں بھلی کے پاؤں کو منہدی لگ جائے، اس کی کم فرصتی کا تصور کرنا چاہیے۔

۴۔ شرح : ہستی کی قید سے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں۔

آنسو کو دیکھیے کہ نہ اس کا سر ہے نہ اس کے پاؤں۔ گویا وہ ہستی کی قید سے نکل جھاگنے کی پوری تیاری کر چکا ہے، لیکن اسے بس بے سر و پائی کے باوجود

باوجود یہاں تا ہے یعنی شرابِ مسخار میں اسے بے سرو پائی کے باوجود بانوھے چلے جاتے ہیں۔ پھر مستی کی قید سے رطائی پانے کی کیا صورت ہے ؟

۵۔ لغات۔ **واشترُ کُلُّ** : پھول کا کھلنا۔

شرح : پھول رنگ کے نشے میں پرست ہو کر کھل جاتا ہے سب لوگ جانتے ہیں کہ بدستوں کی تباؤں کے بدکب باندھے جاتے ہیں ؟ مطلب یہ کہ جب پھول نشے کے رنگ میں مست ہو گیا تو اس کی تبا کے بند کھل گئے ، گو یا وہ کھل گیا۔

پھول کو رنگ کی شرابِ فطرت نے پلا کر مست کر دیا۔ اس قسم کی موندوں شرابِ فطرت نے ہر وجود کے لیے متیا کر رکھی ہے۔ جب یہ شرابِ رنگ دکھاتی ہے تو ہر وجود کے دل کا غیظِ بستہ پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔

۶۔ **شرح** : اس شعر کے دو معنوم بالکل واضح ہیں۔ اول یہ کہ نالے کو رسا کہنا اور ظاہر کرنا بالکل غلط ہے۔ دوسرا اور گہرا مطلب یہ کہ اگر نالہ رسا ہوتا تو باندھنے میں کیونکر آتا ؟ اس کا باندھا جانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ رسا نہیں۔ یعنی معنومِ شعر کی غلطی بالکل ظاہر ہے۔ بندھ جانے ہی سے اس کی رسائی کا بطلان ہوتا ہے۔

۷۔ **لغات** : **واماندگیاں** : واماندگی کی جمع۔ **تھکاوٹ** ، **تھکان** ، **بیچارگی** ، **لاچاری**۔

شرح : جو لوگ اپنے آپ کو اہل تدبیر یعنی عقل و دانش اور چارہ گر سمجھتے ہیں ، ان کی بیچارگیوں ، اور لاچاروں پر نظر ڈالیے کہ کسی کے پاؤں میں چپالے پڑ جائیں تو ان پر مشدئی لگاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ چپالے تو بذاتِ خود چلنے میں مائع ہوتے ہیں امدان پر مشدئی لگا دی جائے تو چلنا اور بھی دو بھر ہو جائے گا۔ یہ تدبیر اور چارہ گری تو نہ ہوتی ، بلکہ لاچار کو اور لاچار بنا دیا۔

اس شر سے ضحّا اہل جنوں کی تائش کا پہلو نکل آیا ، یعنی وہ پاؤں کے پھلوں کے ساتھ صحرائے پُر خار میں بے تکلف دوڑتے ہیں اور کانٹوں ہی سے پھلوں کا علاج کرتے ہیں ۔

۸۔ لغات - پُرکار : ہوشیار ، چالاک ۔

شرح : اسے غائب ! بیشک محبوب بظاہر سیدھے سادے اور حقیقتاً بڑے چالاک اور ہوشیار ہیں ۔ ان کا کمال دیکھیے ، ہم ایسے لوگوں سے وقاداری کا چمان باندھتے ہیں ۔ گویا ہمیں وفا کا یقین دلانا چاہتے ہیں ، حالانکہ ہم اس فریب میں نہیں آسکتے ۔

ان کی سادگی یہ ہے کہ سمجھ لیا ، ہم ان کے فریب میں آجائیں گے اور پتہ لگا یہ کہ ہمیں فریب دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔

۱۔ لغات - سخت کم آزار :

حدود جو کم دکھ دینے والا ۔

شرح : اسد یمنی

غائب کی جان کی قسم ، زمانہ

زمانہ سخت کم آزار ہے بہ جان اسد

وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

اپنے آپ کو بہت آزار دینے والا سمجھتا ہوگا ، یعنی اس کا خیال یہ ہوگا کہ میں لوگوں کو بہت دکھ پہنچاتا ہوں ، حالانکہ جتنا آزار اب تک مجھ میں پہنچا ہے ، وہ تو بہت کم ہے ۔ ہم تو امید رکھتے بیٹھے تھے کہ اس سے بہت زیادہ دکھ دیا جائے گا ۔ شرم بظاہر دکھ نہ لینے کی زیادہ سے زیادہ ہمت کا اظہار کیا ہے ۔

گویا زمانے نے مصائب کے جو جام پے در پے ہمارے لبوں کو لگائے ، وہ ہمارے غریب برداشت کے مقابلے میں بہت کم تھے لیکن اسی سلسلے میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ زمانے نے ہمیں دکھ دینے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا رکھتی ۔ ہاں بہم نہ معنی اس سے زیادہ دکھ برداشت کر سکتے تھے ، بلکہ

امید بھی یہی تھی کہ اس سے زیادہ دکھ دیے جائیں گے۔ گویا حقیقتاً اس شعر میں بھی اپنی پُر آلام زندگی کا نقشہ بڑے اثر انگیز انداز میں کھینچا ہے۔

دائِمْ پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ سچتر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرانہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوح جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زُمر و زرد و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدمِ مری آنکھوں سے کیوں دینے
رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منج قدمِ بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

ا۔ شرح : میری
زندگی ناکارہ ایچ اور قابلِ اعتراض
ہے، کیونکہ میں سچتر بنا۔ اے
کاش! سچتر ہوتا تو ہمیشہ
محبوب! تیرے دروازے
پر چڑھتا۔

عام قاعدہ تھا کہ رکازوں
کے صحن گلیوں سے اونچے
رکھتے تھے اور آمد و رفت کی
آسانی کے لیے دبیر کے ساتھ
ایک سچتر لگادیتے تھے۔ آج
کل یہی کام سینٹ یا ایٹوں
کے پایوں سے لیا جاتا ہے۔
اس سچتر کو سنگ در یعنی دروازے
کا سچتر کہتے تھے۔

شاعر کہتا ہے، اگر میں
سچتر ہوتا تو تیرے دروازے
پر چڑھتا۔ آتے جاتے تیری
پاؤسی نصیب ہوتی۔ اب میری
زندگی کس کام کی ہے کہ تیرے

غالب و طیفہ خوار ہو، دوشاہ کو دعا
وہ دن گئے، جو کہتے تھے، نوکر نہیں ہوں میں
دروازے تک نہیں پہنچ
سکتا اور وہیں نہیں ڈارتا۔
۴۔ لغات۔ گردشِ عالم:
داغی گردش، ہمیشہ پھرتے رہنا۔

شرح : شراب کی مہفل میں پیالہ و ساغر ہمیشہ گھومتے رہتے ہیں۔ ان کا وظیفہ ہی یہی ہے کہ چکر میں رہیں تاکہ مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ باری باری نوبت بہ نوبت شراب پیتے جائیں۔ لیکن یہ کام پیالہ و ساغر کا ہے، جن کا خاصہ ہی ہمیشہ گھومتے رہنا ہے۔ میں انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں کہ پیہم اور مسلسل گردش سے میرا دل گھبراتا جائے۔ پھر کون سی وجہ ہے کہ میں اس مسلسل گردش میں مبتلا ہوں؟ کیا آسمان نے مجھے انسان کی جگہ پیالہ و ساغر سمجھ لیا ہے؟
۳۔ لغات۔ حرفِ مکثر : وہ حرف جو غلطی سے دوبارہ لکھا جائے۔
ایسا حرف مٹا دیتے ہیں اور غلطی کی تلافی جو جاتی ہے۔ مرزا نے مٹائے جانے کی بنا پر اپنے آپ کو حرفِ مکثر یعنی حرفِ غلط سے تشبیہ دی ہے۔

شرح : اے اشد! زانہ کیوں مجھے مٹانے کے درپے ہے؟ کیا میں جہان کی حققت پر کوئی ایسا حرف ہوں جو دوبارہ کہتے جانے کے باعث غلط قرار پایا ہو اور اسے مٹا دینا ضروری ہو؟
مولانا طباطبائی فرماتے ہیں،

”اگر یوں کہتے کہ زانہ مجھے حرفِ غلط کی طرح مٹائے دیتا ہے تو اس قدر بلیغ نہ ہوتا جس قدر اب بلیغ ہے اور بلا عنایت کی وجہ زیادتی معنی ہے اب اتنے معنی اور بڑھے ہیں کہ باوجودیکہ میں حرفِ مکثر نہیں ہوں اور کوئی وجہ میرے مٹانے کی نہیں ہے (بہ ایں ہمد) زانہ مجھے مٹا رہا ہے۔“

اس شعر سے یہ نکتہ سمجھنا چاہیے کہ ایک تشبیہ متبذل میں

زیادتی معنی پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ پھر زیادتی معنی سے
بلاعت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔

۴۔ لغات۔ عقوبت : عذاب، تعذیب، سزا، معنی اصحاب
نے سزا و عقوبت کو ہم معنی بتایا ہے، لیکن معاملہ عام و خاص کا ہے۔ یہ ایسی
ی بات ہے، جیسے محض سزائے قید اور قید با مشقت دونوں ایک چیز نہیں۔
شرح : جزا و سزا کا عام اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ مومن کو گناہوں کے
مطابق سزائے کی اور وہ سزا دائمی نہ ہوگی، لیکن مشرک و منکر کے لیے سزا کی
کوئی حد نہیں خود قرآن کہتا ہے : ان الله لا يعصون اٰیہوں بد۔ (اللہ نہیں
بچنے گا، جو اس کے بارے میں مشرک کا مرتکب ہوگا) اسی عقیدے کی بنا
پر مرزا کہتے ہیں کہ گناہوں کی سزا میں مجھے جو عذاب دیا جا رہا ہے، اس کی
کوئی حد تو ہونی چاہیے۔ میں گنہگار ہوں، کافر نہیں، یعنی مجھے گناہوں کے
مطابق سزا دی جاسکتی ہے، جو بہر حال عارضی ہونی چاہیے، مگر مشرک کی
طرح دائمی سزا کا مستوجب تو نہ سمجھنا چاہیے۔

۵۔ ۶۔ ۷۔ لغات۔ قدم بوس : پاؤں چومنا۔

شرح : یہ تینوں شرفیہ مجھے جانتے ہیں اور یقیناً انہیں اور معنی پر
محول نہیں کیا جاسکتا۔ یا رسول اللہ (صلعم) حضور اس عاجز کو کس وجہ سے عزیز
نہیں بناتے ؟ میں محل نہیں، ذر و ذر نہیں، سوتا نہیں، موتی نہیں، یعنی مجھ میں کوئی
دولت کی کوئی خصوصیت موجود نہیں۔ دنیوی دولت تو حضور والا کی نگاہوں
میں برا بھلا وقت رہی۔ جب میں دولت کے لوٹ سے پاک ہوں تو حضور
مجھے عز و عزیز قصہ فرمائیے۔ حضور والا نے معراج کی رات مہر و ماہ کو قدم لگا دیا۔
میں درجے میں مہر و ماہ سے کم نہیں، پھر ضرور میری آنکھوں کو قدم مبارک سے کیوں
مشرق نہیں فرماتے ؟ حضور نے معراج کی رات آسمان کو قدم بوسی کا ثبوت عطا
فرمایا، لیکن مجھے یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ کیا آپ کا یہ غلام آسمان کے ہی

برابر نہیں ؟

۸۔ شرح : اسے غالب ! تم بادشاہ کے ولیعز خوار ہو۔ بارگاہ شاهی سے تمہیں باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے ، لہذا بادشاہ کو دعا دو۔ اب وہ وقت تو نہیں رہا جب کہا کرتے تھے : میں بادشاہ کا لوگر نہیں۔ اب تو تھری ملازمت کا باقاعدہ انتظام ہو گیا ہے۔

مرزا غالب ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو ملازم ہوئے تھے۔ انہوں نے ہر دامت عرش صاحب خود قزاق کلب علی خاں والی رام پور کو ۱۸۵۷ء میں لکھا کہ حبیب شاہ دہلی نے مجھے نوکر رکھا ، خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری تفویض کی تو میں نے یہ عزل طرز تازہ پر لکھی۔
ظاہر ہے کہ یہ عزل ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کے بعد قریبی زمانے کی ہے۔

۱۔ شرح : شاعر
کی نظر لالہ دگل کے من
پر پڑی تو خیال آیا کہ
ایسی چیزیں تو صرف
حسینوں کی مٹی سے
پیدا ہو سکتی ہیں ساتھ
یہ سوچا کہ خدا جانے
زمین میں کیسی کیسی صورتیں
جا چکی ہیں ، جنہوں نے
ظہور تازہ کے لیے لالہ دگل
کی شکل اختیار کی ، لیکن
جتنے حسین زیریں جا
سب کہاں کچھ لالہ دگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
تیس بنات الشعلش گروں 'ون کو پر د ہیں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عرماں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نر یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

چلتے ہیں، وہ سب تون
 چوہوں کی شکل میں
 نمایاں نہیں ہو سکتے،
 ان میں سے کچھ توں
 جلوہ گری پر آمادہ
 ہو گئے ہیں۔

لادو گل کی معنائی
 اور دلی بانی نے حساس
 شاعر کے دل میں یہ
 سلسلہ عیالات پیدا کر
 دیا۔ کمال یہ ہے کہ
 اس کی نظر لادو گل
 کی معنائی میں الجھنیں
 بلکہ معاً ان صدقوں
 کی طرف متقل ہو گئی
 جو زمین میں جا چکی ہیں
 اور ان میں سے سب
 نہیں، کچھ یوں حال
 افروز ہوئیں۔

بعض اصحاب نے
 اس شعر کا ماخذ ختام
 کی ایک رباعی اور مشرعو
 کے ایک شعر کو قرار دیا

سب رقیبوں نے ہوں ناخوش، پر زمانِ سحر
 ہے زنجیرِ ناخوش کہ محو ماہِ کنسٹ ہو گئیں
 جوئے غوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
 میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
 ان پر ہی زادوں سے یس گے غلہ میں ہم انتقام
 قدرتِ حق سے یہی حواریں اگر واں ہو گئیں
 فینداس کی ہے داغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
 تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
 میں چن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
 بلبلیں سن کر مرے نامے، غزل خواں ہو گئیں
 وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں، یارب! دل کپڑے
 جو مری کوتاہی قسمت سے، مٹرگاں ہو گئیں
 بسکہ روکائیں نے اور سینے میں ابھریں پے پر پے
 میری آہیں بخیڑ چاک گر سیاں ہو گئیں
 واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
 یاد تھیں جتنی دعائیں، صرف درباں ہو گئیں

جہاں فزا ہے بارہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
 سب لکیریں ہاتھ کی، گویا، رگ جہاں ہو گئیں
 ہم موقوفہ ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
 ملتیں جب مٹ گئیں، اجڑے ایماں ہو گئیں
 رنج سے خوگر ہوا انسان، تو مٹ جاتا ہے رنج
 مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آس ہو گئیں
 یونہی گروتا رہا غالب! تو لے اہل جہاں!
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں
 یہ چاند جیسے کھڑے داسے کی خاک سے اگا ہے۔

خستہ کا شعر یہ ہے :

اے گل، چو آمدی ز زمین گر چگونہ اند
 آں دوسے ہاکہ در تر گرد فنا شدند

یعنی اے پھول! تو زمین سے نکلا ہے، بتا، ان چہروں کا کیا حال ہے، جو
 فنا کی گردش کے نیچے دب گئے؟

ظاہر ہے کہ ان دولوں شعروں کو غالب کے شعر سے کوئی خاص نسبت نہیں
 ختام نے سبزے کو محبوبوں کے سبزہ خط سے لگا دیا لگا دیا کہ اس پر پاؤں نہ رکھنا
 چاہیے۔ خستہ نے پھول زمین سے نکلا ہوا دیکھا تو پوچھا کہ جو گل رنج اس میں
 دفن ہو چکے ہیں، بتا ان کی کیا کیفیت ہے؟

ان کے برعکس غالب صرف یہ کہتا ہے کہ لالہ و گل کی شکل میں تمام حسین تو

ہے ختام کہتا ہے :
 ہر سبزہ کہ برکنار جوئے رفتہ است
 گویا زب فرشتہ غمے رفتہ است
 پارہ سبزہ تا بہ غواری نہ منی
 کلاں سبزہ ز خاک ٹاہر و زلفت است
 یعنی جو سبزہ نہی کے
 کنارے اگا ہے، جہنا
 چاہیے کہ کسی فرشتہ خو
 کے لب پر سے اگا ہے
 دیکھ اس سبزے کو دلیل
 سمجھتے ہوئے بے خیال
 سے پاؤں نہ رکھو کیونکہ

نایاں نہیں ہو سکتے تھے، ان میں سے کچھ نمایاں ہوتے ہیں، پھر لادنگل کی دھانی دیکھ کر کہتا ہے: خدا جانے کیا کیا صورتیں ہوں گی، جو زمین میں جا چکی ہیں، اس نے پورے منظر سے دنیا کی بے ثباتی کا جکھانہ نکلتے پیدا کیا اور اسے نہایت پرتائیر و دلپذیر انداز میں پیش کر دیا۔

۲۔ لغات۔ نقش و نگارِ طاقِ نسیاں : بھول کے طاق کی ذہنیت و آرائش۔

شرح۔ ہمیں بھی رنگ رنگ کی محفلیں سجانا یاد تھا، لیکن اب وہ محفلیں بھول کے طاق کی آرائش و زیبائش بن گئیں، یعنی بالکل بھول گئیں اور فراموشی کی نذر ہو گئیں۔

یہ شعر ان لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے، جو جوانی کے عالم میں رنگارنگ محفلیں آراستہ کرنا کے واسطے رہتے ہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس شعر میں ”بھی“ کا لفظ دیکھنا چاہیے یہ دو حرف کا لفظ نکال دیا جائے تو سوچیے، معنی شعر میں کس نندہ کی آبا نے گی۔ اس لفظ نے جو زائد معنی پیدا کیے، یہ ہیں :

”جس طرح تم لوگ رنگارنگ جلے کیا کرتے ہو، کبھی ہم کو بھی ان صحبتوں کا شوق تھا، لیکن اب ہمارا حال دیکھ کر تم کو عبرت کرنا چاہیے کہ شباب کو قیام نہیں ہے۔“

۳۔ لغات۔ بنات النعش : نفی معنی نقش اٹھانے والی شمالی جانب سا ستارے ہیں۔ چار کھٹولے کی شکل میں ہیں، جنہیں نقش کہتے ہیں اور تین ٹکے ہوئے ہیں، جنہیں بنات کہا جاتا ہے یعنی نقش اٹھانے والے۔ تین ستاروں میں سے بیچ والے کے پاس ایک چھٹا سا ستارہ ہے، جو بڑھا کھلاتا ہے۔ یہ ستارے قلوب کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اٹھانے والے

کو عربی میں "ابن النعش" کہا جاتا ہے اور اس کی جمع عربوں کے
 معاودے میں "بنات النعش" ہے۔ فارسی میں انھیں "سہ و ختر"
 بھی کہا گیا ہے۔ اور اردو میں ساتوں ستاروں کو سات سیلیوں
 کا جبر کا یا گنچا یا سات سیلیاں بھی کہتے ہیں۔ ان کا ایک نام
 عقیدہ ثریا بھی ہے۔

شرح : بنات النعش دن کے وقت تو پروے میں چھپی رہیں اور
 لڑکیوں کے لیے یہی زیبا تھا کہ دن کی روشنی میں بے پردہ نہ ہوں اور چہرے
 چھپائے رکھیں۔ رات کو خدا جانے ان کے دل میں کیا آیا کہ یکا یک بے پردہ
 ہو گئیں اور نقاب چہروں سے اتار دیے۔

مرزا نے اس شعر میں بنات کے لفظ سے نااندہ اٹھایا ہے۔ بنات النعش
 عربی معاودے میں تو ابن النعش کی جمع ہے، لیکن مرزا نے بنات سے
 لڑکیاں مراد لے کر دن کے وقت ان کے چھپے رہنے اور رات کو بے پردہ
 ہو جانے کا معنوم پیدا کر لیا۔

بظاہر مرزا نے صرف ایک منظر دکش انداز میں پیش کر دیا ہے، لیکن
 کوئی شخص چاہے تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ سات سیلیوں نے محبوب کی بزم شبینہ
 کے نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے چہروں سے نقاب اٹھ دیے۔

۴۔ شرح : بجزوری مرحوم فرماتے ہیں :

"حضرت یعقوب کی آنکھیں فرزند کے فراق میں روتے روتے
 سفید ہو گئی تھیں۔ مرزا کی فکر نے اس سے تاثیر عشق کا کیا
 طرز مضمون پیدا کیا ہے۔ کہ وہ روزن، جو دیوارِ بخاراں یوسف
 میں ہیں، حضرت یعقوب کی تابنا آنکھیں ہیں، جو اپنے فرزند کو
 دیکھتی رہتی ہیں۔ سفید تابنا آنکھوں کو روزن سے جو مشابہت
 ہے، ظاہر ہے، قطرہ قطرہ پانی اگر کہیں گرتا رہتا ہے تو مر مراد

فولاد جنگ میں سوراخ کر دیتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی مام اٹکنا
سے دیوار زنداں میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ جس طرح روزِ دن
دیوار کبھی بند نہیں ہوتے، حضرت یعقوبؑ کی تاجینا آنکھیں
بھی بند نہیں ہوتیں۔ رات دن بے خواب جانبِ یوسفؑ نگران
رہتی ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روزِ دن دیوار زنداں ہو
گئیں تاکہ تاریکی اور محبس سے یوسفؑ کا دم خفا نہ ہو۔ آنکھیں
روزِ دن دیوار زنداں ہو گئیں تاکہ یوسفؑ زنداں سے دنیا کا تماشا
دیکھ سکیں اور تنہائی سے پریشان نہ ہوں۔“

شاعر کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر حضرت یوسفؑ سے ربط و تعلق قائم
کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی، کیونکہ قدرت کو یہی منظور تھا، حضرت یوسفؑ
کو جس اونچ کمال پر پہنچانے کے لیے مصائب کا ریلہ ان پر آیا تھا، وہ اس
پر پہنچ جائیں اور ان کی معنوی تکمیل کا سلسلہ پورا ہو جائے، پھر باپ اور بیٹے
میں یکجائی کی صورتیں پیدا ہوں، ہاں یہ ہر حضرت یعقوبؑ فردِ زندہ ارجمند کی
تلاش سے ایک لمحے کو بھی غافل نہ ہوئے اور سعی و تلاش کی آخری حد یہ تھی
کہ حضرت یوسفؑ زنداں میں پہنچے تو حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں زندان کی دیوار
میں روزِ دن بن گئیں۔

۵۔ لغات۔ زنان مصر: مصر کی وہ عورتیں، جنہوں نے
عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) کو طعنہ دیا تھا کہ وہ اپنے ایک غلام پر
فریفتہ ہو گئی۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق عزیز مصر کی بیوی
نے ان عورتوں کو دعوت دی۔ کھانے پینے کا سامان سجا دیا۔
جب وہ کھانے میں مصروف ہو گئیں تو یوسفؑ سے کہا کہ ان کے
سامنے آ جائیں۔ انہوں نے یوسفؑ کو دیکھتے ہی اپنے ہاتھ کاٹ
لیے اور بے اختیار پکار اٹھیں کہ یہ تو انسان نہیں، بلکہ ایک فرشتہ

ہے، بڑے مرتبے والا فرشتہ اس طرح ان عورتوں پر حضرت یوسفؑ کی عظمت و نفیست آشکارا ہو گئی اور عورتوں کا ظمن و تقنین باطل ثابت ہوا۔

شرح : مرزا نے اس داستان سے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ دنیا بھر کے لوگ رقیبوں سے ناخوش رہتے اور جلتے ہیں، لیکن عزیز مصر کی بیوی یعنی زلیخا ان رقیب عورتوں سے خوش ہے، جو حضرت یوسفؑ کی عظمت کی معترف ہو گئی تھیں اور زلیخا کے خلاف طعنہ زنی پر پشیمان ہوئی تھی۔

۷۔ **شرح :** جدائی کی شام آگئی۔ اندھیرا چھا رہا ہے، میری آنکھوں سے خون کی جوندھی بہ رہی ہے، اسے بہنے دیجیے۔ میں یہ سمجھوں گا کہ اس اندھیرے میں ابالا کرنے کے لیے دو شمعیں روشن ہو گئی ہیں۔ گویا آنکھوں سے خون بہنے کو چراغ کی روشنی سے قہیہ دی۔

۷۔ **شرح :** ان سیمینوں نے دینی زندگی میں ہم پر جو مظالم ڈھائے اور جو آفتیں نازل کیں، ان کا بدلہ بہشت میں لیا جائے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہی حسین وہاں حوریں بن جائیں۔

بدلے سے یہ مراد نہیں کہ ہم ان پر ظلم و ستم کریں گے، مراد صرف یہ ہے کہ زندگی میں ہم ان کی رضا کے تابع رہے اور بہشت میں پہنچ جانے کے بعد یہ ہم پر زیاد حوریں بن کر ہماری رضا کے تابع ہو جائیں گے۔

۸۔ **شرح :** زلفوں کے پریشان ہونے سے اشارہ اختلاط کی گرمجوشی کی طرف ہے۔ اے محبوب! توجس خوش نصیب عاشق کے بازو پر سر رکھ کر محو استراحت ہو اور شیری زلفیں بازو پر کھیری ہوئی نظر آئیں تو نیند کی حقیقی راحت اسی کو حاصل ہوگی۔ وہ اپنے آپ میں پھولانہ سانسے گا اور اس کا دل باز سب سے ادنیٰ ہوگا۔ راتیں بھی اسی کی لطف و مسرت اور نشاط و شادمانی میں بسر ہوں گی۔

مرلا تا طبا طبائی مزا تے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شعر بہت انفرملہ

اور کارنامہ ہے۔

۹۔ شرح : میں نے چمن میں جاتے ہی درد بھرے نالے کیے تو بلبلوں

کے دل پر ایسا اثر پڑا کہ انہوں نے ایک دم غزل خوانی شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ چمن نہیں، بلکہ ایک مکتب، ایک درس گاہ ہے، جس میں بچے اپنا اپنا آموختہ یاد کر رہے ہیں۔

شاعر کے نالے سن کر بلبلوں کا غزل خواں ہونا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ بلبلوں نے ان نالوں میں عشق و محبت کا ایسا سوز پایا کہ وہ خود بے اختیار ہو کر اپنے درد و عشق کے اظہار پر مجبور ہو گئیں۔

بعض اصحاب نے اس سلسلے میں نعمت خان عالی کا یہ شعر پیش کرنا پسند

مزا یا ہے :

آب در نگ گلستانِ عشق اکنوں ازم است

عذلیاں ہر چہ می گویند مضمون ازم است

یعنی بارخِ عشق کی رونق اب صرف میرے دم سے ہے۔ بلبلیں جو کچھ بھی کہتی ہیں، مضمون مجھ سے لیتی ہیں۔

بہر صاحب ذوق پر آشکارا ہے کہ دونوں شعروں کا مضمون ایک نہیں اور نعمت خان عالی کا شعر غالب کے شعر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

۱۰۔ لغات : کوتاہی قسمت : کم نصیبی، بد قسمتی۔

شرح : خواہ عالی مزا تے ہیں :

”نگاہوں کے مڑگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے

سبب اوپر نہیں اٹھتیں، بلکہ پلکوں کی طرح نیچے ٹھکی رہتی ہیں۔“

اگرچہ شرم و حیا کے باعث محبوب کی نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں اور میری

کم نصیبی کے باعث نیچے ٹھکی رہتی ہیں، گویا ان کی حیثیت بظاہر مڑگاں کی ہے

لیکن اسے خدا ! یہی نگاہیں میرے دل کے پار کیوں ہوئی جاتی ہیں۔

مطلب یہ کہ ظاہری کوتاہی کے باوجود دل تک ان کی رسائی اور تاثیر و نفوذ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ چیزیں بیان سے نہیں، احساس سے تعلق رکھتی ہیں جس کا ایک پہلو مڑگاں کی درازی بھی ہے، لیکن مڑگاں انتہائی درازی کے باوجود ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتیں۔ نگاہوں کی تاثیر دور تک جاتی ہے، مگر جو نگاہیں شرم و حیا کے باعث سمٹ کر مڑگاں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، یعنی جھجکی رہتی ہیں، ان کا حسن اور ان کی جاذبیت بھی دیدنی ہے، اسے بیان میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسی دلاویزی کو مرزا نے زیرِ غور شعر میں واضح کیا اور حق یہ ہے کہ اصل نکتے کی توضیح کے لیے اس سے بہتر طریقہ ذہن میں نہیں آسکتا۔

۱۱۔ شرح : میں آہوں کو بار بار سینے میں روکتا تھا اور وہ بار بار جوش و فغا سے ابھرتی تھیں۔ اس طرح پہلے، پے درپے دبانے اور ابھرنے، دبانے اور ابھرنے کا منظر پیدا ہو گیا۔ گویا کپڑے کی سلائی کی سی صورت سامنے آگئی، کیونکہ سلائی یمن بچے میں بھی دھاگہ پیچے اوپر نیچے اوپر ہوتا رہتا ہے۔ اس دھاگہ آہوں کو روکنے اور ابھرنے کا عام منظر تھا۔ بچے کا سلسلہ اٹھ اٹھ آگیا تو مرزا نے اسے چاک گر یاں کی سلائی سے تعبیر کر دیا۔ لطف یہ کہ گریباں عمداً سینے ہی پر سے چاک ہوتا ہے۔

مصنوع محض خیالی ہے، اگرچہ اسے رنگ ایسا دے دیا گیا ہے کہ بالکل واقعی اور فطری معلوم ہوتا ہے۔

۱۲۔ شرح : خواجہ عالی فرماتے ہیں :

”اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہ مستقل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں، دوست کے حق میں صرف کرنے کو ہی نہیں چاہتا۔ شعر میں جو اصل غزل اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گائیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی ضروری بات

برنایا ہر کرتا ہے گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے۔ کیونکہ
سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ، ان کی گالیوں کا کیا
جواب دوں گا۔ جبکہ دعائیں سب نمٹ چکیں۔

شاعر کہتا ہے کہ میں محبوب کے پاس گیا۔ جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں، وہ
سب کی سب دربان کو دے دیں، جس کی مہربانی کے بغیر شاعر اندر داخل نہیں
ہو سکتا تھا۔ پھر محبوب سے ملاقات ہوئی تو اس نے معمول کے مطابق برا بھلا
کہنا شروع کر دیا۔ اب شاعر حیران ہو کر اس پاس والوں سے پوچھتا ہے کہ میں
ان گالیوں کا جواب کیا دوں، صرف دعائیں دے سکتا ہوں، لیکن دعاؤں کے
سلسلے میں مصیبت یہ پیش آئی کہ جتنی مجھے یاد تھیں، وہ دربان کو دے دیں۔ جو
دعائیں دربان کے لیے صرف ہو چکیں، وہ محبوب کے لیے استعمال کرنا مناسب
نہیں سمجھتا۔

شعریں یہ حقیقت واضح کرنا مقصود ہے کہ جتنے وسائل عاشق کے پاس
تھے، وہ سب اصل مقصد کے قریب پہنچنے میں صرف ہو گئے۔ اب مقصد سے
استفادے کے لیے کن نئے وسائل سے کام لیا جائے؟

۱۳۔ شرح : شراب ہاں کے لیے تازگی اور قوت و توانائی کا موجب
ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ آ جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
ساتھ ہی اس کے ہاتھ کی لکیریں دگ جاں بن جائیں گی، یعنی شراب لکیروں کی
رگوں کے ذریعے سے تازہ خون جان تک دوڑا دے گی۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں کہ اس شعر میں لفظ ”گویا“ خاص توجہ کا محتاج
ہے۔ عام شاعر ”گویا“ کا لفظ شعریں بھرتی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، لیکن
اس شعر کی کیفیت بالکل دوسری ہے۔ یہاں شاعر نے اس لیے ”گویا“ کا لفظ
استعمال کیا کہ مبالغہ صدا مکان سے شہباز نہ کر جائے۔ یعنی وہ یہ نہیں کہتا کہ لکیریں
سج جی۔ ہاں بن گئیں، کہتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رگ ہاں بن گئیں۔

گویا مبالغے کو حد کے اندر رکھنا اور اغراق نہ بنانا جو عموماً بڑا سمجھا جاتا ہے۔
 ۱۴۔ لغات - مؤتجد : توحید پرست ، خدا کو ایک ماننے والا۔
 وحدت مباد کا قائل۔

کفیش : ملک و مشرب ، طریقہ۔

رُسوم : رسم کی جمع۔ مراد یہ ہے۔ بہ طور خود اختیار کردہ طور
 طریقے یا جنہوں نے رفتہ رفتہ مستقل مذہبی حیثیت اختیار کر لی۔
 ملت : فرقہ ، گروہ ، قوم ، مذہب۔

شرح : خواجہ ساجی فرماتے ہیں :

- تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے ، جن
 کا ترک کرنا اور مٹانا موحّد کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ
 یہی قیمتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بن جاتی ہیں۔
 مولانا طلبا بٹائی نے اس شعر کی تشریح فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے فرمائی ہے ،
 وہ کہتے ہیں :

”ہم موحّد ہیں یعنی وحدت مباد کے قائل ہیں اور اس کی ذات
 کو واحد سمجھتے ہیں اور واحد وہ ہے ، جس میں نہ تو ”اجزائے مقداری“
 ہوں ، جیسے طول ، عرض وغیرہ اور نہ ”اجزائے ترکیبی“ ہوں جیسے
 بیرونی صورت اور نہ ”اجزائے ذہنی“ ہوں ، جیسے جنس و فعل۔
 عرض اس کا علم محض سلبیات کے ذریعے سے حاصل ہے ، جیسے
 کہیں کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے ، وہ جسم نہیں ہے ، وہ
 متخیّر نہیں ہے ، وہ مرئی نہیں ہے وہ حادث نہیں ہے
 یہی سب سلبیات ہیں کہ ان کے اعتقاد سے اور سب ملتیں
 باطل و منحور ہو جاتی ہیں۔ اور یہی عین اجزائے توحید ہیں۔“

ظاہر ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے اس تصور سے فنی صفات کا راستہ

صاف ہو جاتا ہے۔ ایجاب و اثبات کا کوئی ذریعہ ہاتھ نہیں آتا۔ قرآن مجید نے خدا کا جو تصور پیش کیا، اس کا یہ پہلو تو بالکل واضح ہے کہ جس حد تک انسانی عقل کی پہنچ ہے، صفات باری تعالیٰ کو مخلوق کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے، اسی کو اصطلاح میں تنزیہ کہتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ "تعطیل" کا راستہ کھول دیا جائے، یعنی صفات کی نفی کر دی جائے۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے لیے صفات خیر کا تصور پیدا کیا، ساتھ ہی مشابہت مخلوق کی نفی بھی کر دی۔ وہ خدا کی تمام صفات کو حسن و خوبی کی صفات قرار دیتا ہے یعنی وہ حق ہے، قیوم ہے، رب ہے، قادر ہے، رحیم ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، علیم ہے، لیکن ان صفات کا تصور عام انسانی صفات سے بالکل بالا ہے۔ لہذا ان صفات کی تعبیر مرزا غالب کے اس شعر کے لیے کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتی۔ مقصود یہ نہیں کہ مرزا غالب کے ہر شعر کو اسلامییت کی ترادومین تو لینے کی کوشش کی جائے، تاہم اگر ایسی تعبیر ممکن ہو، جو تعطیل یعنی نفی ثبات کی طرف نہ لے جائے، تو اسے اختیار کر لیتے ہیں تاہم نہ ہونا چاہیے جس حد تک میں سمجھ سکا ہوں، شعر میں بنیادی حیثیت توحید کو حاصل ہے، اسی پر مرزا نے نذر دیا ہے اور توحید ہی ہر چہ اور الہامی مذہب کی اصل بنیاد ہے۔ مرزا سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے مختلف فرقے، گروہ، جماعتیں اور قومیں بنالیں، انہوں نے اختلافات کی بنیاد ان رسوم پر رکھی، جو بطور خود اختیار کر لیں اور وہ مذہب کی بنیاد و اساس یعنی توحید کے تحفظ پر مبنی نہ تھیں۔ میں متوجہ ہوں، میرے سلسلے کا آغاز توحید سے ہوتا ہے بنگرہ ہوں نے توحید کو مرکز نہ مانا اور الگ الگ رسوم کے پابند ہو گئے، وہ دراصل توحید پر ایمان میں سچے اور مخلص نہ تھے۔ اب ان اختیار کردہ رسوم کو ہم جس حد تک ترک کرتے جائیں گے اور توحید کو بنیاد و اساس بنائے رکھیں گے، اصل مقصد سچے عقیدے رہتے جائیں گے، گو یا مختلف گروہوں کے درمیان کش مکش کے

جو سامان موجود ہیں، وہ گھٹتے جائیں گے۔ ان کا زور انفرادیت کے سببان توحید پر ہوتا جائے گا۔ اس طرح یہ خود ساختہ ملتیں، جس قدر ملیں گی، خاص توحید پر سچے ایمان کے اجزا بنتی جائیں گی، واللہ اعلم بالصواب۔

۱۵۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

”یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور بڑا خیال نہیں، بلکہ فیکٹ ہے۔ ایسی غوی سے بیان ہوا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ صند حقیقی یعنی ان کے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حسن مبالغہ کی معراج ہے، جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔“

نفیات کا واضح مسئلہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی رنج و یا اذیت رساں چیز کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کا احساس رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوئے بالکل مٹ جاتا ہے۔ نماز میں التفیات کے وقت انسان بیٹھتا ہے تو ابتدا میں بائیں پاؤں پر خاصا بوجھ پڑتا ہے اور ذرا تکلیف محسوس ہوتی ہے، لیکن نماز کی عادت ہو جانے تو مقام نشست پر ایک گٹا سا پڑ جاتا ہے۔ پھر نشست کے وقت تکلیف کا کوئی احساس نہیں رہتا۔ مرزا یہی پہلو سامنے رکھ کر اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھ پر اتنی مشکلیں اور مصیبتیں مسلسل نازل ہوئیں کہ میں ان کا عادی ہو گیا اور ان سے جو تکلیف پہنچتی تھی، اس کا احساس ہی باقی نہ رہا۔ انسان رنج کا عادی ہو جانے تو اس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مشکلات کا ہجوم اور تواتر ہی میرے لیے آسانی کا موجب بن گیا۔

یہ پہلو ایسے انداز میں پیش کرنا صرف مرزا پر ختم ہے اور بقول حالی مشکلات کا اندازہ صند حقیقی یعنی ان کے آسان ہو جانے سے کرنا حسن مبالغہ کی معراج ہے، یعنی اتنی مشکلات پڑیں کہ چارو ناچار میں ان کا خوگر ہو گیا اور ان سے جو اذیت پہنچ سکتی تھی، اس کا احساس ہی باقی نہ رہا۔ واضح ہے کہ مشکلات ختم نہیں

ہوئیں۔ وہ بدستور قائم ہیں، لیکن ان کا احساس نہ رہا تو ظاہر ہے کہ وہ مشکلیں نہ رہیں۔ خواجہ جانی بجا فرماتے ہیں کہ اس شعر کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔

۱۶۔ **شرح :** اگر غالب اسی طرح دوتا رہا تو اسے دنیا والو! تم

دیکھنا کہ یہ ببتیاں اور آبادیاں جو تمہیں نظر آرہی ہیں، وہ سب کی سب اس کے سیلابِ اٹک میں بر باد و ویران ہو جائیں گی۔ غالب دورِ باجے۔ ابھی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی کہ نوح جیسا طوفان آجائے، لیکن اگر دونا اسی طرح جاری رہا تو یقیناً وہ کیفیت بھی کچھ دور نہ سمجھنی چاہیے۔

ایک لحاظ سے اہل جہاں کے جیسے یہ انتباہ ہے کہ وہ غالب کو یوں روکنے سے روکنے کی کوئی تدبیر کر لیں۔ ورنہ دنیا کے ویران ہو جانے میں کوئی کلام نہیں۔

یہ غزل ۱۳۶۸ کی ہے، کیونکہ یہ ”دہلی اردو اخبار“ کی اشاعت نمبر ۲۸

۲۱۔ شوال ۱۳۶۸ء مطابق ۲۸۔ اگست ۱۳۶۸ء میں شائع ہوئی تھی اور شائع کرتے وقت تہذیب میں لکھا گیا تھا کہ مرزا نور الدین، جو مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے، لکھنؤ سے دہلی آئے تو ساتھ ہی یہ زمین لے کر آئے۔ بادشاہ نے بھی غزل کسی اور مرزا کو بھی غزل کہنے کا حکم دیا۔

خود مرزا نے منشی نبی بخش حقیر کو یہ غزل بھیجی تو ساتھ ہی لکھا:

”بھائی! خدا کے واسطے غزل کی داد دنیا، اگر بچتے یہ ہے تو میرا

میرزا امیر تقی اور میرزا سودا، کیا کہتے تھے؟ اگر وہ بچتے تھا

تو پھر یہ کیا ہے؟“

(نادراتِ غالب)

۱۔ **شرح :** دیوانگی

کے جووش میں ہمارا لباس اس

طرح پادہ پادہ ہو گیا کہ ایک

دیوانگی سے دوش پہ تار بھی نہیں

یعنی، ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیا نہ حسرت دیدار کر چکے !
 دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں
 ملتا تھا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
 دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
 بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اوریاں
 طاقت بہ قدر لذت آزار بھی نہیں
 شہیدگی کے ہاتھ سے ہے سروبالِ موش
 صحرا میں، اے خدا ! کوئی دیوار بھی نہیں
 گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
 یاں دل میں، ضَعْف سے ہوس یا بھی نہیں
 دُنا لہ لہے زار سے میرے، خدا کو مان
 آخر نولے مرغِ گرفتار بھی نہیں
 دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے کشی
 حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
 اس سادگی پہ کون نہ مر جائے لے خدا !
 صحتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تار بھی جسم پر باقی نہ رہا۔
 جسے ہم نہ تار قرار دے لیتے
 اور سمجھتے کہ صنم پرستی کے
 مذہب کا ایک نشان تو ہمارا
 جسم پر موجود ہے۔

۲۔ شرح : ہمدرد
 دل محبوب کے دیدار کی
 حسرت میں ختم ہو گیا، گویا
 وہ اس حسرت کی حدیثِ چڑھ
 گیا، لیکن اپنی حالت پر غور
 کیا تو معلوم ہوا کہ ہم میں
 محبوب کے دیدار کی تاب د
 تو اس بھی موجود نہیں۔ یہی
 جس مقصد کے لیے ہم نے
 زندگی کے بہترین مواقع
 صرف کر دی، اس مقصد
 سے فائدہ اٹھانے کی ہم
 میں طاقت ہی نہیں۔

۳۔ شرح : خود
 مرزا غالب قاضی عبدالحمل
 جنونِ برعلوی کو اس شعر کی
 شرح یوں لکھتے ہیں :
 ” اگر تیرا انا آسان

نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے دیکھا اسد کو خلوت و خلوت میں بارہ
 خیر تیرا ملنا آسان نہیں نہ دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
 سہی نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی
 نہیں جس سے تو نیا ہوتا ہے، مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے
 سہل کر لیا تھا، رشک کو اپنے اوپر سہل نہیں کر سکتے۔
 خواہجہ جانی فرماتے ہیں :

۱۔ ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب
 ہو جانا ایک عجیب اتفاق ہے۔ اس معنوں کو چاہو حقیقت کی
 طرح لے جاؤ۔ چاہو مجاز پر محمول کرو۔ دونوں صورتوں میں مطلب
 یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ وقت
 نہ ملتی، کیونکہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی غلش
 سے چھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں،
 اسی طرح دشوار بھی نہیں۔ اس لیے شوق و آرزو کی غلش سے
 کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

خواہجہ جانی مرحوم نے شوق و آرزو کی غلش سے چھوٹنے کا جو ذکر کیا، وہ
 میرے نزدیک مرزا غالب کے معنوں میں ایسا اماندہ ہے جس کے لیے بظاہر کوڑ
 گھاٹش نہیں۔ مرزا کا معلوم صرف یہ ہے کہ ہجر کو برداشت کر لیا، رشک برداشت
 نہیں ہو سکتا۔ شوق و آرزو کی غلش قائم ہے، لیکن مفارقت پر ہم صبر کر سکتے ہیں
 غیر کا تجھ سے ملنا گوارا نہیں ہو سکتا۔

۴۔ شرح : زندگی عشق کے بغیر سبر نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کے
 لیے کوئی نہ کوئی لگن چاہیے، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو۔ لیکن ہر عشق اور مہر لگن
 میں انسان کو دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ مصیبتیں جھیلنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہماری

حالت یہ ہے کہ آتنی طاقت ہی نہیں، جو دکھ سہ لینے اور مصیبتیں جھیل لینے کے لیے ضروری ہے۔ لطافت یہ کہ محض دکھوں کا ذکر نہیں کیا، بلکہ دکھوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے لذت اندوز ہونے کا ذکر کیا۔ ”لذتِ آزار“ دو وجہ سے قابلِ توجہ ہے۔ اول یوں کہ جب تک شوق سے دکھ نہ اٹھائے جائیں، عشق کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا، دوم یہ کہ اگر دکھ اٹھانے میں ایک خاص لذت نہ ہو تو کون اسے قبول کرے گا اور کیونکر ممکن ہے کہ اس حالت میں اصل مقصدِ عشق کے لیے سعی و کوشش جاری رہے؟

۵۔ لغات - شوریدگی : دیوانگی، پریشانی، آشفتگی۔

شرح : حالت جنوں میں پریشانی اور آشفتگی کا یہ عالم ہے کہ سرگردانوں کے لیے ایک مصیبت خیز بوجھ بن گیا ہے، لیکن صحرا میں بسر ہو رہی ہے۔ وہاں کوئی دیوار بھی تو موجود نہیں کہ اس سے سر پھوڑ لوں اور اس دباں سے نجات پاؤں۔

۶۔ شرح : ضعف کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس میں رقیبوں سے دشمنی کی سائی تو کیا ہوتی، خود محبوب کی آرزو بھی باقی نہیں رہی۔

شرح کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ محبوب کی آرزو باقی نہیں رہی۔ مرزا کا مطلب ضعف کی انتہا ثابت کرنا ہے اور اس کے لیے اس سے بہتر پیرایہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنا کمزور ہو چکا ہوں دل میں محبوب کے لیے آرزو بھی موجود ہی نظر آتی ہے۔

۷۔ شرح : اسے محبوب، امیری و دبھری مزیاؤں و فغاں سے دور اور خدا کا خوف کر۔ کیا یہ مزیاؤں و فغاں اس پرندے کا درد بھرا گیت ہے جو چرے میں بند ہے، مطلب یہ کہ میری مزیاؤں و فغاں ایسی بے اثر نہیں، جیسی کسی قیدی پرندے کی صدا ہو سکتی ہے۔

۸۔ لغات - رُکوکشی : مقابلہ

شرح : دل میں محبوب کی صوفِ مژگاں کے سامنے ڈٹ جانے کا ارادہ ہے۔ یعنی ارادہ کیے بیٹھے ہیں کہ تیر پر تیر کھائیں گے اور سامنے سے نہیں ہٹیں گے، حالانکہ دل کی حالت دیکھی جائے تو ایک کانٹے کی غش بھی برداشت کر لینے کی ہمت نہیں رکھتا۔

یہ شعر ان لوگوں کی کیفیت کا نہایت عمدہ اور مکمل مرتع ہے، جو بڑے بڑے عزائم دل میں لیے بیٹھے ہوں، لیکن ان کی خاطر خفیف سی بھی زحمت اٹھانے سے گریزاں ہو، حالانکہ کوئی بڑا عزم اور کوئی بڑا مقصد انتہائی محنتیں مشقتیں اور اذیتیں اٹھائے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔

۹۔ شرح : محبوب کی اس سادگی اور سہولت پر کون جان دے دینے کے لیے آمادہ نہ ہو گا کہ لڑ رہے ہیں، لیکن ہاتھ میں تلوار بھی موجود نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ محبوب تیغ و خنجر سے نہیں لڑا کرتا، اس کی لڑائی حسنِ جمالِ حمزہ واداد اور ناز و انداز کے بل پر ہوتی ہے۔ اسے مرزا نے سادگی قرار دے لیا اور کہا: یہ سادگی ہی ایسی چیز ہے کہ ہر شخص اس پر جان قربان کر دے۔ تلوار لے کر چلاتے تو اس کا انجام بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟

مولانا شبلی نے پہلی جنگِ یورپ پر ایک نظم کہی تھی جس کا مناد یہ تھا کہ ایک جرمن نے عزو میں آکر کہا کہ ہماری فتح آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں، برطانیہ کی فوج تعداد میں بھی کم ہے اور تیار بھی نہیں، فرانس دند ہے، اسے جنگ سے کیا کام؟ میں نے کہا کہ ٹوٹلے کتا ہے۔ ہم اہلِ ہند جرمنوں سے دس گئے ہیں، وہ حمزہ سے میری بات سن رہا ہے۔ پھر اس نے جو کچھ کہا، وہ لائقِ اظہار نہیں، کہا!

اس سادگی پر کون نہ مرجائے اسے خدا!

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مرزا غالب کے شعر کا آفاقی پہلو ملاحظہ ہو کہ اس سے ایک خاص بنگی

بحث میں بھی کام لے لیا گیا۔

۱۰۔ تشریح : ہم نے اسد یعنی غائب کو تنہائی اور مجلس دونوں حالتوں میں بار بار دیکھا۔ اگر تم اسے دیوانہ اور پاگل نہیں سمجھتے تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ عقل و فہم سے کوئی سروکار رکھتا ہے، یعنی وہ ہوشیار ہے۔

۱۔ لغات
در خور :
لائق۔
چشم سوزن :
سوئی کا ناکہ۔
تشریح :
میرے بدن کا
کوئی بھی زخم
مجھے جانے کے
قابل نہ سمجھا
گیا۔ اس سے
انتہائی یابوسی
ہوئی۔ سوئی
کی آئینہ یعنی
ناکے میں جو
دعا گاتا ،
وہ یابوسی کے
آنسوؤں کا تار

نہیں ہے زخم کوئی بجھے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشک یاس، رشتہ چشم سوزن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے بہ رنگِ پنہ روزن میں
ودیعت خانہ بیداد کاوشمائے شرکاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے، مرا ہر قطرہ خوں تن میں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہم ہو، جو رکھ دیں پنہ دیواروں کے روزن میں
نکو ہش مانعِ بے ربطی شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احبابِ بخیمہ حبیب و دامن میں
ہوئے اُس ہروش کے جلوؤ تمثال کے آگے
پرافشاں جو ہر آئینے میں، مثلِ ذرہ روزن میں

بن گیا۔
 نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
 جو گل ہوں تو ہر گلشن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
 ہزاروں دل دیے جوش جنونِ عشق نے مجھ کو
 سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں
 اسد! زندانی تاثیر الفتہائے خواباں ہوں
 خیم دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں
 شرم، کوئی خاص
 بات نہیں،
 زخم، بخیمہ،
 تار، اشک
 چشم، رشتہ
 سوزن وغیرہ
 الفاظ کی
 مناسبت ظاہر ہے۔

۲۔ لغات - مانع : روکنے والا۔

مشرح : ہمارے گھر کا برباد ہونا نظارے کے ذوق میں بھی
 رکاوٹ بن گیا۔ جو سیلاب آیا تھا اور گھردیران کر گیا۔ اس کا حباگ
 روٹی کی طرح روشن دان میں نظر آ رہا ہے۔

جن لوگوں نے ندیوں اور دریاؤں کے کنارے کی آبادیوں میں رہ کر
 تجربہ کیا ہے یا ان کی کیفیت دیکھی ہے، انہیں معلوم ہے کہ جب طبعانی
 آتی ہے اور پانی زور شور سے چڑھتا ہے تو جہاں جہاں آبادی میں اسے
 راستہ ملتا ہے، نکل جاتا ہے۔ جہاں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے وہاں پانی
 کا جوش حباگ لے آتا ہے، جو گردش و اونٹن یا دوسرے چھوٹے چھوٹے
 شگافوں میں ٹپک کر جم جاتا ہے۔ اسی منظر کے پیشِ نظر مرزا غالب نے
 یہ شعر کہا۔ یعنی سیلاب آیا، گھردیران ہو گیا۔ روزوں اور شگافوں میں
 حباگ ٹپک گیا۔ اب یہ اندر بیٹھے ہوئے باہر کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔
 روزن کے سوا کوئی جگہ نہیں، جہاں سے دیکھ سکیں۔ اس میں حباگ اٹکا

ہوا ہے اور باہر کی کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ یوں غار دیرانی ذوقِ نظر میں
کلاوٹ بن گئی۔

۳۔ لغات : دو لغت : امانت ، دو لغت خانے سے مراد ہے
وہ مکان ، جہاں لوگوں کی امانتیں محفوظ رہیں۔

نگین : انگشتری کا نگینہ جس پر مالک کا نام کندہ ہوتا ہے۔
شرح : محبوب کی پلکوں نے چُہچُہے کہ جو ظلم کیے ، میں ان کا امانت
بن گیا ہوں۔ میرے بدن کے خون کا ایک قطرہ ایسا ہے ، جس پر نگینے کی طرح
محبوب کا نام کندہ ہو چکا ہے۔

یہ شعر میں گوہِ کندن و گاہِ بر آوردن کی حیثیت رکھتا ہے مرزا غالب
پہلے بھی کہ چکے ہیں۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا چڑا حساب

خونِ بکر دو لغت مرزا گانِ یار تھا

۴۔ لغات : ظلمت گستری : ظلمت آرائی۔ اندھیرے کا پھیلاؤ۔

شبستان : رات بسر کرنے کی جگہ۔ گھر۔

شرح : میرے شبستان میں اندھیرے کا پھیلاؤ جو صورت اختیار کر

چکا ہے ، اس کی کیفیت کون بیان کر سکتا ہے ؛ حالت ہے کہ اگر روٹی
کا کوئی گالا دیواروں کے روزنوں میں رکھ دیں تو ایسا منظر پیدا ہو جائے ،
گویا پاندی چٹکی ہوئی ہے۔

پہلے ایک شعر میں روٹی کے اسی گالے کو نورِ صبح مزیایا تھا۔

کیا کہوں تارِ یکی زندانِ خمِ اندھیرے

پنسہ نورِ صبح سے کم اس کے روزن میں نہیں

۵۔ لغات : نکو ہش : علامت ۔ تاویب ۔

شرح : دوستوں نے میرے شورِ جنوں کی بے ریلی اور سہلے آواز

حاصل کی۔ میری ہنسی اڑائی۔ اس وجہ سے شور جنوں رک گیا۔ گویا دوستوں کا خندہ دندان نما وہ ہنسی جس میں راحت ظاہر ہو جائیں، میرے جیب اور دامن کے چاک کے لیے بخیہ بن گیا۔ یعنی وہ چاک رفو ہو گئے اور شور جنوں ختم ہو گیا۔

خندہ کو خندہ دندان نما سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اسے نیچے سے مشابہت پیدا ہو جائے۔

بے ربطی شور جنوں اس لیے کہا کہ جنوں کا ہر فعل بے ربط و مضطر ہوتا ہے۔

۶۔ لغات - ہر دوش : سورج جیسا۔

تمثال : صورت، پیکر، تصویر۔

براقشال : پر پھڑ پھڑانے والا۔

شرح : میرے سورج جیسے محبوب کا پیکر جلوہ افروز ہوا تو اس کے آگے آنیے کے جوہر اسی طرح اڑنے اور پر پھڑ پھڑانے لگے، جیسے سورج کی کرنوں میں روزن کے اندر چھوٹے چھوٹے ذرے بیتابانہ اڑتے نظر آتے ہیں۔ یعنی آنیے کے جوہر اس کے جلوے کا مقابلہ نہ کر سکے۔

۷۔ لغات - گلخن : بھٹی - بھاڑ۔

شرح : مجھے کچھ خبر نہیں کہ اچھا ہوں یا بُرا، لیکن یہ جانتا ہوں کہ میرا حول سازگار نہیں۔ جس دائرے میں مجھے رکھا گیا ہے، اس کے ساتھ میرے لیے موافقت و مناسبت کی کوئی صورت نہیں۔ اگر میں اچھا ہوں تو میری مثال پھول کی سی ہے، جیسے محبوبوں کی زلفوں میں لگے یا بستر کی زینت بننا چاہیے۔ اس کے برعکس مجھے بھٹی میں ڈالی دیا گیا ہے۔ اگر میں بُرا ہوں تو سمجھنا چاہیے کہ میری حیثیت گھاس پھوس اور خس و خاشاک کی ہے، گویا مناسب مقام بھٹی ہے، لیکن مجھے باغ میں رکھا گیا ہے، جہاں خس و خاشاک

کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا اور اٹھا کر باہر پھینکنے کی کوشش کرتا ہے۔
 ہندیت مختلف نظموں میں دو عام تشبیہوں سے نیک و بد اور ناسازگارئی ماحول
 کی کیفیت اس طرح بیان کر دی کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔

۸۔ شرح : میرے بدن کے خون کا ہر قطرہ جنونِ عشق کے
 باعث سیاہ ہو کر سودا بن گیا، یعنی اس سیاہ نقطے کی صودت اختیار کر گیا
 جو دل میں تصور کیا جاتا ہے۔ گویا ہر قطرہ ایک دل کی صودت اختیار کر گیا
 اس طرح جنونِ عشق کے جوش نے میرے لیے ہزاروں دلی متیا کر دیے۔
 جتنی نقطہ نگاہ سے معلوم ہے کہ سودا یعنی جنون کا رنگ سیاہی
 مائل ہوتا ہے، اسی لیے اسے سودا کہتے ہیں۔ یعنی کالا۔

۹۔ لغات - زندانی : قیدی، اسیر۔
 شرح : اے استاد! میں حینوں کی تاثیرِ محبت کا قیدی ہوں۔
 انھوں نے مہربان ہو کر میرے گلے میں بانیں ڈال دیں، وہی بانیں میرے
 لیے اسیری کا ایسا طوق بن گئیں، جس سے رہائی پانا ممکن نہیں۔
 تاثیرِ الفت اس لیے کہا کہ محبت نے اثر پیدا کیا اور حسینِ خلافت
 عادت اتنے مہربان ہوئے کہ اس کے گلے میں بانیں ڈال دیں۔

۱۔ شرح : ہماری
 نگاہ میں دنیا کی لذتیں
 اور راحتیں ہیج رہ گئی
 ہیں۔ بیشتر خونِ جگر پینے
 میں مزہ آتا تھا اور یہی
 سہارا دستور تھا کہ خون
 پی کر زندگی گزارا کرتے
 مزے جہان کے اپنی نظریں خاک نہیں
 سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
 مگر غبار ہو سے پر ہوا اڑا لے جائے
 وگرنہ تاب و توانِ بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
 کہ غیر جلوۂ گلِ رہگزر میں خاک نہیں
 بھلا اُسے نہ سہی، کچھ بھی کو رحم آتا
 اثرِ مرے نغمے بے اثر میں خاک نہیں
 خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
 شرابِ غائبانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
 ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
 سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں
 ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدا
 کھلا کہ فائدہ عرض بہز میں خاک نہیں

۲۔ لغات - مگر : شاید۔

تھے، گراب بگڑیں بھی
 کچھ باقی نہیں رہا۔ خرم
 کی جتنی دولت تھی، وہ
 سب ہم نے صرف کر ڈالی۔
 شعر میں قابلِ حذر
 نکتہ یہ ہے کہ خونِ بگڑینا
 کسی کے لیے بھی باعثِ
 راحت نہیں ہو سکتا، لیکن
 مرزا اس کے عادی ہو
 گئے تھے اور اسی میں طبع
 لیتے تھے۔ اب انتخابی
 دکھ کی یہ چیز بھی، جس
 سے عادی ہونے کے
 باعثِ نطف آئے لگا
 تھا، ختم ہو گئی۔

شرح : میرے بال و پر میں اب طاقت و قوت بالکل باقی نہیں
 رہی۔ گویا یہ ممکن نہیں کہ میں خود اڑ کر اپنے آشیانے یا محبوب تک پہنچ سکوں
 البتہ یہ ممکن ہے کہ اب میں پرے پرے فرسودگی سے گرد و غبار بن جاؤں
 اور ہوا اسے اڑا کر حنزلِ مقصود پر پہنچا دے۔

۳۔ لغات - شمائل : شید کی جمع، سرشت، طبیعت،

خلعت، عادت۔

شرح : یہ کون سے بہشت جیسے شمائل و سرشت کے محبوب کی

آمد آمد ہے کہ راستے میں خاک کے بھائے پھولوں کا جلوہ نظر آتا ہے ۔

جس محبوب کی خصلتیں بہشت کی سی ہوں اور اس کے ذوق میں بھی انتہائی نفاست نمایاں ہو ، ظاہر ہے کہ وہ آئے تو گرد و غبار کا مستحل نہیں ہو سکتا ۔ ہاں ، خاک کی جگہ پھولوں کا جلوہ ہو تو بات بنتی ہے ۔

۴ - شرح : اگر محبوب کو میری مزید و فضاں پر رحم نہ آیا تو خیر خود مجھے تو اپنے آپ پر رحم آنا چاہیے تھا ۔ اگر میری مزید و فضاں میں اتنا اثر نہیں تھا کہ محبوب کو متاثر کر سکتا تو خود مجھے تو ضرور متاثر کر دینا چاہیے تھا لیکن ظاہر ہو گیا کہ میری مزید و فضاں بالکل بے اثر ہے ۔ یہ محبوب پر تو کیا اثر کرے گی ، ستم یہ ہے کہ مجھ پہ بھی کچھ اثر نہیں کرتی ۔

۵ - لغات - خراب : مست ، مدہوش ۔

شرح : شراب پینے والے جلوہ گل کے تصور سے مدہوش ہو گئے ہیں ۔ شراب خانے کے دیوار و در میں تو کچھ بھی نہیں ۔

جلوہ گل سے اشارہ بہار کی طرف ہے ۔ بظاہر مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب خانے میں تو کچھ بھی نہیں رہا ۔ اس کے دیوار و در میں تو خاک اڑ رہی ہے ۔ اب شراب نوش صرف بہار کے خیال سے بدست ہیں ۔

۶ - شرح : عشق نے میرا سب کچھ برباد کر دیا ۔ اب میرے گھر میں تعمیر کی حسرت کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ۔ یعنی پھر سے سب کچھ بنالینے کی آرزو ہے ، لیکن بنالینے پر قدرت حاصل نہیں وہ آرزو حسرت بن کر رہ گئی ہے ۔ عشق بدستور غارت گرمی میں لگا ہوا ہے وہ بربادی کی ٹو جھوٹ نہیں سکتا ۔ میں شرمندہ ہوں کہ اس کے ذوقِ غارت کی تسکین کے لیے کیا پیش کروں ؟

۷ - شرح : اے استاد ! اب ہم صرف دل لگی کی خاطر شکر کہتے ہیں ورنہ جو غرہ تھا کہ ہم صاحبِ ہنر ہیں اور دنیا کو اپنے جوہر دکھائیں گے تو

سمو کر رہیں گے، وہ ختم ہو گیا۔ ہم نے دیکھ لیا کہ ہنرمندی کی کوئی بات پیش کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ یہ لوگ ہنر کو پہچان نہیں سکتے، اس کی قدر نہیں کر سکتے، لہذا ہم ان کے لیے کیا لکھیں؟ اب تو صرف اپنے دل کی تسکین کے لیے کچھ لکھ لیتے ہیں۔
معاشرے کی خیرہ ذاتی پرکٹنا بڑا طعنہ ہے۔

۱۔ تمہید:

یہ غزل دہلی اور دہلی اخبار کی اشاعت

بابت ۴۰۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۹ھ مطابق

۱۳۔ فروری ۱۹۵۰ء

میں چھپی تھی۔ تمہید میں جو عبارت لکھی

گئی تھی، اس کا مفاد یہ تھا کہ مرزا

نور الدین دہلوی

سیماں بگلوہ جھٹکے

ہر شاہی دہلی آئے اور انہوں نے

شاہی دربار اور مشاعروں میں شعر گوئی کے کلمات

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و نشت، ورنہ سے بھرنا آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں، حرم نہیں، ورنہ نہیں، آستان نہیں

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دل فروزا، صورتِ مہر نیم روز

آپ ہی ہو نظارہ سوزا پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشہ غمرہ جاں تاں، ناوکِ ناز بے پناہ

تیرا ہی عکس رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے سجات پائے کیوں؟

حُسن اور اس چُسن ظنِ برہ گئی بُو الہوس کی شرم

اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟

وہ غور و غزو نماز، یاں یہ حجاب پاس وضع
 راہ میں ہم ہیں کہاں؟ ہزم میں وہ بلائے کیوں؟
 ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
 جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟
 غالب خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
 رویے زار زار کیا؟ یکجہے ہاے ہاے کیوں؟
 دکھائے بہادر شاہ ظفر نے
 مرزا غالب سے
 مرزاں کی کوئی
 ایسی غزل کہ
 ہائے جس پر
 مصرع لگانا دشوار
 بلکہ ناممکن ہو۔
 چنانچہ مرزا غالب

نے یہ غزل کہی اور مرزا نور الدین نے - ادنیٰ خورد تامل میں کہاں محبت سے
 محسّس تیار کر کے پڑھ دیا اور سب حضار دربار والا نے نہایت پسند کیا۔ حضور نے
 پانچ دفعہ اس محسّس کو پڑھوایا اور بہت خوش ہوئے :-

مرزا نور الدین کا محسّس سامنے نہیں کہ اندازہ کیا جاسکے، وہ کیسا تھا۔
 درباریوں اور بہادر شاہ کی پسندیدگی یا خوشنودی کوئی معیار نہیں۔ مرزا نور الدین
 شاہی خاندان کے مزدوتھے، اس لیے سب انھیں شہزادہ سمجھ کر اندھا دھڑ
 ستائش کرتے تھے اور بہادر شاہ ظفر کے اسلوب کلام سے بھی واضح ہے کہ
 ان کا ذوق کس قسم کا تھا۔

شرح : ہمارے پیو میں دل ہی تو ہے، جوتانے اور دکھ دینے
 سے الم زندہ ہو جاتا ہے، اینٹ اور پتھر تو نہیں کہ اس پر کچھ اثر ہو۔ اگر
 ہمیں دکھ پہنچے گا تو ہزار بار روئیں گے۔ یہ بتاؤ کہ کسی کو ہمیں دکھ دینے
 کا کیا حق ہے؟

شعر کی وضع و سیاق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب ستم زندہ عاشق سے
 کہ رہا ہے، ہم مزدور ظلم و ستم جاری رکھیں گے۔ تمہیں ہرگز دونا نہ چاہیے

اور سب کچھ صبر و تحمل سے برداشت کر لینا چاہیے۔ غریب عاشق پریشان ہو کر کہتا ہے کہ میرے پہلو میں اینٹ یا پتھر کا بے حس ٹکڑا نہیں، دل ہے، جو الم اگینز سلوک پر درو سے بھرا کرتا ہے۔ ہم تو ضرور روش گئے، کوئی ہمیں ستا تا کیوں ہے؟

لفظ ”کوئی“ سے مراد محبوب ہے، کیونکہ عاشق کو محبوب کے سوا کوئی نہیں ستا سکتا، لیکن ”کوئی“ کے لفظ سے اجنبیت ظاہر ہے اور جب انسان ظلم و ستم سے گھبرا جائے تو وہ ستانے والے کا نام لینے یا اسے براہ راست مخاطب کرنے کے بجائے ایسے ہی لفظ استعمال کرتا ہے، جن سے اُک گونہ اجنبیت یا تکلیف ٹپکتی ہو۔

۲۔ شرح : ہم بہت خدشے کے سامنے نہیں بیٹھے کہ پنڈتوں اور برہمنوں کو ہمیں اٹھا دینے کا حق ہو۔ ہم نے کبھی کے دردِ اذہ پر نشست نہیں جہانی کہ ارباب انتظام ہمیں اپنے خیال کے مطابق زند یا بے مشرب سمجھ کر اٹھانے کے وہ پے ہوں۔ ہم نے کسی محبوب یا کسی بڑے آدمی کا دردِ اذہ نہیں سنبھالا۔ کسی کے آستانے پر ڈیرا نہیں جمایا۔ ہم تو راستے کے کنارے بیٹھے ہیں، جو گزرگاہ عام ہے۔ پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ہمیں اٹھائے؟

مولانا طبعاً جانی فرماتے ہیں کہ اس شعر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے

۳۔ لغات۔ مہر نیمروز : دو پہر کا آفتاب، جس کی طرف نظر اٹھانے ہی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ یعنی وہ ”نظارہ سوز“ ہوتا ہے۔

”منہ چھپانے کیوں“ کے معنی بدابہت دو ہیں۔ اول یہ کہ اسے منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ دوم یہ کہ اس نے منہ چھپایا ہی نہیں، بالکل بے نقاب اور آشکارا ہے۔

شرح : میرے محبوب کے جمال سے دل میں روشنی اور نور پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی دو پہر کے آفتاب کی طرح وہ جمال اس درجہ بے پناہ ہے کہ اس

کی طرف آنکھ نہیں اٹھ سکتی۔ جو آنکھ اٹھے گی، معاً چن دیا جائے گی اور اس جمال سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے گی۔ جب حالت یہ ہے تو اسے پردے میں چھپے رہنے کی کیا ضرورت ہے ؟

پردے میں چھپنے کا مقنا یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے جب آنکھ میں اسے دیکھنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں تو پردہ بالکل بے سود ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا، دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ واقعی پردے میں چھپا ہوا نہیں، بلکہ پوری شان سے جلوہ آ رہا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے جمال سے کوئی لطف اندوز نہیں ہو سکتا، کیونکہ کسی نگاہ کو اسے دیکھنے کی ہمت ہی نہیں۔

خواجہ حاتی کے قول کے مطابق یہ شعر مہاز اور حقیقت دونوں پر محمول ہو سکتا ہے، حقیقت پر بعد جہاز یادہ، کیونکہ وجود حقیقی کائنات میں نمایاں اور آشکارا بھی ہے اور پنہاں و مستور بھی۔ ہر اس ہمہ کوئی اس کے جمال سے براہ راست بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔

۴۔ لغات۔ دشنہ : خنجر۔

جانستاں : جان لیوا۔

نادک : تیر۔

مشرح : غزنے کا خنجر جان لیوا اور ناز کا تیر اس درجہ سخت ہے کہ کوئی نہاد اس سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ ہم نے مانا کہ تو ہی اپنا چہرہ آئینے میں دیکھنا چاہتا ہے، لیکن خدا کے لیے عزم کہ کہ ناز و ادا کی ان تلواروں اور تیروں سے تیرا کیا حال ہو گا ؟ ضروری ہے کہ تو اپنا چہرہ آئینے میں نہ دیکھے تاکہ وہ صورت، جس نے دنیا کو زخموں سے تڑپا رکھا ہے، تیرے لیے بھی کسی آفت کا باعث نہ بن جائے۔ تیرے سوا تو جتنے تھے وہ تڑپ کر گر گئے، تو اپنے آپ کو کیوں ایسے خطروں میں ڈال رہا ہے ؟

۵۔ **شرح :** زندگی کا ایک وقت معزہ ہے، جسے بسر کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ ساتھ ہی ہم کا سلسلہ لگا ہوا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اصلہً ایک ہیں لہذا ممکن ہی نہیں کہ انسان زندگی کی میناد پوری کیے بغیر غم سے نجات حاصل کرے۔ جب دونوں چیزیں اصل میں ایک ہوئیں تو ہر حال میں ساتھ ساتھ رہیں گے اور دونوں اکٹھی ختم ہوں گی۔

یہ بھی ایک حکیمانہ نکتہ ہے، جو نہایت بڑا تاثیر انداز میں بیان کیا گیا ہے زندگی نام ہے احساسات و ادراکات کا۔ جب تک قوتِ احساس باقی ہے، انسان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ اس دنیا میں پہلے پھرے، زندگی گزارے اور ماحول سے متاثر نہ ہو۔ یہ متاثر بعض اوقات وقتی طور پر مسرت و نشاط بھی پیدا کرتا ہے، لیکن انجام اس کا بھی غم کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً کوئی اچھی چیز کھائی یا دیکھی، پھر وہ چھٹی یا جاتی رہی، جس کا نتیجہ غم کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ غرض جب تک دنیا کی احساس بھری زندگی قائم ہے۔ غم زندگی کے لیے ایک ناگزیر شے ہے، جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں غم اسی وقت جانے گا، جب زندگی ختم ہوگی اور زندگی کے غموں کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

۶۔ **لغات -** بواہوس : ہوا و ہوس سے بھرا ہوا، یعنی غیر۔
شرح : مرزا غالب نے تاحی عبدالمجید جنون کو اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے :

”مولوی صاحب ! کیا لطیف معنی ہیں ! داد و دینا۔ حسنِ عارض اور حسنِ نکل دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں، یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا بھیج ہے، کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیرا سزا خطا نہیں کرتا پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں

کسے : حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ، ورنہ یہاں محبوب نے مغالطہ کھایا تھا ، رقیب عاشق صادق نہ تھا ، ہوس ناک آدمی تھا ، اگر پائے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی :

شعر کے معنی بالکل واضح ہو گئے ۔ یعنی رقیب نے عشق نہیں ، محض ہوس کی بنا پر محبت کا دعویٰ پیش کر دیا ۔ محبوب حسین بھی تھا اور اسے اپنے بارے میں انتہائی حسن ظن بھی تھا ، یعنی یہ کہ میں جس پر ایک نظر ڈال دوں ۔ وہ عاشق ہوے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ۔ اس وجہ سے امتحان لیے بغیر ہی محبوب کو رقیب کے عشق کا یقین ہو گیا ۔ اپنے حسن پر اعتماد اور حسن ظن پر اعتماد کی بدولت رقیب کی آزمائش کا وقت ہی نہ آیا ۔ یوں اس کی شرم رہ گئی اور بھرم نہ کھلا ۔ اگر امتحان کی لزبت آ جاتی تو رقیب کے لیے یقیناً بڑی مصیبت پیش آتی ۔

۷۔ لغات ۔ پاس وضع : وضع داری کا لحاظ ۔

شرح : شعر میں لغت و نشر غیر مرتب ہے ۔ یعنی غرور عز و ناز کا تعلق ہے ، بزم میں نہ لانے سے اور حجاب پاس وضع کا تعلق ہے راہ میں نہ لینے سے ۔

محبوب کو اپنے وقار و تمکین کا غرور ہے ، لہذا وہ ہمیں بزم میں لانے پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتا ، کیونکہ لانے سے اس کے غرور کو صدمہ پہنچے گا ۔ ہم اپنی وضع داری کے لحاظ میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ ہمیں یہ شرم ماسخاتی ہے کہ راستے میں اس سے کہاں ملیں ، کیونکہ راستے میں محبوب سے ملنا وضع داری کے خلاف ہے ۔ عزمن اس غرور عز و ناز اور اس حجاب پاس وضع کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبوب اور عاشق میں ملاقات کی کوئی صورت نہ رہی ۔ راہ میں ملنا اور بات کرنا مشکل اور بزم میں بلایا جاتا غیر ممکن ۔

۸۔ شرح : شعر کے اسلوب سے ظاہر ہے کہ لوگ مرزا کو سمجھا

رہے ہیں، تو کس مصیبت میں پڑ گیا ہے ؟ جسے محبوب بنائے بیٹھا ہے اسے
 نہ خدا سے کوئی واسطہ ہے، نہ دغا سے۔ وہ منکر بھی ہے اور بے وقاف بھی۔
 تیرا دین بھی برباد ہو گا اور دل بھی عمر بھر بے وقافی کی ٹھوکریں کھائے گا۔
 مرزا ان سمجھانے والوں کی بات کاٹتے ہوئے کہتے ہیں : اچھا بھئی ! ہم نے
 مانا، ہمارا محبوب کافر بھی ہے اور بے وقاف بھی لیکن تم میں سے جسے اپنا دین
 اور اپنا دل پیارا ہے، وہ اس کی گلی میں کیوں جاسے، جہاں دونوں برباد ہونگے
 ہم تو دین و دل دونوں برباد کر چکے۔ ہمیں تمھاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔
 مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس زمین میں یہ شعر بھی بیت الغزل
 ہے۔ اس معاملے کی طرف اشارہ ہے کہ لوگ سمجھا رہے ہیں اور یہ ان کی
 بات کاٹ رہے ہیں۔

۹۔ شرح : غالب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب وہ اپنے
 کسی رفیق کی زبان سے دوستوں، عزیزوں اور ماتم داروں کو سمجھا رہے ہیں
 کہ بھئی ! زار زار رونے اور ہائے ہانے کرنے سے کیا فائدہ ہے ؟ کیوں
 اس طرح ماتم کیا جائے ؟ ایک خستہ حال غالب کے بغیر دنیا کے کون
 سے کام رک جائیں گے ؟ ماتم چھوڑو اور مہر سے کام لو۔

۱۔ شرح :

میں نے پوچھا کہ بوبر
 کیونکر دیا جاتا ہے ؟
 تو نے دُور سے مجھے
 ایک منہ بند یعنی
 ناشگفتہ کلی دکھادی
 اس کے دکھانے سے

غیچہ ناشگفتہ کو، دُور سے مت دکھا کہ یوں
 بوبر سے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
 پریش طرز دلبری کیجیے کیا کہ بن کے
 اس کے بہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کر یوں

رات کے وقت مے پیو، ساتھ رقیب کو یہ
 آئے وہ یاں خدا کرے! پر نہ کرے خدا کہ یوں
 ”غیر سے رات کیا جنی؟“ یہ جو کہا تو دیکھیے
 سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ ”یوں“
 بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خوش بیٹھے
 اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی ”مدعا کہ یوں“
 میں نے کہا کہ ”بزم ناز چاہیے غیر سے تھی،
 سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ ”یوں“؟
 مجھ سے کہا جو یار نے سباتے ہیں ہوش کس طرح؟
 دیکھ کے میری بخودی، چلنے لگی ہوا کہ ”یوں“
 کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
 آئینہ دار بن گئی، حیرت نقش پا کہ ”یوں“
 گرتے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
 موج محیط آب میں، مارے ہے دست و پا کہ یوں
 جو یہ کہے کہ ”ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی،
 گفتہ غالب ایک بار، پڑھ کے اُسے سنا کہ ”یوں“

کیا فائدہ؟ میں نے
 تو یہ سوال کیا ہے،
 منہ سے بوسے لے
 کر جاکیوں لیا
 جاتا ہے۔

اس میں خوبی
 صرت یہ ہے کہ
 بوسہ لیتے وقت
 منہ کا نقشہ بالکل
 ناگفتہ کل کا سا
 ہوتا ہے۔

۲۔ شرح:

میں محبوب سے
 دل لینے کا طریقہ
 کیا پوچھوں؟ کچھ
 بتائے بغیر ہی اس
 کے ہر اشارے
 سے کوئی نہ کوئی
 ہوا ٹپک رہا ہے
 جو جاتی ہے کہ
 دل یوں لیا جاتا ہے
 ۳۔ شرح:
 اس میں لغو و نشر

مرتب ہے۔

رات کا وقت ہو، محبوب نے شراب پی رکھی ہو۔ خدا کرے، وہ یہاں
منور آئے۔ ساتھ ہی خدا نہ کرے کہ وہ رقیب کو ساتھ لے کر آئے۔

۴۔ **شرح :** جب میں نے محبوب سے پوچھا کہ رات غیر کی صحبت
میں کیا صورت پیش آئی تو دیکھیے، وہ سامنے آ بیٹھا اور بولا : ”دیکھنا، یوں :
” دیکھنا کہ یوں ” کے دو مطلب ذہن میں آتے ہیں۔ اول یہ کہ غصے سے
عاشق کی طرف دیکھنا۔ مقصد یہ تھا کہ تمہارے لب پر ایسا گستاخانہ سوال نہ
آنا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ محبوب نے ڈھٹائی اختیار کر لی اور سامنے بیٹھ
کر کہا کہ یوں صورت پیش آئی تھی، گویا بے حجابی اور بے تکلفی کی صورت تھی۔

۵۔ **شرح :** بزم میں محبوب کے دو بروچپ بیٹھے رہنے کے سوا
چارہ نہیں، وہ خود چپ بیٹھا ہے اور اس کا مطلب یہی ہے کہ کسی اور کو بھی
کچھ نہ بولنا چاہیے۔

۶۔ **لغات :** ستم ظریف : وہ شخص، جو ظلم و ستم میں بھی ظرافت
کا پہلو نہ چھوڑے۔

شرح : میں نے محبوب سے کہا کہ آپ نے بزم ناز آراستہ
کر رکھی ہے۔ ایسی محفل غیر سے بالکل خالی کرالینی چاہیے۔ یہ سنتے ہی
اس ستم ظریف نے مجھے بزم سے اٹھا دیا، پھر پوچھا کہ تمہاری مراد یہ تھی؟
شعر میں ستم ظریفی کا پہلو یہ ہے کہ مردانے اپنے آپ کو خویش سمجھتے ہوئے
غیر کو اٹھا دینے کی تدبیر کی۔ ظالم محبوب نے خود مرزا ہی کو غیر سمجھ کر اٹھا
دیا، ساتھ ہی پوچھا : ”تم یہی چاہتے تھے؟“

۷۔ **شرح :** جب محبوب نے مجھ سے پوچھا کہ ہوش کس طرح اُڑتے
ہیں تو مجھ پر بخودی کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی ہوا چلنے لگی اور اس
نے بتایا کہ ہوش یوں اُڑتے ہیں۔ یعنی محبوب کا جلوہ دیکھ کر ہوش و حواس

اس طرح رخصت ہو جاتے ہیں، جیسے ہوا چلتی ہے۔

۸۔ شرح : مجھے محبوب کے کوچے میں رہنے کا طور طریقہ یاد نہ تھا۔ یہ دیکھتے ہی نقشِ پا کی حیرت میرے لیے آئینہ دار بن گئی، یعنی اس نے دکھا دیا کہ محبوب کے کوچے میں رہنا چاہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ نقشِ پا کی طرح خاک میں مل جاؤ اور جلوۂ حسن سے سراپا حیرت بن کر پوری زندگی گزار دو۔

۹۔ لغات : موجِ محیط : سمندر کی لہر۔

شرح : اگر تیرے دل میں یہ خیال ہو کہ وصل کے بعد شوق پر زوال آجاتا ہے تو یہ صحیح نہیں۔ سمندر کی لہروں کو دیکھ، وہ عینِ پانی میں بھی بدستور ہلکتے مارتے رہتی ہیں۔ یعنی وصل کا کمال بھی ان کے شوق پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ وہ ہمیں بتا رہی ہیں کہ شوق سچا اور خالص ہو تو وصال کے بعد بھی اس کی جیتا جی اور بقیاری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

۱۰۔ لغات - رنجتہ : اردو غزل

شرح : اگر کوئی شخص کہے کہ اردو کی غزل کیونکر فارسی کے لیے باعثِ رشک ہوتی ہے تو اسے ایک بار غالب کے کچے ہوئے شعر سنا دے ساتھ ہی کڑ دے کہ ایسے شعرواقعی فارسی کے لیے باعثِ رشک ہوتے ہیں۔

۱۔ شرح :

خواجہ ساجی فرماتے

ہیں :

”یہ مصنف خیالی

مصنوع نہیں ہے

بلکہ حقیقتِ واقعی

حسد سے دل اگر اندر ہے، گرم تماشا ہو

کہ چشمِ ننگ، شاید، کثرتِ نظارہ سے دامو

ہر قدر حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی

بھروں یک گوشہ واسن، اگر آبِ ہفت دریا ہو

کو ایک نہایت : اگر وہ سر و قد، گرم خرام ناز آ جاوے
 عمدہ پیرائے کف ہر خاک گلشن، شکل قمری، نالہ فرسا ہو
 میں بیان کیا

ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور دنیا
 کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقی و تنزل کا سبب
 سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ
 حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جس قدر اس کا دائرہ تعارف
 زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اس پر یہ بات کھلتی جاتی
 ہے کہ لوگوں کی خوش حالی محض اتفاقی نہیں ہے، جس پر حدود
 رشک کیا جائے، بلکہ ان کی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے اور اس
 لیے انصاف و فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور خود
 بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بھائے حدود رشک
 کے اوروں کی رہیں اور پیروی کرنے میں متوجہ ہو جاتا ہے۔
 اس معقول بات کو ایک محسوس تشیل میں بیان کرتا ہے کہ چشم
 تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو۔ جس طرح شعراء نے بخیل
 کے دل کو تنگ باندھا ہے، اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی
 کے ساتھ موصوف کیا۔

مولانا طباطبائی نے حسد کرنا اس لیے بجا قرار دیا کہ "دنیا میں دولت
 کے لیے کوئی سبب و کار نہیں، ہر جگہ یہی حال ہے" یعنی اگر کوئی شخص
 پھر پھر کر دیکھے گا تو اس پر واضح ہوتا جائے گا کہ دولت خاص اسباب کی
 بنا پر ہوتی نہیں آتی۔ مثلاً ایک تاجر کا بیٹا صرف اس لیے دولت مند بن جاتا
 ہے کہ اس کا باپ دولت مند تھا اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ بادشاہ کا
 بیٹا ملک کا والی بن جاتا ہے، حالانکہ اس میں ملک داری کی کوئی خصوصیت

نہیں ہوتی۔ جب کوئی شخص اس قسم کی مثالیں بکثرت دیکھے گا تو امید یہی ہے کہ حسد اس کے دل میں یا تو بالکل باقی نہیں رہے گا یا بہت کم رہ جائے گا۔

دونوں صورتوں میں سے خواجہ عاتق کی اختیار کردہ صورت بہترین ہے۔ اسے واقعی اخلاقی سبق قرار دے سکتے ہیں۔ محض یہی نہیں کہ دنیا میں جہل پھر کہ حالات پر غائر نظر ڈالی جائے تو انسان کے دل میں کسی بھی نقطہ نگاہ سے تنگی باقی نہیں رہ سکتی، بلکہ بعض ملکوں اور قوموں کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کے نکتے افراد وہاں پہنچ کر اعلیٰ درجے کے کارکن بن جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے دل سے حسد دور ہو سکتا ہے۔ مرزا نے "شاید" کا لفظ استعمال کیا، جس سے مراد یہ ہے کہ لازمی اور یقینی نہیں، بہر شخص پر کثرتِ نظارہ کا یہی اثر ہو۔ اثر زیادہ یا کم بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بالکل نہ ہو۔ بعض طبیعتیں کسی بھی حال میں اچھا اثر قبول نہیں کرتیں، لہذا "شاید" کی قید بالکل بجا ہے اور میرزا کی گہری بصیرت کا پتا دیتی ہے۔

۲۔ لغات - معاصی : معصیت کی جمع۔ گناہ

شرح : میرے دل میں مختلف گناہ نہ کر سکنے کی جتنی حسرت ہے

اسی کے مطابق گناہوں کا ذوق ہونا چاہیے۔ میری حسرت لا قتا ہی ہے، اس لیے ذوقِ گناہ بھی لا قتا ہی ہے۔ حالت یہ ہے کہ اگر گناہ سات سمندر بن جائیں تو میرے دامن کا صرف ایک گوشہ تر ہو سکے گا۔

میرزا پہلے بھی اس مضمون کا ایک شعر کہ چکے ہیں :

دیانے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک

میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۳۔ لغات - نالہ فرسا : آہ و نغائاں کرنے والا۔

مشریح : اگر میرا محبوب، جس کا قد سرو کی طرح بلند ہے، اتنا دانا ذرے
سے ملتا ہو، باغ میں آجائے تو خاک، باغ کی ہر سٹھی قمری کی طرح آدھ
نقاں کراٹھے۔

خاک کی ہر سٹھی کو قمری اس لیے قرار دیا کہ قمری ناختہ کی ایک قسم
ہے، جس کا رنگ خاکی ہوتا ہے پھر قمری کو سرو سے جو تعلق ہے وہ محتاج
تشریح نہیں اور سرو کے لیے خرام تاز کی موزونیت واضح ہے۔

۱۔ لغات :

کنشت : بُت خانہ

مشریح :

اگر میں کہے میں

جا کر مقیم ہو گیا ہوں

تو مجھے طعنہ نہ دو، کیا

میں وہاں جا کر بُت خانہ

کے لوگوں کا حقِ صحبت

بھول گیا ہوں ؟ ان

میں رہ کر میں نے جو

فیض پائے، جن

مہربانیوں سے فاذا

اٹھایا اور جو کچھ سیکھا،

اسے بھول سکتا ہی نہیں، وہ بدستور میرے دل میں تازہ ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ مقام کی تبدیلی سے لازم نہیں آتا۔ انسان کے

فکر و خیال اور عقیدت و نیاز میں بھی تغیر آجائے انسان کہے میں جا کر بھی

کہے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں

بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ سے دانگیں کی لاگ

دو زرخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ درسمِ ثواب سے؟

ٹیڑھا لگا ہے قلمِ سرِ نوشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے

خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

بُت پرست رہ سکتا اور بُت پرستوں سے محبت رکھ سکتا ہے۔ عقیدہ و ایمان کا تعلق دل سے ہے، نہ کہ کسی خاص مقام میں قیام سے۔

۲۔ لغات۔ طاعت : بندگی، عبادت، فرمانبرداری۔

سے و انگلیں : شراب اور شہد۔ اشارہ ہے بہشت میں شراب

اور شہد کی ہنروں کی طرف۔

شرح : خواجہ حاکم فرماتے ہیں :

”جب تک بہشت قائم ہے، لوگ عبادت اس امید پر کرتے

ہیں کہ وہاں شہد اور شراب بطور وغیرہ ملے گی، پس بہشت کو

دوزخ میں مچونک دینا چاہیے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے

اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔“

عام عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت کرنے سے بہشت میں شراب اور

شہد کی ہنریں ملیں گی۔ میرزا کہتے ہیں کہ عام لوگ شراب اور بہشت کی

آرزو دل میں لے کر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ سچی اور بے لوث عبادت

تو نہ ہوتی، جو ہر غرض کی آلائش سے پاک ہو اور صرف خدا کے لیے ہو۔

مناسب یہ ہے کہ بہشت کو انشا کر دوزخ میں ڈال دیا جائے تاکہ لوگ صرف

خدا کے لیے عبادت کر سکیں، اور کوئی غرض ان کے سامنے نہ رہے۔

۳۔ لغات۔ منحرف : پھر جانے والا۔ برگشتہ

میں نوشت : تقدیر، قسمت۔

شرح : میں ان طور طریقوں سے کیوں نہ پھر جاؤں، جن پر چل کر

ثواب حاصل ہوتا ہے؟ میری حالت تو یہ ہے کہ جس قلم سے میری قسمت لکھی

گئی ہے، اسے قط ہی ٹیڑھا لگا تھا، لہذا جو تحریر لکھی گئی ہے، وہ بھی ٹیڑھی ہے

اور میرے لیے سیدھے راستے پر چلنا اور ثواب حاصل کرنا طبعاً غیر ممکن ہو گیا ہے۔

۴۔ لغات۔ لمخ : ٹیڑھی

کہنا : قسمت ، نصیب ، فائدہ ، حاصل

شرح : اسے غائب ! میں اپنی کوشش ، محنت اور جدوجہد سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا ۔ اگر میں کھیبتی ہاڑی کروں تو پہلے یقین ہے ، ہڈی ڈل آ کر اسے صفا چٹ کر جائے گا ۔ اگر اتفاقاً تیرے فضل ہڈیوں سے بچ گئی اور میں نے کھدیاں جمع کر لیا تو اسے بھلی بھلا دے گی ۔

۱۔ لغات :

وارستہ : آزاد

شرح : اسے

محبوب ! ہم اس سے آزاد ہیں کہ آپ ہم

سے محبت ہی کریں ۔

اگر محبت نہیں کرنا چاہتے تو کچھ مسابقت نہیں ۔

دشمنی ہی کا طریقہ امتیاز

کر لیں ۔ دونوں صورتوں

میں تعلق قائم رہے گا ۔

ایک میں خوشگوار اور

دوسری میں ناخوشگوار

لیکن دونوں ہی صورتیں

غائب ہو جائیں تو کامل

بے تعلقی رونما ہو جائیگی

یہ کسی بھی حالت میں منطوق

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو

یکے ہمارے ساتھ ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا

ہے دل پہ بار ، نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیبر کا گلہ

بہر خیر بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے ، کہتے ہیں ، ہر درد کی دوا

یوں ہو تو چارہ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالانا بیکی نے کسی سے معاملہ

اپنے سے کھینچتا ہوں ، نجات ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خمبہ ال

ہم انجمن سمجھتے ہیں ، غلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامہ زبونی بہت ہے ، انفعال

نہیں میرزا خرو
کہتے ہیں :

حاصل نہ کیجے دہر سے ، عبرت ہی کیوں نہ ہو

لاگ ہو تو اس کو ہم جھپٹ لگاؤ
جبے ہو کچھ بھی تو دھوکا کھا ئی کیا

وارثگی بہانہ بیگانگی نہیں !

اپنے سے کرانہ غیر سے ، وحشت ہی کیوں نہ ہو

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی ہے

ٹٹا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی ؟

عمر عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

۲۔ لغات -
اختلاط : میل جول۔

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد

شرح : ضعف

اس میں ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ ہو

اتنا بڑھ گیا کہ میل
جول قائم رکھنے کی

جی تاب نہ رہی ۔ حالت یہ ہے کہ محبت کا نقش بھی دل کے لیے ایک ایسا

بوجھ معلوم ہوتا ہے ، جو برداشت نہیں کیا جاسکتا ۔

اس شعر میں بھی صرفِ منعت کی شدت واضح کرنا مقصود ہے ، یہ نہیں کہ

محبت ہی سے بیزار ہو گئے ۔ اسلوب بیان ایسا اختیار کیا کہ جو چیز ہمیں سب

سے بڑھ کر عزیز ہے بلکہ ہمارے لیے روح و رواں کی حیثیت رکھتی ہے یعنی

محبت ، وہ بھی ایسے صفت میں بار محسوس ہو ۔

۳۔ لغات - برسمیل شکایت : شکایت کے طود پر ، گلے کے

رنگ ہیں ۔

شرح : اے محبوب ! مجھے تجھ سے یہ گلہ ہے کہ غیر کا ذکر مجھ سے

کیوں کیا ؟ مانا کہ تیرا مقصد اس کی شکایت کرنا تھا ، لیکن مجھے شکایت کے

رنگ میں بھی اس کا ذکر گوارا نہیں ۔

۴۔ شرح : مشہور ہے کہ ہر درد کے لیے دنیا میں دوا موجود ہے اگر یہ قول درست ہے تو کون سی دہ ہے کہ محبت کے عہ میں کوئی دوا کہیں نہیں ملتی۔ یعنی اس قول کو، جو عام رواج پا چکا ہے، غلط ثابت کرنے کے لیے کم از کم یہ بدیہی مثال تو ضرور موجود ہے۔

۵۔ لغات - نجات : شرمندگی، پشیمانی۔

شرح : میں عمر بھر بکیں رہا۔ کسی نے میرا ساتھ نہ دیا اور اس دہ سے کسی کے ساتھ مجھے کوئی معاملہ پیش نہ آیا۔ اگر لوگوں سے تعلق ہوتا تو کوئی مجھ سے فائدہ اٹھاتا اور کسی کا حق پورا نہ کر سکنے کے باعث مجھے شرمندگی اور پشیمانی سے سابقہ پڑتا۔ جب کسی سے معاملہ ہی نہ پڑا تو شرمندگی بھی اپنے آپ ہی سے جو رہی ہے۔ اور کسی سے نہیں۔ شرمندگی اس لیے کہ میں اتنا ناقص ہوں، کسی کو میرے ساتھ معاملے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

۶۔ شرح : آدمی اپنے دل و دماغ میں گونا گوں خیالات کا ایک محشر بے ہوش ہے۔ کوئی وقت، کوئی صورت اور کوئی حالت ہو، ان خیالات سے الگ نہیں ہو سکتا۔ وہ مختلف منصوبے سوچتا ہے، انہی ہی سبکیں بناتا ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی ان باتوں سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ دنیا سے کٹ کر گوشہ تنہائی میں بھی بیٹھ جائے تو وہاں بھی اپنے خیالات سے سلسلہ منقطع نہیں کر سکتا۔ گویا گوشہ تنہائی میں بھی اس کے دل و دماغ کے اندر ایک مستقبل انجمن آراستہ رہتی ہے، لہذا ہم اس کی خلوت کو خلوت نہیں، انجمن ہی سمجھتے ہیں۔

روحانی نقطہ نگاہ سے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دنیوی تعلقات سے الگ ہو جانے کے کتنے ہی دعوے کرے، اس کے لیے الگ ہونا ہے غیر ممکن، کیونکہ وہ دنیا والوں سے الگ ہو سکتا ہے، اس کے اندر دنیوی خیالات

کا جو محشر بپا ہے، اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔

۷۔ لغات۔ زربوئی بہمت : بہت کی پستی۔

انفعال : دوسرے کا اثر قبول کرنا۔

شرح : دوسرے کا اثر قبول کرنا پستی بہمت کی دلیل ہے۔ لوگ ذلت

سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بصیرت سے غائدہ اٹھایا، لیکن میں کہتا ہوں کہ زمانے سے عبرت ہمیں حاصل نہ کرنی چاہیے کیونکہ یہ بھی دوسرے کا اثر قبول کر لینا ہے اور اثر قبول کر لینا پستی بہمت کا باعث ہے۔ پھر کون سی وجہ ہے کہ انسان اپنے عزم و بہمت کے لیے ذلت رسولانی کا سامان مزاہم کرے ؟

۸۔ لغات۔ وارستگی : آزادی

بیگانگی : بے تعلق، اجنبیت

وحشت : دور بھاگنا۔

شرح : آزادی کے دعویدارو! آزادی کا مطلب یہ نہیں، کہ

اسے لوگوں سے بے تعلق کا بہانہ بنا لیا جائے، بے تعلق اپنی ذات سے پیدا کرنی چاہیے، نہ کہ غیروں سے۔ وحشت و بیگانگی اپنی ہی ذات سے لازم ہے، دوسروں سے نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ گرد و پیش سے الگ ہو کر سمجھتے ہیں کہ

ہم آزاد اور آزادہ فرد ہیں۔ آزادی یہ نہیں، یہ تو اپنی ذات کی خاص پاسداری اور دوسروں سے علیحدگی ہے۔ حقیقی آزادی یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ رہ کر ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دی جائے، ان کے دکھ بٹائے جائیں اور ان کی ہر ممکن اعانت کی جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اپنی ذات کو مٹایا جائے اور سب سے پیچھے رکھا جائے۔ یہی حقیقی آزادی ہے۔

اقبال اس مقام میں کیا خوب کر گیا ہے :

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، جنوں میں پھرتے ہیں لے لے کر

میں اس کا بندہ جنوں کا، جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

۹۔ لغات۔ فرت فرصت : فرصت کا چھن جانا، منافع ہو جانا۔

شرح : اگر انسان کی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ عبادت ہی میں

صرف ہو، جو نہایت پاکیزہ مشغلہ ہے تو کیا اس حالت میں زندگی کی فرصت منافع ہو جانے کا غم مٹ جائے گا ؟

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کی جو

مہلت عطا کی ہے، وہ اتنی بیش بہا ہے کہ انسان ایک ایک لمحہ خدا کی

عبادت میں بھی گزار دے تو احساس ہی ہوتا ہے کہ اس فرصت سے پورا

فائدہ نہ اٹھایا گیا۔

ہاں لفظ "عبادت" حقیقی نہیں، رواجی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حقیقی عبادت کا دائرہ نہایت وسیع اور بن نوح انسان کے لیے حدود جغرافیہ

رساں ہے۔ غالباً میرزا غالب ہی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ رواجی عبادت میں

زندگی صرف کر لینے کے باوجود اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مطلوب یہ ہے کہ

اسے واقعی ان کاموں میں صرف کیا جائے، جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے

دستے لگا دیے ہیں اور انہیں کاموں کی بجا آوری کو حقیقی عبادت قرار دیا ہے

اگر ایسا نہ ہو تو ظاہر ہے کہ زندگی کی عارضی مہلت منافع ہوئی اور اس کا غم

باقی رہ گیا۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بیشک انسان دل میں سمجھ سکتا ہے، اس نے

ارادۂ کسی نیک کام میں کوتاہی نہیں کی، لیکن کیا کہا جاسکتا ہے کہ تمام کام

نیک۔ بیشک اسی طرح پورے ہوئے، جس طرح ہونے چاہئیں تھے۔ لہذا

رہی فرصت مہلت کے منافع ہونے کا سبب بنا۔

۱۰۔ **شرح :** ہمارے محبوب کی فطرت ہی فتنہ انگیزی ہے۔ اسے استاد! اب ہم اس کے دروازے پر آ بیٹھے ہیں اور پختہ ارادہ کر چکے ہیں۔ کہ یہاں سے نہیں اٹھیں گے۔ اگرچہ ہمارے سر پر قیامت ہی ٹوٹ پڑے، جو مردوں کو قبروں سے اٹھا کر باہر کھڑا کر دے گی۔

- قیامت ہی کیوں نہ ہو " میں اشارہ قیامت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ ہم پر ایسی مصیبتیں نازل کر دی جائیں جو قیامت سے مشابہ ہوں۔

۱۔ لغات :

شیون : تارہ، فضاں
نوا سنجان : گلشن
باغ میں گانے والے پرندے
شرح :
میں خجریے میں قید ہوں اور فریاد و فغاں کرتا رہتا ہوں۔
مان پیچھے کر باغ کے

قفص میں ہوں، اگر اچھا بھی نہ جائیں میرے شیون کو
مرا ہونا بڑا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو
نہیں گر مہدی آساں، نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
ندوی ہوتی خدا یا آرزوئے دوست، دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو، اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خو نچکاں، مٹر گان سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جانناں کے دامن کو
ابھی ہم قتلگہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

آزاد و خوش نوا
 پرندوں کو میری
 فریاد و فغان بھی
 معلوم نہیں ہوتی
 لیکن میرے
 ہونے میں کیا
 بُرائی ہے ؟
 میرا وجود انھیں
 کیوں ناگوار
 معلوم ہوتا ہے
 حالانکہ میری
 وجہ سے ان کی
 آزادی اور
 خوش نوائی کو
 کوئی نقصان
 نہیں پہنچتا ۔
 ممکن ہے ،
 میرزا غالب نے
 باغ کی صرف
 عام کیفیت
 پیش نظر رکھتے

ہوا چہرہ چا جو میرے پانوں کی زنجیر بننے کا
 کیا بے تاب کاں میں بجنبش جو ہرنے آہن کو
 خوشی کیا ، کھیت پر میرے ، اگر سو بار ابر آوے
 سمجھتا ہوں کہ ٹھونڈے ہے ابھی سے برقِ غم کو
 وفاداری ، بشرطِ استواری ، اصلِ ایماں ہے
 مرے بُتِ خانے میں تو کعبے میں گاڑ و برہمن کو
 شہادت تھی مری قسمت میں ، جو دی تھی یہ خو مجھ کو
 جہاں تلوار کو دیکھا ، جھکا دیتا تھا گردن کو
 نہ کُلتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
 رہا کھٹکانہ چوری کا ، دُعا دیتا ہوں رہزن کو
 سخن کیا کہ نہیں سکتے کہ جو یا ہوں جوابہر کے
 جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو
 مرے شاو سلیمان جاہ سے نسبت نہیں ، غالب !
 فریون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

ہونے یہ شعر کہ دیا ہوا اور ان کے سامنے کوئی خاص واقعہ نہ ہو ، لیکن جلد ہی
 ہمارے ملک کی قومی زندگی میں کئی ایسے واقعات پیش آئے ، جن پر یہ شعر ٹھیک ٹھیک

منطبق ہوتا تھا۔ مثلاً ابتدا میں جن لوگوں نے ہمت و جرأت سے کام لے کر آزادی کے لیے سعی و جہد شروع کی اور وہ آلام و مصائب میں مبتلا ہوئے تو ایک دو نہیں، ہزاروں افراد اپنے دلی معتقدات کی بنا پر یا حکمران قوم کو خوش کرنے کے لیے ان مجاہدین کی مذمت کرتے رہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک آزادی کا جذبہ عام نہ ہو گیا۔ ایسے مجاہد اہل وطن کو یہی شعر سن کر حقیقت حال واضح کر سکتے ہیں کہ قید ہم ہوئے، مصیبتیں ہم پر آئیں، آزادی کی صدا ہم نے بلند کی۔ اس سے اہل وطن کے مشغلوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا، پھر انھیں ہمارا وجود کیوں نا پسندیدہ معلوم ہوتا ہے ؟

شاعر کے فکر و نظر کی غیر معمولی صلاحیت کا ایک منظر یہ بھی ہے کہ وہ شعر میں ایسی صورت حال پیش کر دے، جو اگرچہ اس کے زمانے میں موجود نہ ہو، لیکن آگے چل کر ٹھیک ٹھیک اسی طرح پیش آنے والی ہو۔ اسے بھی شاعر کے کلام کی آفاقیت کا ثبوت سمجھنا چاہیے۔

۲۔ **مشرح :** اگرچہ رقیب کے لیے عشق و غبت اور وفا و خداکاری میں مجھ پایا ہونا آسان نہ ہو، مگر یہ رشک کم نہیں کہ اس کے دل میں بھی میرے محبوب کی آرزو ہے۔ اے خدا ! کاش یہ آرزو اسے نصیب نہ ہوتی ! یعنی محبوب کے لیے کسی دوسرے کے دل میں خواہش کا پیدا ہونا بھی گوارا نہیں۔ اس سے بھی رشک کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

کلیات غالب (فارسی) میں ایک شعر ہے، جس میں اس سے ملتا جلتا مفہوم یوں پیش کیا ہے۔

یاد از عدد نیامدیں ہم ز دور بینی ست

کا درد لم گوشتن ! یا رہم نیشنی ست

۳۔ **لغات :** جراحہ : زخم ۔ گھاؤ ۔

شرح : جن زخموں نے سینے کے اندر موٹی کی آنکھوں سے خون

ٹپکا دیا، اے محبوب ! اُن زخموں پر تیری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ
 بعض اصحاب نے اس لیے سوزن سے سوزنِ غم مراد لی کہ سینہ غم
 کا مقام ہے، لیکن یہ خیال نہ فرمایا کہ سوزنِ غم سے زخم سے نہیں جاتے۔
 اور تجراحِی میں آج کل کی طرح پہلے بھی اندرونی زخم برابر سے جاتے تھے
 اور سونوں کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپکتے تھے۔ سینہ بہ معنی صدر
 کی جگہ سینا بہ معنی دو وقتں سمیٹنا بھی میرے نزدیک قرینِ صواب نہیں۔ شعر کا
 معنوں یقیناً زیادہ گہرا نہیں، لیکن شاعر محبوب کی بے پروائی اور بیدردی
 کی تصویر پیش کر رہا ہے اور اس نقطہ نگاہ سے شعر نہایت اچھا ہے۔

۴۔ شرح : خدا کرے کہ میرے ہاتھوں کو شرم آئے۔ ان کے
 دوہی کام رہ گئے ہیں یا تو میرے گریبان کو کھینچا تانی میں رکھتے ہیں یا محبوب
 کے دامن کو کھینچتے ہیں۔ کاش یہ اپنے اس فعل سے باز آئیں۔

عاشق کے لیے زندگی کی دوہی صورتیں ہیں یا محبوب سے وصال یا ہجر
 و فراق۔ محبوب سے قرب ہو تو عاشق کے ہاتھ اس کا دامن کھینچ کر شروع
 کر دیتے ہیں، یہ حرکت بھی نا زیبا ہے۔ اگر محبوب سے مفارقت ہو تو بتیابی
 اور بقیارادی میں عاشق کے ہاتھ گریبان تار تار کر دینے لگے پے ہو جاتے ہیں۔
 میرزا نے ہاتھوں کے لیے بدو و عاصروں کی، لیکن ہجر و وصال کا جو نقشہ پیش
 کر دیا، وہ بالکل بے مثال ہے۔

۵۔ لغات۔ تشناور : تیرنے والا۔

توسن : گھوڑا۔

شرح : عشق کی قتل گاہ کہ فی معمولی چیز نہیں۔ جب یہ رونق
 پر آتی ہے تو خون کا دریا بہ نکلتا ہے جس میں قاتل کا گھوڑا تیرتا پھرتا ہے۔
 اس شعر کی آفاقیت قابلِ غور ہے۔ قومی زندگی میں ایسے ہزاروں
 منظر پیش آئے اور ہمیشہ پیش آتے رہیں گے۔ لوگوں نے سمجھا کہ آزادی حاصل

کر لینا آسان ہے۔ جب قربانیوں کا موقع آیا، قرتوں اور پشتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ واقعی خون کے دریا بہ گئے، پھر آزادی کی منزل میں قدم پہنچ سکے۔ شعر میں یہ منظر نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ درچاروس ہیں قربانیوں سے یہاں کام نہیں چل سکتا۔ اس منزل کو آسان نہ سمجھو۔ یہاں واقعی بے دریغ قربانیاں کرنی چریں گی۔

۶۔ **شرح :** میں وہ وحشی اور مجنوں ہوں کہ جب میرے پاؤں کی زنجیر ہنسنے کا چرچا ہوا تو جو سہرا اس طرح حرکت میں آگئے کہ فولاد کان کے اندر بیتاب و بے قرار ہو گیا۔ یعنی فولاد بھی ایسے وحشی کی زنجیر بن جانے کا انتہائی خواہاں تھا۔

شعر میں گرفتاری اور قید و بند کے ذوق کا جو جذبہ پیش کیا گیا ہے، وہ واقعی اعلیٰ مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے تعلق میں قابل تقلید ہے۔

۷۔ **شرح :** اگر میرے کھیت پر بادل سوا بار بھی آئے تو اس کا صرف یہی پہلو نہیں کہ کھیت پر بارش ہوگی اور اس سے فصل پک جانے میں مدد ملے گی۔ ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ ابر کی آمد مصیبت کا سامان بھی بن سکتی ہے، یعنی ابر کے پردے میں بجلی آئی اور تلاش کر رہی ہے کہ کب موقع پائے اور کھیت کا حاصل جلا کر راکھ کر دے۔

میرزا نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں دو پہلو موجود ہیں، ایک منفعت کا ہے، دوسرا نقصان کا۔ انسان کو صرف ایک ہی پہلو پر نظر نہ رکھنی چاہیے۔ لوگ ایسے اشعار کی بنا پر میرزا کو قنوطیت کا شاعر قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہاں رجائیت و قنوطیت کا کوئی سوال نہیں۔ بصیرت کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں پہلو پیش نظر رکھتے جائیں۔ گویا یہ اظہار قنوطیت نہ اس لیے، بلکہ دعوت بصیرت ہے۔

۸۔ شرح : ایمان کی اصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ وفاداری کے مسلک پر انسان برابر قائم و استوار رہے، یہاں تک کہ مر جائے۔ اگر برہمن اسی اصل ایمان کو پیش نظر رکھ کر بتھانے میں مر جائے تو وہ اس قابل ہے کہ دفن کے لیے اسے کبے میں جگہ ملے۔

ظاہر ہے کہ نہ برہمن کو دفن کیا جاتا ہے اور نہ کعبہ مکرمہ قبرستان ہے کہ وہاں لوگ دفن ہوں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ایمان کی اصل (اپنے عقیدے پر پوری وفاداری سے قائم و استوار رہنا) کی اہمیت و عظمت نمایاں کی جائے۔ جس فرد میں ایمان کی یہ اصل موجود ہو، اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، وہ اس قابل ہے کہ اسے دنیا کے مقدس ترین مقام میں جگہ ملے۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ عرفی پیشتر ایک شعر کہ چکا ہے، جس کا مضمون قریب قریب یہی ہے، یعنی :

ہر کیش برہمن آں کس از شیدان است

کہ در عبادت ثبت روئے بر مذ میں میرد

برہمنوں کے عقیدے کے مطابق شیدہ ہے، جو ثبت کے سامنے

سجدے میں گرے ہوئے جان دے دے۔

ظاہر ہے کہ اس شعر کو بہ اعتبار مضمون غالب کے شعر سے کوئی نسبت نہیں۔ عرفی صرف یہ بتاتا ہے کہ برہمنوں کے عقیدے کے مطابق شیدہ کون ہے؟ غالب ایمان کی اصل و اساس واضح کرتے ہیں اور اس پر پورے مضمون کی بنیاد رکھتے ہیں۔

۹۔ شرح : میری قسمت میں شہادت کسی تھی، لہذا اللہ تعالیٰ

نے میری فطرت ہی میں یہ چیز ڈال دی کہ جہاں تلوار کبھی پہنچی ہو وہاں دیکھتا تھا، وہیں گردن جھکا دیتا تھا۔

جس لوگوں کے عزائم بلند ہوں، ان کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ خطرات سے ڈرتے نہیں، بلکہ ان کا غیر مقدم کرتے ہیں۔ یہی حقیقت اس شعر میں واضح کی گئی ہے۔

۱۰۔ **تشریح :** اگر میں دن کے وقت رہزن کے ہاتھوں نہ لٹ جانا اور جو کچھ میرے پاس تھا، وہ چھین نہ لیا جاتا تو رات کے وقت میرے لیے یوں سو جانے کی کون سی صورت تھی کہ سدا بچہ ہی نہ رہی۔ بے خبری کی یہ نیند اس لیے آئی کہ چوری کا کوئی دغہ نہ باقی نہ رہا اور رہزن کو دھاویا ہوا سو گیا کہ وہ دن کے وقت سب کچھ چھین لے گیا۔

اس شعر سے ملتا جلتا ایک شعر نظیری نیشاپوری کا بھی ہے۔

بہر بانی ازاں شادم کہ از قشیش آزد اوم

گر بمانے نذارم تا کہے از دست من گیرد

یعنی میں برہنگی پر اس لیے خوش ہوں کہ قشیش سے فارغ ہو گیا۔ میرے پاس کپڑا ہی نہیں، جو کوئی چھین کر لے جائے۔

دونوں کا مرکزی مضمون ایک ہے، یعنی دنیا کا ساز و سامان اور علانیہ انسان کے لیے قشیش و اضطراب کا سرچشمہ ہیں۔ ان سے آزاد رہنا باعث اطمینان ہے، لیکن دونوں کے بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نظیری نے محض ایک دعویٰ کر دیا، مرثانے پورے مضمون کو عام و قومی صورت دی اور کہا کہ رہزن دن کو سب کچھ لوٹ نہ لے جاتا تو رات کو بے خبر سونا نصیب نہ ہوتا، کیونکہ چوری کا اندیشہ باقی رہتا۔

پھر مرثا کی دقیقہ سنی ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ دو شخص پیدا کیے، جو سامان لے جا سکتے تھے، ایک رہزن، جو دن و رات

نور و قوت سے سب کچھ لوٹتا ہے، دوسرا چور، جو رات کو چھپ چھپا کر چیزیں اٹھاتا ہے۔

۲۔ رہزن اور چور دونوں موجب تشویش ہیں۔ مگر رہزن دن کو ٹوٹتا ہے اس لیے نیند میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ چور رات کو چوری کرتا ہے اور اس کے متعلق کھشکامات کی غیند حرام کر دیتا ہے۔

۳۔ انسان کو اطمینان و مزارع کی ضرورت سب سے بڑھ کر رات ہی کے وقت پیش آتی ہے، کیونکہ یہی سونے کا وقت ہے۔ رہزن نے دن کو دوستی تعجب طرز کیا اور رات کے لیے اطمینان بہم پہنچا دیا، لہذا مرزا کے نزدیک وہ دعا کا مستحق ٹھہرا۔

۴۔ پھر مرزا نے یہ پورا واقعہ ایسے انداز میں پیش کیا، گویا یہ جو چکا ہے، یہ نہیں کہہ سکتے والا ہے۔

۱۱۔ شرح : اس شعر میں کلام کو جواہرات سے اور سخن کو فی کوکلان کنی سے افضل و برتر قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کیا ہم شعر میں کہہ سکتے کہ جواہرات ڈھونڈتے پھرے؟ کیا ہمارے پاس جگر نہیں جس کی کاوش سے اعلیٰ درجے کے اشعار نکال سکتے ہیں کہ کاغذیں کھودتے پھرے؟

۱۲۔ شرح : آکا بیک ایران میں بڑے بڑے بادشاہ گذرے ہیں، مثلاً فریدون، جمشید، کیمینرو، دارا گشتاسپ اور بہمن، مگر ان سب کو میرے بادشاہ سے جو حضرت سلیمان کا سار تہہ رکھتا ہے، کیا نسبت ہے؟

۱۔ لغات : پاؤں دھو کر مینا : انتہائی تعظیم اور انتہائی عزت و ادب اور انتہائی محبت کا ایک فعل ہے دھوتا ہوں جب میں پینے کو، اس سیم تن کے پاؤں رکھتا ہے، صند سے، کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں دی سادگی سے جان، پڑوں کو ہ کن کے پاؤں بیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے، پیر زن کے پاؤں

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
 ہو کر اسیر دہستے ہیں، راہزن کے پاتو
 مریم کی جستجو میں، پھرا ہوں جو دُور دُور
 تن سے سوانگار ہیں، اس خستہ تن کے پاتو
 اندر سے ذوقِ دشتِ نور دی کہ بعد مرگ
 جلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاتو
 ہے جوشِ گلِ بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
 اُڑتے ہوئے الجھتے ہیں، مرغِ چمن کے پاتو
 شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
 ڈکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازکِ بدن کے پاتو
 غالب! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؟
 پیتا ہوں دھوکے خسرو شیریں سخن کے پاتو
 اس سے محبت کا یہ انتہائی اظہار کر سکوں۔

۲۔ لغات - جہہات : لغتی معنی "بہت بعید ہے" اردو میں یہ
 کلہ ناسف ہے اور اس کے ایک ٹکڑے یعنی "بات" کو پاؤں سے مناسبت ہے۔
 پاؤں پڑنا : قدم چومنا، عزت اور تعظیم کرنا۔
 پیرزن : مشورہ ہے کہ فریاد سے کما گیا تھا، پہاڑ چیر کر شریق کے باغ

سناٹا خچرِ جندو پر نہیں
 کے پاؤں دھو کر
 چیتے تھے۔ راہباؤں
 میں بھی یہ دستور
 رہا۔

شرح :

میں اس حسین و
 جمیل کے پاؤں
 اس لیے دھوتا
 ہوں کہ دھوؤں
 پہی جاؤں تو وہ
 منہ سے اپنے
 پاؤں کھینچ کر لگیں
 سے باہر نہ کہ
 لیتا ہے۔ یعنی
 مجھے یہ سعادت
 بھی حاصل نہیں
 کرنے دیتا کہ

کے لیے ہنرے آئے تو اسے شیریں مل جائے گی۔ مزہ دینے یہ شرط پوری کر دی۔ اب خستہ کو تشویش ہوئی۔ آخر ایک بڑھیا کو یا ایک روایت کے مطابق ایک مصاحب کو بڑھیا کا بھیس بدلوا کر مزہ دے کے پاس بھیجا گیا۔ وہ روٹی چٹائی گئی۔ مزہ دینے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں شیریں کی دایہ ہوں، میں نے ہی اسے پالا تھا۔ وہ آج مر گئی۔ مزہ دینے یہ سنتے ہی تیشہ سر پر مارا اور مر گیا۔

تشریح : مزہ دینے جھوٹے ہنر سے ہوتا ہے۔ میرے دل میں اس کی اس سادگی کی انتہائی عزت ہے۔ سچی چاہتا ہے کہ اس کے پاؤں چوم لوں امنوس، صد امنوس، اُس بڑھیا کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ گئے، جس نے شیریں کی موت کی جھوٹی خبر مزہ دے تک پہنچائی اور اسے یوں موت کے گھاٹ اتارا۔

مزہ دے کی سادگی یہ کہ محبوب کی خبر موت سنتے ہی جہان بین بھی نہ کی اور اسے درست مان کر جان دے دی۔

۳۔ **تشریح :** انسان سے جیسا جرم سرزد ہوا، ویسی ہی اسے سزا ملتی ہے۔ اس کا نہایت اچھا نمونہ یہ اور اس سے اگلا شعر ہیں۔ کہتے ہیں کہ راہزن کا حملہ ہوا اور ہم نے اس کی گرفت سے بچ نکلنے کے لیے بھاگنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، لیکن پکڑے گئے اور ہمارے لیے یہ سزا تجویز ہوئی کہ راہزن کے پاؤں دبائیں۔ گویا گرفتاری اور اسیری سے بچنے کے لیے راہزن کو جتنا دھڑایا تھا، اتنی ہی سزا مل رہی ہے اور سزا میں مشقت یہ ہے کہ راہزن کے پاؤں دبائیں۔

۴۔ **تشریح :** میرا بدن زخموں سے چھڑھٹا۔ اُن زخموں کے لیے مرمم کی تلاش میں ہمیں دُور دُور پھرتا پڑا۔ اب حالت یہ ہے کہ پاؤں بدن سے زیادہ زخمی ہیں۔ دُور دُور پھرنے کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ پاؤں کو دیا وہ سے زیادہ تکلیف پہنچے۔ شرکی عوامی صورت ایسی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ مرمم کی تلاش میں دُور دُور پھرنے کا تو کچھ فائدہ نہ ہوا، یعنی بدن جیسا زخمی

تھا۔ ویسا ہی رہا۔ مزید معیبت یہ پیش آئی کہ پاؤں تن سے بھی بڑھ کر زخمی ہو گئے۔

یہ صورت حال بھی زندگی میں پیش آتی رہتی ہے۔ مثلاً تکلیفوں کو دور کرنے کے لیے تنگ و دور شروع کر دے، لیکن سو متدبیر یا سہی کی غامی کے باعث پہلی تکلیفیں دور ہونے کے بجائے مزید تکلیفیں پیش آ گئیں۔

۵۔ **مشریح :** صحراؤں میں پھرنے کا ذوق اس طرح فطرت میں رچ گیا تھا کہ مرنے کے بعد غسل بھی دے دیا گیا، کھن بھی ہنایا گیا، لیکن پاؤں بدستور پل رہے ہیں۔ یہ اسی فطری ذوق کا کرشمہ ہے۔

۶۔ **مشریح :** بہار کے موسم میں ہر طرف پھولوں کے جوش کا یہ عالم ہے کہ پرندے باغ میں اڑتے ہیں تو ان کے پاؤں جا بجا الجھتے ہیں۔ اس کے دو مقدم ہو سکتے ہیں، اول یہ کہ پھولوں کا جوش خود حال کی طرح پورے باغ پر بچھا گیا ہے اور اس میں پرندوں کے پاؤں الجھ رہے ہیں۔ دوم یہ کہ پھولوں کے جوش نے باغ میں ہر طرف عجیب کیفیت پیدا کر رکھی ہے، پرندہ اڑتا ہے، لیکن پھولوں کی کیفیت دیکھتے ہی پر سمیٹ کر نیچے اتر آتا ہے، گو یادہ جانا نہیں چاہتا۔

۷۔ **مشریح :** پرانے انداز کا ایک خیالی شعر ہے۔ محبوب کی نزاکت کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، آج اس نازک بدن کے پاؤں ٹوکر رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں جڑا کہ رات کو کسی کے خواب میں آیا ہو۔ اس نزاکت کا کیا کہنا کہ محبوب خواب میں بھی چل کر جانے تو اس کے پاؤں ٹوکنے لگتے ہیں۔

۸۔ **مشریح :** اے غالب! میرا کلام کیوں پر لطف احمد مزیدار نہ ہو؟ میں تو شیریں سخن خسرو کے پاؤں دھو کر پتا ہوں۔

آخری مصرع میں خسرو سے مراد بادشاہ بھی ہو سکتا ہے اور امیر خسرو بھی، دونوں شاعر تھے، اگرچہ شعر کے مدارج میں بڑا فرق تھا۔

یہ غزل سنا سننے کے دیوان میں چھپی تھی، گویا یہ قلم کے ساتھ ملا دمت کے تعلق سے پیشتر کی ہے۔ لہذا قرینہ ہی ہے کہ میرزا کے پیش نظر امیر خسرو ہوں۔ لیکن عوامی سبھا گیا ہے کہ اشارہ ابو خلیفہ بہادر شاہ کی طرف ہے۔

خسرو، شیریں اور مزہ کی مناسبت واضح ہے۔

۱۔ لغات۔

ہولِ دل : ہول

بہ معنی خوف، ہولِ دل

ایک بیماری ہے،

جس میں دل دھڑکنے

لگتا ہے اور اختلاج

شروع ہو جاتا ہے۔

واں اس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شرمسار

یعنی، یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ

آئینہ تاکہ دیدہ پنچیر سے نہ ہو

شرح : محبوب کو ہولِ دل کی بیماری ہو گئی ہے اور میں یہاں

نادم و شرمسار بیٹھا ہوں کہ یہ کہیں میری آہ و فغاں ہی کا اثر نہ ہو۔

کبھی تو یہ عالم ہوتا ہے کہ جس آہ و فغاں سے سو دج میں شکات پڑ

جاتے، وہ محبوب کے دل پر نفسِ برابر اثر نہیں رکھتی اور کبھی خوش فہمی کا یہ

عالم ہوتا ہے کہ محبوب کو ہولِ دل کی بیماری ہوئی اور عاشق نے سمجھ لیا،

کہ یہ میری آہ کا اثر ہے اور آہ کے کرنے پر شرمندہ ہیں۔

۲۔ لغات۔ تاکہ : جب تک۔

پنچیر : شکار۔

شرح : محبوب کا ذوقِ ستم ملاحظہ فرما ہے کہ جب تک کسی جانور کو

شکار کر کے نہ کھائے اور اس کی آنکھوں کو آئینہ بنا کر سامنے نہ رکھے

دیباٹش و آرائش اور بننے سونے ہی کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

شکار مارا جائے تو اس کی آنکھیں یا تو بالکل کھل جاتی ہیں یا نیم دار ہوتی ہیں اور صاف و شفاف آئینے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ محبوب ایسا ظالم ہے کہ ان آنکھوں کو آئینہ بناتا ہے، پھر کنگھی چوٹی کرتا ہے۔

۱۔ لغات :

پئے ہم : ہم

لگاتار : مسلسل۔

صدرہ : سوسو

طرح : سوسو باد۔

آہنگ : ارادہ

زمین بوس : زمین

چومنا۔

شرح : محبوب

کے کوچے میں پہنچ کر

مجھے لگاتار غش پر

غش آتے ہیں، اگویا

میں اپنے قدموں کی

زمین چومنے کے لیے

سوسو طرح ارادہ

کرتا ہوں۔

قدموں نے محبوب

کے کوچے میں پہنچایا

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

دل کو میں اور مجھے دل، محو وفا رکھتا ہے

کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو

ضعف سے نقش پئے مور ہے طوق گردن

تیرے کوچے سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اتمید بھی ہو

یہ نگاہ غلط انداز تو سہ ہے ہم کو

رنگ ہم طرحی و در و اثر بانگ حزیں

نالہ مرغ سحر، تیغ دو دم ہے ہم کو

مراڑانے کے جو وعدے کو مکر چاہا

سہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

وہاں پہنچ کر غش آئے
 لگے۔ عاشق نے
 سمجھا کہ یہ غش نہیں
 بلکہ میں قدموں کے
 احسان سے اتنا زبردست
 ہوں کہ جی چاہتا ہے
 سو سو طرح ان کی
 زمین چرووں، کیونکہ
 انہیں کی بدست میں
 یہاں پہنچا، جسے
 میرے شوق اور
 میری آرزو کی مزاح
 سمجھنا چاہئے۔

۲۔ لغات۔ ہم : ایک دوسرا جیسے باہم دگر۔
 شرح : اگرچہ وفا کے واجبات ادا کرنے میں بڑی مصیبتیں اور بڑی
 پریشانیاں امکانی پڑتی ہیں، پھر بھی میں دل پر زور دیتا رہتا ہوں کہ وفا کا
 راستہ نہ چھوڑنا چاہیے اور دل مجھے سمجھاتا رہتا ہے کہ آداب وفا سے
 الگ نہ ہونا۔ اسی سے اعزازہ کر لیجیے کہ مجھے اور میرے دل کو باہم دگر
 عشق میں الجھائے رکھنے کا کتنا شوق ہے !

۳۔ لغات۔ نقش پے مورد : چوٹی کے پاؤں کا نقش۔

رم : بھاگ، چلا جانا۔

شرح : ہماری کمزوری کا یہ عالم ہے کہ چوٹی کے پاؤں کا نقش
 میری گردن میں طوق کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے بعد ادھر ادھر جنبش محال

ہے۔ اسے محبوب! سوچ کہ اس حالت میں ہمارے لیے تیرے کوچے سے جانے یا چلے جانے کی کون سی صورت ہے؟

اس شعر میں صنعت کی شدت پر اس لیے زور دیا گیا کہ اگر چلے جانے کی طاقت ہوتی تو اس کا امکان خیال میں آ سکتا تھا۔ جب طاقت ہی نہیں رہی تو امکان ہی خارج از بحث ہے، ہم جا سکتے ہی نہیں۔

۴۔ لغات۔ نگاہ غلط انداز : وہ نظر جو غلطی سے، بھٹوے سے بے اتفاقی سے بلا ارادہ کسی پر پڑ جائے۔

زہر :

شرح : شناسائی اور جان پہچان کا ساتھ نفل کیجے تاکہ دل کے لیے امید کی کوئی روشنی باقی رہے۔ یہ آپ انجانوں کے سے انداز میں بے اتفاقی سے بلا ارادہ جو نظر ڈال رہے ہیں، یہ تو ہمارے لیے زہر ہے، جو ہمیں موت کا پیغام دیتی ہے۔

میرزا نے اس شعر میں تفاعل کی دو صورتیں پیدا کی ہیں، ایک وہ جو جانے پہچانے آدمیوں سے بڑتا جاتا ہے، دوسرا وہ جو انجانے آدمیوں سے کیا جاتا ہے۔ میرزا تفاعل پر راضی ہیں، لیکن ایسا تفاعل، جو جانے پہچانے آدمیوں سے روا رکھا جاتا ہے، کیونکہ اس میں عاشق کے لیے یہ اتید باقی رہتی ہے کہ کسی وقت تفاعل ختم ہو جائے گا اور محبوب کے اتفاقات سے جی بھر کر محظوظ ہونے کا موقع ملے گا، لیکن جو تفاعل انجانے آدمیوں سے کیا جاتا ہے، اس میں اتید کی کون سی صورت ہو سکتی ہے وہ تو ہر انجان آدمی کے لیے بڑتا جاتا ہے۔ وہ تو یقیناً عاشق کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے۔

۵۔ لغات۔ ہم طرحی۔ ہم مشرنی، یک رنگی، ایک جیسا ہونا۔

بانگ حزیں : درد بھری صدا، غم انگیز آواز

تیرغ دو دم : دو دھاری تلوار۔

شرح : صبح کو پرندہ جو فریاد و فغاں کرتا ہے، وہ میرے لیے دردِ دھاری تلواری ہے۔ اس کی ایک دھاری تو یہ ہے کہ اس فریاد و فغاں میں میرا اذنانہ ہے اور وہی سوز ہے، جو سیری فریاد و فغاں میں پایا جاتا ہے یہ رنگ مارے ڈالتا ہے دوسری دھاری یہ ہے کہ اس کی صدا نہایت غم انگیز ہوتی ہے اور وہ جہاں جہاں پہنچتی ہے، درد کی آگ بھڑکا دیتی ہے۔

۶۔ **شرح :** خواجہ حالی فرماتے ہیں :

”ترے سر کی قسم ہے ہم کو“ اس جملے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہے، ہم ضرور اڑا دیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے، یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائیں گے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ان کھانے کی قسم ہے، یعنی کبھی ہمارے ان کھانا نہیں کھاتے۔“

ہم نے محبوب سے سر اڑانے کا وعدہ دوبارہ لینا چاہا۔ اس نے کہ دیا کہ کو تیرے سر کی قسم ہے، گویا عاشق کو ضبطے میں ڈال دیا، کیونکہ سر کی قسم کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے : تیرا سر ضرور اڑا دیں گے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے : ہرگز نہ اڑائیں گے۔ اور لطف یہ ہے کہ ”تیرے سر کی قسم ہے ہم کو“ کہا تو نہیں کر کہا۔

۷۔ **لفات :** اہم : بہت زیادہ اہمیت۔

شرح : ہمارے لیے دل کو خون کینے کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن کیا کرتے، مجبور ہو گئے۔ آنکھیں بالکل بے رونق ہو رہی تھیں۔ دل خون ہو کر ان میں نہ پہنچتا تو بے رونق دور نہ ہو سکتی اور آنکھوں کی بے رونق کا ہمیں ہمید پاس و محاذ تھا، لہذا دل کو لہو میں تبدیل کر دیا تاکہ وہ بہ کر آنکھوں میں پہنچے اور ان میں غومیں آنسوؤں سے تازگی و شادابی پیدا ہو۔

۸۔ **شرح :** تمھاری نزاکت کا یہ حال ہے کہ میں نے فریاد و فغاں چھوڑ

کر خاموشی اختیار کر لی۔ اور نزاکت کے باعث تم اس خاموشی کو بھی مزید غماں قرار دے رہے ہو۔ میری عاجزی اور ناتوانی کی یہ کیفیت ہے کہ تم نے ستم سے ہند کھینچ کر تفاعل اختیار کر لیا تو میں اسے بھی اپنے لیے ستم سمجھ رہا ہوں۔

میرزا کا مقصد صرف یہ ہے کہ محبوب کی نزاکت اور عجز و ناتوانی کی کیفیت واضح کر دیں۔ اس کی نزاکت کے لیے خاموشی کو مزید غماں قرار دیا، اور اپنی ناتوانی کے لیے تفاعل کو ستم بنا دیا۔

۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ لغات - مقطع : سفر ختم ہونے کا مقام، آخری منزل۔

نجف : عام روایت کے مطابق وہ مقام جہاں حضرت علیؑ کا دفن ہے۔

طوافِ حرم : خلد کعبہ کے گرد طواف کرنا۔ یعنی گھومنا۔

کشش کا کرم : لفظ کرم کے کاف کی کشش۔ چونکہ یہ کشش

میں جوتی ہے اس لیے اسے راستہ قرار دیا۔ اس سفر کا مقصد حصولِ کرم تھا یعنی لطف و کرم سے فائدہ اٹھانے کی آرزو تھی، لہذا کشش کا کرم کی مناسبت بالکل واضح ہے۔

شرح : ہمارے لکھنؤ آنے کا سبب واضح نہیں ہوتا۔ ایک وجہ یہ بھی

ہو سکتی ہے کہ ہم سیر و تماشا کے لیے آئے، لیکن اس کے ہم چنچاں شائق نہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ لکھنؤ ہمارے سفر کا مقام اختتام اور ہمارے سلسلہ

شوق کی آخری منزل ہے، کیونکہ ہمارا ارادہ تو یہ ہے، نجف اشرف پہنچیں،

حضرت علیؑ کے دفن کی زیارت سے مشرف ہوں، پھر مکہ مکرمہ پہنچ کر خلد کعبہ کا طواف کریں اور مزینہ بیچ سے فارغ ہو جائیں۔ گویا ہماری آخری منزلیں تو نجف اور مکہ مکرمہ ہیں۔

اسے غالب ! ایک اُمید جیسی ہے جارہی ہے اور کرم کے کاف کی کشش ہمارے لیے راستہ بن گئی ہے۔

یہ غزل میرزا غالب نے اُس زمانے میں کہی تھی جب وہ پنشن کے لیے

مقتدے کے سلسلے میں ٹکلتے جاتے ہوئے لکھنؤ شہر سے تھے۔ غالباً وہاں کوئی طبری مشاعرہ پڑا، جس کے لیے غزل کہی گئی، اور نہ ایسی زمین میں مرزا خود کوئی غزل لکھنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

میرزا کے خاندان کے بے ابتدا میں دس ہزار روپے پنشن مقرر ہوئی تھی، لیکن نواب احمد بخش ناس والی فیروز پور مہجر کو نے پہلے یہ رقم نصف کرائی، پھر اس میں دو ہزار روپے کا حصہ دار ایک ایسے شخص (مرزا حاجی) کو بنا دیا، جو مرزا کے خاندان میں شامل نہ تھا۔ گویا پنشن دس ہزار کے بجائے تین ہزار رہ گئی۔ میرزا غالب اس بے ٹکلتے گئے تھے کہ دس ہزار کی ابتدائی پنشن سماں کراش اور جتنی رقم بقایا رہ گئی، وہ یکیشٹ وصول کریں۔ اسی امید کا ذکر انھوں نے مطلق میں کیا ہے۔ مقتدے میں کئی سال صرف ہو گئے، نتیجہ میرزا کے غلامانہ مطلق کا پہلا مصرع ابتدا میں یوں تھا:

لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید

معتمد الدولہ آخر میرزا کے زمانے میں اودھ کے نائب اسطنت یعنی وزیر اعظم تھے، لیکن ان سے ملاقات کی مناسب صورت پیدا نہ ہوئی اور میرزا نے صریح جلد دا

۱۔ تشریح و شعر سے

واضح ہے کہ اس میں ایک حصہ

مقتد ہے، یعنی محبوب سے

بہت کہا کہ رقیب سے میل

جول در کھو اور ہمیں تھوڑے عشق و رنناؤ

لیکن محبوب نے عاشق کی اتناں اوتھا

کا خیال نہ کیا اور رقیب کے ساتھ سلسلہ

روابطہ دستور قائم رکھا۔ اس

کے برعکس خود عاشق سے رابطہ

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟

بچتے نہیں مؤانذہ روزِ حشر سے

قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی یگینہ کشش و حق ناشناس ہیں ؟
 مانا کہ تم بشر نہیں ، خور شید و ماہ ہو
 اُبھرا جُو ! نقاب میں ہے ان کے ایک تار
 مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
 جب میکدہ چھٹا ، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
 مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو
 منتے میں جو بہشت کی تعریف ، سب درست
 لیکن خدا کرے ، وہ تری جلوہ گاہ ہو
 غالب بھی گرنہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
 دنیا ہو یا رب ! اور مرا بادشاہ ہو

منقطع کر لیا ۔ اب
 عاشق بے بس سا ہو
 گیا تو پریشان ہو کر
 کتا ہے کہ اگر تم
 رقیب سے رسم و راہ
 قائم رکھنے پر تھے
 بیٹھے ہو اور کسی طرح
 رک نہیں سکتے تو بتر
 تم جاؤ اور رقیب
 جانے ۔ میں رشک
 کی مصیبت جھیل لینگا
 لیکن مجھ سے بھی تعلق
 قائم رکھو تو کون سا
 گناہ ہو جائے گا ۔
 جب میں نے اقرار

کر لیا کہ رقیب سے تمہارے تعلق پر اعتراض نہ کروں گا تو تمہیں میری پریش
 حال میں کیوں ٹائل ہے ۔ کبھی کبھار ہی پوچھ لیا کرو کہ بھئی ! کیسے ہو زندگی کیونکر
 گزرتی ہے ؟

۲۔ لغات ۔ مواخذہ : جواب دی ۔ پوچھ گچھ ۔

تشریح : اے محبوب ! روزِ حشر کی جواب دی اور پوچھ گچھ سے تمہارے
 بچے رہنے کی کوئی صورت نہیں ۔ بیک قتل کا ذمہ دار رقیب تھا ، لیکن تم اس
 قتل کے گواہ ہو ۔ جس طرح جرم کا مرتکب لازماً سزا پائے گا ، اسی طرح جرم کا
 گواہ پوچھ گچھ سے بچ نہیں سکتا ۔ ضروری ہے کہ اس سے گواہی لی جائے ۔

۳۔ شرح : ہم نے مانا کہ تم بشر نہیں ہو، بلکہ سودج اور چاند ہو لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سودج اور چاند بھی بے گناہوں کو مارتے ہیں اور لوگوں کا حق نہیں پہچانتے ؟

مطلب یہ ہے کہ بے گناہ کو مارنا اور حق نہ پہچانا محبوب کی خاص صفیتیں ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ محبوب حسن و جمال کے بل پر سودج اور چاند ہونے کا مدعی بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا سودج اور چاند میں بھی وہ صفیتیں موجود ہیں جو محبوب کا خاصہ ہیں ؟

۴۔ شرح : محبوب کے نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ بدگمان عاشق کا خاصہ ہے۔ اسے فوراً خیال ہوا کہ مبادا یہ کسی کی نگاہ ہو۔ جو عین نقاب پر اگر جم گئی ہے اور اسی غم کے مارے عاشق مرا جیا رہا ہے۔

۵۔ شرح : خواجہ حاکمی فرماتے ہیں :

- اس شعر میں ازراہ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا، جس کے کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ، جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا عادت تھا، جب یہی چھوٹ گیا تو اب مسجد مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات، جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں، وہاں بھی میکدہ بچھنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔

جو مقام شراب نوشی کا مرکز تھا، جہاں پینے کی تمام لذتیں متبایں تھیں، جب وہی ہاتھ سے نکل گیا تو اب کسی خاص جگہ کی قید کیا ہے ؟ جہاں بھی موقع ملے اپنی لینے سے انکار نہیں۔ مسجد، مدرسہ اور خانقاہ تینوں ایسے مقام ہیں

جہاں شراب نوشی ہو ہی نہیں سکتی۔ مقصود یہ ہے کہ جب ہم ان مقامات میں بھی پینے کے لیے تیار ہیں، جو شراب نوشی کے لائق نہیں تو باقی مقامات میں ہمیں کب انکار ہو سکتا ہے ؟

مولانا طہطائیؒ بجا فرماتے ہیں کہ حاصل زمین بھی شرع ہے اور اس کا اطلاق زندگی کے مختلف دائروں میں کیا جا سکتا ہے۔ میرزا نے اپنے دل کی جو کیفیت بیان کی ہے، وہ بالکل طبعی اور عام ہے، جب وہ مقام ہاتھ سے نکل جائے، جس میں دل اُکھچا ہوا ہو اور جو مختلف اعتبارات سے انسانی روابط کا مرکز ہو تو ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان کو کسی اچھے یا برے مقام کا کوئی خاص لحاظ نہیں رہتا۔ تقسیم کے دور ان میں ہم نے دیکھا کہ جن آبادیوں کو صدیوں کے وطن چھوڑنے پڑے۔ وہ عالم غربت میں جہاں کہیں پہنچے، ٹھہر گئے اور ان کے دلوں میں کسی بھی مقام سے کوئی وابستگی باقی نہیں رہی تھی۔ یہ بھی اسی حقیقت کی دلیل تھی کہ حب میکہ چھوٹ گیا تو کسی جگہ کی قید کا سوال ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

۶۔ شرح : بہشت کی تلاش میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اس سے اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ماننے لیتے ہیں کہ وہ بالکل درست ہے۔ ہمیں اس کی خوبی میں کوئی کلام نہیں، لیکن ہمارے لیے اصل معیار یہ ہے کہ تیرا جلوہ وہاں نظر آئے، خدا کرے کہ ایسا ہو! اگر یہ جلوہ موجود نہیں، ہم دیدار سے فیض یاب نہیں ہو سکتے تو جو بھی خوبی بیان کی جاتی ہے، ہماری نظروں میں بیچ ہو گی۔ اے محبوب حقیقی ! ہمارے لیے بہشت وہی ہے، جہاں تیرا قرب نصیب ہو تیرا دیدار میرا آئے۔ اگر یہ دولت نہیں مل سکتی تو سب کچھ بیچ ہے۔

میرزا غالب نے جزا و سزا کے باب میں جو کچھ کہا، اس میں دو چیزیں بالخاصہ قابلِ توجہ ہیں۔ اول یہ کہ عبادت میں کسی ایسے عیش و راحت کی کوئی ترغیب نہ ہو، جیسا مادی صورت میں یہاں تیرا آ سکتا ہے، دوم بہشت سے

مقصود حقیقی باری تعالیٰ کا دیدار ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ بیکسر
نا قابل توجہ ہے۔

ایک نسخہ - تری جلوہ گاہ - کی جگہ - ترا جلوہ گاہ - بھی ہے۔

۷۔ - شرح : اے خدا ! تجھ سے میری دعا ہے کہ دنیا قائم رہے۔
اور میرا بادشاہ یعنی ابو ظفر بہادر شاہ ہمیشہ تخت حکومت پر جلوہ افروز ہو۔
بہتر تو یہ ہے کہ غالب جیسا با کمال بھی ساتھ رہے، لیکن اگر یہ منظور نہ ہو تو
کچھ مضائقہ نہیں، اس سے کوئی نقصان نہ ہو گا۔ مگر دنیا اور بادشاہ کا ہونا
بہر حال ضروری ہے۔

۱۔ شرح :

وہ دن ہی نہ رہے
جب کہا کرتے تھے
کہ محبوب سے گفتگو
ہوگی تو دیکھیے یہی
کچھ کہا جاتے ہیں
جو کچھ کہنا تھا، نہ بچکے
محبوب سے چپکا اور
کچھ بھی نہ ہوا۔ اب
بتاؤ کہ دوبارہ کہیں
تو کیا ہو، یعنی دوبارہ
کہنے کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

۲۔ شرح :

بدلے ذہن میں

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کب سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیونکر ہو،
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں؟ ہو تو کیونکر ہو؟
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے؟
جیا ہے اور یہی گوگو تو کیونکر ہو؟
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی نحو تو کیونکر ہو؟
اُچھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو؟

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو؟
ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پر ہمیں نہ دد تو کیونکر ہو؟
غلط نہ تھا، ہمیں خط پر گناہ تسلی کا
نہ مانے ویدہ ویدار جو تو کیونکر ہو؟
بتاؤ اُس مشرہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیونکر ہو؟
مجھے جنوں نہیں، غالب ازلے بہ قولِ قصور
”فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو“
طاری کر دکھتا ہے۔ اس طرح ہم کشمکش کی بلا میں پھنسے ہوئے ہیں اور کچھ سمجھ
میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ دوسری طرف محبوب کی حالت یہ ہے کہ اس پر جیسا طاری
ہے اور وہ گوگوں میں مبتلا ہے۔ اس گوگوں سے نجات کیونکر ہو سکتی ہے؟
۴۔ شرح : اے محبوب! ہم تمہیں سے پوچھتے ہیں کہ اگر تجوں میں حسینوں
کی عادت ایسی ہو، جیسی تھادی ہے تو جن لوگوں کا شیوہ صنم پرستی ہے، یعنی
وہ حسینوں پر جان دیتے ہیں اور انہیں پوجتے ہیں، ان کا گزارہ کیونکر ہو؟
مطلب یہ ہے کہ بیشک حسینوں کے لیے خشکی اور عتابِ زیبا ہے، لیکن
اس حد تک کہ عاشق اسے برداشت کر سکیں اور اس طرح گزارہ ہوتا جائے۔ مگر

لیک نکر اور ایک سوچ ہے
اسی کو ہم وصال سمجھ رہے
ہیں۔ سوچ یہ ہے کہ اگر وصال
نہ ہو تو کہاں جائیں اور جو تو
اس کی صورت کیونکر بنے؟
ہم رات دن اسی سوچ
میں ڈوبے رہتے ہیں، گویا
اس سوچ سے آگے کوئی قدم
نہیں اٹھا۔ صاف مطلب یہ
ہے کہ وصال نہیں ہوا۔ بس
اس سوچ ہی میں ہم گمن ہیں۔
۳۔ شرح :
ہم محبوب کا ادب اور پاس
لحاظ کرتے ہیں۔ اُدھر آئندوں
اور ارا مالوں نے دل پر غمخوار

خفگی اور عتاب ہی پر سلوک کا مار ہو تو ظاہر ہے کہ بھاپے عاشق زیادہ عرصے تک گزارہ نہ کر سکیں گے اور ختم ہو جائیں گے۔

۵۔ شرح : خواہجہ حالی فرماتے ہیں :

- اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو ؟ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہو ناگوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو گے ؟

محبوب آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر خستے اور جوش میں آجاتا ہے۔ گویا اسے اپنا عکس دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ جب حالت یہ ہے تو واقعی شہر میں ایک دو حسین محبوب جیسے موجود ہوں تو خدا جانے ، اس کا خفتہ اور عتاب کیا رنگ لائے ؟

دوسرے معنی بقول حالی یہ ہیں کہ ایک ہی حسین نے قیامت برپا کر رکھی ہے ، اگر ایسے ہی ایک دو اور شہر میں موجود ہوں تو واقعی اہل شہر کا جینا و دبھرا ہو جائے۔

۶۔ شرح : جس سیاہ نصیب کو ایسا ہی تیرہ و تار یک دن نصیب ہوا

جیسا میرے لیے مقدم ہے ، وہ شخص رات کو دن نہ کہے تو کیا کرے ؟ مطلب یہ ہے کہ میرے روزگار کی تاریکی اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ رات اس کے مقابلے میں بہ منزلہ دن کہے۔

بعض اصحاب نے اسے عربی کے مندرجہ ذیل شعر سے ملتا جلتا قرار دیا ہے :

ز فرود آقا بم بود خبر کہ بے تو !

چند روز بعد فتنہ کیاں شب و روزم از سیاہی

مجھے سودج کی روشنی کی خبر ہی نہیں ہوتی ، کیونکہ اسے محبوب ! تیرے بغیر

میرے دن اور رات تیری دو زلفوں کی طرح یکساں سیاہ ہیں ۔
 ظاہر ہے کہ دونوں مصنوع یقیناً سیاہ نصیبی کے ہیں ، لیکن دونوں میں
 حقیقتہً کوئی یکساںی نہیں ، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوسرا پہلے سے اخوذ ہے عرفی
 کہتا ہے کہ سو درج کے روشن ہونے کی مجھے خبر بھی نہیں ہوتی ، کیونکہ میرے دن
 اور رات یکساں سیاہ ہیں ، جس طرح تیری زلفیں سیاہ ہیں ۔ غالب کہتا ہے میرا
 دن اتنا تاریک ہے کہ اس کے مقابلے میں رات ، دن معلوم ہوتی ہے ۔
 سیاہ نصیبی کے اور بھی بہت سے مصنوع کہے گئے ، مثلاً میرزا غالب :

نومیدی ماگردش آیام نثارو
 روزے کہ یہ شد سحر و شام نثارو

ہماری نابوسی میں دن رات کی گردش ناپید ہے ۔ جو دن تاریک ہو جائے
 اس کی صبح و شام کیا ہو سکتی ہے ؟ یا
 گشت در تاریکی روزم نہاں
 کو چراغے تا بجوم شام را

میری شام دن کی تاریکی میں چھپ گئی ۔ چراغ کہاں ہے تاکہ میں اسے
 ٹھونڈوں ۔

جو ہر طبع درخشان است بیک
 روزم اندا بر نہاں می رود

میری طبیعت کے جو ہر یقیناً درخشان ہیں ، لیکن میرا دن تاریک ٹھانڈا
 ہیں چھپا ہوا اگر ذرا ہے ۔

۷۔ - شرح : جب محبوب ہماری بات ہی نہ پوچھے تو ہمیں اس سے
 کیا امید ہو سکتی ہے اور اس کے دل میں ہمارے لیے قدر و منزلت کی کون
 سی گنجائش رہ جاتی ہے ؟

۸۔ **تشریح :** ہم سمجھتے تھے کہ اسے محبوب ! تمہارا خط آنے سے دل کو تسکین ہو جائے گی ، لیکن دیدار کی مشتاق آنکھیں نہ مائیں تو کیا کیا جائے وہ تو خط پر مطمئن نہیں ، بلکہ جلوہ دیکھنے کی طلب گار ہیں۔

۹۔ **تشریح :** اس شعر میں خاصی تعقید ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب کی مرثیہ کو دیکھ کر قرار کیونکر آ سکتا ہے ؟ یہ تو ڈنک بن کر گدگد ہاں میں اُتر جاتی ہے اور جو چیز ڈنک بن کر گدگد ہاں میں اُتر جائے۔ وہ قرار کیونکر آئے دے گی۔
- قرار کا تعلق کیونکر ہو سکتا ہے اور تیرہ نیش ہو گدگد ہاں میں فرو تو ،
بیچ میں جہلہ معترضہ ہے۔

۱۰۔ **تشریح :** یہ قول حضور سے واضح ہے کہ مطلق کا دوسرا مصرع ابوظہر بہادر شاہ کا ہے جس کی تفسیر مرزا نے کر دی۔

کہتے ہیں کہ اسے غالب : میں دیوانہ نہیں ، اس لیے بقیہ اور ہوں کہ محبوب سے بدائی کا عالم ہے اور بہادر شاہ بھانڑا چلے ہیں کہ محبوب کے فراق میں تسکین و تسلی پانے کی کوئی صورت نہیں۔

۱۔ **لغات :**
کسی کو دوسے کے دل کوئی ، نواسنج فغاں کیوں ہو ؛
نواسنج فغاں :
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو ؛
فریاد کرنے والا۔
تشریح :
وہ اپنی خود چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں ؛
عشق کا تقاضا
بسک سرن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو ؛
یہ ہے کہ صبر
کیا غم خوار نے رسوا ، لگے آگ اس محبت کو
ضبط کیا جائے۔
ماتش کے لیے
نہ لاوے تاب جو غم کی ، وہ میرا زواں کیوں ہو ؛
مزید فغاں

ذیبا نہیں۔ جب دل کسی کو دے دیا تو وہ نے دھونے اور فریاد و فغاں کرنے کا مطلب کیا ؟ زبان دل کے جذبات کی ترجمان ہے۔ جب دل ہی پہلو میں نہ ہو تو زبان کیوں کھولی جائے ؟

۲۔ لغات : وضع : روش ، دستور ، طوطی ، انداز، بیان
بہ معنی خود داری۔

سبک سر : اوچھا ، کم حوصلہ

سرگراں : خفا ، ناراضی ، ناخوش۔

شرح : محبوب ناراضی اور خفگی کی عادت نہیں چھوڑ سکتا ، ہم اپنی وضع یعنی خود داری کیوں ترک کریں ؟ کیا اوچھے اور کم حوصلہ ہو کر ہم ان سے پوچھیں کہ ہم سے ناراضی کیوں ہوں ؟

مولانا طیبائی فرماتے ہیں : اس نے وہ بندش پائی کہ نثر میں بھی ایسے بوجہ نہ فقرے نہیں ہو سکتے ۔

۳۔ لغات - محبت : مراد ہے ، غمخوار کی محبت ، دل سوزی
اور ہمدردی۔

شرح : غم خوار نے میری تھوڑی سی کیفیت سنی اور اس درجہ مضطرب ہو گیا کہ سب کے سامنے راز عشق فاش کر دیا۔ اس طرح میں رسوا ہوا۔ میرے عشق کا بھید کھل گیا ، جسے میں انتہائی صبر و ضبط سے چھپائے بیٹھا تھا۔

محبوب کے لیے بھی رسوائی پیدا ہوئی : ایسی محبت ، دل سوزی اور غمخواری کو آگ لگ جائے جس شخص میں غم کو ضبط کرنے کا حوصلہ نہیں ، وہ میرا راز دواں کیوں بنے ؟

شعر کا غور طلب پہلو یہ ہے کہ خود ہر مصیبت نہ رہے تھے ، لیکن انتہائی ضبط سے کام لے رہے تھے اور عشق اسی امر کا متقاضی تھا۔ غم خوار سے سرسری بات بھی برداشت نہ ہو سکی اور اس نے رسوائی تک نوبت پہنچا دی ۔ گئے آگ

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑتا مٹھرا
 تو پھر اے سنگِ دل! تیرا ہی سنگِ آستان کیوں ہو؟
 قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر مہم
 گرمی ہے جس پر گل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟
 یہ کہہ سکتے ہو؟ ہمِ دل میں نہیں ہیں؟ پر یہ بتلاؤ
 کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟
 غلط ہے جذبِ دل کا جھگڑہ دیکھو، جرمِ کس کا ہے؟
 نہ کھینچو گرم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟
 یہ نقتہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
 ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟
 یہی ہے آزماتا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
 عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟
 کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ٹٹنے میں رسوائی؟"
 بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کیوں کہ "ہاں کیوں ہو؟"
 نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب؟
 ترے بے مہر کرنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

اس محبت کو" سے آخر شعر تک غم خوار کی ذمت سے واضح ہے کہ دوسری اور سہمردی کا یہ طریقہ انتہائی ناراضی کا باعث ہوا۔ نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ہو، مگر غم خوار کی بے حوصلگی نے کہیں کا نہ رکھا۔

۴۔ شرح : جب ہماری وفا اور ہمارے عشق کی کوئی قدر نہ ہوئی اور صرف سر پھوڑ کر مرنے کا ہی باقی رہ گیا۔ تو اسے پتھر جیسے دل والے محبوب! بتا کہ تیرے ہی دروازے کے پتھر سے کیوں ٹکرائیں؟ جہاں کہیں موقع ملے گا، یہ بھی کر لیں گے۔

مطلب یہ کہ محبوب کے سنگ آستان سے جو بھی تعلق ہے، اس کی بنیاد تو یہ ہے کہ عاشق کی وفاداری اور پُر خلوص عشق کا پاس و لحاظ کیا جائے۔ جب پاس و لحاظ ہی نہ رہا تو سر پھوڑنا باقی رہ گیا۔ اس کے لیے محبوب کے سنگ آستان کی تخصیص کیوں؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : "یہ شعر رنگ و سنگ میں گوہر شہوار ہے۔" مولانا نے شعر کے اس پہلو پر بھی بحث کی ہے کہ "سنگ دل" کی جگہ "ہونا" کا لفظ بھی آ سکتا تھا، لیکن میرزا نے سنگدل کو اس لیے ترجیح دی کہ یہ سنگ آستان سے قریب تھا اور بے وفا اس لیے نظر انداز کیا کہ وہ لفظ "وفا" سے دُور ہو گیا تھا۔

۵۔ شرح : مولانا طباطبائی نے بجا فرمایا ہے کہ ان دو مصرعوں میں اس قدر معانی سما گئے ہیں، جن کی تفصیل لطف سے غالی نہیں، مثلاً :
۱۔ لفظ "قفس" سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرندہ قشمن سے جدا ہو کر قید ہو گیا ہے۔ یہ پورا ٹکڑا اصل شعر میں مفرد ہے۔ صرف لفظ "قفس" سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔

۲۔ اس پرندے نے باغ میں بھلی گرتے ہوئے دیکھی اور بہ حالت اسیری اسے لہجہ ہوئی کہ خدا جانے، میرا قشمن اجڑ گیا یا جل گیا۔ کہاں یہ ہے کہ

دوسرے مصرع کا صرف ایک لفظ، یعنی "کل" اس پورے مضمون پر دلالت کر رہا ہے۔

۳۔ ایک اور پرندہ، جو طائر اسیر کا ہم سفر و ہمدم ہے، پتھر کے سامنے کسی شاخسار پر آ بیٹھا ہے۔ اس مضمون پر صرف لفظ "ہدم" دلالت کر رہا ہے۔

۴۔ طائر اسیر ہمدم سے پوچھتا ہے کہ فردا باغ کی روداد تو بتاؤ، لیکن اس کا آشیانہ جل چکا ہے اور ہمدم روداد سنانے میں مترقو ہو گیا ہے۔
۵۔ طائر اسیر نے ہمدم کے ترقو سے اندازہ کر لیا کہ اس کے نشین پر آفت آئی، مگر اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ باغ میں سیکڑوں آشیانے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ بھلی میرے ہی آشیانے پر گری ہو؟

۶۔ اس طرح اپنے دل کو سمجھا کر ہمدم سے کہتا ہے کہ بھائی! تو باغ کی کیفیت بتانے میں کیوں متذبذب ہے۔ جو بھلی کل گری تھی، کیا ضروری ہے کہ وہ میرے ہی آشیانے پر گری ہو؟

۷۔ یہ پوری داستان اس درجہ درد انگیز اور غم ناک انداز میں بیان کی گئی ہے کہ ہر سننے والا تڑپ اٹھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے شعر کے نہیں جاتے، ایسا ہوتے ہیں۔

۶۔ **شرح :** پہلے مصرع میں استغناء انکاری ہے۔ یعنی تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم دل میں موجود نہیں۔ جب حقیقت یہی ہے، یعنی دل میں تھما ہے سو کوئی موجود نہیں تو ہمیں بتاؤ کہ آنکھوں سے کیوں پوشیدہ ہو؟
بظاہر یہ عذاب محبوب حقیقی سے ہے اور تقاضا یہ ہے کہ محض دل میں موجود رہنا کافی نہیں، ذرا آنکھوں کو جمال سے بھی شرف بخشے۔

۷۔ **شرح :** تمھارا کسی پر مہربان ہونا اور دوست بننا ایک ایسا فتنہ ہے، جو کسی کا گھر برباد کرنے کے لیے کم نہیں۔ پھر آسمان کو اس سے

دشمنی کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے ؟ یعنی اسے محبوب اتمہاری دوستی کی حیثیت وہی ہے جو آسمان کی دشمنی کی ہے ۔

اس شعر میں عشق کے لوازم کی تصویر نہایت عمدگی سے کھینچی گئی ہے ۔

۹۔ **شرح :** جب تم نے میرے دشمن معین رقیب سے دوستی کا رشتہ

جوڑ دیا اور اس کے محبوب بن گئے تو مجھے کیوں آزماتے ہو ؟ میرا امتحان کیوں لیتے ہو ؟ اگر اسی کا نام آزماتا ہے تو بتاؤ سنا کا کسے کہتے ہیں ؟

آزمائش کے لیے مزدوری تھا کہ رقیب کے ساتھ محبوب کا کوئی قطعی فیصلہ

نہ ہو تا ۔ جب فیصلہ ہو چکا تو آزمائش واقعی دل آزاری ہے ، بالکل بے سبب اور بے وجہ ۔

۱۰۔ **شرح :** ہم ہر چند کہتے رہے کہ غیر سے نہ ملو ، رسوا ہو جاؤ گے ۔

تم نے کہا : بھلا اس میں رسوائی کی کیا بات ہے ؟ " اُن صاحب : طہیک کہنا سچ کہا ، پھر فرمائیے کہ " اُن رسوائی کیوں ہو ؟

دوسرے مصرع کا حرف حرف محبوب کے قول پر ایک بھر پور طنز ہے کہ اس سے بہتر طنز کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی ۔ مولانا طہا طہائی بے اختیار ہیکار اٹھے کہ " اس کی بندش سحر کے مرتبے تک پہنچ گئی ہے " یقیناً سحر ہے ۔

۱۱۔ **شرح :** اے غالب ! کیا اب طمنوں سے مطلب برآری مقصود

ہے ؟ یعنی محبوب کو بے میر کہہ کر مہراں بنا لینا چاہتے ہو ؟ تم لاکھ ایسے طمنے وہ بھلا وہ تم پر مہراں کیوں ہونے لگا ۔

۱۔ **شرح :**

" اب " کے لفظ سے

نظا ہر ہے کہ شاعر کو

دوستوں ، رفیقوں

رہے اب ایسی جگہ چل کر ؛ جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

اور ہم وطنوں سے بے درد دیوار سا اک گھر بنا یا چاہیئے
 اتنے آزاد پنپے ہیں کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
 کہ وہ ان کی صحبت سے بیزار ہو گیا ہے پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
 اس درجہ بیزار ہو گیا ہے کہ کسی ایسی
 جگہ جا رہنے کا ارادہ کر لیا ہے، جہاں کوئی موجود نہ ہو۔ نہ کسی سے بات ہو سکے، نہ
 کوئی اس کی بات سمجھ سکے۔

”ہم سخن“ سے واضح ہے کہ کوئی ایسا شخص موجود نہ ہو جس سے بات کی جا
 سکے۔ ہم زبان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ایسا شخص نظر نہ آئے، جو اس کی
 بات سمجھ سکے، کیونکہ بات سمجھنے کے لیے ہم زبان لازم ہے۔ ہم مضمون کی صحبت
 سے اتنی بیزاری اس امر کی دلیل ہے کہ اسے بدرجہ کمال رنج پہنچے۔

۲۔ **مشرح :** ایک ایسا گھر بنا یا جائے، جس کی نہ کوئی دیوار ہو اور نہ کوئی
 دروازہ۔ مقام ایسا ہو، جہاں نہ کوئی پڑوسی ہو اور نہ کسی چوکیدار کی ضرورت پیش
 آئے۔ گویا ساری دنیا سے علیحدگی ہو۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ دیوار نہیں ہوگی تو پڑوسی بننے کا امکان ہی نہ رہے گا۔ کوئی
 شخص پڑوسی اس صورت میں بن سکتا ہے کہ اس کی جگہ متغیبن ہو جائے۔ تعین کے لیے
 دیوار لازم ہے، جب دیوار بنانی ہی منظور نہیں تو پڑوس خود بخود خارج ہو گیا۔ چوکیدار
 دروازے پر مقفول کیا جاتا ہے۔ جب دروازہ ہی نہ ہوگا تو چوکیدار کی کیا ضرورت
 رہی۔ کمال یہ ہے کہ ”بے درد دیوار گھر“ نہیں کہا ہے ”بے درد دیوار سا اک گھر“ اگر
 بالکل بے درد دیوار کہہ دیتے تو گھری نہ بنتا۔ اس لیے مزایا ایسا گھر جو بے درد دیوار
 معلوم ہو۔

۳۔ **لغات :** تیمار دار : بیمار کی دیکھ بھال، علاج معالجہ اور محبت

کرنے والا۔

شرح : اگر سمایہ ٹر جائیں تو دوا دارو، ویکھ بھال اور خدمت کرنے والا کوئی موجود نہ ہو۔ اگر سر جائیں تو نہ کوئی ماتم کرے، نہ کوئی فوسے پڑے اور نہ کوئی سوگ منائے۔

لغات :
شش جہت : از بہر تا بہ ذوقہ دل و دل ہے آئینہ
 طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ
 چھ طرفین۔ مشرق مغرب شمال جنوب اور پچھلے یعنی دنیا۔

شرح : سورج سے ذوقہ تک ہر دل ایک آئینہ ہے۔ گویا طوطی کے لیے اس کائنات کی ہر شے آئینے کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں اسے اپنی شکل نظر آ رہی ہے۔

یہاں بقلا ہر طوطی سے مراد صاحب علم و عرفان ہے، جس پر حقیقت واضح ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں، جس میں ہر وجود کو اپنی حقیقت اسی طرح نظر نہ آئے۔ جس طرح آئینے میں نظر آتی ہے، صاحب علم و عرفان کے لیے پوری کائنات وجود حقیقی کا مظہر ہے اور اسے ہر شے میں وہی وجود نظر آتا ہے۔

۱۔ لغات : ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غم کدہ
 غم خانہ، غم کا گھر، غم کا مرکز، مراد عاشق کا گھر۔
شرح : جس کی بہار یہ ہو، پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ
 ناچار یکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
 غم خانے کی دیواروں اور
 شہواری رہ و ستم ہمراں نہ پوچھ

دردانے پر اتنا سبزہ آگ آیا ہے کہ اسے سبزہ زاد کہنا چاہیے۔ جس کی بہار کا یہ عالم ہو، اس کی خزاں کے متعلق کیا کہا جائے ؟

کچھ مکانون یا ان مکاؤں میں جو اینٹ گارے یا پتھر گارے سے بنے ہوں۔ برسات کے موسم میں سبزہ آگ آتا ہے۔ اہل خانہ موجود ہوں تو دیکھ بھال کے سطلے میں سبزہ جی الگ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو دیکھ بھال نہیں ہوتی اور سبزہ مزورغ پاکر درو دیوار پر چھپا جاتا ہے۔ کھنڈروں میں ایسے نظارے عموماً ملتے ہیں۔ چونکہ سبزے کا آگنا اور ہلدانا بہار کا منظر ہے اس لیے کہا کہ جس ویران اور برباد غنائے کی بہاریہ ہے کہ ہر طرف سبزہ آگلا ہوا ہے، اس کی خزاں کے متعلق کچھ نہ پوچھنا چاہیے۔

۲۔ شرح : راستہ محدود و دشوار ہے اور ساتھی مسازوں لے جو ظلم کیے اور ستم توڑے، وہ ناقابل بیان ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ کاش ہم تنہا ہوتے، کوئی ہمارا ساتھی نہ ہوتا۔ راستے کی دشواری تو برداشت کر لیتے، مگر ساتھیوں کے ظلم و ستم سے تو محفوظ رہتے۔ اب تنہائی اور بیکسی کی حسرت دل میں بیٹھے ہیں۔ ساتھیوں سے الگ ہو نہیں سکتے اور ان کے ظلم و جور برداشت کیے بغیر چارہ نہیں۔

۱۔ شرح :

آئینہ اٹھاتے ہی محبوب کے میکڑوں جلوے سامنے آ جاتے ہیں، اس کی ہر جلوہ گری نگاہ شوق پر احسان غامض ہے رہیم یہ اتنی طاقت کہاں

صد جلوہ رو برو ہے، جو شرکاں اٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنوں عشق یعنی منور منتِ طفلان اٹھائیے

کہ دیوار کا احسان ،
اٹھاتے مائیں ۔

میرزا کا مقصود یہ
ہے کہ جس طرف بھی
آنکھ اٹھے ، محبوب
ہی مختلف شکلوں میں

دیوار ، بار منت ، مزدور سے ہے ختم
لے خانماں خراب ! نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردہ تبسم پہناں اٹھائیے

جلوہ گر نظر آتا ہے اور جلووں کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ ہم میں ان کے دیکھنے
کا احسان اٹھانے کی تاب ہی نہیں ۔ حقیقت وہ محبوب حقیقی کے جلووں کی فراوانی
نمایاں کرنا چاہتے ہیں ۔ ۔ اس کے لیے پیرایہ یہ اختیار کیا کہ ہم میں ان کے
دیکھنے اور احسان دینے کا یارا ہی نہیں ۔

۲۔ لغات ۔ پیرات معاش : روزی کا خزان یا حکم حصہ

شرح : جنون عشق کی روزی کا حکم پتھر پر ہے ، یعنی پتھر کھائیے اور
شگہاری کا تختہ مشق بنیے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی لڑکوں کا احسان اٹھانا
مزدوری ہے ۔

کوئی شخص جنون کا شکار ہو جائے تو لڑکے عموماً اسے پتھر داتے ہیں ۔ غالب
کہتے ہیں کہ جنون عشق کے لیے روزی کا جو زمان صادر ہوا ، وہ پتھروں کے لیے
صادر ہوا یا جو حصہ ہماری قسمت میں لکھا گیا ، وہ پتھروں کا تھا ۔ جس طرح جاگیر میں
زمینیں ملتی ہیں یا نقد روپے کے لیے خزانے کے نام کھنڈے جاری ہوتے ہیں
اسی طرح جنون عشق کی روزی میں پتھر کھ دیے گئے اور پتھر لڑکے داتے ہیں ۔
گویا اس روزی کا انحصار لڑکوں کا احسان اٹھانے پر ہے ۔ وہ پتھر داریں تو
جنون عشق کی روزی کا سرو سامان ہو ۔

۳۔ لغات ۔ خانماں خراب : وہ شخص جس کا گھر ویران ہو ۔

شرح : دیوار کو دیکھیے ، یہ مزدور کے بار احسان سے ٹھک گئی ہے ۔

اس سے واضح ہوا کہ احسان اٹھانا مشکل نہیں۔ اس کا بوجھ دیوار تک کو بھکا دیتا ہے، انسان کا تو ذکر ہی کیا۔ اسے وہ شخص جس کا گھر ویران ہے، اس نظر سے عبرت حاصل کر اور ہم سب کے لیے یہی لازم ہے کہ کسی کا احسان نہ اٹھائیں۔ خانہ خراب کا خطاب قابلِ توجہ ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جس شخص کا گھر ویران ہو چکا ہو، وہ اسے دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے مضطرب ہوتا ہے، لہذا اسے عین موقع پر عبرت دلانا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ خانہ ویرانی قبول کر لینی چاہیے، احسان نہ اٹھانا چاہیے۔

۴۔ - تشریح : یا تو میرے دل کے زخمِ رشک کو بدنام نہ کیجیے، یعنی لوگوں سے یہ نہ کہتے پھرے کہ دیکھو، یہ شخص غیروں سے میرے بے تکلف میل جول پر غل رہا ہے اور رشک کے باعث اس کے دل میں گھاؤ پڑ رہے ہیں یا غیروں سے پردے میں چھپ چھپ کر مسکرانا اور ناز و انداز کرنا چھوڑ دیجیے ان سے جو بھی سلوک کرنا چاہتے ہیں، وہ خلوت میں نہیں، بلکہ ہر عام کیجیے گویا زخم کے باعث دل پر چر کے اس وقت لگتے ہیں، جب آپ پردے میں غیروں کے ساتھ بیٹھ کر مسکراتے اور ہنستے ہیں۔

۱۔ لغاتِ خرابات:

شراب خانہ۔

قبیلہ حاجات : سب کی ضرورتیں پوری کرنے والا۔
تعلیم کا کلمہ ہے۔ اس کا حقیقی معنی استعمال تو خدا کے لیے ہے، لیکن عموماً واعظ، شیخ اور بزرگ کے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

بھول پاس آنکھ، قبیلہ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی، اک اور شخص پر

آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

وے داوا، اسے فلک، اول حسرت پرست کو

دل کچھ نہ کچھ تلافی، مکافات چاہیے

یہیے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
مئے سے معرض نشاط ہے، کس رویا کو

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
نشوونما ہے اصل سے، غالب افروز کو

غاموشی ہی سے نکلتے ہے، جو بات چاہیے
ہے رنگ لالہ و گل و نسیم جدا جدا

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سہراپائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

یعنی یہ حسب گردش پیمانہ صفات

عارف، ہمیشہ مست مے ذات چاہیے

یہیے جی مستقل ہے۔

شرح :

میں شراب خانے کو

آنکھ سے اور مسجد کو

یہ اعتبار محراب اور

یعنی بھوڑوں سے تشبیہ

دی گئی ہے۔ شراب

خانہ مسجد کے زیر سایہ

یعنی پاس مونا چاہیے

دیکھیے قبلہ مناجات !

آنکھ اندر کے پاس

ہوتی ہے۔

مولانا طاعن بانی

فرماتے ہیں کہ قبلہ

مناجات، مسجد کے

ضلع کا لفظ ہے جہاں

محض ضلع بولنے کے

یہیے محاورے میں تعرت

کرتے ہیں، وہاں ضلع برا معلوم ہوتا ہے اور محاورہ پورا اترے تو ضلع بولتا

حسن پیدا کرتا ہے۔ یہاں یہ لفظ محاورے کے لحاظ سے آیا ہے۔

۲۔ لغات۔ مکافات : بدلا۔

شرح : اے محبوب ! ہم آپ پر عاشق تھے اور آپ نے جی بھر

کر ہم پر ستم توڑے۔ اب ماشاء اللہ آپ کو بھی کسی سے عشق ہوگا اور جتنے

تعلیم آپ نے کیے تھے، ان کا بدلا لانا چاہیے تھا، چنانچہ مل جائے گا۔ جزاء
سینۃ، سینۃ مثلاً۔

۳۔ لغات۔ تلافی باقات : جو کچھ گزر چکا، اس کی تلافی
نقصان کا پورا ہونا۔

شرح : اے آسمان ! تو نے میری کوئی بھی آرزو پوری نہ کی۔ ہر
آرزو کا نتیجہ حسرت کی شکل میں نکلا اور میرا دل بے در پے حسرتوں سے بہرہ
ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس کے حصے میں حسرتوں کے سوا کچھ نہ آیا۔ اب میرے
دل کی حسرت پرستی ہی کی داد دے دے، میں پہلے جو دکھ اٹھا چکا ہوں، جو
مصیبتیں برداشت کر چکا ہوں ان کی کچھ نہ کچھ تلافی تو ہو جانی چاہیے۔

مطلب یہ ہے کہ حقیقی آرزو کوئی پوری نہ ہوئی، اب آسمان سے صرف
یہ کہہ رہے ہیں کہ دل نے جس بہت و اطمینان سے حسرتیں برداشت کیں،
اسی کی داد مل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان پر ہر قسم کی رنج و غم
کا هجوم ہو تو محض اتنی بات بھی بڑی تسکین کا باعث ہوتی ہے کہ کوئی نہ
دے، واہ افسان شخص نے کس پامردی سے کام لیا۔ میرزا آسمان کی طرف
سے اتنے کلمہ تحمیں کو بھی اپنی برداشت کی ہوئی مصیبتوں کی ایک حد تک
تلافی سمجھتے ہیں۔

۴۔ لغات۔ تقریب : ذریعہ سبب، باعث، شادی بیاہ،
جلب، موقع، محل، سفارش، ذکر۔

شرح : ہم نے چاند جیسے چہرے والے۔ عجبوں کی خاطر مصوری
کیسی ہے۔ آخر ان سے ملاقات کے لیے کوئی نہ کوئی سبب اور وسیلہ تو
ہونا چاہیے۔

مصوری اس لیے سیکھی کہ حسینوں کو ہمیشہ تصویریں کھینچنے کا شوق
ہوتا ہے اور وہ وقتاً فوقتاً انہیں جلاتے رہیں گے اور تصویر کھینچنے کے سلسلے

میں ان کے پاس بیٹھنے اور دیدار سے لذت اندوز ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔
 شعر میں مقصود کیرے کے ذریعے سے تصویر لینا نہیں، بلکہ وہ تصویر مراد
 ہے، جس میں صاحب تصویر سامنے بیٹھ کر مقصود سے تصویر اتروا تا ہے اور اس
 کی تکمیل میں کئی دن صرف ہو جاتے ہیں۔

۵۔ شرح : شراب پینے سے کس رو سیہ کا مقصد ہے کہ نشاط و شادابی
 حاصل ہو ؟ حاشا و کلام۔ میرا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ دن رات ایک طرح کی بیخودی
 طاری رہے۔

کمال یہ ہے کہ عیش و نشاط کی خاطر شراب پینے کو رو سیہ ہی قرار دے دیا۔
 بعض اصحاب کہتے ہیں کہ میرزا کا یہ شعر عمر خیام کی مندرجہ ذیل رباعی سے
 ماخوذ ہے۔

مے خوردن من ذا برای طرب است نے بہر فساد وین و ترک اب است
 خواہم کہ ز بیخودی بر آرم کفے مے خوردن دست بود نم زین سب است

یعنی میں جو شراب پیتا ہوں تو اس لیے نہیں کہ خوشی حاصل ہو، اس لیے ہی
 نہیں کہ دین پر باد ہو اور ادب کا رشتہ با حق سے چھوٹ جائے۔ صرف یہ چاہتا ہوں
 کہ بیخودی کی حالت میں ایک سالن لوں۔ میرے شراب پینے اور مست رہنے کا سبب
 یہ ہے۔

بلاشبہ خیام نے دوسرے بعض امور کے علاوہ عیش و طرب کی بھی نفی کی اور
 بیخودی کا لفظ بھی استعمال کیا، لیکن مرزا کا پورا مضمون اس سے الگ ہے۔ انھوں
 نے صرف نشاط کی نفی کی اور عام شراب نوشیوں کے سامنے صرف یہی مقصد ہوتا
 ہے۔ ایک ہی مصرع میں نہ محض نشاط کی نفی کی، بلکہ یہ مقصد پیش نظر رکھنے کو
 رو سیہ ہی قرار دے دیا، گویا نفی آخری حد پر پہنچا دی۔ پھر یہ نہیں کہا کہ ایک دو
 سالن حالت بیخودی میں لے لوں، بلکہ مزایا : دلدادت ایک طرح کی بیخودی چاہیے۔
 نشاط کی نفی کے بعد کسی دوسری غرض کی طرف اشارہ تک نہ کیا اور یہ معاملہ

سامع پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے حالات کی مناسبت سے جو مقصد چاہے، پیش نظر رکھے۔ لیکن میرزا کو صرف دن رات کی ایک خاص بخودی درکار ہے۔ دن کو بخودی اس لیے مطلوب ہے کہ زندگی میں قدم قدم پر تکلیف دہ حالتیں پیش آرہی ہیں۔ بخودی کی حالت میں ان کا احساس تک نہ ہوگا۔ رات کو اس لیے بخودی درکار ہے کہ وسوسے اور خواب پریشان نہ کریں گے۔

سب سے آخر میں یہ کہ خیاتم کی رباعی میں وہ کیفیت موجود نہیں، جو اس کی اکثر رباعیات کا غائدہ ہے، مگر مرزا نے دو مصرعوں میں تمام حقائق یکجا کر دیے۔ اور شعر کو اس درجہ پر کیفیت بنا دیا کہ انسان پڑھے اور وجد و سرخوشی میں گم ہو جائے۔

۶۔ ۹۔ لغات۔ فروع : فروع کی جمع، اشائیں۔

نسری : سیوق کا پھول۔

عارف : خدا شناس، صاحب عرفان۔

شرح : اسے غالب ! شاخوں کا بڑھنا اور پھولنا پہلے جڑ پر موقوف ہے جڑ چھپی ہوئی ہے اور شاخیں نمایاں ہیں۔ دوسری مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ہر بات خاموشی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی پہلے بات کا تصور ذہن میں آتا ہے پھر موزوں الفاظ کی شکل میں وہ زبان پر آجاتی ہے۔ پہلی حالت اس کے چھپے ہونے کی تھی، دوسری حالت نمود و نمائش کی ہوئی۔ گویا خاموشی اصل ہے، باتیں اس کی فروع ہیں۔

ایک اور مثال یہ ہے۔ دیکھیے، لالے، گلاب اور سیوق کے پھولوں کا رنگ وضع قطع، خوشبو اور ہر چیز مختلف ہے۔ لیکن ان سب کا پیدا ہونا، بہار پر موقوف ہے، جس کا ظاہری وجود کوئی نہیں۔ پھول رنگ لاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں، بہار آ گئی۔ بہار فرض ہے کہ پھولوں کے رنگوں میں نہ الجھیں، بلکہ بہار کے اثبات پر بندہ دیں۔ بہار اصل ہے، لالہ و گل و نسری اس کی فروع ہیں۔

انسان کو زندگی میں مختلف حالتوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ہر حالت کا

ایک خاص مقتضا ہے، وہ ضرور پورا ہونا چاہیے۔ مثلاً بخوری اورستی کا وقت ہو تو سر شراب کے منگے کے پاؤں یعنی پچھلے حصے پر ہونا چاہیے اور دعا و سناجہ کا موقع آجائے تو منہ قبلہ کی طرف کر لینا چاہیے۔ گویا بخوری ایک کیفیت ہے، جس کی اصل شراب کا خم ہے اور مناجات ایک کیفیت ہے، جس کی اصل قبلہ ہے۔ ان تمام بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کا پیمانہ جس طرح گردش کرتا جائے، یعنی مختلف صفات جس طرح وقتاً فوقتاً ظہور کریں، ان کے تقاضے ضرور پورے کیے جائیں، لیکن خدا شناس اور صاحب عرفان کے لیے لازم ہے کہ صفات کے تقاضے پورے کرنے کے ساتھ ساتھ ذات کو ہرگز نہ بھولے، بلکہ اسی کی شراب سے ہمیشہ مست رہے۔

ان چاروں شعروں میں مرزا نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ کائنات کا مبداء ایک ہے۔ زندگی میں اس کے مظاہر سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ ہر منظر جن واجبات کا طلب گار ہے، وہ ضرور پورے کیے جائیں، لیکن مبداء کو ایک لمحے کے لیے بھی بھولنا نہ چاہیے، مقصود حقیقی مبداء ہی ہے۔

مروجہ دیوانوں میں غفلت والا شرب سے آخر میں رکھ دیا گیا، حالانکہ اس کا اصل مقام اس قطعے کا آغاز ہے۔

۱۔ لغات:	بساط عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں، وہ بھی
بساط عجز:	سورمٹا ہے، بہ انداز چکیدن سرنگوں، وہ بھی
عاجزی کی	رہے اُس شوخ سے آزر وہ ہم چندے تکلف سے
بساط، عاجزی	تکلف برطرف، تھا ایک انداز جنوں، وہ بھی
کی حیثیت،	
سرورسان:	

یہ انداز چکین،
 ٹپکنے کے طور پر
 شرح :
 بحر عاجز کی بنا
 میں جو سرد سامان
 ہے، وہ صرت
 ایک ہے، یعنی
 دل اور اس
 کی کیفیت بھی
 یہ ہے کہ صرت
 خون کا ایک قطرہ
 ہے۔ وہ قطرہ
 بھی سر جھکاتے
 نیچے کی طرف
 لٹکا رہتا ہے
 گویا ابھی ٹپک پڑے گا۔

خیالِ مرگ کب تمکیں دلِ آزرده کو بخشے
 مرے دامِ تنہا میں ہے اک صیدِ زبوں، وہ بھی
 نہ کرتا کاش ! نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا، ہسم
 کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں، وہ بھی
 نہ اتنا بُر ششِ تیغِ جفا پر نازِ فراؤ
 مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں، وہ بھی
 مے عشرت کی خواہشِ ساقیِ گردوں سے کیا کبھی
 لیے بیٹھا ہے اک، دو، چار، جامِ وارثگوں، وہ بھی
 مرے دل میں ہے غالبِ اشوقِ وصلِ دُشکوہِ ہجراں
 خدادہ دن کرے، جو اس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی
 گویا ابھی ٹپک پڑے گا۔

مطلب یہ ہے کہ دل کے سوا میرے پاس کوئی سرد سامان نہیں اور دل کی کیفیت
 وہ ہے، جس کی تفصیل بتا دی گئی۔ یعنی ایک قطرہ خون ہے اور وہ بھی ٹپکا، ہی
 چاہتا ہے۔

بعض اصحاب نے اس شعر کو ضیعی کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ بتایا ہے۔
 دریاب کہ ماندہ است ذولِ قطرہ خونے
 آن قطرہ ہم از دستِ تو لبریز چکیدن
 یعنی اسے بحرِ اہان لے کر دل میں سے ظون کا ایک قطرہ اتار رہا گیا

ہے اور اس قطرے کی حالت بھی تیرے ظلم و جبر کے ہاتھ سے ایسی ہو گئی ہے، گویا اس کا پیادہ ٹپکنے سے لبریز ہو گیا ہے، یعنی ابھی گرا اور تھا ہوا چاہتا ہے۔

بلاشبہ غالب کے شعر میں بھی دل، قطرہ خون اور چکیدن کے الفاظ آئے ہیں، مگر دونوں کا معنوں ایک نہیں۔ فیضی نے بنایا ہے کہ دل میں سے صرف ایک قطرہ خون باقی رہ گیا۔ غالب نے اپنا کل سرو سامان دل بتایا اور وہ صرف لو کی ایک بوند ہے۔ فیضی نے اس قطرہ خون کو محبوب کے ہاتھوں ٹپکنے پر آمادہ قرار دیا۔ غالب نے یہ کہا کہ لو کی جو بوند میرے پاس ہے، وہ ٹپکنے کے انداز میں سر نہچے کیے ہوئے ہے۔ فیضی کا معنوں خاص ہے، غالب کا عام۔

بجزوری مرحوم مرناتے ہیں کہ پرانی عمارتوں میں آب و ہوا کے اثرات سے جا بجا کالہ جم جاتی ہے اور دیواروں سے پانی نسنے لگتا ہے۔ یہ پانی قطرہ قطرہ گرتا رہتا ہے۔ قطرے ایک دوسرے کا تاقب کرتے ہوئے آتے ہیں جو سب سے آگے ہوتا ہے، وہ ذرا سے توقف کے بعد گر پڑتا ہے۔ جو چیز ان کو فوراً گر پڑنے سے روکتی ہے، وہ پانی کے سالمات کا باہم لچک ہوتا ہے، لیکن کہاں ایک قطرے کی قوت قرار، کہاں کرف ارض کی کششِ ثقل قطرہ کیا تاب لا سکتا ہے؟ مرزا غالب نے اپنے دل کو ٹپکتے ہوئے قطرے سے مشابہ قرار دیا۔ اظہارے فرنگ نے دل کو تاشاقتی سے تشبیہ دی ہے، حالانکہ اس کا بالائی حصہ چھوٹا اور زیریں حصہ بڑا ہوتا ہے، حالانکہ دل کی کوئی تشبیہ ٹپکتے ہوئے قطرے سے بہتر ممکن نہیں۔

۲۔ لغات - تکلف بر طرف :

شرح : ہم اپنے شوخ و شنگ محبوب سے سی سخت کے لیے تھنق اور بناوٹ کے طور پر لول و ناخوش رہے۔ حق یہ ہے کہ ہمارا یہ طریق

بھی جنوں عشق ہی کا ایک انداز تھا۔

مطلب یہ کہ محبوب سے آزدہ ہونے کی حقیقت بھال ہی نہیں، لیکن تکلف سے آزدگی کی صورت پیدا کر لی۔ گویا سمجھ لیا کہ ایسا طریقہ اختیار کرینگے تو محبوب کو خیال ہوگا، وہ پوچھے گا کہ آزدگی کا سبب کیا ہوا؟ اس طرح قدر و منزلت بڑھ جائے گی، لیکن حتیٰ یہ بناوٹ، جو جنوں عشق کے انداز میں اختیار کی گئی۔ جب دیکھا کہ محبوب پر کچھ اثر نہیں ہوا تو تکلف اٹھا دیا، پھر پہلے کی طرح اس سے ربط مضبوط پر آمادہ ہو گئے۔

۳۔ لغات - صیدِ زبوں : دہلا اطلاق و ناتواں شکار جسے شکاری پسند نہیں کرتے۔

شرح : جب دل رنجیدہ و غمزدہ ہو تو اسے موت کے خیال سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ اگر ہو بھی تو میری یہ حالت ہے کہ آزد کے حال میں جننے شکار میں نے بھانس رکھتے ہیں، ان میں سے ایک دہلا اور مرلی شکار خیال مرگ جس ہے۔ یعنی مدت سے یہ مجھے ہمیشہ ہوں کہ موت آئے گی اور غمزدہ دل کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچے گا۔ لیکن موت آتی ہی نہیں اور یہ مرلی شکار میری تمتا کے دام میں مدت سے اٹھتا ہوا ہے۔ گویا یہ ایک فضول اور بے فائدہ خیال ہے، جو پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

۴۔ شرح : اسے بھدم ! کاش مجھے معلوم ہوتا کہ فریاد و فغاں نہ کرنی چاہیے۔ میں نے بے خبری میں کی، نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے دل کا درد اور بھی بڑھ گیا۔

فریاد و فغاں کی غرض تو یہ تھی کہ دل کا بخار نکل جائے گا۔ جس درد نے مجھے پریشان کر رکھا ہے، اس میں کمی آجائے گی، مگر اس نے اٹل لٹک کر درد میں اضافہ کر دیا۔ اگر پہلے سے مجھے اس نتیجے کی خبر ہوتی تو مزید یہ سہل کیوں کرتا؟

یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ انسان بعض اوقات اپنے مصائب کی تخفیف کے لیے ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے، جس سے پریشانی میں کسی قدر تخفیف ہو جائے، لیکن وہ تدبیر مصیبتوں اور پریشانیوں کی شدت میں اضافے کا باعث بن جاتی ہے۔

۵۔ لغات۔ بئرش : کاٹ۔

شرح : اے محبوب ! تیغ حیا کی کاٹ پر ناز کرنے کی کون سی وجہ ہے ؟ میرے دل میں بیتابی کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ اُن لہروں میں سے ایک خونیں لہر آپ کی تیغ حیا میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جن لہروں نے مجھے بیتابی و اضطراب کا تجربہ مشق بنا رکھا ہے، آپ کی تیغ حیا ان میں سے صرف ایک لہر ہے۔ اس کے علاوہ بھی خدا جانے کتنی لہریں اس دریا میں اضطراب کی تصویر بنی ہوئی ہے ؟

۶۔ لغات۔ واژگوں : اُٹا۔

شرح : حب جام الٹ دیا جائے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جتنی شراب بھٹی، وہ پی جا چکی۔ اب کچھ باقی ہی نہیں، جس کی خاطر جام سے کام لینے کی ضرورت ہو۔

آسمان کے ساقی سے عیش و عشرت کی شراب کی خواہش کا کون سا مقام ہے ؟ اس کے پاس بے ہی کیا ؟ اک دو چار جام، جو اس کے پاس ہیں۔ انہیں بھی اوندھا کر رکھا ہے۔ گویا جتنی شراب اس کے میخانے میں تھی، وہ ختم ہو چکی۔

اک دو چار کو جمع کیا جائے تو سات بنتے ہیں، یہ اشارہ سات آسمانوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور سات تیاروں کی طرف بھی۔

مراویہ ہے کہ اب آسمان کے ساقی سے کسی کو شراب عشرت نہیں مل سکتی، کیونکہ وہ سب کچھ ختم کر کے دکان بڑھانے بیٹھا ہے۔

بعض اصحاب نے کہا ہے کہ غالب کا یہ شعر جاتی کے اس شعر سے
ماخوذ ہے۔

پھر رخ را جامِ نگوںِ داںِ کز مے عشرتِ تمیست
بادہ از جامِ نگوںِ جستنِ نشانِ ابلہیست

آسمان ایک اوندھا پیالہ ہے۔ یہ عشرت کی شراب سے خالی ہے۔ جو
پیالہ اوندھا ہو، اس سے شراب ڈھونڈنا حماقت کا نشان ہے۔

بلاشبہ دونوں شعروں کی ظاہری وضع سے مضمون بتاتا جتنا معلوم ہوتا
ہے۔ لیکن اسے پیش کرنے کا جو انداز غالب نے اختیار کیا، وہ جاتی کے
ہاں ناپید ہے۔ جاتی نے صرف یہ کہا کہ آسمان خود اٹا پیالہ لیے بیٹھا ہے۔

اٹھے پیالے سے شراب کیونکر حاصل کی جاسکتی ہے؟ غالب نے یہ مضمون
واعظانہ نہیں، حقیقی شاعرانہ رنگ میں پیش کیا اور کہا، آسمان کے ساتی سے
مے عشرت نہیں مل سکتی۔ کیونکہ وہ تو خود اک دو چار پیالے اٹائے بیٹھا ہے
بیخود کھڑا بیٹھتا ہے کہتا ہے کہ غالب کو اپنی بے سرد سامانی پر کڑھنے کڑھتے

یہ خیال گزرا کہ آسمان کے ساتی سے سوال کرنا چاہیے۔ شاید وہ ہمارے جام
میں بھی کچھ ڈال سکے۔ پھر یکایک خیال آیا کہ وہ تو خود جام اٹائے بیٹھا ہے
گو یا اس کے اپنے پاس ہی کچھ نہیں، وہ دوسرے کو کیا دے سکے گا؟

بقول بیخود: "دونوں شعروں میں واقعہ اور بیان واقعہ کا فرق ہے
ایک پیکر بے جان ہے اور ایک پیکر ذی روح۔"

۷۔ شرح: اے غالب! میرے دل میں وصل کا شوق بھی ہے
اور جدائی کی شکایتیں بھی۔ خدا وہ دل لائے کہ میں اپنے محبوب سے دونوں
چیزیں کھ سکوں۔ یعنی وصل کا شوق بھی عرض کروں اور ہجر کی جتنی شکایتیں
ہیں، ان کا بخار بھی نکال لوں۔

۱۰۔ شرح :

محبوبوں کی بزم میں کلام
ہوں سے آذر وہ اور

دکھی ہے۔ گویا ہوں

تک آنا نہیں چاہتا

یہ لوگ اتنے خوش و

طلب ہیں، چاہوسی

کے اتنے عادی ہیں

کہ ہم تک آگئے یہ

... خوشامد ہیں کا طلب

یہ ہے کہ ان کی مجلس میں

کوئی ایسی بات زبان پر

ہے بزمِ بیاں میں سخن آذر وہ ہوں سے

تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہ پریشانی صہبا

یک بار لگا دو ختم میرے ہوں سے

رندانِ درمیکدہ گستاخ ہیں، زاہدا

زہار نہ ہونا طرّف، ان بے ادبوں سے

بیدا و وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر

بہرِ حنید مری جان کو مختار بطن ہوں سے

لاہی نہیں کہتے، جو سچائی اور راستبازی پر مبنی ہو یا ان کے حسن کی تعریف

کریں گے یا معمولی نوازشوں کو اپنی خوش نصیبی قرار دیں گے یا ان کے ظلم و جور

کی مدح و ستائش کریں گے۔ عرض وہی باتیں زبان پر آئیں گی، جو ان کے لیے

خوشی اور ان کی خوشنودی کا باعث ہوں، اس وجہ سے کوئی بات بے تکلف

ہوں تک نہیں آتی۔ اسے کھینچ تان کر ہی لانا پڑتا ہے۔

محبوبوں کے تعلق میں بھی اس شرکِ موزونیت محتاجِ تشریح نہیں، لیکن

کم ظرف اور خود غرض حاکموں کی مجلس کے تعلق میں تو یہ ہر اعتبار سے موزوں و

بر عمل ہے۔

۲۔ لغات - دورِ قدح : شراب پینے کا دور، جس میں پیادہ باری

باری ایک ایک میکش کے سامنے آتا ہے۔

صہبا : شراب۔

شرح : یہ جو باری باری ساغر ایک ایک کے سامنے لایا جاتا ہے، اس سے تو شراب جزو جزو ہو کر بکھر جاتی ہے۔ چاہیے کہ شراب کا خم میرے لبوں سے لگا دو تاکہ اسے یکدم پی جاؤں اور پیالہ بھر بھر کر باری باری دینے کی ضرورت نہ رہے۔

۳۔ لغات - طرف ہونا : مقابل ہونا۔ بحث و فکر کرنا۔

زہنار : ہرگز۔

شرح : اسے زائد ! میخانے کے دروازے پر جو رہند ہیں، وہ بڑے مستاح اور منہ بھٹ ہیں۔ ان بے ادبوں سے ہرگز سرگز بحث و فکر نہ کرنا چاہیے۔

۴۔ شرح : اگرچہ میری جان کو لبوں سے گہرا ربط ضبط تھا، یعنی وہ بہر وقت لبوں پر دمیتی تھی اور دفا کا پورا حق ادا کرنا چاہتی تھی، لیکن دفا کے تقاضے اتنے کڑے، اتنے سخت اور اتنے جاگداز ہوئے کہ اس نے لبوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور نکل گئی۔

مقصود شریعہ معلوم ہوتا ہے کہ دفا کے سلسلے میں عاشق کو جن مصیبتوں اور آفتوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان کا بے پناہ ہونا واضح کیا جائے۔

۱۔ شرح :

اب محبوب نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ جب کوئی شخص میرا ذکر ان کے سامنے چھیڑ دیتا ہے تو اسے منع نہیں کرتے چپ چاپ سن لیتے

تاہم کوشکایت کی بھی باقی نہ رہے جا سن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے غالب ! ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو وہ سن کے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

ہیں تاکہ جیسے شکایت کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ البتہ خود میرا ذکر کہی نہیں کرتے

اگر کسی کی طرف سے ذکر کیا رویتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ سخت بگاڑ ہو گیا ہے اور عاشق کے لیے شکایت کا موقع پیدا ہوتا۔ اب صورت یہ ہے۔

۱۔ محبوب ذکر پر خفگی کبھی ظاہر نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو عاشق معذرت کر دیتا۔

۲۔ نفرت بھی ظاہر نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو شکایت کی گنجائش پیدا ہو جاتی۔

۳۔ اظہارِ ہلال بھی نہیں کرتا کہ عاشق کے لیے منالینے کا موقع نکل آتا۔

یہ تمام صورتیں ختم کر دیں، البتہ اگر کوئی ذکر پھیڑ دے تو سن لیتا ہے، ذکاوت بے تعلقی ہے، نہ خفگی ہے، نہ ظال ہے اور عاشق کے لیے یہ صورتِ حال گولمگول ہے۔ نہ وہ اسے توجہ قرار دے سکتا ہے نہ بے توجہتی۔

۲۔ شرح : اے غائب! ہم تیرا حال محبوب کی ضرورت سنا دیں گے، لیکن وہ سب کچھ سن کر تجھے بلا لے، اس کا ذمہ ہم نہیں لے سکتے۔

مولانا طباطبائی نے لکھا ہے کہ اس شعر کے وجوہِ بلاغت بہت دقیق ہیں۔ بیچ والوں کا کہنا کہ سنا دیں گے ہم ان کو "اس کے معنی محاورے کے رد سے یہ ہیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح مناسب موقع دیکھ کر اور محبوب کے مزاج کا اندازہ کر کے باتوں باتوں میں یا ہنسی ہنسی میں تیرا حال گوش گزار کر دیں گے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ تمام معنی الفاظ کے موقع استعمال سے ظاہر ہیں اور پتا چلتا ہے کہ محبوب بڑا مغرور، نازک مزاج، خود میں اور خود آرا ہے۔ مولانا مزاتے میں کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کہتے : "کہ دیں گے ہم ان سے" تو ان میں سے اکثر معانی فوت ہو جاتے۔ پھر "امارہ نہیں کرتے" ایسے موقع پر بولا جاتا ہے، جب کوئی شخص اصرار سے کہے، کہ جس طرح بنے، میرا ان کا غلاب کرادو۔ غرض شعر سے عاشق کی بیانی اور اصرار، محبوب کا غرور و ناز و دلوں تصویریں واضح ہو گئیں۔

شرح : میرے گھر میں کوئی چیز مٹی ہی کہاں ہے اے محبوب ! تیرا غم عشق برباد کرتا ؟ میں ایک تعمیر کی حسرت پہلے سے چلی آتی تھی ، وہ بدستور باقی ہے ۔ تعمیر کی حسرت سے مراد ہے کہ تعمیر کا خیال تو ہے ، مگر کوئی سامان موجود نہیں ، جس سے یہ آرزو پوری کی جاسکے ، حسرت باقی ہے ۔

۱۔ لغات۔
تقریب : یہاں یہ لفظ درجہ ، باعث ، سبب کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ اصطلاح منطق میں "تقریب" کا ایک معنوم یہ بھی ہے کہ بات ایسے طریقے پر کی جائے جس سے دلیل یا نتیجہ ذہن میں آجائے ۔

شرح : غم دنیا ہم پر اس طرح مسلط ہے کہ اول تو سر اٹھانے کی فرصت ہمہ نہیں ملتی ۔ اگر کہیں اتفاق سے سر اوپر

غم دنیا سے ، گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی فلک کا دیکھنا ، تقریب تیرے یاد آنے کی کھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا یارب قسم کھاتی ہے اس کا فزنی کاغذ کے جلانے کی پٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے دلے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی انہیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی ہماری سادگی تھی اتفاستِ ناز پر مرنا ترا آنا نہ تھا ظالم ، مگر تمہید جانے کی

لکھ دو کوپ حوادث کا تخت کر نہیں سکتی
 اٹھتا ہے اور جو نظر آسمان
 بری طاقت کہ ضامن تھی تہوں کے ناز اٹھانے کی
 پر پڑتی ہے تو ساتھ ہی
 کہوں کیا خوبی او ضائع ابنائے زماں غائب
 اے محبوب! تو یاد آجاتا
 ہے۔ گویا آسمان پر نظر
 بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بار بار نیکی
 پڑتا تیرے یاد آنے کا
 اسی طرح علم کا سامنا ہو جاتا ہے۔

۲۔ لغات - فقہ کھانا : جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اس کے دو
 معنی ہیں۔ ایک یہ کہ محبوب نے فیصلہ کر رکھا ہے، جو کا غذا اس کے پاس پہنچے گا
 اسے جلا دے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ ہرگز نہ جلائے گا۔

شرح : فرماتے ہیں، اے اللہ! میرے خط کا مضمون محبوب ہر
 کیونکر کھائے گا؟ اسے کیونکر معلوم ہو گا کہ مجھ پر کیا کچھ گزر رہی ہے؟ اس کا فر
 نے تو فیصلہ کر رکھا ہے کہ جو کا غذا اس کے پاس پہنچے گا، اسے دیکھے اور کھولے
 بغیر ہی جلا دے گا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ خط کھول کر مضمون پڑھ لینے کی تو اس سے کوئی امید
 ہی نہ تھی، البتہ اس نے ہر کا غذا جلا دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میرا خط جاتا تھا،
 وہ آگ کی نذر ہوتا تھا، اس سے شعلے اٹھتے تھے، یوں میرا سوزِ غم اس پر واضح
 ہو جاتا تھا۔ اب اس ظالم نے خط نہ جلائے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گویا میرے سوزِ غم
 کے اظہار کی جو گنجائش باقی تھی، اس کا دردِ داغہ بھی بند ہو گیا۔ لہذا میں اپنے مکتوب
 کا مضمون کھٹنے سے بالکل محروم رہ گیا۔

پہلا مطلب کسی بے پیدگی کے بغیر واضح ہے، دوسرے میں کسی قدر پھر ہے،
 لیکن مرزا غالب کے ہاں معمولی پھیر کی کوئی حیثیت نہیں۔

۳۔ لغات - پرندیاں : ریشم

شرح : معلوم ہے کہ شد ریشم میں لپٹا ہوا نہیں رہ سکتا۔ وہ فوراً بھڑک اٹھتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ شد ریشم میں بہ آسانی لپٹا جا سکتا ہے، لیکن سو نہ غم کو دل میں چھپائے رکھنے کی تدبیر بہت مشکل ہے۔

گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دل ریشم سے بدرجہا زیادہ آتشگیر اور غم عشق کا سو نہ آگ سے زیادہ سرکش و بے پناہ ہے۔

۴۔ **شرح :** محبوب نے باغ کی سیر کا قصد کیا۔ شاعر کہتا ہے کہ حقیقتاً وہ باغ کی سیر کے لیے نہیں نکلے، بلکہ یہ ایک شوخی آمیز بہانہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے خدا کار زخمیوں کو ایک نظر دیکھ آئیں۔ گویا باغ میں چھوٹوں کے کھیلنے کا منظر وہی حیثیت رکھتا ہے، جو محبوب کے تیر نگاہ اور تیغ غمزہ کے گھائیوں کا ہے۔ بہانے کی شوخی کا مطلب یہی ہے کہ وہ ان گھائیوں کو دیکھنا سیر باغ کی طرح مزحت و انبساط کا باعث سمجھتے ہیں۔

۵۔ **لغات۔** التفات : توجہ، مہربانی، لطف، اکرم
تہنید : اجدا، آغاز، پیش خمیدہ۔

شرح : تو آیا، اہم سادگی سے یہ سمجھتے رہے کہ ہم پر خاص توجہ اور لطف و کرم ہوا ہے، ہمارے لیے یہ لطف و کرم ایسی خاص چیز تھا، جس پر ہر جان ملک شاکر کہہ دینے کے لیے آمادہ تھے۔ لیکن اسے ظالم اتیری حالت یہ کہ ادھر آیا، ادھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گویا تیرا آنا التفات اور لطف و کرم کی بنا پر نہ تھا، بلکہ تیرے چلے جانے کی تہنید تھا۔

دوسرے مصرع سے اول یہ واضح ہوتا ہے کہ محبوب صرف رواروی آیا اور چل دیا، دوم اس میں غویں یہ ہے کہ کوئی بھی آتا ہو، وہ بہر حال جانے کی تہنید ہوتا ہے۔

۶۔ **لغات۔** لکد کوب : لات مارنا، ٹھکراؤ، پامالی، کڑی ضربیں۔
شرح : میری طاقت کسی زمانے میں حسینوں کے ناز بے تکلف اٹھایا

کرتی تھی، اب حالت یہ ہے کہ زمانے کے حادثات کی ضربیں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

اس شعر سے جہاں اپنے صنعت اور ناتوانی کا اظہار مقصود ہے وہاں یہ بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ زمانے کے حادثات کی ضربیں جنوں کے نازا جھٹکنے کے نیکے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

۷۔ لغات - اوصناع : و صناع کی جمع - طور طریقے - سلوک - برتاؤ دستور -

ابتا : ابن کی جمع ، ابتائے ذراں سے مراد ہے - دنیا والے ، عام لوگ -
 شرح : اس درد کے لوگوں نے جو طور طریقے اختیار کر رکھے ہیں، اے غائب ! میں ان کے بارے میں کیا کہوں ؟ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس فروے ہم نے ایک مرتبہ نہیں، بار بار نیک برتاؤ کیا، اسے جب موقع ملا، ہمارے ساتھ برائی ہی کی۔

۱۔ لغات :
 حاصل : پیداوار
 محصول - ثائدہ - نفع -
 آرزو خرامی :
 خرام بہ حسب آرزو
 یعنی اپنی آرزو کے مطابق چلنا۔
 حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی
 دل جوش گریہ میں ہے، ڈوبی ہوئی اسامی
 اس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بجھا دے
 میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغ و آتما می

شرح : اے آرزو کے مطابق نفع حاصل کرنے کی امید رکھنے والے !
 تو پیداوار سے ناامید ہو جا، کیونکہ رونے دھونے کے جوش میں دل کی اسامی
 ٹھپ چکی ہے۔ یعنی اس کے پاس کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی، جو ہاتھ آ سکے۔

مطلب ہے کہ خیال تھا، رو دھو کر مدعا حاصل کر لینے کی کوئی صورت نکل آئے گی، لیکن رونے دھونے نے دل کی رہی سہی حیثیت بھی ختم کر ڈالی۔
 ۲۔ **مشریح :** میری مثال اس شمع کی سی ہے، جسے جلتے جلتے کسی نے پھونک مار کر بجھا دیا ہو اور سرا پا جل جانے کا موقع نہ ملا ہو۔ اس طرح وہ جلے ہوؤں میں تو شمار ہو گئی، ساتھ ہی اس پر نامتائی کا داغ لگ گیا۔ یہی کیفیت میری ہے کہ جلے ہوؤں میں تو شمار ہوتا ہوں، لیکن پورا نہ جل سکا اور ناقص رہ گیا۔

۱۔ **لغات :**
 ستم زدگاں :
 ستم زدہ کی جمع :
 غم کے مارے ہوئے۔
 بیضہ مور :
 چوٹی کا انڈا۔
مشریح :
 ہم دو گ ظلم کے مارے ہوئے ہیں۔ دیکھیے ہماری دنیا کتنی تنگ ہے جس میں چوٹی کے اتنے تنگ کو آسمان کی حیثیت حاصل ہے۔
 بظاہر سب سے زیادہ

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
 جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے
 ہے کائنات کو حرکت تیرے فوق سے
 پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
 حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ
 غافل کو میرے شیشے پر مے کا گمان ہے
 کی اُس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا
 آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
 کیا خوب ! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
 بس چُپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ گائیہ دیوارِ یار میں
 فرماں روا سے کشورِ ہندوستان ہے
 ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
 کس سے کہوں کہ داغ، جگر کا نشان ہے
 ہے بارے اعتماد و فاداری اس قدر
 غالب ! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرمان ہے
 ہی نہیں، غلو معلوم ہوتا
 ہے، لیکن نفسیات کے
 نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے
 تو اس کا نقش بالکل مختلف
 نظر آئے گا۔ ہر انسان
 کے لیے دنیا کی وسعت
 محض محبت اور ہمدردی
 کے نقطہ نگاہ سے ہے
 جہاں تک ہمدردی اور

محبت کا سلسلہ چلا جائے گا، دنیا وسیع ہوتی چلی جائے گی۔ مگر جو لوگ غلو
 اور ستم زدہ ہیں، انہیں کسی سے محبت اور ہمدردی کی توقع کیا ہو سکتی ہے
 ظلم و ستم کی مزا دانی کے ساتھ ان کی دنیا تنگ ہوتی جاتی ہے، یہاں تک
 کہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں، ان کی دنیا کا آسمان چیونٹی کے انڈے کی حیثیت
 رکھتا ہے۔

۲۔ شرح : بخجوری مرحوم اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں :

۔ مادہ خود ہیجان اور حامد ہے۔ جو چیز مادے کو تحریک و جنبش
 میں لاتی ہے، وہ حرکت ہے، مگر حرکت خود اپنی ذات سے
 آفرینش کی قدرت نہیں رکھتی، جب تک کہ معین نہ ہو۔ اگر
 حرکت میں قاعدہ نہ ہو، دنیا عالم مناد سے عالم کون میں نہ
 آسکتی۔ پس علت وہ ذات یا طاقت ہے، جو حرکت
 کے پس پشت حرکت کو تعین دیتی ہے۔

کائنات میں جو حرکت نظر آتی ہے، اسے مالک کل اودہ حیرے ذوق شوق
 کی وجہ سے ہے۔ اس کی مثالی یہ ہے کہ ذرہ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا،

لیکن دنیا بھر کو تابان و درخشاں بنا دینے والا آفتاب ذبیحے پر سیوا انگلیں ہوتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے ۔

یہ حقیقی منظر کی تصویر ہے ۔ آپ اسے دیکھنا چاہیں تو کسی روزن میں سے سورج کی کرنیں گزرنے کا سماں دیکھ لیں ۔ اس میں اُن گنت ذرّے حرکت کرتے ہوئے نظر آئیں گے ۔ گویا آفتاب کی روشنی نے کروڑوں کے ذریعے سے ان میں جان ڈال دی ۔ یہی کیفیت کائنات کی ہے ۔ اس میں جو جنبش، تڑپ اور اضطراب نظر آتا ہے وہ کائنات کے خالق کے ساتھ، عشق و محبت کا کرشمہ ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ، ہر چھوٹا بڑا وجود عشق میں سرشار اُسی کی طرح دوڑا چلا جا رہا ہے ۔

میرزا غالب نے یہ مضمون مختلف صورتوں میں بانڈھا ہے مثلاً :

سب تجلی تری سامانِ وجود

ذرّہ بے پرو تو خورشید نہیں

طبیعیات کے نقطہ نگاہ سے بھی یہ مضمون بالکل مطابق حقیقت ہے آفتاب کے پرتو یعنی حرارت کے باعث ہوا گرم ہو کر پھیلتی ہے اور پھینے کے باعث ہلکی ہو کر اوپر چڑھتی ہے ۔ دوسری جگہ سے ہوا دوڑ کر اوپر چڑھنے والی ہوا کی جگہ لیتی ہے اس طرح ایک حرکت ایک تسلسل قائم ہو جاتا ہے ۔ اس طرح یہ کہنا بالکل درست ہے کہ آفتاب کے پرتو سے ذروں میں جان پڑ گئی گو یا جہاں جہاں یہ پرتو پڑا پوری فضا میں مسلسل حرکت شروع ہو جاتی ہے اور یہ تسلسل بالکل درست ہے کہ ذروں میں جان پڑ جاتی ہے ۔

۳۔ لغات ۔ ریشی : تھپڑ ، مزب

شرح : حقیقت یہ ہے کہ میرے دل کا شیشہ سب گنہگار کی حزب کھا کر لالے کی طرح سرخ ہو گیا ۔ جن لوگوں کو حقیقت کی روشنی نہیں ملی ، وہ سمجھتے ہیں کہ میرے دل کے شیشے میں شراب بھری ہوئی ہے ۔

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ حقیقت نا شناس لوگ میری ظاہری حالت دیکھ کر سمجھتے ہیں، گو یا میں اطمینان و دلچسپی سے عیش و عشرت میں مصروف ہوں، حالانکہ دنیا کے آفات و مصائب کی ضربوں سے میرا وجود سراپا خون آلود ہے۔

شاعر نے دونوں صورتوں میں سرخی کو مابہ الاشتراک قرار دیا۔ غافل اسے شراب کی سرخی سمجھتے ہیں، حالانکہ اصلاً یہ سرخی حوادث کی چوٹ کا نتیجہ ہے۔ بعض اصحاب کو یہ دوسرا ہوا کہ پتھر کی ضرب شیشے کو چکنا چور کر دیتی ہے، اس میں سرخی پیدا نہیں کرتی، لیکن شعر میں یہ کوئی پیچیدہ معاملہ نہیں، شاعر نے شیشے کو دل کا استعارہ ٹھہرایا اور اس کے لیے چوٹ کے آثار کی عمومی حیثیت پیش کر دی۔ یعنی ضرب شیشے پر نہ لگی، دل پر لگی اور وہ پتھر کی چوٹ نہ تھی، بلکہ حوادث کی چوٹ تھی، لہذا اس شیشے کا لالہ رنگ ہو جاتا تعجب خیز نہیں سمجھا جاتا۔

۴۔ مشرح : محبوب نے اہل ہوس یعنی رقیب کے سینے میں رولن افروز ہونا مناسب سمجھا۔ ہاں، جو مکان ٹھنڈا ہو، وہ مجلس آرائی کے لیے کیوں پسند نہ آئے۔

اہل ہوس کے سینے کو ٹھنڈا اس لیے قرار دیا کہ وہ عشق کی حرارت سے نا آشنا ہوتا ہے۔

شعر میں الفاظ کی مناسبت محتاج تشریح نہیں، معنوی اعتبار سے اس کی حیثیت معمول ہے۔

۵۔ مشرح : خواب بھائی مڑاتے ہیں،

”ہمارے بھی منہ میں زبان ہے؟ اس میں دو معنی رکھتے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دیں گے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوس لیا یا نہیں؟“

شعر کے عام انداز سے ظاہر ہے کہ عاشق اور محبوب میں بوسہ رقیب کے

مستحق بحث اور دود کہ شروع ہو گئی تھی۔ عاشق محبوب پر الزام لگاتا تھا کہ تم نے ضرور رقیب کو بوسہ دیا۔ محبوب انکار کرتا تھا۔ جب جھگڑے نے طول کھینچا تو عاشق نے کہا : "اچھا، ہمارے سامنے مکتے ہو؟ ہم غموت پیش کر سکتے ہیں یا زبان سے چمکد کرتا سکتے ہیں کہ تم نے رقیب کو بوسہ دیا۔ اس میں بھی عقلی مناسبتیں واضح ہیں۔

۶۔ شرح : جو شخص محبوب کی دیوار کے سایے میں جا بیٹھا ہے وہی حیثیت اور وہی شان و عظمت حاصل ہو جاتی ہے، جو ہندوستان جیسے وسیع و عظیم ملک کے فرما نروا کو حاصل ہو۔ ہندوستان سے صرف موجودہ ہندوستان مقصود نہیں، بلکہ وہ ملک مقصود ہے، جس میں پاکستان بھی شامل تھا اور جس کی حدیں غیر سے برائے ملک اور قراقرم سے اس کی گاری تک پھیلی ہوئی تھیں۔

کشور ہندوستان کا فرما نروا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مرزا کے تصور کے مطابق جو شخص اس وسیع ملک کے تحت کا ملک ہو، نہ کوئی اس کی عظمت کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی آرزو و امانہ تکمیل رہ سکتی ہے، یقیناً محبوب کے سایہ دیوار میں بیٹھنے کا نتیجہ بھی یہی ہو سکتا ہے۔

ایک پہلو یہ بھی نکالا گیا ہے کہ سایے میں اک گوند تیرگی ہوتی ہے، ہند کے معنی بھی "سایہ" کے ہیں اور یہ ہے بھی کالے لوگوں کا ملک، لہذا اسے سایے کے ساتھ مناسبت پیدا ہو گئی۔ یہ مناسبت کسی دوسرے ملک کی فرما نروائی میں نہ تھی۔

۷۔ شرح : بہادر جگر سوز عشق سے جلتے جلتے محو ہو گیا اور اس کی جگہ ایک داغ پڑ گیا، جو جگر کی نشان دہی کر رہا ہے، لیکن غموں کے هجوم نے میری یہ حالت کر رکھی ہے کہ مہتی کا اعتبار ہی باقی نہیں رہا۔ وہ اعتبار ہی بالکل مرٹ گیا۔ بیشک داغ جگر کی نشانی موجود ہے۔ مگر اپنی نفسیاتی کیفیت کے

پیش نظر کس سے کموں اور کیونکر کموں کر یہ واضح جگر کا قائم مقام ہے ؟ ایسا کہنا
ہستی کے اعتبار کی دلیل ہو گا اور میرے دل سے وہ اعتبار بالکل داخل ہو چکا
ہے ۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں ” یہ مضمون بہت نیا اور خاص مصنف مرحوم
کا نتیجہ فکر ہے ۔

۷۔ - شرح : اے غالب ! ہم اس میں خوش ہیں کہ محبوب ہم پر
نامربان ہے ۔ کسی بھی صورت میں لطف و کرم سے نوازنے کے لیے تیار
نہیں ، ظلم و ستم ہی میں سرگرم رہتا ہے ۔ اس سے واضح ہو گیا ہے کہ اسے
ہماری وفا داری پر پورا بھروسہ ہے اور جانتا ہے کہ کتنی ہی بے رخی اور سختی
کا بردار کیا جائے ۔ یہ عاشق محبت ترک نہیں کرے گا ۔
نامر بانی ، بے رخی اور کثرت ظلم و ستم کو اپنی وفا داری کے لیے ستاؤ
اعتقاد بنا تا مرزا غالب ہی کا حصہ ہے ۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ' ہائے ہائے !
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شکاری ' ہائے ہائے !
تیرے دل میں گرد تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ' ہائے ہائے !
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال ؟
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ' ہائے ہائے !

یہ لوری ماتی
غزل کسی محبوب
کا مرثیہ ہے ۔
غفلت شعروں
سے معلوم ہوتا
ہے کہ اس
میں زیادہ تر
اشعار اس
وقت کی کیفیت
پیش کرتے ہیں

عمر خنجر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
 عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے !
 زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوا سے زندگی
 یعنی تجھ سے مٹی اے ناساز گاری ہائے ہائے !
 گلِ فشانہا سے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
 خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے !
 شرمِ رسوائی سے ہا چھپنا نقابِ خاک میں
 ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے !
 خاک میں ناموسِ پیمانِ محبتِ دل گئے
 اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے !
 ہاتھ ہی تیغِ آزما کا کام سے جاتا رہا
 دل پر اک لگنے نہ پایا زخیمِ کاری ہائے ہائے !
 کس طرح کاٹے کوئی شہما سے تارِ برشکال
 ہے نظرِ نحو کردہ اخترِ شماری ہائے ہائے !
 گوشِ مجبورِ پیام و چشمِ محسوسِ جمال
 ایک دل ، بس پر یہ نا امید داری ہائے ہائے !

ہیں ، جب محبوب
 پر حالتِ نزع
 ظاری مٹی ۔
 اشرح
 اے محبوب !
 آج تجھے نزع
 کی حالت میں
 دیکھ کر میں تڑپ
 رہا ہوں تو تو
 بھی بیتاب
 و بیقرار ہے ۔
 وہ دن کدھر
 گئے ، جب میں
 تجھ پر متاعِ وفا
 اور تو تعاقب
 سے کام لیتے
 ہوئے میری
 بات تک نہ
 پہنچتے تھے ۔
 ۲۔ لغات
 آشوبِ غم !
 غم کا طوفان
 غم کا ہجوم ۔

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب ! ابھی وحشت کا رنگ : شرح :
 رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خوارِی، اُسے ہائے
 اگر تیرے دل میں غم کے
 طوفانِ برداشت کر لینے کی ہمت نہ تھی، تو تو نے کیوں مجھ سے ہمدردی اور غمخواری
 کا شیوہ اختیار کیا تھا ؟ بہتر ہوتا کہ مجھ سے نا آشنا اور بے پروا رہتا تاکہ آج میری
 پریشاں حالی پر تجھے پریشان نہ ہونا پڑتا۔

۳۔ شرح : تجھے کیوں میری غمخواری کا خیال آیا ؟ کیوں میرے
 دل کو سہارا دینے کے لیے قدم بڑھایا ؟ آہ ! مجھ سے دوستی کر کے تو نے
 اپنے ساتھ دشمنی کی۔

۴۔ شرح : بیشک تو نے عمر بھر کے لیے وفاداری کا عہد کر لیا ،
 لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ؟ عمر کو بھی تو پائنداری اور استواری حاصل نہیں
 یعنی جو عہد وفا بنا دیتا تھا ، وہ اس اعتبار سے بھی تو نا استوار ہی رہا۔

۵۔ شرح : اس دنیا کی آب و ہوا مجھے دہر معلوم ہوتی ہے ،
 کیونکہ یہ آب و ہوا تیرے لیے سازگار نہ ہوتی۔ تو نے کوچ کی تیاری کر لی تو
 میں بھی جینے سے بالکل بیزار ہوں۔

۶۔ شرح : پہلے تیری جلوہ افروزی کے وقت عشوہ و ناز کے
 پھول جھڑتے تھے ، آج یہ حالت ہے کہ تیری تربت پر پھول اگائے جا
 رہے ہیں۔

۷۔ شرح : تو نے خاک کا پردہ اوڑھ لیا ، لیکن عشق کی نیک نای
 پر حریف نہ آنے دیا اور رسوائی کی سز م گوارا نہ کی۔ اے میرے محبوب !
 تجھ پر محبت کی پردہ داری ختم ہو گئی۔ اس میں تو نے وہ کمال کر دکھایا ، جو
 دوسرے سے ممکن نہ تھا۔

۸۔ شرح : اندوس عہدِ محبت کی عزت خاک میں مل گئی اور دنیا میں

دوستی کی راہ درسم باقی نہ رہی۔

۹۔ شرح : جس محبوب سے برابر زخم کھاتے رہنے کی آرزو تھی اس کا تیغ آزمایا تھ ہی معطل ہو کر رہ گیا اور ابھی میرے دل پر ایک بھی کاری زخم نہیں لگا تھا۔

اس شعر اور اس سے پہلے شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ابھی محبت کی ابتدا ہوئی تھی، اسی حالت میں محبوب دنیا سے رخصت ہو گیا۔ دل کی تمنائیں اور آرزوئیں دل ہی میں رہ گئیں۔
۱۰۔ لغات - برشکال : برسات۔

شرح : ہماری نگاہیں تو بھر کی راتیں تارے گن گن کر کاٹنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ برسات کی اندھیری راتیں آگئیں، انہیں کوئی کس طرح کاٹے، برسات کی راتیں اس لیے کہا کہ فراقی محبوب میں مسلسل رونے دھونے کے سوا کچھ کام نہیں اور یہ بھی غلط ہے کہ برسات کی کالی راتوں میں ابر کے باعث تارے عموماً نظر نہیں آتے اور جو شخص تارے گن گن کر رات کاٹنے کا عادی ہو، اس کی محرومی محتاج بیان نہیں۔

۱۱۔ شرح : کان محبوب کا پیغام سننے کے لیے ترستے ہیں اور آنکھیں جمال دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ پہلو میں ایک دل ہے اور اس پر مایوسی و ناامیدی کا یہ طوفان اُٹھ آیا ہے، کوئی کرے تو کیا کرے؟

۱۲۔ شرح : اے غالب! میرا عشق ابھی وحشت کے درجے پر نہیں پہنچا تھا۔ یعنی دنیا اور اہل دنیا سے بے پروا ہو کر رسوائی اور بدنامی کی طرف سے آنکھیں بند کرتے ہوئے صرا گردی اور دشت نوردی کی نوبت نہیں پہنچی تھی۔ دل میں ذلت و رسوائی اور خواری و بدنامی کا جو ذوق تھا، وہ دل ہی میں رہ گیا۔

شعر میں عشق اور وحشت کے آثار واضح کر کے دونوں میں جو فرق نمایاں کیا

وہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔

۱۔ لغات -
سرگشتگی : سرگردا
جنون : دیوانگی۔

شرح : جنون و
دیوانگی نے یہ حال کر
دیا ہے کہ اب زندگی
سے بالکل نا امید ہو
گئی۔ آرام و سکون کی
خواہش کو خوشخبری سنا
دو کہ مرجانے کی امید
ہے اور مرتے ہی
جنون و دیوانگی سے
نجات مل جائے گی۔
یعنی جو چیز موت کا
سبب ہے، وہی آخر
تسکین و آرام کا باعث
بن جائے گی۔

۲۔ شرح :

محبوب مضطرب و بے اختیار دل کی ذرا پروا نہیں کرتا۔ یعنی وہ اس سے متاثر
نہیں رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اب تک دل میرے ہی پاس ہے، حالانکہ
وہ میرے اختیار سے باہر نکل چکا ہے۔

سرگشتگی میں، عالم ہستی سے یاس ہے
تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں برے دل آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرور تب غم کہاں تک
ہر مومرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرور حسن سے بیگانہ و فا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پنی جس قدر بے شبِ مہتاب میں شراب
اس بے غمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر اک مکان کو ہے کہیں سے شرفِ اسدا
مجھوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ اُداس ہے

- خیرے ہی پاس ہے " کے دو مفہوم ہیں - اول یہ کہ عاشق کے پاس ہے - جس کی تشریح اوپر ہو چکی ، دوم یہ کہ محبوب ہی کے پاس ہے اور جو چیز اس کے پاس ہے ، اس کے تعلق بے خبری اور تغافل کسی تشریح کا محتاج نہیں -

۳ - لغات - سپاس : شکر ، شکر گزاری

شرح : تب چڑھنے کے وقت بدن کے دو ٹکٹے کھڑے ہو جاتے ہیں - اسی کیفیت کے پیشِ نظر فرماتے ہیں کہ تب غم چڑھنے کی لذت و شادمانی کہاں تک بیان کی جائے ؟ میرے جسم کا ایک ایک دو ٹکٹا شکر گزاری کے لیے زبان بنا ہوا ہے - یہ ایسے بہرہ لذت معروضِ بیان میں نہیں آ سکتی -

۴ - شرح : محبوب کو حسن کے گمنڈ نے وفاداری سے بے پروا کر دیا ہے ، حالانکہ اس کے پاس حق پہچاننے والا دل موجود ہے -

حق پہچاننے والا دل محبوب کا دل نہیں ہو سکتا - اگر ایسا ہوتا تو غرورِ حق اسے وفاداری سے برگشتہ نہ کر سکتا - یہ عاشق کا دل ہے - یعنی اگرچہ عاشق کا حق شناس دل اس کے پاس ہے ، جو وفا کے تقاضوں سے اسے آگاہ کر رہا ہے ، لیکن حسن کے غرور نے اس میں حق شناسی کا جو سہرا باقی ہی نہیں چھوڑا

۵ - شرح : چاندنی رات مطلوب ہونے کے باعث ٹھنڈی ہوتی ہے ، اس لیے کہتے ہیں کہ چاندنی رات میں جتنی بھی شراب لے ، پیتا جا کیونکہ بلغم کی اصلاح شراب ہی سے ہو سکتی ہے -

۶ - لغات - مکین : رہنے والا - سکونت رکھنے والا -

شرح : اسے اسد ! ہر مکان کی عزت و برتری اور رونق و آبادی اس میں رہنے والے پر موقوف ہے - دیکھیے ، جنونِ جب تک صحرا میں مقیم تھا وہاں رونق اور چہل پہل تھی - جب سے وہ مرا ہے ، پورے صحرا پر اسی چھائی ہوئی ہے - نہ کہیں کوئی جنگل رہے ، نہ کہیں آبادی نظر آتی ہے - ایک ساٹھا ہے ، جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک یکساں طاری ہے -

گر خاموشی سے فائدہ اخفا سے حال ہے

۱۔ لغات ۔

اِخفا: چھپانا
پوشیدہ رکھنا ۔

شرح: اگر

خاموشی کا فائدہ یہی

ہے کہ انسان کی دل

کیفیات اور حقیقی حالات

چھپے رہتے ہیں اور

لوگوں پر واضح نہیں

ہوتے تو میں اس بات

پر خوش ہوں کہ یہ فائدہ

مجھے بولنے کے باوجود

حاصل ہے اکیوں کہ جو

باتیں میں کہتا ہوں ان

کا سمجھنا بے حد مشکل

ہے ۔

خاموشی کا مطلب یہ

ہے کہ انسان چپ

رہے اور کوئی بات

زبان پر نہ لائے بلکہ

اگر کوئی شخص باتیں کرتا

ہے اور ان کا سمجھنا ممکن نہیں تو بولنے کے باوجود اسے خاموشی کا حقیقی فائدہ

حاصل ہے ۔ یہی حقیقت مرزا غالب اس شعر کے ذریعے سے واضح کر رہے ہیں

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

بکس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ

دلِ فرو جمع و خمرِ زبا نہا سے لال ہے

کس پردے میں ہے آئینہ پرواز اے خدا

رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی

اے شوقِ منفعل ! یہ تجھے کیا خیال ہے

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان

تابِ زمین سے نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پر میری عرصہ آفاق تنگ تھا

دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیوا سد

عالمِ تمام حلقہٴ دامِ خیال ہے

ہے اور ان کا سمجھنا ممکن نہیں تو بولنے کے باوجود اسے خاموشی کا حقیقی فائدہ

حاصل ہے ۔ یہی حقیقت مرزا غالب اس شعر کے ذریعے سے واضح کر رہے ہیں

اغلب ہے، یہ اشارہ مرزا کے کلام کی طرف ہو، جسے عام اسلوب بیان کے عادی مشکل سمجھتے تھے اور آسان کہنے کی فرمائشیں کرتے رہتے تھے۔

۲۔ لغات - فرو جمع و خرچ : وہ رجسٹر جس میں آمدنی اور خرچ کا اندراج ہوتا رہے۔

زبانہائے لال : گونگی زبانیں۔

شرح : جو کچھ میرے دل میں ہے، انوس کہ اسے کبھی بیان نہ کر سکا۔ اس باب میں جو حسرت رہ گئی، اس کا جگہ کس سے کروں؟ دل کی یہ کیفیت ہے کہ وہ گونگی زبانوں کی آند و خرچ کا رجسٹر بنا ہوا ہے۔ یعنی اس کا پورا اندوختہ گونگی زبانوں پر مشتمل ہے، جن سے مناسب موقع پر حقیقی کیفیت ظاہر ہو سکی۔

دل کی کیفیات کا اظہار زبان گویا پر موقوف ہے۔ جو زبان گویائی کی صلاحیت سے محروم ہو، وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ مرزا کہتا ہے چاہتے ہیں کہ دل میں جتنی بھی کیفیات ہوتیں، وہ اس لیے معروض بیان میں نہ آسکیں کہ جو زبانیں ملیں وہ گونگی نہیں، لہذا ان کیفیات کے اظہار کی حسرت باقی رہ گئی اور لطف یہ کہ اس حسرت کا شگوہ بھی کسی سے نہیں کر سکتا۔

۳۔ لغات - آئینہ پرواز : آئینے کو جلا دینے اور روشن کرنے والا۔

مُذَر خواہ : خود عذر کرنے یا کسی کا عذر قبول کرنے والا، یعنی وہ جو خود عفو خواہ ہو یا دوسرے کو معذور سمجھے۔

شرح : اے خدا! تیری رحمت کس پر دے میں آئینے کو جلا دے رہی ہے؟ وہی اس لب کی مُذَر خواہ ہے، جسے سوال کا حوصلہ نہیں اور وہ گنہگاروں کی کثرت کے باعث کچھ کہنا ہوا شرماتا ہے۔

رحمت کے لیے آئینہ پرواز ہی کا ذکر غالباً اس لیے کیا کہ اسی کی برکت سے

گناہوں کے رنگ داخل ہوتے ہیں۔ لب بے سوال اس بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ گناہوں کی مزا دانی کے پیش نظر کچھ کچھ کی محبت نہیں پڑتی، اس بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ نظر صرف اللہ کی رضا پر ہے اور اپنی طرف سے کچھ کتنا رونا کے معنی ہے۔ مولانا غلامی نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جو لب بے سوال ہوگا، اس کا لبے بغض ہونا ضروری ہے۔ انسان بوسے اور آئینہ منہ کے پاس ہو تو وہ سانس سے مکدر ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی لیے رحمت کو آئینہ پرواز قرار دیا۔

۴۔ لغات - منفعل : شرمندہ۔ پیشان ۔

شرح : شوق اپنی تمام کوششوں کو بے نتیجہ دیکھ کر شرمندہ و پیشان ہے اور اسے یہ خیال ہو رہا ہے کہ میں نے جس سے محبت کی، وہ دوست نہیں۔ دشمن ہے۔ شاعر شوق کو سمجھا رہا ہے کہ تجھے یہ خیال کیونکہ آیا بہ خدا نہ کرے کہیں یہ ممکن ہے کہ محبوب ہم سے دشمن کا طریقہ اختیار کرے۔ اصل مقام یہ ہے کہ محبت کے راستے میں مختلف منزلیں آتی ہیں۔ سختیوں پریشانیوں، مصیبتوں اور نا کامیوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ تھکاوٹ لوگ ایسے مواقع پر محبت ہار بیٹھتے ہیں، لیکن مرزا اپنے شوق کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کی طرف سے دشمنی کا خیال بھی نہیں ہو سکتا۔ شوق کی سرگرمی دستور جاری رہتی جا رہی ہے۔

۵۔ لغات - لباس کعبہ : اس سے مراد وہ کپڑا ہے جو حرم پاک کی دیواروں کو باہر سے ڈھانپے رہتا ہے اور جسے عام اصطلاح میں غلاف کعبہ کہتے ہیں۔ ابتدا میں غلاف کے لیے رنگ کی کوئی تخصیص نہ تھی، اب وقت سے سیاہ رنگ ہی کا غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ یہ غالباً عباہیوں کے عہد میں شروع ہوا، جنہوں نے خانہ دانی نشاںوں کے لیے کالا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس رنگ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں میلے پن کا اثر نمایاں نہیں ہوتا، نیز

وصوب یا بارش کے باعث اس میں تغیر نہیں آتا۔
نافِ زمین : زمین کا مرکز۔

نافِ غزال : بہرن کی ناف، جہاں ایک خاص قسم کے بہرن میں مکھن پیدا ہوتا ہے۔

مشرع : حرمِ پاک کے لباس کا ٹٹک جیسا رنگ حضرت علیؑ کے قدم کی برکت ہے، اور یہ مقدس مقامِ زمین کا مرکز تو یقیناً ہے، لیکن بہرن کی ناف قطعاً نہیں۔

لوگوں نے نافِ زمین پر بحثیں کی ہیں، حالانکہ ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ کعبے کو نافِ زمین کہنا حدیث کا معنوں ہے۔ اور نافِ زمین سے وسطیٰ زمین مراد ہے، لیکن کعبہ وسطِ زمین نہیں، کیونکہ خطِ استوا سے ہٹا ہوا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ایسی حدیثیں سب کھم ہیں، جن کا محض نقل و نقل اور قطعی القدر ہونا ثابت ہو۔ ایک توجہ انہوں نے یہ بھی کی ہے کہ جن خطوں میں برت اور سردی کی انتہا ہے، وہاں ایسے حادثوں کی بڑیاں ملتی ہیں، جو گرم ملکوں کے رہنے والے ہیں۔ گویا ایک زمانے میں اقصائے شمال کا منطقہ بارہ منطقہ حارہ میں تھا۔ اس وقت عرب کا ملک ضرور خطِ استوا پر ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ بحث بالکل بے محل ہے۔ حرمِ پاک کو نافِ زمین جغرافیائی اعتبار سے نہیں کہا گیا کہ اس بارے میں خطِ استوا کی بحث ضروری ہوتی۔ یہ متبرک مقام اپنی عظمت و جلال اور تقدس و پاکیزگی کے اعتبار سے زمین کا مرکز اور اس کی ناف ہے، کیونکہ ہدایت و ارشاد کی ہر کرن اسی سے نکل کر اقصائے عالم میں پھیلتی ہے۔

۶۔ لغات - عرصۂ آفاق - روئے زمین کی وسعت۔

عرقِ النفال : شرمندگی اور ندامت کا پسینا۔

شرح : جب مجھ پر وحشت طاری ہوئی اور میں نے صواگدی شروع

کی تو دنیا وسعت کے باوجود میرے لیے تنگ نظر آئی۔ اس پر اسے ندامت کا پینا شروع ہوا۔ وہی پینا ہے، جس نے نہ نہ کر دیاؤں اور سمندروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

۷۔ **مشرح :** یہ دنیا محض خیالی اور اعتباری حیثیت رکھتی ہے یعنی فکر و خیال کا پیدا کیا ہوا ایک حلقہ ہے، اس کی حقیقت کوئی نہیں۔ اسے اسدا کہیں اس دھوکے میں مبتلا نہ ہو جائے کہ دنیا کا وجود حقیقی ہے اور ہستی کوئی غارہی حیثیت رکھتی ہے۔ اعتباری اور خیالی شے کو حقیقی سمجھ لینا یقیناً عقل و ضم کا فریب ہے، جس سے دور رہنا چاہیے۔

۱۔ **مشرح :** میرے
دل میں بے شمار شکوے
موجود ہیں اور ان کی
حیثیت ایسی ہے،
گویا راکھ کے بچے
انگارے دبے ہوئے
ہیں۔ اسے محبوب !

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
مزد کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ لے بی ہے
ولایہ درد و الم بھی تو مفتنم ہے کہ آخر
نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

تم کرید کرید کر پوچھ رہے ہو کہ آخر تمہیں کیا شکایت ہے ؟ خدا کے لیے اس سے قطع نظر کرو۔ اگر تم اس طرح کر دیتے رہے تو راکھ کے بچے سے دبے ہوئے انگارے نکل پڑیں گے اور آگ بھڑک اٹھے گی۔
راکھ کے بچے دبے ہوئے انگاروں سے ضبط کیے ہوئے شکوؤں کی تشبیہ بدیع تشبیہ ہے۔

۲۔ **لغات :** مفتنم : غنیت سمجھا گیا یعنی غنیت۔

مشرح : اسے دل ! تو رکھ اور غم سے کیوں گھبرا رہا ہے ؟ یہ بھی

تو ہر حال ایسی چیز ہے، جو غنیمت سمجھنی چاہیے، کیونکہ آخر صبح کا رونا بھی ختم ہو جائے گا اور آدھی رات کی آہ و فغاں کا ہنگامہ بھی سرور پڑ جائے گا۔

یہ مضمون مرزا نے مختلف شعروں میں باندھا ہے، مثلاً :

نغمہ ہائے غم کو بھی اسے دلِ بغنیمت جانے
بے صدا ہو جانے کا یہ سائے سستی ایک دن

نیز :

ایک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق
نورِ غم ہی سہی، نغمہ شادی نہ سہی

۱۔ لغات :

غلط بردار کا غذا
وہ کاغذ جس پر سے
کوئی لفظ یا حرف
بہ آسانی مٹایا جاسکے
اور اس کا کوئی نشان
باقی نہ رہے۔ غالباً
یہ اس مسئلہ کے جو
کاغذ کا نام تھا، یہاں
آج کل کا تب کا پلہ
کہنے کے لیے استعمال
کرتے ہیں۔ اس پر
سے بھی حرفت پھری
یا چاقو (دکڑ کلب تصحیح)

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہر کا غذا تو بے خط کا غلط بردار ہے
جی جلدے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس بہر چند آتش بار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
بہر کوئی در ماندگی میں نالے سے ناچار ہے
ہے وہی بد مستی بہر فردہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

کے ذریعے سے ہ
 آنکھ کی تصویر سرتا سر پہ کھینچی ہے کہ تا
 آسانی شائے جاسکتے
 ہیں اور کوئی فتنہ ہی
 باقی نہیں رہتا۔

شرح :
 حال فرماتے ہیں :

” یہاں اذرا و غرافت غلط بردار کے یہ معنی لیے ہیں، جس پر سے
 حرف غلط خود بخود واڑ جائے۔ کتا ہے، خط میں حرف ایک جگہ حرف
 وفا لکھا تھا، سودہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ
 کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات چنے دل سے اس پر
 نہیں لکھی جاتی، وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔“

محبوب نے خط میں حرف وفا لکھا۔ چونکہ وہ محض رسماً لکھ دیا تھا اور مخلص
 پر مبنی نہ تھا، اس لیے کاغذ نے غلط بردار ہونے کے باعث اسے خود بخود وا
 دیا۔ مراد حرف یہ ہے کہ محبوب کیسے وفا کا ذکر بھی کر دیں تو اسے بے بنیاد
 سمجھنا چاہیے، کیونکہ اس طبقے سے وفا کی اتنی ہوس نہیں سکتی۔

۲۔ شرح : سانس پلے در پلے آگ برسا رہا ہے، لیکن ہم جیسے تھے
 ویسے ہی رہے اور جلے نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال دل کی جلن کا باعث
 ہے، کیونکہ ذوقِ فنا ناقام کا ناقام رہا۔ سانس کی آتشیاری کے باوجود ہمیں جلا
 نہ سکا۔ اس معنوں کا ایک شعر پہلے بھی آچکا ہے :

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
 اے ناقامی نفس شعلہ بار حیف

مولانا علی بابائی نے اس کی سائنٹیفک توجیہ فرمائی ہے، یعنی سہر نفس سینے
 میں جا کر اشتعال پیدا کرتا ہے اور وہی اشتعال باعث حیات ہے، مالاں کہ ہر

اشتعال میں جسم کا آتش اور بدن کا ہیر (جو ہرست) فنا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلی کہ بحسب طبیعت وہ مقتضائے فطرت ہر ذی حیات کو فوقِ فنا ہے اور وہی اشتعال جو فنا کرتا ہے، عین حیات ہے، لیکن اس فوقِ فنا کی ناقامی پر جی جلتا ہے کہ ایک بار جلا کیوں نہیں دیتا۔ جو لوگ صفت کی سوانح عمری سے واقف ہیں، انھیں حیرت ہوگی کہ ان کو یہ مسئلہ دورانِ خون کہاں سے معلوم ہوا؟

۳۔ شرح : اگرچہ آگ خاموش ہے اور اسے زبانِ عطا نہیں ہوتی، لیکن جب بجھانے کے لیے اس پر پانی ڈالا جائے تو اس سے ایک صدائے داویلا اٹھتی ہے۔ اس سے یہ نظریہ پیدا ہوا کہ حالتِ در ماندگی میں سہر وجود کو نامہ و فغان کے سوا چارہ نہیں رہتا لفظ ”در ماندگی“ خاص توجہ کا محتاج ہے۔ آگ جل رہی ہو اور اس پر پانی ڈال دیا جائے تو وہ چار و ناچار بجھتی ہے، اس لیے در ماندگی پر آہ کرتی ہے۔ نظریہ کے لیے جو مثال پیدا کی ہے، وہ یقیناً بے مثال ہے۔
بجزوری فرماتے ہیں :

”کس شاعر نے آج تک آتش کے فرو ہونے کی اس ظاہر اور ادنیٰ کیفیت کو مشاہدہ اور محسوس کیا ہے ؟ لفظ ”ہر کوئی“ میں آگ کے طبعاً مغرور اور سرکش ہونے کا اشارہ نہایت خوبی سے مسخر ہے۔“

۴۔ لغات - سرشار : لبریز، لبالب، فراواں۔ بعض اصحاب نے اسے مست و بیخود کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ یہاں بظاہر یہی معنی قابلِ ترجیح معلوم ہوتے ہیں۔

شرح : خواہجہ حالی فرماتے ہیں :
”اس شعر میں دعویٰ ایسے طریق پر کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متعین نہیں واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ملکات، جو

فی الحقیقت معلوم محض ہیں، ان کی بدمستی و غفلت کا عذر
خواہ وہی ہے، جس کے پر تو وجود سے یہ تمام مخلوقات وجود
کا دم بھرتے ہیں :-

اس کائنات کی مخلوقات سے بدمستی اور از خود رفتگی میں جو کچھ سرزد
ہو رہا ہے، اس کا الزام ان پر عائد نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ تو صرف اعتباری
وجود رکھتی ہیں۔ ان کے اندر جان اور حرکت تو اس حقیقی وجود کی وجہ سے
ہے، جس کے جلووں کی فراوانی زمین و آسمان پر چھائی ہوئی ہے اور کوئی
وجود ایسا نہیں، جو اس جلوہ افروزی سے مست و سرشار نہ ہو۔

گو یا قدرہ داری اسی حقیقی وجود کی ہے، ان قدرات یا ممکناتِ عالم کی
کیا قدرہ داری ہو سکتی ہے، جو صرف اس وجود کے پر تو کی بدولت زندہ ہیں؛

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

۵۔ شرح : شعر سے بظاہر یہ واضح ہوتا ہے کہ عاشق یعنی مرزا غالب

محبوب سے خفا ہو گئے ہیں۔ محبوب انھیں مٹا رہا ہے۔ باتوں باتوں میں اس
نے کہ دیا : ”بھئی ! تو تو ہمیں اپنی زندگی قرار دیتا تھا، یعنی یہ کتنا تھا کہ میرے
جینے کا مار تو ہے“ یہ خفگی کے عالم میں فرماتے ہیں کہ ایسی بات منہ سے نہ

نکلیے، میرا دل ان دنوں زندگی سے بیزار ہے۔ یعنی جب حقیقی چیز سے
بیزار ہیں تو اس سے بیزار کیوں نہ ہوں گے، جسے مجازاً زندگی کہتے تھے۔

عشق و محبت میں اس قسم کے معاملات بھی پیش آتے رہتے ہیں اور
میں ممکن الوقوع ہیں، لیکن مرزا غالب کے سوا کون ہے، جس نے انھیں
ایسے دلکش انداز میں بانڈھا ہو ؟

۶۔ شرح : میں نے پتا لکھنے کے مقام پر آنکھ کی تصویر کیلینج دی

ہے تاکہ اسے محبوب ! تجھ پر واضح ہو جائے کہ میری حسرت و دیدار کا کیا عالم ہے۔

”نکل جائے۔“ کو سرتاڑے سے بھی مناسبت ہے اور آئینہ سے بھی۔

لغات :
پینس : فنس یا فن
پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
پانچکی - ایک سواری
کندھا بھی کناروں کو بدلنے نہیں دیتے
جسے کنار اٹھاتے تھے
اور عموماً امراد یا حورتوں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

شرح : محبوب پینس میں سوار ہو کر میرے کوچے سے گزرتا ہے تو
اتنی تیزی سے نکل جاتا ہے کہ کناروں کو کندھا بدلنے کا موقع بھی نہیں دیتا،
مبادا ایک دولہے کی دیو ہو جائے اور مرزا غالب گھر سے باہر آ کر اتفاقاً قیددار
کر لیں۔ اس سے محبوب کی انتہائی بے رخی واضح کرنا مقصود ہے۔

۱۔ لغات :
عفتا : ایک پڑا
جو مشہور بے حد ہے
لیکن اس کا وجود
کوئی نہیں۔
شرح : محبوب
کی تمنا ہے اس درجہ
حیرت میں ڈال دیتا
ہے، گویا حیرت کی
ایک بستی آباد ہو گئی
ہے۔ میرا وجود اور
مری بستی فضا کے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عفتا ہے
خزاں کیا؟ فصل گل کہتے ہیں کسکو؟ کوئی موسم ہو
تو ہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اسے بدم
اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے
نہ لائے شوخی اندیشہ تاب رنج نو میدی
کعبہ افسوس ملنا عہد تجدد تمنا ہے

سیری ہستی اسی ہستی کی فضا ہے۔ تمنا کے لیے آہ و فغاں ضروری ہے، لیکن حیرت کا تقاضا یہ ہے کہ حرکت اور آواز دونوں چیزوں کی نفی ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ جس حد تک نالہ و مزیادہ کا تعلق ہے، اسے اس فضا کا عطا سمجھنا چاہیے کہ اس کی سحریت تو ہے، مگر کبھی کسی نے دیکھا نہیں، سراسر معدوم و موجد ہے۔ صاف الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ تمنا نے سراپا حیرت بنا رکھا ہے اور فریاد و فغاں کوئی نہیں۔

۲۔ لغات۔ فصلِ گل : پھول کھلنے کا موسم۔ موسمِ بہار۔
 شرح : ہمیں معلوم نہیں کہ خزاں کیا ہوتی ہے اور بہار کسے کہتے ہیں۔ کوئی بھی موسم ہو، ہماری کیفیت یہ ہے کہ اپنے حال پر قائم ہیں۔ پتھرے میں بند ہیں اور بالی و پر کا ماتم کر رہے ہیں :
 مولانا طہطاہانی فرماتے ہیں :

- اس شعر کی بندش میں یہ حسن ہے کہ چھ جملے دو مصرعوں میں آ گئے اور ادائے صافی میں یہ حسن ہے کہ قبل کی زبانی شکایتِ بے جا ہے اور شکایت میں الغاب لطف دیتا ہے۔ معنی تبدیل کو الفاظ کثیر میں یہاں مصنعت نے ادا کیا ہے اور الغاب کا زیادہ لطف اسی میں ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملے بہت سے ہوں، نہ یہ کہ ایک طوفانی جہد ہو، گویا اس میں الفاظ زیادہ تر ہوں، مگر الغاب کا لطف نہیں پیدا ہوتا۔

۳۔ شرح : اے ہم نشین ! اگر محبوب ماضیوں سے وفا کرتے ہیں اور ان پر مہربان ہوتے ہیں تو اسے ایک اتفاقی خوش نصیبی سمجھنا چاہیے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ درد مندوں کی زیادہ کا اثر کس نے دیکھا ہے ؟ کون ان کی مہربانی کو آہ و فغاں یا محبت کی تاثیر کا نتیجہ قرار دے سکتا ہے ؟ مقصود یہ ہے کہ ہم تاثیر کچھ تامل نہیں۔

۴۔ لغات۔ کف افسوس کتنا : افسوس کے عالم میں ہاتھ کتنا جب کوئی شخص افسوس اور پشیمانی کے عالم میں ہو تو طبعاً ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔

عہد تجدید تمنا : تمنا تازہ کرنے کا عہد۔ جب کوئی عہد تازہ کیا جاتا ہے تو ہمت کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ کف افسوس کھینچنے اور تجدید تمنا کا عہد کرنے کی مناسبت واضح ہے۔

شرح : ہمارے اندیشے کی شوخی نا اطمینانی اور مایوسی کا رنج برداشت ذکر کی۔ مایوسی کے عالم میں ہم نے ہاتھ کھینچنے شروع کر دیے۔ یہ دراصل مایوسی کا اظہار نہیں، بلکہ ہم تمنا تازہ کرنے کا عہد ہاتھ رہے ہیں۔

ہاتھ دونوں صورتوں میں مل جاتے ہیں، افسوس کی صورت میں بھی اور عہد ہاتھ کھینچنے کی صورت میں بھی مردہ کی شوخی اندیشہ نے افسوس کی کیفیت کو از سر نو حتم کرنے کی کیفیت سے تعبیر کر لیا۔

۱۔ لغات۔

بُود : ہستی۔

چراغ کُشتہ :

بجھا ہوا چراغ۔

بیمار وفا :

جو شخص وفا کا بیمار ہو،

جیسے بیمار محبت۔ جسے

کوئی چیز راہ وفا سے ہٹا دے، عاشق صادق و جانناز۔

شرح : اے ظالم محبوب ! میں عشق میں مجھے ہوئے چراغ کی صورت اختیار کر گیا ہوں۔ تو خود سوچ، مجھے ہوئے چراغ کی ہستی ہی کیا ہوتی ہے ؟ سچے اور جانناز عاشق کی نبض وہی حیثیت رکھتی، جو مجھے ہوئے چراغ سے ٹھنڈے

والے دھوئیں کی ہوتی ہے کہ اٹھا اور ختم ہو گیا۔

مولانا طاعن بانی فرماتے ہیں :

”نبض کو دو چراغ کشتہ سے تشبیہ متحرک یا متحرک ہے اور وہ شبہ میں حرکت ہے یعنی سر و ہونا، کمزور ہونا، بتدریج کمزور ہوتے جانا وغیرہ جتنے یہ سب صفات سمجھے ہوئے چراغ کے دھوئیں میں ہیں، وہ سب دم نکلتے وقت نبض بیمار میں ہوتے ہیں۔ انصاف یہ ہے کہ متحرک کی تشبیہ میں مصنف کو میرٹھولی ہے۔
 اٹھا اس وقت کی نبض کو دودی کہتے ہیں، یعنی کیڑے کے رنگینے سے تشبیہ دیتے ہیں کہ عرق میں دو کیڑے کو کہتے ہیں۔
 دونوں تشبیہوں کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی تشبیہ اس سے زیادہ ترہدیح ہے۔“

۲۔ شرح : بہر شخص کا مشاہدہ کثرت ہو یا چراغ ان کے لیے روشن ہونا اور جلنا نقصان کا باعث ہے، کیونکہ جلنے سے شمع پھیل پھیل کر فنا ہوتی جائے گی۔ چراغ کا تیل اور غنیمت دونوں کم ہوں گے۔ لیکن ان کی رونق روشن رہنے اور جلنے ہی سے ہے اگر انہیں جلایا نہ جائے تو بالکل بے رونق رہیں گے گویا روشن نہ ہونا اور بے رونق رہنا شمع و چراغ کے لیے نفع بخش ہے۔ یہی کیفیت ہماری ہے۔ ہم بھی بے رونق قبول کر لیں اور عیش کے پکڑے نکل جائیں تو اس میں ہمارا نفع ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہمیں کہیں نہ کہیں دل لگا لینے کی آرزو ہے چہرہ رکھتی ہے۔ یہی بے چینی ہمارے لیے نقصان کا باعث ہے۔

غرض انسان میں دل لگا لینے کی جو فطری تڑپ موجود ہے اس کی حیثیت وہی ہے جو شمع و چراغ کے روشن ہونے کی ہے۔ انسانی زندگی کی رونق

اسی تڑپ سے ہے، جس طرح شمع و چراغ کی روشنی ان کی روشنی سے ہے۔
روشنی شمع و چراغ کو رفتہ رفتہ فنا کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ اسی طرح انسان
کے لیے عشق کی تڑپ پیغام اجل بن جاتی ہے۔

۱۔ لغات۔

نوا پرداز :-
بولنے والا، باتیں
کرنے والا۔
شعلہ آواز :-
آواز کا شعلہ۔ اس
سے مراد وہ پُرسوز
آواز ہے، جو دلوں
میں اڑ کر جاتے۔

چشمِ خوابِ خاموشی میں بھی نوا پرداز ہے
سُرمہ تو کسوں کے دودِ شعلہ آواز ہے
پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ ستارہ کی آواز ہے
دستِ گاہِ دیدہٗ خوشبہرِ معینوں دیکھنا
یک بیاباں جلوہٗ گلِ فرشِ پا انداز ہے

شرح :

حسینوں کی آنکھ خاموشی میں بھی بڑی دل پذیر باتیں کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے
کہ اس سے ہر لحظہ ایسے عشوے اور اشارے ہوتے رہتے ہیں، جو دلوں میں
اُڑ جاتے ہیں اور عاشقوں کے لیے ان میں باتوں سے بہرہ جاز یا وہ دلاویزی
ہوتی ہے۔ پھر وہ آنکھوں میں سرمہ لگا لیتے ہیں۔ یہ سرمہ گویا آواز کے شعلہ
کا دھواں بن جاتا ہے۔

سرے کی خاموشیت یہ ہے کہ اس کے کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے،
لیکن حسینوں کی آنکھ کے سرے کو ان کی دلاویز گفتگو کے شعلے کا دھواں
سمجھا جاوے۔

۲۔ لغات۔ طالعِ ناساز :- ناسازگار قسمت۔ برعکس۔

گروش تیارہ : سارے کی گروش یعنی قسمت کا پٹا۔

شرح : عاشقوں کا وجود ہی تقدیر کی ناسازگاری اور پر نصیبی کا ساز ہے اور جو وہ خراب و نفاں کرتے ہیں، اسے سارے کے پٹا کھا جانے کی آواز سمجھنا چاہیے۔

مطلب یہ کہ عاشق بہر حال سیاہ بخت میں اور تقدیر ان کا ساتھ نہیں دیتی، ہمیشہ خلاف رہتی ہے۔ پیکر، ساز، ناساز، نالہ، گروش تیارہ، آواز کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں کہ عاشق بھی ساز کے مصلح کا لفظ ہے، کیونکہ اہل قارس کی موسیقی میں مقام عاشق ایک راگ کا نام ہے۔

۳۔ لغات۔ دستگاہ : قوت، قدرت، اہمیت، طاقت، دسترس۔

ایک بیاباں جلوۂ گل : پھولوں کی انتہائی کثرت۔

فرش پا انداز : وہ فرش یا ٹاٹ، جو جوہروں کی گرو صاف کرنے کے لیے کرے کی بیرونی چوکھٹ سے ملا کر بچھا دیتے ہیں۔

شرح : دیکھیے، مجنوں کی لہو روئے والی آنکھ کی قدرت و دسترس کا کیا عالم ہے ! سجد کے صحرا میں پھولوں کی کثرت اس پہاڑ پر پہنچ گئی ہے کہ پھول ہی فرش پا انداز کا کام دے رہے ہیں۔

دستگاہ، دیدۂ خونبار، ایک بیاباں جلوۂ گل، فرش پا انداز کی مناسبت واضح ہے۔

عشق مجھ کو نہیں دشت ہی سہی میری دشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا سوائی اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
 ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
 اپنی ہستی ہی ہے جو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
 عمر ہر چند کہ ہے برقی خرام دل کے خوں کرنیکی فرصت ہی سہی
 ہم کوئی ترک و فاکرتے ہیں نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
 کچھ تو ہے اے فلکِ نالصاف آہ و حراہ کی رخصت ہی سہی
 ہم بھی تسلیم کی ٹوڑا لیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی
 یار سے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۱۔ شرح : محبوب عاشق کے مینا بانہ اظہارِ عشق پر کرتا ہے کہ یہ عشق ہے ؟ یہ تو وحشت و دیوانگی ہے ۔ عاشق جواب دیتا ہے ۔ بہتر وحشت و دیوانگی ہی سہی اور میری دیوانگی بہر حال آپ کی شہرت کا باعث ہوگی ۔
 ۲۔ شرح : یہ مضمون مرزا غالب کا خاص ہے اور ایک سے زیادہ شعروں میں مختلف انداز میں کے ساتھ آچکا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر محبوب التفات کے بجائے دشمنی سے کام لے تو یہ بھی تعلق کی ایک صورت ہے اس لیے محبوب سے انتہا کرتے ہیں کہ آپ ہم سے رشتہ تعلق نہ توڑیں ، اور کچھ نہیں تو دشمنی ہی قائم رکھیں ۔

اس مضمون کے بعض دوسرے اشعار ملاحظہ فرمائیے :

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
 جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

دارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
 کیجئے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو
 اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
 اس قدر دشمن اور باپ و قافا ہو جانا

مولانا طہا لبائی فرماتے ہیں :

” معاملات عاشقانہ میں یہ مضمون بھی مصنف کے حصّے کا ہے ۔
 خوب خوب اسے نظم کیا ہے اور جہاں نظم کیا ہے، نئے انداز
 سے بانڈھا ہے ۔“

۳۔ شرح : محبوب سے پوچھتے ہیں کہ آپ فرمائیں، میرا موجود ہونا
 آپ پر کیوں گراں گزرتا ہے ؟ اس میں آپ کی کیا رسوائی ہے ؟ اگر مجلس
 میں میرے حاضر ہونے سے آپ کو یہ خیال ہو کہ لوگوں کی انگلیاں میری
 طرف اٹھیں گی اور اس طرح آپ کی بدنامی ہوگی تو میں مجلس سے درگزر
 تنہائی میں بلا لیجیے۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ جس ملاقات کو بدرجہ تنزل قبول کرتے ہیں، وہ
 معاملات عاشقانہ ہیں آرزو کی آخری منزل ہے۔

۴۔ شرح : اگر غیر کہ تجھ سے محبت ہے تو ہو، ہم بھی تو اپنے
 دشمن نہیں۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ محبوب سے محبت نہ کرنا اپنے سے دشمنی ہے
 لہذا وہ کہتا ہے کہ ہم اپنے دشمن نہیں گویا اگر تو سمجھتا ہے کہ غیر کہ تجھ
 سے محبت ہے تو ہماری محبت کا بھی یقین ہونا چاہیے، کیونکہ اگر تجھ سے
 محبت نہ کی جائے تو وہ اپنے سے دشمنی ہوگی۔

جن اصحاب نے اس شعر کا مطلب سمجھا کہ اگر تجھ غیر کی محبت
 کا یقین ہو گیا ہے تو ہم تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کیوں کریں۔

انہوں نے مرزا کے اسلوب بیان پر پورا غور نہیں کیا اور دوسرے مصرع کا معنوم بھی ٹھیک ٹھیک ذہن نشین نہیں فرمایا۔ ان کا بیان کردہ معنوم آداب عشق کے اعتبار سے سراسر تاڑیا ہے اور مرزا غالب سے ایسا معنوم فسوب ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عشق تئیں، بلکہ ایک عام بازار سی جنس ہے کہ ایک دکان سے دلی، دوسری سے لے لی۔

۵۔ شرح : اس دنیا کے تعلق میں انسان کے لیے روش کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ مختلف اشیاء سے کچھ حاصل کیا جائے، دوم یہ کہ ان سے غفلت اور بے پروائی اختیار کر لی جائے۔ مرزا کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی ذات کے سوا کسی کا خیال تک دل میں نہ لانا چاہیے۔ اگر آگاہی مقصود ہے، حقیقت منہی منظور ہے تو وہ بھی اپنی ہی ذات سے جو۔ اگر غفلت و بے پروائی اختیار کرنی ہے تو وہ بھی اپنی ہی ذات سے کرنی چاہیے۔

تصوف کا بہت بڑا مسئلہ ہے، جو مرزا نے ان چند الفاظ میں پیش کر دیا ہے اور الفاظ نہایت موزوں میں۔ اپنی ذات سے آگاہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے، سمجھ لے کہ وہ بندہ ہے اور دنیا میں اس کے پیدا کرنے کا ایک خاص مقصد و نصب العین ہے، جو پورا ہونا چاہیے اور یہ نصب العین خالق کا مقرر کیا ہوا ہے۔

وما خلقت الجن والانس اور میں نے جنوں اور انسانوں

الا لیعبدون کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ

وہ میری عبادت کریں۔

عبادت سے مقصود احکام الہی کی پیروی ہے۔ اسی طرح اصل مقصد پورا ہونا ہے۔

ایک روایت مشہور ہے، جسے حدیث بتایا جاتا ہے، اگرچہ انساب صحیح

نہیں یعنی :-

من عرف نفسه فقد عرف ربه
جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس
نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

یہ اپنی ذات سے آگاہی ہے۔

غفلت و بے پروائی یہ ہے کہ اپنے آپ کو بالکل بے وجود اور نیست سمجھے۔ اس کا نتیجہ بھی خدا کو وجود حقیقی ماننے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ گویا اپنی ذات کے متعلق آگاہی اور غفلت دونوں صورتیں اختیار کرنا انسان کو اس منزل پر پہنچا دیتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ مولانا طہطاہائی کیا خوب فرماتے ہیں:

”اس شعر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ حق یہ ہے کہ مشائخ طریقت جن کا کلام ترجمان حقیقت ہوا کرتا ہے ان کے دلوں میں آج اس شعر کی نفیر سے خالی ہیں۔“

۲۔ لغات - برق خرام : بجلی کی طرح تیز رفتار۔

تشریح : ہم نے مانا کہ عمر بجلی کی طرح تیز رفتار ہے یعنی ابھرائی اور ادھر گئی، چمکی اور ناپید ہو گئی۔ گویا فرصت اتنی کم ہے کہ کوئی خاص کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔ چلو اور کچھ نہیں ہو سکتا تو اس صدمت سے فائدہ اٹھا کر دل ہی کو خون کر لینا چاہیے۔

اکثر لوگ اس دہم میں مبتلا رہتے ہیں کہ عمر کی صدمت بے حد تحلیل ہے، کریں تو کیا کریں۔ مگر فرماتے ہیں کہ اگر اس فرصت کو چمک برق بھی تصور کر لیا جائے تو مفاتیح نہیں، مگر کچھ کرنے سے باز نہ رہنا چاہیے۔ مرزا کے نزدیک سب سے اہم اور ضروری کام یہ ہے کہ دل کو خون کر لیا جائے۔ یقیناً یہی زندگی کا دیبا تر ہے کام ہے۔ دل کے خون کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ وجود حقیقی سے سچا عشق پیدا کیا جائے۔

مولانا طہطاہائی فرماتے ہیں : ”وہ مناسب ہے کہ برق بھی تو خون کر لے گا۔“

۷۔ شرح : ہم نے عشق کیا۔ اگر تکلیفوں اور سختیوں کی فراوانی کے باعث عشق مصیبت بن گیا تو کچھ پروا نہیں، ہم صبر و سکون سے ہر آفت اور ہر مصیبت برداشت کریں گے، لیکن ترک و غا پر کبھی آمادہ نہ ہوں گے۔

۸۔ شرح : اے نا انصاف آسمان ! میں یہ نہیں کہتا کہ وہی مجھے دے، جس کی آرزو ہے۔ مزید و فقاں کی صلت ہی دے دے۔

شعر میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے اسے سادہ الفاظ میں پیش کرنا سہل نہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مصیبت زدہ شخص ایک ایک آرزو اور مراد کے لیے کوششیں کر چکا ہے، مگر ناکامی کے سوا کچھ اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ انتہائی یاس و ناامیدی کی حالت میں وہ کہتا ہے کہ اے آسمان ! اگر تو کوئی مراد پوری نہیں کرتا تو اتنی ہی رخصت دے دے کہ میں اپنی حالت پر روپیٹ لیا کروں۔

لفظ "نا انصاف" سے واضح ہے کہ آسمان نے شاعر کی کوئی بھی مراد برہنہ آنے دی اور اتنی بے انصافی کی کہ اسے مزید و فقاں کا بھی موقع نہ دیا گیا اور وہ بیچارگی کے عالم میں اور کچھ نہیں مانگتا، صرف رونے پٹینے کی اجازت مانگتا ہے۔ یہ آسمان کی نا انصافی اور شاعر کی مایوسی و نامرادی کی انتہا ہے۔ آسمان کے ہمتوں وہ اتنا تنگ ہے کہ رونے پٹینے کو بھی ایک نعمت سمجھ کر آسمان سے طلب کرتا ہے۔

جس کی بہار یہ ہوا پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

۹۔ شرح : ہم نے مانا کہ بے نیازی تیری عادت ہے۔ تو کسی مسکین کی حالت پر متوجہ نہیں ہوتا اور تیرا عام شیوہ ہی یہ ہے کہ ہر ایک سے بے پروائی اختیار کیے رہے۔ اگر حقیقت میں ہے تو ہم بھی رفتہ رفتہ تسلیم کی خوشیہا کریں گے اور تیری بے نیازی کو برداشت کرنے کے عادی بن جائیں گے۔
خود اہلین گے سے واضح ہوتا ہے کہ ابھی طبیعت برداشت کی عادی

نہیں، رفتہ رفتہ اسے قابو میں لا کر عادی بنائیں گے۔

۱۰۔ **شرح :** میر غلام حسین قدس بگرامی نے یہ شعر نیز تاسخ کا ایک شعر مرزا غالب کی خدمت میں پیش کر کے پوچھا تھا کہ ”سہی“ اور ”تو سہی“ کا ترجمہ فارسی لغت میں کیا آیا ہے۔ جواب میں مرزا فراتے ہیں !
 ”اسماء کے واسطے یا لغات کے واسطے یہ بات ہے کہ عربی میں یہ کہتے ہیں اور فارسی میں یہ اور ہندی میں ہے۔ طرز گفتار ہندی کی فارسی یا فارسی کی ہندی کبھی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً چوری کا گڑ میٹھا۔ اس کی فارسی نہ پوچھیے گا، مگر نادان۔“ ”سہی“ اور ”تو سہی“ کی فارسی کیونکر بنے ؟ یہ روز مرہ کی اردو ہے۔

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس مطلب کے مطابق فارسی عبارت یوں ہو سکتی ہے : وصل

اگر غنیت، حسرت نیز عالمے وارد

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے استاد ! محبوب سے چھوڑ کا سلسلہ بابر قائم رہنا چاہیے۔ اگر وصل تیسر نہیں آتا تو معنائیقہ نہیں، وصل کی حسرت کا اظہار ہی کرتے رہنا چاہیے۔

۱۔ لغات۔ آرمیدگی :

آرام پانا، راحت طلبی۔

نکویش : علامت مرزوش

شرح : میں صحرا

گردی اور وحشت خوردی

چھوڑ کر راحت کی غرض سے

ہے آرمیدگی میں نکویش بجا مجھے

صبح وطن ہے خندہ دندان نما مجھے

ڈھونڈے ہے اس مفتی آتش نفس کو جی

جس کی صدا ہو جلوہ برقی فنا مجھے

گھر آ بیٹھا تو بلیک میں
 سلامت و سرزندگی کا سزاوار
 ہوں۔ میرے گھر یعنی
 وطن کی صبح میرے لیے
 دغماں نما خندہ بنی ہوئی
 ہے تو یہ ہرگز بھانپیں
 بلکہ بالکل بجا ہے۔
 مقصود یہ ہے کہ
 عشق میں راحت و آرام

متناہی کر دوں ہوں رو وادی خیال
 تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے
 کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں
 آنے لگی ہے نکست گل سے حیا مجھے
 کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
 شعروں کے انتخاب نے رُٹوا کیا مجھے

کا شائبہ بھی کسی کے لیے دیا نہیں۔ اگر کوئی راحت طلبی پر مائل ہو تو ماحول کی
 ہر چیز اس کے لیے پیغامِ سلامت بن جائے گی۔

۲۔ لغات۔ مفتی: بھانے والا۔

آتشِ نفس : جس کا دم آگ اُٹھے، جس کی آواز سوز و گداز سے بھری
 ہوئی ہو۔

شرح : دل ایسے گانے والے کا طلبگار ہے، جس کی آواز سوز و گداز
 سے اس طرح لبریز ہو کہ میرے لیے فنا کی بھلی کا جلوہ بن جائے، یعنی میں ایسے
 سماج کا خواہاں ہوں جو مجھے جلا کر فنا کر دے۔

۳۔ لغات۔ باز گشت : واپسی، مراجعت، لوٹنا۔

شرح : میں خیال کی وادیِ مستی و بیخودی کے عالم میں طے کرتا ہوں
 تاکہ کوٹھنے سے مجھے کوئی غرض نہ رہے۔

انسان جو راستہ ہو خمدی کے عالم میں چوکس رہ کر طے کرے، اس کے
 منیب و فراز، موڑوں اور مختلف منزلوں کے خاص نشانوں کی یاد دل میں باقی
 رہ جاتی ہے، لیکن جو راستہ بیخودی اور مدہوشی میں طے ہو، اس کے متعلق کچھ

خیال نہیں رہ سکتا۔ سرزرا بھی خیال کی دادی اسی انداز میں ملے کرتے ہیں کہ واپس نہ آئیں۔ مطلب یہ کہ ہر وقت خیال میں غرق رہتے ہیں۔

۴۔ شرح : تو نے باغ میں ایسی بے حجابیاں شروع کر دی ہیں کہ مجھے پھولوں کی خوشبو سے شرم آنے لگی ہے۔

شرم کی وجہ یہ کہ میرے نزدیک تو نکست گئی ہی بے حجاب تھی کہ ذرا ہوا کی لہرائی اور وہ پھول کا پردہ چاک کر کے بے اختیار نکل پڑی، لیکن اسے محبوب! تیری بے حجابیاں اس پیانے پر پہنچ گئی ہیں کہ میں جو پھول کی خوشبو کو بے حجابی کے طعنے دیا کرتا تھا، اب شرم کے مارے اس کے آگے آگے نہیں اٹھا سکتا۔

۵۔ شرح : میرے دل کی حقیقی کیفیت کسی پر ٹھیک ٹھیک آشکارا

نہیں ہو سکتی تھی۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ میں نے اپنے مطلب کے شرچن چن کر جو محبوب تیار کیا، اس نے میرا زفاش کر دیا۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے دل کی جو حالت ہو، اسی کی مناسبت سے وہ اشعار کا انتخاب کرتا ہے۔ یہی انتخاب دوسروں کے لیے اس کی اصل کیفیت معلوم کر لینے کی کلید بن جاتا ہے۔ اگر اپنے مطلب کے شعر نہ چنے ہوتے تو رسوائی کی نوبت نہ آتی

شرح : جب

ہمارا ہی زندہ گی نہ تھی

برہی حالت میں

گزی تو ہم کیا یاد

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کریں گے کہ ہمارا بھی کوئی خدا تھا۔

دوسرا مصرع پورے کا پورا ایک کہاوت ہے جو حسن و خوبی سے نکلے کر دی

گئی ہے۔ فارسی میں یہی مضمون یوں باندھا ہے :

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چه رفت

می توان گفت کہ این بندہ خداوند نداشت

مرزا آفتاب کو ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں کہ اپنے

کلمے ہوئے تمام اشعار بھول گیا، صرف ڈیڑھ شعر یاد رہ گیا، ایک مقطع یعنی :

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب !

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دس پانچ بار یہ پڑھ لیتا ہوں، پھر جب سخت گھبراتا ہوں تو یہ مصرع

پڑھ کر چپ ہوجاتا ہوں کہ :

اے مرگِ ناگہاں ! تجھے کیا انتظار ہے ؟

۱. شرح : محبوب کی

بزم میں غیرت اور سیاداری

سے کام لیا جانے تو گزارہ

نہیں ہو سکتا اور بے حیا بنے

بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ میں اس

کی محفل میں گیا، اگرچہ لوگ

اشارے کرتے اور آواز سے

کہتے رہے، لیکن میں ان سے

بے پروا ہو کر بیٹھا رہا۔ پروا

کرتا تو اٹھنا پڑتا اور یہ گوارا

نہیں ہو سکتا تھا۔

اُس بزم میں مجھے نہیں بتی حیا کیے

بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے سیاستِ دربار سے گڑ گیا

میں اور جاؤں در سے تیرے بن صدا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقة و سجادہ رہن نے

موت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو کرچہ عمرِ خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

نقدور ہو تو خال سے پوچھوں کہ اولیٰئم

نوں نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عذوبہ

کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کیے

صحبت میں خیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو

دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے

جند کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں

بجھوے سے اس نے سیکڑوں وعدہ وفا کیے

غالب تمیں کو کہ لے گا جواب کیا

مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

دل ہی تو ہے تلے دو پہلو ہیں ، اول یہ کہ وہ حساس ہے ، اچھی چیز کی

طوٹ پکتا ہے ، منور رساں چیز سے دور بھاگتا ہے ۔ وہ چوکیدار کی تعزیر سے

ڈر گیا ۔ دوم یہ کہ دل میرے قابو سے باہر ہے ۔ مجھے اس پر کوئی اختیار نہیں ۔

لہذا دل کی وجہ سے مجھے چپ چاپ نکل جانا پڑا ۔

۳۔ لغات : خرقہ : گدڑی ، جو فقراء کا خاص لباس سمجھی جاتی ہے

سجادہ : جس پر سجدہ کیا جائے ۔ جائے نماز ۔

آب و ہوا : یہاں اس سے مراد فصل بہار ہے ۔

شرح : میں اب خرقہ اور سجادہ شراب خریدنے کی غرض سے گرد

رکھنے کے لیے کوشاں ہوں ، کیونکہ مدت گزر گئی ۔ میں نے فصل بہار کی دھواں

۲۔ لغات :

سیاست وربانی :

چوکیدار کی طوٹ سے

باز پرس ، دارو گیر

اور ڈانٹ ڈپٹ ۔

شرح : دل

ہی تو ہے ، جو وربانی

کی دارو گیر اور پکڑ

دھکڑ سے ڈر گیا ،

ورد کیا یہ ممکن تھا

کہ میں آپ کے روئے

پر پہنچوں اور صدا

لگائے بغیر وہاں سے

گزر جاؤں ؟

اہتمام نہیں کیا۔

مفضل بہار کی دعوت کا مطلب یہ ہے کہ اس خوشگوار موسم میں تاؤ نوش کا لطف نہیں اٹھایا۔ خرقہ و سجادہ دونوں کو شراب کے لیے گرد رکھنے کی ضرورت غالباً اس لیے پیش آئی کہ خاصی مقدار بہم پہنچ سکے تاکہ بھی بھر کر پی سکیں، اگرچہ میرزا غالب کے نزدیک ان سے بڑی چیزیں بھی کوئی زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، کیونکہ فرماتے ہیں :

از فرنگ آمدہ در شہر فراوان شدہ است

جرعہ را دیں عوام آریدے اوزاں شدہ است

۴۔ لغات - بے صرفہ : بے فائدہ، بے سود، بے نتیجہ۔

شرح : عمر کتنی ہی لمبی ہو جائے، آخر بے سود اور بے فائدہ ہی گزر جاتی ہے۔ دنیا داری کے جہاں اتنا موقع ہی نہیں دیتے کہ عام انسان کوئی شایاں کام انجام دے سکیں۔ مثلاً حضرت خضرؑ ہی کی مثال لے لیجیے جن کی عمر عام روایت کے مطابق نہایت لمبی ہوئی، بلکہ اب تک زندہ ہیں، وہ میں کل یعنی قیامت کے دن کیا مزائیں گے کہ ہم کیا کچھ کرتے رہے۔

مقصود خدا نخواستہ یہ نہیں کہ حضرت خضرؑ کو ہدفِ علم بنایا جائے بلکہ طویل عمر کی ایک مثال پیش نظر رکھ لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بے شمار ایسے انسان ہیں، جنہیں زندگی کی خاصی مدت ملتی ہے، مگر ان سے اپنی ذات کے لیے تنگ و دوکے سوا کچھ نہیں ہوتا اور وہ شاید ہی کوئی ایسا کام انجام دیتے ہیں، جو خلقِ خدا کے نقطہ نگاہ سے مفید و شایاں ہو۔

۵۔ لغات - لیشیم : کبجوس۔ بخیل۔

شرح : اگر ممکن ہو اور میں دسترس پاؤں تو زمین سے پوچھوں کہ اے نامراد کبجوس ! جو بیش بہا خزانے تیرے حوالے ہوئے تھے اور تیری تہیں پہنچ گئے، وہ کہاں گئے اور ان کا کیا بنا ؟

مطلب یہ ہے کہ بے شمار گراں قدر ہستیاں یہاں رونما ہوئیں۔ انھوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیے اور مر کر تجھے میں دفن ہو گئیں اور اب ان کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ زمین سے پوچھتے ہیں کہ تو نے ان سے کیا پرتاؤ کیا؟

۶۔ **تشریح :** کون سے دن رقیبوں اور مخالفوں نے ہم پر تہمتیں نہ تراشیں اور کون سے دن ہمارے سر پر آدے نہ چلے، یعنی ہمیں انتہائی دکھ دیے گئے؟

”تراشنے“ اور ”آدے چلنے“ کی نسبت واضح ہے۔

۷۔ **تشریح :** محبوب نے وصل میں خاص التفات سے کام لیا۔ تو عاشق کے دل میں یہ دوسرہ پیدا ہو گیا کہ پہلے تو یہ حالت نہ تھی اور بدگئی کی بنا پر سمجھ لیا کہ کہیں رقیب کی صحبت میں یہ حادثہ نہ پڑ گئی ہو۔ اور مشہد ہے :

عشق است و ہزار بدگئی

عاشق بے التفاتی پر مزایا و نفاں کرتا ہے، لیکن محبوب کی طرف سے التفات ہو تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ عادت غیر سے اختلاف کے باعث نہ پیدا ہو گئی ہو۔

۸۔ **تشریح :** میرے محبوب کی عادت یقیناً بری نہیں، البتہ کبھی مذہر آ جائے تو جو کچھ کرنا چاہیے، نہیں کرتا۔ چنانچہ جب کبھی وہ ضد بھول گیا تو ایک دو نہیں، اس نے سیکڑوں وعدے پھدے کر دیے۔

اعتیاد دیکھیے کہ خوسے محبوب کے بارے میں نشانات نہیں، نفی کا پہلو اختیار کیا، یعنی یہ نہیں کہا کہ خواہمیں ہے، یہی کہا کہ بڑی نہیں، مرزا کے کلام کی یہی باریکیاں اور نزاکتیں ہیں، جو کسی دوسری جگہ عموماً نظر نہیں آئیں۔

۹۔ **تشریح :** اے غالب! تم جو اپنا حال سنا سنے اور اظہارِ عشق کرنے کی غرض سے محبوب کے پاس جاتے ہو، خود ہی بتاؤ کہ قصائی داستان

سزائی کا حجاب کیا ملے گی؟ ہم کہتے ہیں کہ اچھا، تم نے سب کچھ کھینچ
محبوب نے سن لیا، لیکن اس سے نتیجہ کیا نکلے گا؟

یہ سب کچھ ایک بہادر تاج محل کو سمجھا رہا ہے، گویا اظہارِ عشق کا
قصد دیکھ کر سمجھ گیا ہے کہ غالب دیوانہ ہو رہا ہے۔ وہ اُس کے سامنے
اظہارِ عشق کرنے چلا ہے، جہاں اس کے پہنچنے کا بھی کوئی امکان نہیں۔
پھر پوری بات سن لینے اور اسے مان لینے کا کون سا امکان ہے؟

۱۔ تشریح : عمر

کی رفتار پر نظر ڈالی جائے
تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم
حالتِ اضطراب میں کتنے طے
داستے پر جا رہے ہیں۔ سال
کے حساب کی صورت یہ ہے
کہ آفتاب بارہ منزلیں طے
کرے تو سمجھتے ہیں کہ ایک
سال ہو گیا اور معلوم ہے کہ
شمسی سال تین سو پینسٹھ دن
پانچ گھنٹے، اٹھائیس منٹ
اور ساڑھے سینتالیس سیکنڈ
کا ہوتا ہے۔ گھنٹوں ہی کی
گفتی پوری کرنے کے لیے چوتھے
سال مزدوری کے جیسے ہیں ایک
دن بڑھا دیتے ہیں، جسے لونڈ

رفتارِ عمر قطع رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برقی آفتاب کے
میناٹے سے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تذرو جلوۂ موجِ شراب ہے
فرخی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب کے
جاوادِ بادِ فوشیِ رنداں ہے ششِ شجبت
غافل گاہِ کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
نظارہ کیا حریف ہو اس برقی حُسن کا
جوشِ بہارِ جلوے کو جبکہ نقاب ہے

میں نامراد دل کی قسّی کو کیا کروں
 کا دن کہتے ہیں۔ مرزا فراتے
 ہانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیا ہے
 ہیں کہ جس طرح سال کا حساب
 گزرا اس دستِ پیغام یار سے
 سوچ کی بنا پر کیا جاتا ہے
 قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے
 اسی طرح عمر کا حساب مطلوب
 ہو تو برقی کی بنا پر کیا جاتا ہے۔

مقصود یہ کہ عمر بھلی کی طرح تیز رفتار ہے اور زندگی کی منزل طے کرنے
 کی وہی صورت ہے، جیسے کوئی مسافت حالتِ اضطراب میں طے کی جائے۔
 - تیزی -، رفتار -، اضطراب - اور ترقی - کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔
 ۲۔ لغات - تذرو : ایک خوش رنگ اور خوش رفتار پرندہ، جو
 استر آلود کے جھگل میں بہ کثرت ہوتا ہے۔ محققین کے نزدیک ذال ہی سے
 صبح ہے۔ فاختہ اور قمری کی طرح شعراء تذرو کو بھی سرو کا عاشق قرار دیتے
 ہیں :

شرح : شراب کی مراچی بہار کی شادمانی کے جوش میں سرو کی
 شکل اختیار کر گئی ہے یا یوں سمجھیے کہ بہار نے ہر شے پر عیش و نشاط کی ایسی
 کیفیت طاری کر دی ہے کہ شراب کی مراچی سرو بن گئی ہے۔ اسی طرح
 تذرو کے بال و پر پوچ شراب کا جلوہ معلوم ہوتے ہیں۔
 شعر میں بہار کا نقشہ و نگش انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
 ۳۔ لغات - پاشنہ : اڑی -
 گوں : طاقت، بہت۔

اقامت : قائم رہنا، بر جا رہنا، ٹھہرنا۔

شرح : اپنی جگہ کھڑا رہنے سے پاؤں کی اڑی ہی زخمی ہو گئی :
 اب رہ جگہ کی بہت وقوت ہے، نہ ٹھہرے رہنے کی طاقت ہے کیونکہ

قیام و فرار کا اختصار ایڑیوں ہی کی سلامتی پر ہے۔

میدان جنگ میں دو ہی صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔ یا انسان بہت و جرات سے کام لے کر ثابت قدمی دکھائے یا نامرد بن کر بھاگ جائے، لیکن جس شخص کے پاس ثابت کی ایڑی زخمی ہو جائے، وہ دونوں میں سے کوئی بھی کام انجام نہیں دے سکتا اور گر جاتا ہے۔ اسی حالت اضطراب کا نقشہ مرزا نے اس شعر میں کھینچا ہے۔

مرزا نے اس سے ملتا جلتا ایک اور بھی شعر کہا ہے :

ہوے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

۴۔ لغات - جہاداد : جاننا اور ملکیت

شش جہت : چھ طرفین، یعنی دنیا یا کائنات۔

شرح : یہ پوری کائنات رندوں کی شراب نوشی کے لیے جاگیر

ہے۔ جسے حقیقت کا کوئی احساس نہیں، وہ سمجھے بیٹھا ہے کہ یہ جہان بالکل ویران و تباہ حال ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

”بادہ سے عرفان اور رند سے عارف مراد ہے اور عالم کے

خراب و ویران ہونے سے مطلب یہ ہے کہ جو شخص جلوۂ

حقیقت سے غافل ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی صانع

اور مدبر نہیں“

یعنی ساری کائنات عارفوں کے نزدیک معرفت کی ایک جلوہ گاہ ہے

اس کی ہر شے سے حقیقت شناس دل یہ سبق لیتے ہیں کہ اس کے پس پردہ

ایک عظیم القدر صانع کی تدبیر و کار فرمائی جاری ہے۔ جو لوگ عرفان کا

ذوق نہیں رکھتے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا ابترا، بے ترتیب اور بے پروا

سی ہے، جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔

متصور غائب فقط نگاہ کے علاوہ بھی شعر بدہی حقیقتوں کا حامل ہے۔ مرزا یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی بھی شے ایسی نہیں جو کوئی نہ کوئی مقصد پورا نہ کر رہی ہو۔ حقیقت شناس لوگ ہر شے سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور رفتہ رفتہ فطرت کی قوتوں کو مستخرج کرتے کرتے انسان زمین سے ستاروں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے، لیکن جن لوگوں کو حقائق کا کوئی احساس نہ ہو سکا اور غافل رہے، وہ اتنے ہی پر قانع رہے کہ دنیا کو بے حقیقت اور ناقابلِ توجہ قرار دے کر اس سے دور بھاگنے کی تلقین فرماتے رہے۔

۵۔ شرح : نظارہ اس برقی حسن کے جلوے کا کیونکر محفل ہو سکتا ہے جس کے لیے فضلی بہار کا جوش پروے کا کام دے رہا ہے۔

مولانا طبا طبائی جوش بہار کو عالم اجسام کے طور سے تعبیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، یہ ظہور جس شاہِ حقیقی کے لیے حفاظت کا باعث ہے، اسے نظر کیونکر دیکھ سکتی ہے؟ نظر جب پڑے گی، نقاب ہی پر پڑے گی۔ یعنی اچھو جب دیکھے گی، اجسام ہی کو دیکھے گی۔

مرزا یہ کنا چاہتے ہیں کہ جوش بہار کی گلاکاریوں اور طراوت افزائیوں کا نظارہ آسان نہیں، حالانکہ جوش بہار حسنِ حقیقی کا ایک نقاب ہے۔ اس صورت میں کوئی اصل حسن کی تاب کیا لاسکتا ہے۔

۶۔ شرح : میں نے مانا کہ نگاہیں حیرے ربخ الوہ پر پڑ رہی ہیں لیکن اس نامراد دل کو کیونکر تسلی دوں؟ وہ محض دیدار سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے کچھ اور چاہیے، جس کی تعبیر مولانا طبا طبائی نے "سینہ بہ سینہ" ہونے سے کی ہے۔

۷۔ شرح : اسد یعنی غائب نے محبوب کے پیغام کو خوشی خرابان کر دی اور یہ رشک برداشت نہ کر سکا کہ قاصد اس کے پاس جاے، بات چیت کرے۔

پھر پیغام لائے۔

محبوب کا پیغام عاشق کے لیے ہمیشہ انتہائی مسترت کا باعث ہوتا ہے، لیکن مرزا کو یہ منظور نہ ہوا کہ قاصد پیغام لینے کے لیے جائے اور محبوب سے ہم کلام ہو۔ اس رشک کے باعث پیغام وصول کرنے کی خوشی سے دست برداری اختیار کر لی۔

۱۔ شرح:

مرزا نے رشک

کے جھپٹے غریب

پہلو پیدائے

ہیں، ان میں

سے ایک وہ

بھی ہے، جو

اس شرم

پیش کیا گیا ہے

فراتے ہیں:

پر قسمتی لا حظ

ہو کہ مجھے خود

اپنے آپ پر

رشک آنے

لگا، محبوب

کی زیارت

کرنا چاہتا

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے

میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گرا اندیشے میں ہے

آگینہ تندی صبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب! وہ کیونکر منع گستاخی کرے

گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے

دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشم بہ تری بزمِ طرب سے واہ وا!

نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تفاعل پر وہ دائرِ رازِ عشق

پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے سے

اس کی بزم آرا اشیاں سن کر دل رنجور یاں ہوں، مگر شک
 مثلِ نقشِ مدعا ئے غیر بیٹھا جائے ہے یہ موقع ہی
 ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا نہیں دیتا کہ
 رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے اسے دیکھ سکوں
 نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز، بین! مولا علیؑ
 کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھینچتا جائے ہے نے خوب فرمایا
 سایہ میرا مجھ سے مثلِ دور بھاگے ہے اسد، اتنا نے دکھ
 پاس مجھ کو آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے جیسے اتنا نے
 اپنے تئیں بھی محروم رکھتا ہے: اس قسم کے مزید اشعار میں سے ایک دو درجہ
 فرمائیے :

ہم دکھ کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
 مرتے ہیں، مگر ان کی تمنا نہیں کرتے
 تکلف برطرفِ نظارگی میں بھی سہی، لیکن
 وہ دیکھا جائے، اکب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
 چھوڑا نہ رنگ نے کہ ترے گھر کا نام لوں
 ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ ہاؤں کہھر کو میں

۲۔ لغات - آگینہ : شیشہ، شیشے کی صراحی

شرح : اگر فکرِ اندیشہ کی گرمی کا یہی حال ہے تو دل سے ہاتھ دھو
 بیٹھنے کے بغیر چارہ نہیں، کیونکہ شراب اتنی تیز و تند ہے، جو شیشے کو پگھلائے

ہمارے ہیں۔

مکر و اندیشہ کی گری کو شراب تند سے اور دل کو آگینے سے تشبیہ دی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ دل کا آگینہ گہل کر ختم ہو جائے گا۔

غالب نے دوسرے مصرع کا مضمون ایک فارسی شعر میں بھی بانجا ہے
اگرچہ باقی مضمون کچھ اور ہے، یعنی :

میتا سے نئے از تندی ایں نئے بگدازد

پیغامِ حنت در خورِ تحویلِ صبا نیست

۲۔ شرح : خواجہ جاتی فرماتے ہیں :

یہ شعر معانی کا ہے، جو طاب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا

ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر

ہے کہ حیا آئی اور شرابا دور اصل ایک ہی چیز ہے۔ پھر اس کے

کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرابا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس

مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرابا ہلنے کا متعلق اور۔

”گر حیا بھی اس کو آتی ہے“، یعنی ”غیر کی گستاخی پر خواہش و حیا

سے تو شرابا ہٹنے ہے“، یعنی ”غیر سے یا اس کے ساتھ مکرار کرنے سے“

شعر کا مطلب واضح ہو گیا، صرف اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ حیا دار شخص

طبعاً خود زیادہ سے زیادہ تکلیف اٹھا لیتے ہیں اور دوسرے سے مکرار نہیں کرتے

یا کوئی ایسی بات نہیں کہتے، جو اس کی دگڑاری کا باعث ہو۔ یقیناً غیر کی گستاخی

دیکھ کر مجرب کو حیا آتی ہے۔ وہ غیر کو منع کرنا چاہتا ہے، لیکن انتہائے دلگیری

میں جو حیا داری کا طبعی خاصہ ہے، منع کر نہیں سکتا، یہی بات مرزا غالب نے

شعر کے پہلے مصرع میں واضح کی ہے۔

۴۔ لغات - لغت : لپکا، ٹٹو۔ یہ لفظ لپکا کی طرح بری عادت

کے لئے بھی مستعمل ہے۔

شرح : شوق کو توڑ پکا پڑ گیا ہے کہ سبروم فریاد و فغاں ہی کرتا ہے۔ لیکن دل کی حالت ضعف کے باعث ایسی ہے کہ سانس لیتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔ شوق اور دل کی اس کشمکش کے باعث جان مضارب میں ہے۔

۵۔ شرح : تُو نے عیش و نشاط کی جو محفل آراستہ کر رکھی ہے، خدا اسے بُری نظروں سے بچائے۔ واہ وا ! بھان اشد ! اُس بزم کی یہ کیفیت ہے کہ میں تالہ بھی کرتا ہوں تو وہاں پہنچتے پہنچتے وہ نغمہ ہو جاتا ہے۔ گویا بزمِ مہر کی فضا میں ایسی تاثیر ہے، جو نالے کو نغمہ بنا دیتی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ کہا ہے :

بہشتیں ! مت کہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیش و دست
واں تو میرے تالے کو بھی اعتبار نغز ہے

شرح : اگرچہ ہم نے ایسا انداز اختیار کر رکھا ہے کہ عشق کا صبیح محبوب پر بھگنے نہ پائے اور ہمارے لیے اس کے پاس جانے میں ٹوک ٹوک کی نوبت نہ آئے، لیکن جب ہم اسے دیکھتے ہیں تو اس طرح کھوٹے جاتے ہیں اور از خود رفتگی کا ایسا عالم ہم پر طاری ہو جاتا ہے کہ محبوب عشق کا راز ایک صد تک پاتا جاتا ہے۔ یعنی اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کھویا جاتا خالی از علت نہیں۔

۷۔ لغات - دل بیٹھا جانا : دل پر حد درجہ ضعف طاری ہونا، یعنی عشق کی ابتدائی حالت۔

رنجور : بیمار - اضرہ۔

نقش بیٹھنا : نقش قائم ہو جانا، کسی کے دل میں جگہ سے بیٹنا۔

شرح : محبوب کے ہاں عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہیں۔

میں ان کا ذکر سنتا ہوں تو بیمار و اضرہ دل پر حد درجہ ضعف کے باعث غشی طاری ہونے لگتی ہے۔ خیر کے مطلب و مقصود کا نقش قائم ہوتا جاتا ہے اور وہ محبوب کے دل میں گھر کر رہتا رہتا ہے۔

پہنچنے کا تعلق عاشق کے دل سے ہے اور رقیب کے مدعا سے۔ ایک سے مراد انتہائی صنعت ہے، دوسرے سے مراد پوری کامیابی و کامرانی۔

۸۔ لغات۔ رنگ کھلنا : رنگ کا نمایاں اور زیبا ہونا یا سفید ہونا

شرح : میرا پری جیسے چہرے والا محبوب کسی پر عاشق ہو گیا، عشق کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ اس کا رنگ اٹھنے لگے۔ چنانچہ اس وجہ سے وہ اور بھی نازک بن گیا اور ظاہر ہے کہ رنگ جتنا اڑے گا، اتنا ہی کھلے گا۔ ہر فرد واضح ہے کہ کسی چیز پر کوئی رنگ ہو، وہ جتنا اڑتا جائے گا، چیز اتنی ہی سفید ہوتی جائے گی۔

۹۔ لغات۔ کھینچتا جائے ہے : (۱) تصویر ہنق جا رہی ہے (۲) محبوب پیچھے ہٹتا جا رہا ہے، یعنی پہلے کھینچتا کی مندر۔

شرح : اس کی تصویر مستور سے بھی کیا گیا ناز کر رہی ہے۔ وہ ہنق کو شش پوری کروینے کے لیے کرتا ہے، اتنا ہی محبوب دُور ہٹتا یعنی کشیدہ ہوتا جاتا ہے۔

مطلب یہ کہ محبوب کے ناز و انداز اور عشوہ واداکے باعث مستور کو تصویر پوری کر دینے کا موقع نہیں ملتا۔

۱۰۔ لغات۔ آتش بھان : جس کی جان میں آگ بھڑک رہی ہو۔

جو سراپا آگ ہے۔

شرح : اے اسد! میرا یہ اسی طرح مجھ سے دُور بھاگتا ہے، جس طرح آگ سے دھواں نکل کر الگ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے میرے دل و جان میں آگ جھڑک رہی ہے اور میں سراپا آتش ہوں۔ بھلا میرے پاس مٹرنے کی تاب کبھی ہو سکتی ہے؟

۱۔ لغات - نہالی

لوک، لغات، رضائی،
ہیں بظاہر لغات مراد
ہے۔ لغاتوں اور تو شکوں
پر آرائش کی غرض سے
خوش وضع شکلیں بنانے
کا عام دستور تھا، جس
طرح قالینوں پر اب تک
قسم قسم کے نقشے اور
شکلیں بنائی جاتی ہیں۔
بکرو : سردی،
شند ۔

گرم مزاج رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں بھجریں دی بردیالی نے مجھے
نیر و نقد و دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے
کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری و ہم
کر دیا کا مزان اصنام خیالی نے مجھے
ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکانہ رہا
عجب آرام دیا ہے بد و بالی نے مجھے

بیالی : نیل کی جھج، راتیں ۔

شرح : لغات پر جو شکل بنی ہوئی تھی، اسے دیکھتے ہی محبوب

یاد آگیا اور میں نے فراق میں مزاج و فغان شروع کر دی۔ یہ سلسلہ رات بھر
جاری رہا۔ اسی کی بدولت راتوں کی سردی سے مجھے پناہ ملی، یعنی سردی بھ
پر کوئی اثر نہ کر سکی، کیونکہ میں گرم مزاج تھا۔

۲۔ لغات - بشیہ : عام معنی ادھار، مقصود وہ چیز ہے، جو

ابھی ہاتھ نہیں آئی اور آنے کی امید ہے۔ یعنی آخرت کی زندگی، بہشت۔

نقد : وہ چیز، جو میسر ہے، یعنی دنیا اور اس کی زندگی۔

شرح : مجھے دنیا اور عقبی کی حقیقت معلوم ہے۔ میری بلند ہمتی

نے اہل کے حوض پکا گوارہ کیا۔ دونوں کو ٹھکرا دیا اور دونوں سے بے نیازی

مطلب یہ کہ انسان اپنی حقیقت پر خود کرے تو وہ دنیا کی کوئی چیز اسے
بھگا کر دام میں الجھا سکتی ہے اور نہ عقبنی کی کوئی نعمت اس کے لیے تخریب
کا سامان بن سکتی ہے۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ کی رضا کے سوا ہر شے سے
بے پروا رہے گا۔ یہی دعوتِ مرزا غالب کا اصل مقصود ہے۔

۳۔ لغات۔ اصنام : صنم کی جمع، بُت

شرح : وجودِ حقیقی صرف ایک ہے۔ جو لوگ ہزاروں لاکھوں
وجودوں کو کسی نہ کسی شکل میں مانتے ہیں اور وحدت میں کثرتِ آرائی کے
تافل ہیں، وہ حقیقت میں وہم کی پوجا کر رہے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ
ایک وجود کے سوا کسی کو نہ مانا جائے۔ توحید کے معنی میں ہیں۔ آہ! لوگوں
نے وہم کی پرستش میں جو خیالی بُت قائم رکھے ہیں، انہوں نے مجھے ایمان
کے راستے سے ہٹا کر کامرنا دیا ہے۔

جب ایمان توحید پر ہو تو کثرت کو تسلیم کرنا یقیناً توحید کے ثانی ہے
اس لیے اسے ایمان کے بجائے کفر کہنا چاہیے۔

۴۔ شرح : جب تک میرے بال و پر موجود تھے، دل میں پھولوں
کی آرزو تھی، لیکن جب بال و پر کٹ گئے اور میں پرداز کے ہر سامان سے
محروم ہو گیا تو ساتھ ہی پھولوں کی آرزو بھی افسردہ ہو کر رہ گئی، یہاں تک کہ
اس آرزو کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، گویا اس معاملے میں غلبان کی کوئی
صورت باقی نہ رہی۔

ہر مقصد و نصب العین کے محرکات و عوامل ہوتے ہیں، جن کی بدولت
مقصد کے لیے سہی و کوشش کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور آرزو اسی
وقت تک زندہ سمجھی جاتی ہے، جب تک اس کے لیے تحریک کے موجبات
موجود ہوں۔ پھولوں کی آرزو کے لیے بلبل کے سامنے بال و پر واحد محرک
تھے، وہ جب چاہتی، اُڑ کر ان کے پاس پہنچ سکتی تھی۔ جب بال و پر ہی نہ

۔ ہے تو اڑنے اور جدوجہد کرنے کا سوال ہی نہ ہا۔ اس طرح آرزو سے گل افروز ہو
جے جان ہو گئی۔ جب محک کا غم ختم ہو گیا تو کامل آرام نصیب ہوا۔

۱۔ لغات

کارگاہ و بستی میں لالہ داغ ساماں ہے
کارخانہ یعنی دنیا۔
شرح : خود مرزا
غائب نے ان تینوں کی
شرح اپنے شاگرد موسوی
محمد عبدالرزاق شاکر کو لکھی
تھی اور یہی بیان درج کی
جاتی ہے۔

کارگاہ و بستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمین راحتِ غنیمت گرم و دھماں ہے
غنچہ تا شگفتن با برگِ عاقبت معلوم !
با وجود دلجمعی، خواب گل پریشاں ہے
ہم سے رنج بے تابی کس طرح اٹھایا جائے
وابغِ پشتِ دستِ عجزِ شدتِ خس بہ ونداں ہے

”داغ ساماں مثل انجم انجمن، وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان
ہو، موجودیت لائے کی مختصر نمائش داغ پر ہے اور نہ رنگ تو اور
چولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ بھول
درخت یا غلہ جو کچھ لایا جاتا ہے، وہ بھقان کو جوتنے، دوسنے، پانی
دینے میں مشقت کرتی پڑتی ہے اور یا صنت میں لو گرم ہو جاتا ہے
مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجودِ محض رنج و غنا ہے۔ مزارع کا وہ
لو، جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے، وہی لائے کی راحت کے خرمین
کے لیے برق ہے۔ حاصلِ موجودیت داغ، داغ مخالفِ راحت
اور صورتِ رنج۔“

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں لائے کا سرمایہ و سامان داغ ہے، یعنی بستی

باحث ، بخ ہے ۔ وبقای کا جو خون محنت و مشقت میں گرم ہوتا ہے ، وہی کاشت کردہ شے کے انبارِ راحت کے لیے بھل بن جاتا ہے ۔

۲۔ **تشریح :** مرزا فرماتے ہیں ۔

”کلی جب نئی نکلے ، یہ صورتِ قلب صوبہ کی نظر آئے اور جب تک پھول بنے ۔۔۔ برگِ مافیت ”معلوم ۔ یہاں معلوم ہے معنی معلوم ہے اور برگِ مافیت ہے معنی مانے آرام ۔ برگ اور سرو برگ ہے معنی سازد سامان ہے ۔ خواب گل ہے اعتبار خاموشی و درجا ماندگی پریشانی ظاہر ہے ۔ یعنی گنگنل ، وہی پھول کی چنگڑیوں کا کبھرا ہوا ہوتا ۔ خنجر بہ صورتِ دل جمع ہے ۔ باد صفتِ جمعیتِ دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے ۔“

کلی جب تک کھلے ، اُسے آرام کا کوئی لمحہ نصیب نہیں ہو سکتا ۔ اگرچہ نظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسے جمعیتِ دل نصیب ہے ، لیکن حقیقت پر نظر رکھتے جائے تو اس کا خواب یعنی خاموش رہنا خوابِ پریشاں ہے ، کیونکہ وہ کھلے گی اور کھلتے ہی ایک ایک چنگڑی الگ الگ ہو جائے گی ۔

کلی کی حالت میں دلچسپی اور پھول کی حالت میں پریشانی عام مشاہدے کی چیز ہے ۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ بظاہر اس دنیا میں ، جو آزمائش کا مقام ہے کسی بھی وجود کے لیے آرام کے اسباب متیان نہیں ۔

۳۔ **لغات ۔** نیشیت و سرت : اصل میں نیشیت دست برد میں نماندن ہے ، یعنی کسی کی تعظیم کرنا اور اس کے سامنے عجز و انکسار سے پیش آنا ۔
خس بدندانِ گرفتار : دانتوں میں تنکا لیتا ۔ زمانہ قدیم کے ہندوؤں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ جب کوئی گروہ کسی سے مغلوب ہو جاتا تھا تو مغلوب گھاس کا تنکا منہ میں لے کر غالب گروہ کے دوہرہ منہ چاٹتا ۔ مقصود یہ ہوتا تھا کہ مغلوب نے گھاس کی صورت پیدا کر لی ، جو گھاس کھاتی تھی ۔ ہندوؤں کے نزدیک گھاس کو مارنے

سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا۔ اس بنا پر اس گروہ کو 'ہو گائے' کی صورت میں سامنے آتا تھا، معاف کر دیا جاتا تھا۔ یوں جس بندگان گرفتار یا کاد بندگان گرفتار سے مراد عاجزی اور مظلومیت کا اظہار ہوتا۔

شرح : مرزا فرماتے ہیں :

- پشت دست صورت عجز اور خس بندگان و کاد بندگان گرفتار ہیں
اظہار عجز ہے۔ پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر
دکھ دی ہو اور شعلے نے تنکا دانتوں میں لیا ہو، ہم سے رنج و غم
کا تحمل کس طرح ہوتا؟

مطلب یہ کہ جب داغ بیتابی کا رنج برداشت نہ کر سکا اور اس نے عاجزی
سے پشت دست زمین پر دکھ دی۔ اسی طرح شعلے نے تنکا دانتوں میں لے لیا،
گو یا اظہار عجز کر دیا۔ جس رنج کی متحمل ہو سکا اور چیزیں نہ ہو سکیں، اسے ہم
کیونکر اٹھاویں؟

شرح : اے

غالب ! گھر کے در و دیوار

پر سبزہ آگ رہا ہے۔

کیونکہ وہ جلے آباد ہے۔

آگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ ہم وحشت و بیاباں کی خاک چھان
رہے ہیں اور گھر میں فصل بہار طراوت و شادابی کا سماں پیدا کر رہی ہے۔

اس شعر کی خوبیاں خاص توجہ کی محتاج ہیں، مثلاً :

۱۔ گھر کو چھوڑے جوئے عت گزر گئی۔ اس اشار میں کسی نے اس کی دیکھ بھال
نہ کی، یہاں تک کہ وہاں جنگل کا سماں نمودار ہو گیا۔

۲۔ در و دیوار پر سبزہ آگ آتا ہے رونقی اور ویرانی کی علامت ہے۔ شاعر

نے اسے بہار کا سماں بتایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس صحرائی وہ خاک چھانتا رہا، وہاں روئیدگی سرے سے ناپید تھی۔ اور جہاں معمولی سی روئیدگی معلوم ہوتی، اسے حقیقی حالت سے بے پروا ہو کر بہار قرار دے دیا۔

۲۔ ظاہر ہے کہ جب گھر میں ویرانی کمال پر پہنچ گئی تو شاعر کہتا ہے کہ اس حالت میں صحر اگر وہی کی کیا ضرورت باقی رہی؟
۴۔ اس شعر کا طنز کسی تصریح کا محتاج نہیں۔

مولانا طہار اللہ فرماتے ہیں: ”اس شعر میں بیان و بدیع کی کوئی خوبی نہیں، لیکن صاف صاف لفظوں میں حالتِ دیوانگی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ جواب نہیں۔“

شرح آ

یہ حسرتِ برباد رہی
اور اب تک ہے
کہ ہم اس کی سادگی
پر جان دے دیں
اور گلا کاٹ کر مر
جائیں، مصیبت یہ
ہے کہ جب کبھی ہم
نے ایسا ارادہ کیا
اس نے خنجر اٹھا
لیا، یعنی سادگی
عظم ہو گئی اور ہماری
حسرت دل ہی میں
رہی۔ اب خیال تھا

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
میں نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بہ ایں بہر
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
میں بجومِ ناامیدی خاک میں مل جانے گی
یہ جو اک لذت ہماری سہی بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچے؟ واما ندگی سے عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

علوہ قرار آتش دوزخ بسا دل ہی ! کہ یہ نکل جائے گی ۔
 نغمہ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے ؟ اور ان پورا ہونا لگا
 ہے دل شوریدہ غالب طلمسچ و تاب لیکن اس ظلم نے
 رحم کرا اپنی تمنا پر ، کہ کس مشکل میں ہے پھر خنجر سنبھال لیا
 رہ گئے ہیں ۔ ہے اور ہم بے بس

۲۔ **مشریح :** خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

” کسی کے حسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات
 قائل کے منہ سے نکلے ، وہ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے
 کہ اسے خبر ہو ، یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی ۔“

بیشتر حقائق انسان کے دل میں طبعاً پیوست ہوتے ہیں ، لیکن جب تک ان
 کی طرف اشارہ نہ کیا جائے ، اکثر کو ان کا شعور و احساس نہیں ہوتا ۔ جب اشارہ
 کر دیا جائے تو یہ خیال نہیں ہوتا کہ کوئی نئی بات سننے میں آئی ۔ یہی سمجھا جاتا
 ہے کہ جو بات پہلے سے دل میں موجود تھی ، وہ تازہ کر دی گئی ۔ تقریر کی سب
 سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انسان کے دل کی باتیں تازہ ہو جائیں ۔ ایسی ہی تقریر
 دل پذیر و پُر تاثیر ہوتی ہے ۔ اسی حقیقت کی طرف مرزا غالب نے اشارہ کیا ہے
 مرزا کی دقیقہ سنجی کا کمال ملاحظہ ہو کہ یہ نہیں کہا ، وہ بات پہلے سے دل
 میں موجود تھی ، یہ کہا ، میں نے جانا ، گویا یہ بھی میرے دل میں تھی ۔

۳۔ **مشریح :** اگرچہ محبوب کی محفل میں میرا ذکر انتہائی برائی سے ہو
 رہا ہے ، لیکن یہ ذکر مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں پہنچ گیا ہے ، آہ ! میں
 نہیں پہنچ سکتا ۔

عاشق کو محبوب برائی سے بھی یاد کرے یا محفل نشینوں کی بدگوئی گوارا
 کرے اور ذکرِ درد کے تو عاشق کے لیے یہ بھی ایک دل پسند شے ہے اور

مرزا غالب کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ دشمن بھی بہر حال تعلق ہی کا ثبوت ہے ۔
وہ نفسِ ذکر پر خوش ہے ، اس کے لیے اچھے بُرے کا سوال پہلے نہیں ، بعد
میں آتا ہے ۔

۴۔ شرح : اسے نا امیدی کے بے پناہ سیل ! ذرا ختم جا ۔ امید
کا جو براے نام تیرے لگا ہوا ہے ، وہ بھی کٹ نہ جائے ۔ اُسی کی بنا پر ہم رات
دن سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں ۔ اگرچہ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا ،
لیکن ہماری دل لگی کا ایک ذریعہ مزدور ہے ۔ اگر یہ سہارا بھی باقی نہ رہا اور
امید کے پورے غانے پر اندھیرا چھا گیا تو اس کوشش میں دل لگی اور دلچسپی
کا جو سامان ہے ، وہ بھی ختم ہو جائے گا ۔

انسان حصولِ مقصد کے لیے جو کوششیں کرتا ہے ، وہ امید پر مبنی
ہوتی ہیں ، اگرچہ اس کی حیثیت کچھ ہی ہو ۔ کوششیں کامیاب نہ ہوں تو
جب تک امید کا تھوڑا بہت سہارا باقی ہے ، وہ جاری رہیں گی اور ان میں مصروفیت
کے باعث انسان اک گودِ لذتِ محسوس کرے گا ۔ اگر ناامیدی ایک طوفان کی طرح
ہجوم کر کے آہانے تو ظاہر ہے کہ رہا سہا سہارا بھی ختم ہو جائے گا اور نتیجہ کامل
بالوسی ، نیز سعی و کوشش کے تھقل کے سوا کچھ نہ ہوگا ۔

۵۔ شرح : ہم چلنے کی زحمت کیوں برداشت کریں ۔ داناگی اور
بیچارگی کو ہمارے قدموں سے اس درجہ عشق ہو گیا ہے کہ جو بھی قدم رکھتے
ہیں ، وہ اٹھ نہیں سکتا ۔

مطلب یہ کہ ہمارے لیے داناگی کے باعث چلنا غیر ممکن ہے ۔
مولانا طاباٹبائی فرماتے ہیں کہ ”منزل کے ساتھ“ میں ”استعمال ہو تو اس
سے مراد“ ماستہ“ ہوتا ہے ”پر“ استعمال ہو تو منزل مقصود سمجھنا چاہیے ۔

۶۔ شرح : محبوب عاشق سے کتنا ہے کہ تمہارا دل تو جہنم کی آگ
بھڑکنے کا جلوہ دکھا رہا ہے ۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ،

بھاسی، لیکن یہ بھی تو بتائیے کہ شور قیامت کے فتنے سے کس کی سرشت
لبریز ہے ؟

ظاہر ہے کہ عاشق کے دل میں ہمیشہ عشق کی آگ مشتعل رہتی ہے اور
آتش دوزخ سے اس کی مناسبت متنازعہ نہیں، مگر محبوب بھی تو اپنے
ناز و اغا ز اور عشوہ و ادا کی بدولت قیامت کے فتنے سے کم نہیں ہوتے۔

۷۔ **شرح :** غالب کا دل دیوانہ بیچ و تاب کا ایک طلسم ہے جس
میں ہر لحظہ بیتیابی و ہفتیاری موجزن رہتی ہے۔ اسے محبوب ! اسی دل میں تیری
تمنا اور آرزو جاگزیں ہے۔

مجھ پر نہ سہی، اپنی تمنا پر تو رحم کر اور دیکھ کہ کن مشکلات میں پڑی ہوئی
ہے ؟ تو ہی اسے ان مشکلات سے ٹھہرا سکتا ہے۔

شاعروں نے حسن طلب کے عجیب و غریب پہلو پیدا کیے ہیں، ان میں سے
ایک غالب کا یہ شعر بھی ہے۔ اتیر مٹائی نے کہا ہے۔

دل آپ کا کہ دل میں جو کچھ ہے، سب آپ کا
دل ایسی، مگر میرے ارماں نکال کے

۱۔ **شرح :** دل اور

جگر دونوں تیرے تیرے نگاہ سے
زخمی ہونے کے آئندہ مند
تھے، چنانچہ وہ تیرے دل کو چیرتا
ہوا جگر میں اتر گیا۔ اس ادا
سے دونوں خوش ہو گئے۔
دونوں کی آرزو پوری ہو گئی
اور حسرت باقی نہ رہی۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذت فراغ
تکلیف پر وہ داری زخم جگر گئی !
وہ بادۂ شہانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیں بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

۲۔ لغات :

شق ہونا : پھٹ جانا

فراخ : بے ٹکری

مزاغت ۔

شرح : خدا کا

شکر ہے کہ میرا سینہ پھٹ

گیا اور اس کا بند بند ٹھکل

گیا۔ پیشتر جگر کے زخم کو

پوشیدہ رکھنے میں زحمت ،

اشافی پڑتی تھی ، اب اس

زحمت کی کوئی ضرورت نہ

رہی ، بڑا ہی اچھا ہوا کہ

بے ٹکری کی لذت میسر آگئی۔

زخم جگر کی پر پردہ دیا

اسی وقت تک کار آمد بھی

جاسکتی تھی کہ سینہ محفوظ رہتا

جب سینہ پھٹ جانے سے

خود جگر منظر عام پر آگیا ، تو

پردہ داری کی کیا گنجائش باقی رہی ؟

اڑتی پھرے بے خاک مری کو سے یار میں

بارے اب اسے ہوا ! ہوس بال و پڑ گئی

دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقش پا

موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

مہر بواہوس نے شبن پرستی شعار کی

اب آبرو سے شیوہ اہل نظر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا

مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فرداودی کا تفسرۂ یک بار مٹ گیا

کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تھیں

وہ دلوے کہاں ؟ وہ جوانی کدھر گئی ؟

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چھوٹی مصیبت میں ضبط و تحمل کا اہتمام

کرنا پڑتا ہے۔ جب اس سے بڑی مصیبت پیش آجائے۔ تو پیشتر کا ضبط و تحمل

بالکل بے سود رہ جاتا ہے اور بڑی مصیبت میں چھوٹی مصیبت کی الحقیقت

یاد بھی نہیں رہتی ۔

۳۔ لغات - بادۂ شبانہ : رات کے وقت شراب پینا۔

شرح : اس شعر میں دراصل عیش و نشاط کی ایک خاص کیفیت پیش کی گئی ہے۔ دندوں کا عام دستور یہ تھا کہ رات رات بھر محفل مہاکر شراب پیتے رہتے، راگ رنگ ہوتے رہتے، صبح کو سو جاتے اور نیند کے مزے لیتے۔

میرزا کہتے ہیں، رات کو شراب پینے کی ہمتیاں اب کہاں ہ وہ تو ختم ہو گئیں۔ جب وہی نہ رہیں تو خواب سحر کی لذت بھی رخصت ہو گئی، کیونکہ وہ لذت تو رات بھر شراب پی کر سیاہ مست ہو جانے پر موقوف تھی۔

مولانا لطیف باقی فرماتے ہیں کہ شعر کے الفاظ معنی حقیقی پر محمول کریں تو کچھ لطیف نہیں، چنانچہ ان کے نزدیک میرزا کو استدعا یہ مقصود ہے۔ یعنی بادۂ شبانہ سے نشہ شباب اور سحر سے پیری کا استدعا اور اٹھیے کا خطاب نفس غافل کی طرف ہے۔

بظاہر مولانا رندانہ مشغلوں کا بھیک اندازہ نہ فرما سکے۔ اٹھیے کے خطاب سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ بادۂ شبانہ کی سرمیتوں سے خواب سحر کی لذت اٹھانے والا کوئی ثواب یا نہیں ہے، جو ایسی سرمیتوں میں انہماک کا عادی چلا آتا ہے۔ تاہم اگر مولانا کے فرمائے ہوئے استعارے سے پیش نظر رکھتے ہائیں۔ تو مقصود یہ ہو گا کہ شباب کی منزل گزر گئی اور بڑھاپا آ گیا۔ اب خواب سحر میں وہ لذت باقی نہ رہی، کیونکہ وہ تو شراب نوشی کی فراوانی پر موقوف تھی جو شراب کے ساتھ ہی ختم ہو گئی، لہذا اب کچھ عبادت کر لینی چاہیے۔

۴۔ شرح : میری خاک محبوب کے کوچے میں اڑتی پھرتی ہے۔ یہی میرا مقصود تھا، یہی آرزو تھی۔ اے ہوا! اب مجھے بال و پر کی کیا ضرورت رہ گئی؟ وہ بھی تو اسی لیے درکار تھی کہ میں کو پڑے محبوب کی فضا میں اڑ سکوں۔ جب میری خاک کو یہ شرف حاصل ہو چکا ہے تو اب بال و پر سے بے نیازی تیسر آ گئی۔

مولانا غلام غلامی فرماتے ہیں کہ ہوا سے خطاب بظاہر بے مزہ ہے لیکن ہوس کی مناسبت سے مصنف نے صبا کو چھوڑ کر ہوا کو باندھا میرے نزدیک لفظ ہوا محض ہوس کی رعایت ہی سے اختیار نہ کیا گیا، خاک کو اڑانے کے لیے صبا سے کہیں زیادہ ہوا کی ضرورت تھی۔ صبا خوشبو لے جا سکتی ہے خاک نہیں اڑا سکتی۔

۵۔ لغات۔ گل کترنا : کاغذ وغیرہ کے پھول بنانا، گلکاری کرنا عیب و غریب اور اچھے کا کام انجام دینا۔ کسی کا کوئی ایسی بات کرنا، جس سے فساد برپا ہو اور وہ الگ رہے۔

شرح : محبوب چلتا ہے تو زمین پر پاؤں رکھنے کے رنگ ڈھنگ صمد جہ و لغزب اور قابل دید ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خرام محبوب کی لہر گل کرتی ہوئی جا رہی ہے۔

گل کترنے سے یہ مفہوم بھی ثابت ہے کہ محبوب چل نہیں رہا، بلکہ گلکاریاں کر رہا ہے۔ یہ مفہوم بھی واضح ہے کہ اس چال سے عشاق میں ایک ہنگامہ فساد برپا ہو رہا ہے اور خود محبوب کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لغات۔ بوالہوس : ہوس پرست، جھوٹا عاشق۔

اہل نظر : معنویت پر نظر رکھنے والے سچے عاشق۔

شرح : زمانے کے طور طریقے بدل گئے۔ ہر ہوس پرست اور جھوٹے عاشق نے حسن پرستی کو اپنا مشغلہ بنا لیا ہے۔ گویا یہ رسم عام ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب سچے عاشقوں کے طور طریقے کی عزت و آبرو جاتی رہی۔

شرع کی آفاقیت متنازع تشریح نہیں۔ زندگی کے ہر دائرے میں اس کا یکساں اطلاق ہو سکتا ہے۔ جب سچے جھوٹے میں امتیاز کا کوئی نشان خاص باقی رہے تو پتوں کی آبرو کیا باقی رہ سکتی ہے؟

۷۔ شرح : محبوب کا نظارہ بھانے خود ایک نقاب کی صورت اختیار

کر گیا، کیونکہ چونکہ اس کے رنج اور پریشی وہ مست اور از خود رفتہ ہو کر
ہر طرف بکھر گئی۔ ہر نگاہ کی حیثیت ایک تار کی تھی۔ بہت سے تاروں نے
اس کے چہرے پر بکھر بکھر کر ایک پردہ تیار کر دیا۔ یعنی نظارہ نباتات خود جس
سے نعت اندوز ہونے کے بہانے محرومی کا باعث بن گیا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ مصنف نے بہتر کا لفظ بیاں پورا نقاب
بنانے کے لیے صرف کیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے، تیرا رخ دیکھ کر ایسی
از خود رنگی ہوئی کہ سب دیدار سے محروم رہے۔

۸۔ لغات - فردا : آئندہ کل۔

دی : گزشتہ کل۔

شرح : خواجہ عالی فرماتے ہیں :

”تمہارے جاتے ہی بہ سبب خود رنگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو
گئی کہ آج اور کل کی مطلق تیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کی
نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدلی بہ زمانہ حال
ہو جائیں گے۔ پس تم کیا گئے، گو یا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت
گزر جانے کے دونوں معنی ہیں، ہنایت سختی کا زمانہ گزرتا اور
خود قیامت کا آجانا۔“

خطاب محبوب سے ہے۔ فرماتے ہیں، کل تم ہمارے پاس سے رخصت ہوئے
حشر ٹوٹ پڑا۔ آئندہ کل اور گزشتہ کل میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ اس سے
بڑھ کر قیامت کا نشان کیا ہوگا ؟ یوں گزشتہ کل فرماے قیامت بن گئی۔

۹۔ شرح : اے اسدا اللہ خاں ! تجھیں زمانے نے تباہ کر ڈالا۔ وہ

جوانی جس پر تم نازاں تھے، کہاں گئی ! وہ بنگار خیز دلو لے کیا ہوئے ؟ مطلب
یہ کہ جوانی کے ساتھ دلو لے بھی گئے اور پہری آ گئی۔ یہ انحطاط زمانے کے
باعث رونما ہوا۔

میرزا کا پورا نام اسدا اللہ خاں تھا۔ ابتدا میں اسدا تخلص کرتے تھے۔ مولانا طباطبائی نے فرمایا ہے کہ تخلص کے ساتھ پورا نام آجانے سے خوبی پیدا ہوتی۔ اور خان سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ کسی زمانے میں قوت و سطوت کے مالک تھے۔ جسے پیری نے مٹا دیا۔ یعنی عظمت رفتہ کی یاد بجا ہے، بجا نہیں۔

۱۔ شرح :

مگر نظر کے لیے لذت
ہاں سامان فراہم ہو جانے
تو ہم دل کی تسکین کا
غم کیوں کریں بہشت
کی حوری کتنی ہی پاکیزہ
کیوں نہ ہوں، لیکن
اے محبوب! ان میں
تیری صورت ملنی چاہیے
کیوں؟ اس لیے کہ
نہ تیری صورت کے سوا
نظر کسی حالت میں حقیقی
لذت پا سکتی ہے اور
مدول کی تسکین کا سامان
فراہم ہو سکتا ہے۔

مشرقی مرزا غالب
فے بہشت کے مطلق پنا
نقطہ نگاہ پوری طرح

تسکین کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے
خورانِ خلد میں تری صورت، مگر، ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دمن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر بلے
ساقی گری کی شرم کرو آج، اور نہ ہم
ہر شب پایا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم!
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غم پہناں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچہ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتمہر ملے

واضح کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ بہشت میں حمدیں ملیں گی، لیکن ہم ان میں اپنا ذوق نظر کہاں پا سکتے ہیں اور ہمیں تسکین کیونکر ہو سکتی ہے؟ اے محبوب حقیقی! دلوں تیرا جلوہ تیسرا آنا چاہیے۔ وہی ذوق نظر کا سراپہ اور وہی تسکین خاطر کا دوا دہر لیر ہے۔

۲۔ شرح : اے محبوب! تو میرے قتل کے بعد مجھے اپنے کوچے میں دفن نہ کر، کیونکہ لوگ میری قبر کا نشان پا کر تیرے گھر کے دروازے پر پہنچنے لگیں گے اور میرا مجذبہ رشک اس کا روادار نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ عاشق کو اپنی عظمت و شہرت کا پورا یقین ہے۔ وہ دفن ہو گا تو لوگوں کو عظمت و شہرت کی بنا پر قبر تک آنے کا بہانہ ملتا رہے گا۔ اس طرح انھیں تیرے گھر کا نشان مل جائے گا۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ لوگوں میں مشہور ہو جائے گا، دیکھو فلاں نے فلاں کو قتل کر دیا اور اپنے کوچے ہی میں اس کی قبر بنا دی۔ اس طرح قتل کا بھید کٹل جائے گا اور ممکن ہے، لوگ تجھ سے مواخذے کا سوال اٹھائیں۔

۳۔ شرح : آج تم نے ساقی کا منصب اختیار کر لیا اور شراب پلا رہے ہو۔ خدا کے لیے اپنے اس منصب ہی کا پاس و لحاظ کرو اور جتنی پلا سکتے ہو، پلا دو، اور نہ بہرات ہمیں جتنی ملتی ہے، اپنی لیتے ہیں اور مسطحن ہیں تمہاری ساقی گرمی کے لیے تو تھوڑی پلانا کچھ باعث عزت نہیں۔

۴۔ شرح : خود مرزا غالب اس شعر کا مضمون قاضی عبدالجلیل جنوں کو کہتے ہوئے یوں واضح کرتے ہیں۔

”یہ مضمون کچھ آغا نہ چاہتا ہے۔ یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوتی، مگر کھٹکا یہ ہے کہ قاصد کہیں محبوب پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کا، ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی و مندار اور معتد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ

یہ ایسی حرکت ذکر سے گا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قفا
را عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد معشوق کو دیکھ کر والدہ شریفہ
ہو گیا۔ کیا خط، کیا جواب؟ دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ جنگل
کو چل دیا۔ اب عاشق اس وقوعے کے بعد ندیم سے کہتا ہے
کہ غیب دان تو خدا ہے، کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر؟
اے ندیم! تجھ سے تو کچھ کلام نہیں۔ لیکن اگر نامہ بر کہیں مل
جائے تو اس کو میرا سلام کہو کہ کیوں صاحب! تم کیا کیا دھوے
عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا؟

”کہو سلام“ دراصل ایک نہایت لطیف تشریف ہے۔

۵۔ شرح : اگر ہمیں چھپے ہوئے غم کی کھینچ تان سے نجات مل

جائے تو اسے محبوب! ہم تمہیں بھی بتا دیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا۔

”چھپے ہوئے غم سے مراد بظاہر یہ ہے کہ اگر مجنوں کی طرح کپڑے پھاڑ
کر صحرا میں نکل جائیں تو راز عاشق فاش ہو جائے اور اس میں محبوب کی رسوائی
کا احتمال ہے۔ ہمارے لیے وہ سب کچھ کر دکھاتا بہت سہل ہے جو مجنوں
نے کیا تھا، لیکن گوناگوں مصیبتیں ہمارے راستے میں حائل ہو رہی ہیں۔

۶۔ شرح : حضرت خضرؑ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زندہ ہیں اور

بھوے بچکے مسازوں کی رہنمائی فرماتے ہیں کم از کم یہ ادنیٰ مسلمات میں سے
مزدور ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہمارے لیے حضرت خضرؑ کی پیروی لازم نہیں
البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ راہ سلوک میں ہمیں ایک بزرگ مل گئے، جو ہمارے
ہم سفر تھے اور ان کا نام خضرؑ تھا۔

مطلب یہ کہ سلوک میں ہمارا مرتبہ خضرؑ سے کچھ کم نہیں کہ انہیں رہنما

مان لینا ہمارے لیے لازم ہو۔

۷۔ شرح : اے محبوب کے کوچے میں بسنے والو! اگر کہیں تمہیں

غالب دیوانہ مل جاتے تو دیکھنا اس کا کیا حال ہے، فدا اس کا خیال رکھنا۔

کوئی دن گر زندگی گانی اُور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اُور ہے
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ عنہا سے نہانی اُور ہے
بار بار دیکھی ہیں ان کی رنجشیں پر کچھ اب کے سرگرائی اُور ہے
وے کے خط منہ دیکھتا ہے لمبر کچھ تو پیغامِ زبانی اُور ہے
قابعِ اعمار ہیں اکثر بخوم وہ بلائے آسمانی اُور ہے
ہو چکیں غالب! بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اُور ہے

۱۔ شرح : قاسمی عبد الجلیل جنون نے اس شعر کی شرح خود مرزا

غالب سے پوچھی تھی۔ جواب میں فرماتے ہیں :

”اس میں کوئی اشکال نہیں، جو لفظ ہیں، وہی معنی ہیں۔ شاعر
اپنا نقد کیوں بتانے کہ میں کیا کروں گا؟ بہم کہتا ہے، کچھ کروں گا
خدا جانے شہر میں یا قراج شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر میٹھ رہے
یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے۔“

مولانا طہطاہی فرماتے ہیں :- ہندش کی خوبی اور محاورے کے لطفت
نے اس شعر کو سنبھال دیا، ورنہ غالب سا شخص اس بات سے بے خبر نہیں
ہے کہ جی کی بات جی میں رکھنا المعنی فی بطن الشاعر کہلاتا ہے۔ اس شعر
سے یہ سبق لینا چاہیے کہ ہندش کے حسن اور زبان کے مزے کے آگے اساتذہ
صنعت معنی کو بھن گوارا کر لیتے ہیں۔“

میرے اندازے کے مطابق مولانا نے کسی قدر زیادتی فرمائی کسی امر کو
شعر میں قدرے مبہم رکھنے کا مطلب لازماً المعنی فی بطن الشاعر نہیں۔ بعض
مقامات پر ابہام خواندے کے لیے بدرجہا زیادہ لطف کا باعث ہوتا ہے
کیونکہ ہر فرد اپنے خاص حالات کے اعتبار سے شعر کو خاص معنی پر ڈھال لیتا
ہے۔ اس طرح ایک شعر مختلف حالتوں پر حاوی ہو جانے سے زیادہ ہمواری
و آفاقیت پیدا کر لیتا ہے، جیسا کہ میرزا نے خود فرمایا۔ شاعر نے اس وجہ
سے اپنا قصد معین نہیں کیا کہ وہ چاہے فقیر بن جائے، چاہے پرو میں چلا جائے
چاہے کچھ اور کر گزرے۔

جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے فوری اقدام نہ کرنے کا طریقہ
پہلے مصرع میں موجود ہے۔ فرمانے ہیں کہ اگر زندگی کے کچھ دن باقی ہیں تو
ہم نے ہی میں کچھ اور شان رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں شاعرین نے مختلف
احتمالات پیدا کیے، مثلاً مرجانیں گے، کسی اور سے محبت کر لیں گے یا محبت
سے دست بردار ہو جائیں گے، تبین مرزا نے ان احتمالات کی طرف خفیف
ساجھی اشارہ نہیں کیا، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی آداب محبت کے شایاں نہیں
۲۔ شرح : دوزخ کی آگ میں اس قدر گری کہاں ہو سکتی ہے؟ چپے
ہوئے غم کی جان بالکل جدا گانہ حیثیت رکھتی ہیں، یعنی دوزخ کی آگ
اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کہاں "استفہام انکار می ہے، گویا سوال کیا،
مگر مقصود نفی ہے۔

۳۔ لغات - سرگرائی : سر کا بھاری ہونا، مراد ہے رنج و غم۔

شرح : ہم ان کی رنجشیں بار بار دیکھ چکے ہیں اور معاملات عشق

میں محبوب کی رنجشوں سے سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے، مگر اس مرتبہ ان کی غفلت
کا درجہ زیادہ بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔

حقیقت زیادہ غفلت ہے یا نہیں، لیکن عاشق کو فوراً محبت میں اتھکا؟

بے اعتنائی پر بھی اس قسم کے دہم پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

۴۔ شرح : میں نے محبوب کو ایک خط نامہ بر کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس نے جواب لا کر دے دیا، لیکن میرا منہ ٹک رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زبانی بھی کوئی پیغام دیا ہے۔

”ہم نے اپنے ہی میں ٹھانی اور ہے“ کی طرح یہاں بھی مرزا نے زبانی پیغام کو مقتدر یا مبہم چھوڑ دیا، کیونکہ اسے معلوم کر لینے کے قوی قرینے شعر میں موجود ہیں۔ مثلاً وہ ایسا پیغام ہے، جو معرعنہ تحریر میں لامتناہی سبب سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ نامہ بر کو بھی ڈانٹا گیا ہو گا اور خط بھیجنے والے کی بھی خوب خبر لی گئی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ نامہ بر اسے دہرانے میں تاثری کر رہا ہے۔

۵۔ لغات۔ قاطع : قطع کرنے والا، کاٹنے والا۔

اعمار : عمر کی جمع۔

شرح : اکثر ستارے عمروں کا رشتہ کاٹ دینے والے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ زمانہ ستاروں کی گردش کا تام ہے اور زمانے ہی گزرنے سے عمروں کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے۔ اس طرح ستارے قاطع اعمار بن گئے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے، لیکن وہ بلائے آسانی (محبوب) ان سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ ستاروں کی گردش کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ عمروں کے دن ختم ہو رہے ہیں آخر اسی طرح سب مرجائیں گے۔ مگر میرے محبوب نے ظلم و ستم سے زندگی بالکل ناقابل برداشت اور موت سے بدتر بنا رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ستاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بیدا گر ہے۔

۶۔ شرح : اے غالب! ہمارے لیے جتنی باتیں اور مصیبتیں تضاد و

کی طرف سے متقدّم تھیں، وہ پوری ہو چکیں، بظاہر اب کوئی باقی نہیں، البتہ موت باقی ہے، جو بہر حال ناگہان اور اچانک آئے گی کیونکہ وہ کبھی کسی کو بتا کر نہیں آتی۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
 موت کا ایک دن متین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
 آگے آتی تھی حالِ دل پہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
 جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی
 ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپٹیں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
 کیوں نہ چھوڑ کر یاد کرتے ہیں میری آواز گر نہیں آتی
 داغِ دل گر نظر نہیں آتا بوجھی اُسے چارہ گر نہیں آتی
 ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
 مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
 کبھے کبھ منہ سے جاؤ گے غالبؔ شرمِ تم کو مگر نہیں آتی

۱۔ لغات - بر آنا : پورا ہونا۔

شرح : میری کوئی اُمید پوری نہیں ہوتی اور کسی کے پورا ہونے کی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ یعنی مایوسی اور نا اُمیدی کی آخری منزل ہے۔ نہ کوئی آرزو بر آتی ہے، نہ کوئی تدبیر بن پڑتی ہے، نہ کوئی ایسی صورت پیش نظر ہے کہ کبھی کوئی مدعا پورا ہو جائے گا۔

۲۔ **شرح :** موت کا دن اور وقت مقرر ہے، اس میں رد و بدل اور پس و پیش ممکن نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ رات خدائے سونے کے لیے بنائی ہے ۱

و جعلنا ذو مکرم سبانا

پھر کیا وجہ ہے کدات بھر غید نہیں آتی اور ذرا دیر کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپکتی ؟ کیا غید بھی موت بن گئی ہے کہ معین وقت ہی پر آئے گی ؟

۳۔ شرح : پہلے یہ صورت تھی کہ دل کا حال دیکھ کر سبھی آجاتی تھی۔ یعنی یہ کس طرح سکون و اطمینان سے بیٹھا ہو عشق کے چکروں میں پڑا اور کس نوبت کو پہنچ گیا۔ اب افسردگی و پژمردگی کا یہ عالم ہے کہ سبھی بالکل ناپید ہو گئی۔ کسی بات پر شگفتگی کا احساس ہی باقی نہ رہا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

یہ وہ شعر ہے کہ میر کو بھی جس پر رشک کرنا چاہیے۔ افسردگی خاطر کو کس عنوان سے بیان کر دیا اور کیا خوب شرح کی۔

۴۔ لغات - طاعت و عبادت

شرح : میں عبادت اور پرہیزگاری کے ثواب سے واقف ہوں، لیکن کیا کروں، میری طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوتی۔

مطلب یہ کہ بندگی اور پرہیزگاری کا ثواب جان لینا کافی نہیں، جب تک خدا کی رحمت سے دل میں ان کے مطابق عمل کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

۵۔ شرح : اس شعر کے پہلے مصرع میں پھر ابہام ہے۔ کہتے ہیں

کوئی ایسی ہی بات پیش آگئی ہے کہ میں چپ بیٹھا ہوں اور لب بند کر رکھے ہیں وہ نہ کیا یہ سمجھتے ہو کہ میں بات کر نہیں سکتا ؟

پہلے مصرع میں چپ رہنے کی غنیمت مصلحتیں ہو سکتی ہیں اور ہر خواندہ اسے اپنی حالت پر ڈھال سکتا ہے، مثلاً :

۱۔ میرے چپ رہنے میں خاص مصلحت ہے، جو ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔

۲۔ مجھے یہ خوف دامنگیر ہے کہ کچھ کہوں گا تو رازِ عشق فاش ہو جائے گا

اور میرے محبوب کی رسوائی ہو گی۔

۲۔ دل شکوہوں سے لبریز ہے، مٹ کھٹے گا تو زبان پر شکایتیں آئیں گی اور ممکن ہے، شکایتوں پر محبوب عفا ہو جائے۔

۴۔ اگر شکایتیں بھی کیں تو ان سے محبوب کے دل پر کیا اثر ہوگا، لہذا پاس وضع کا تقاضا یہی ہے کہ چپ رہے۔

۵۔ ممکن ہے، میرے گھٹے شکوے غیروں کے لیے خوشی کا سامان بن جائیں اور مجھے یہ منظور نہیں۔

غرض مختلف وجوہ ہو سکتے ہیں۔ مردانے اسے مبہم چھوڑ دیا اور شعر پڑھنے والے کے تخیل کے لیے پرواز کی گنجائش قائم رکھتی۔

۶۔ شرح : میں نالرد مزید کیوں نہ کروں ؟ اگر نکتا اور چپ ہوتا ہوں تو محبوب کتا ہے، کیا سبب ہے، اس کی آواز کان میں نہیں آتی کیا وہ مر گیا یا وہیں چھوڑ کر پردہ میں چلا گیا ؟ میری مزید اسے جہلی معلوم ہوتی ہے لہذا میں برابر چپ رہتا ہوں۔

۷۔ شرح : چارہ گر کے عقل و فہم پر حیران ہیں، مڑاتے ہیں، کہ میں نے مانا، تجھے دل کا داغ نظر نہیں آیا، لیکن اس کی بُو تو سونگھی جاسکتی ہے۔ داغ کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ گوشت جلے اور اس کی بُو آ جائے۔ اندیشہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر داغ اتنا نایاں نہیں، جسے بیک نظر دیکھا جا سکے تو کم از کم اس کی بُو سے تو چٹا لگا جاسکتا ہے، لیکن یہ چارہ گر کیسا ہے ؟ ذرا غ دیکھ سکتا ہے ذبُو سونگھ سکتا ہے۔

۸۔ شرح : ہم عشق میں از خود رفتگی کے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمیں اپنے حال کی بھی کچھ خبر نہیں ملتی۔

یقیناً بخود ہی میں ایک مقام ایسا بھی آ جاتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھی بالکل سمجھ نہ لے۔ اس کا تجربہ ان لوگوں کو بار بار ہوا ہوگا، جو معاملات پر گہرے غور و فکر کے عادی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کچھ ٹھنچتا ہوا

باہر نکل جاتا ہے اور خاصاً خاصہ اس عالم میں طے کر جاتا ہے کہ اسے اپنی ذات یا گرد و پیش کا کچھ بھی خیال نہیں رہتا۔ ایسی ہی بخودی مرزا پر ظاری ہوئی جس میں وہ اپنے آپ کو کاملاً فراموش کر بیٹھے۔

۹۔ شرح : پہلا ”مرزا“ مجاز ہے یعنی مرنے کا انتہائی شوق ہے ، دوسرا ”مرزا“ حقیقت ہے ، یعنی موت کی آرزو انتہائی حد پر پہنچی ہوئی ہے عشق میں ہمارا جو حال ہو چکا ہے ، اس کے پیش نظر ایک لمحے کے لیے بھی جینا گوارا نہیں ، لیکن مصیبت یہ ہے کہ موت کے شوق میں مرے جانے کے باوجود موت نہیں آتی۔ اس وجہ سے سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایسی زندگی کو نہ زندگی کہہ سکتے ہیں ، نہ اپنے شوق کے مطابق مر سکتے ہیں۔

۱۰۔ شرح : اے غالب ! تم نے ساری عمر برائیوں اور گناہوں میں گزاری ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی تم سے کوئی نیکی نہ ہوئی۔ اب کہجے جانے کے آرزو مند ہو ، لیکن وہاں کیا ٹنڈے کر جاؤ گے ؟ کیا تمہیں اس حالت پر شرم نہیں آتی ؟

غالباً ^{۱۱} یا ^{۱۲} ^{۱۳} میں بہادر شاہ ظفر نے سچ کا ارادہ کیا تھا اور اسی سلسلے میں میرزا غالب نے یہ آرزو ظاہر کی تھی :

غالب ! اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے جائیں
سچ کا ثواب نذر کروں گا حصہ کی

ویسے بھی انہیں حرمین شریفین اور نجف اشرف جانے کی بڑی آرزو تھی۔ وہ خود کھنڈ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر

حرم سیرِ رغبت و طوفِ حرم ہے ہم کو

ساتھ ہی اس خیال نے پریشان کیا کہ پوری زندگی گناہوں کی گز اس نے کئے بعد خاندان میں جاتے ہوئے یقیناً شرم آئے گی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم میں مشتاق اور وہ بیزار یا الٹی یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ دعا کیا ہے؟
جب کہ تجھ پر نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ دادا کیا ہے؟
ٹھکن دلفِ عنبریں کیوں ہیں؟ نگو چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر، تبرا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا، دعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب! مُفتِ ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

۱۔ شرح : پہلے مصرع میں سوال کا دعا استفسار نہیں، بلکہ اگلا

علامت ہے، یعنی اے دل! جو سوچ بچھ سے بالکل ماری ہو چکا ہے، تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ عشق کے جس درد میں تو مبتلا ہے، بتا اس کی کوئی دوا بھی ہو سکتی ہے؟ عشق تو ہمیشہ سے لا دوا مانا گیا ہے۔

اس استفہام سے مختلف پہلو پیدا کرنا شعر کو بے معنی بنا دینے کے مترادف ہے۔ مثلاً یہ مفہوم پیش کرنا کہ تجھے ہوا ہی کیا ہے، جس کا علاج کیا جائے؟

یا یہ کہنا کہ اسے دل ! تو مرمن کو چھپا کیوں رہا ہے ؟ صاف صاف بتا دے کہ میں تیرے علاج کا انتظام کروں۔

۲۔ شرح : خواجہ عالی فرماتے ہیں :
 - گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا اور معشوق و عاشق
 میں جو تازہ و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں ، ان سے ناواقف ہے ،
 اس لیے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے (محبوب کے) بیزار
 ہونے پر تعجب کرتا ہے ۔

مولانا مہلبائی فرماتے ہیں کہ مرزا نے دوسرا مصرع جس محاورے میں
 کہا ہے ، جو شخص اس کے محل استعمال کو نہ جانتا ہوگا ، اس کی نظر میں شعر
 حسرت اور مصرعے بے ربط ہوں گے۔

- محل استعمال اس کا یہ ہے کہ جب کسی کے پھیکے غمزوں پر
 استہزاء یا تشبیہ یا اظہار نفرت مقصود ہوتا ہے ، جب اس طرح
 کہتے ہیں اور اس مناسبت سے مصنف نے مصرع لگایا اور
 معشوق پر استہزاء کیا ہے ۔

بظاہر صحیح معلوم وہی ہے ، جو خواجہ عالی نے پیش کیا۔ یعنی ابتداء عشق
 ہے اور ابھی یہ معلوم نہیں کہ محبوب عموماً اظہار نیاز پر از روئے نازیبا طریقہ
 اختیار کر لیتے ہیں ، جس سے عاشق بیزاری کا اثر قبول کرے۔ کبھی معمولی
 بات پر روٹ جاتے ہیں۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ بانجھیں اور پرکھیں ، عاشق کے
 دل میں کتنی لگن ہے ، لہذا نا تجربہ کاری کے باعث عاشق کو تعجب ہوتا
 ہے کہ ہم تو محبوب پر جان دیتے ہیں اور ہمارے شوق کی حدود نہایت ہی
 نہیں ، لیکن محبوب کی روش ایسی ہے ، جیسے ہم سے بالکل بیزار ہو۔ خدا
 جانے ، یہ کیا معاملہ ہے ! اس پر اظہار استعجاب کیا ہے ۔

۳۔ شرح : ”بھی“ سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب غیروں سے حال

پوچھ رہا ہے اور مرزا کی طرف متوجہ نہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں بے زبان نہیں کہ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے۔ عزیزوں کی طرح میرے بھی منہ میں زبان ہے۔ میرا دل بھی تمناؤں اور ارادوں سے لبریز ہے۔ کاش! مجھ سے بھی پوچھیکہ تو کیا چاہتا ہے۔

۴۔ ۷ شرح : اے خدا! جب تیرے سوا حقیقتہً کوئی موجود نہیں تو ارگرد جو ہنگامہ بپا نظر آتا ہے، آخر یہ کیا ہے؟

کہیں حسین اور دل مہیا لینے والے مجرب موجود ہیں۔ پھر ان کے غمزدہ، عاقل و عاثرے اور ادائیں ایسی ہیں جنہیں دیکھ کر انسان بے اختیار مزلفیتہ ہو جاتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟

پھر مجربوں کی سیاہ اور غیر بھری ذلیفیں اور ان کی سرمئی آنکھوں کی نظریں ان سب کو کیا سمجھیں اور ان کی دلربائی و دلغزبی سے کیونکر بچیں؟ یہ سبزہ و گل، ہمارے یہ پر لطف منظر، بادلوں کا چھا جانا، نہایت خوشگوار ہواؤں کا چلنا، یہ سب کچھ کیا ہے؟

دنیا میں یہ گونا گوں ہنگامے اتنے دکھش میں کہ انسان ان میں الجھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ بیشک اے خدا! حقیقی وجود صرف تیرا ہے اور ہمیں تیرے سوا کسی سے وابستگی نہ ہونی چاہیے۔ صرف تیری ہی لگن ہمارے دل میں ہونی چاہیے۔ تاہم تو نے ہی دنیا میں ایسی بے شمار چیزیں پیدا کر دی ہیں، جو دلوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں کہ بقول مولانا غلامیابائی سراب کی محویت میں دریا کی طلب سے ہاتھ دھوئے بیٹھے ہیں۔

۸۔ شرح : ہماری سادہ لوحی اور نادانی ملاحظہ فرمائیے کہ ان مجربوں سے وفا کی امید لگائے بیٹھے ہیں، جو جانتے ہی نہیں کہ وفا کیا چیز ہوتی ہے۔

۹۔ شرح : درویشوں کی صدا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ ہاں

بھلا کر، تیرا بھلا ہو گا۔

کتنا سادہ، سلیس اور اثرورسّہ شعر ہے اور حقیقت بیان کی گئی ہے، یہ بھی عالم
انسانیت کی بہت بڑی سمجھائیوں میں سے ایک سمجھائی ہے۔ جو لوگ اسے قفسِ دل کی
بنیاد پر محبوبوں کی طرف لے جاتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ خواہ مخواہ نامناسبیت
کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۱۰۔ شرح : مجھے معلوم نہیں کہ دعا کسے کہتے ہیں، البتہ اسے محبوبِ اِتم پر
جانِ قربان کر دینے کے لیے برحق اور سرِ لحظہ آمادہ ہوں۔

دعا کا مقصد کیا ہوتا ہے ؟ کہ جس کے لیے دعا کی جائے کہ وہ بہتر سے بہتر
حالت میں رہے۔ جو شخص دوسرے پر جان دے دینے کے لیے آمادہ ہو، کون سی
دعا ہے، جو اس میں شامل نہ ہوگی ؟ کوئی دعا جانِ نثار ہی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔
یہی حقیقت مرزا غالب نے اس شعر میں پیش کی ہے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دعا غوغاوار الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتی ہے جس میں
زیادہ سے زیادہ نیک اور خیرِ طلب آرزوؤں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تاہم وہ صرف
الفاظ ہوتے ہیں اور مرزا محبوب کے لیے جان دے دینے پر آمادہ ہیں، محض
اچھے الفاظ کر دینے پر وہ قناعت کے لیے تیار نہیں۔

۱۱۔ شرح : میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ غالب کی حیثیت کچھ نہیں، تاہم
اسے محبوب ! ایک غلامِ مفت آپ کو مل رہا ہے، پھر اسے لے لیجئے میں مضائقہ
کیوں ہو ؟

لطف کا پہلو یہ ہے کہ بغا ہر اپنے آپ کو مفتِ محبوب کے حوالے کر رہے
ہیں، لیکن عاشق کے لیے اس قبول سے بلند تر مقام اور کیا ہو سکتا ہے ؟

کہتے تو جو تم سب کہ بُتِ غالبِ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ دو آئے

۱۔ لغات - غالیہ :
ایک مرتبہ خوشبو جو ٹنگ

جنہر وغیرہ خوشبویں
 ملا کر تیار کرتے ہیں
 غالبہ خوشبو سے مراد
 ہے ایسا محبوب ،
 جس کی زلفیں اس
 مرکب خوشبو میں بسی
 ہوئی ہوں ۔

شرح :
 اس غزل کے دوسرے
 شعر سے معلوم ہوتا
 ہے کہ آخری وقت
 ہے نزع کی حالت
 طاری ہے ۔ عاشق
 کو محبوب کا انتظار
 ہے ۔ اسے تسلی دینے
 کے لیے دوست احباب
 کڑے ہیں کہ وہ
 آنے ' وہ آئے ،
 لیکن عاشق نے ان
 کے چہروں سے
 اندازہ کر لیا کہ محبوب
 کی آمد کوئی معمولی
 چیز نہیں ۔ بادشاہ ہوا

ہوں کشمکش نزع میں ، ہاں ، جذب محبت
 کچھ کہ نہ سکوں ، پروہ میرے پوچھنے کو آئے
 ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
 آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں ، گو آئے
 ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں کے نکیرین ؟
 ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
 جلاؤ سے ڈرتے ہیں ، نہ واعظ سے بھگڑتے
 ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے ، جس بھیس میں جو اسٹریکٹ
 ہاں ، اہل طلب ! کون مٹے طعنہ تا یافت
 دیکھا کہ وہ ملتا نہیں ، اپنے ہی کو کھو آئے
 اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
 اُس درد پر نہیں بار تو کبھے ہی کو ہو آئے
 کی صم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
 اچھے رہے آپ اس سے مگر عجب کو ڈبو آئے
 اس انجن ناز کی کیا بات ہے ، غالب !
 ہم بھی گئے واں ادتری تقدیر کو رو آئے

سے بھی بڑھ کر دھب داب اور ہیبت کی چیز ہے۔ اگر واقعی وہ آ رہا ہو تو دیکھنے والوں کے چہروں پر گھبراہٹ نہ طاری ہو جائے؛ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ آئے، وہ آئے، کہنے سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؛ گھبرا کے کہو کہ وہ آئے یعنی محبوب کی واقعی آمد کی خبر وہ ہو سکتی ہے، جب سب پر گھبراہٹ طاری ہو۔

۲۔ **شرح :** میں جان کنی کی کشش میں ہوں۔ اسے محبت کی کشش ! محبوب کو کھینچ جاتا ہوں کہ میں بول نہ سکوں گا مجھ سے کچھ کہنا نہ جاسکے گا، مگر اتنا تو ہو کہ وہ میرا حال پوچھ لے۔

۳۔ **لغات :** صاعقہ : گرنے والی بھل۔

شرح : اس شعر میں آنے کی دو مختلف تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ اول دنیا میں انسان کی آمد، دوم محبوب کی آمد۔ قرینہ دوسری تعبیر کا موافق ہے، لیکن پہلی تعبیر بھی بے لگفت درست مافی جاسکتی ہے۔

پہلی تعبیر کے مطابق مطلب یہ ہوا کہ انسان اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی زندگی گرنے والی بھلی یا شعلے کی تپش اور پارے کی تڑپ کی طرح ہوتی ہے، یعنی یکا یک آتا ہے، جتنی مدت یہاں گزارتا ہے، اسے قرار نصیب نہیں ہوتا اور رخصت ہو جاتا ہے۔ ہم نے مانا کہ ہم یہاں دنیا میں آئے، لیکن یہ آنا ہی سمجھ میں نہیں آتا کہ اکثر اتنی قصوری مدت کے لیے کیوں آئے اور جتنی بھی مدت تھی، وہ کس لیے بتیابی و بیکاروی میں صرف ہوئی؟

دوسری تعبیر کے مطابق مفہوم یہ ہوا کہ محبوب نے نوازش تو فرمائی یعنی آ تو گیا، مگر کس رنگ میں جیسے بھلی گری، شعلہ چمکا، پارا تڑپا اور وہ چلا گیا۔ لمحہ بھر کے لیے بھی نہ ٹھہرا۔ میں نے تسلیم کر لیا کہ محبوب آیا، مگر سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا آیا، کیوں آیا، اس آنے سے کیا حاصل تھا؟ ایسے لطف و کرم سے عاشق کے لیے تسکین کا کیا سامان ہم بچے سکتے تھے؟

۴۔ **لغات :** نکیرین : وہ دھڑکتے ہوئے سے قبر میں جاتا ہوگا

کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ انہیں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں۔
 بادۂ دو شینہ : گزشتہ شب کی پی ہوئی شراب۔

شرح : خواہر عالی فرماتے ہیں :

- بادۂ دو شینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب، جو مرنے سے پہلے پی بھتی
 محض ازراۂ شوخی کے کتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے
 بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مرے تاکہ نکیرین
 اس کی ٹوکراہت سے بغیر سوال جواب کیے چلے جائیں۔

مرزا کو شراب کی ٹوکراہت کے گھبرا کر بھاگ جانے کا اتنا یقین ہے کہ
 ایک مسلم حقیقت کی بنا پر پوچھتے ہیں، ظاہر ہے کہ نکیرین گھبرا کے نہ بھاگیں گے؟
 البتہ بشرط یہ ہے کہ شب گزشتہ کی پی ہوئی شراب کی ٹوکراہت سے آئے۔

دیکھیے، نکیرین کے سوال و جواب کا معاملہ ماورائے محسوسات ہے اور
 انسانی عقل و فہم محسوسات پر مبنی ہے۔ یہ معاملہ محسوسات کا نہیں، لیکن مرزا
 پورے معاملے کو محسوسات کے عالم میں لے آئے ہیں۔ جس طرح عام شراب نہ
 پینے والوں کو اس کی ٹوکراہت ہوتی ہے، اسی طرح مرزا فرض کیے بیٹھے
 ہیں کہ فرشتوں کو تقدس و پاکیزگی کی بنا پر بہت زیادہ کراہت ہوگی۔ اگر شراب پی
 کر مرے تو سانس کی آمد و رفت ختم ہو جانے کے باوجود منہ سے مزبور بو آنے لگی
 اور فرشتے سراپا روج ہونے کے باعث اُس کی بو کی تاب نہ لاسکیں گے۔ یوں
 سوال و جواب کی منزل بخیر و عافیت گزر جائے گی۔

۵۔ شرح : خواہر عالی فرماتے ہیں :

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ رنج اور تکلیف سب خدا کی طرف سے ہے۔

مطلب یہ، ہم جسے بھی دیکھتے ہیں، اسے محبوب حقیقی ابھی جانتے ہیں کہ تو
 ہے۔ جلاؤ قتل کے لیے آتا ہے، ہم اس سے بالکل نہیں ڈرتے، کیونکہ اس کے
 پس پردہ تو کار فرما ہے۔ جو کچھ ہے تیری رضا اور تیرے حکم سے ہو رہا ہے۔ اس

سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ وہ تو عین ہمارا مقصود ہے ۔ اسی طرح واعظ کچھ بھی کہے ، ہم اس سے جھگڑنے کے روادار نہیں اور کیوں جھگڑیں ؟ اس کے وعظ و نصیحت کا سرچشمہ بھی تو ہے ، گویا تو ہی اس کے اندر سے بول رہا ہے پھر ہمارے لیے جھگڑنے کا کون سا مقام ہے ؟

سادہ لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک وجود حقیقی کو مان لینے سے تمام ظاہری امتیازات مٹ گئے اور کوئی وجود کوئی جھیس بدل کر آئے ، ہمارے نزدیک تیرے سوا کوئی نہیں ۔

۶۔ لغات ۔ نایافت : نہ پانا ، حاصل نہ کر سنا ۔

شرح : اے حقیقت کے طلبگارو ! ہم میں اتنی تاب کہاں نہ دوسروں کا طعنہ نہیں ، اس نے حقیقت کو ڈھونڈا اور نہ پایا ۔ جب ہم پرواضح ہو گیا کہ حقیقت ہمیں نہیں ملتی تو تلاش میں اپنے آپ ہی کو فنا دیا ۔

مطلب یہ کہ ہمارے سامنے صرف دو صورتیں ہیں ، مطلوب کو پا لینا یا اپنے آپ کو فنا کر دینا ، تیسری صورت ہمارے نزدیک کوئی وجود نہیں رکھتی ۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ مطلوب کو ڈھونڈیں ، نہ پائیں ، زندہ رہیں اور لوگوں کے طعنہ نہیں کہ دیکھو ، اس نے بہت تلاش کی ، لیکن مطلوب تک نہ پہنچ سکا ۔

۷۔ شرح : ہمارا یہ دستور نہیں کہ کہیں آرام سے بیٹھ جائیں ۔ ہم محبوب حقیقی کے دروازے پر پہنچے ۔ جب دیکھا ، وہاں بار نہیں ملتا تو کعبے چلے گئے کہ محبوب کی بارگاہ میں حاضری کا موقع نہیں تو چلو اسی مقدس مقام کی زیارت کر آئیں ، جسے محبوب کا گھر سمجھا جاتا ہے ، یعنی بیت اللہ ۔

اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں ، اول اس حقیقت کا اعلان کہ بیت اللہ دراصل عبادت باری تعالیٰ کا ایک ظاہری نشان ہے ۔ اس کا تقدس ذاتِ باری تعالیٰ سے نسبت اور نشانِ عبادت کی حیثیت میں ہے ۔

دوم اپنی تک و دو اس دائرے سے باہر نہیں ہونے دی جو مقرر کر دیا گیا ،
یعنی اصل آرزو محبوب حقیقی کے حضور میں باریاب ہونے کی ہے۔ اسی کے
لیے تڑپ رہے ہیں ، لیکن جب تک وہ نصیب نہ ہوا ، کچھ کی زیارت میں
بھی تاثر نہیں ، کیونکہ کعبہ ذات باری تعالیٰ سے خاص نسبت رکھتا ہے ۔

۸۔ شرح : دوستوں اور ہم نشینوں نے میری آہ و زاری کے بارے

میں محبوب کے پاس نہایت پر تاثر تقریر کی ۔ بہت کہا کہ عاشق درمائدہ کو اس
حالت میں رکھنا مناسب نہیں ۔ بہر وقت روتا ہے ، بہر لحظہ فریاد کرتا ہے ۔ اس
پر رحم کیجیے لیکن محبوب پر کچھ اثر نہ ہوا اور یوں میری جو رہی سہی حیثیت تھی ،
وہ بھی ختم ہو گئی ۔ مگر عجیب کو ڈبو آئے " کی دو تعبیریں ہو سکتی ہیں اول وہ
جو پیش کی جا چکی یعنی محبوب پر کچھ اثر نہ ہوا ، دوم یہ کہ اب تک میں خود داری
پر قائم تھا اور کبھی محبوب پر کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی ۔ دوستوں نے جو
تقریریں مانی ، اس کے نتیجہ کیا نکلا ؟ اثر تو ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر میری
خود داری کا بیڑا بھی غرق کر دیا ۔

۹۔ شرح : دوست کہتے ہیں : اے غائب ! محبوب کی بزم ناز کی

صحیح کیفیت کون پیش کر سکتا ہے ؟ وہ ایسی بزم ہے ، جس کا پورا نقشہ بیان میں
آہی نہیں سکتا ۔ ہم بھی گئے تھے اور تیری تقدیر کو رو کر لوٹ آئے ۔

تقدیر کو روکنے کے دو مفہوم ہیں ، اول یہ کہ اس بزم ناز میں تجھے بار

میسر نہیں اور حق یہ ہے کہ جسے بار میسر نہ ہوا ، سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی قسمت

بھوٹ گئی اور ایسی سیاہ نصیبی پر بے اختیار دونا آتا ہے ۔ دوسرا مفہوم یہ

ہے کہ ہم نے بزم ناز سے تیری قودی کا حال محبوب سے کر دیا ۔ گویا تیری

کم نصیبی کا ذکر نہایت دردناک الفاظ میں کر دیا ۔ تقدیر کو روکنے کا مفہوم ہی

یہ ہے کہ کسی کی کم نصیبی کی شکایت کی جائے ۔

پھر کچھ اک دل کو بقراری ہے سینہ جو یاسے زخم کاری ہے
 پھر جگر کھودنے لگا ناخن آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
 قبلہ مقصدِ نگاہ و نیاز پھر وہی پروہِ عماری ہے
 چشمِ دلالِ جنسِ رسوائی دلِ خریدارِ ذوقِ خواری ہے
 وہی صد رنگِ نالہ فرسائی وہی صد گونہ اشکباری ہے
 دل، ہولے خمِ ناز سے پھر محشرِ ستانِ بقراری ہے
 جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے روزِ بازاریِ جانِ پاری ہے
 پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں پھر وہی دندگیِ مہاری ہے
 پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز گرم بازارِ فوجدارِی ہے
 ہو رہا ہے جہان میں اندھیر زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
 پھر دیا پارہ جگر نے سوال ایک فریادِ آہ و زاری ہے
 پھر میرے میں گواہِ عشقِ طلب اشکِ باری کا حکم جاری ہے
 دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا آج پھر اُس کی رو بکاری ہے
 بے خودی بے سبب نہیں غالب! کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱۔ شرح : پھر دل عبودۂ عشق کے لیے بقرار ہو رہا ہے اور سینے کو
 پھر کاری زخم کھانے کی تڑپ ہے، گویا میں پھر کسی کی نگاہِ ناز کا ہدف

بہنے کے لیے مضطرب ہوں ۔

۲۔ **شرح :** پھر بہار کی آمد آ رہی ہے۔ لالہ کاری کا سرو سامان جو رہا ہے۔ میرے ناخن بھی جگر کرید کرید کر زخم تازہ کر رہے ہیں، گو یا لالہ کاری کا جواب دیتا کیا ہار رہا ہے۔

۳۔ **لغات :** عماری : ہاتھی کے ہودے کو بھی کہتے ہیں اور اونٹ کے محل کو بھی، جس میں سواریاں بیٹھتی ہیں۔ خصوصاً عورتیں۔ یہاں آخری معنی مراد ہیں۔

شرح : پھر وہی محل میری نگاہ و نیاز کا اصل مقصد بن گیا ہے جس میں محبوب پر وہ نشیں ہے۔

یہاں قبلہ کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا کہ عماری کے پردے کو پردہ کعبہ قرار دے لیا۔

۴، ۵۔ **شرح :** پھر ہماری آنکھ نے جس رسوائی کی دلالی شروع کر دی ہے۔ پھر ہمارا دل وقت و خواری کی لذت کا خریدار ہے۔ چنانچہ دل سیکڑوں طریقوں پر فریاد و فغاں کر رہا ہے، جیسے پہلے کرتا تھا اور آنکھ بھی پہلے کی مانند سو سو طرح آنسو بہا رہی ہے۔

آنکھ کے آنسو بہانے اور دل کے فریاد و فغاں کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ رازِ عشق کھل جائے اور میرے لیے وقت و رسوائی کا سامان ہم پہنچے۔

۶۔ **شرح :** پھر دل کو محبوب کے خرام ناز کی آرزو ہے اور اس کے لیے وہ بیکراری کا عہدستان بنا ہوا ہے۔ اتنا بیکرار ہے، گو یا سیکڑوں قیامتیں ہر ایک وقت ہا ہود ہی ہیں۔

محبوب کی چال کو عوام قیامت ہا ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ مرزا نے بھی اس شعر میں ہی حقیقت پیش نظر رکھی ہے۔

۷۔ لغات - روز بازار : جس دمانے میں مرکزی مقامات سے ضرورت کی چیزیں لانے کے جانے کی سہولتیں نہ تھیں، مختلف مقامات پر بچتے ہیں ایک یا دو مرتبہ بازار لگ جاتے تھے اور اس پاس کے لوگ اشیائے ضرورت وہاں سے خرید لیتے تھے۔ ان بازاروں کے لیے پہلے سے دن مقرر ہوتے تھے۔ یہی مقرر دن روز بازار کہلاتے تھے۔ اس سے مراد ہے گرمی بازار یعنی خرید و فروخت کی کثرت۔

مشریح : حسن نے پھر عثوہ و ناز کی نمائش شروع کر دی ہے۔ گویا سمجھ لینا چاہیے، جانیں بچھاؤ کر دینے کا خاص موسم آگیا اور اس کی گرمی بازار شروع ہو گئی۔

مطلب یہ کہ محبوب کے عثوہ و ناز کی خریداری کے لیے سب جانیں دے دینے پر آمادہ ہیں۔

۸۔ مشرح : ہم پھر اسی محبوب پر جان دے رہے ہیں جس نے ہم سے کہیں وفانہ کی۔ دوسرے مصرع کے دو معنوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے زندگی کے وہی طریقے اختیار کر لیے ہیں، جو پہلے تھے، دوسرا یہ کہ وہی محبوب پھر ہماری زندگی کا سہارا بن گیا ہے، یعنی اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کا فریاد نہ نکلے

۹-۱۳۔ مشرح : پھر ناز کی عدالت کا دور اذہ کھل گیا اور فوجداری کے مقدمے پر کثرت ہونے لگے۔ دنیا میں اندھیر شروع ہو گیا اور ناز کا محبوب نے پھر سرشتے داری کا منصب سنبھال لیا۔

زلزلہ کے ساتھ اندھیر، سر اور رشتہ کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

جگر کے ٹکڑے نے پھر نمائش داڑ کر دی۔ آہ و زاری اور فریاد کا ہنگامہ

بچا ہے۔

دوسرے مصرع میں لفظ "ایک" نہ عدد کے لیے ہے، نہ تکثیر کے لیے، بلکہ عمل استعمال کے اعتبار سے کثرت کے معنی دیتا ہے۔
 عشق کے گواہ پھر طلب کیے گئے ہیں تاکہ ان سے بیان لیے جائیں۔ بہرطرح آنسو بہ رہے ہیں، حتیٰ کہ گواہ بھی مستثنیٰ نہیں۔

عاشق کے دل اور محبوب کی ہلکوں کے درمیان جو مقدمہ چل رہا تھا، آج پھر اس کی پٹری ہے۔ گویا یہ سارا ہنگامہ اس پیشی کے سلسلے میں بپا ہوا۔

۱۴۔ شرح : اسے غالب : تم کسی سبب کے بغیر بخود نہیں ہو۔ ہم نے سمجھ لیا کہ کچھ نہ کچھ چھپانے اور راز میں رکھنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ گویا تم بخود بن کر عشق کا بھید چھپانا چاہتے ہو۔

۱۔ لغات:

جنوں تہمت کش تکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
 تہمت کش :

نمک پاش خراشِ دل ہے لذتِ زندگانی کی
 تہمت کھینچنے والا،

کشا کش ہائے مستی سے کرے کیا سعی آزادی
 یعنی وہ جس پر تہمت لگائی جائے۔

ہوئی زنجیر، موجِ آب کو فرصتِ روانی کی
 نمک پاش : نمک

پسِ مرون بھی دیوانہ نہ یارتِ گاہِ طفلان ہے
 چھڑکنے والا۔

شرابِ سنگ نے تربت پہ میری گلشنِ فی کی
 خراش : زخم

اگر مجھے تھوڑی دیر کے

لیے خوشی کرتا ہوا پاؤ تو اس سے جڑوں پر آرام و سکون کی تہمت نہ لگنی چاہیے۔

میں جو عارضی خوشی کرتا ہوں، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آنے والی تکلیف زیادہ سے زیادہ محسوس ہو، کیونکہ خوشی کے بعد بچ و غم طلباً زیادہ تکلیف دہ ہوتا

ہے۔ گویا زندگی میں تھوڑی سی لذت محسوس کرنا زخمِ دل پر نمک چھڑکانا ہے تاکہ درد اور بڑھ جائے۔ یہ آرام و سکون کی کوشش نہیں، بلکہ احساسِ رنج کو بڑھانے کی کوشش ہے۔

مولانا طباطبائی کے قول کے مطابق دوسرے مصرع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان تمام مصیبتوں، پریشانیوں اور تکلیفوں میں ہمارا زندہ رہنا ہی زخمِ دل پر نمک چھڑکنے کے لیے کافی ہے۔

۲۔ لغات - کشاکش : کھینچ تان، کشاکش۔

مترشح : زندگی کی کھینچ تان اور کشاکش سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے ؟ دیکھیے، آپ کے سامنے ہر کی مثال ہے، اسے دیا جانے کا جو موقع ملا، وہی اس کے لیے ایک ذخیرہ بن گیا۔ یعنی اس نے زندگی کی کشاکش سے نکل جانے کی کوشش کی، لیکن وہ کوشش اسے مزید جکڑ لینے کا موجب بن گئی۔

دریا یا سمندر میں لہروں کو دیکھا جائے تو ان کی شکل نہ بخیر سے بالکل بدلتی جلتی نظر آئے گی۔ وہ دیا تو اس لیے ہوئیں کہ زندگی کی الجھنوں سے نجات پالیں، مگر وہی مدافنی ان کے لیے ذخیرہ بن گئی۔

۳۔ مترشح : دیوانہ مرچکا، قبر میں دفن ہو چکا، بلکہ قبر بچتے بھی کر دی گئی، لیکن لڑکے اب تک وہاں پہنچ رہے ہیں اور اسی طرح اینٹ پتھر برسا رہے ہیں، جس طرح دیوانے کی زندگی میں برسا رہے تھے پتھر تختہ قبر پر لگتے ہیں تو رگڑ سے شرابے پیدا ہوتے ہیں۔ دیوانہ یہ سمجھتا ہے کہ یوں اس کی قبر پر پھول چڑھائے جا رہے ہیں۔ اسی اعتبار سے قبر کو زیارت گاؤ قرار دیا، نشانہ نہیں بتایا۔

۱۔ لغات :

نکوہش : علامت

سد نش۔

خندہ دندان نما :

وہ ہنسی جس میں

دانت نمایاں ہو جائیں

یہ ہنسی طنز و تشبیہ

کے لیے استعمال

ہوتی ہے۔

شرح :

جو عاشق محبوب کے

ظلم و ستم کی فریاد

کرے وہ یقیناً نشتر

و علامت کا سزاوار

ہے۔ کچھ دور نہیں

کہ حشر کے دن کی صبح اس کے لیے خندہ دندان نما بن جائے، یعنی اس کی ہنسی

اڑائے، حالانکہ حشر کا دن حق و انصاف کا دن ہے۔ اگر اُس جھوٹے عاشق نے

محبوب کے ظلم و جور برداشت کر لیے ہوتے اور فریاد نہ کرتا تو اسے اجر ملتا۔

۲۔ لغات : ریشگی : ریشے کی خاصیت، یعنی آگ، بڑھنا،

پھولنا، پھلنا۔

شرح :

اگر کسان اُس صحرا میں، جہاں مجنوں نے زندگی گزاری اور

وہیں مرٹ کر خاک ہو گیا، دانے کی جگہ نشتر کی نوک ہو دے تو اس صحرا کی خاک

نوک نشتر سے ییل کی رگ اُگائے اور اسے پھولنے پھلنے کی قوت دے دے۔

نکوہش ہے سزا، فریادی بیداد و لبر کی

مبادا، خندہ دندان نما ہو صبح محشر کی

رگ ییل کو خاک دشت مہنوں ریشگی بجھے

اگر بوسے بجائے دانہ و ہنقاں، نوک نشتر کی

پر پروانہ شاید باد بان کشتی سے تھا

ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

کروں بیداد ذوق پر فشانی عرض، کیا قدرت

کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہر کی

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے چھپے قیامت

مری قسمت میں یا رب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

اڑانے، حالانکہ حشر کا دن حق و انصاف کا دن ہے۔ اگر اُس جھوٹے عاشق نے

محبوب کے ظلم و جور برداشت کر لیے ہوتے اور فریاد نہ کرتا تو اسے اجر ملتا۔

۲۔ لغات : ریشگی : ریشے کی خاصیت، یعنی آگ، بڑھنا،

پھولنا، پھلنا۔

شرح :

اگر کسان اُس صحرا میں، جہاں مجنوں نے زندگی گزاری اور

وہیں مرٹ کر خاک ہو گیا، دانے کی جگہ نشتر کی نوک ہو دے تو اس صحرا کی خاک

نوک نشتر سے ییل کی رگ اُگائے اور اسے پھولنے پھلنے کی قوت دے دے۔

اس شعر میں بظاہر عشق و حسن اور عاشق و محبوب کا اتحاد ثابت کیا ہے اور اشارہ اس قصے کی طرف ہے کہ ایک مرتبہ میل کی فصد لی گئی تھی، تو دوست مجنوں کی رگ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اسی پر کسی نے کہا تھا:

لوائی فصد میلی نے رگ مجنوں سے خون آیا
محبت کے لیے لازم ہے اظہار اثر ہونا

۳۔ شرح: مجلس گرم ہوئی، جس کے لیے شمع کا جلا لازم تھا۔ شمع جلی تو پروانے آئے۔ جام شراب کا دور شروع ہو گیا۔ کشتی سے چلنے لگی۔ شاید پروانے کا پڑاؤ کشتی کے لیے بادبان بن گیا۔

شعر کا مضمون یہی ہے، باقی مرزا نے لفظوں کا ایک عجیب و غریب ظلم باز صنف کی کوشش کی ہے، جس میں کوئی حسن نظر نہیں آتا۔ شراب کی کشتی وہ ہوتی ہے، جس میں شراب کی بوتلیں رکھ کر حوض کے اندر چلا دیتے ہیں تاکہ ارد گرد بچھے ہوئے تمام میکشوں تک شراب پہنچ جائے۔ کشتی کے لیے بادبان کا ہونا ضروری ہے اور مرزا نے کشتی کے لیے پروانے کا پر تلاش کیا۔ مجلس کی گرمی کا ایک لازمی جزو شمع ہے۔ شمع پر پروانوں کا آنا لازم ہے اس طرح مختلف چیزیں جوڑ کر ایک منظر پیدا کر دیا ہے۔

۴۔ لغات - پرفشانی: پڑ پڑ پھڑانا، اس کے معنی تپوں کا گر جانا بھی ہیں۔

شرح: پڑ پڑ پھڑانے کا جو ذوق و شوق ہے، اس کا ظلم و جور بیان کرنے کی قدرت مجھ میں کہاں ہے؟ کونکہ اڑنے سے پہلے ہی میرے شہر کی قوت رخصت ہو گئی، یعنی میں ایک معمولی نسبت بھی نہیں کر سکتا۔ دل میں اڑنے کا ذوق یقیناً بے حد ہے، لیکن وہ ذوق ساتھ نہیں دیتا اور میں بے بس ہوں، یہی اس کا ظلم ہے۔

کسی شے کا ذوق و شوق ہو، مگر طاقت و استطاعت ساتھ نہ دے تو،

صاحبِ فوق کی تکلیف و مصیبت محتاجِ بیان نہیں رہتی۔

۵۔ شرح : میں خیمہ محبوب کے پچھواڑے میں کپ تک روتا ہوں ؟
اے خدا ! کیا میری قسمت میں بھتر کی دیوار نہ تھی کہ اس سے سر پھوڑ لینا اور
جنگلِ انہم ہو جاتا۔ اب نیچے سے کیونکر سر پھوڑوں ؟ وہ تو کپڑے کا ہے ۔
مصیبت یہ ہے کہ نیچے کے نیچے کھڑے رو رہے ہیں۔ سامنے ہوتے
تو کم از کم محبوب کے دیدار سے مژدہ فیض یاب ہو جاتے ۔

۱۔ لغات :

سبک :

ہلکا ، بے وقعت ۔

شرح :

ہم مختلف معاملات

میں حد سے تجاوز

کرتے رہے۔ اعتدال

کا کوئی خیال نہ رکھا

نتیجہ یہ نکلا کہ سب

میں بے وقعت ہو

گئے اور ہمارا وقار

کھو گیا۔ دوسرے

لفظوں میں کہہ سکتے

ہیں کہ جتنے آگے

بڑھے تھے ، یمنی ،

بے اعتدالی کے باعث

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے

جتنے زیادہ ہو گئے ، اُتنے ہی کم ہوئے

پہناں تھا دامنِ سختِ قریبِ آشیان کے

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے

یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر

وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

نیری وفا سے کیا ہو تلافی ؟ کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پر بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوشچاکاں
 بہر چند اس میں باقہ ہمارے قلم ہوئے
 اللہ سے تیری تندیِ خو، جس کے ہم سے
 اجزائے نالہ دل میں مرے، رزقِ ہم ہوئے
 اہل ہوس کی فتح ہے ترکِ ہنر و عشق
 جو پاؤں اٹھ گئے، وہی اُن کے قلم ہوئے
 نالے عدم میں چند ہمارے سپر و تھے
 جو داں نہ کھینچ سکے، سو وہ یاں آکے دم ہوئے
 چھوڑی اسد! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
 سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

مد سے نکل گئے
 تھے، اتنا ہی ہمیں
 کم ہونا اور پیچھے
 ہٹنا پڑا۔
 بے اعتدالی کے
 مقابلے میں زیادہ
 ہونا اور سبک ہونے
 کے مقابلے میں کم
 ہونا ہے۔

۲۔ شرح۔

خواجہ جاتی فرماتے
 ہیں۔

”جو مطلب اس
 طریقے سے ادا کیا
 گیا ہے، وہ ہے“

کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر
 لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ ہمارے آشیانے کے بالکل پاس جاں لگا ہوا تھا، جو ہماری
 نظروں سے پوشیدہ تھا۔ ابھی ہم پر ہی تول رہے تھے، اڑے نہ تھے کہ
 اُس جاں میں پھنس گئے۔

شکاری عموماً جاں ایسے طریقے پر لگاتے ہیں کہ وہ شکار کی نگاہوں سے
 چھپا رہے تاکہ آسانی سے پھنس جائے۔ اڑنے نہ پائے تھے سے بظاہر
 مراد یہ ہے کہ ابھی آشیانے سے شبست کی تھنی اور نقصان میں بازو پھیلا کر توازن

قائم نہ کر سکے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حال آشیانے سے آنا قریب تھا، گویا کہہ سکتے ہیں، بالکل ملاؤ اٹھا، جیسا کہ "سخت قریب" سے ظاہر ہے۔
۳۔ شرح : خود مرزا غالب میرمدی مجروح کو اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پہلے یہ سمجھو، شتم کیا چیز ہے ؟ قد اس کا کتنا لمبا ہے ؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں ؟ رنگ کیسا ہے ؟ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ شتم جسم و جسمانیّت میں سے نہیں، ایک اعتبار محض ہے، وجود اس امر کا صرف تعقل میں ہے۔ سیرخ کا سا اس کا وجود ہے، یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں۔ میں شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی شتم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے فنا ہونے کی دلیل ہے۔"

محاورہ یہ ہے کہ فلاں شے ہمارے پاس شتم کھانے کو بھی نہیں، یعنی ہم کو بھی نہیں۔ کیونکہ اگر اس کا وجود کچھ ہوتا تو شتم کھانے کا ثبوت بن سکتا تھا۔ یہی محاورہ مرزا نے اس شعر میں استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں : "ہمارا ہونا، ہمارے فنا ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہم شتم تھے اس حد پر پہنچ گئے گویا اپنی شتم بن گئے ہیں۔ یعنی نام کو بھی ہمارا وجود باقی نہ رہا۔"

۴۔ شرح : جن لوگوں نے عشق کی سختیاں جھیلیں، ان کے بارے میں کیا پوچھتے ہو ؟ وہ لوگ رفتہ رفتہ گھٹنے گھٹنے سرا پا رنج و غم رہ گئے۔ جس طرح خارج میں رنج و غم کا کوئی وجود نہیں، اسی طرح عاشقوں کا وجود بھی عشق کی کڑیاں برداشت کرتے کرتے تحلیل ہو گیا۔

۵۔ شرح : اے محبوب ! زمانے میں محض تیری ہی طرف سے ہم پر ظلم و ستم نہیں ہوئے، تیرے علاوہ بھی ہمیں گونا گوں جفا کاروں سے سابقہ چھنا رہا۔ اگر تو فنا داری کا پابند ہو جائے تو تیرے ظلموں کی تلافی

تو ہو جائے گی، لیکن جس سے علاوہ جو عظم ہو ہے، ان کی تلافی کیونکر ہوگی؟
 اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ مجھے جو جفا میں جھیلنی پڑی، وہ صرف
 عشق کے باعث نہ تھیں۔ عشق کے علاوہ بھی مجھے بے شمار رنج و غم پہنچے۔ دوم
 یہ کہ اپنی پریشاں حالی کو بڑبڑا چڑھا کر محبوب کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ
 وہ ترس کھا کر فدا تلافی پر متوجہ ہو جائے۔

۶۔ **بشریح** : ہم جنوں دو یونگی کی داستا میں قلم بند کرتے رہے، جو اتنی
 دردناک تھیں، گویا ان کے لفظ لفظ سے خون ٹپکتا تھا۔ اگرچہ اس مسئلے میں ہمارے
 ہاتھ کٹ گئے، لیکن ہم نے داستاں طرازی نہ چھوڑی۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری دشمن کچی اور ہمارا عزم اٹل تھا۔ ہم عشق و شیطنت کی
 داستا میں مرتب کرتے رہے۔ وہ اتنی درد انگیز تھیں کہ کارمزاؤں نے اس جرم میں
 ہمارے ہاتھ کٹا دیے، مگر ہم نے اُس حالت میں بھی پوری عزیمت کے ساتھ اپنا
 کام جاری رکھیں۔

یہ شعرانِ مہاجرین حق کی عزیمت آشکارا کر رہے ہیں، جو بلند مقاصد کے لیے،
 جدوجہد شروع کرتے ہیں اور کوئی ظلم و جبر انہیں اس راستے سے ادھر ادھر نہیں
 کر سکتا۔

۷۔ **لغات**۔ رزقِ ہم : ایک دوسرے کا رزق۔

بشریح : اے محبوب! تیری شد مزاجی اور تیز طبیعت کے بارے میں کیا
 کہا جائے؟ اس کے خوف سے میری مزاید و نقا کے اجزاء گھل کر اور تحلیل ہو
 کر اندر ہی اندر ایک دوسرے کو کھا گئے۔ یعنی مزاید اس لیے نہ کھاتا کہ تیری تند فطرت
 کا ڈر تھا۔ نالہ دل سے اٹھتا تھا، پھر جزو جزو ہو کر اندر ہی اندر تحلیل ہو جاتا تھا،
 اور اس کے مختلف اجزاء ایک دوسرے کو کھا جاتے تھے۔

۸۔ **لغات**۔ اہل ہوس : جھوٹے عاشق، جو عشق سے نا آشنا ہوں

اور صرف ہوس پوری کرنا چاہتے ہیں۔

نبرد : جنگ ، لڑائی ۔

شرح : جھوٹے عاشقوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ عشق کی جنگ سے الگ ہو جائیں ۔ وہ اس راستے کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتے ۔ امتحانوں میں سرخورد نہیں ہو سکتے ۔ ان کے لیے کامیابی کی کوئی صورت نہیں ، صرف اس جنگ کے میدان سے باہر نکل جانا ہی ان کے لیے بہتر ہے ۔ اسی کو انھیں اپنی فتح سمجھنا چاہیے ۔ فتح کا نشان یہ ہوتا ہے کہ جھنڈے بلند کیے جاتے ہیں اور پرچم لہرائے جاتے ہیں ۔ اہل ہوس کا میدان عشق سے الگ ہو جانا اور پاؤں اٹھا کر چل پڑنا ہی ان کے لیے فتح کا پرچم لہرانا ہے ۔

کنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اہل ہوس کے لیے میدان عشق سے باہر نکل جانا ہی مناسب ہے ۔ اس کے لیے طریقے فدا تکلف کا اختیار کیا ۔

۹۔ شرح : قدرت نے روزِ اول ہی سے چند نالے ہمارے سپرد کر دیے تھے ۔ جب تک ہم اس دنیا میں نہ آئے ، نالہ کشی میں مشغول رہے جب یہاں آگئے تو انھیں نالوں نے سامنوں کی شکل اختیار کر لی ۔

شعر سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جب سے ہماری ہستی کی بنیاد استوار ہوئی ، مزید و فتنوں کے سوا ہمارا کوئی کام نہیں ، یہاں تک کہ اس دنیا میں آکر ہم نے جو سامن لیے ، وہ بھی دراصل نالے ہی تھے ، جو یہاں آنے سے پیشتر کیے نہیں گئے تھے ۔

بعض اصحاب نے اس شعر کا مافذ عربی کا مندرجہ ذیل شعر قرار دیا ہے :

نالہ نمی کشم از درد تو گاہے ، لیکن

تا بہ لب می رسد از ضعف نفس می گردو

یعنی اے محبوب ! مجھے تیرا درد و عشق ستاتا ہے تو نالہ سر کرتا ہوں ، لیکن ضعف کا یہ عالم ہے کہ وہ لب تک پہنچتے پہنچتے سامن بن جاتا ہے ۔

نالے کا سامن کی شکل میں تبدیل ہو جانا بجا ، مگر عربی اور غالب کے معنوں

بالکل الگ ہیں۔ عرق صفت کی کیفیت بیان کر رہا ہے جس کی وجہ سے
 نالے سانس بن گئے۔ میرزا غالب اپنی فطری و اذلی دروندی کا اعتراف کر رہے
 ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ازل ہی سے ہم دروند ہیں نالہ سر کرتا ہمارا فطری و طبعی قرار
 دے دیا گیا ہے۔ جو نالے ہم عدم میں سر نہ کر سکے، وہی اس حیاتِ مستعد میں
 آکر ہمارے سانس بن گئے۔

۱۰۔ شرح : اے استاد! ہم نے گدائی اختیار کی تو دل لگی اور عشقِ دوست
 کا مشغلہ اس حالت میں بھی نہ چھوڑا۔ ہم سائل تو بن گئے، لیکن اہل کرم کے
 عاشق ہو گئے۔

مطلب یہ کہ عشق ہماری گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ وہ ہم سے چھوٹ نہیں
 سکتا، یہاں تک کہ کوئی دوسرا پیشہ بھی اختیار کر میں تو عشق کے طور پر لپکتے سے
 ادا و ادا مر رہے ہوں گے۔

۱۔ لغات :

نقد : نقدی ،

اشرفی - رویہ -

کین : گھات۔ اگر

عبت کا شعر داغ دل کی

نقدی ، یعنی اشرفی

کی نگہبانی ذکر ہے ہین

اسے ہر وقت گرم نہ

رکتے تو بے زبانی

یعنی خاموشی کی گھات

جو نہ نقدِ داغِ دل کی، کرے شعلہ پاسانی

تو فسرِ دگی نہاں ہے، بہ کین بے زبانی

مجھے اُس سے کیا توقع، بہ زمانہٴ جوانی

کبھی کودکی میں جس نے، نہ سُنی میری کہانی

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا

کہ مرے عدد کو یارب ملے میری زندگانی

میں اندر وہ دلی چھپی میٹھی ہے، وہ اس داغ کو افسردہ کر دے گی، یعنی یہ داغ اپنی

پیش کھو کر مٹ جانے کا۔

مطلب یہ ہے کہ شعلہ محبت، ہر لحظہ داغِ دل کو گرم رکھتا ہے، ورنہ محبوب سے نفرتی کے باعث جو افسردگی و پژمردگی چھائی ہوئی ہے، اور جس کے باعث میں خاموش بیٹھا ہوں، داغِ دل کو افسردہ کر ڈالے گی۔

۲۔ شرح : جس محبوب نے لڑکپن میں میری درد بھری کہانی نہ سنی، حالانکہ اس عمر میں کہانیاں سننے کا خاص شوق ہوتا ہے، اس سے جوانی کے زمانے میں کیا اُمید رکھ سکتا ہوں؟

۳۔ شرح : کسی کو خواہ مخواہ دکھ دینا اور مصیبت میں ڈالنا اچھا نہیں، ورنہ میں دعا مانگتا کہ یارب! میری زندگی میرے دشمن کو عطا کر دے۔
یعنی میری زندگی اتنی المانگ اور درد انگیز ہے کہ دشمن کے لیے بھی ایسی زندگی کی آرزو نہیں کر سکتا۔

واضح رہے کہ یہ بھی اپنی زندگی ختم ناک و ریخ افزا ہونے کا ایک انداز ہے۔ واقعی مقصود یہ نہیں کہ دشمن کے لیے ایسی دعا مانگی جائے۔

۱۔ شرح :
میرزا خود اس شعر کی
شرح کرتے ہوئے
عبدالرزاق شاہ کو
کہتے ہیں :
اک شمع ہے دلیلِ سحر و سحر
یہ خبر ہے۔ پہلا مصرع
ظلمت کہے میں سحرِ شبِ علم کا جو
اے شوقِ ایامِ اجازتِ تسلیم ہوش ہے

ظلمت کہے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو غموش ہے
نے مرثوۃ وصال، نہ نفثِ ارہ جمال
دلت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے
نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوقِ ایامِ اجازتِ تسلیم ہوش ہے

گوہر کو عقد گردنِ خواباں میں دیکھنا
 کیا اور چہ پرستارہ گوہر فروش ہے
 دیدارِ بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہِ مست
 بزمِ خیالِ میکدہ بے خروش ہے
 اسے تازہ وار دانِ بساطِ ہولے دل
 زہنار اگر تھیں ہوسِ ناؤ نوش ہے
 دیکھو مجھے، جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
 میری منو، جو گوشِ نصیحتِ نبوش ہے
 ساقی پر جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
 مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
 یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
 دامانِ باغبان و کفِ گلِ فروش ہے
 لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
 یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
 یا صبح دم جو دیکھیے اگر تو بزم میں
 نے وہ سرود و سوز، نہ جوش و خروش ہے

شبِ خم کا جوش "یعنی اندھا
 ہی اندھیرا۔ غلبتِ غلیظہ،
 سخنِ ناپید، گویا غلج ہی نہیں
 ہوئی۔ ہاں، ایک دلیلِ صبح
 کی بود پر ہے، یعنی بجھی ہوئی
 شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و
 چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے
 ہیں۔ لطف اس مضمون کا
 یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ صبح
 ٹھہرایا ہے، وہ خود ایک
 سبب ہے، منجملہ اسبابِ تاریکی
 کے۔ پس دیکھا چاہیے، جس
 گھر میں ملاحتِ صبح نہ ہو، ظلمت
 ہوگی۔ وہ گھر کتنا تاریک ہوگا؟
 اس شرع پر شاگرد کے
 ایک دوست نے اعتراض
 کیا۔ شاگرد نے یہ اعتراض
 مرزا کو ملکہ پہنچا۔ جواب میں
 فرماتے ہیں،

۔ مولوی نظام الدین
 گنجوی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر
 طالب علموں کے ہاتھ پڑا۔
 انھوں نے از گوئے قوا مد نحو

اس میں محکم کرنا شروع کیا
 مووی کے پاس جب وہ
 کلمات پہنچے تو فرمایا: ”
 کہ یاداں اشعر مرا بہ مدرہ
 کہ بڑہ ہتہ“
 ”جو صاحب یہ جراتے

دایع مزاقِ صحبتِ شب کی جلی جونی
 اک شمع رہ گئی ہے، سودہ بھی نحوش ہے
 آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
 غالب صریح خامہ نواسے سروش ہے

ہیں کہ مجموع پہلا مصرع مبتدا نہیں ہو سکتا، ان سے پوچھا چاہیے کہ
 کیا آپ اس پہلے مصرع میں سے ”ظلمت کہے میں میرے“ اس
 کو مبتدا اور شبِ غم کا جوش ہے، ”اس کو خبر ٹھہراتے ہیں ہیں
 اگروں ہے تو بھی مدعا حاصل ہے۔ دوسرا مصرع دوسری خبر
 سہی۔ آخر یہ بھی تو مسلمات فنِ نحو میں سے ہے کہ ایک مبتدا کی
 دو بلکہ زیادہ خبریں ہو سکتی ہیں۔

”ہاں ایک تادمہ آؤر ہے۔ یعنی جملہ فعلیہ کے ماقبل جو عبارت
 ہوتی ہے، اس کو مبتدا نہیں کہتے۔ اس مطلع کا مصرع ثانی جملہ
 اسمیہ ہے۔ اپنے ماقبل مبتدا کو قبول کرتا ہے۔ اگر ہم نے نظر
 اس دستور پر مصرعِ اول کو مبتدا کیا تو بھی قباححت لازم نہیں آتی
 بہر حال چودہ صاحب اس پہلے مصرع کو قرار دیں، وہ مجھے قبول
 ہے۔ مگر شعر میرا مہمل نہیں۔ زیادہ اس سے کیا نکلتوں؟

میرے اندھیرے گھر میں شبِ غم کے جوش و شہت کا یہ عالم ہے کہ صبح
 کی علامتیں ناپید ہیں، صرف ایک نشان رہ گیا ہے اور وہ ٹھیک جونی شمع ہے۔
 اندھیرے کی شدت واضح کرنے کے لیے جس شے کو صبح کی دلیل ٹھہرایا، یعنی شمع
 کو، وہ خود بھی ہوئی ہے، یعنی اندھیرے کے تصور میں اضافہ کرتی ہے۔

۲۔ لغات۔ آشتی : صلیح۔

شرح : اب نہ محبوب کی طرف سے وصال کی خوشخبری آتی ہے نہ اس کے حسن و جمال کے نظارے کا کوئی موقع ہے۔ انہیں دو باتوں پر چشم گوش میں کشمکش رہتی تھی۔ دیدار نصیب ہوتا تو کالوں کو شکایت پیدا ہوتی وصال کی نوید ملتی تو آنکھیں بکھڑکتیں۔ دونوں باتیں نہ ہونے سے آنکھوں اور کالوں کے درمیان صلح کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نہ ایک کو شکوے کا موقع باقی نہ دوسرے کو گلے کا۔

۴۔ شرح : شراب کے نشے نے اُس محبوب کو شرم و حجاب سے نیاز کر دیا ہے، جسے ہر لحظہ آرائش کا خیال رہتا ہے۔ اسے شوق ! اس حالت میں جوش دھواں گم کر دینا اور ضبط و قرار کے بند ٹوٹ جانا بالکل جائز ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

۴۔ لغات - عقد : ہر

شرح : گوہر پہنچنے والے نے موتیوں سے جو ہار تیار کیا، وہ حسینوں کی گردن میں پڑا تو قابل رشک نظارہ پیدا ہو گیا۔ دیکھیے، گوہر پہنچنے والے کا ستارہ کتنی بلندی پر ہے !

بلندی اس لیے کہا کہ ہر حسینوں کی گردن میں پہنچ گیا جو ہر حال ایک بلند مقام ہے۔ رشک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گوہر فروزش نے جو ہار تیار کیا، وہ خود حسینوں کو پہنایا، گویا اس کے ہاتھ ان کی گردنوں میں حاکم ہوئے اور عاشق اس کے لیے ہمیشہ ترستے رہتے ہیں۔

۵۔ شرح : محبوب کے تصور کی محفل میں ایک شراب خانہ ہے، مگر ایسا، جس میں کوئی مہنگمہ اور کوئی ہاؤ ہو نہیں۔ اس شراب خانے میں دیدار کی شراب ملتی ہے، حوصلہ ساقی گری کا کام انجام دیتا ہے اور رنگا ہیں مست رہتی ہیں۔

مطلب یہ کہ تصور میں بھی محبوب کا دیدار نصیب ہوتا ہے، جتنا کسی

کا حوصلہ ہو، اس کے مطابق شراب مل جاتی ہے اور نگاہیں مست رہتی ہیں۔ یہاں تصور سے مراد مراقبہ بھی ہو سکتا ہے اور شعر محبوب مجازی کے بجائے محبوب حقیقی سے متعلق سمجھ سکتے ہیں۔

۶ - ۱۲۔ لغات : تازہ وارد : نیا تیا آنے والا۔

بساط : بزم کا فرش، یعنی بزم۔

ہوا کے دل : دل کی خواہش۔

زخماں : کلے تاکید، جو نفی اور اثبات دونوں کے لیے آتا ہے، یہاں اثبات کی تاکید مراد ہے۔

نا و نوش : نندہ اور شراب۔

دیدہ عبرت نگاہ : عبرت کی نظر رکھنے والی آنکھ، وہ آنکھ جو عبرت

حاصل کرے۔ عبرت سے مراد ہے خاص حالت میں طبیعت کا غفلت سے آگاہی کی طرف آنا، یعنی نصیحت حاصل کرنا۔

گوش نصیحت نبوش : نصیحت سننے والا کان۔

چنگ : ایک ساز، سازگی۔

سور : خوشی، شادمانی

شرح : اسے وہ لوگوں اور دل کی خواہشوں اور آرزوں کی مصل میں

نئے نئے آئے ہو اور نندہ و شراب کی طلب میں اندھے ہوئے ہو رہے ہو،

خبردار !

اگر تمہارے پاس ایسی آنکھ ہے، جو عبرت حاصل کر سکے تو مجھے دیکھو،

مجھ پر نظر ڈالو۔ اگر تمہارے پاس نصیحت سننے والے کان ہیں تو میری بات

سنو۔ میں نا و نوش کا تجربہ کر چکا ہوں اور میری باتیں گھر کے بھیدی کی حیثیت

رکھتی ہیں۔

ساتی جلوہ دکھا کر اور شراب پلا کر عقل و ایمان کو تباہ کر دیتا ہے۔ گانے والا

۔ گاکر اور نغمہ سنا کر ہوش اور وقار و تکنت کو نارت کر ڈالتا ہے۔ یعنی حسین و جمیل ساقی کے ہاتھ سے شراب پی جائے تو نہ ایمان باقی رہتا ہے، نہ عقل اور گانے والے کے فنون کی لت پڑ جائے تو عزت و وقار بھی ضائع ہو جاتے ہیں اور ہوش دھوکا ہو۔

پھر اس عیش و نشاط کی حالت کیا ہے؟ رات کو مجلس آراستہ تھی، تو فرش کا ہر گوشہ باغبان کے دامن اور پھول بیچنے والے کے ہاتھ کی طرح پھولوں سے بھرا ہوا نظر آتا تھا۔

ساقی کی خوش خرامی ایسا پُر لطف نظارہ پیش کرتی تھی، گویا نگاہ کے لیے جنت کا منظر پیدا ہو گیا تھا اور سارنگی کی سُر ملی آواز میں اتنی لذت تھی، گویا کانوں کے لیے فردوس آراستہ ہو گیا تھا۔

یہ تو رات کی کیفیت تھی، لیکن صبح کو دیکھتے ہیں تو محفل میں مدوہ سرور و شادانی نظر آتی تھی، مدوہ ہوش و خروش سناٹی دیتا تھا۔

مجلس درہم برہم ہو چکی تھی، اس کی بساط الٹ گئی تھی۔ جو صبح رات بھر جلتی رہی تھی، وہ گل ہو چکی تھی، گویا رات کی ہنگامہ آرائی سے عروسی کا ایک داغ بن کر رہ گئی تھی۔

پورے قلعے میں دو منظر پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا اس وقت کا، جب مجلس کی رونق عروج پر تھی، دوسرا اس وقت کا، جب ساری رونق اور چہل پہل ختم ہو چکی تھی، نشانے اور بھوکا عالم باقی رہ گیا تھا۔ مولانا طباطبائی نے بالکل درست لکھا ہے، آخر کے دو شعر اس سبب سے زیادہ بلیغ ہیں کہ ان کا اثر گونگی خاطر ہے اور جو گونگی و اشہ کے بعد ہو، اثر قوی رکھتی ہے۔

۱۱۔ لغات - مسریر خامہ : وہ آواز جو کھٹے وقت قلم سے پیدا ہوتی ہے۔ قلم سے مراد کلمک ہے، جس سے غالب کے زمانے میں لکھا جاتا تھا۔ انگریزی قلم یا انڈی پنڈنٹ نہیں۔

نواسے سروش : لڑتے کی صدا ۔

شرح : اسے غالب ! تیرے خیال میں طیب سے معنوں آتے ہیں اس لیے تمام مطالب غیب سے تجھ پر القا ہوتے ہیں ، گو یا تیرے قلم کی آواز فرشتے کی صدا ہے ۔

آ ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے طاقتِ بیدار انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنتِ سیاتِ دہر کج بے نشہ بہ اندازہِ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو ہمارے ہاں کہ رونے پر اختیار نہیں ہے
ہم سے حبث ہے گمانِ نجشِ خاطر خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہمارے صافی غیرِ گلِ آئینہ بہار نہیں ہے
قتل کا مرے کیا ہے عہدِ توابعی داسے ! اگر عہدِ استوار نہیں ہے
تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب ! تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱۔ **شرح :** اسے محبوب ! اٹھو جلد آ ، کیونکہ میری جان کو صبر و قرار نہیں وہ مدد و رجحانِ بیاب و مضطرب ہے ۔ تیرا انتظار ایک بہت بڑی مصیبت ہے ۔ اس مصیبت کی سختیاں اور پریشانیاں برداشت کرنے کی عہد میں طاقت نہیں ۔

۲۔ **شرح :** اس دنیا میں جو عہدِ درخ اور اندوہ و قلق کا ایک طوفانی سمندر ہے ، زندگی گزار چکنے کے بعد جنتِ جلد میں ملے گی ، لیکن جنت ان عہدوں اور مصیبتوں کی تلافی کر سکے گی ، جو ہم نے اس دوسرے زمین پر برداشت کیں ؟ جنت کا نقشہ ایسا نہیں ، جو فیوضِ زندگی کے خمار یعنی نشہ اترنے کی تکلیفوں اور اذیتوں کے زخموں کا مرہم بن سکے ۔

صرف نشے کا عادی ہی صحیح اندازہ کر سکتا ہے کہ جب نشہ ٹوٹتا ہے تو جہانی اور دہنی اعتبار سے اس پر کیا قیامت گزرتی ہے ، جتنا سخت خمار ہو ،

اگر اسی کے مطابق شراب نہ لے تو تکلیفیں دُور نہ مہر سکیں گی۔ یہی حقیقت اس شعر میں پیش کی گئی ہے۔ دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تنہا بہشت و نبوی زندگی کی مصیبتوں کا پورا بدلہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ محبوبِ حقیقی کی جہانِ فانی بھی ہونی چاہیے۔ قرنی حُجّت ہمارے شمار کی تلافی نہ کر سکے گی۔

فارسی میں بھی یہ خیال پیش کیا ہے :

حُجّت نہ کند چارہٴ افسردگی دل

تعمیرِ اندازہٴ ویرانی ما نیست

ہیباں ہمیں رنج و کدورت اور دل گرفتگی کے جن اسباب سے سابقہ پڑا رہا۔ ان کی تلافی حُجّت نہیں کر سکتی۔ ہم ہیباں جتنی بربادی سے دوچار ہوئے ہیں، تعمیرِ نو کا انتظام اس کے مطابق نظر نہیں آتا، یعنی حُجّت کی آبادی اس دنیا کی ویرانی کا بدلہ نہیں ہو سکتی۔

۳۔ شرح : اے محبوب ! میں تیری محفل میں پہنچتا ہوں تو تیرے تغافل اور بے اعتنائی پر بے اختیار آغوش نکلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے جبراً نکال دیا جاتا ہے۔ ضبط و صبر پر مجھے اختیار ہوتا تو نہ روتا۔ افسوس کہ اختیار نہیں ہے۔

رونے پر محفل سے نکالے جانے کی کوئی وجہ مرزا نے بیان نہیں کی، اسے مبہم چھوڑ دیا، کیونکہ ہر فرد کے رونے کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ عیش و نشاط کی بزم میں کسی کا رونا بالکل بے محل ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ رونے سے محبوب کی رسوائی ہوتی ہے۔ تیسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ محبوبِ رقیبوں پر جبراً ہے اور عاشق صادق سے بے اعتنائی برتا ہے۔

۴۔ شرح : اے محبوب ! ہمارے متعلق یہ گمان بالکل بیجا ہے، کہ ہمارا دل آپ سے کٹ رہا ہو جائے گا، کیونکہ ہم تو سچے عاشق ہیں اور سچے عاشقوں کی مٹی گر و غبار سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ پھر ہمارا دل کٹ رہا

ہونے کا کون سا امکان ہے ؟

دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ خاطر سے مراد خاطر محبوب لی جائے۔ اس
موضوع پر مبنی یہ ہوں گے : ہمارے متعلق یہ گمان بھی نہیں کہ ہماری کسی
بات سے آپ کے دل میں کدھر پیدا ہوگا ، کیونکہ ہماری خاک میں تو خبار ہے
ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو آپ کا دل میلا ہو جانے کا بھی احتمال باقی رہتا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ ”خاک“ طہینت کی جگہ لایا گیا ہے
لیکن فطرت محاورہ ہے۔ موجودہ صورت میں شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم مرث
کو خاک بھی ہو جائیں گے تو اس سے خبار نہ بنے گا ، جو آپ کا دل کدھر ہونے
کا باعث ہو۔

۵۔ شرح : اے مخاطب ! تیرے پاس دل ہے تو ہماری معنی آرائیوں
کے جلوں سے لطف اٹھا۔ ان جلوں کی حیثیت فضلِ بہار کی سی ہے اور بہار
کا آئینہ پھول کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس طرح بہار کی حقیقی کیفیت پھول میں
نظر آتی ہے۔ اسی طرح دل بہار سے کئے ہوئے حقائق سے ٹھیک ٹھیک استفادہ
کر سکتا ہے۔

۶۔ شرح : محبوب نے میرے قتل کا پختہ وعدہ تو کر لیا ہے۔ افسوس !
اگر یہ وعدہ عمل میں پختہ ثابت نہ ہوا۔ اس طرح محبوب کے نامعلوم قتل ہونے
کا ارمان دل ہی میں رہ جائے گا ، کیونکہ اس ارمان کا پورا کرنا عہد کی استواری
پر موقوف ہے۔

۷۔ شرح : قسم کھانا ، حلف اٹھانا ، کسی چیز کی قسم کھانا ، کسی چیز
کو چھوڑ دینے کا عہد کرنا۔

۸۔ مطلب یہ ہے کہ اے غالب ! تو نے شراب چھوڑ دینے کی قسم کھائی
ہے ، لیکن تیری قسم کا اعتبار کیا ہے ؟ کون کدھر سکتا ہے کہ کب شراب چھوڑے اور
کب پھر بنی شروع کر دے۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اے غالب ! تو نے میکشی کا حلف
اٹھا یا ہے ، اپنے یا چھوڑ دینے کا بالمشروع کوئی ذکر نہیں ، جب تیری قسم مختلف

بلکہ متغادر پہلو بیٹے ہونے سے تو اس پر اعتبار کیسے ہو سکتا ہے ؟

۱۔ شرح :
غم خیل و رخیل اور
فوج و رفوج آ رہے
میں اور معلوم ہے کہ
غم کی حالت میں
انسان کا سر بے اختیار
جھک جاتا ہے۔ مرزا
ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
لکہ تار دامن و تار نظر میں فزق مشکل ہے
رفوے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
مجھ پر موت کہ پاس درو سے دیوانہ غافل ہے
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غائب
چکنا خنچہ و گل کا صدائے خندہ دل ہے

کا سر ہجوم غم کے باعث اتنا جھکا کہ دامن کے سرے پر پہنچ گیا۔ گویا دامن سے
ٹپکے ہوئے تار اور تار نگاہ میں فزق کرنا مشکل ہو گیا۔

۲۔ شرح :
میں اپنے زخموں کو ٹانگے لگوا رہا ہوں۔ میرا دماغ
نہیں کہ زخم بھر جائے، بلکہ ٹانگے لگانے میں سوئی سے جو زخم ہوں گے، ان کی
لذت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مجھ کو دلوانے کو درد کے مزے
کا کوئی خیال نہیں رہا اور اس سے غافل ہو گیا ہوں۔

یہ مضمون مرزا پہلے بھی باغداد چکے ہیں، مثلاً :

زخم سلوانے سے مجھ پر چادر جوئی کلبے طعن

غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

۳۔ شرح : اے غائب ! میرا محبوب جس باغ میں جلوہ فرما ہو وہاں
کلیوں کے چککنے کو دل کے پہننے اور باغ باغ ہونے کی آواز سمجھنا چاہیے

۱۔ شرح:

میں صحرائے چکر کاٹ

رہا تھا۔ پاؤں میں

اتنے کانٹے چبھے کہ

جے بس ہو کر بیڑیا

اور کانٹے نکالنے کے

لیے پاؤں زانو بد

رک گیا، جہاں دامن

پنہا ہوا تھا۔ اگر

زانو کو آئینہ سمجھ لیا

پا پو دامن ہو رہا ہوں، بس کہ میں صحرائے زانو

خار پا ہیں جو ہر آئینہ زانو مجھے

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے بعد

ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ

ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

ہائے تو میرے پاؤں کے کانٹے اس آئینے میں جو ہر معلوم ہوتے ہیں۔

اس شعر کے سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اول صوفیہ کے

نزدیک سر زانو پر مراقبے میں رکھا جاتا ہے۔ چونکہ مراقبے میں عالم علوی سے فیض

حاصل ہوتا اور دل چلا پاتا ہے اور اس لیے زانو کو اصطلاح صوفیہ میں آئینہ

کہنے لگے۔ دوم کانٹے نکالنے وقت پاؤں زانو پر رکھا جاتا ہے تاکہ تمام کانٹوں

کا پتہ مل جائے اور انہیں نکالنے میں سہولت ہوتی ہے۔ مرزا نے صوفیہ کی اصطلاح

کے مطابق زانو کو آئینے سے تشبیہ دی، چہر کانٹوں کو اس آئینے کے جوہر بنا دیا۔

جیسا کہ پہلے بار بار عرض کیا جا چکا ہے، آئینے سے مراد توہری آئینہ نہیں، بلکہ

فولادی آئینہ ہے۔

۲۔ شرح: محبوب سے ہم بغل ہونے کے بعد میرے دل کی حالت

دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ محبوب کے جسم کا بال بال مجھے ایسی نگاہ معلوم ہوتا

ہے، جو میری دلی کیفیتوں سے آگاہ ہو۔

ہم آغوشی نصیب ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ محبوب کے جسم کا بال بال نگاہ و آستان بن جائے۔

۳۔ شرح : میں ایسا ساز ہوں جس میں گلوں اور شکووں کے درگ بھرے ہوئے ہیں۔ اسے محبوب ! میرے بارے میں کچھ نہ پوچھو۔ بہتر یہی ہے کہ جب لوگ صبح ہوں تو توڑ بجے نہ پھیرے۔ پھیرے گا تو ساز بجنے لگے گا، گلوں اور شکووں کا ایک سیل امٹنے لگے گا۔

۱۔ لغات کا لہجہ :
قلب اٹھا نچا۔
صورت دیوار :
دیوار پر بنی ہوئی تصویر
شرح : اسے محبوب !
تو جس مقل میں تاز وادوا
سے بولنے لگے ادواں
تیری جاں بخشوں کے
اعجاز سے ان تصویروں
کے قالب میں جان پڑ
جائے جو دیوار پر بنی
ہوئی ہوں۔
یہاں گفتگو محبوب کی
جاں بخشی کا اظہار مقصود

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کا لہجہ صورت دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس تیرے دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب ناز گراں مانگی اشک بجا ہے
جب لخت جگر دیدہ عوینار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کھستگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
اس چشمِ صنوں گر کا اگر پاسے اشارہ
طوطی کی طرح آشنہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
 اک آبلہ پا داوی پڑ غار میں آوے
 مریاؤں نہ کیوں رشک ہے جب وہ تن نازک
 آغوشِ خم حلقہ زنار میں آوے
 غارت گر ناموس نہ ہو گر ہو س زار
 کیوں شاہر گل باغ سے بازار میں آوے
 تب پاک گریباں کا مزا ہے دلِ تاداں
 جب اک نفس الہیا ہوا ہر تار میں آوے
 آتش کدہ ہے سینہ مرادِ انہاں سے
 لے دانے! اگر معرِ اظہار میں آوے
 گنجینہ معنی کا طلسم اُس کو بھیجے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ہے اور ناز سے گفتار
 میں آنے کا مطلب ہرگز
 یہ نہیں کہ جب محبوب
 ناز و انداز سے گفتگو
 کرے گا تو ایسا ہو گا۔
 مقصود ہے کہ محبوب
 جب بھی ہوتا ہے،
 ناز ہی سے ہوتا ہے
 گویا یہ اس کی ایک
 مستقل صفت ہے۔
 اس کی کوئی بات ناز
 سے خالی ہو ہی نہیں
 سکتی۔ اس مستقل صفت
 کے پیشِ نظر "ناز"
 کا لفظ مشاعر کو مزوری
 معلوم ہوا۔

۲۔ شرح :

اے محبوب! تو دلکش

و دلآویز قامت کے ساتھ باغ میں آجائے تو سرورِ صنوبر جنیں اپنی بلند قامتی پر
 ناز ہے سائے کی طرح ساتھ ساتھ پھرنے لگیں۔

دراخت رہے کہ شاعر نے محبوب کے لیے قدر و دلکش کا لفظ استعمال کیا۔ اس
 سے یہ ظاہر کہ مقصود ہے کہ محض بلندی قامت کوئی خوبی نہیں، قد آستانہ ہی
 بلند ہونا چاہیے، جبنا کہ موزونیت کے باعث دل کو مہلائے، نرمی بلند قامتی معنی

اوقات نازیبا بن جاتی ہے۔

مولانا علیا علیائی فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں سے "کالفظ" محجب لطف رکھتا ہے اور بڑے محاورے کا لفظ ہے اور مصنف پہلے شخص میں جس نے اس مقام پر سے "استعمال کیا، دوسرے شاعر اس طرح استعمال کیا کرتے ہیں :

۱۔ اس قد کو اگر لے کے تو گلزار میں آدے

۲۔ لغات - گراں مایگی : بیش بہا ہونا۔

شرح : آنسو کے لیے بیش بہا ہونے کا فخر اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے، جب جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہو رونے والی آنکھ سے بہنے لگے، یعنی وہ آنسو کس کام کا، جس میں جگر کا ٹھونہ ہو۔

مرزا نے ایک اور جگہ بھی کہا ہے :

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں تھاکے

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر ہو کیا ہے

۳۔ شرح : اے ظالم محبوب ! مجھے لگے شکوے کی اہانت دے دے تاکہ تجھے میرے رستے میں کچھ مزہ بھی آئے۔

مطلب یہ کہ میں شکایت کروں گا، تجھے یہ پتا چلے گا کہ تیرے ہاتھوں دکھ اٹھانے کا معاملہ کہاں تک پہنچ گیا ہے یا کدہ شکوہ میں کہ تجھے غصہ آئے گا اور غصے میں مجھ پر سختی کرے گا۔ یہ قاعدہ ہے کہ نظم و ستم کا معاملہ اسی وقت بڑے لطف بنتا ہے، جب ایک طرف شکایت ہو اور دوسری طرف سختیاں کی جائیں۔ اگر سختیوں کو چپ چاپ صبر سے برداشت کر لیا جائے تو کچھ لطف نہ ہوگا۔ اس معاملے میں گرمی اور ہنگامہ خیزی صرف لگے شکوے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

مولانا علیا علیائی فرماتے ہیں کہ اس زمین کا حاصل اس شعر میں آگیا۔

۵۔ شرح : اگر محبوب کی جاود بھری آنکھ کا اشارہ پاتے تو آئینہ طوطی کی طرح بولنے لگے۔

طوطی آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر بولنے لگتا ہے۔ محبوبوں کی آنکھیں اشاروں میں باتیں کرتی ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ میرے محبوب کی آنکھ کے اشارے سے آئینہ طوطی بن جائے۔

ہاں چشم منوں گر یعنی جاود بھری آنکھ اس لیے کہا کہ طوطی کی طرح آئینے کا بول اٹھنا خلافت عادت و اقتد ہے اور یہ جاود کے بغیر ممکن نہیں۔
۶۔ لغات - آبلہ پا : وہ شخص جس کے تلے چھالوں سے بھرے ہوں۔

شرح : اے اللہ! کانٹوں بھری داوی میں ایک ایک کانٹے کی زبان پیاس کے مارے خشک ہو گئی ہے۔ کسی ایسے شخص کو بھیج جس کے تلے آبلوں سے لبریز ہوں تاکہ وہ اس میں پھر نکلے اور آبلوں کے پانی سے کانٹوں کی پیاس بجھ سکے۔

اس شعر کی خوبیاں خاص توجہ کی محتاج ہیں، مثلاً :
”کانٹوں کی زبان سوکھ گئی“ کہ کر اُن کی وضع و حیثیت کا نقشہ بہترین انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ان کی فزیکس دیکھ کر بھی معلوم ہوتا ہے کہ زبانیں خشک ہو کر نکیل ہو گئیں۔

۲۔ عام نباتات کو سیراب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جڑوں میں پانی چھوڑ دیتے ہیں، لیکن کانٹوں کو اس طرح پانی نہیں دیا جاسکتا ہے۔

۳۔ ان کے لیے سیرابی کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ سوکھی ہوئی زبانیں تھوڑی سی اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ جس کے تلوں میں چھلکے ہوں وہ ان کانٹوں پر پھرنکلے۔

۷۔ شرح : محبوب کا نازک جسم زتار کی آغوش میں دیکھا تو فرمایا کہ

میں رکھ سکے کیوں نہ مریاؤں؟ وہ جسم میری آغوش میں آنا چاہیے تھا، مذکر
اُس دھاگے کی آغوش میں، جو گریبا برہمن باندھتے ہیں اور اسے ذمبب کا
ایک خاص نشان سمجھتے ہیں۔

”خیم حلقہ“ زتار کا مطلب ہے زتار کے حلقے کا خیم۔ زتار باندھتے
ہیں تو کندھے پر اسے خم دیا جاتا ہے، اسی کو خیم حلقہ قرار دیا۔

۸۔ لغات۔ زر : یہاں اس کے دو معنی ہیں، اول وہ زرد سا
زیرہ، جو پھول کے اندر ہوتا ہے، دوم مال، دولت اور قیمت۔

شرح : اگر مال دو دولت کی حرص عزت و ناموس کی بربادی کا باعث
نہ ہوتی تو پھول کا محبوب باغ چھوڑ کر بازار میں کیوں آتا۔

مطلب یہ کہ پھول کے لیے اول زندگی ہوس یوں ظاہر ہوتی ہے کہ
جب وہ کھلتا ہے تو اندر سے زیرہ نکل آتا ہے۔ گویا اس نے ہاتھ میں زرد
رکھ لیا ہے۔ دوم وہ پکنے کے لیے باغ سے بازار میں جاتا ہے۔ یہ بھی الٹ
کی ہوس ہے، جو اس کی رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ اگر وہ غنچے کی طرح
بند کا بند رہتا تو نہ اس کے اندر کا زیرہ نمایاں ہوتا، نہ بازار میں پکنے کی
نوبت آتی۔ اس سے یہ سبق حاصل ہوا کہ زندگی ہوس انسان کے لیے سوائی
کا باعث ہوتی ہے اور اس کی عزت و ناموس برباد کر دیتی ہے۔

۹۔ شرح : اسے بے خبر اور حقیقت ناشناس دل! گریباں تار تار کرنے
کا مزہ اُس وقت آسکتا ہے، جب ہزار میں ایک سانس الہیا ہوا ہو۔ یعنی
ہزار کے ساتھ سانس کھپا ہوا آئے اور دم نکل جائے۔
تار گریباں اور تارِ نفس کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

۱۰۔ لغات۔ معرض : ماضی عرصہ یعنی وہ جگہ، جہاں کوئی چیز پیش ہو
معرضِ اظہار سے مراد ہے کہ کسی چیز کا اظہار میں آنا، یعنی ظاہر ہونا۔

شرح : میرے سینے میں ایک ایسا چٹپا ہوا جھید ہے، جس کی گری

سے سینہ آتش کدہ بن گیا ہے، یعنی اس میں سراسر آگ و دھبہ رہی ہے۔ اگر یہ داندھا ہر سو جانے تو خدا جانے کہاں کہاں آگ لگے اور کیا قیامت برپا ہو !

۱۱۔ شرح : اسے غالب ! میرے شعروں میں جو بھی لفظ آتا ہے، اسے معنی کے خزانے کا ایک غلم سمجھنا چاہیے۔ مین لفظ لفظ میں معنی کے خزانے غلم کے ذریعے سے جبرویہ گئے ہیں۔ جب تک کوئی شخص وہ غلم توڑ کر اصل خزانے تک نہ پہنچے، میرے اشعار کی حقیقت اس پر واضح نہیں ہو سکتی۔

مولانا طیب لہستانی فرماتے ہیں :

”گنجینہ اس سبب سے ہے کہ معانی کثیر اس میں ہیں اور غلم اس سبب سے ہے کہ پہلو بھی اس میں کئی نکلتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ غلم مشکل سے نکلتا ہے اور حیرت انگیز ہوتا ہے۔ اسی طرح کلام میرا مشکل سے حل ہوتا ہے اور معانی سے اس کے حیرت پیدا ہوتی ہے۔ غرض لفظ کی تشبیہ غلم سے بنائیت بدیع ہے۔“

۱۔ شرح :

خواہ مائی فرماتے ہیں :

”دوسرے مصرع

میں دعویٰ متعشق و میل

ہے۔ معشوق کو

میرا خود شید جہاں اس

یہ کہتا کہ اس کو

باوجود کامل پر ترجیح دینے

کی وجہ پیدا ہو جانے

حسن مر گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے

اس سے میرا میر خود شید جمال اچھا ہے

بلوہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ

جہی میں کہتے ہیں کہ صفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغر جہم سے مرا جام سفال اچھا ہے

اگرچہ چاند او کا دل یعنی
بددین جانے تو بہت اچھا
معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میرا
چاند جس کا حسن و جمال
سورج کا سا ہے، بد
سے بہتر ہے۔

خواجہ خاں مرزا ہی
چمکے ہیں "اپنے محبوب کو
میر خورشید جمال اس لیے
کہا کہ او کا دل پر اس کی
وقتیت واضح ہو جائے۔
جس طرح چاند پر سورج
کی وقتیت واضح ہے۔

۲۔ تشریح :
شعراء عموماً بوسے کو
دل کی قیمت قرار دیتے ہیں
مرزا فرماتے ہیں کہ میرے
محبوب کی نظر میرے دل
پر بھی پڑی ہے۔ اسے
اڑا لینا پاتا ہے، لیکن
اس کی قیمت ادا کرنے،

بے طلب دیں تو مرزا اس میں سوا لگتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوشے سوال اچھا ہے
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ار کا حال اچھا ہے
دیکھے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن میثے نے مرزا کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جوں جوں جاتے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ آل اچھا ہے
خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کسے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب خیال اچھا ہے

یعنی بوسہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ بظاہر اس نے دل میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ
اگر مفت بل جائے، یعنی بوسہ دے بغیر دل ملے تو اچھا مال ہے اور مرزا

سے لینا چاہیے۔

مولانا طاباطبائی فرماتے ہیں کہ دل کا بوسے پر پکا قبضل مضمون ہے، لیکن یہاں محاورے کی خوبی اور جہدش کی ادا نے اس مضمون کو تازہ کر دیا۔

۳۔ لغات۔ ساغرِ حجم : جمشید کا پیالہ۔ جمشید ایران کا مشہور بادشاہ تھا۔ کہتے ہیں، شراب اسی نے ایجاد کی۔ اس کے ساغر کی ایک خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس سے زمانے کی خبریں مل جاتی تھیں۔

جامِ سفال : مٹی کا پیالہ۔

شرح : شعر کی شرح ہے پیشتر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شاعر کے سامنے چند پرہیزگارانہ تھے جو کسی ثبوت کے محتاج نہ تھے، مثلاً :

۱۔ اسے معلوم تھا کہ مٹی کا پیالہ نہایت بے حقیقت چیز ہے۔

۲۔ معلوم تھا کہ ساغرِ حجم بہت بیش قیمت اور نایاب تھا۔ دنیا میں وہ ایک ہی پیالہ تھا، عام اوصاف کے علاوہ اس اعتبار سے بھی اس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ معلوم تھا کہ مٹی کے دس ہزار پیالے بھی جمع کر لیے جائیں تو وہ ساغرِ حجم کی برابر ہی نہیں کر سکتے۔

ہر اس ہمدرد نے مٹی کے پیالے کی برتری کا ایک ایسا پہلو پیدا کر لیا، جس سے عقل سلیم کو ایک لمحے کے لیے بھی اختلاف نہیں ہو سکتا اور غالباً مرزا کی اس حقیقت بانی سے پیشتر کسی کو برتری کے اس پہلو کا کوئی احساس بھی نہ تھا۔ مرزا نے صرف یہ سوچا کہ پیالے سے شراب پی جاتی ہے اور شراب نوشی کے لیے ساغرِ حجم اور ساغرِ سفال دونوں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ جامِ سفال ٹوٹ جائے تو فوراً ہر شخص بازار سے لاسکتا ہے، ساغرِ حجم ٹوٹ جانے پر قلعہ کا بدلہ ہی نہیں مل سکتا، لہذا۔ جامِ سفال۔ ساغرِ حجم سے بدتر جہاں برتر ہے۔

پھر مرزا کے نزدیک اصل شے شراب نوشی ہے۔ پیالہ خواہ کیسا ہی ہو۔

وہ خود عاری کی ایک غزل میں فرماتے ہیں :

نشاطِ جم طلب از آسمان نہ شوکتِ جم

قدحِ مباحثِ ذی قوت بادہ گر صبی ست

یعنی آسمان سے جمید کی شان و شوکت نہیں، صرف اس کے عیش و نشاط

کی آرزو کرنی چاہیے اگر پیالہ یا قوت کا نہیں تو کیا پروا ہے، شرابِ خالص انگوری
ہونی چاہیے۔

بلکہ وہ تو پیالے کے بھی محتاج نہیں اور کہتے ہیں۔

پلاوے اوک سے ساقی! جریم سے نفرت

پیالہ گر نہیں دیتا اندوے، شراب تو دے

۴۔ شرح : جس فقیر کو سوال کی عادت نہ ہو، وہی احتیاج ہوتا ہے،

کیونکہ مانگے بغیر مل جائے تو اس میں مزہ زیادہ آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریبی
یہی ہے کہ ہر شخص کو بے طلب دیتا ہے۔

سوال کی عادت پڑ جائے تو انسان ذاتی شرف کے احساس سے محروم

ہو جاتا ہے اور اس کائنات میں انسان کی اصل محتاج وہی شرف ہے، جو ہر
چیز پر مقدم رہنا چاہیے۔

۵۔ شرح : خواہرِ عالیٰ فرماتے ہیں :

اسی کے قریب قریب سعدی کا بھی ایک شعر ہے :

گفتہ بودم چو بیانی، غمِ دل با تو بگویم

چہ بگویم کہ غمِ از دل بود، چوں تو بیانی

دو وزن سعدی اور غالب کے شعروں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح

اپنی تکلیف یا رنجِ معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے، مگر سعدی کے

بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی غائبی

بد حالی دیکھ کر سمجھ جائے کہ اس کا دل مغموم ہے، کیونکہ سعدی کے

بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے طرحات
رہتا ہے ، نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے ، مگر مرزا کے
بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا ۛ

محبوب کے آنے سے دل کو ایسی خوشی اور بشارت ہوتی ہے کہ رنج و غم
کا کوئی اثر چہرے پر باقی نہیں رہتا ۔ اس کے برعکس رونق و تازگی آ جاتی ہے ۔
یہ حالت دیکھ کر محبوب سمجھ لیتا ہے کہ میرے بیلو عشق کا حال اچھا ہے ۔
اس سلسلے میں سعدی کا شعر پیش کرنا غالباً مناسب نہیں ، خواجہ حاتم نے اس
میں جو احتمال بتایا ہے ، اس سے مرزا کا شعر پاک ہے ۔ اگر کسی معنوں کو کوئی استاد
پہلے پیش کر چکا ہے اور اس میں کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہے ، بعد کا شاعر اس تشنگی کو
بوجہ احسن دہر کر دیتا ہے تو ہمیں الفضل للمتقدم کہہ کر اس کی حقیقت کم نہ کرنی
چاہیے ۔ متقدمین نے بہت سے معنوں باندھے ، لیکن ایسے مضامین بھی ہیں جو
ان کے ہاں ٹھیک نہ بندھ سکے ۔ متاخرین نے ان مضامین کے حسن میں بھی اضافہ
کیا اور ان کی بندش بھی بہتر سے بہتر نادی ۔ ایسے موقع پر عری ہی کا قول صحیح ہے ۔
اول رہ ویں نظم خود ایشان بسپر وند

پس باز نمودیم بہم منزل بہم را
یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر متاخر محض تاخر ذاتی کی بناء پر ہر مقدم سے گویا
نہیں لے جا سکتا ۔

ۛ - شرح : خواجہ حاتم فرماتے ہیں ۔

- گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں
ہیں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتا ہے تو اس کے لیے
یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان
جو جائے ، نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وہ نہیں آئے گی ۔
یا لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ ۛ

مہینے کے نزدیک زمانے کی اچھائی اور خوشگوار سی کامیاب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عاشقوں کی کون کون سی مرادیں پوری ہوں گی۔

۷۔ شرح : فریاد کو سنگ تراشی کے سوا اور کیا آتا تھا ؟ اسی سنگ تراشی کی بدولت اسے شیریں سے بات چیت کا موقع ملا۔ سنگ تراشی کا نشان تیشہ تھا۔ گویا تیشہ فریاد و شیریں کے درمیان بات چیت کا ذریعہ بنا۔ اس بنا پر یہ اصول وضع کر لیا کہ کمال کسی بھی فن میں حاصل کیا جائے، وہ بہر حال اچھا ہی ہوتا ہے۔

۸۔ لغات : کمال : انجام، نتیجہ۔

شرح : جس کام کا انجام اچھا ہو، وہ بہر حال اچھا ہوتا ہے، کیونکہ کام سے مقصود محض کام نہیں، بلکہ خاص نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں پیش کی کہ قطرہ دریا میں مل جائے تو خود دریا بن جاتا ہے۔ دریا میں مل کر دریا بن جانا، نتیجہ ہے اور ایک قطرے کا دریا بن جانا نتیجہ اور انجام کی اچھائی کا بڑی ثبوت ہے۔

جن اصحاب نے شعر کے پہلے مصرع کو اصل مقصد قرار دے کر دوسرے مصرع کو اس کی دلیل بنایا، میرے نزدیک وہ غلطی میں مبتلا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مصرع کے ہم معنیوں اشعار دیوان غالب میں دیکھ کر ان کی توجہ راہ راست سے ہٹ گئی۔ پہلا مصرع صرف مثال ہے۔ مقصود شعر دوسرا مصرع ہے۔

۹۔ لغات : خضر سلطان : بہادر شاہ ظفر کا ایک بیٹا،

جسے ظالم بادشاہ نے شہزادہ میں شہزادہ مرزا افضل اور شہزادہ

مرزا ابوبکر کے ساتھ دہلی دروازے کے باہر گولی سے شہید کر دیا

خداوند بہادر اور ملک رام صاحب کا بیان ہے کہ شہادت کے

وقت پچیس سال کی عمر تھی۔ گویا خضر سلطان ۱۷۳۷ء کے آمل بنے۔

پیدا ہوا۔

نعر و مرزا کی طرح خضر سلطان بھی مرزا غالب کا شاگرد تھا۔
اچھے شعر کہتا تھا۔ مجموعہ کلام شمس کے ہنگامے میں تلف ہو گیا
صرف چند شعر تذکروں میں رہ گئے۔

تازہ نہال : نیا پودا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ غزل خضر
سلطان کی پیدائش پر لکھی گئی تھی۔ چونکہ پہلے مصرع میں خالق اکبر
سے بظاہر اکبر شاہ ثانی کی طرف بھی اشارہ ہے، جو اس وقت
بادشاہ تھا، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ شعر واقعی خضر سلطان
کی پیدائش پر لکھا گیا تھا اور یہ غزل ۱۳۳۲ء یا آس پاس کی ہوئی
چاہیے۔

اس صورت میں ایک بحث یہ بھی آئے گی کہ آیا شاہ سے
مقصود بہادر شاہ ظفر ہیں، جو اس زمانے میں ولی عہد تھے اور ان
کی ولیعہدی خاصی متزلزل چلی آ رہی تھی یا شاہ سے مقصود
اکبر شاہ ثانی ہیں ؟

شرح : شعر دعائیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑا ہے، شہزادہ
خضر سلطان کو سرسبز رکھے ! بادشاہ کے باغ میں یہ نیا پودا بہت اچھا ہے۔
خضر، سرسبز، باغ، تازہ اور نہال کی مناسبتیں محتاج تشریح نہیں۔

۱۰۔ شرح : اسے غالب ! جنت کا جو عام تصور ہے، یعنی باغ، نہریں
خوریں وغیرہ، اس کی حقیقت ہمیں معلوم ہے، البتہ اس مضمون کے خیالات دل
خوش رکھنے کے لیے بڑے اچھے ہیں۔

شعر میں مرزا نے جنت کے متعلق صرف عام افکار کا ذکر کرتے ہوئے
ہیں دل خوش رکھنے کا ذریعہ قرار دیا۔

۱۔ شرح : اسے

محبوب ! اگر میرے مرنے سے
تیری تسلی نہیں ہوئی، اس
امتحان میں سے سرخرو نہ لکنا
تیرے لیے تسکین کا سامان
نہیں بن سکا، بعد از مرگ کی
امتحان باقی رہ گیا ہے تو اس
کا انتظام بھی کرے تاکہ تیرے
اطمینان میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

جان دے دینے کے
بعد مزید امتحان کیا ہو سکتا
تھا ؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ
لاش کو بازوؤں میں گھسیٹا
جاتا یا جلا کر خاکسراڑا دی
جاتی۔ شاعر کا مقصود ہے
کہ موت اس دنیا میں سب
سے بڑا امتحان ہے جو کسی
فرد کو پیش آ سکتا ہے، لیکن

نہ ہوئی گرمی مرنے سے تسلی نہ ہو
امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ ہو
خارِ غارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوقِ گلچینِ گلستانِ تسلی نہ ہو
مے پر پستانِ خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا خم میں ساقی نہ ہو
نفسِ بقیں کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہِ خانہِ یلّٰ نہ ہو
ایک مہنگا مے پر موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہِ خم ہی سہی نعمۂ شادی نہ ہو
نہ تالش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ ہو
عشرتِ صحبتِ خواباں ہی قیمتِ بھجو
نہ ہوئی غالب ! اگر عمرِ طبعی ، نہ ہو

اگر محبوب کے نزدیک اس کے بعد بھی کوئی امتحان باقی رہ گیا ہو تو پتے عاشق کو اس میں ایک لمحے کے لیے بھی تاقل نہ ہو گا۔

پھر یہ محض خیال نہیں، بلکہ حق پرستی اور انسانیت دوستی کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ جاننا دلوں نے جانیں دیں، اس کے بعد ان کی لاشوں سے نہایت نازیبا سلوک روا رکھا گیا۔ یہ شعرا ایسے ہی حقائق کا آئینہ ہے۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں: اس شعر پر اگر غالب خدا سے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو خدا گواہ ہے کہ دیا ہے۔ پھر دیکھیے تو، نہ فنِ معانی کی کوئی خوبی ہے نہ فنِ بیان کا کچھ حسن ہے، نہ فنِ بدیع کے تکیفات ہیں۔

۲۔ **شرح:** اگر میرا شوق تلی کے باغ سے پھول نہیں چن سکا تو نہ سہی۔ محبوب کے دیدار کی حسرت کا جو غم ہے، اس کا غار راز تو موجود ہے۔ سادہ لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر شوق کی تسکین کا سامان ہم نہیں پہنچا تو بچے عاشقوں کے لیے حسرت دیدار کا غم تو موجود ہے۔

۳۔ **شرح:** شراب پینے والے دوستو! اگر ایک دن محفل میں ساتی نہیں آیا، جو بادی بادی جام بھر بھر کر دیتا اور ہم شراب پیتے تو کچھ مہمان نہیں کیوں نہ ہم شراب کے شگے ہی کو منہ سے لگائیں، اس کے بغیر چارہ ہی کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ شراب نوشوں کا گزارہ شراب پینے بغیر ہو ہی نہیں سکتا ساتی موجود نہ تو وہ ترتیب سے ایک ایک کو خاص پیمانے کے مطابق چلائے گا، لیکن اگر ساتی موجود نہیں تو تقسیم کا معاملہ خارج از بحث ہے۔ اس کے سوا چارہ نہیں کہ شگے ہی کو منہ لگا لیا جائے، یعنی جتنی شراب کوئی پینا چاہتا ہے، پیتی ہے۔

اس شعر میں خاص پہلو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر محفل اور ہر وارے کی تنظیم مرکزی شخصیت پر موقوف ہوتی ہے۔ شراب کی محفل میں ساتی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تمام شراب نوش اسی کے لطف و کرم پر نظر رکھیں گے۔ اگر مرکزی

حسیت موجود ہو تو ترتیب و تنظیم ختم ہو جائے گی۔ ہر فرد بے ترتیبی سے جو چاہے گا، کرے گا، مثلاً شراب کی محفل میں پیمانے کے مطابق پینے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، ہر شخص تنگے کو منہ لگانے کے لیے مضطرب رہے گا۔

۴۔ لغات - سیاہ خانہ میل : میلی کا سیاہ گھر۔ یہ اس لیے کہا کہ عام روایت کے مطابق میلی کا خیر سیاہ رنگ کا تھا اور خود میلی نام بھی میل سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا رنگ کا بھی سا نولا تھا۔ مولانا روم نے مثنوی میں ایک جگہ لکھا ہے کہ عقیقہ نے میلی کو نکا کر دیکھا تو وہ چنداں خوب صورت نہ نکلی۔ پوچھا : کیا تو ہی وہ میلی ہے جس کے لیے مجنوں سرگرداں پھر رہا ہے ؟

از ہر خوباں تو افروز نیستی

گفت : خامش شو تو مجنوں نیستی

(تو تمام حسینوں سے بڑھی ہوئی نہیں۔ میلی نے کہا : چپ رہ، تو مجنوں نہیں) شرح : مجنوں کا وجود صحرا کے لیے چشم و چراغ ہے، یعنی صحرا جیسے بے رونق مقام میں پوری رونق صرف مجنوں کے دم سے ہے۔ اگر میلی کے سیاہ خیمے میں اسے شمع کی حیثیت حاصل نہ ہوئی تو نہ سہی۔ مطلب یہ کہ مجنوں کو میلی کی بزمِ ناز میں مستقل مایہ نہ ملا تو کچھ پروا نہیں۔ اس کے دم سے بیابان میں رونق کا ہنگامہ گرم ہے۔

۵۔ شرح : گھر کی رونق صرف ایک ہنگامے پر موقوف ہے۔ اگر مسرت و شادمانی کا نغمہ نصیب نہیں تو کیا معنائی ہے ؟ علم کا نور ہی سہی۔

کوئی شبہ نہیں کہ اس عارضی اور نا پائدار زندگی میں انسانوں کو مختلف حالات پیش آتے ہیں۔ بعض کو یکے بعد دیگرے شادی و غم دونوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بعض پوری زندگی عیش و نشاط میں گزار دیتے ہیں، بعض کو رنج و غم سے ایک لمحہ کے لیے بھی فراخ نصیب نہیں ہوتا۔ حقیقت پر نظر رکھنے والے عارف ایسی چیزوں سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ شادی و غم دونوں کو بیچ مانتے

ہیں اس زندگی میں دل ملی کے لیے کسی ایک کا وجود ضروری ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ اگر ہمیں خوشی نصیب نہیں ہو سکتی تو غم ہی ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ گھر میں رونق کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا مسرت کا ہنگامہ بپا ہوا غم کا۔ مسرت و شادمانی پر بھی لوگ جمع ہوں گے۔ غم و الم اور رنج و ماتم کے موقع پر بھی مجدد و جوم کر کے آئیں گے۔ اس طرح رونق کا انتظام ہو جائے گا۔ اگر دونوں چیزیں نہ ہوں تو کسی کے لیے آنے کا سبب کیا ہو سکتا ہے اور رونق کا انتظام کیونکر ہو گا؟

۶۔ شرح : اگر میرے شرفا فیوں کے نزدیک معنی سے خالی ہیں تو ہوں۔ نہ یہ آرزو ہے کہ کوئی میری تعریف کرے، نہ یہ خیال ہے کہ کہیں سے صلہ ملے۔

اگر کوئی فرد اپنی کسی چیز کے لیے ستائش کی تہا اور صلے کی پدا سے بے نیاز ہو جائے تو اس امر کی کیا ضرورت باقی رہ سکتی ہے کہ دنیا اس کی چیز کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے ؟

مولانا شبلی نے بھی اس سلسلے میں ایک نہایت پر معاملہ شعر کہا ہے : یعنی :

ازدرد و از قبول تو خارج نشست ایم

اے آنگہ خوب ماہ شناسی ز درشت ما

جو شخص کسی فرد کی اچھائیوں اور برائیوں میں امتیاز نہ کر سکے، اس کے رویا

قبول کی پدا کیوں ہو ؟

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے ”آپ حیات“ میں بعض تنک باہ

لوگوں کی داستانیں لکھتی ہیں، جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ لوگ مرزا کے کلام کو بے معنی سمجھتے تھے۔ خود بھی ستائش ایسے انداز سے کی ہے، جس میں تعریف کا پہلو صاف نمایاں ہے۔ ساتھ ہی لکھا ہے کہ کلام پر ایسے اعتراضات ہوئے،

”تو اس ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیم سخن کا بھی بادشاہ تھا“

اپنی غزال کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا :

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی ، نہ سہی

۷۔ لغات - عمر طبعی : عمر کا عام پیمانہ جو پہلے ایک سو بیس

سال سمجھا جاتا تھا، اب پچھتر اور اسی کے درمیان مانا جاتا ہے۔

شرح : اسے غالب ! اگر ہمیں دنیا میں عام پیمانے کے مطابق زندگی

بسر کرنے کی فرصت نہ مل سکی تو کچھ مضایقہ نہیں۔ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ

ہمیں حسنین کی صحبت میں دن گزارنے کی شادمانی نصیب ہوئی۔

مطلب یہ کہ عمر طبعی کی آرزو نہیں، اصل آرزو یہ ہے کہ حسنین کی صحبت

مقبول رہے۔

۱۔ شرح :

ہم اس خوشی

سے جلاؤ کے

آگے آگے جا

رہے ہیں کہ سر

کا سایہ پاؤں

سے دو قدم

آگے ہے۔

خوشی قتل پہننے

کی ہے۔ اور

آفتاب چلنے والے

کی پشت پر ہو

عجب نشاط سے جلاؤ کے چلے ہیں ہم آگے

کہ اپنے سائے سے سراپاؤں سے بے دو قدم آگے

تصانے تھا مجھے چاہا خراب بادہ الفت

فقط ”خراب“ لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی

وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دین

کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیوں اٹھاتی ہیں ہم نے
 تمہارے آئینوں سے طرفہ ہائے غم بہ غم آگے
 دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجبِ غم ہے
 ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے
 قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے میں غالب
 ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے
 تو اس کا سایہ پاؤں سے آگے رہتا ہے
 شعر میں غریب کا ایک پہلو یہ ہے
 کہ قتل میں سرکشا ہے اور سر ہی کو پاؤں
 سے دو قدم آگے ہوتا ہے۔
 بجنوری مرحوم فرماتے ہیں:

”جب آفتاب و سہرہ کی پشت کی جانب ہوتا ہے تو سایہ سامنے پڑتا
 ہے۔ مرزا دو پہر کے قریب مقتل میں جانے کے متعلق اپنا شوق لیا
 بیان کرتے ہیں کہ میرا سر پاؤں سے دو قدم آگے آگے ہے۔ اس
 کیفیت کو ہر شخص نصف النہار کے بعد خود دیکھ سکتا ہے۔“

۲۔ شرح : قضا و قدر کی مرضی یہ تھی کہ مجھے شراب باوۃ الغت (شراب
 محبت میں بدست) رکھتے۔ صرف ”خراب“ کا لفظ ظلم سے نکلا تھا، آگے کچھ لکھا
 نہ گیا۔ یقیناً اس لیے نہ لکھا گیا کہ ”خراب“ لکھنے کے ساتھ ہی قضا و قدر کے ظلم
 پر بدستی طاری ہو گئی۔ گویا مرزا آفتاب خراب باوۃ الغت ہونے کے بجائے
 صرف خراب، تباہ حال اور بدست ہو کر رہ گئے۔

۳۔ شرح : زمانے نے ہمیں جو رنج و الم پہنچائے، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ
 نشاءِ عشق کا نشہ ہی بہر ہو گیا اور ہم عشق سے جو طعنت اٹھاتے تھے، اسی باقی
 نہ رہا۔ جب تک وجہی مصیبتیں ہم پر نازل نہیں ہوئی تھیں، ہم محبت کے غم
 سے خوب مزے لیتے تھے۔

اس شعر میں ”آگے“ پر معنی ”پیشتر“ استعمال ہوا ہے۔

۴۔ **شرح :** عشق کی دیوانگی نے ہمارا جو حال کر رکھا ہے، خدا کے لیے اس کی داد دیجیے۔ یہ کتنا عجیب معاملہ ہے کہ محبوب کو خط لکھ کر قاصد کے حوالے کر دیتے ہیں، لیکن بیتابی و اضطراب میں قاصد سے پہلے محبوب کے روانے پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہ کوشہ محبت کی دیوانگی کا ہے۔ دیوانگی کا تقاضا ہی ہے کہ جو حرکت ہو وہ عقل و فہم سے عاری ہو۔ اب ظاہر ہے کہ خط لکھ کر نامہ بر کے ہاتھ بھیج دیا تو خود محبوب کے پاس دوڑے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے نہ بھویے، یہ جنونِ شوق ہے اور حتیٰ یہ ہے کہ جنون کے جو مظاہر جان ہوئے، وہ مرزا غالب ہی بیان کر سکتے تھے۔

۵۔ **لغات :** طرۃ ہائے خم بہ خم : بیچ در بیچ زلفیں، تاجدار گیسو۔
تمہارے آگے آنے : بددعا ہے، مثلاً عموں کہتے ہیں : ”جو کچھ تم نے کیا ہے، وہ تمہارے آگے آنے“۔

شرح : اے محبوب کی بیچ در بیچ زلفوں! ہم نے تمہارے لیے عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں، خدا کرے، وہ سب تمہارے آگے آئیں، یعنی تم ہمیشہ پریشان رہو۔

دیکھیے۔ بظاہر بددعا دی، لیکن زلفِ محبوب کے لیے اس سے بہتر دعا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ہمیشہ پریشان رہے، کیونکہ پریشانی زلف کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑا حق ہے۔

۶۔ **لغات :** زعم : گمان۔

شرح : دل اور جگر میں خون کی ایک لہر تڑپ رہی ہے، جسے ہم پیشتر اپنے گمان میں سانس سمجھے ہوئے تھے۔

مطلب یہ کہ ہمارے سینے میں سانس نہیں، بلکہ خون کی ایک لہر ہے جو اسی طرح پھر رہی ہے، جس طرح پوندہ پر پھڑپھڑاتا ہے۔

مولانا علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ دل کا تعلق تو سانس سے ہے، مگر مگر میں سانس کہاں؟ سانس پھیپھڑے میں جوتا ہے، لیکن پھیپھڑا یا اس کا غاری شش یا عربیہ ریه قیوں غیر فیصحتھے، لہذا شاعر نے ان کی جگہ جگہ رکھ لیا کہ محض اندرون شے کو بھی جگہ کہتے ہیں۔

۴۔ تشریح : اسے غالب! جن لوگوں کو بیشتر مجھ سے اتنی محبت تھی کہ میری جان کی قسم کھاتے تھے، وہ میرے جنازے پر نہ آنے کی قسم کھاتے ہیں، یعنی آنے سے انکار کر رہے ہیں۔

مطلب یہ کہ بیشتر افراد زندگی میں انسان سے انتہائی محبت کے باوجود مرنے کے بعد اس سے یکایک بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہ عام تجربہ ہے، خصوصاً ہمارے دور میں، کیونکہ یہ دور سراسر مادہ پرست اور نفع باز ہے چونکہ مرنے کے بعد انسان سے بظاہر کوئی مادی فائدہ اٹھانا ممکن نہیں رہتا، اس لیے بے تعلقی اختیار کر لیتے ہیں۔ مرزا کے زمانے میں بھی عام حالت ایسی ہی تھی۔



۱۔ تشریح :
سیرا بے ہر محبوب
شکوے کے نام سے
خفا ہوتا ہے۔ وہ
نہیں چاہتا کہ اس
کے ظلم و جور بے اتفاقی
اور تغافل کے بارے
میں کچھ زبان پر لایا
جائے۔ اتنی بات
بھی مجھے زبان پر

شکوے کے نام سے بے ہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کیسے تو گلا ہوتا ہے
پڑہوں میں شکوے سے یوں داگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو
شکوہ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ لکوک کی رہ چال
 سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
 کیوں نہ ٹھہریں دہنِ ناوک بیدار کہ ہم
 آپ اٹھا لاتے ہیں گریزِ خطا ہوتا ہے
 خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
 کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
 نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا ادب
 لبِ لبک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے
 خامہ میرا کہ وہ ہے بارِ بد بزمِ سخن
 شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے
 اے شہنشاہِ کواکب سپہِ دہرِ مسلم!
 تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
 ساتِ اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
 تو وہ لشکرِ کاترے نسلِ بہا ہوتا ہے
 ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے بلال
 آستانِ چترے مدنا صیہ سا ہوتا ہے

نہ لانی چاہیے کیونکہ
 یہ بھی گلے ہی کی
 ایک صورت ہے۔

۲- میں گلے

لکوک سے اس
 طرح بھرا ہوا ہوں
 جیسے باجا راگ سے
 بھرا ہوتا ہے۔ اُسے

پھیرتے ہی نئے
 نکلنے لگتے ہیں۔ مجھے

بھی ذرا چھیر کر تماشا
 دیکھیے۔ گلے لکوک سے

کیونکہ شروع ہو جاتے
 ہیں اور شروع ہو

جائیں گے تو ان کا
 سلسلہ ختم ہی نہ

ہوگا۔

یہ معنوں میں
 نے ایک اور شعر

میں بھی لاندھا ہے:

گون سر اسدا بانیگ شلایت
 جی ہی ہنر کو دوانی نہ جی نہ آہی

میں جو گستاخ ہوں آئیں غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیںو غالب ! مجھے اس تلخ نوائی میں معنا
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

۳۔ لغات :
حسنِ تلافی ہمہ
طریق پر بلا دینا ۔
کسی کام کے سر انجام میں
کوئی کمی یا غای رہ جانے
تو اسے بہتر طریق پر پورا
کر دینا ۔

شرح : اگرچہ میرا محبوب کسفی یا سادگی کے باعث میرے شکووں
اور گلوں کا مقصد نہیں سمجھتا ، لیکن حسنِ تلافی ملاحظہ کیجیے کہ میں جب کبھی اس
کے ظلم و ستم کی شکایت کرتا ہوں تو وہ پہلے سے زیادہ ظلم و ستم شروع کر دیتا ہے ۔
حسنِ تلافی سے ظاہر ہے کہ عاشق کا مدعا مزید ظلم و جور کے سوا کچھ نہیں
محبوب اس حقیقت کو نہیں سمجھتا ، تاہم جب کبھی شکایتیں سنتا ہے تو مدعا کبھی
بغیر مزید جور شروع کر دیتا ہے ۔

یہ مسنون بھی مرزا غالب نے ایک اور جگہ باندھا ہے :
نالہ تجز حسن طلب اسے ستم ایسا ہوا ! نہیں
ہے نعمان سے جفا ، شکوہ بیداد نہیں
م۔ لغات ۔ مکوکب : تاروں بھرا ۔

شرح : عشق کے راستے میں ستاروں بھرے آسمان کی چال ایسی
ہے ، جیسے وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہے ، جس کے پاؤں چھالوں سے بھرے
ہوئے ہوں ۔

آسمان کو تاروں بھرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تارے آبلوں سے مشابہ
ہوتے ہیں ۔ گویا آسمان کے تارے بھی دراصل تارے نہیں ، بلکہ اس کے پاؤں
کے چھالے ہیں ۔

۵۔ لغات ۔ بدف : نشاء

ناوک : تیر

شرح : ہم ظلم کے تیر کا نشانہ کیوں نہ بنیں ؟ اگر کوئی تیر نشانہ پر نہیں
بھیٹتا اور خطا ہو جاتا ہے تو ہم خود اسے اٹھا لاتے ہیں اور ناوک انداز کے حوالے
کر دیتے ہیں۔ یوں وہ سمجھ جاتا ہے کہ ہمیں اس کا نشانہ بننے کی انتہائی اُردو ہے۔

۶۔ شرح : ہماری قسمت کے ستارے کی خواست کا یہ حال ہے کہ
ہم بھلا کرنے کے خواہاں رہتے ہیں اور اس سلسلے میں انتہائی کوشش کرتے
ہیں، لیکن نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ گویا ہم جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا، بلکہ
اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر کیا اچھا ہونا کہ ہم
مشروع ہی سے اپنے بدخواہ بن جاتے۔ چونکہ ہر چیز ہماری خواہش کے
خلاف ہوتی ہے، اس بنا پر اپنی بدخواہی یقیناً بھلائی کا سبب بن جاتی۔

۷۔ شرح : پہلے میری مزید و فغان میں اتنا زور تھا کہ وہ عرش
سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔ اب یہ کیفیت ہے کہ کسی مزید میں زیادہ سے
زیادہ مصافی کی کوتاہی تو وہ سب تک آتی ہے، ورنہ اکثر آپس میں سینے ہی میں رہ
جاتی ہیں۔

۸۔ ۱۲۔ لغات : باربد : خسرو پرویز شہنشاہ ایران کا
مشہور درباری گویا، جو شیراز کی سمت کاربہنے والا تھا۔
کونکب سپہ : جس کی فوج ستارے ہوں یا شمار میں ستاروں کے برابر
فوج والا۔

میر غلام : سورج کے جھنڈے والا یا وہ جس کا جھنڈا یا پرچم سورج
جیسا ہو۔

راکرام : عزت، توقیر، بخشش، عطا۔

نعل بہا : فارسی محاورے میں وہ رقم جو کسی حملہ آور کو ملک سے اپس
کرنے کے لیے ادا کی جائے۔ اسے بدیں و بہر نعل بہا کہتے ہیں کہ وہ حملہ آور کے

گھوڑوں کے نعلوں کی قیمت ہوتی ہے۔ نعل بندی کی رقم کو بھی کہہ سکتے ہیں۔
 ناصیہ سا۔ پیشانی، گھٹنے والا۔

شرح : میرے تلم کو شعر کی محفل میں غسور پرویز کے مغنی کی حیثیت حاصل ہے، جس کا نام داربد تھا۔ اب میرا تلم غزل کو چھوڑ کر بادشاہ کی درج میں یوں نغمہ زور ہوتا ہے۔

اے شہنشاہ! جس کی فوج ستارے اور جس کا علم سورج ہے یا جس کی فوج ستاروں کے برابر اور جھنڈا سورج جیسا ہے، تو نے جس جس کو عزت و توقیر بخشی اس کا حق کون ادا کر سکتا ہے؟

اگر سات دلا توں یعنی پوری دنیا کی آمدنی اکٹھی کر لی جائے تو وہ رقم تیرے لشکر کے گھوڑوں کی نعل بندی کی اُجرت ہوگی۔

ہر مہینے پورا چاند ہلال رہتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ تیری دہلیز پر پیشانی بکھتا رہتا ہے یعنی پیشانی گھٹتے گھٹتے چاند کی گودائی روتہ رفتہ ختم ہوتی رہتی ہے، ایسا نہ کہ وہ صرف ہلال رہ جاتا ہے۔

میں نے غزل کہتے کہتے درج شروع کر دی، گو یا غزل کے دستور کی پابندی نہ کرتے ہوئے گستاخی سرزد ہوئی۔ یہ بھی تیرے ہی مصلحت و کرم کا کرشمہ ہے، جو مجھ میں درج کا ذوق جدید بڑھاتا رہتا ہے۔

۱۲۔ لغات۔ تلخ توانی۔ وہ باتیں کتنا اجڑ چکی ہوں۔ درد بھرے نغمے پائے

شرح : اے غالب! میں درد بھرے نغمے الپ رہا ہوں۔ لیکن معافی کا خواستگار ہوں۔ انیس سن کر بے مزہ نہ ہونا۔ کیونکہ مجبور ہوں۔ آج میرا دل بہت ڈھکی ہے۔



ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ ”تو کیا ہے“
 ا۔ شرح : اے محبوب! میں جو بھی بات دہن پر لاتا
 تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

ہوں، اگر دینے ہو، تو کوئی ہے؟
تیری کیا حقیقت ہے؟ خود ہی
فراد کہ آخر بات حیات کا یہ کرنا
طریقہ ہے؟

چاہیے یہ کہ بات اعلیٰ
سے سنی جائے، اس پر حوزہ
کیا جائے۔ اگر اس میں واقعی
کوئی خامی ہو تو کوئی دیا جائے کہ
یوں نہ ہو، لیکن یہ کیا طریقہ
ہے کہ سنتے ہی بول اٹھے، تیری
کیا ہستی ہے؟

۲۔ مشرح جب

میں چاہتا ہوں کہ محبوب کو شعلہ
سمجھ لوں تو سوچتا ہوں کہ شعلے
میں تو وہ کرشمے نہیں ہو سکتے
جو اس شعلہ میں ہیں۔ پھر جانتا
ہوں کہ اسے بجلی قرار دے لوں
مگر بجلی میں اس کے سے عشوے
اور ادوا نہیں کہاں پائی جاتی ہیں؟
اگر وہ شعلہ شعلہ شعلہ نہیں،
بجلی نہیں تو خدا کے لینے بناؤ
وہ ہے کیا؟

۳۔ لغات -

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادوا
کوئی بناؤ کہ وہ شعلہ شعلہ شعلہ کیا ہے؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگر نہ خوفِ بد آموزیِ عدد کیا ہے؟
چپک رہا ہے بدن پر لبو سے پیرا من
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کُردیتے ہو جواب را کہ حُب تجو کیا ہے؟
دگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لٹو کیا ہے؟
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشتِ عزیز
سوائے باوہِ گلغام و مشکبو کیا ہے؟
پیوں شراب اگر تخم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پر کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

ہوا ہے شہ کا صاحب پھرے ہے اترتا
بد آموزی : بری
باتیں سیکھانا، غلط راستے
پر ڈالنا۔

شرح : اسے محبوب اتم و قیب سے باتیں کرتے ہو۔ اس بات کا تو کوئی ٹکڑ
نہیں کردہ تھیں بڑی باتیں سکھا دے گا یا غلط راستے پر ڈال دے گا، کیونکہ تم کسی کے
چلنے میں آہی نہیں سکتے، البتہ یہ رنگ مارے غار ہا ہے کہ اُسے تم سے بات چیت کرنے
کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

۴۔ شرح : ہمارا پیرا بہن سو کی بدولت بدن پر چپک گیا۔ اب ہمارے
گرمیاں کا چاکہ رفق کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔

جسم سے خون نکل آئے اور اس میں کپڑا تر ہو جانے تو وہ خشک ہو کر اس طرح جسم
سے چپک جاتا ہے کہ اسے بمشکل الگ کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا ہو گا کہ زخموں پر پٹی باندھنے
میں تو ابتدا میں وہ بھی سو کی غمی کے باعث زخم سے چپٹ جاتی ہے۔
میرزا نے یہ مضمون غامضی کے ایک شعر میں بھی باندھا ہے :

ہو تن چسبید لازم از خم خوننا بہ پیرا بہن
خراش سینہ سطر بخیر شد چاکہ گرمیاں را

۵۔ شرح : سوزِ عشق نے جہاں جسم کو جلا دیا، وہاں دل بھی جل گیا ہو گا۔
اسے محبوب ! اب ساکھ کر دینے سے تمہارا مقصد کیا ہے ؟ اگر دل کی تلاش ہے تو بالکل
فصول ہے، کیونکہ وہ جسم کے جل جانے کی حالت میں محفوظ کیونکر رہ سکتا تھا ؟
۶۔ شرح : ہم اس لڑکے کا قافی نہیں، جو رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے ہمارے
نزدیک تو جو لڑکا لڑکے سے نہ چلے وہ لڑکیا ہوا ؟

مولانا طہطاہی فرماتے ہیں :

- شعراء اپنے غم دوست ہونے کا مضمون بہت کہا کرتے ہیں، مصنف نے اسے
نئے پلوسے کہا اور جس بندش و بے تکلفی اور انے اور بھی تکلف معافی کا بڑھادیا ہے۔

۷۔ **شرح :** جنت میں ہمیں بہت سی نعمتیں ملیں گی۔ ہر قسم کے پھلوں اور دوسری نعمتوں کے علاوہ چار قسم کی ہنریں کا ذکر تو خود قرآن مجید میں ہے ، مثلاً پانی کی ہنری ، جو گہڑا نہیں ، دودھ کی ہنری ، جس کا مزہ نہیں بدلتا ، صاف کیے ہوئے شہد کی ہنری اور شراب کی ہنری ، جو پیٹنے والوں کے لیے لذت کا باعث ہوں گی۔ مرزا فرحاتے ہیں کہ بہشت کی عام نعمتوں میں سے جس نعمت کی بدولت ہمیں عذیبہ ہے ، وہ شراب کے سوا کیا ہے ، جو پھول کی طرح سرخ ہو اور اس سے مشک کی پٹیں آئیں ، لذۃ اللشاربین ۔

۸۔ **شرح :** میں شراب کے دو پدمثلے دیکھ لوں تو پینا شروع کروں ۔ یہ صراحی ، پیالہ ، گوزہ اور سہو کیا حیثیت رکھتے ہیں ؟ انہی تھوڑی شراب دیکھ کر میرے دل میں پینے کا شوق جوش زن ہو سکتا ہے ؟

۹۔ **شرح :** اول تو ہم ضعف سے اس حالت کو پہنچ گئے کہ بات کرنے کی تاب و توان ہی نہ رہی اگر کچھ کہہ بھی سکتے ہوں تو کس اُمید پر کہیں کہ ہماری آرزو کیا ہے ؟

گویا محبوب نے عمر بھر تو بات نہ پوچھی ، یہاں تک کہ ہماری زندگی کا آخری وقت آ گیا اور ہونا بھی مشکل ہو گیا ۔ اب بھی حرفِ مطلب زبان پر لائیں تو اُمید کیا ہے کہ وہ توجہ سے سنا جائے گا ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

” اُت رے ضبط کہ آرزو میں کام تمام ہو گیا ، طاقتِ گفتار تک باقی ۔

ذہری ، اگر کبھی زبان سے حرفِ شوق نہ نکلا ۔ ہائے نا اُمیدی ! جس نے

عزیمِ مطلب کا خون کر کے دل کی دل ہی میں رہنے دی ؟ ”

۱۰۔ **شرح :** غائب کو بادشاہ کا مصاحب بنایا گیا ہے اور اس عزت پر وہ اترتا پھرتا ہے ، اور نہ خیر میں اسے کون پوچھتا ہے ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : ” شاعروں کے لیے ذرے کو آفتاب ، قطرے کو

دریا اور ادنیٰ کو اعلیٰ بنا دینا ایک متبذل معنوں ہے جسے حبلہ خیرہ میں لوگ کہا کرتے ہیں۔ مصنف کی افش پروازی کا نود و یکھے کو اس پر نے معنوں کو حبلہ خیرہ میں ادا کیا ہے؟

میں انہیں چھڑوں اور کچھ نہ کہیں چل نکلتے جوئے پیے ہوتے
 قمر جو یا بلا ہوا جو کچھ ہو کاش کے تم میرے لیے ہوتے
 میری قسمت میں غم گر آتا تھا دل بھی یارب اکئی دیے ہوتے
 آہی جاتا وہ راہ پر غالب کوئی دن اور بھی بھیجے ہوتے

۱۔ لغات - چل نکلتا : حد سے بڑھ جانا، تیز ہو جانا۔

شرح : تعجب کی بات ہے کہ میں انہیں چھڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں۔ اگر وہ نشے کی جانک میں ہوتے تو سرور مجھ پر برس پڑتے اور ایک ہنگامہ ہوا جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب شراب کے نشے میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اگر نشے کی حالت نہ ہو تو چھڑ چھاڑ کی بھی چنداں پروا نہیں کرتا۔

۲۔ شرح : میں نے مانا کہ تم قمر جو یا بلا ہوا آفت ہو یا قیامت ہو جو کچھ بھی ہو کاش میرے لیے اور صرف میرے لیے ہوتے۔

شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نے محبوب سے بات کی اور اپنی دلی آرزوؤں کا اظہار کیا۔ محبوب نے بے پروائی کے انداز میں کہہ دیا کہ تجھ سے عشق و محبت تو کرتے ہو، لیکن یہ بھی جانتے ہو کہ میں کیا ہوں؟ میں قمر ہوں، بلا ہوں۔ عاشق کہتا ہے کہ جو کچھ بھی ہو، مجھے منظور ہے، مگر صرف میرے بنے ہو۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک اسلوب بیان ہے جس میں ایک طرف محبوب کی تند خوئی، ہنگامہ آرائی اور بے پروائی کی تصویر کھینچی گئی ہے، دوسری طرف اپنے

انتہائی شوق و حسرت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ **شرح :** شعر کا ماحول مطلب یہ ہے کہ غم و الم کی مقدار اتنی بڑھ گئی جسے سنبھالنے کے لیے ایک دل کافی نہ تھا، بلکہ بہت سے دل ہونے چاہیے تھے۔ ایسے موقع پر تشریح اعلیٰ کے سوالات پیدا کرنا بالکل بے محل ہے۔ شاعر اپنا تاثر پیش کر رہا ہے اور اس کے لیے طریقہ ایسا اختیار کیا ہے جو بالکل طبعی اور فطری ہے۔ غموں کا تحمل دل کا کام ہے۔ شاعر کہتا ہے: میرے غموں کی فراوانی کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ اگر قصداً قدر نے غم کی اتنی بڑی مقدار میرے لیے مقدر کر دی تھی تو کاش مجھے دل بھی زیادہ دے دیتے جو کہ میں اس مقدار کو خفایت و لوہوں میں بانٹ دیتا اور ان کی برداشت ممکن ہو جاتی۔ یہ اسلوب سمداری زبان میں بالکل حق ہے کہ اتنا بدیع اور دلآویز ہے، جس کا لطف بیانی نہیں، صرف وجدانی ہے۔ مردہ۔ اسی طرح آنکھوں کے لیے بھی ایک جگہ ناکافی ہونے کا اظہار کیا ہے۔

ہے غم جگر جوش میں، دل لکھوں کے رونا
ہوتے جو کئی دیدہ خوشا بہ فشاں اور

۴۔ **شرح :** اسے غائب! اگر ہماری زندگی کچھ دن اور ساتھ دیتی اور محبوب کی طلب میں بدستور سرگرم رہتے تو وہ ضرور ہمارا اکٹھا مان لیتا۔ بظاہر اس شعر میں دو پہلو پیش کیے گئے ہیں اور دونوں متضاد ہیں۔ اول یہ کہ عام زندگی محبوب کو راہ پر لانے کے لیے کافی ثابت نہ ہوئی۔ اس باب میں مزید سہمی و کوشش کی ضرورت تھی، جو کچھ مدت اور جلیغے ہی کی بنا پر کی جاسکتی تھی۔ دوم یہ کہ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ محبوب ایسا نہیں کہ کتنا بالکل نہ مانے، البتہ منت سماجت کے لیے وقت زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے معاملہ امید و بیم کے درمیان معلق رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کی روش ایسی نہیں، جو بالکل مایوسی پیدا کر دے، اگرچہ ہماری زندگی میں وہ ہم پر مہربان نہ ہو۔

غیر نس محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
 خشکی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ تھکنڈے میں چرخ نیلی نام کے
 خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
 رات پی زمزم پرئے اور صبح دم دھوئے دھبے جامہ احرام کے
 دل کو آنکھوں نے چھنسا یا کیا مگر یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
 شاہ کی ہے غسلِ صحت کی خبر دیکھیے کب دن پھرں یہام کے
 عشق نے غالب نکلتا کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱۔ شرح : محفل سے مراد محبوب کی محفل ہے اور پیغام سے اشارہ پیغام طلب کی طرف ہے۔ یعنی اسے محبوب ! غیر تو تیری محفل میں بپ سا غزل کے بوسے سے ہے ہیں۔ گویا جام بھر کر شراب پی رہے ہیں اور ہم پیغام طلب کے لیے بھی تشنہ لب ہیں۔ یعنی بلا دے کو بھی ترس رہے ہیں۔

۲۔ لغات - خشکی : تباہ حالی، خستہ دل، بربادی۔

شرح : ہم اپنی بربادی و تباہ حالی کا لاکھ تم سے کیا کریں ؟ یہ تو نیلے رنگ کے آسمان کی حیلہ بازیوں، حیلاریاں اور رنگاریاں ہیں۔ یعنی ہم پر جو مصیبتیں آئیں وہ ہماری تقدیر میں تھیں۔ اسے محبوب ! تم سے ان کا کھلے ہو سکتا ہے ؟

۳۔ شرح : ہم ہر باتیں خط لکھتے رہیں گے۔ اگر کہنے کے لیے کوئی نئی بات نہ ہو، کیونکہ جو کچھ کہنا تھا وہ سب پہلے کہ چکے ہیں۔ ہمیں خط کے مضمون سے اپنی طرف سے نہیں صرف یہ پتا ہوتا ہے کہ تمہارا نام بار بار لکھیں، کیونکہ ہم اسی کے عاشق ہیں۔

۴۔ لغات - زمزم : کمپنیز کمزہ کا مشہور کنواں جو کبجے سے صرف چند گز کے فاصلے پر مسجد الحرام کے اندر واقع ہے۔ اس کا پانی پینا مسنون ہے۔ علاوہ بریں صحت کے لیے بے حد مفید ہے۔ لوگ پیے، ڈبے اور ڈبیاں بھر بھر کر بطور تبرک اطرافِ عالم میں لے جاتے ہیں۔

جامئہ احرام : احرام کے معنی ہیں اپنے اوپر حرام کر لینا۔ حج اور عمرہ کے موقع پر حرم پاک جانے کے لیے ایک خاص لباس پہنا جاتا ہے، جسے جامئہ احرام یا محض احرام بھی کہتے ہیں۔ یہ صرف دو چادریں ہوتی ہیں، ایک کمر میں باندھنے کے لیے، دوسری اوڑھنے کے لیے۔ ان میں سلاخی بالکل نہیں ہوتی، سرنگار کٹنا جاتا ہے۔ مختلف اطراف کے آدمی حج و عمرہ کے لیے جاتیں تو ہر طرف خاص مقامات مقرر ہیں، جہاں سے غسل کے بعد یہ لباس پہن لینا چاہیے ساتھ ہی ادا سے حج و عمرہ کے بعد جامئہ احرام اتارنے تک صاحبِ احرام پر خاص پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں اور اس سلسلے میں بعض جائز امور بھی معین وقت کے لیے ترک کر دیے جاتے ہیں۔

مشرح : رات بھر زمزم پر بیٹھے شراب پیتے رہے۔ صبح ہوئی تو اسی کے پانی سے جامئہ احرام کے دھتے دھو کر ذرا ترین حرم پاک میں شامل ہو گئے۔ بظاہر اس سے مقصود رندی نہیں، بلکہ یہ بتانا چاہتے ہیں، ہم نے ہر حال میں بے شمار گناہ کیے، لیکن حج کر کے ان گناہوں سے پاک ہو گئے، کیونکہ حج تمام پچھلے گناہ دعو ٹھاتا ہے۔

۵۔ لغات - کیا : کیا، کس طرح، کیونکر۔

مشرح : دیکھیے، میری آنکھوں نے کس طرح میرے دل کو تمہارے عشق کے حال میں پیشا دیا۔ شاید میری آنکھیں بھی تمہارے ہال کے مچلتے ہیں۔

مطلب یہ کہ زمیری آنکھیں تھیں دکھتیں، مذلّٰی تھاری محبت کے چنبیہ وہ
 میں چنتا۔ آنکھوں کو تھارے جہاں کے حلقے اس لیے کتا ہوں کہ انھوں نے وہی
 کام انجام دیا، جو تھارا حلقہ گیسو انجام دیتا۔

۶۔ مشرح : افواہ ہے کہ بادشاہ نے بیماری سے شفا پائی اور غسلِ صحت
 کرنے والے ہیں۔ دیکھیے، تمام کے دن کب بھر ہیں، اس کی صحت کب سا زگار
 ہو اور اس کی تقدیر کو کب چار چاند لگیں!

بہادر شاہ جو ۱۰ مئی ۱۷۵۳ء میں صحت بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری نے طول
 کھینچا اور خامی صحت تک ان کی صحت کے بارے میں پریشانی رہی۔ شفا ہوئی
 تو غسلِ صحت کا انتظام کیا، مگر صحت کے باعث غسل ۲۱۔ صفر ۱۲۴۱ھ (۲۵ نومبر
 ۱۷۵۳ء) تک ملتوی رہا۔ بظاہر یہ غزل اگست یا ستمبر ۱۷۵۳ء کی ہے۔ یعنی شفا
 اور غسل کی درمیان مدت کی۔

۷۔ مشرح : اسے غالب! عشق نے ہمیں کسی کام کا نہ رکھا اور نہ ہم
 چنداں گئے گزسے نہ تھے۔ خود مرزا نے ہر گوپال تفتہ کو ایک خط میں یہ شعر
 لکھتے وقت تھوڑا سا تنقید کر دیا تھا۔ یعنی:

صنعت نے غالب تکا کر دیا

رایم الدین اتھو نے سیر وہی میں لکھا ہے کہ میں نے یہ شعر مرزا کے

سامنے پڑھا تو فرمایا: ”بھئی اچپ رہو، یوں کہو کہ:

صنعت نے غالب تکا کر دیا

یا

دہر نے غالب تکا کر دیا

عشق کیسا، عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔

(احوال غالب ص ۵۷)

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے ہر ماہ تماشا ٹی
 دیکھو اے ساکنانِ خطہ پاک! اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
 کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
 سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ٹی بن گیا روئے آب پر کا ٹی
 سبزہ و گل کے دیکھنے کیلئے چشمِ زگس کو دی ہے مینائی
 ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادِ پوشی ہے بادِ پیمائی
 کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب شاہِ دیندار نے شفا پائی

۱۔ شرح : یہ ایک مستقل نظم ہے جس کے تمام شعر مسلسل چلے جا رہے ہیں۔ پھر بہار ایسے دکاش اور دلاویز انداز میں آئی کہ آسمان پر چاند اور سورج اس کے تماشا ٹی بن گئے، یعنی اس سے نطف اٹھانے لگے۔

۲۔ شرح : اسے خطہ خاک یعنی زمین کے بننے والو ادنیٰ کی آرائش و زیبائش کہتے ہیں، مینا ہمارے آکر دنیا کے گوشے گوشے کو آراستہ کر دیا۔

۳۔ لغات - روکش : خرمندہ کرنے والا۔

چرخِ مینائی : چنے رنگ کا آسمان۔

شرح : زمین ایک سرے سے دوسرے سرے تک سبز ہو گئی اور نیلگوں آسمان کی سطح بھی اس کے سامنے شرمسار ہونے لگی۔

۴۔ شرح : سبزے کی کثرت کا یہ عالم ہوا کہ جب اس کے پے زمین پر کوئی جگہ باقی نہ رہی تو وہ پانی کی سطح پر کا ٹی بن گیا۔

۵۔ شرح : سبزے اور پھولوں کو دیکھنے کے لیے عام آنکھیں تو تھیں۔

جوش بہار نے رنگس کی آنکھ میں بھی پینائی پیدا کر دی۔

۶۔ لغات : باد و پیمائی : ہوا چاکلنا ، محاورے میں فضول اور حث کام کرنا۔

شرح : بہار کے باعث ہوا میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور شراب نوشی اب ایک فضول کام ہے یا ہوا میں چلیں پھریں تو شراب نوشی کا سوا حاصل ہوتا ہے۔

• باد و پیمائی کے دونوں معنی ایسے جا سکتے ہیں۔ اول بہار کی ہوا اس درجہ نشا انگیز ہے کہ بادہ نوشی کی محذرت نہیں رہی، کیونکہ ہوا میں شراب کی تاثیر موجود ہے۔ دوم یہ کہ ہوا کھانے کو نکلیں تو یہ بجائے خود بادہ نوشی ہے۔ گویا ہوا کھانا جی شراب پینا ہے۔

۷۔ شرح : اسے غائب ! دنیا کو کیوں خوشی نہ ہو؟ ہمارے دیندار بادشاہ کو اللہ نے اپنی رحمت سے شفا بخش۔

۱۔ لغات :

تغافل دوست : تغافل دوستانہ ہو میرا دماغ عجز خالی ہے
بے توجہی اور بے التفاتی
تغافل دوست : اگر پہلو تھی کیجئے ، تو جا میری بھی خالی ہے
کو پسند کرنے والا۔
پہلو تھی کرنا : رہا آباد عالم اہل بہمت کے نہ ہونے سے
کنارہ کشی اور علیحدگی
افتقار کرنا ، پرہیز کرنا۔
بھرے میں جس تعدد جام و سبلو میخانہ خالی ہے

شرح : میں توجہ کو نہیں، بے توجہی کو، تو امتنع کو نہیں، بے رشی کو پسند کرتا ہوں اور میرے عجز کا دماغ بہت بلند ہے۔ یعنی میری عاجزی اور کمزوری کا پایہ بہت اونچا ہے۔ اگر آپ مجھ سے محفل میں کنارہ کشی کریں اور بے التفاتی

برتن تو میری جگہ بھی آپ کے لیے خالی ہوگی۔

محفل میں جگہ خالی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تعظیم کے طور پر کسی کے لیے اپنی جگہ خالی کر دی جائے، یعنی آپ بے اتفاقی برتن تو میں بھی جگہ چھوڑ دوں گا۔ شعر کا پورا مضمون ”پہلو تھی“ اور ”ہا خالی“ کرنے پر مبنی ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں بے اتفاقی کو اپنے لیے تعظیم و تکریم کا باعث سمجھتا ہوں۔

یہ مضمون فارسی میں بھی ایک جگہ کہا ہے :

در آغوش تغافل عرض گیرنگی تو ابدین

نتی نامی کنی پہلو . ہ ما بنمودہ جارا

۲۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

”یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو، مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل بہت کا وجود ہوتا، جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا دیران ہو جاتی، پس جانتا چاہیے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل بہت مغفود ہیں۔ یعنی جس طرح میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میسر نہیں ہے، اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہل بہت مغفود ہیں۔“

اہل بہت سے مقصود ہے دنیا کو شکرانے اور اس سے بے نیاز رہنے والے لوگ، اگر ایسے لوگ موجود ہوں تو دنیا دیران ہو جاتی۔ چونکہ وہ آباد ہے، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اہل بہت ناپید ہیں۔ مثال اس کی یہ ہے کہ اگر شراب خانے میں پیالے اور شنگے شراب سے بھرے ہوئے موجود ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ شراب خانہ میخواروں سے خالی ہو گیا، کیونکہ اگر وہ موجود ہوتے تو جام و سبو

شراب سے بھرے کیونکر رہتے ؟

کب وہ سنتا ہے کہانی میری ؟ اور پھر وہ بھی زبانی میری
 خلش غمزہ خوریز نہ پوچھے ! دیکھ خوں ناپہ نشانی میری
 کیا بیاں کر کے مراد میں گے یار ! مگر آشفۃ بیاں میری
 ہوں زخود رفتہ بیدائے خیال بھول جانا ہے نشانی میری
 متقابل ہے مقابل میرا رُک گیا دیکھ روانی میری
 قدر سنگ سہرہ رکھتا ہوں سخت امڈاں ہے گرانی میری
 گرد باد رو بے تابی ہوں صرصر شوق ہے بانی میری
 دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی بیچ عانی میری
 کر دیا صغف نے عاجز غالب ننگ پیری ہے جوانی میری

۱۔ شرح : محبوب میرے عشق کی دردناک داستان سننے کا روادار کیا ہو سکتا ہے ؟ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ داستان میری زبان سے سُنے۔ جب اس داستان کا کسی کی زبان سے بھی سنتا لیکن نظر نہیں آتا تو خود میری زبان سے سُنے کی امید کیا ہو سکتی ہے ؟

مولانا علی گھانی فرماتے ہیں، مرزا غالب نے اس شعر میں سننے کے دو مرتبے پیدا کیے، اول عشق کی کہانی سنتا، دوم عاشق کی زبانی سنتا :

”یہ امر خوبی شعر کا باعث ہوا ہے اور معانی میں ایسی نادرک تفصیل

ہمیشہ لطف دیتی ہے۔ دوم سارے شعر کے الفاظ ایسے دست و پیراں

ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، پہلے ہی فکر میں دونوں مصرعے شکل آئے۔

۲۔ شرح : جب میری آنکھوں سے خون بنے کا سلسلہ جاری ہے تو

یہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے کہ غمزہ خوزین کی کھٹک کی کیا کیفیت ہے۔ جب

اس کیفیت کی گواہی سامنے موجود ہے تو پوچھنے کا کیا مطلب ؟ یہ سب کچھ تو

میری خوفناکی دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ شرح : دوست احباب میرے مرجائے کے بعد کون سی خصوصیت

یاد کر کے مجھے رزنیں گے ؟ اور تو مجھ میں کوئی خصوصیت ہے نہیں، صرف ایک

چیز ہے اور وہ یہ کہ دیوانگی اور پریشاں حالی میں وقتاً فوقتاً اُٹنی سیدھی باتیں

کرتا تھا، جن میں نہ کوئی ترتیب تھی اور نہ ان کا کوئی ٹھکانا تھا۔

عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی مرجائے تو عزیز اور دوست مرنے والے

کے نمایاں وصف یاد کر کے دوستوں میں اور تعزیت کی مجلس میں انھیں اور بات

کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ شاعر نے یہاں اپنی سب سے بڑی خصوصیت آشفٹہ بیانی

قرار دی۔

۴۔ لغات - بیدار : صحرا، جنگل، بیابان۔

شرح : میں خیال کے بیابان میں از خود رفتہ سوچکا ہوں، یعنی اپنے

آپ کو گم کر بیٹھا ہوں۔ میرا پتا نشان صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ احباب مجھے

بھول جائیں۔

۵۔ لغات - مُتقابل : متضاد، بالقابل، باہم مقابلہ کرنے والا۔

شرح : مقابل سے یہاں مراد محبوب ہے، ترک جانے سے مراد ہے

چُپ ہو جانا، خفا ہو جانا۔ روانی، لطیف گوئی، بزدلی، سخی۔

خود مرزا غالب نے عبدالرزاق شاکر کو اس شعر کی شرح یوں کہی ہے :

”مقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا ؛ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و کد“

وجود عدم۔ مقابل اس مصرع میں یہ معنی مرجع ہے، جیسے حربت کہ یہ معنی دوست کے بھی مستعمل ہے۔ معنوم شعر یہ کہ ہم اور دوست اذروئے خود عادت عند ہم دیگر ہیں۔ وہ میری طبع کی مدافنی دیکھ کر رک گیا۔

مطلب یہ ہے کہ میں اور محبوب عند ہم دیگر ہیں۔ میری طبیعت ذروں پر بدلتی۔ پے در پے لطیف گوئی اور بزل سخی سے کام لے رہا تھا۔ محبوب نے یہ کیفیت دیکھی تو چپ ہو گیا، یعنی بات چیت ترک کر دی۔ سمجھنا چاہیے کہ اسے میری طبیعت کی مدافنی پسندیدہ معلوم ہوئی اور ناراض ہو گیا۔

۶۔ لغات۔ گرائی : وزن میں بھاری ہونا، قدر و قیمت میں بلند پایہ ہونا۔

ارزاں : وزن میں ہلکا، قدر و قیمت میں بے حقیقت۔

شعر میں دونوں لفظوں کے دونوں معنی شاعر کے پیش نظر ہیں۔

شرح : خواہجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”میری قدر اُس پتھر کی ہے جو راستے کے سرے پر پڑا ہو اور ہر شخص اس پر آتے جاتے پاؤں رکھ کر گزرے، یعنی ہوں تو گراں قدر، مگر اُس پتھر کی طرح بے قدر ہوں۔ پس میری گرائی کس قدر ارزاں ہے“

جو پتھر راستے میں پڑا ہو، بھاری ہونے کے باوجود سمٹتے بے قدر ہوتا ہے۔ کیونکہ آنے جانے والے سب اسے پامال کرتے ہیں۔ وہی کیفیت مرزا غالب کی ہے کہ قدر و قیمت میں بڑھا ہوا ہونے کے باوجود بالکل بے حیثیت سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا نے یہ مضمون ایک فارسی شعر میں بھی باندھا ہے :

تاکس زتنومندی ظاہر نہ شود کس
چوں سنگ سرورہ کہ گران است و گران نیت

۷۔ لغات : گرد و باد : بگولا۔

صرصر : آندھی۔

شرح : میں بے تابی کے راستے میں بیچ و تاب کھانے والا بگولا ہوں۔

شوق کی آندھی مجھے وجود میں لانے کا موجب بنی۔

مطلب یہ کہ میں بگولے کی طرح بیکراہ ہوں، مجھے کسی پہلو بھی سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ چونکہ آندھی بگولا اٹھانے کا موجب بنی اور آندھی کے زور و قوت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا، لہذا میں بھی جب تک موجود ہوں، برابر بیکراہ رہوں گا اور مجھے سکون نصیب نہیں ہوگا۔

۸۔ لغات : پیچیدانی : کچھ نہ جانتا۔

شرح : شاعر عموماً محبوب کے مُنہ اور کمر کو تنگی اور باریکی میں کمال پر

پہنچاتے پہنچاتے بالکل بے وجود بنا گئے، یعنی بیچ اور بے حقیقت۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے محبوب کے دہن کا سراغ لگا تا جا ہاں تک بالکل ناکام رہا۔ اب دنیا پر آشکارا ہو گیا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔

اس شعر کا پورا مضمون لفظ ”بیچ“ پر مبنی ہے۔ چونکہ دہن ”بیچ“ ہے اور میں اس کا سراغ نہ لگا سکا، اس لیے پیچیدان بن گیا، یعنی ”بیچ نہ جانے والا“۔

۹۔ شرح : اے غالب! ضعف نے مجھ پر اس درجہ غلبہ پایا اور

مجھے اتنا عاجز کر دیا کہ میری جوانی بڑھاپے کے لیے باعثِ تنگ ہو گئی، یعنی

جوان ہونے کے باوجود اس درجہ ضعیف اور کمزور ہوں کہ بوڑھے بھی اس ضعف

کو اپنے لیے باعثِ تنگ جانیں۔

۱۔ لغات

آغوش کشائی :

کسی سے ہم بدل ہونے
کے لیے دونوں ہاتھ
بھیلاتا۔

شرح :

اے مجرب ! تیرے
باغ میں پہنچنے پر کلیں
طرحی سے پھولی نہیں

نہ نچنے کھلتے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ تجھ سے ہم بدل ہونے کے شوق میں رہے
ہے اب میں۔

۲۔ لغات۔ گنگرہ : وہ کٹے ہوئے طاقتور جو خوبصورتی کی غرض سے

قلعوں، فصیلوں اور دیواروں پر بنا دیتے ہیں اور جو انتہائی بلندی پر ہوتے ہیں۔
استغنا : بے نیازی، بے پروائی۔

شرح : ادھر محبوب کی بے نیازی کے بام کا گنگرہ زیادہ سے زیادہ

بلند ہو گیا رہا ہے، یعنی اس کی بے نیازی برابر بڑھتی جا رہی ہے، ادھر میری
مزید ولفاق کو یہ دعویٰ ہے کہ میں ہر بلندی پر پہنچ سکتی ہوں۔

مطلب یہ کہ محبوب تو زیادہ سے زیادہ بے پروا ہوتا جا رہا ہے اور نالے کو
دعویٰ ہے کہ میں تاثیر پیدا کر رہا ہوں۔

شعر میں لفظ "اٹا" عجب انداز سے استعمال ہوا ہے۔

۳۔ لغات۔ چشم نمائی : آنکھیں دکھانا، گھورتنا، غصے سے دیکھنا

تنبیہ۔
شرح : غم عاشق کو صبر و ضبط کی تعلیم دے رہا ہے۔ جو تیرا دل

پر چڑتا ہے، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس استاد کی طرف سے گھورتے اور تنبیہ کرنے کا
نشان ہے۔

”واجہ“ کی تشبیہ ”آئینہ“ سے محتاج تشریح نہیں۔

۱۔ لغات - نقش نامز بہت ہٹا ز بہ آغوشِ رفیب
نقش : تصویر۔ پائے طاؤس پئے خامہ مانی مانگے

ہٹا ز : رمز و کنایہ میں بات کہنے والا، نامز سے چھپنے والا، آشوخ، بیباک، مانی : ایک مشورہ مصدرا جو بابل کا بادشاہ تھا۔ کمالِ علم و فن کی بنا پر اس

نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ ملک سے نکالا گیا اور ترکستان و چین میں عمر کا بڑا حصہ گزار کر شاہ پور کے زمانے میں ایران آیا۔ ایک روایت کے مطابق سقز میں پیدا ہوا اور سقز میں وفات پائی۔

شرح : اگر میرا آشوخ اور بیباک محبوب رقیب سے ہم جنس ہو کر ناز و نیاز کرنے لگے اور اس حالت میں اس کی تصویر کھینچی جائے تو دستور کے لیے لازم ہوگا کہ مور کے پاؤں کو موٹم بنائے۔

مطلب یہ کہ محبوب کتنا ہی حسین و جمیل کیوں نہ ہو، لیکن حبیب رقیب کی آغوش میں پہنچتا ہے تو اس کا حسن و جمال اس قابل رہ جاتا ہے کہ مور کے پاؤں سے جو حدود و حدود تو نازیبا ہوتا ہے، اس کی تصویر بنائی جائے۔

مور کے پاؤں کو موٹم بنانے کی غرض یہ ہے کہ مور بال و پر اور کھنٹی کے اعتبار سے نہایت خوبصورت جانور ہے، لیکن اس کے پاؤں بے حدود و صورت ہوتے ہیں، بلکہ مشورہ ہے، مور خود پاؤں کو اپنے لیے باعثِ ننگ مانتا ہے۔

۲۔ لغات - تخییر : حیرانی کی حالت، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان چُپ ہو جاتا ہے اور اس میں بات کرنے کی سکت نہیں رہتی۔

شرح : اسے محبوب ! تیری بدخوئی کا یہ عالم ہے کہ میں سراپا حیرت بن کر خاموش ہو جاتا ہوں تو تو اسے ایک دلچپ تماشا سمجھتا ہے اور اس سے لطف اٹھاتا ہے۔ مگر میں عالم حیرت سے نکل کر اپنے غم کی کہانی تیرے سامنے پیش کروں تو میری پریشاں گوئی کے باعث تو بے مزہ ہو جاتا ہے۔ گویا میرا چُپ رہنا تیرے لیے دلچپ اور میرا غم دل کہنا تیرے لیے باعثِ دلچسپی و کدورت ہے۔

۳۔ لغات - ریشہ دوانی : ریشہ دوڑانا۔ جب کوئی دانا یا بیج زمین سے اُگتا ہے تو اس کے ریشے ارد گرد پھیل جاتے ہیں۔ انہیں ریشوں کی بدلتی زمین سے اس روئیدگی کو غذا ملتی ہے۔

شرح : مجھے اُس تپ عشق کی آرزو ہے کہ پھر شمع کی کوئی طرح آگ کا شعلہ جگر کی رگ تک اپنا ریشہ دوڑا دے۔

مطلب یہ کہ جس طرح شمع کی کوہماگے کے ذریعے سے اس کے اندر تک، حرارت پہنچا دیتی ہے اور پوری طرح کیسر گرم ہو جاتی ہے، اسی طرح میں بھی عشق کی اس حرارت کا آرزو مند ہوں، جو میرے جگر تک آگ کے شعلے دوڑا دے۔

۱۔ شرح : جس زخم کے لیے رفو کی تدبیر ممکن ہو اُسے میرے خدا ! اُسے دشمن کی قسمت میں لکھ دیجیے۔ یعنی میں تو اس زخمِ دل کا آرزو مند ہوں جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رفو کی؟

لکھ دیجیو یا رب ! اُسے قسمت میں عدو کی اچھا ہے سرانگشتِ حنائی کا قصور

دل میں نظر آتی تھی اک بوندِ لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے جو رُو ہو ہی نہ سکے۔

۲۔ لغات۔

سر انگشتِ حنائی:
مشدی کی انگلی کا سرا۔

شرح: خواہجہائی
فرماتے ہیں:

”لفظ تو نے جو درود صبر

مصرع میں ہے، یہ معنی پیدا
کر دیے ہیں کہ آنکھ سے ہو

یاں تو کوئی سُنتا نہیں مزید کسو کی

دشنے نے کبھی مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو

شجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے غارت

حسرت میں رہے ایک بُتِ عربہ جو کی

دوتے دوتے دل میں غُٹن کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا، اس لیے دو۔

کے سر انگشتِ حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی دُور سے۔

دل میں ہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔“

اس شعر کی شرح کے مختلف پہلو مولانا طہطائی نے نہایت اچھے انداز میں

پیش کیے ہیں۔ میں ان کا بیان خلاصۂ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ سر انگشت کا مشدی سے لال ہو کر ہو کی بوند ہو جانا بہت اچھی تشبیہ ہے

تشبیہ سے مشبہ کی اکثر تزئین و تحسین مقصود ہوتی ہے۔ شاعر نے سر انگشت کی
خوب صورتی آنکھ سے دکھا دی۔

۲۔ جس انگلی کی پور ہو کی بوند برابر ہو، وہ انگلی کس قدر نازک ہو گی۔ کیا یہ

ہمیشہ تصریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

۳۔ اس شعر میں وجہ شبہ مرکب ہے، یعنی بوند کی سرخی اور بوند کی شکل دونوں

سے وجہ شبہ کو ترکیب حاصل ہوئی ہے اور مرکب تشبیہ زیادہ بدیع ہوتی ہے۔

۴۔ یہ نئی تشبیہ ہے، پہلے کسی نے نظم نہیں کی۔

۵۔ اسی تشبیہ سے یہ بات نکالی کہ دل میں ایک بوند تو ہو کی دکھائی دی۔ پھر

کجا تصور، کجا سو کی بوند، دونوں میں کیسا بونِ بعید ہے اور تباہیِ طرفین سے
تشبیہ میں حسن اور عزابت زیادہ ہو جاتی ہے۔

۶۔ لفظ ”تو“ نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ شعر اس شخص کی زبانی ہے جس

کا ہوسب خشک ہو چکا ہے۔ وہ اپنے دل کو ایک خیالی چیز سے تسکین دے رہا ہے۔

۷۔ بوند کے معنی میں ٹپک پڑنا داخل ہے۔ یہی حال تصور کا خیال سے اتر

جانے میں ہے، یعنی حرکت و جبرشہ میں داخل ہے، گو طرفین تشبیہ متحرک نہیں۔

۸۔ غرض یہ نہایت غریب و بدیع و تازہ تشبیہ ہے۔

۳۔ شرح : خواہ عالی فرماتے ہیں :

”بے حوصلگی میں کم ظرفی۔“ یاں ”سے مراد دنیا ہے۔ معشوق سے کہتا

ہے، تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق تیرے جود و ظلم

سے تنگ آکر حاکم سے یا خدا سے مزید کریں گے؟ کیونکہ اگر ہم

ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی مزید ہی نہیں سنتا۔“

اول سچے عاشق اتنے کم ظرف نہیں کہ محبوب کے ظلم و جود صبر سے برداشت

نہ کریں، لیکن اگر اسے محبوب ا تیرے دل میں یہ دوسرے موجود ہے کہ شاید عشاق

کے گروہ میں سے کوئی بے ہمت نکل آئے اور مزید و فتناء شروع کر دے تو ظالم

ہے کہ اس دنیا میں تو کوئی کسی کی مزید سننے پر آمادہ نہیں، پھر تو کیوں پریشان ہے؟

۴۔ ۵۔ لغات۔ عربیہ مجروح : جنگجو۔ لڑاکا۔

شرح : اسے غالب ! اس ناکام فرد کے لیے سومر تہ انوس، جو عمر بھر

ایک جنگجو محبوب کی حسرت میں رہا۔ اس محبوب کی کٹار نے کسی آرزو مند عاشق کے

جگر کو سترہ نہ لگا یا اور محبوب کے خنجر نے کسی اس کے گلے کی بات نہ پوچھی۔

جنگجو محبوب کی آرزو اس لیے تھی کہ ملکر کو کٹار سے چھیدے اور گلا خنجر

سے کاٹے، لیکن عاشق کی عمر حسرت میں گزر گئی اور یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

۱۔ لغات :

پشت گرمی :

اعدا، اجانت

پشتیا فی ۔

شرح : پارا

شیخ پر چراغا دیا جائے

تو وہ آئینہ بن جاتا ہے ، گویا پارا آئینے کے لیے پشتیا فی کا کام دیتا ہے ، لیکن ہمارا بیتاب و بیقرار دل جو مثال میں پارے کی حیثیت رکھتا ہے اور جس سے ہمیں پیش نظر اصول کی بنا پر اعدا کی توقع ہونی چاہیے تھی ، وہ ہماری حیرانی کا باعث بنا ہوا ہے اور اس نے ہمیں سخت غصہ میں ڈال رکھا ہے ۔

۲۔ لغات ۔ وداغ : رخصت ۔

شرح : پھول کھلا نہیں ، بلکہ اس نے رخصت کے لیے اپنی آغوش

کھول دی ہے ۔ اسے نہیں ، تو بھی پھل ، کیونکہ بہار کے دن ختم ہو رہے ہیں ۔

عام قاعدہ ہے کہ جب دو گ ایک دوسرے سے کچھ وقت کے لیے الگ

ہوتے ہیں تو ہم بغل ہو کر رخصتی ملاقات کرتے ہیں ۔ گویا آغوش کھولنے کا مطلب

رخصت ہونا ہے ۔ اسی طرح پھول نے رخصت کے لیے آغوش کھولی ، کیونکہ

بہار جا رہی ہے اور بلبل کو بھی رخصت ہونا چاہیے ، بلکہ خطاب سے معلوم ہوتا

ہے کہ شاعر بھی جا رہا ہے اور بلبل کو ساتھ لے جا رہا ہے ۔

۱۔ لغات : تمکین :

دُتار سے بیٹھنا ، کوئی ایسی

حرکت نہ کرنا ، جس کا رنگ

ہے وصل سحر عالم تمکین و ضبط میں

مشتوق شوق و عاشق و یوانہ چاہیے

ہذا باقی ہو۔ کیونکہ جذباتی
حرکیتیں عموماً اعتدال سے
باہر ہوتی ہیں۔ اس لب سے بل ہی جا نیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جراتِ رعدانہ چاہیے

شرح : اگر محبوب وصل کی حالت میں وقار و نمکنت سے بیزار ہے
اور عاشق ضبط و صبر سے کام لے تو اُس وصل کو وصل نہیں، ہجر سمجھنا چاہیے
وصل کی حالت کا تو تقاضا ہی یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے پے در پے شوقیاں
سرد ہوئیں اور عاشق پر اک گونہ دیوانگی کی کیفیت جاری رہے۔
مرزا نے اس شعر میں وصل و ہجر کے ماحول کی کیفیت دو دو لفظوں میں انتہائی
جامعیت کے ساتھ پیش کر دی۔

۲۔ **شرح :** محبوب کے ہوں سے بوسہ ضرور مل جائے گا، خواہ کتنی
ہی دیر لگے، البتہ یہ ضروری ہے کہ شوق کا جوش و خروش جاری رہے، اس میں
کوئی کمی نہ آنے پائے۔ ساتھ ہی رندوں کی سی جرات ہو، لیکن ایسی جرات جو
کسی سے نہ دے بالکل جیسا کہ ہو۔

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
صحبتِ رنداں سے واجبِ سحر
چاہئے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
چاک مت کر حیب بے آیام گل
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
جائے سے اپنے کو کھینچا چاہیے
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بریگانگی
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا عنبر کو

اپنی رُسوائی میں کیا چلتی ہے سہی یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
 منحصر مرنے پہ جو جس کی اُمید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
 غافل ان مرہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
 چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

۱۔ شرح : دنیا میں صرف حسین اس امر کے حقدار ہیں کہ انہیں چاہا جائے۔ اتنا چاہا جائے، جو چاہنے کی آخری حد ہے۔ اگر خوش نصیبی سے وہ بھی چاہنے لگیں تو اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں ہو سکتی۔

۲۔ لغات : کھینچنا : پیچھے ہٹنا۔ پرہیز کرنا، بچنا۔ نئے کے ساتھ کھینچنا، میکش کا ترجمہ ہے، جس کا مطلب شراب پینا ہے۔ یہاں مرزا نے کھینچنا شراب کے ساتھ استعمال کیا، لیکن پہلے مصرع سے واضح ہے کہ ان کا مقصود احتراز ہے۔

شرح : دندوں اور شراب نوشوں کی صحبت سے دُور ہی رہنا واجب ہے۔ دہاں باگر شراب پینے کے بجائے شراب سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۳۔ لغات : سمجھنا : (پہلے مصرع میں) جاننا، خیال کرنا۔ سمجھنا : (دوسرے مصرع میں) مزادینا، مزہ چکھنا، باز پرس کرنا۔

شرح : اے محبوب! دل تیری چاہنت کو ایک معمولی سی بات سمجھا تھا، یعنی اس کا خیال یہ تھا کہ یہ کوئی ایسا امر نہیں، جو مشکلات کا باعث بنے، لیکن ایک کاریہم کو معمولی بات سمجھ کر اس نے سنبھال لیا تھا، اب لازم ہے کہ اسے اس حماقت کا مزہ چکھنا یا جائے۔

۴۔ شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

”پھول کے کھٹنے کو پاک گریباں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کتا ہے کہ

سہرا ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیے۔ پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے، تو بھی گریبان چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں زیادہ جوش جنوں ہوتا ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ بہار آتی ہے تو درختوں میں شگوفے پھوٹتے ہیں، گونپیں نکلتی ہیں، پھول کھلتے ہیں تو بھی موسم بہار کے بغیر اپنا گریبان چاک نہ کر۔ اس کے لیے قدرت کا بھی کوئی اشارہ ادا کیا جوتا چاہیے۔ یعنی جس طرح فطرت کی دوسری چیزوں کے واسطے آمد بہار پر چاک ہوتے ہیں، اسی طرح تیرا دل من بھی بہار کی آمد کے بغیر تار تار نہ ہونا چاہیے۔

۵۔ شرح : اے محبوب ! آپ منہ چھپا کر ہم سے بیگانہ بنتے ہیں، حالانکہ یہ پردہ داری تو دوستی کا راز فاش کرنے کی دلیل ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم سے بیگانہ بنے رہیں تو منہ چھپانا چھوڑ دیجیے۔ اگر آپ ہم سے پردہ داری کرتے رہیں گے تو لوگ ضرور سمجھیں گے کہ دال میں کچھ کالا ہے، گویا اس ذریعے سے مرزا حصولِ مطلب کی تدبیر کر رہے ہیں۔

۶۔ شرح : غیر مبرا میرے خلاف لگائی بجائی میں سرگرم رہا، یہاں تک کہ محبوب کا دل بھی اس سے اکتا گیا اور جو قرارِ اعتماد سے محبوب کے دل حاصل ہوا تھا، وہ خاک میں مل گیا۔ گویا میری دشمنی میں اس سیاہ بخت نے اپنا بھی میرا عزق کر لیا۔ دیکھیے، اس کی دشمنی کا درجہ کہاں پہنچا ہوا ہے۔ جب انسان کسی کے ساتھ دشمنی میں اپنے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا تو یہ دشمنی کی آخری حد ملہوتی ہے، کیونکہ دشمنی میں اپنی ذات کو بھی بھول جاتا ہے۔ یہی حقیقت مرزا نے اس شعر میں پیش کی ہے۔

۷۔ شرح : عاشق خود اپنی رسوائی کے لیے کیا کوشش کر سکتا ہے؟ یہ معاملہ تو محبوب کی سبکدوش آمانی پر موقوف ہے۔ وہ جب چاہے، کسی کو بے صبر اور بیتاب بنا کر رسوائی کے راستے پر لگا دے اور اس کی عزت و وقعت ہر باز

کر ڈالے۔

۸۔ شرح : خواہ حال فرماتے ہیں :

۔ تا اُمیدی کی غایت اس سے بڑھ کر اور ایسی خوبی کے ساتھ

شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

جس کی امید کا برآنا مرنے پر موقوف ہو، اس کی تا اُمیدی دیکھنے کے قابل ہے۔ یعنی زندگی میں اس کی کسی امید کا پورا ہونا بالکل ناممکن ہو گیا اور مرنے پر اُمید پوری بھی ہوئی تو اس سے کیا حاصل؟ گزری ہوئی عمر تو واپس نہیں آ سکتی۔

۹۔ ۱۰۔ شرح : اے استاد! تم حسینوں کو چاہتے ہو، واہ! ذرا اپنی

صورت تو دیکھو، یہ اس قابل ہے بھی کہ حسینوں کو چاہے۔

اے فاضل! ان چاند جیسے چہروں والے درباؤں کو چاہنے کے لیے بھی

آدمی کو خوش وضع اور خوب رو ہونا چاہیے۔

۱۔ شرح :

میری منزل مجھ سے

ہر قدم پر دور ہوتی

جا رہی ہے۔ میں کوشش

کر رہا ہوں کہ جہاں

پہنچنا ہے، پہنچ جاؤں

لیکن مقام مقصود اتنا

ہی بعید ہوتا جا رہا

ہے، جتنا میں اس

کے نزدیک پہنچنے کی

بہر قدم دوری منزل ہے نمایاں، مجھ سے

میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں، مجھ سے

درس عنوان تماشا بہ تفافل خوشتر

ہے نگہ رشتہ شیرازہ مزگاں، مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شب تنہائی میں

صورتِ دور رہا سایہ گریزاں، مجھ سے

کوشش کر رہا ہوں
اس کا سبب یہ ہے
کہ میاں اسی رفتار
کے مطابق مجھ سے
بھاگ رہا ہے جس
رفتار سے میں اس
کے قریب پہنچنا چاہتا
ہوں۔

اس شعر میں بڑا
نے فکر کے القباس
اشتباه کا وہ معاملہ
پیش کیا ہے، جس
کا تجربہ اکثر اشخاص
کو ہوتا ہے، لیکن
عموماً اس کا خیال
نہیں رکھتا جتنا غرض
کیجیے کہ آپ ریل یا
کسی دوسری سواری
میں بیٹھے ہیں۔ وہ جتنی
تیز چلے گی، ویسی اسی
ہوگا کہ سواری ٹھہری

غم عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بہستان
کس قدر خاندانِ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتہ گو ہر ہے چراغاں مجھ سے
بے خودی بسترِ تمسیر فراغت ہو جو
پڑ ہے سانے کی طرح میرا بہستان مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تو مجھ گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے
بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گروں سا غر صدمہ جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے
نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے، اسد
ہے چراغاں جس و خاشاکِ گلستان مجھ سے

ہوتی ہے اور ارد گرد کی زمین تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑی جا رہی ہے۔ تیز
دوڑنے والے شخص کو اس قسم کا القباس ہوتا ہے۔ چنانچہ مرزا فراتے ہیں کہ میں

جنتا منزل کی طرف دوڑتا ہوں، عام القیاس و اشتباہ کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منزل مجھ سے دوری مبارک ہی ہے، لہذا میری تیز رفتاری سے منزل کی دوری کا معاملہ واضح ہے۔

۲۔ لغات۔ تماشا : جلوہ، دیدار، مجازاً اس سے تماشاے دنیا بھی مراد لی جاسکتی ہے، جو یہاں زیادہ موزوں ہے اور تماشاے محبوب بھی۔

شرح : دنیا کی کتاب کا پڑھنا تو ممکن ہی نہیں، صرف اس کے حوالوں کا سرسری تماشا ہی تغافل اور بے توجہی ہی سے کرنا چاہیے۔ صرف اچکتی ہوئی نظر ڈال کر ضروری نتیجہ نکال لینا کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری نظر آنکھوں سے باہر نہیں نکلتی، اندر ہی اندر رہتی ہے، گویا وہ میری پلکوں کی بندش کے لیے شیرازہ بن گئی ہے۔

مرزا کہتا ہے چاہتے ہیں کہ دنیا کی چیزوں کو بہ غور دیکھنا شروع کریں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نگاہیں ان میں الجھ جائیں گی اور حیاتِ انسانی کا جو مقصود ہے، یعنی محبوبِ حقیقی سے نورِ نگاہ، اس کے ممکنات کم ہو جائیں گے۔ تغافل و بے پروائی ہی کا طریقہ اچھا ہے۔

اگر تماشا سے تماشاے محبوب مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا، محبوب کو اس حالت میں دیکھنا چاہیے، جس میں خود اسے پتا نہ لگے کہ دیکھ رہے ہیں۔ یہی طریقہ میں نے اختیار کیا اور اس وجہ سے میری نگاہیں آنکھوں کے اندر ہی اندر رہتی ہے، لیکن اعتراض کر لینا چاہیے کہ اس تعبیر کی صورت میں پہلے مصرع کا معنوم واضح کرنے کے لیے تکلف سے کام لینا پڑے گا۔ صحیح معنوم وہی معلوم ہوتا ہے، جو ابتدا میں پیش کیا گیا۔

۳۔ شرح : محبوب سے جدائی کی رات ہے۔ دل میں آتشِ شوق بری طرح بھڑک رہی ہے، اس سے وحشت زدہ ہو کر میرا سایہ و حوٹیں کی طرح مجھ سے بھاگ رہا ہے۔

شعر میں خوبی یہ ہے کہ آگ جتنی بھڑکے گی، دھواں اس سے دور ہی ہائے گا۔ یہ مضمون مرزا ایک اور جگہ بھی ہاندہ چکے ہیں۔

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُودِ بھانگے ہے آمد
پاسِ مجھ آتشِ بجاں کے کس کے ہٹا رہا ہے

۴۔ شرح : خدا نہ کرے کہ محبوب عاشقوں کے غم میں بناؤ سنگار چھوڑ کر سادگی اختیار کرے۔ میں مر گیا اور میرے غم میں محبوب نے بناؤ سنگار چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آئینہ دیکھنے کی ضرورت نہ رہی ہے، کیونکہ اس کی ضرورت بہر حال بناؤ سنگار ہی کے لیے ہوتی ہے۔ گویا خانہ آئینہ ویران ہو گیا اور اس کا سبب میں بنا۔ اے خدا! اتنی مہربانی کر کہ عاشقوں کا غم محبوبوں کو اس درجہ پریشان نہ کرے۔

۵۔ شرح : میرے پاؤں چپالوں سے بھرے ہوئے تھے اور میں نے صحراے جنوں میں چلنا شروع کر دیا۔ اس کی لگ بھگ ڈنڈی میرے چپالوں کے پے دھاگا بن گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ چپالے موقی ہیں اور لگ ڈنڈی کے دھاگے نے انہیں موتیوں کی لڑی بنا دیا ہے۔ پھر موتیوں کے برعکس چپالوں میں پیش اور حرارت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چراغاں کی طرح جل اٹھے۔ گویا چپالوں نے صحراے جنوں کے راستے کی بدولت رشتہ گوہر کی صودت بھی اختیار کی اور چراغاں کی بھی۔

۶۔ لغات - ہو جو : ہو جو، ہو جائے۔

شرح : خدا کرے، بیخودی میرے لیے فراغت اور راحت و سکون کی قید کا بستر بنی رہے۔ میرا شبتان سایے کی طرح مجھ سے بھرا ہوا ہے۔

مطلب یہ کہ میں بیخودی کی بدولت اپنی آرام گاہ میں بے حس و حرکت پڑا ہوں، خدا کرے، میری یہ بیخودی اسی طرح میرے لیے راحت و آسائش کا سامان بنی رہے! اگر بیخودی نہ ہو تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں جگہ جگہ

بھاگا دوڑا پھروں اور سرگردانی میں عمر گزاروں۔
مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

” تمہید کے لغوی معنی بھیلانے کے ہیں اور یہ ہستر کے مناسبات میں سے ہے۔ اصطلاح میں تمہید اسے کہتے ہیں کہ کسی کام سے پہلے کچھ ایسی باتیں کی جائیں، جن پر وہ کام موقوف ہے اور یہی معنی مصنف کو مقصود ہیں۔۔۔ فراغت کے لغوی معنی خالی ہونے کے ہیں اور یہ پُر ہونے کے مناسبات میں سے ہے اور اصطلاح میں راحت کے معنی پر ہے اور یہی معنی یہاں مقصود ہیں۔“

۷۔ لغات۔ گل شمع : شمع کا گل، چراغ کی تلی کا سرا، شعلے کی ٹو، یہاں دونوں معنی درست ہیں۔ شمع کا گل اس لیے کتر جاتا ہے کہ روشنی ٹھیک رہے، ورم نہ ہونے پائے۔ گل کترتے وقت اس میں سے دھواں نکل کر ارد گرد پھیلتا ہے اور اس کے بعد شعلہ زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی روشنی زیادہ پھیل جاتی ہے۔

شرح : اے محبوب ! اگر تو میری گردن بہ حالت شوق دیدار کاٹ دے، یعنی مجھے قتل کر ڈالے تو میری نظر شمع کے گل یا شعلے کی کو کی طرح ہر طرف پھیل جائے گی۔

۸۔ شرح : آہ ! محبوب سے جدائی کی رات، بیکسی کا عالم، کوئی ماضی نہیں، کوئی رفیق نہیں، کوئی غمخوار نہیں۔ حد یہ ہے کہ میرا سایہ بھی بھاگ کر آفتابِ حشر کے دامن میں چھپ گیا ہے۔

سایہ طبعاً آفتاب سے گریزاں رہتا ہے، لیکن عاشق کی شبِ فراق اور اس کی بیکسی کے خوف سے اتنا ڈرا، اتنا ڈرا کہ اسے آفتابِ حشر کے سوا کہیں پناہ نہ مل سکی۔

۹۔ شرح : اسے محبوب ! سیکڑوں رنگین جلوں کا جام تیری بدولت
 محفل میں گردش کر رہا ہے اور میں ایک حیرت زدہ آنکھ کا آئینہ دار بنا بیٹھا ہوں
 مطلب یہ کہ تیری محفل ہر قسم کی رونق، چہل پہل اور جشن و شادمانی سے
 معمور ہے۔ میں سراپا حیرت بنا بیٹھا ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے ! تو کس طرح
 اپنے چہرے عاشق سے بے پروا ہو کر عیش و نشاط میں مست ہے۔

۱۰۔ لغات۔ راک : ایک کا محقق، یہ لفظ بعض اوقات پڑا،
 نہایت اور بہت کے معنی بھی دیتا ہے، مثلاً جان صاحب :

اس کو پروا نہیں کوئی مر جائے
 ایک بیدو یہ مڑا ہے عشق

نیز امیر مینائی :

اندھے گرمیاں مرے معشوق کی امیر !
 آیا خیال دل میں تو اک آگ لگ گئی

شرح : اسے استاد ! میری نگاہ گرم سے بے پناہ آگ ٹپک رہی
 ہے۔ میں باغ میں پہنچا تو نگاہ پڑتے ہی خس و خاشاک جل اٹھے اور چراغاں
 کا منظر پیدا ہو گیا۔

۱۔ لغات :

سنائے نہ بنے :

سنائے کی کوئی صورت

نہیں بنتی۔

بات کا بنتا :

کامیاب ہونا، تھپہر

ہن پڑنا، مراد حاصل ہونا۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات، جہاں بات بنا ئے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اسے جذبہ دل

اس پر بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
 کاش یوں بھی ہو کہ میں میرے ستائے نہ بنے
 غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
 کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
 اس نزاکت کا بڑا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
 ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگانے نہ بنے
 کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
 پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
 موت کی راہ نہ دیکھوں کہ میں آئے نہ رہے
 تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
 بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
 کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
 عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
 کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بات بتانا :

بات کو پھیر بھیا کر
 اپنا مطلب نکالتا
 سخن سازی کرنا۔

شرح :

میرا محبوب مدد دے
 نکتہ چیں ہے، اسے
 غم و دل ستانے کی
 کوئی تدبیر ہی نہیں
 پڑتی۔ جہاں میر پھیر
 اور سخن سازی سے
 مطلب نکالنا ممکن
 نہ ہو، وہاں مراد
 حاصل کرنے کی کیا
 صورت ہو سکتی ہے۔

اس شعر میں

نہایت اجماع لفظ

نکتہ چیں ہے۔

اگر لفظی فرو نہایت

فردی معاملہ بیان

کر رہا ہو، خصوصاً

غم و اندوہ کا معاملہ اور سننے والا بات بات پر نکتہ چینی اور اعتراض شروع کر
 دے تو وہ معاملہ وہ اثر کبھی پیدا نہ کر سکے گا، جو اس سے طبعاً پیدا ہونا چاہیے

یہی حقیقت اس شعر کی بنیاد ہے۔ عاشق جب اپنے عشق کی غم انگیز داستان سنانا چاہتا ہے تو محبوب بات بات پر ٹوکتا ہوتا ہے۔ کہیں اعتراض کرو یا، کہیں کہہ دیا، یہ غلط ہے۔ کوئی بات کاٹ دی، کسی میں سقم نکال دیا۔ اس طرح تاثیر کی وہ فضا بھی قائم نہیں رہتی، جو ایک درد بھری داستان کے لیے حدود و ضروری ہے۔ نیز غم انگیز بیان کے لیے تسلسل لازم ہے، یعنی اس میں مداخلت نہ ہونی چاہیے۔ محبوب کی نکتہ چینی قدم قدم پر مداخلت کا سامان پیدا کرتی ہے، لہذا عزیز عاشق مجبور ہو کر کہتا ہے۔ میں کیا کروں؟ نکتہ چینی کے باعث اسے غم دل سنا نہیں سکتا۔ جہاں بات بنانے کی کوئی صورت نہیں وہاں بات بنے تو کیونکر؟

۲۔ لغات۔ بن جاتا : مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، آفت آنا، مجبور ہو جاتا۔

تشریح : میں محبوب کو بلاتا تو ہوں، لیکن اس کے آنے کی امید نہیں، البتہ اسے جذبہ دل اٹھ کر کوئی ایسا اثر دکھا کر وہ بالکل مجبور ہو جائے اور میرے پاس آئے بغیر اس کے لیے چارہ نہ رہے۔ پہلے مصرع میں لفظ ”تو“ سے صاف ظاہر ہے کہ محبوب کو بلاتا تو رہے ہیں، مگر اس کے آنے کی امید کوئی نہیں۔

۳۔ تشریح : میرے محبوب کے نزدیک عشق و محبت کا معاملہ ایک کھیل ہے کہ جب چاہا، کھیل لیا اور جب چاہا، چھوڑ دیا۔ اسے وہ کوئی ایسا سنجیدہ مشغلہ نہیں جانتا، جس کے ساتھ دلی تعلق ہو، لہذا عاشق کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ محبوب اس کھیل کو اسی طرح چھوڑ دے، بھول جائے، جس طرح بچے کھیلوں کے متعلق عموماً روش اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے عاشق آرزو کر رہا ہے کہ کاش، ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ محبوب کو مجھے ستائے بغیر نہیں نہ آئے، یعنی عشق و محبت کے معاملے کو وہ خاص اپنا مشغلہ بنائے رکھتے لھیل

نہ کہے۔

۴۔ شرح : اسے محبوب ! تو نے رقیب کو جو نامہ شوق لکھ دیا ۔
وہ اسے یوں لیے پھرتا ہے کہ اگر کوئی پوچھ بیٹھے ، یہ کیا ہے تو اسے چھپانے
رکھنا ممکن نہ رہے۔

نظارہ ہے کہ جب لوگوں میں چرچا ہوگا ، وہ نامہ شوق آپ کی طرف سے
ہے تو آپ کی رسوائی ہوگی۔

۵۔ شرح : بیشک وہ حسین ہیں ، اور ان کا حسن بڑا دلادینے والا ہے ، مگر
دیکھیے ، کتنے نادک ہیں کہ اول تو کسی کے ہاتھ نہیں لگتے اور اگر لگ جائیں
تو انھیں چھڑا دیتے ہیں۔ حسن میں کلام نہیں ، لیکن نزاکت نے عاشقوں کے
لیے کیسی مصیبت پیدا کر رکھی ہے۔

۶۔ شرح : کون کڑھتا ہے کہ کائنات میں کون جلوہ افروز ہے ؟
کس نے اپنے وجود کی شان آشکارا کر رکھی ہے ؟ پوری کائنات یہ اسباب کا
ایسا پردہ ڈال دیا گیا ہے کہ کسی کو اٹھانے کی تاب نہیں یا اٹھانے کی کوئی
تدبیر خیال میں نہیں آسکتی۔

جب پردہ اٹھانا ممکن نہیں تو کیا کیا جاسکتا ہے کہ یہ سب جلوے کس کے
ہیں ؟

۷۔ شرح : اس شعر کا مطلب فحش نبی بخشش حقیر کو سمجھاتے ہوئے
خود مرزا فرماتے ہیں :

”جہاں ! مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم
کو تامل رہا۔ اس میں دو استفہام آ پڑے ہیں کہ وہ بہ طریق طعن و طعن
معتوق سے کہے گئے ہیں : ”موت کی راہ نہ دیکھوں“ ؛ کیوں نہ
دیکھوں ؛ میں تو دیکھوں ہی گا کہ ”ہن آئے نہ رہے“ ، کیونکہ موت
کی نشان میں سے یہ بات ہے کہ ایک دن آئے ہی گی ، انتظار

مناہع نہ جانے گا۔ ”تم کو چاہوں؟“ کیا خوب! کیوں چاہوں؟
 کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے۔ یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے
 اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بلا سکے۔
 گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اگر میں تم کو چھوڑ کر اپنی
 موت کا عاشق ہوا ہوں۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ بن بلائے بغیر
 آئے نہیں رہتی۔ تم کو کیوں چاہوں؟ کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ
 سکوں۔

بات یہ ہے کہ پڑھنے میں ”تم کو چاہوں کہ نہ آؤ“ یہ جملہ ملا
 ہوا سمجھ میں آتا ہے تو آدمی حیران ہوتا ہے، ”تم کو چاہوں“
 الگ ہے، کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے، ”یہ جملہ الگ ہے تم نے
 خود نہ کیا، ورنہ خود بخود کیفیت اس تعریف اور استفہام کی حاصل
 ہو جاتی“

اس تو صیح کے بعد کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہتی۔

۸۔ مشرح : میں نے محبت کا بوجھ بے تکلف سر پر اٹھا
 لیا، لیکن وہ اتنا بھاری تھا کہ سنبھال نہ سکا اور سر سے گر پڑا، اب
 اٹھائے اٹھتا نہیں۔ میں عاجز اور بے بس ہوں۔ کام ہی ایسا آ پڑا ہے کہ
 اسے درست کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مولانا طلبا لطائف فرماتے ہیں :

”ایک تو مضمون نہایت اچھا ہے، دوسرے دونوں مصرعوں
 کی ترکیب کو قشربہ کر کے شعر کو اور بھی برجستہ کر دیا“

۹۔ مشرح : عشق پر کس کا اندر ہے؟ اسے غائب! یہ تو ایسی آگ
 ہے کہ نہ لگائے گنتی ہے، نہ اسے بجھانے کی کوئی تدبیر بن پڑتی ہے۔
 ایک معنوم ہے کہ عشق کی آگ کسی دل میں بھڑک اٹھے تو اسے بجھانا

انسان کے بس میں نہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ یہ آگ لگانا ممکن ہوتا تو ہر عاشق اپنے محبوب کے دل میں لگا لیتا۔ بھانا ممکن ہوتا تو اپنے دل کی لگی بھبا کر اطمینان سے بیٹھ جاتا۔

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ نریانی کرے
 صبح کی مانند، زخمِ دل گریبانِ کرے
 جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گریبے خیال
 دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے
 ہے شکستن سے بھی دلِ نوید، یارب اکب تک
 آگینہ کوہ پر عرضِ گراخیانی کرے
 میکدہ گرچیم مست ناز سے پاوے شکست
 موے شیشہ، دیدۂ ساعز کی مرثانی کرے
 خطِ غارِ ص سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
 یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

۱۔ شرح : اگر
 ہر رنگی کی حالت میں
 جنوں کو یہ خواہش ہو
 کہ گریبان چاک کرے
 تو صبح کی طرح میرے
 دل کا زخم گریبان بن
 کر تار تار ہونے کے
 لیے تیار ہو جائے۔
 مطلب یہ ہے،
 چاک گریبان میں ایسی
 لذت ہے کہ دل کا
 گھاؤ جو پہلے ہی
 ایک چاک کی حیثیت
 رکھتا ہے، دوبارہ
 چاک ہونے کے لیے
 گریبان بن سکتا ہے۔

زخم، چاک، وحشت، حیرانی، گریبان اور صبح، ان سب کی مناسبت محتاجِ تفسیر نہیں۔ یعنی چورہ لفظوں میں سے چھ ایسے ہیں، جو باہم دست و گریبان ہیں۔
 ۲۔ شرح : اے محبوب! تیرے جلوے کی کیفیت کیونکر بیان کروں؟ اگر

اس کا تصور بھی کر لیا جائے تو اس سے دل کی آنکھ حیرت کی ذلیلت گاہ بن جائے۔
مطلب یہ کہ تیرے جلوے کے تصور ہی سے دل پر سراپا حیرت طاری ہو
جاتی ہے۔

۳۔ شرح : اگرچہ معاملہ ایک سنگدل محبوب سے آپڑا تھا، لیکن میرا دل
ٹوٹنے سے بھی ناامید ہو گیا۔ اسے خدا تو ہی بتا کہ شیشہ کب تک پہاڑ پر اپنی سزائے
کا اظہار کرتا رہے؟

اس شعر میں محبوب کو سنگ دلی کی بنا پر کوہ اور اپنے دل کو آگینہ قرار دیا گیا
ہے۔ ہم سہرے کہ پہاڑ کا ایک معمولی سا ٹکڑا بھی ایک آن میں شیشے کو چکنا چودر کر
دیتا ہے، مگر محبوب کی سنگ دلی عاشق کا دل توڑ نہ سکی، یہاں تک کہ وہ ناامید ہو
گیا۔ بظاہر شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی سختیاں برداشت کیں، مگر عاشق محبوب
سے دل توڑنے اور الگ ہونے پر آمادہ نہ ہوا۔

۴۔ لغات - موئے شیشہ : شیشے کے بال یعنی شیشہ تراخ جانے
سے جا بجا لکیریں پڑ جانا۔

شرح : اگر شراب خانہ محبوب کی مسرت نامہ آنکھ سے شکست کھا جائے
تو اس طرح صراحتی میں جو بال پڑیں گے، وہ ساطر کی آنکھ کے لیے پلکیں بن جائیں گے۔
شاعر محبوب کی آنکھ کو ہمیشہ مست ہاندھتے ہیں۔ اس مستی کی بنا پر شاعر کے
دماغ میں میکہ آیا۔ محبوب کی آنکھ اتنی مست تھی کہ پورا شراب خانہ اس کے مقابلے
میں ہیج رہ گیا۔ محبوب کے ناز و انداز نے شراب بھری صراحیوں میں بال ڈال دیے۔
وہ بال ساطر کی آنکھ پر مرزاں بن گئے۔

۵۔ شرح : محبوب کے رخسار پر خط نہیں نکلا، بلکہ الفت نے اس
طرح زلف کو ایک حمد نامہ لکھ دیا ہے اور اس میں یہ مرقوم ہے کہ پریشانی جو کچھ
بھی کرے، وہ یک قلم از اول تا آخر منظور ہے۔

اس شعر میں بھی خط، مارض، زلف، یک قلم، پریشانی وغیرہ الفاظ کی مناسبت

محتاج تشریح نہیں۔ تلم کو اول لکھنے سے مناسبت ہے، دوسرا خطِ ماریں کی بھی
تعلیم ہوتی ہیں۔

۱۔ لغات :

پہلے معنی میں خواب
کے معنی سپنا اور
دوسرے بصری میں
نیند ہیں۔

مجال : دوڑنے
کی جگہ، جولان گاہ،
قدرت، طاقت،
فرصت، اہادت،
موقع۔

شرح :

محبوب کے خود آنے
کی تو کوئی اُمید نہ
رکھنی چاہیے، البتہ
یہ امکان ہے کہ میں
سو جاؤں، وہ خواب

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
دے مجھے تپشِ دلِ مجالِ خواب تو دے
کرے بے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو لب نہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے ادھک سے، ساقی اجڑیم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے
اسدِ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

میں آئے اور میری پریشانی کے لیے تسکین کا سامان ہم پہنچا دے، لیکن مصیبت یہ
ہے کہ میرے دل کی تڑپ اس درجہ بے پناہ ہے جس کے ہوتے ہوئے نیند ہی
نہیں آتی۔ نیند آ جائے تو یہ اُمید پیدا ہو کہ شاید وہ خواب میں آئے اور میرا دل
تسلی پائے۔

جناب آسمی نے اس سلسلے میں فارسی کا ایک شعر نقل کیا ہے :

گفتی کہ یہ خواب اندر تسکین و تہمت اشب

اما تو کجا آئی چوں خواب نمی آید

(اے محبوب ! تو نے کہا کہ میں آج رات پسنے میں آکر تجھے تسکین دے گا ،

لیکن نیند ہی نہیں آتی تو تیرے آنے کی اُمید کیا ہو سکتی ہے)

بلاشبہ یہ شعر ایک مد تک مرزا کے شعر سے ملتا جلتا ہے ، لیکن دونوں شعروں

میں جو فرق ہے ، وہ طویل تشریح کا محتاج نہیں ۔ فارسی کے شعر میں اول محبوب کی

ذہان سے کہا گیا ہے کہ وہ خواب میں آکر تسکین دے گا ، مگر یہ بالکل غیر طبعی ہے ۔

محبوب اتنا مہربان کہیں نہیں ہو سکتا ۔ دوم نیند نہ آنے کی کوئی واضح یا خفیہ واضح

وجہ بیان نہیں کی گئی ۔ اس کے برعکس مرزا کا شعر بالکل طبعی ہے ۔ یعنی محبوب سے

خواب میں آنے کی مہربانی کا امکان یا اُمید تو ہو سکتی ہے ، لیکن دل کا اضطراب سونے

ہی نہیں دیتا ۔

اصل مضمون کسی کا بھی ہو اسے پیش کرنے کی صحیح صورت وہی تھی ، ہو مرزا

نے اختیار کی ۔ میں غالب مرحوم کی دقیقہ سنجی کا کمال اور قادر الکلامی کا رتبہ بلند ہے ۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

” پہلے مصرع میں لفظ ”تو“ امکان کے معنی دیتا ہے ، یعنی اس کا خواب میں

آنا ممکن ہے ۔ دوسرے مصرع میں خواب کو ہتم بالشان کرنے کے

جیسے ”تو“ استعمال کیا گیا ۔ یعنی خواب ہی کا آنا بڑی چیز ہے ۔“

۲۔ لغات ۔ آب : اس کے دو معنی ہیں ، اول پانی جس کا اظہار درد

دینے میں ہوا ، دوم تلوار کی چلا ، آب و تاب اور باطو ۔

شرح : اے محبوب ! چھڑ چھاڑ اور شکوہ آمیز طریق پر اظہارِ آرزو

میں تیرا دودنیا مجھے مارے ڈالتا ہے ۔ دنیا میں جتنے حسین ہیں ، وہ اور کوششوں میں

کتنا ہی کمال پیدا کر لیں ، لیکن تیری طرح نگاہ کی تلوار کو چلا اور آب و تاب دینا

کوئی نہیں جانتا۔

یہ کوئی قیاسی بات نہیں، بلکہ ایسا معاملہ ہے، جو اکثر عشاق کو پیش آ سکتا ہے۔ یعنی کسی دقت محبوب سے محبت کی باتیں کرتے کرتے چھیڑ چھاڑ کے طور پر کچھ گلہ گوہ بھی کر دیا۔ محبوب کو کوئی جواب نہ سوجھا تو رونے لگا۔ کوئی سچا عاشق محبوب کے اس رودینے پر جان دے دینے میں دریغ نہیں کر سکتا۔ گویا محبوب کے آنسوؤں کے پانی سے اس کی نگاہ کی تلوار پر ہاڑھ چڑھ گئی۔

۳۔ شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ ”تو“ دوسرے آیا ہے۔ مولانا لطیف آبادی کے نزدیک پہلا ”تو“ شرط و جزا میں ربط کے لیے اور دوسرا جواب میں اہتمام پیدا کرنے کے لیے ہے۔ ”کہیں سے مراد کوئی نہ کوئی ہے۔“

شرح : تجھ سے بوسے کی اُمید تو ہو ہی نہیں سکتی۔ خیر اگر بوسہ دینا منظور نہیں تو لب ہلا کر صاف صاف انکار ہی کر دے تاکہ ہمارا کام تمام ہو جائے۔ بہ ہزل تیری طرف سے کوئی نہ کوئی جواب تو ہونا چاہیئے۔

۴۔ لغات۔ اوک : جب پینے کے لیے برتن موجود نہ ہو یا پلانے والا برتن دینا نہ چاہے تو پانی پینے والا دونوں ہاتھ ملا کر گرائی سی پیدا کر لیتا ہے۔ پلانے والا اس میں پانی میں ڈالتا جاتا ہے تاکہ پینے والے کی پیاس بجھ جائے۔ بعض اوقات ایک ہاتھ بھی لبوں سے لگا کر اسی طرح پانی پیا جاتا ہے۔ اسے اوک کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ عموماً چھوٹ چھات سے پیدا ہوتا۔

شرح : اے ساقی ! اگر تجھے ہم سے اتنی نفرت ہے کہ پیالے میں شراب نہیں دینا چاہتا تو مضائقہ نہیں۔ ہم ساعز ہو یا جام، ہر چیز سے بے نیاز ہیں، لوگ میں پینے کے لیے تیار ہیں، مگر شراب دینے میں دریغ نہ کر، اس نفرت سے محروم نہ رکھ۔

۵۔ لغات۔ ہاتھ پاؤں ٹھپوٹا۔ ہاتھ پاؤں کا سوجھ جانا، ہاتھ پاؤں کا

کا کام نہ دینا، ہٹکا ہٹکا، حیران اور حواس باختہ رہ جانا۔ جب اچانک انتہائی خوشی کی بات انسان سُن لے تو اعصاب پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ ہتھوڑی دیر کے لیے کام کاج سے رہ جاتے ہیں۔

شرح : اے استاد ! جب محبوب نے کہا کہ ذرا میرے پاؤں تودبا دے، اس ناگہانی خوشخبری سے مجھ پر خوشی کی ایسی حالت طاری ہو گئی کہ میرے ہاتھ پاؤں کام سے رہ گئے۔

۱۔ لغات :

بالیں : ہچکچاہٹ،

پاد پاؤں کا سرنا نا۔

شرح :

میں محبوب سے جہاں

کی حالت میں بستر پر

پڑا ہوا تڑپ رہا ہوں

اس دہرے بستر کا تہ

تار کشمکش کی مصیبت

میں مبتلا ہے۔ میرا سر

ہچکچاہٹ کے لیے ایذا کا

باعث ہے اور میرا

جسم بستر کے لیے بار

بنا ہوا ہے جو آفت

سے کم نہیں۔

۲۔ لغات :

پیش سے میری، وقف کشمکش بہتر ہے

مراسر درج بالیں ہے، براتن بار بستر ہے

سرشکب سر بہ صحرا دادہ، نور العین دامن ہے

دل بے دست دیا افتادہ، بر خورد دار بستر ہے

خوشا اقبال رنجوری اعیادت کو تم آئے ہو

فردغ شمع بالیں، طالع بیدار بستر ہے

بر طوفاں گاہ جوش اضطراب شام تنہائی

شعاع آفتاب صبح محشر، تار بستر ہے

ابھی آتی ہے بوبالش سے اس کی زلف مشکیں کی

بہاری دید کو خواب زنیخا، عار بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے سحرِ یار میں؟ غالب !
 سر پہ صحرا دادہ :
 آوارہ دیوانہ

کہ بیتابی سے ہر اک تار بستر، خار بستر ہے

آنسو کا خانہ آنکھ ہے۔ جب وہ اس گھر سے نکلے گا تو اسے آوارہ دیوانہ

اور سر پہ صحرا دادہ کہا جائے گا۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ آنسو

نکل کر صحرائیں پہنچے اور وہاں سیلاب آگیا۔

نور العین : آنکھ کا نور، آنکھ کا تارا، محدود و محدود۔

بے دست و پا افتادہ : ہاتھ پاؤں معطل ہو جانے کے باعث پڑا ہوا۔

برخوردار : پہل کھانے والا، زندگی سے پھل پانے والا، اقبال مند عموماً

انتہائی پیار سے بیٹھے، بیٹی یا قریبی خروں کو کہتے ہیں۔

مشرح : آنسو آنکھ سے نکل کر دامن کی آنکھ کا تارا بننا ہوا ہے۔

دل کی وہی حالت ہے، جیسے کسی کے ہاتھ پاؤں معطل ہوں اور اس پر بیچارگی کی

کیفیت ظاہر ہو۔ وہ بستر کا برخوردار بنا ہوا ہے۔ یعنی آنکھوں سے آنسو بہ

کر دامن تر ہو رہا ہے اور دل کو بے دست و پا کی حالت میں بستر سے خاص اُس

پیدا ہو گیا ہے۔

سم - لغات - اقبال : خوش نصیبی۔

رنجوری : بیماری، مرہن۔

مشرح : میری بیماری کس دردِ خوش قسمت ہے کہ اسے محبوب ! تم

بیچارہ کسی کے لیے آئے ہو ! اس کی بدولت میرے سر ہانے جو شمع جل رہی ہے

اس کی روشنی بستر کا جاگتا ہوا نصیباً بن گئی ہے۔

مطلب یہ کہ میں بیمار ہو کر بستر پر پڑا ہوں۔ محبوب مزاج پُرسی کے لیے آگیا۔

محض اپنا ہی نصیباً نہ جاگا، بلکہ سر ہانے جلنے والی روشنی بستر کی خوش نصیبی میں

مستبدل ہو گئی۔

۴۔ **شرح :** محبوب سے ہدائی کی شام آئی تو بقیارہی کے جوش سے ایک طوفان کی صورت اختیار کر لی اور ایسی حالت پیدا ہوئی کہ میرے بستر کا تدار صبح قیامت کے سورج کی کرن بن گیا۔ جو بستر آفتاب حشر کی کرنوں سے بُنا گیا ہو، اس کے جوش اضطراب کا اندازہ کیا کیا جاسکتا ہے ؟

۵۔ **لغات ۔** بالمش : تکیہ ، سرانا۔

شرح : زمینا کی طرح محبوب کو خواب میں دیکھنا اور اس کے دیدار سے لذت اندوز ہونا ہمارے بستر کے لیے باعث ننگ ہے۔ یعنی ہم کہیں گوارا نہیں کرتے کہ بستر پر لیٹیں، میند آئیں، پھر خواب میں محبوب جلوہ دکھائے، جس طرح عام روایت کے مطابق زمینا نے حضرت یوسفؑ کا جلوہ خواب میں دیکھا تھا ہمارا محبوب تو خود ہمارے پاس آتا ہی رہتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ ہمارے پاس تھا۔ اس کی مشک بار دُلف کی خوشبو ہمارے تکیے سے سونگھی جا سکتی ہے۔

عرفی نے بھی ایسا ہی ایک شعر کہا، اگرچہ اس کا موضوع دوسرا ہے :

قانع بہ بوسے دوست نہ گردید شوقی

ایں جنس را بہ مفلس کفناں منور ختم

(ہمارا شوق محبوب کی خوشبو پالینے پر قناعت نہ کر سکا۔ مصلح خوشبو

پر خوش ہو جانے کا معاملہ ہم نے حضرت یعقوبؑ کے حوالے کر دیا،

جو چھارے بالکل تھی دست تھے)

۶۔ **شرح :** اے غالب ! میں کیا بتاؤں کہ محبوب کے مزاق میں دل

کی حالت کیا ہے ؟ بیقرازی کا سرسری اندازہ کرنا چاہو تو یہ سمجھ لو کہ میرے بستر کا ہترا کانٹے کی حیثیت رکھتا ہے، جو اس میں چھپا ہوا ہے۔

خطر ہے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے
 ۱۔ شرح: غرور دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہو جاوے
 خطرو یہ ہے کہ الفت کا رشتہ میری
 گردن کی رگ نہ سمجھ اُس فصل میں کوتاہی نشو و نما غالب
 بن جائے اور اس اگر گلِ سرود کے قامت پہ پیرا بہن نہ ہو جاوے
 وہ بے گردن اگر

نہ جائے۔ محبوب کی دوستی اور محبت پر معزور ہو جانا ایک آفت ہے۔ ایسا نہ
 ہو کہ اسے محبوب! آج تو دوستی پر مانگی ہے تو کل دشمن بن جائے۔
 ۲۔ شرح: اگر فصلِ بہار میں پھول بڑھ بڑھ کر اور نوا پا پا کر سرود کے
 جسم پر لباس نہ بن جائیں تو سمجھ لیا چاہیے کہ بہار نشو و نما کا کمال نہ دیکھا سکی،
 بلکہ اس کا دعوائے کمال ادھر رارہ گیا۔

مطلب یہ ہے، فصلِ بہار میں نشو و نما کا جوش اس درجہ ہونا چاہیے کہ
 پھولوں کے پودے بڑھ بڑھ کر گنبد ہوتے جائیں، یہاں تک کہ معلوم ہو، سونے
 پھولوں کا لباس پہن لیا ہے اور اس کا کوئی حصہ اس لباس سے خالی نہیں۔



فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے
 کیوں بوتے ہیں باغبان تو نے گر باغ گداے میں نہیں ہے
 ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے پر تجھ جیسی تو کوئی شے نہیں ہے
 ہاں، کما یو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
 شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

کیوں روّ قدح کرے ہے زابڑا : خے ہے یہ گیس کی قے نہیں ہے
 ہستی ہے : کچھ عدم ہے غالب ! آخر تو کیا ہے ؟ اے نہیں ہے !

۱۔ لغات - لے : سُر، دُصن -

شرح : سُر اور دُصنیں راگوں اور گیتوں کے لیے ہیں۔ مزایہ و نناں کے
 لیے نہ کوئی سُردکار ہے، نہ دُصن۔ نالہ کسی بھی حالت میں بافسری سے کام لینے
 کا پابند نہیں، کیونکہ بافسری بھلتے وقت سُروں کا دُصین رکھتا جاتا ہے اور گواہی
 کو سُروں سے کوئی مناسبت نہیں۔

سُرمال، قلعہ، بناوٹ اور کاریگری نے پیدا کیے، مزایہ کے وقت ایسی کسی چیز
 کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دل سے نکلتی ہے تو طبیعت علم انگیزی سے وہ تاثیر
 پیدا کر دیتی ہے، جو مال سُرمال کی محتاج نہیں۔

حق یہ ہے کہ اول مضمون نہایت نادر ہے، پھر اسے پیش کرنے کے لیے
 جو انداز اختیار کیا گیا ہے، وہ بے مثال ہے۔

۲۔ لغات - تو تبا : ایک قسم کا تلخ کدو، جسے اندر سے خالی کر کے
 درویش کشکول یا چھاگل بناتے ہیں۔ جب مٹی کے برتن کم تھے تو تو تبا، ہی
 شراب یا دوسرے سیالات کے لیے استعمال کیے جاتے تھے ان میں یہ خوبی بھی
 تھی کہ وزن میں ہلکے ہوتے تھے، گرنے سے ٹوٹتے نہیں تھے اور انہیں ہر آسانی
 حاصل کیا جاسکتا تھا۔ صدیوں تک شراب فروشوں کے لیے تو تبا ہی استعمال
 ہوتے رہے۔ چنانچہ خود مرزا غالب فرماتے ہیں :

گر مٹج بہ کدو ریزہ، برکت نہ در اہی شو

(اگر شراب فروش کدو یعنی تو تبا میں شراب دے دے تو اسے ہاتھ
 پر رکھ کر چل دے)

شرح : اگر باغ کو شراب کی بھیک مانگنا مقصود نہیں تو باغبان

تو تجھے کس لیے کاشت کرتے ہیں ؟

چونکہ تو نے درویشوں کے کشکول بھی بنتے ہیں ، اس لیے کہا کہ باغبانہ شراب کی بھیک مانگنے کے لیے تو تجھے بوٹے ہیں ۔

شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ باغ اور شراب باہم لازم و ملزوم ہیں ۔

۳۔ شرح : اسے محبوب حقیقی اپنے شک و شبہ کائنات کی ہر شے میں تیرا جلوہ نظر آتا ہے ۔ گویا تو ہر وجود میں چھپا ہوا ہے ، لیکن ساتھ ہی ظاہر ہے کہ تجھ ایسی کوئی چیز نہیں ۔ یہ لیس کشمکش شینا کا ترجمہ ہے ۔ نیز تمام اشیا کہ اجسام ہیں اور وہ ذات پاک جہانیات سے بالکل منزہ ہے ۔

۴۔ شرح : خبردار ! سستی کا دھوکا نہ کھانا ۔ کوئی کتنا ہی کہے کہ خدا کے سوا کسی کا وجود ہے ، ہرگز نہ ماننا ۔ اس کے سوا وجود کوئی نہیں ۔

۵۔ لغات : اُردی : مراد ہے اُردی بہشت ، جو ایران میں شمس سال کا دوسرا مہینا ہے ۔ بہار کا بھی یہ دوسرا ہی مہینا ہے ، جس میں سبز و گل کی بہتات کمال پر پہنچ جاتی ہے ۔

دسے : شمس سال کا دسواں مہینا ، جو بھرپور خزاں کا مہینا ہے ۔

شرح : مرزا غالب کے اس شعر کا بنیادی مضمون ہے ۔

تعارف الاشیاء باضداد ؛ یعنی چیزیں ایک دوسرے کی ضد سے پہچانی جاتی ہیں ۔ خوشی کا احساس غم کے احساں پر مبنی ہے اور خزاں کا احساس بہار کے احساس پر موقوف ہے ۔

کہتے ہیں ، دل سے مسرت و شادمانی کا احساس محو کر ڈال تا کہ غم کے احساس سے محظوظ ہو جائے ۔ اگر تو بہار کی آمد سے خوش نہ ہوگا تو خزاں کی آمد تیرے لیے رنج و غم کا پیغام نہ بن سکے گی ۔ جو شخص نشاط بہار کا خوگر نہ ہو ، اسے خزاں کی افسردگی چھو بھی نہیں سکتی ۔

۶۔ لغات : قدح : شراب کا پیالہ ۔

گس کی تھے : شہد کی مکیاں پسوں، پسوں سے دس چوستی ہیں اور شہد بنا کر شہد کے
 ہاتھ پھٹے میں اگل دیتی ہیں۔ شہد کو زیادہ سے زیادہ کردہ ظاہر کرنے کے لیے گس کی تھے قرار دیا۔
 شرح : اسے زاہد تو شراب کا پیلا کیوں ٹھکراتا ہے ؟ اسے پی لینے سے لٹکاریوں کرتا ہے یہ
 شراب ہے کھس کی تھے نہیں جس سے شجے کراہت آتے ۔

۷۔ لغات : نہیں ہے : کھ لینی لیکن اس شعر میں یہ طور اسم علم استعمال ہوا ہے اس سے
 اسے " اے نہیں ہے " کہہ کر خطاب کیا۔

شرح : اسے غالب : نہ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ تو حقیقتہً موجود ہے اور نہ کہ کہہ سکتے ہیں
 کہ تو غائب ہے وجود ہے ۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے وہ شخص جو بار بار " نہیں ہے " نہیں ہے
 کہہ رہا ہے اور تجھے نہیں ہے " سوچ کر لیتا زیبا ہے ، تو بتا کہ آخر تو ہے کیا ؟ جس پر نہ خاص مہتی کا
 اطلاق ہو سکتا ہے ، نہ خاص مہتی کا ۔

○
 نہ پوچھ سوچ مریم جو راحت دل کا کہ اس میں ریزہ الماس جزو اعظم
 بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا وہ اک نگہ کہ نہ نظر ہر نگاہ سے کم ہے

۱۔ لغات : الماس : ہیرا ، جو مریم میں ڈال دیا جائے تو زخم
 کو بڑھاتا ہے ، جس طرح نمک اور مشک زخم کی تکلیف میں اضافہ کرتے ہیں
 شرح : زخم دل کے لیے جو مریم موجود ہے ، اس کے اجزاء کی
 تفصیل نہ پوچھ ، بس اتنا جان لے کہ ہیرے کا ٹکڑا اس کا سب سے بڑا
 جزو ہے ۔

۲۔ شرح : اے محبوب ! تو نے مدت تک میری طرف سے تغافل
 اور بے پروائی اختیار کیے رکھتی ۔ اس کے بعد ایسی نگاہ پیدا کی ، جو حقیقتہً
 نگاہ سے کم ہے ۔ یعنی تو نے دیکھنا بھی شروع کیا تو کلکھیوں سے ، جس
 کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی گوشہ چشم سے مجھ پر نگاہ ڈال دیتا ہے ۔
 مولانا طہطائی کہتے ہیں :

- بڑا حسن اس شرکاء ہے کہ محبوب کے تغافل کی تصویر دکھا دی ہے۔ دوسرا لطف یہ ہے کہ ایک نگاہ میں ایسی تفصیل کہ نگاہ ہے اور نگاہ سے کم ہے۔ اس کے علاوہ ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ نگہ - یقیناً نگاہ سے کم ہے کہ "نگاہ" میں الف ہے اور "نگہ" میں نہیں ہے۔



ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں، وے ان کی تمنا نہیں کرتے
دہ پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ انہیں کرتے
یہ باعثِ نو میدیِ اربابِ ہوس ہے غالب کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

۱۔ شرح : رشک کے باعث ہمیں یہ بھی منظور نہیں کہ محبوب کی تمنا کریں اور اس سے وصال کے طلبگار ہوں۔ ہمیں جان دے دینا منظور ہے، لیکن رشک اپنا بھی گوارا نہیں۔

یہ ویسا ہی مضمون، جیسا مرزا نے دوسری جگہ کہا ہے :
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجاتے ہے
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جاتا ہے

مولانا طباطبائی نے خوب مزایا : جس طرح انتہائے بخل کا مرتبہ یہ ہے کہ بخیل خود بھی اپنی دولت سے محروم رہتا ہے، وہی حال انتہائے رشک کا ہے کہ تمنا سے وصل کرتے ہوئے اپنے اوپر آپ رشک آتا ہے۔

۲۔ شرح : محبوب نے پردے پردے میں غیر یعنی رقیب سے پوشیدہ تعلق قائم کر رکھا ہے۔ مجھ پر یہ ظاہر کیا کہ ہم جو غیر سے بے تکلف

ملنے میں اور پروہ نہیں کرتے تو دہرے ہے کہ ہم اسے اجنبی سمجھتے ہیں۔ نیز ہم نہیں چاہتے کہ
بہرہ کرنے سے لوگ ہمارے تعلق کے بارے میں پے میگوئیاں کرنے لگیں۔

۳۔ شرح : اے محبوب! تم غالب جیسے سچے عاشق کو برا کہتے ہو، یہ شین اچھا نہیں، کیونکہ
جب بچے عشق کی یہ گت بن رہی ہے تو جو لوگ ہوس کے بہاری ہیں یعنی غیر لہر و تاب، وہ تو بالکل ناامید
اور پاپس ہو جائیں گے۔



۱۔ لغات	کرے ہے بادہ، ترے لبے کسب رنگِ فروغ
کب :	خطِ پیالہ سرا سر نگاہِ گلچیں ہے
حاصل کرنا :	کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
شرح :	کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالین ہے
اے محبوب !	بجائے، اگر نہ سنے نالہِ ہائے بلبلی زار
شراب تیرے	کہ گوشِ گل، ہم شبنم سے، پنبہ آگیاں ہے
لب لعلیں	اسد ہے نزع میں، چل بے وفا، براے خدا
سے فروغ کا	مقام ترکِ حجاب و وداغ تمکیں ہے
رنگ حاصل	یعنی تیرے لب
کر رہی ہے،	کی بدست

اس میں وہ تمام ظاہری و معنوی خوبیاں پیدا ہو رہی ہیں، جو شراب کے لیے
خاص مافی جاتی ہیں۔ اور پیالے میں پیمائش کے لیے جو خط لگا ہوا ہے معلوم
ہوتا ہے کہ وہ ابند اسے انتہا تک پھول پھٹنے والے کی نگاہ بن گیا ہے۔

مطلب یہ کہ پیالہ تیرے لبوں سے چھوتے ہی شراب نے اتنا رنگ
حاصل کر لیا، معلوم ہو رہا تھا، پیالے کے اندر پھلاڑی مٹیا ہو گئی ہے
اور خطِ پیالہ نے پھول پھٹنے شروع کر دیے۔

۲۔ **شرح :** میرا دیوانہ دل ایک بیت سے اس حسرت میں مبتلا چلا آتا ہے کہ اے محبوب ! تیرا سر میرے تنگے پر ہو۔ آخر کیسی تو یہ امید پوری کر دیجیے۔ کہ نہک اسی حسرت میں عمر گزرتی جائے گی ؟

۳۔ **لغات :** پنبہ آگیں : روٹی سے بھرا ہوا۔

شرح : اگر بھول بھاری ٹیبل کی فریاد و فغاں نہ سنے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، کیونکہ اس کی منی نے اس کے کانوں میں روٹی ٹھونس رکھی ہے۔

اوس کے قطروں کو سفیدی کے باعث روٹی سے تشبیہ دی اور کان میں پانی جمع ہو جانے کو سماعت میں فرق آ جاتا ہے۔ نم شبنم سے یقیناً پھول میں تری جمع ہوئی اور سورج کی روشنی میں شبنم سفید دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح گوش گل شبنم سے پنبہ آگیں ہو گیا۔

۴۔ **شرح :** اسد جانگنی کی حالت میں ہے۔ اے بونہا محبوب ! خدا کے لیے چل اور اس کا حال پوچھ۔ یہ وقت ایسا ہے کہ شرم و حجاب چھوڑ دینا چاہئے اور وقار و وقعت کو رخصت کر دینا چاہیے۔



کیوں نہ ہو چشمِ بٹاں محو تغافل، کیوں نہ ہو ؟
یعنی اس بے یار کو نظارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
و اے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

۱۔ **شرح :** محبوبوں کی آنکھ تغافل سے کیوں کام نہ لے ؟ وہ ضرور کام لے گی، کیونکہ یہ ایسا بے یار ہے جسے

نظارے سے عارضِ گلِ دیکھ، روئے یار یاد آیا، اسدا !
 پرہیز کی تاکید جوششِ فصلِ بہارِ اشتیاق انگیز ہے
 کی گئی ہے ۔

محبوبوں کی آنکھ کی ایک صفت بیمار بھی ہے، چشمِ بیمار، فیصلی آنکھ۔
 لفظ ”بیمار“ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ دیا کہ بیماریوں کو عموماً کسی نہ کسی
 چیز سے پرہیز کی تاکید کی جاتی ہے اور چشمِ بیمار کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنا
 ممنوع قرار دیا گیا ہے، لہذا ان کے بے تغافل کے بغیر چارہ نہیں۔
 ۴۔ شرح : اگر خنجر کند ہوتا تو گلا کٹنے میں کچھ نہ کچھ دیر ضرور لگتی
 اور یہیں محبوب کو دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ اب اس نے خنجر خوب تیز کر رکھا
 ہے، گویا ایک لمحے میں گلا کٹ جائے گا اور مرتے مرتے اسے دیکھ لینے کی
 آرزو جی میں رہ جائے گی۔

۳۔ لغات : اشتیاق انگیز : شوق کو تیز کرنے والا۔
 شرح : اے اسدا ! پھول کا چہرہ دیکھ کر محبوب کا چہرہ یاد آتا
 ہے۔ ہر طرف فصلِ بہار کا جوش ہے اور اس جوش کے باعث دل میں شوق
 کی آگ تیز ہو رہی ہے، کیونکہ ہر جانب پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہر
 پھول روئے یار کی یاد تازہ کر رہا ہے۔



۱۔ شرح : دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کیسے
 عاشق نے
 ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کیسے
 محبوب کو خط
 یہ صد کہ آج نہ آوے اور آئے پن نہ رہے
 پہنچانے کیسے
 قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کیسے !
 نامہ بر تلاش کیا

رہے جے یوں گے وہ بے گہ کہ کو سے دوست کو اب
 اگر نہ کیسے کہ "دشمن کا گھر ہے" کیا کیسے؟
 نہ بے کر شہر کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
 کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے، کیا کیسے؟
 سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پر سش حال
 کہ یہ کہے کہ "سر رہنموز ہے" کیا کیسے؟
 تمہیں نہیں ہے سر رشتہ وفا کا خیال
 ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کیسے؟
 انھیں سوال پر نہ ہم جنوں ہے، کیوں لڑیے؟
 ہمیں جواب سے قطع نظر ہے، کہا کیسے؟
 حد سزا کے کمال سخن ہے کیا کیسے؟
 ستم ہمارے متاع ہمز ہے، کیا کیسے؟
 کہا ہے کس نے؟ کہ غالب بُرا نہیں، لیکن
 سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہے، کیا کیسے؟
 نہیں سکتا، پھر اسے قصور وار کیوں ٹھہرایا جائے؟ میں نے تو اسے نامہ ر
 بنا کر بھیجا تھا۔ اگر وہ میرا رقیب بن گیا تو اسے کیا کڑھکتے ہیں؟

وہ خطے کر
 محبوب کے پاس
 پہنچا تو دیکھتے
 ہی دل دے
 بیٹھا اور عاشق
 کا رقیب بن گیا۔
 مزارتے ہیں کہ
 اگر نامہ بنے
 محبوب کو دل
 دے دیا اور
 اس پر عاشق
 ہو کر میرا رقیب
 بن گیا تو اسے
 کیونکر انزام
 دوں؟ آخر
 وہ انسان ہے
 اور کوئی سلیم الخوا
 انسان میرے
 محبوب جیسے
 حسین کو دل
 دے بغیر وہ

پورے شعر کا حاصل یہ ہے کہ کوئی انسان میرے محبوب کو دل دیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

۲۔ **شرح :** موت بہر حال آئے گی، لیکن ہم آج اس کے آرزومند ہیں اور اسے منہ ہے کہ آج نہیں، بلکہ مقررہ وقت پر آئے گی۔ آہ! ہم کیا کہیں کہ موت سے ہمیں کس قدر شکایتیں ہیں۔ جب اُسے آنا ہی ہے اور گئے بغیر رہ نہیں سکتی تو آج کیوں نہیں آ جاتی ؟

۳۔ **شرح :** رقیب کو جب دیکھو، وقت بے وقت محبوب کے کپڑے میں موجود رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کو چپے کو رقیب کا گھر نہ کہیں تو کیا کہیں گھر وہی مقام ہے، جہاں انسان عموماً رہتا ہے اور خاص مشاغل کے بغیر وہاں سے باہر نہیں جاتا۔ جب رقیب نے کوئے یار میں رہنے کی ویسی ہی صورت پیدا کر لی ہے تو وہی اس کا گھر بن گیا۔

۴۔ **شرح :** یہ معشوقانہ ناز و انداز تو دیکھیے کہ جب ہم دل کی بات کہنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ مزید دے دیا جاتا ہے کہ ہمیں کہے بغیر ہی سب کچھ معلوم ہے اور تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح وہ دل کی بات بھی نہیں سنتے۔

۵۔ **شرح :** جب کبھی بازار میں ملاقات ہو جاتی ہے تو خوب سوچ سمجھ کر وہیں حال پوچھنے لگتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ عاشق بازار میں دل کھول کر بات نہیں کر سکے گا۔ وہ پرسش کا فرم ادا کر دیں گے اور جو کچھ انہیں سنانا چاہیے، اس کی نوبت نہ آئے گی۔

شعر کا ایک پہلو یہ ہے کہ مشرف خاص باتیں بازار میں کرنا اور رکنا آداب کے خلاف سمجھتے تھے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ محبوب حد درجہ شوق و حیا رہے جو گرد و پیش دیکھ کر حال پوچھتا ہے تاکہ تفصیل کی نوبت نہ آئے۔

۶۔ **شرح :** اے محبوب! تمہیں تنافل کے باعث سر درشت و نا کا

ذرا خیال نہیں۔ یہ دیکھو، ہماری مسٹی میں کچھ ہے، مگر کیا ہے؟ ذرا بتائیے تو؟

مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

۔ اس شعر کا انداز بندش بھی نیا ہے اور معنوں بھی تازہ ہے۔

تازگی معنوں تو یہ ہے کہ سرد مشق و وفا کو ایک محسوس شے

فرزن کر لیا ہے کہ مشق سے پوچھتے ہیں، بتاؤ، ہماری مسٹی میں

کیا ہے؟ بندش کی جوت یہ ہے کہ پوچھتے بھی ہیں، مسٹی میں کیا

ہے؟ پھر جو چیز مسٹی میں ہے اس کا نام بھی لے دیا۔

۷۔ **شرح :** محبوب سے سوال کیا جائے تو فرماتے ہیں، معلوم ہوتا

ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ ہم نے اس ارشاد کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کر رکھا

ہے، پھر کہیں تو کیا کہیں؟

مولانا طہطائی فرماتے ہیں : معنوں خوبی شعر کا سبب نہیں، بلکہ دونوں

معروضوں کی بندش میں ترکیب کے قنابہ ہونے سے شعر میں حسن پیدا کیا۔

۸۔ **شرح :** اگر کوئی شخص سخنوری میں کمال پیدا کرے تو اسے سزا

یہ ملتی ہے کہ لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں، یعنی کوئی بلند پایہ سخنور ایسا

نہیں، جو حسد کا تختہ مشق نہ بننا ہو۔ اسی طرح جس شخص کے پاس ہنرمندی

کی بیش بہا متاع موجود ہے، اسے قیمت یہ ملتی ہے کہ اس پر ظلم توڑے جائے

ہیں۔ گویا اس شعر میں مرزا نے زمانے کی تنگ نظری، خیرہ ذوق اور قدر ناشناسی

کی تصویر کینچ دی ہے۔

۹۔ **شرح :** یہ کس نے کہا کہ غالب بُرا نہیں؟ نہیں، مزہ دیکھیے کہ

وہ بُرا ہے، بہت بُرا ہے، لیکن یہ تو سوچیے کہ آخر دیوانے کے سوا اسے

کیا کہا جاسکتا ہے اور کھاہر ہے کہ دیوانے پر اچھا بی بیاتی کا حکم لگانا اہل

عقل و دانش کا کام نہیں۔

دیکھیے، کس خوبی اور نکتہ نوازی کے ساتھ اپنی برائیوں سے براہ راست حاصل کر لی۔

دیکھ کر وہ پردہ گرم دامن افشانی مجھے
 کر گئی وابستہ تن، میری عریانی مجھے
 بن گیا تیغ نگاہ یار کا سنگِ فاس
 مرجبائیں! کیا مبارک ہے گراختانی مجھے
 کیوں نہ ہو بے اتفاقی اس کی خاطر جمع ہے
 جانتا ہے عجب پرستشائے پنہانی مجھے
 میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
 لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے
 بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے
 اس قدر فوقِ نوالے مرغِ بستانی مجھے
 داسے! واں بھی شورِ محشر نے زدم لینے دیا
 لے گیا تھا گور میں فوقِ تن آسانی مجھے

۱۔ لغات:

دامن افشانی: پتہ مھاڑنا، دنیا چھوڑ دینا۔

شرح: جب میری برہنگی نہ دیکھا کہ میں خفیہ خفیہ پتہ مھاڑ کر دنیا کو چھوڑ دینے میں سرگرم ہوں تو مجھے جسم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

مطلب یہ کہ دنیا سے بے تعلق ہو جانا آسان نہیں جب تک انسان بدن کے ساتھ وابستہ ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دنیا سے

وعدہ آنے کا دُعا کیجئے ، یہ کیا انداز ہے ؟
 تم نے کیوں سوئی ہے ، میرے گھر کی درباری مجھے ؟
 ہاں ، نشاطِ آمدِ فضلِ بھاری ، واہ واہ
 پھر ہوا ہے تازہ سوداے غزل خوانی مجھے
 وی مرے بھائی کو حق نے ، از سر نو زندگی
 میرزا یوسف ہے ، غالب ! یوسف ثانی مجھے
 مجرّد تھا ، جہانیاں سے کوئی ملا نہ تھا ۔ جب مجھے سرگرم تنفس دیکھا تو مجرّد
 مجھے وا بیٹہ جسم کر کے رخصت ہو گیا ۔

۲۔ مطلب یہ کہ عالمِ اجسام کی نفس شادی میں مجھے سرگرم دیکھ کر مجرّد
 نے زندانِ بدن میں مجھے چھوڑ دیا اور آپ رخصت ہو گیا ، یعنی جسے واسن
 انسانی کا شوق ہو اُسے تجرّد و عریانی سے کیا واسطہ ؟
 ۳۔ ”دہ پردہ“ کے لفظ میں یہ رعایت رکھی ہے کہ تنفس بھی حجابِ صدر
 سے تعلق رکھتا ہے ۔

۴۔ لغات ۔ سنگِ فساں : وہ پتھر جس پر تلوار ، پھری ،
 خنجر وغیرہ تیز کیے جاتے ہیں ۔ سان ۔

گرا سنجانی : سخت جانی ، یعنی جان کا بہ مشکل نکلنا ۔

مشرّح : میری سخت جانی مبارک باد کے قابل ہے ، کیونکہ اس
 کی بدولت میں محبوب کی تیغِ نگاہ کے لیے سان کا پتھر بن گیا ۔

اس میں مرزا کے پیشِ نظر یہ حقیقت ہے کہ میں سخت جان ہوں اور
 مجھے قتل کرنا آسان نہیں ، بلکہ سخت مشکل ہے ۔ محبوب کی نگاہ کے وار بار

بارہوتے ہیں ، لیکن میری جان نہیں نکلتی اور ہر دار میں محبوب کی تیغ نگاہ میری
سخت جانی پر درگزا کھانے سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

۳۔ **تشریح :** وہ کیوں نہ مجھ سے بے رُخی برتے ؟ وہ ہانتا ہے کہ
بھی بکھار خواب میں آکر میرا حال پوچھ لیتا ہے اور میں اتنی ہی توجہ پر خوش
ہوں۔ اس سے اسے اطمینان ہے اور بے التفاتی میں کوئی تاقل نہیں ہوتا۔

۴۔ **تشریح :** جب قسمت کھنے والے نے میرے سیاہ خانے کی
قسمت لکھی تو دیرانی کے دوسرے اسباب کے ساتھ مجھے بھی شامل کر دیا۔ اسی
کا نتیجہ ہے کہ میں دیرانی کا تختہ مشق بنا ہوا ہوں اور میری قسمت یہی ہے۔

۵۔ **تشریح :** میرے محبوب کے مزاج میں اتنی ہر گانی ہے کہ جب
مجھے بھل کے نئے نئے ہونے دیکھتا ہے تو کچھ اور شبہ کرنے لگتا ہے۔
کاش ! مجھے بھلوں کے نئے نئے ہونے کا اتنا ذوق نہ ہوتا تا کہ اسے ہر گانی کا
سامنا نہ ملتا۔

اس سے ملتا جلتا مضمون پہلے بھی کر چکے ہیں۔

کیا ہر گان ہے مجھ سے کہ آئینے میں برے
طوطی کا عکس سمجھتا ہے زنگار دیکھ کر

۶۔ **لغات۔** تن آسانی : آرام طلبی۔

تشریح : مجھے آرام طلبی کا ذوق قبر میں لے گیا تھا ، لیکن انوس
وہاں بھی قیامت کے شور نے دم نہ لینے دیا اور اٹھایا۔

تن آسانی کا تقاضا یہ تھا کہ خیمہ میں خلل کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی۔
شورِ محشر نے آکر جگا دیا اور تن آسانی کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

مولانا طلبا لطیفی فرماتے ہیں کہ یہ شعر اس زمین میں بیت الغزل ہے۔
خوبی اس میں یہ ہے کہ قبر میں جانے کی توجہ بہت تازہ ہے۔ ذوقِ تن پرست
اس شعر کی جان ہے ، جس نے مضمونِ مردہ کو زندہ کر دیا اور مصنف کی

معجزہ بانی پر ایک شاہد ہاتھ آیا۔ تن پرستی اور آسائش طلبی کی برائی کیا تھی
طرح بیان کی ہے !

۷۔ **مشریح :** محبوب سے خطاب ہے کہ میرے پاس آنے کا ردہ
کیا تھا، لیکن آنے نہیں اور میں بیٹھا انتظار کر رہا ہوں۔ گھر سے ادھر ادھر
نہیں ہو سکتا، گویا اپنے گھر میں درباری بنا ہوا ہوں۔ یہ کیا انداز ہے ؟

۸۔ **مشریح :** واہ وا ! افضل بہار آئی اور اس سے عیش و شادمانی
میں ایسی تازگی پیدا ہوئی کہ غزل سرائی کے جس جنون کو فراغوش کیے بیٹھا
تھا، وہ عود کر آیا۔

۹۔ **مشریح :** خدا نے میرے بھائی میرزا یوسف کو بیماری سے شفا
بخشی اور ہنٹے سرے سے زندگی بل گئی۔ اے غالب ! میرا بھائی میرے لیے
یوسف ثانی ہے۔

میرزا یوسف مرزا غالب سے دہریس چھوٹے تھے، انہیں جوانی ہی
میں جنون کا عارضہ ہو گیا تھا، جس سے عارضی طور پر شفا پائی۔ غالباً اسی
موقع پر یہ غزل کہی گئی تھی۔ میرزا یوسف پھر بیماریا ہو گئے اور شفا
جب انگریزوں نے دہلی کا محاصرہ کر رکھا تھا، ان کا انتقال ہوا اور پاس
کی ایک مسجد کے احاطے میں انہیں سپرد خاک کیا گیا۔

یاد ہے شادی میں بھی، ہنگامہ ”یارب“ مجھے
ستجہ زاہد ہوا ہے، خندہ زیر لب مجھے
ہے کشادِ خاطر و البتہ، در رہن سخن
تھا طلسمِ قفلِ اسجد، خانہ مکتب مجھے
۱۔ لغات :
یارب :
اسے پروردگار !
ایرانوں نے
اسے دعا اور

وفاقِ دونوں
معنی میں استعمال
کیا۔
شبیخہ زائدہ
زائدہ کی تیسج
ہیماں مراد ہے
کسی عبادت گزار
کا تیسج کرنا، جو
عام طور پر آہستہ
آہستہ کی جاتی ہے اور اصطلاح میں اسے ذکر خفی کہتے ہیں۔ اس کی ضد ذکرِ کبر
ہے۔ یعنی بلند آواز سے ذکر کرنا۔

خندہ زیر لب : لبوں میں ہنستا یعنی کھل کر دہننا، مسکراہٹ ہم
شرح : مجھے عیش و نشاط میں بھی خدا نہیں پہنچاتا بلکہ انسان عموماً ایسے
اوقات میں خدا کو بھول جاتے ہیں۔ پس اس حالت میں بھی ہرستور یارب !
اسے پروردگار ! اے اللہ ! پکارتا رہتا ہوں، ہیماں تک کہ لبوں میں ہیری
سہنی یعنی مسکراہٹ بھی ایک پرہیزگار آدمی کا تیسج کرنا ہے۔

۲۔ لغات : گشاد : کھلنا، کشائش۔

خاطر و البستہ : بندھا ہوا دل، یعنی لول اور رنجیدہ دل۔
در رہن سخن : بات کے پاس گرو، اس سے مراد سچا بات پر موقوف ہونا۔
قفل الجبر : اس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے، یعنی ایسا قفل جو مختلف
حروف کو ملا کر ایک لفظ بنا لینے سے کھلتا ہے۔

شرح : میرے لول اور رنجیدہ دل کا کھلنا اور شادماں ہونا،
بات پر موقوف ہے، یعنی دل اُسی وقت خوش ہوتا ہے، جب وہ سنی گزرتی

میں مصروف ہو۔ میرے لیے درسگاہ بھی نقل البعد کا ظلم، یعنی جب تک مختلف حدود طاکر صحیح بات نہیں بنتی تھی، قفل نہیں کھلتا تھا، ٹھیک اسی طرح بات بننے یا بنانے پر میرے دل کی فرحت و کشادگی موقوف ہے۔

۳۔ لغات - زندانی : قیدی -

شرح : اے خدا! اس دیوانگی کی داد کس سے چاہیں کہ جب میں قید میں تھا تو یہ آرزو تھی کہ صحرانوردی اور دشت پیمائی کا موقع ملے۔ اب وہ آرزو پوری ہوئی تو اس امر پر رشک ہو رہا ہے کہ قیدی کتنے آرام میں ہیں۔

دیوانگی یہ کہ نہ پہلی حالت پر اطمینان تھا، نہ دوسری حالت میں سکون کی کوئی صورت پیدا ہوئی، کبھی جنگلوں میں پھرنے کا شوق تھا، اب معلوم ہوا کہ جو لوگ جنگلوں میں پھرتے ہیں، ان کے مقابلے میں وہ لوگ زیادہ آرام سے ہیں، جو جیل خانے میں بند ہیں۔ اتنے زیادہ آرام میں ہیں کہ ان کی حالت پر رشک آتا ہے۔

۴۔ لغات - شکست آرزو : آرزو کا ٹوٹنا یعنی پورا نہ ہونا۔ مطلب : اس شعر میں یہ معنی مطلوب استعمال ہوا ہے۔

شرح : میں کیا کروں، میری نظرت ہی حسرت و نامرادی کی رہی ہے۔ اگر کسی چیز کی آرزو پیدا ہوتی ہے تو میرا مقایہ نہیں ہوتا کہ وہ آرزو پوری ہو جائے، بلکہ اس کے پورا نہ ہونے کا مطلب گار دیتا ہوں۔ حسرت و نامرادی کی لذت طبیعت کو اس درجہ پسند ہے کہ میں کسی آرزو کے پورا ہونے کا خواہاں ہی نہیں۔

۵۔ لغات : آپ بھی : خود بھی۔

میرزا صاحب : غالب، یہاں صاحب کی ج مفتوح رکھی گئی ہے۔ حالانکہ حقیقت کسور ہے۔ دراصل مرزا نے لغت کے بجائے عام بول چال کو

ترجیح دی۔ بول چال میں اسے مفتوح ہی ہوتے ہیں۔

شرح : دیکھیے، غالب دل لگا کر خود بھی عجب ایسے ہی ہو گئے، حالانکہ حضرت میرزا صاحب پہلے بڑے کروفر کے ساتھ مجھے عشق سے روکتے رہتے تھے۔ جب خود ان کے دل پر سنی تو ساری پندہ نصیحت بھول گئے۔

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنویاں چمن کی آزمائش ہے
قدو گیسو میں قیس و کوہن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے
نیم مصر کو کیا پیر کنناں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوے پیر بن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں، دیکھو نہ کہ پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبر اہل انجن کی آزمائش ہے
رہے گردِ دل میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو بہتر
غرض شہرت بہت ناوک نلک کی آزمائش ہے

۱۔ شرح :
شر سے ظاہر ہے
کہ یہ غزل جس
مشاعرے میں پڑھی
گئی تھی، وہاں
ہمارے شاہ ظفر
بہ نفسی نفسیں موجود
تھے۔ اہلب ہے
یہ مطلع بادشاہ کے
موجود ہونے کی وجہ
سے موقع پر کہ
یا گیا ہو۔
آج بادشاہ
سلامت کے حضور
سخنوروں کی آزمائش
ہے۔ گویا یہ بزم
مشاعرہ ایک باغ

نہیں کچھ سُجھ و زتا ر کے پھندے میں گیرائی
 وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
 پڑا رہا، اے دل وابستہ، بتیابی سے کیا حاصل
 مگر پھر تاب زلفِ پُر شکن کی آزمائش ہے
 رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو
 ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے
 وہ آئیں گے برے گھر، وعدہ کیا، دیکھنا غائب
 نئے فتنوں میں اب چرخِ کُنن کی آزمائش ہے

۲۔ لغات :

دار و رسن :

سُولی اور رستا ۔

جس سے موت کی

سزا دی جاتی ہے ۔

شرح : مجنوں اور مزاد کا معاملہ میل اور شیریں کے قد اور زلفوں
 تک محدود تھا ، لیکن جس مقام پر ہم ہیں ، وہاں آزمائش کے لیے سُولی اور
 رستا موجود ہے ۔

شعر میں قد کو دار سے اور گیسو کو رسن سے جو تشبیہ دی گئی ہے ، وہ
 محتاجِ تشریح نہیں ۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اپنا مرتبہ قیاس اور کو بکت سے بددجا
 بلند تر ثابت کیا یعنی ان کی آزمائش صرف ان کے محبوبوں کے قد و گیسو میں تھی
 ہماری آزمائش دار و رسن میں ہے اور دار و رسن کی منزل قد و گیسو کے مقابلے
 میں ہزار درجہ سخت ہے ۔

۳۔ لغات : نیرو : قوت ، طاقت

شرح : مزاد کے حوصلے کا امتحان تو آگے چل کر ہو گا ، ابھی تو
 اُس غریب کی قوتِ بدن آزمائی جا رہی ہے ۔

اس شعر میں مزاد کے قصبے کی طرف تلج ہے، یعنی اسے پہاڑ کاٹنے کا کام دے دینے کا مطلب صرف اتنا تھا کہ اس کے بدن کی قوت آزمائی جائے دیکھا جائے کہ اس کی جسمانی طاقت کتنے پانی میں ہے۔ وہ پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لاسکتا ہے یا نہیں۔ اس آزمائش میں وہ پورا اُترا۔ پہاڑ کاٹ گیا اور جوئے شیر بہ نکل۔ اس کے بعد اس غریب کے حوصلے کا امتحان یوں کیا گیا کہ ایک بڑھیا کو بھیج کر شیریں کے مربانے کی خبر پہنچادی گئی۔ یہ خبر سنتے ہی مزاد کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے آہ بھر کر تیش سر پر مارا اور وہ غمگین ہو گیا، گویا اس آخری امتحان میں پورا نہ اُترا۔

۴۔ لغات - پیر کنٹھاں : کنعان کا بوڑھا، یعنی حضرت یعقوب۔
جو خواہی : خیر خواہی۔

شرح : اس شعر میں حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے واقعے کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے، جب حضرت یوسف مصر میں بھائیوں پر ظاہر ہو گئے تو انہوں نے فرمایا :

”اب تم یوں کرو کہ میرا یہ کڑا (بہ طور علامت کے) اپنے ساتھ لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو کہ اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔ پھر اپنے گھرانے کے تمام آدمیوں کو لے کر میرے پاس آ جاؤ اور جب (کہتا ہے کہ) قافلے نے مصر کی سرزمین چھٹی تو (ادھر کنعان میں) ان کا باپ بولا : اگر تم لوگ یہ نہ کہنے لگو کہ بڑھاپے سے اس کی عقل ماری گئی تو میں کہوں گا : مجھے یوسف کی ملک آ رہی ہے۔“ (سورۃ یوسف)

مصر سے آنے والی نسیم کو حضرت یعقوب کی خیر خواہی کا کوئی خیال نہیں، اسے تو حضرت یوسف کے کرتے کی ملک آزمائی ہے، یعنی یہ دیکھنا ہے کہ کرتے کی ملک مصر سے کنعان پہنچتی ہے یا نہیں۔

۵۰۔ **شرح :** دیکھو، خبردار ہو جاؤ، وہ غارت گری سب بزم میں آ رہا ہے۔ پھر نہ کنا کہ آگاہ نہ کیا گیا اور غافل رہے۔ بزم میں جتنے لوگ بیٹھے ہیں، ان کے صبر و ضبط کا امتحان درپیش ہے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کون اس کی غارت گری سے بچتا ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

”جیسا مصرع مصنف نے یہاں لگایا، ادیب کی نظر میں مردے کو زندہ کر دینے سے کم نہیں۔ معنوں مردہ ہے، فقط مصرع لگا کر اس میں جان ڈال دی۔ یہ وہی معنوں ہے، جو کروڑ وندہ باندرھا گیا کہ مشق کے دیکھنے سے صبر و شکیب نہیں باقی رہتا۔ مصرع جو لگایا، اس کے تین ٹکڑے کرو (وہ آیا بزم میں) جیسے کہتے ہیں وہ چاند تھو (دیکھو) بشیار ہو جاؤ، دلوں کو سنبھال لو، (دیکھو پھر کہ غافل تھے) یہ جملہ بھی وہی معنی رکھتا ہے، جو ”دیکھو“ کے ہیں، لیکن یہ پتلے پتلے کی تاکید ہے اور شعر میں حسن اسی تاکید سے بہت پیدا ہو گیا ہے اور ”وہ“ کے اشارے سے“

۶۔ **لغات - شمسیت :** نشانہ۔

نادک ننگن : تیر انداز۔

شرح : محبوب کا تیروں میں رہ جائے تو وہ بھی اچھا، جگر کے پار ہو جانے تو اس سے بہتر، میں بھی دو بہت ہیں اور اس کی تیر اندازی کی آزمائش درپیش ہے۔

۷۔ **لغات - گیرائی :** گرفت، پکڑ۔

شرح : تسبیح اور زنا کے پھندے میں کون سی پکڑ ہے؟ یہ دعا گے کسی کو کیونکر گرفت میں رکھ سکتے ہیں؟ اصل چیز تو یہ ہے کہ آزمایا جائے، شیخ اور برہمن کی وفاداری کا کیا حال ہے، یعنی وہ کب تک اپنے اپنے مسلک پر کچے

رہ سکتے ہیں اور اسے نہاد تک پہنچا سکتے ہیں۔

۸۔ **شرح :** اسے قیدی دل، جو زلفت کے پھندے میں بری طرح بکڑا ہوا ہے، آرام و اطمینان سے بیٹھا رہ، بیتابی اور بغیراری سے کیا ہاتھ آئے گا تو اس پھندے سے آزادی کی کوشش کئی مرتبہ کر چکا ہے، لیکن تجھے رانی نہیں ملی۔ کیا پھر اس غم بہ غم زلفت کی قوتِ گرفت آزمانا چاہتا ہے، جو بار بار آزما کر ناکام رہ چکا ہے ؟

۹۔ **شرح :** مجنوری مرحوم نے لکھا ہے :
 " قدرت نے قریب قریب جلد ملک سمیات کو تلخ بنایا ہے۔ ہندوستان میں جو زہر زیادہ تر خود کشی کے لیے مستعمل ہیں، وہ تیلیا، سنگھیا، دھتورا، انیون اور گھٹلا ہیں۔ یہ سب تلخ ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے مشکل ان کا مٹنا تک لے جانا ہے۔ زہر کا فعل معدے کے فعل پر منحصر ہے اور دیر طلب ہے۔ چنانچہ دودھ اور پیس، سر، بدو اطراف، املا، فسیان، جریان خون، پیاس، ضیق النفس اور انقباض و تشنج، جو موت کی علامتیں ہیں، اس وقت تک شروع نہیں ہوتیں کہ زہر سہرا بیت نہ کر جائے۔ مرنا نے غم اور رنج کے آخر کا مقابلہ زہر سے خوب کیا۔ آغاز میں غم صرف تلخ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انجام کار رفتہ رفتہ گھٹلا کر مار دیتا ہے۔ "

زہر غم رگوں اور مشربلاؤں میں اترے گا تو دیکھنا چاہیے کہ اس کا اثر کیا ہو گا۔ ابھی تو صرف مُتہ اور حلق کی کڑواہٹ کا معاملہ درپیش ہے۔ ابھی تو یہ دیکھا جا رہا ہے کہ اس تلخ چیز کو کون کون کھانے کی ہمت رکھتا ہے۔

۱۰۔ چرخِ کمن کی آزمائش سے مراد چرخِ کمن کی طرف سے آزمائش ہے۔

شرح : کیا وہ میرے گھر آئیں گے ؟ بھلا، ممکن بھی ہے ؟ ہاں کہ انھوں نے وعدہ کر لیا، مگر اسے پورا کرنے کا خیال کب رکھا ؟ اسے غائب !

دیکھنا کہ اب یہ بڑھا آسمان ہمیں کس کس نئے نئے نقشے میں مبتلا کرتا ہے اور ہم پر کیا کیا مصیبتیں لاتا ہے۔

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
 جفا میں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے
 خدایا! جذبہٴ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
 کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جائے ہے مجھ سے
 وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
 عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
 اُدھر وہ بدگمانی ہے، اُدھر یہ ناتوانی ہے
 نہ پوچھا جائے ہے اس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے
 سنبھلنے دے مجھے، اے ناامیدی! کیا قیامت ہے
 کہ وہ امنِ خیال یا رُچھوٹا جائے ہے مجھ سے
 تکلف برطوت، نظارگی میں بھی سہی، لیکن
 وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

۱۔ شرح :
 اگر میرے بارے
 میں محبوب کا دل
 کبھی پیچھا میں ہے
 اور وہ چاہتا ہے
 کہ مجھ پر اس کا
 کرے تو مصیبت
 یہ پیش آتی ہے
 کہ وہ اپنے پہلے
 ظلم و جور یا ذکر
 کے شرما جائے
 اور جس منہ
 نہیں دکھاتا۔

یہ معنوں
 جس ایک شعر
 میں باغداد چلے
 ہیں،

ظلم سے باز آئے، پر باز آئیں کیا
 کہتے ہیں، ہم تجھ کو منہ دکھلاؤں کیا

۲۔ شرح : ہوئے میں پائو ہی پہلے ، نبرد عشق میں زخمی
 نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے ، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
 قیامت ہے کہ ہووے ، مدعی کا ہم سفر غالب !
 وہ کافر ، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے
 اسے اشد اشد میرے دل کی کشش کا اثر
 اٹا ہوتا ہے ۔ میں بتا اسے
 اپنی طرف کھینچتا ہوں ، وہ اور بھی زیادہ آزدہ و خفا ہوتا اور مجھ سے دور
 بھاگتا ہے ۔

۳۔ لغات ۔ وہ : مراد ہے محبوب ۔

شرح : محبوب بہ مزاج اور ندر نچ ہے ۔ وہ معمولی بات بھی تحمل
 سے نہیں سن سکتا اور میرے عشق کی داستان بڑی لمبی ہے ۔ حالت تو یہ ہے
 کہ میں یہ داستان قاصد کے سامنے دھراتا ہوں تو وہ بھی گھبرا اٹھتا ہے ۔ پھر یہ
 کیونکر ممکن ہے کہ میرا ندر نچ محبوب اسے اول سے آخر تک بہ اطمینان سن
 لے گا ؟

۴۔ شرح : محبوب کے دل میں تو بدگمانی بیٹھی ہوئی ہے اور وہ
 میرے دعوے محبت کو جھوٹا سمجھتا ہے ۔ میں حد درجہ ، تو ان و کمزور ہو گیا ہوں
 محبوب کچھ پوچھنے کے لیے تیار نہیں اور میں صفت کے باعث بول نہیں سکتا ۔
 مولانا طہطائی فرماتے ہیں : اس شعر میں ترکیب کے تشابہ اور الفاظ
 کے تقابلی سے بہت سخن پیدا ہو گیا ہے ۔

۵۔ شرح : اسے ناامیدی خدا کے لیے رسم کر ، یہ کیا قیامت پر پا
 کر دی ہے ؟ مجھے تجھے اور دم لینے دے ، یہ ہم یورشیں نہ کیے جا ۔ تو نے یہاں
 تک ذہبت پہنچا دی کہ میرے ہاتھ سے خیال یار کا واسن چھوٹا جا رہا ہے ۔ یہ
 چھوٹ گیا تو ہاتھ کیار رہا ؟

عزماً سمجھا ہوتا ہے کہ کس حالت کا نقشہ الفاظ کے بجانے رنگِ روغن کے ذریعے سے بدرجہا بہتر کھینچا جاسکتا ہے، لیکن مرزا نے اس شعر میں لفظوں کے ذریعے سے جو نقشہ پیش کر دیا ہے، اسے غالباً کوئی مصوّر رنگِ روغن کے ذریعے سے پردے پر منتقل نہیں کر سکتا، کیونکہ ”چھوٹا جاتے ہے“ کی تدریجی حرکت تصویر میں نہیں دکھائی جاسکتی ہے۔

۶۔ لغات : تکلف بر طرف : صاف صاف کہنا، لگ چلے رکھتے بغیر کہہ دینا۔

نظارگی : دیکھنے والا۔

شرح : مانا کہ میں بھی اسے دیکھنے والوں میں ہوں، لیکن صاف صاف اور لگی چلی رکھتے بغیر کہہ دیتا ہوں کہ کیا میں یہ ظلم دیکھ سکتا ہوں، اس پارے محبوب کو دیکھا جاتے، مجھے خود دیکھنا منظور نہیں، مگر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ دوسرے اسے دیکھیں :

یہ مصنون دوسری جگہ یوں بانڈھا ہے،

دیکھنا قسمت کو آپ اپنے پر رشک آجاتے ہے

میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جاتے ہے

۷۔ شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

”اس شعر میں وجدانی کیفیت کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے

مطلب یہ ہے کہ وہ قوی، جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے

شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی، ابتدائے عشق میں انہیں کو

صدمہ پہنچا ہے، پس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے، نہ اس پر صبر تحمل

کیا جاسکتا ہے۔“

بجوری مرحوم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”جنگ میں اس سے زیادہ بجوری کا عالم کوئی نہیں، جب تک گوئی

دل یا دماغ میں نہ لگے ، انسان کو لڑنے سے فوراً معقل نہیں کر سکتی ۔ بسا اوقات جدید باریک کلاہ کی گویاں فلم معدہ میں ایک جانب سے دوسری جانب بٹا لکھتے شکم سے پشت کی طرف نکل جاتی ہیں اور سوائے خارجی خفیف زخموں کے کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ غشائے معدہ کے سوراخ فرداً خود بخود منہل ہو جاتے ہیں ۔ پیپسٹروں میں ، جگر میں گویاں بعض مرتبہ محسوس بھی نہیں ہوتی اور قریب قریب جزو بدن ہو جاتی ہیں ، لیکن پاؤں پر گولی کا لگنا غضب ہے ۔ نہ پائے رقت نہ جانے مانہن : مرزا غالب نے میدانِ عشق میں بے بس ہو جانے کی کیا مثال دی ہے ! ہم عشق کے میدانِ جنگ میں پہنچے اور مردانگی سے لڑتے کافیلہ کر لیا ۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ سب سے پہلے پاؤں زخمی ہو گئے ۔ اب نہ جاننے کی طاقت ہے کہ میدان سے نکل جائیں اور نہ جم کر لڑنے کی قوت ہے ۔ ظاہر ہے پاؤں کے زخموں نے اتنا بے بس کر دیا کہ شاید سر اور سینے کے زخموں کا بھی یہ اثر نہ ہو ۔

یہ مضمون بھی ایک اور شعر میں باندھا ہے !

زخمی ہوا ہے پاشنہ پا سے ثبات کا

نے جہانگاہ کی گول ، نہ اقامت کی تاب ہے

۸ ۔ لغات : مدعی : رقیب ، خیر ، جو عاشق کے مقابلے پر محبت

کا دعویدار ہوتا ہے ۔

شرح : اے غالب ! قیامت ہے کہ ہمارا محبوب ، جسے ہم ،

خدا ناترکس ہونے کی بنا پر کافر کہتے ہیں ، غیر کا ہم سفر ہو جائے ، جہانگیر ہیں یہ بھی منظور نہیں ، اسے رخصت کرتے وقت " خدا کے حوالے " کہیں ۔

زبکہ مشق تماشا جنوں ملا مگر کشادہ لبث مرہ سیلی سلامت ہے
 نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعنِ بدجہدی تجھے کہ آئینہ بھی در طہ سلامت ہے
 بوج و تاب سے سبک عافیت مت توڑ نگاہِ عجز سرِ رشتہ سلامت ہے
 وفا مقابلِ وعدہ عارے عشق بے بنیاد جنوں ساختہ و فصل گل قیامت ہے

۱۔ لغات۔ زبکہ : چونکہ۔

کشادہ لبث : کھولنا اور بند کرنا۔

سیلی : تھپڑ۔ طانچے

شرح : چونکہ دنیا کو دیکھنا اور عبرت نہیں، بلکہ رغبت کی نظر سے
 دیکھنا دیوانگی کا نشان ہے، اس لیے چکوں کا کھولنا اور بند کرنا حقیقت میں پریشانی
 کا طانچہ ہے۔

مطلب یہ کہ جو شخص دنیا کو عبرت کی نظر سے دیکھتا ہے، اسے یہاں کی چیزوں
 سے کوئی وابستگی نہیں ہو سکتی۔ وہ سمجھ لے گا کہ سب کچھ عارضی اور فانی ہے اور
 قدم قدم پر اس کی شہادتیں سامنے آ رہی ہیں اگر اس کے باوجود کوئی شخص دنیا
 سے رغبت پیدا کرے اور اسے بہ نظر رغبت دیکھے تو مجھ لینا چاہیے کہ وہ پاگل
 ہے اور پاگل کا علاج یہی ہے کہ اسے طانچے پڑیں۔ وہ جو دیکھنے کی حالت میں
 آگہیں جھپکتا ہے، وہی اس کے لیے غلطی کا طانچہ ہے۔

اس سلسلے میں مرزا بیگل کا ایک شعر غالب کے اس شعر کا ماخذ بتایا

جاتا ہے۔

دیرِ ناکہ بہ نظارۂ دل محرم نیست
 مرہ برہم زدن از دستِ تاسف کم نیست

(جو آنکھ دل کے قطارے سے محرم نہ ہوئی، اس کا پکیں جھپکنا دواصل
انوس کے ہاتھ کھانا ہے)

ظاہر ہے کہ اس مضمون کو مرزا غالب کے مضمون سے کوئی نسبت نہیں۔
۲۔ لغات - ورطہ : بھٹور، گرداب، ہلاکت کا مقام۔

شرح : خدا ہی جانے کہ تو نے جو عہد توڑا، اس پر پھٹنے کا دھبا۔
کیونکر دھلے گا؟ تو جو بھٹنے سونرنے کے لیے آئینہ دیکھتا ہے، تیرے لیے تو وہ
بھی علامت کا گرداب ہے۔

مطلب یہ کہ محبوب آئینہ بناؤ سنگار کے لیے دیکھتا ہے اور بناؤ سنگار
کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں پر اپنے حسن کے کرشمے آشکارا کیے
جائیں۔ سچے عاشق کے نقطہ نگاہ سے یہ بجائے خود بد عہدی ہے۔ پھر محبوب
کے دامن سے بد عہدی کا داغ کیونکر دُور ہو سکتا ہے؟

۳۔ لغات - سلک عافیت : آرام و راحت کا رشتہ۔

شرح : جنس کے چکروں میں پڑ کر راحت و آرام کا رشتہ ٹکڑے
ٹکڑے نہ کر، کیونکہ جو شخص جنس میں مبتلا ہوا، اس کے لیے آرام سے بیٹھنا
غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ گونا گوں آذوقہ میں اُسے ہر طرف دوڑانے لیے پھریں گی
اور عافیت ختم ہو جائے گی۔ عاجزی کی نگاہ ہی سلامتی کی ٹود ہے جو شخص عزیز
اختیار کرے گا، وہ جنس سے بالکل پاک ہو گا، لہذا اس کی سلامتی میں کوئی خلل
نہ آئے گا۔

۴۔ شرح : محبوب تو وفا پر آمادہ ہو، لیکن عشق کا دعویٰ محبوبا ہو

جائے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ موسم بہار آجائے اور دیوانگی، جو اس موسم میں
طبعی ہوتی ہے، بناوٹی رہ جائے۔ یہ منظر قیامت سے کم نہیں۔

۱۔ شرح :

میں آتنا ڈبلا اور
کمزور ہو گیا ہوں
کہ اے محبوب !
اگر تو اپنی محفل
میں جگہ دے دے
تو میں اس بات
کا ذمہ اٹھاتا ہوں
کہ کوئی مجھے دیکھ
کر تباہ نہ سکے گا ،
میں ہوں ۔

شعر میں صرف

لاغر اتنا ہوں کہ گرتو بزم میں با ، دے مجھے
میرا ذمہ ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم
وان ملک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے ، نہ دکھلا ، پر بہ اندازِ عقاب
کھول کر پردہ فردا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلمک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زُلفت گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

اپنے صنعت اور لاغری کی کیفیت بیان کی ہے ۔ یعنی کسی کی آنکھیں مجھے دیکھ
ہی نہیں سکتیں ۔ میں کسی کو نظر ہی نہیں آ سکتا ۔ ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
محبوب کی بزم میں داخل جانے پر رقیب چہ میگوئیاں کرتے تھے اس وجہ سے
بزم میں آنے کی اجازت نہ تھی ۔ مرزا کہتے ہیں کہ مجھے تو کمزوریوں کے باعث
کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا ۔ پھر چہ میگوئیوں کا کونسا موقع ہے ؟

۲۔ شرح : میری حالت اس درجہ خیر ہو چکی ہے کہ ہر دیکھنے
والے کو مجھ پر رحم آجاتا ہے ۔ اگر کوئی حقیقی سہمہ دے تو مجھے کسی بہانے
سے محبوب کے پاس پہنچا دے ۔ کچھ عجب نہیں کہ اسے بھی میری حالت دیکھ کر
رحم آجائے ۔

۳۔ لغات : آنکھیں دکھلانا : غصے ہونا ۔ بے مروتی دکھانا ۔
شرح : اے محبوب ! اگر تو چہرہ نہیں دکھاتا ، نہ دکھا ، لیکن غصے

ہمارے پروردگار نے ہمارے گھور ہی کر دیکھے۔

شعریں لطف یہ ہے کہ آنکھیں دکھانے کی وجہ سے پورا چہرہ نہیں تو اس کا ایک حصہ ضرور نظر آ جائے گا، کیونکہ خفگی صرف آنکھیں دکھانے سے ظاہر نہیں ہو سکتی، ضروری ہے کہ چہرے کے آس پاس کا حصہ بھی نمایاں ہو۔
۴۔ مشرح : مجھے مصیبت میں مبتلا رکھنے پر محبوب اتنا خوش ہوتا ہے کہ اگر میں اس کی ذلت بھی بن جاؤں تو مجھے وہ کنگھی میں الجھا دے گا۔

باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اور نگ سلیمان مرچ و دیک اکٹات ہے اعجازِ میما، مرے آگے
جز تمام، نہیں صورتِ عالم، مجھے منظور جزویم، نہیں بستی اشیاء، مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحر، مرچہ تے گستا ہے حسین خاک پر دیا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا، ترے پیچھے تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا، مرے آگے
سچ کہتے ہو خود مین و خود آرا ہوں نہ کیوں سچ بیٹا ہے بُتِ آئینہ سیما، مرے آگے
چہر دیکھیے اندازِ گل انشائی گفتار رکھ دے کوئی پمائیہ و صہبائے مرے آگے
نفرت کا گلاں گزردے ہے میں رشکے گنا کیوں کر کہ لو نام نہ ان کا، مرے آگے
ایمان مجھے روکے ہے، ہو کھینچے ہے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا، مرے آگے
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو بُرا کہتی ہے، یلیا، مرے آگے

خوش ہوتیں، پر وصل میں یوں مر نہیں گئے
 آئی شب بچوں کی تمنا، برے آگے
 ہے موج زن اک تلمزم خوں، کاش یہی ہو
 آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
 گوناگوں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم بچ
 رہنے دو ابھی باغ و مینا مرے آگے
 ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
 غالب کو بُرا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

۱۔ شرح : میری نگاہوں میں دنیا بچوں کا ایک کھیل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ رات دن ایک تماشا میرے سامنے چل رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو واقعات و حادثات یہاں رات دن پیش آ رہے ہیں، میرے دل پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور پہنچے جو کھیل کھیلتے ہیں، کسی سلیم العقل انسان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۲۔ لغات - اورنگ سلیمان : حضرت سلیمان کا تخت، جس پر سوار ہو کر وہ جزا میں پروا ڈالتے تھے۔

اعجازِ مسیحا : حضرت عیسیٰ کا معجزہ، جو تم باذن اللہ (اٹھ اٹھ کے حکم سے) کڑکڑدے کو زندہ کر دیتے تھے۔

شرح : حضرت سلیمان کا تخت، جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جزا میں اڑتا تھا، میرے نزدیک محض ایک کھیل ہے اور حضرت عیسیٰ کے معجزے کو میں محض ایک بات سمجھتا ہوں۔

دوسرے مصرع میں خوبا ہے ہے کہ حضرت عیسیٰ محض ایک کلر یعنی بات کڑکڑدے کو زندہ کر دیتے تھے۔

۳۔ شرح : میں دنیا کے وجود کو حقیقت کچھ نہیں سمجھتا، محض ایک نام ہے جو اس کے لیے رکھ دیا گیا، مٹی کچھ نہیں اسی طرح اشیاء کا وجود بھی میرے لیے وہم سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

مولانا مہا لہائی فرماتے ہیں کہ تصوف کے نزدیک اجسام باذات محسوس نہیں۔ ذات باری تعالیٰ کے سوا کسی شے کو موجود سمجھیں تو یہ موجودات یا مجربات ہوں گے۔ جیسے نفوس، ملائک وغیرہ یا ہمارے تصور کردہ اجسام ہوں گے۔ ہم نفوس و اجسام کے صرف اعراف دیکھتے ہیں، مثلاً نفس کا علم و ارادہ، جسم کا رنگ اور شکل۔ مجربات کا نام محسوس ہونا تو غلط ہے، ارہے اجسام تو ان کے محض لوازم محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً پہاڑ میں جس شے کو ہم جسم کہہ یا ذات کہتے ہیں، وہ تو دکھائی نہیں دیتی، صرف پہاڑ کا رنگ، اس کی لمبائی چوڑائی اور پھیلاؤ نظر آتا ہے۔ یہ سب اعراف ہیں۔ رنگ کے متعلق بھی فلاسفہ یورپ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ دراصل روشنی کی ایک نوع ہے اور اس نوع کا خاص توجہ و تماشائیں ہمیں نظر آتا ہے۔ اسی طرح آواز بھی ہو گا ایک ارتعاش ہے۔ غرض اجسام کا حقیقی وجود کوئی نہیں اور اعراف ہمارے ادہام کی تخلیق ہیں، لہذا ثابت ہو گا کہ جس شے کو ہم عالم کہتے ہیں، وہ محض ایک نام ہے اور اشیاء کی ہستی محض ایک وہم ہے۔

بجنوری مرحوم نے لکھا ہے کہ منہدانہ نشوون کی قدیمی تعلیم کا مفہوم غلط سمجھتے ہوئے عالم کو ایک فریب نگاہ اور دشتِ سراب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک خواب ہے، جو چشم کو ر عالم رویا میں دکھائی ہے۔ مرزا غالب کی عقل اس مغالطے سے آزاد ہے وہ ہستی کو ہمیشہ ادے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، لیکن وہ ادے کے منکر ہیں۔ اگرچہ عالم اجسام خارجی سے لبریز نظر آتا ہے اور نہایت لطیف گیوں سے نہایت بھاری دھاتوں تک ہر شے اس میں موجود ہے، لیکن ادے کا وجود خود محض با نسبت ہے، بالذات نہیں۔ زندگی کی حیثیت جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں، حرکات، اصوات، الوان، کوئی وجود نہیں رکھتیں، جب تک ذہن ان کا ادراک نہ کرے۔ تمام مادہ جس میں خود میرا جسم اور بنی نوع کے اجسام شامل ہیں، یہ جان اور بیکار ہے، وہ روح

وہ رواں، وہ خیال، جوان پر قائل ہے، حقیقت ہے۔ غالب کا فلسفہ پتہ نوا
 نواز، ہینگل، برکتے اور فسطے سے ملتا ہے۔ حکمت کے رو سے مرزا کا خیال
 صحیح ہے۔ مادۂ سالمات سے مرکب ہے۔ اگر پانی کے ایک قطرے کو کرۂ ارض
 کے برابر خیال کریں۔ تو اس کے سالمات چوگان کے گیند سے بڑے ہوں گے
 یہ خود اجزاء سے مرکب ہیں، جو آب و تجرئی خیال نہیں کیے جاتے، بلکہ جو اہر
 سے مرکب مانے جاتے ہیں۔ ہر جز کو اگر ایک کلیہ سے مشابہ خیال کریں تو
 بقول سر آبیور لاج بہ جو اسہر کلیہ میں اڑتی ہوئی کشتیوں کی مثال ہیں۔ اگر
 ان کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایتھر کے حلقوں کی ساخت ہیں۔ اگر
 ان حلقوں کی گرہ کھل جائے تو محض خیال باقی رہ جائے۔ یوں مرزا غالب کا
 یہ شعر از روئے فلسفہ و حکمت بھی درست ثابت ہوگا۔

۴۔ شرح : میں بیا بان میں سیوگروش کرتا ہوں تو اتنی خاک اڑاتا
 ہوں کہ پورا بیا بان گرد و غبار میں چھپ جاتا ہے اور دریا کو میرا اتنا احترام
 منظور ہے کہ وہ میرے آگے اپنی پیشانی زمین پر گھستتا ہے۔
 یہ معلوم بھی ہو سکتا ہے کہ میری اشکباری کے مقابلے میں دریا عجز کے
 اظہار پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۵۔ شرح : اے محبوب ! نہ پوچھ کہ تیرے عشق میں میرا کیا حال
 ہوا، یہ دیکھ کہ میرے سامنے تیرا کیا رنگ ہے۔
 مطلب یہ کہ عاشق کے درود و محبوب کی جو کیفیت ہوگی، اسی سے
 عاشق کی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر محبوب کی نظر التفات عاشق
 پر ہے اور وہ وفاداری سے عشق و محبت کے تقاضے پورے کر رہا ہے
 تو ظاہر ہے کہ عاشق کی حالت بڑے اطمینان کی ہوگی۔ اگر اس کے برعکس
 محبوب کو عاشق کے حال پر کوئی توجہ نہیں، وہ اس سے مسلسل تغافل کرتا
 ہے تو ظاہر ہے کہ عاشق کی حالت زیادہ سے زیادہ خستہ ہوگی۔

غرض اس شعر کے ذریعہ سے مرزا غالب نے عاشق کی حالت معلوم کرنے کا ایک پیغام دیا، یعنی عاشق کے سامنے محبوب کا رنگ۔

۶۔ لغات - خود بین : اپنے آپ پر نظر رکھنے والا، معزور خود پسند۔

خود آرا : اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے والا۔ خود بین و خود آرا حقیقہ محبوب کی صفات ہیں کہ اس کی نظر ہر لحظہ اپنے آپ پر رہتی ہے اور وہ اپنے بناؤ سنگار کا خاص خیال رکھتا ہے۔
آئینہ سیا : آنکھیں جیسی پیشانی والا۔

شرح : محبوب طعنا مرزا کو کہتا ہے کہ تم تو بڑے خود بین و خود آرا ہو۔ مرزا جواب دیتے ہیں کہ کیوں نہ ہوں؟ آنکھیں جیسی پیشانی والا محبوب میرے سامنے موجود ہے۔

اول بناؤ سنگار اس لیے موزوں و مناسب شعر کہ محبوب کے چہرے کا آئینہ سامنے ہے، دوم خود بینی و خود آرائی کی فوجت اس لیے آئی کہ محبوب پاس موجود ہے اور عاشق کے لیے خوشی کی سرشاری کا اس سے بڑا موقع کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی سرشاری کو محبوب نے خود بینی اور خود آرائی قرار دے لیا اور کوئی بھی عاشق کو اس حالت میں دیکھتا تو یہی کہتا۔

۷۔ شرح : کوئی شخص میرے سامنے شراب کا پیالہ رکھ دے۔ پھر دیکھیے، کیونکہ گفتگو سے پھول برستے ہیں، یعنی شراب کا پیالہ دیکھ کر طبیعت پر مستی کی خاص کیفیت طاری ہو جائے گی اور گفتگو کا انداز حدود رنگین و دلاویز ہو جائے گا۔ اسی رنگین و دلاویزی کو گفتگو کی گل افشانی سے تعبیر کیا۔

۸۔ شرح : محبوب کے سسے میں میرے رنگ کا یہ حال ہو گیا کہ اس کا نام بھی کسی کی زبان پر آجاتا تو میں کڑ دیتا کہ بس یہ نام نہ تو۔ میری تو

یہ کیفیت رشک کے باعث حقیقی محبوب کے دل میں لگان پیدا ہوا کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ اور لوگوں کو بھی یہی شبہ ہونے لگا۔ فرماتے ہیں کہ بھائی! میں رشک سے ذمت بردار ہوا۔ آئندہ نہ کہوں گا کہ محبوب کا نام میرے سامنے نہ لو، یعنی رشک اپنی جگہ بچا، لیکن یہ صورت نہ ہونی چاہیے کہ سب کو محبوب سے نفرت کا لگان ہونے لگے۔

۹۔ شرح : ایمان مجھے روک رہا ہے کہ عطر جاؤ، کفر کی طرف نہ جاؤ۔ اُدھر کفر مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ عجب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کعبہ میرے پیچھے ہے اور کلیسا میرے آگے ہے گویا ایمان کو چھوڑ کر کفر کی طرف چل پڑے ہیں، ورنہ کلیسا آگے کیوں ہوتا؟

۱۰۔ شرح : بلاشبہ میں عاشق ہوں۔ لیکن ایسا عاشق جو دلادین کا رناموں سے معشوقوں کو ٹھہا لیتا ہوں۔ میرے اس کمال کا یہ عالم ہے کہ یل میرے سامنے ہو تو بھٹوں کی بُرائی شروع کر دیتی ہے۔

مطلب یہ کہ میں عشق میں ایثار، جان بازی اور فداکاری کے ایسے کرشمے دکھاتا ہوں، جو محض ہزناؤ اور دوسرے بڑے بڑے عاشقوں کو نصیب نہ ہوے۔ چنانچہ ان کے محبوب میرے کارنامے دیکھتے ہیں تو میری طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اپنے عاشقوں کی قدر و قیمت ان کی نظروں میں گھٹ جاتی ہے۔

۱۱۔ شرح : بیشک وصل ایسی خوش نصیبی کی تقریب ہے جس پر ہر سچے عاشق کو انتہائی مسرت و شادمانی ہوتی ہے، لیکن شادی مرگ کی نوبت نہیں آتی۔ یہ طریقہ نہیں کہ خوشی اس حد پر پہنچ جائے، جو جان لیوا ثابت ہو۔ مجھے یہی صورت پیش آتی۔ آہ! معلوم ہوتا ہے کہ میں جدائی کی رات جو آرزو کر رہا تھا، وہ وصل کی شب پوری ہو گئی، یعنی زمانہ شہر کی تمنا نے جنگام وصل علی لباس پس کیا۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

یہ شعر اس زمین میں بیت الغزل ہے، مطلب یہ ہے کہ شب بچوں میں جو میں نے مرنے کی تمنا کی تھی، آج وہ بڑا بول میرے آگے آیا کہ وصل کی خوشی میں مر گیا۔ وصل کی خوشی میں مرجانا اور لوگ بھی ہاتھ کاٹتے ہیں، مگر یہ بات ہی اور ہے اور ساری کرامات محاورے اور زبان کی ہے، جس نے مرنے کے مسنون کو زندہ کر دیا۔ مگر غائب کے کارناموں میں یہ شعر بھی شمار کرنا چاہیئے۔

۱۲۔ شرح : میری آنکھوں سے خون کا دیا بہ نکلا، جو سامنے لہریں لے رہا ہے۔ کاش! اس پر معاملہ ختم ہو جاتا، مگر بقا سہرا لیا کرتے کی اُمید نہیں دیکھی عشق کی راہ میں ابھی کیا کچھ میرے سامنے آنے والا ہے!

۱۳۔ شرح : اگر یہ نزع کی حالت ہے اور ہاتھ حرکت کرنے سے رو گئے ہیں۔ اتنی سکت باقی نہیں کہ صراحی سے شراب پیالے میں انڈھلیوں اور پانی ہاؤں، لیکن آنکھوں میں تو دم ابھی باقی ہے۔ اس لیے ابھی پیالہ اور صراحی اٹھاؤ نہیں، بدستور میرے سامنے رہنے دو۔

اس سے مقصود وہی ایک گونہ بخودی ہے، جس کے آرزو مند مرزا غائب ہمیشہ رہے۔

ابو فراس کا ایک شعر ہے کہ اے ساقی! مجھے شراب پلا اور زبان سے بھی کہہ کہ یہ شراب ہے۔ خود ابو فراس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک کاتب کے سامنے سے گزرا۔ استاد نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ ابو فراس نے یہ کیوں کہا، زبان سے بھی کہہ کہ یہ شراب ہے، طالب علم نے جواب دیا کہ شراب کا پیالہ ہاتھ میں لے کر قوت لامر اس سے مستفید ہوگی، شراب دیکھ کر باصرہ لذت حاصل کرے گی، شراب پینے سے ذائقہ شاد کام ہوگا، شراب پیتے وقت شاعر اس کی خوشبو سے مستی حاصل کرے گی، صرف ایک سامعہ باقی رہ گئی تھی۔ جب ساقی زبان سے کہے گا کہ یہ شراب ہے تو اسے بھی ایک خاص راحت ملے گی،

گویا تمام حواس اس خورد و نوش میں شریک ہوں گے اور لذت انتہا پر پہنچ جائے گی۔

مرقاۃ غالب زندگی کی اس منزل پر پہنچ گئے، جب باصرہ کے ہوا کو ٹی جس کار آمد نہیں رہی۔ وہ چاہتے ہیں کہ جب تک باصرہ باقی ہے۔ شراب کو دیکھنے سے جتنی لذت حاصل ہو سکتی ہے، وہ ہوتی رہے اور اس کیفیت کا صحیح اندازہ عرق نوش ہی کر سکتے ہیں۔

۱۴۔ لغات۔ ہم پیشہ : دو یا دو سے زیادہ آدمی، جن کا پیشہ ایک ہو۔ ایک پیشہ اور ایک ہی کام کرنے والے۔

ہم مشرب : دو یا دو سے زیادہ آدمی، جن کا مسلک، مذہب اور طوطریقہ ایک ہو، نیز جو مل کر شراب پئیں۔

شرح : غالب تو میرا ہم پیشہ، ہم مشرب اور ہمراز ہے۔ وہی کام کرتا ہے، جو میں کرتا ہوں۔ وہ میرا ہم مسلک ہے اور ہم اکٹھے کھاتے پیتے ہیں۔ میرے رازدوں میں بھی وہ شریک ہے، اُسے کیوں بُرا کہتے ہو؟ اچھا اگر تمہیں کہنے پر اصرار ہی ہے تو کم از کم میرے سامنے تو نہ کہو۔

”مدعا کیسے“

”تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کیسے؟“

”کیونکہ تم سے پھر تم کہ ”ہم ستم گر ہیں“

مجھے تو خود ہے کہ جو کچھ کہو، ”بجا“ کہیئے“

۱۔ شرح :

اسے جواب : اگر میں اپنا حال زار

آپ کے سامنے

پیش کرتا ہوں تو

آپ کو دیتے ہیں

یہ طوفانی داستان

سننے کے لیے ہمارے
پاس وقت نہیں ،
مطلب کی بات کو
اور بتاؤ کیا چاہتے
ہو ؟ بیچارہ عاشق
اس صورت حال
پر حیران ہو کر عرض
کرتا ہے ، آپ ہی
فرمایا کہ آپ کے
اس ارشاد کے بعد
کیا کموں اور کیا کر
سکتا ہوں ؟

مطلب یہ کہ
عاشق اپنی حالت
محبوب کے سامنے
اس لیے پیش کرتا
ہے کہ اسے رحم
آجائے اور عاشق
کا دل عا جو محبوب پر
پوری طرح داغ
ہوتا ہے ، پورا ہو
جائے ، لیکن محبوب
وہ کیفیت ہی سمجھتا

وہ بیشتر سہی ، پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کیے
نہیں ذریعہ راحت ، جراحاتِ پریمیاں
وہ زخم تیغ ہے ، جس کو کہ دکشا کیے
جو مدعی بنے ، اس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے ، اس کو نہ ناسزا کیے
کہیں حقیقت جانکا ہی مرض لکھے
کہیں مصیبت ناسازی دوا کیے
کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجے
کبھی حکایت صبرِ گرینہ پا کیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خونہا دیجے
کٹے زبان ، تو خنجر کو مرہب کیے
نہیں نگار کو الفت ، نہ ہوا نگار تو ہے
ردائی روش و مستی ادا کیے
نہیں بہار کو فرصت ، نہ ہوا بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا کیے

سفینہ جب کہ کنارے پر آ لگا ، غالب ! گوارا نہیں کرتا ،
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخُدا کیسے !
نری پیدا کرنے کا موجب سمجھی جاسکتی ہے ۔ تیز حال سننے سے بیزاری یا بے پروائی
کا مطلب ہی یہ ہے کہ محبوب کو عاشق کا کچھ خیال نہیں ۔ اب وہ بچا رہ محبوب ہی
سے پوچھتا ہے کہ آپ کی اس روش کے بعد میں کوں تو کیا کوں ؟

۲۔ شرح : اسے محبوب ! میں آپ کی سنگدلی اور بیدردی کی شکایت
کرتا ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ، جاؤ ، ہم واقعی ظالم اور سنگر ہیں ۔
آپ کو از روئے طعن بھی یہ نہ کہنا چاہیے ، کیونکہ میری تو عادت ہی یہ ہے کہ آپ
جو کچھ فرمائیں ، میں بجا اور درست کہتا جاؤں ۔ گویا اس طرح بلا ارادہ میری
زبان سے آپ کی ستم گری کی تصدیق ہو جائے گی ۔

۳۔ شرح : بلاشبہ محبوب کی نگاہ تاز ایک نشتر ہے ، لیکن جب وہ
نشتر دل میں اُتر جائے تو اسے کیوں جانی پہچانی چیز نہ سمجھیں ؟
مطلب یہ ہے کہ دل میں وہی چیز اُترتی ہے جو محبوب ہو ۔ یقیناً محبوب
کی نگاہ نشتر ہے ۔ مگر و نشین ہوتے ہی وہ آشنا بن جاتی ہے ۔

۴۔ اس شعر کی شرح ہم پہلے ”خطوطِ غالب“ سے نقل کر چکے ہیں ۔ ملاحظہ

ہو شرح :

زخمِ نہ داند وی تنگلِ دل کی یا رب

تیر بھی سینہٴ بمل سے پرِ افشاں نکلا

مطلب یہ کہ نوکِ تیر کا زخم دلی راحت کا ذریعہ نہیں بن سکتا ، کیوں کہ
نوکِ تیر سے جو زخم گھے گا وہ نہایت معمولی اور چھوٹا سا ہوگا ۔ جس زخم کو
دکشا یعنی دل کھول دینے والا کہتے ہیں ، وہ تلوار کا زخم ہے ۔

شعر میں لفظ ”دکشا“ کے دو معنی ہیں ۔ اول راحت افزا ، دل شگفتہ کر دینے والا

فرحت انگیز، دوم دل کو کھول دینے والا یعنی فراخ اور وسیع۔ یہاں دونوں معنی بالکل ٹھیک اُترتے ہیں، یعنی زخم تیغ فرحت افزا بھی ہے، فراخ اور وسیع بھی۔

۵۔ ۱۰۔ لغات : مدحی : دعائے کرنے والا، نالیش کرنے والا حریف، دشمنی۔

جان کا ہی : جان گھٹانا، تکلیف کی شدت۔
گراں نشیں : جہم کو بیٹھ جانے والا، جسے دُور کرنا مشکل ہو، بھاری۔

گریز پا : بھاگنے والا۔ تا پائدار، تا استوار
خونہما : خون کی قیمت، جو رقم خون کے بدلے میں مقتول کے دانت گروی جائے۔

روانی روش : خوش و نقاری، خوش خروائی۔

شرح : اگر کوئی حریف اور دشمن بنے تو اس سے دشمنی کا قصد نہ کرنا چاہیے۔ جو شخص ہمارے متعلق نازیبا باتیں کہے اس کے جواب میں ایسی ہی باتیں نہ کہنی چاہئیں۔

کیس بیانی کے جان گھٹا دینے کی حقیقت قلم بند کیجیے، کیس یہ مصیبت بیان کیجیے کہ دو موافق نہیں۔

کبھی ایسے رنج کی شکایت کیجیے، جو دل میں اس طرح بیٹھ جائے کہ اُسے دُور کرنا ممکن نہ ہو۔ کبھی اُس صبر کی داستان سنائیے جو بالکل نا پائدار ہے اور ہمیشہ بھاگنے کے دوپے رہتا ہے۔

اگر جان باقی رہے تو قاتل کی خدمت میں خود ہتھامش کرنا چاہیے۔ اگر زبان کٹ جائے تو خنجر کو مرجھاؤ آئیں کسی چاہئے۔

اگر محبوب کو عاشق سے محبت نہیں اور اس کا جو ہر خیر الغت سے خالی ہے

تو کچھ پیدا نہیں۔ محبوب تو ہے۔ اس کی رفتار کی وقار یزی اور ناز و انداز کی مستی کا ذکر کرنا چاہیے۔

مطلب یہ کہ اگر محبوب میں الفت نہیں تو نہ اس کی محبوبی زائل ہوتی ہے نہ اس کی خوش خرامی اور ناز و انداز میں کوئی فرق آتا ہے۔ گویا محبوبیت پر تودہ باقی رہتی ہے۔

اگر بہار تھوڑی دیر کے لیے آتی ہے اور جلد رخصت ہو جاتی ہے۔ تو مضائقہ نہیں، بہار تو ہے۔ اس کی وجہ سے باغ میں ہر طرف حرارت و شادابی پیدا ہو جاتی ہے اور چٹا میں ایک خاص دلکشی آ جاتی ہے۔ یعنی بہار کی کم فرستہ کی باعث اس کے یہ بد بھی جو ہر تو ختم نہیں ہو جاتے۔

۱۱۔ لغات۔ سفینہ : کشتی۔ ناز۔

ناخدا : قلعہ۔

شرح : اے غالب! جب ناؤ کنارے پہ آگئی تو قلعہ نے دورانی سفر

میں ہم پر جو ظلم و ستم کیے، خدا سے ان کی مزید کیا کریں ؟

مطلب یہ کہ جب اصل وقت گزر گیا تو کسی کی برائی یا د نہ رکھنی چاہیے، ٹھکانہ

چاہیے، کیونکہ جو کچھ پیش آچکا ہے، وہ کسی بھی صورت میں کالعدم نہیں ہو سکتا، پھر اسے یاد رکھنے سے کیا فائدہ ؟

مورخ طباطبائی فرماتے ہیں کہ عقاب نے چار باتوں میں حکمت اخلاق کو مستفہر کر دیا

ہے، ان میں سے دو یاد رکھنے کی ہیں یعنی موت کا آنا اور خدا کا حاضر و ناظر ہونا اور وہ بھول جانے کی ہیں، یعنی کسی پر کچھ احسان کیا ہو یا کسی نے کچھ برائی کی ہو۔

مرزا غالب نے اس شعر میں بھول جانے کی ایک بات کا ذکر نہایت پرتابھر

انداز میں کر دیا۔

۱۔ شرح:

غور اجاڑا کرتا ہے۔

ہیں :

”دھویا جانا“

بے شرم و بیباک ہونا

پاک، آزاد یا شہداء

مطلب یہ ہے کہ جب

ایک آنکھ سے آنسو

نہیں نکلتے تھے تو

اس بات کا پاس نہ لیا

تھا کہ عشق کا راز کس

پر دکھانا ہوتا ہے

مگر جب رونا ضبط نہ

ہو سکا اور ہر وقت

آنسو جاری رہنے

لگے تو اخفاءِ راز عشق

کا خیال جاتا رہا اور

ایسے بے شرم و بیباک

ہو گئے کہ آزادوں

اور شہدوں کی طرح

کھل کھیلے۔ اس

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے

دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرف بہاے سے ہوئے آلاتِ میکشی

تھے یہ ہی دو حساب، سویوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم

بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالہ بُبُل کو بے اثر؛

پہرے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؛

آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم جگہ

کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے گل اس نے اٹھائی، اس کی نش

دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک

ہو گئے۔ بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔“

جب تک اشکباری جاری نہیں ہوتی تھی، یہ خیال تھا کہ عشق کا بھید کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ جب ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے اور گریہ و زاری شروع ہو گئی تو راز چھپانے رکھنے کا معاملہ ہی ختم ہو گیا۔ کیونکہ اشکباری سے ہر شخص بات گیا، ہم مرنے عشق میں مبتلا ہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جب تک بھید آشکار نہ ہو، انسان بڑی احتیاط کرتا ہے، لیکن جب حقیقت بے اختیار واضح ہو جائے تو ضبط کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی اور رفتہ رفتہ رسوائی کا احساس گند ہونے ہوتے ختم ہو جاتا ہے۔ یہی صورت مرزا غالب کو پیش آئی۔ دہنے سے ایسے دھوئے گئے کہ پاس دلہانہ کا کوئی ترنگہ نہ رہا۔ بالکل پاک ہو گئے۔ یعنی ضبط و احتیاط سے کاٹے بے پروائی اختیار کر لی۔

۲۔ لغات۔ ہما : قیمت۔

آلات میکشی : شراب نوشی کا سرو سامان۔

شرح : ہمارے لیے دو ہی قیمتیں تھیں، ایک یہ کہ شراب پینے، دوسرا یہ کہ شراب کے سرو سامان سے فارغ ہو جائیں۔ چنانچہ ہم نے شراب نوشی کا پورا سرو سامان شراب کی قیمت میں دے دیا۔ اس طرح ہمارے دونوں حساب صاف ہو گئے۔ نہ شراب کی قیمت ہمارے ذمے رہی، نہ سرو سامان ساتھ ساتھ اٹھانے پھرنے کی مصیبت سے دوچار ہونے۔

۳۔ شرح : اگرچہ تم (حبیبی) آوارگی کے باعث دنیا بھر میں رسوا ہو

گئے، لیکن اتنا تو ہوا کہ تمہاری طبیعتوں میں چالاک آگئی۔ سادگی اور سادہ لوحی باقی نہ رہی۔ اب کوئی تمہیں فریب نہیں دے سکتا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ طبیعتوں کا چالاک ہونا محاورہ ہے۔ اس مقام پر جمع اور مفرد دونوں طرح ہوتے ہیں، لیکن مسکت پے شخص ہیں، جنہوں نے جمع کے ساتھ نظم کیا۔ ۳۔ اذگی لفظ اسی کو کہتے ہیں۔

۴۔ شرح : کون کتنا ہے کہ بیل کی فریاد و غماں بے اثر رہی؟ یہ جو

پھول کھلتے ہیں، کیا معلوم نہیں کہ ان کے پردے میں لاکھ جگر پاک ہوتے ہیں ؟ یہ
بیل کی مزاید ہی کا اثر ہے۔ جو مزاید پھول کے پردے میں لاکھوں جگر چہرہ کر لکھ
دیتی ہے، اسے بے اثر قرار دینے کی کون سی وجہ ہے ؟

۵۔ شرح - اہل شوق کی بقا و فنا کے بارے میں کیا پوچھتے ہو ؟ یہ کوئی
بیان کرنے کی چیز ہے ؟ وہ لوگ تو اپنے عشق کی آگ میں غس و غاشاک کی
طرح جل بجھے۔

کمال یہ ہے کہ اہل شوق اپنی آگ میں غس و غاشاک کی طرح جلتے ہیں،
یعنی اُن سوکھے ہوئے تنگوں اور پتوں کی طرح، جنہیں صاف کر کے بارغ سے باہر
پھینک دیتے ہیں۔ یقیناً عشق کی آگ سب کو اسی طرح جلاتی ہے۔ اس کے نزدیک
کسی کی بقا کوئی خاص وزن نہیں رکھتی۔ جو کچھ ذاتِ باری تعالیٰ کے ہوا ہے،
وہ کوڑا کرکٹ ہے اور اس کے لیے یہی زریعہ ہے کہ آگ کی نذر ہو جائے عشق
کی آگ میں کام انجام دیتی ہے۔ اب رہ معاملہ بقا و فنا کا تو انھوں نے عارضی
بقا سے نہایت پائی اور حقیقی بقا میں گم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مردانے مشر میں
بقا و فنا کا معاملہ واضح نہیں کیا۔

۶۔ شرح : خواجہ عاتی مزارتے ہیں :

ہم نے اس کے تقاضے سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اس کی
توجہ کے خواستگار ہوئے۔ تھے۔ جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی
نگاہ میں ہمیں فنا کر دیا :

مطلب یہ کہ محبوب کے جلوے کی تاب کوئی نہیں لاسکتا۔ ہم سمجھتے تھے کہ
ہم سے تقاضے برتا جا رہا ہے۔ یہ شکایت لے کر محبوب کے پاس پہنچے اس نے
ایک نگاہ ہم پر ڈالی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم خاک ہو کر رہ گئے۔

محبوب حقیقی کے جلوے کی آمد و ہر دل میں موجزن ہے، لیکن اس کے تقاضے
کو سمجھانے کی ہمت کسی میں نہیں۔

۷۔ شرح : کل اس نے اسد کی نعل ایسے انداز سے اٹھائی کہ دشمن
بھی اسے دیکھ کر رنج و غم کے پیکر بن گئے۔

شاید کسی صاحب کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ نعل اٹھانے کی کیفیت
معتن طریق پر بیان نہیں کی گئی تو یہ وسوسہ جیسا ہو گا۔ دوسرا مصرع صاف بتا
رہا ہے کہ نعل اٹھانے کا طریقہ آنا ہوا تھا، جسے دیکھ کر دشمنوں کے دل بھی
دہل گئے اور وہ بھی رنج و غم میں مبتلا ہو گئے۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشہ مئے سرو سبز جو ثبارِ نغمہ ہے
ہم نشینِ مست کہ کہہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

شرح : نشہ نہایت رنگین اور پُر طعت ہیں۔ ساز خوشی میں مست
نظر آتے ہیں۔ شراب کی صراحی نعل کی ہنرِ رواں کے کنارے سبز سرو
کی تبار دکھا رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ پورا منظر نعل بہار کا ہے، جب شراب پینے، مست و
رہنے، راگ رنگ سننے کا خاص طعت آتا ہے۔ ایسے ہی وقت میں دل
پر یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر گیتوں کو ایک ہنرِ وزن کر دیا جائے تو اس
ہنر کے کنارے شراب کی صراحی کے سوا سرو کا کام کوئی نہیں دے سکتا۔
غرض شراب اور راگ رنگ کی نہایت موزون بزم کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔

۲۔ شرح : اسے مہدم ! تو مجھے یہ کیوں سمجھا تا ہے کہ فرایہ و نغناں

بند کر اور محبوب کی بزم عیش درہم برہم نہ کر؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس بزم میں تو میری فریاد و فغاں کو بھی نغمے کی حیثیت حاصل ہے، پھر اس سے اس کی محفل عیش کیونکر کتہہ ہوگی؟

دوسرے مصرع کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، اول یہ کہ محبوب میری فریاد و فغاں سے بیحد خوش ہوتا ہے، گویا میرا نالہ بھی نغمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب نالہ نغمہ بن گیا تو محفل عیش میں خلل کیونکر پیدا ہوگا؟ دوم میرے محبوب کا ماحول اس درجہ مسرت خیز و نشاط افزا ہے کہ باہر سے مزید و فغاں بھی وہاں پہنچے تو نغمے کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ دونوں صورتوں میں محبوب کی بزم عیش کے درہم برہم ہونے کا کوئی موقع نہیں۔

اے شرح:
 بننے کے لیے
 لازم ہے کہ
 دانتوں کی
 شوخی کا کرشمہ
 نمایاں کیا جائے
 دوستوں کی
 جمعیت کا دعویٰ
 ہنسی کا مقام
 ہے۔
 مطلب یہ
 کہ ہنسنے وقت
 عرضِ نازِ شوخی و نداں براٹھے خندہ ہے
 دعویٰ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے
 ہے عدم میں غنچہ، محوِ عبرتِ انجمِ گل
 یک جہاں زانو تامل، در فغاں خندہ ہے
 کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
 ورنہ ونداں دردِ دلِ افشردن پناے خندہ ہے
 سوزشِ باطن کے ہیں احبابِ منکر، ورنہ یاں
 دلِ محیطِ گریہ و لبِ آشناے خندہ ہے

دانت نمایاں ہوتے ہیں۔ اکٹھے ہونے کے باوجود تمام دانت الگ الگ ہیں اور کبھی یکساں نہیں رہ سکتے۔ یہی کیفیت دوستوں کے مجمع کی ہے۔ جس طرح دانت طبعاً یکے بعد دیگرے نکل جاتے ہیں، اسی طرح احباب کا مجمع بھی رفتہ رفتہ بکھر جائے گا، لہذا ان کے اکٹھے رہنے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے، اس پر تعریفاً ہنس دینا بالکل بجا ہے۔

۲۔ لغات۔ ایک جہاں زالوتامل : حد درجہ فکر و تامل۔ زانو کا لفظ اس لیے لائے کہ محذور فکر کے وقت انسان عموماً سر زانو پر رکھ دیتا ہے۔
تفا : پیچھے۔

شرح : کلی کا منہ بند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدم میں بیٹھی ہوئی ہے اور بھول کے انجام سے عبرت حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ ہنسی کے بعد، سجدہ و فکر کا مقام ہے۔

مطلب یہ کہ کلی کھلے گی، جسے بھول کا ہنسنا قرار دیا۔ خوشبو بکھرے گی پھر بھول کی پنکھڑیاں ایک ایک کر کے گر جائیں گی اور وہ تاپید ہو جائے گا گویا ہنسنے کا انجام عبرت کا مقام ہے اور کلی جب تک بند ہے، اسی سے کسب عبرت کر رہی ہے۔

۳۔ لغات۔ کلفت : تکلیف، کدورت۔

دنداں درد دل افشردن : دانت دل میں گڑب دینا۔ فارسی محاورہ جو تکلیف دہ حالات کو صبر سے برداشت کر لینے کے لیے بولا جاتا ہے۔

شرح : میں امردہ، پڑمردہ اور دل تنگ ہوں۔ اس حالت کا تعجب کے لیے اضطراب و بے قراری کا عیش حرام ہے۔

مطلب یہ ہے کہ امردگی کا تقاضا ہی انقباض اور دل گرفتگی ہے۔

اے بے تابی اور بے چینی کی قانع ابالی کیونکر نصیب ہو سکتی ہے ؟
بے تابی اور بے تابی حرکت و جنبش کی تقاضی ہے۔ ظاہر ہے کہ امردگی

اور دل گرفتگی کے مقابلے میں بیتابی عیش کی حالت ہے اور اضطراب کو عیش نصیب نہیں ہو سکتا، برداشت دل میں گرا دیتا یعنی ہر قسم کے کمزوریاں صبر سے برداشت کر لیتا ہی صبر کی بنیاد ہے۔

کتنا یہ چاہتے ہیں کہ اس زندگی میں ہزاروں تکلیف وہ صورتیں پیش آتی ہیں۔ بہ ایں ہمہ لوگ مسترت و ثناء دانی میں بھی مصروف پائے جاتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ وہ کمزوریاں صبر سے برداشت کر لیتے ہیں۔ یوں ان کے لیے سہتی کا موقع پیدا ہو جاتا ہے، لیکن اضطراب کے لیے بے تابی کا عیش ممکن نہیں۔

۴۔ لغات - محیط : احاطہ کرنے والا، فارسی والے اسے بحر بکراں کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، کیونکہ پانی نے زمین کو سہ طرف سے گھیر رکھا ہے۔

شرح : میرے دوست اور مہدم اندونی شوش کے قائل نہیں درخان پروا خج ہو جانے کہ میرا دل گریے کا ایک بکراں سمندر ہے اور لب بڑی بے تکلفی سے خندہ زنی میں مشغول ہیں۔ یعنی میرے اندونی حالات ظاہر پر اثر انداز نہیں ہوتے اور ظاہری آشام کو میرے اندونی حالات کا نقشہ نہ سمجھنا چاہیے۔ میں اند ہی اندرجل رہا ہوں، لیکن کسی پر یہ راز ظاہر نہیں ہونے دیتا، کیونکہ برابر ہنستا رہتا ہوں اور دل کی کیفیت کسی پر آشکارا نہیں ہوتی۔

۱۔ لغات حسن بے پروا، خریدار متاع جلوہ ہے
آئندہ زانوئے فکر آئندہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہے

تا کجا اے آگہی! رنگ تماشا بافتن
چونکہ غور و فکر کے وقت
چشم و اگر دیدہ، آغوش و دراع جلوہ ہے
انسان عموماً گھٹنے پر سر
فارسی والے زانو کو آئینہ بھی کہتے ہیں۔
رکھ دیتا ہے۔ اس لیے

اختر اعراب : ایجاد

شرح : بلاشبہ حسن بالکل بے پروا اور بے نیاز ہے۔ یہ اس جہاز
جلوہ آرائی کا خاص شوق ہے۔ گویا وہ برابر جلوے کی متاع کا شہ یار چلا
جاتا ہے۔ وہ زانو پر آئینہ رکھ کر بناؤ سنگار کرتا ہے تو مقصد یہ ہوتا ہے
کہ جلوہ آرائی کے نئے نئے طریقے سوچے۔

۲۔ لغات۔ رنگ بافتن : رنگ شکستن یعنی رنگ کا بدن

اور متغیر ہوتا۔

تشریح : اے علم و شعور! تم کب تک عالم امکان کے دیکھنے کا رنگ
بدرستہ رہو گے؟ یعنی کب تک مختلف صورتوں میں اس دنیا کی چیزوں پر نظریں
جھانٹے رکھو گے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آنکھ ایک مرتبہ کھلتی ہے تو مطلب
یہ ہوتا ہے کہ جلوے نے رخصت کے لیے آغوش کھول دی ہے؟ گویا وہ
اس درجہ آبی و نانی ہے کہ ہر لپک جھپکنے میں رخصت ہوتا چلا جا رہا ہے۔

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی

۱۔ شرح :

اے محبوب حقیقی!

تجھ سے گفتگو کا راز

اس وقت تک کھنا

مشکل ہے۔ جب

مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن واکرے کوئی

عالمِ غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر

کب تک خیالِ طرہ یلیٰ کرے کوئی

افسردگی نہیں، طرب انشائے التفات
 ہاں، دردِ بین کے دل میں مگر جا کرے کوئی
 رونے سے اسے ندیمِ اِلامت نہ کر مجھے
 آخر کبھی تو عقدِ دل وا کرے کوئی
 چاکِ جگر سے جب رہِ پر سش نہ وا ہوئی
 کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
 لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
 تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی
 ناکامی نگاہ ہے، برقی نظارہ سوز
 تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
 بہرنگ و دشت ہے صدقِ گوہر شکست
 نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی
 سر بر ہوتی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر
 فرست کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
 ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاب، یا کس خیز
 یہ درد وہ نہیں ہے کہ پیدا کرے کوئی

بمک دل
 پر نہ غم
 کام نہ
 پیدا کر یا
 جائے ۔
 گویا جب
 تک تیرے
 ساتھ عشق
 کی حقیقت
 تڑپ
 پیدا نہ
 ہو، وہ
 ربط ضبط
 قائم کر
 لینا غیر
 ممکن ہے
 جسے اصطلاح
 میں مسرت
 و محاورت
 کہتے ہیں ۔
 بہر حال ہم
 اس دنیا میں
 باہتِ حیات
 رہیں

بیکاری جنوں کو ہے سر پٹنے کا شغل
 جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
 حسن فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسد
 پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی
 دے سکتا۔ اس کے لیے دل پر عشق کا ایسا چرکا لگنا چاہیے، جو منہ کا
 کام دے سکے۔

۲۔ شرح : دنیا پوری کی پوری عجنوں کی وحشت کے باعث
 گرد و غبار بن گئی۔ گویا زمین سے آسمان تک یہی گرد و غبار پوری فقنا پڑ
 سادی ہو گیا۔ اب سوچنا چاہیے کہ بیلی کے طرے کو اس سے کیونکر بچایا جائے۔
 مطلب یہ کہ عشق نے یہاں ایسا ہنگامہ بپا کر رکھا ہے کہ اس میں جس
 کے لیے اپنی آرائش و دیباچہ محفوظ رکھنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ لغات۔ طرب انشا : شادمانی پیدا کرنے والا۔
 شرح : میں جس امزدگی اور دل گرفتگی میں مبتلا ہوں، اس میں محبوب
 کے اتفاقات سے نشاط و شادمانی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یعنی محض اس کی توجہ
 سے میری امزدگی کا ختم ہونا محال ہے، البتہ محبوب دروہن کر دل کے اندر
 جا بیٹھے تو میں سمجھوں کہ حالت بدلنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی۔

۴۔ شرح : اے ہمد امیں دوتا ہوں تو تو مجھے سلامت کیوں کرنے
 لگا؟ آخر تو جی بتا کہ دل کی گرہ کا نہ کھٹنا کوئی کب تک گوارا کرے؟ کچھ نہ کچھ
 تو انتظام ہونا چاہیے۔ کہیں تو اس گرہ کا کھٹنا بھی مناسب مان لینا چاہیے۔

۵۔ شرح : جب سانسے جگر چیر رہے ہیں پر بھی محبوب جادے حال
 پرچنے پر متوجہ نہ ہوا تو خدا کے لیے بتاؤ کہ اب گریبان کو رسوا کرنے کا

کیا ٹاٹا ہے ؟ یعنی پاکب جگر حبیبیا عظیم القدر کار نامہ اسخام و سے چکنے کے بعد
 بھی مدام حاصل نہ ہوا تو کرتا پھاڑ لینے سے کیا بنے گا، جو پاکب جگر کے مقابلے
 میں بالکل بے حقیقت ہے ؟

اس شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جو مقصد بڑی بڑی قربانیوں
 سے حاصل نہ ہوا، اس کے لیے کس قدر قربانیوں سے کام لینا یقیناً بے سود
 ہے ۔

۶۔ لغات۔ لختِ جگر : جگر کے ٹکڑے ۔

شرح : میں صحرا میں پکڑ لگا رہا ہوں۔ وہاں کا ہر کاٹا میرے
 جگر کے ٹکڑوں سے پھول کی شاخ بن گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کب
 تک صحرا میں باغبانی کا فرض اسخام دیا جائے ؟ یعنی کب تک اس کے
 کانٹوں کو شاخوں سے گل اور اس کی وسعت کو خیابان بنانے کی کوشش
 کی جائے ۔

یہ خیال غارسی میں بھی ایک جگہ بڑی خوبی سے نظم کیا ہے :

آخستہ ایم ہر سر خار سے بہ خون دل

تاقون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

دہم نے ہر کانٹے کو دل کے لہو سے لت پت کر دیا ہے، یوں ہم
 نے تاقون بنا دیا ہے کہ صحرا میں باغبانی کیونکر کی جائے)

۷۔ مشہور : اسے حُسنِ حقیقی ! تجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھنے
 والوں کی نگاہیں ناقام چلتی ہیں اور میں ناکامی ان کے لیے ایسی بجلی بن
 جاتی ہے جو تپ نگاہ کا مال و متاع جلا کر خاک کر دیتی ہے ۔

۸۔ شرح : جنون کی حالت میں سوداگر لینا نقصان کا باعث

نہیں ہو سکتا، کیونکہ رٹ کے مہزون پر جو اینٹ پتھر پھینکیں گے، ان میں
 سے ہر ایک ایسی سیبی بن جائے گا، جس کے اندر سے شکست کا موتی نکلے ۔

اس شعر کا پہلا مصرع صرف الفاظ کا ہیر پھیر ہے، شکست سے مراد ہے سر کا ٹوٹنا۔ اس ٹوٹنے کو موقی قرار دیا اور ہرنگ و خشت کو صدف بتایا۔ لہذا ہر اینٹ پتھر کے بجائے موقی بنے، نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن وہ موقی نہیں، جو بادشاہوں کے تاج اور حسینوں کے ہاروں کی زینت ہوتے ہیں، بلکہ سر اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کے موقی، جو یقیناً نقصان ہے، مگر اس لیے نقصان نہیں سمجھا جاسکتا کہ دیوانے کو اینٹ پتھر ہی مطلوب ہوتے ہیں۔

۹۔ شرح : اے محبوب ! تیرا وعدہ اس درجہ صبر آزمائیا تھا کہ عمر اس کے پورا ہونے کا ساتھ نہ دے سکی۔ ظاہر ہے کہ تیری تنا زندگی ہی میں کی جاسکتی تھی، اب زندگی گزر جانے کے بعد تمنا کی صورت کیا ہے ؟ بہر حال یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہماری عارضی عمر تیری آرزو کے لیے کافی نہیں۔

۱۰۔ شرح : حجت اور ایچ کی فطرت ہی وحشت ہے مطلب یہ کہ جو لوگ فطرۃً حجت اور ایچ کا جوہرے کر دنیا میں آتے ہیں، وہ مسئلہ قواعد کی پابندی سے مزدور کم و بیش گریز کریں گے۔ اور وحشت کا خاصہ یہی ہے کہ کسی ایک ضابطے کی پابندی نہ کی جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو نئی چیز کیونکر پیدا ہو؟ پھر دنیا نئی چیز ہے آسانی قبول نہیں کرتی، اس سے اک گوشہ مایوسی پیدا ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کی فطرت میں اعلیٰ جوہر موجود ہوتے ہیں، وہ دنیا کے قبول و عدم قبول سے بے پروا ہو کر مزدور نئی چیزیں پیدا کرتے ہیں اور ان سے باز نہیں رہ سکتے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حجت ایک درد ہے، جس سے کوئی عالی دماغ انسان باز نہیں رہ سکتا۔ یہ صورت بنی نکلتی ہے کہ نئی چیز پیدا کر کے اپنے آپ کو مایوسی کا تختہ مشق بنانا ایک درد اور ایک دکھ ہے، لیکن جو

لوگ خاص جو ہرے کر آتے ہیں، وہ اس قسم کے درد پیدا کرنے میں متاثر نہیں ہوتے۔

۱۱۔ **شرح :** جیزن یا صاحب جیزن کے لیے اصل شغل یہ ہے کہ لباس تار تار کرے، گھر بار چھوڑے، اعزہ و احباب سے منہ موڑے اور صحرا میں نکل جائے۔ وہاں کوئی کام نہ ہو تو سر پٹینے کے سوا کیا شغل باقی رہ جاتا ہے؟ تاہم سر پٹینے کے لیے ہاتھ سلامت ہونے چاہئیں۔ یہ تباؤ کہ جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو کوئی کیا کرے؟

ظاہر ہے کہ سر پٹینا کوئی اچھا شغل نہیں، جس سے مفید نتیجہ برآمد ہو سکے، لیکن بیچارگی کا ایسا دور بھی آ سکتا ہے کہ حبث مشغلہ جاری رکھنے کی صورت ہی ناپید ہو جائے۔

۱۲۔ **شرح :** اسے اسدا شغل گوئی اور سخن وری کی شرح میں دلاویز روشنی پیدا کرتا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے طویل فرست دیکار ہے، نیز لازم ہے کہ جو شخص ایسی روشنی کا خواہاں ہو، وہ پہلے پھٹلا ہوا دل پیدا کرے۔

ظاہر ہے کہ جب تک دل میں رقت نہ ہوگی، شعر میں سوز و گداز آ ہی نہیں سکتا۔ پھر یہی مدت تک ریاضت کے بغیر کام نہیں بنتا۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی	میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی	ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر	دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پرواں زبان کشتی ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
 بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
 نہ سنا کر بڑا کہے کوئی نہ کہو گر بڑا کرے کوئی
 روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی
 کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی
 کیا کیا خضر نے سکندر سے؟ اب کہے رہنا کرے کوئی
 جب توقع ہی اٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۱۔ شرح : ابن مریم یعنی حضرت عیسیٰ ہیں تو ہوا کریں ۔
 بلاشبہ ان کے اعجاز سے بیمار شفا پاتے تھے اور مردے زندہ ہوتے تھے
 لیکن میرے لیے تو اصل شے اپنا دکھ ہے ، اس کی کوئی دوا تجویز کر دے
 تو میں جانوں اور مالوں ۔

۲۔ شرح : میں نے مانا کہ مقدمے کا فیصلہ شریعت اور قانون
 کے مطابق ہوگا ، کیونکہ مدار و انحصار انھیں دو چیزوں پر ہے ۔ اسلامی
 حکومت میں شریعت کی بنا پر فیصلہ کیا جائے گا اور غیر اسلامی حکومت میں
 قانون پیش نظر رہے گا ، تاہم دونوں میں گواہ ایسے جائیں گے ۔ آلات قتل
 پیش ہوں گے ۔ دیکھا جائے گا کہ مقتول کو کس کس آلے سے کتنی ضربیں
 لگیں ، لیکن میرا قاتل تو کسی مادی ہتھیار سے کام ہی نہیں لیتا ، بناؤ ، اس
 سے کیونکر باز پرس کی جائے گی ۔

۳۔ لغات ۔ کڑی کمان : وہ کمان ، جو سخت ہونے کے باعث

بہت زور لگا کر کہینچی جاتی ہے اور اس کا تیر ہنایت تیزی سے بہت دور پہنچ جاتا ہے۔

شرح : میرے محبوب کی چال ایسی ہے، جیسے کڑی کمان کا تیر ہو۔ ایسے محبوب کے دل میں جگہ پیدا کرنا کارے دارو۔ اس میں کوئی کامیاب ہو تو دیکھنا چاہیے۔

۴۔ **لغات :** بات پر زبان کٹنا : بات منہ سے نکلتے ہی سامع کا غصے سے سر ہوجانا۔ اور خاموشی کے سوا چارہ نہ رہنا۔

شرح : وہاں یہ حالت ہے کہ بات بات پر غصے سے سر ہو جاتے ہیں۔ لب کھڑتے ہی جان نکلتی ہے۔ عاقبت اسی میں نظر آتی ہے کہ جو کچھ وہ کہیں، چپ چاپ سنتے جائیں، یہاں تک کہ گالیاں بھی دیں تو کچھ نہ بولیں۔

۵۔ **شرح :** کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جنون کی حالت میں منہ سے کیا کچھ نکل رہا ہے؟ سیکھنے کے ساتھ مناسب حال بات کہنا میرے لیے ممکن نہیں یہی دعا کر سکتا ہوں کہ خدا کرے، کوئی کچھ نہ سمجھے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ ”کچھ نہ سمجھنے“ میں دو پہلو نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غرض یہی ہے کوئی سمجھے اور لغات کرے، مگر اپنے کچھ نہ پر آپ ہی تیشہ کی ہے اور غالباً یہی معنی مقصود ہیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی کچھ نہ سمجھے تاکہ راز فاش نہ ہو۔

۶۔ ۹۔ **لغات :** خضر و سکندر : مشہور ہے (اگرچہ

کوئی مستند تاریخی واقعہ نہیں) کہ سکندر نے خضر کو آپ حیواں کے لیے رہنا بنایا تاکہ دونوں پانی پی لیں اور آپ حیواں کے متعلق عام روایت کے مطابق ہمیشہ کی زندگی پائیں، لیکن خضر نے خود تو آپ حیوان نوش کر لیا اور سکندر محروم رہ گیا۔ اسی

یہ خواجہ حافظ نے کہا ہے :

تمیدستانِ قسمت را چه سود از رہبرِ کامل

کہ خضرؑ از آبِ حیاں تشنه می آید سکندرؑ

شرح : اگر کوئی بڑا کچھ تو اس پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں۔

کان دھرو گئے تو دل مکدر ہوگا اور جواب دینے کی آزمائش میں مبتلا ہو جائے گا۔ اگر کسی سے کوئی برائی سرزد ہو تو اسے جتاؤ نہیں، جتانے سے اس کا دل بڑا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ منہ میں آکر وہ اس بُرائی کے لیے اور جبری ہو جائے۔

اگر کوئی شخص غلط راستے پر چلے تو اسے روک لو۔ اگر کسی شخص سے

غلطی ہو جائے تو معاف کر دو۔

مولانا طباطبائی چچے اور ساتویں شعر کے متعلق فرماتے ہیں کہ تشابہ ترکیب

سے بندش میں حسن پیدا ہوا ہے اور پہلے شعر میں کہنے کی تکرار بھی لطفت سے خالی نہیں۔

کون ہے جسے کوئی نہ کوئی حاجت نہ ہو ؟ اگر تم کسی کے پاس کوئی

ضرورت لے جاؤ اور وہ پوری نہ ہو تو شکایت نہ کرو۔ یہ سمجھو کہ ضرورت مند

بہت زیادہ ہیں اور کوئی بھی شخص ان سب کی ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔

سکندر نے خضرؑ کو رہنا بنایا تھا، مگر نتیجہ کیا نکلا ؟ وہ خود آبِ حیات پی

کر ہمیشہ کی زندگی پا گئے اور سکندر کو ایک گھونٹ بھی نہ چلایا، چنانچہ وہ تیس

سال ہی کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ مثال سب کے سامنے ہے اب

کوئی کسی کو کس بھروسے پر رہنا بتائے ؟

۱۰۔ شرح : اے غالب ! جب امید ہی باقی نہ رہی تو کسی کا گلہ

شکوہ کرنے سے کیا فائدہ ہے اور کیوں کیا جائے ؟ گلہ شکوہ ہمیشہ اس سے

کیا جاتا ہے، جس سے کچھ امید ہو۔ جب بنیاد ہی موجود نہ ہو تو عمارت بنانے

سے کیا مطلب ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

اس کی تعریف کیا کرے کوئی

ہدایت عالی معنوں ہے ، جس کی تعریف نہیں ہو سکتی ۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے امید منقطع ہو گئی ہو ، پھر اس کا گلہ کیوں کریں ؟ قاعدہ تو کچھ ہو گا نہیں ، اور نفرت و دشمنی پیدا ہو گی ۔

۱۔ شرح :

زمانے کا غم کتنا ہی

زیادہ ہو ، میں پوچھتا

ہوں ، کیا شراب

کم ہے ؟ اگر غم

نے ستایا تو شراب

پی کر امنیں بیدلانا

ممکن ہو گا ۔ میں

ساقی کوڑ کا غلام

بہت سہی غم گیتی ، شراب کم کیا ہے

غلام ساقی کوڑ ہوں ، مجھ کو غم کیا ہے

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے

رقیب پر ہے اگر لطف تو رستم کیا ہے

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشان

یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

ہوں ، دنیا میں جتنے بھی غم پیش آتے ، آقا کی طرف سے مجھے شراب کوڑ ملے گا

اور سب غم و محمل جائیں گے ، پھر میں غم کیوں کروں ؟

۲۔ شرح : اے محبوب ! ہم تمہارا طور طریقہ خوب جانتے ہیں ۔ کہتے

ہو کہ مجھ پر ظلم نہیں ہوا ، لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ تم نے رقیب پر ہر باتیں شروع

کر دی ہیں ؟ پھر تباہ ظلم کیا ہوتا ہے ؟

۳۔ شرح : غائب کے قلم سے شعر و سخن کے جوشیلے برستے ہیں ان کا توہیں بھی اعتراض ہے اور یقین کیے بیٹھے ہیں ، لیکن سوال یہ ہے کہ اب اس بے مثال شاعر میں دم کہاں ہے ؟

باغ، پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایہ شاخ گل افنی نظر آتا ہے مجھے
جو ہر تیغ بہ سر چپہ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اُگاتا ہے مجھے
مدعا محو تماشا نے شکستِ دل ہے
آئندہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
نالہ سرمایہ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بھینڈ قمری نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے
بہت ہے ۔

شرح : باغ نے جب دیکھا کہ میں خفقان کے مرض میں مبتلا ہوں اور وہم و وسوسہ کی بن پر معمولی چیزیں بھی مجھے خوفناک نظر آتی ہیں تو ڈرانا شروع

۱۔ لغات :
خفقانی : خفقان
کامریض : خفقان
ایک بیماری ہے ،
جس میں دل کی
دھڑکن تیز ہو جاتی
ہے ، بیدار پر گھبراہٹ
طاری رہتی ہے ۔
خواہ مخواہ اس کے
دل میں وحشت انگیز
توہمات پیدا ہوتے
ہیں ۔ معمولی چیزیں
بھی اس کی نظریں
خوفناک بن جاتی
ہیں اور وہ ڈرتا

کر دیا، یہاں تک کہ پھول کی شاخ کا سایہ بھی مجھے کالا زہریلا سا نپ دکھائی دیتا ہے۔

بجنوری مرحوم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ہندوستان میں مغلوں کے زمانے کے بہت سے باغ ویران اور غیر آباد پڑے ہیں۔ سنگ مرمر اور سنگ رخام کی بارہ دریاں شکستہ و اتناوہ ہیں۔ جہاں شہزادے اور بیگمات رہتی تھیں، وہاں اب جنازات اور پریوں کا مسکن ہے۔ جن روشوں پر کافوری شمعیں روشن تھیں، وہاں اب جگنو اڑتے ہیں۔ نباتات نے دست انسانی کی قطع و برباد سے آزادی پا کر ایک عجیب آوارگی اختیار کر لی ہے۔ پانی کے پاس درختوں کے سائے میں جو پودے ہوتے ہیں، وہ اکثر طویل اور نازک تن ہوتے ہیں، جن کی شاخیں پتل جھونے کے باعث پھول کے وزن سے بھی جھک جاتی ہیں، اور ہوا کے خدا سے جھونکے میں ادھر سے ادھر لہرانے لگتی ہیں۔ شام کے وقت ان شاخوں کا عکس سبزے پر بعینہ سائب کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر طبیعت پر مایا، وحشت اور ہول کا اثر ہو تو اس اخفی سے ڈرنا کوئی عجب نہیں۔“

۲۔ لغات - زہر آب : وزہریلا پانی۔

تشریح : جس طرح تلوار کو زہر میں بھتانے سے اس کے جوہروں پر سبزی مانگی رنگ آ جاتا ہے، اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں، جسے زہر بھرا پانی اگاتا ہے۔

۳۔ تشریح : میرا دل ٹوٹ گیا۔ ایک آئینے کے بے شمار ٹکڑے ہو گئے۔ اب میرے مقصد کا عکس ایک ایک ٹکڑے میں نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مجھے آئینہ خانے میں بے جا رہا ہے۔

۴۔ شرح : دنیا کا سرمایہ مزید وفتاں ہے اور دنیا خاک کی ایک مٹی ہے۔ آسمان مجھے قمری کا انڈا نظر آتا ہے۔

آسمان کو قمری کا انڈا اس لیے کہا کہ قمری کا رنگ خاکستری ہوتا ہے۔ چونکہ دنیا مشیت خاک بن گئی، اس لیے آسمان اپنی ظاہری گولائی کے باعث قمری کا انڈا نظر آنے لگا۔

۵۔ شرح : جب میں جیتا تھا تو محبوب مجھے اپنی محفل سے نکلوا دیتا تھا۔ اب دیکھنا چاہیے کہ مرنے پر مجھے کون اٹھاتا ہے۔

”اٹھاتا ہے“ کے دو معنی ہیں، اول، محفل سے اٹھانا، دوم جنازہ اٹھانا اسی ایہام سے مراد نے یہاں غائبہ اٹھایا ہے۔

روندی ہوئی ہے کو کبیرہ شہر یار کی
اترائے کیوں نہ خاک سیرِ رگہزار کی
جب اُنکے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہولالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی
۱۔ لغات : کو کبیرہ : شاہی مجلس
شرح : راتے کی
خاک غوثِ نقیبی پر کیوں
نہ اترائے ؟ اس پر سے
تو بادشاہ کی سواری بہ
صورست مجلس گزری
۲۔ لغات : نمود : ہے

نمائش، شہرت، ناموری۔

شرح : جب بادشاہ سلامت بہ نفس نفیس لالہ زار دیکھنے کے لیے آئیں تو وہ کیوں لوگوں میں نمود و نمائش پر آمادہ نہ ہو اور شہرت و ناموری حاصل

نہ کرے۔

۳۔ شرح : ہم باغ کی شیر کے بھوکے نہیں ، لیکن بہار کی ہوا ہے جس کی خوشگوار سی میں کلام کی گنجائش نہیں ، پھر کیوں نہ کھائیں ؟

۱۔ شرح

خواجہ حاکمی

فرماتے ہیں :

”خواہش پر

دم نکلنا مطلب

ہے اس کے

پورا ہونے

کے لیے جلدی

کرنا ، چنانچہ

کہتے ہیں ، کیوں

دم نکلا جاتا ہے

یا کیوں مرے

جاتے ہو ، یہی

جلدی کرتے ہو

پہلے مصرع میں

پر مقتضائے مقام

یہ الفاظ کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل ؟ کیا رہے گا اس کی گروں پر ؟

وہ خون جو چشم تر سے عمر بھریوں دم بدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

نہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا

اگر اس طرف پڑیج و خم کا تیج و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی

پھر آ بادہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
 وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے
 محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
 اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا مزہ دم نکلے
 ذرا کر زور سینے پر کہ تیر پر ستم نکلے
 جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے
 خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم
 کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کا فر صنم نکلے
 کہاں سے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
 پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
 حال کے اعتبار سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ کم نکلے، کیونکہ جتنے نکلے ان سے
 زیادہ پیدا ہوتے گئے۔

۲۔ شرح : میرا قاتل تلوار چلانے میں ڈر کیوں رہا ہے ؟ اگر میں
 قتل ہو گیا تو اس کی گردن پر کیا رہ جائے گا ؟ وہ خون جو میری آنکھوں سے
 لگتا رہتا رہا۔

مقتول کا خون یقیناً قاتل کی گردن پر رہتا ہے۔ مرزا قاتل کے اس پہلو
 کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لیے مزمانے میں کہ اسے قاتل ! اگر میرا خون
 تیری گردن پر رہ گیا تو اس کی حقیقت کیا ہے ؟ عمر بھر تو یہ آنکھوں سے

"دل میں باقی
 میں" مقتدر شکن
 چاہئیں؟
 دل میں ہزاروں
 خواہشیں ایسی
 باقی ہیں، جن
 میں سے ہر
 خواہش کو پورا
 کرنے کے لیے
 دم نکلا جا رہا
 ہے۔ میں نے
 مانا کہ میرے
 بہت سے
 ارمان نکل گئے،
 لیکن حقیقت

ہتار دے۔

۳۔ **تشریح :** خواجہ حاتم فرماتے ہیں :

”دوسرے مصرع میں ”بہت“ کے لفظ پر زور دینا چاہیے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔“
اس شعر میں متعدد خوبیاں ہیں، مثلاً :

۱۔ کوچہ محبوب کو بالواسطہ غلہ قرار دے دیا۔

۲۔ حضرت آدم کا بہشت سے نکالنا تا تو سب کو معلوم ہے، لیکن بے آبروئی کا پہلو اس شعر سے پیشتر ابھرا نہیں تھا۔

۳۔ شعر کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ حضرت آدم کا بہشت سے نکلنا بھی

بے آبروئی کا باعث تو ضرور تھا، مگر وہ بے آبروئی ایسی نہ تھی، جیسی ہمیں پیش آئی، کیونکہ صاف معلوم ہوتا ہے، سرزا کو نکلنے یا نکالے جانے میں جو حالت پیش آئی، اس کے سامنے حضرت آدم کی بے آبروئی بھی معمولی چیز رہ گئی۔

۴۔ **لغات - بھرم :** اعتبار، ساکھ، عرت، راز۔

تشریح : اسے ستم گراؤ اپنے قد کی درازی پر بہت ناز کر رہا ہے لیکن اگر تیزی پر ہیچ و غم زلفت کے ہیچ و غم نکل جائیں تو ابھی درازئی قد کی ساکھ جاتی رہے اور اعتبار اٹھ جائے۔

مطلب یہ کہ قد اسی وقت تک کشیدہ نظر آ رہا ہے، جب تک زلفت کے ہیچ و غم نہیں کھلے۔ اس سلسلے میں ایک خاص نکتہ قابل غور ہے۔ اگر زلفت کے ہیچ و غم قائم رہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ کرتک پہنچے گی۔ اور درازئی قد پر بہت موزوں نظر آئے گی، لیکن اگر زلفت کے تمام ہیچ و غم کھول دیے جائیں تو وہ کمر سے بھی بہت نیچے آ جائے گی اور قامت محبوب کی درازی اس میں گم ہو جائے گی۔ یہ نظارے کا معاملہ ہے، جس کا تجربہ ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ شرح : مرزا کو معلوم ہے کہ جس بستی میں ان کا محبوب رہتا ہے اس کے اکثر باشندوں سے محبوب کا نام و پیام ہے۔ یہ حال دیکھ کر مرزا کو خیالی ہوا کہ دیکھنا چاہیے، مختلف لوگ اسے کیا کچھ لکھواتے ہیں چنانچہ محترمی اور منشی گری کی خدمت بہ طور خود اپنے ذمے لے لی۔ اب طریقہ یہ اختیار کر لیا کہ صبح ہوتے ہی قلم کان پر رکھ کر نکل پڑے اور ہر ایک سے پوچھتے جاتے کہ جسے محبوب کو خط لکھوانا ہوا وہ ہم سے لکھوالے۔

جب تعلیم عام نہ تھی تو ہر بستی میں صرف چند آدمی ہوتے تھے جن سے لوگ خط لکھواتے تھے۔ ان دنوں آج کل کی طرح انڈی پنڈنٹ نہ تھے۔ منشی لوگ قلم بنا کر کان پر رکھ لیتے تھے، جو بندش دستار کے باعث وہاں بالکل محفوظ رہتی تھی۔ جہاں کسی کو لکھوانے کی ضرورت پڑتی، جیسٹ جاتے اور قلم کان سے کیچنگ کر لکھ دیتے، پھر وہیں ٹھونس لیتے۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ قلم کی سیاہی سے کپڑے خراب نہیں ہوتے تھے۔

۶۔ لغات۔ بادہ آشامی : شراب نوشی۔

جامِ حجم : مشور ہے کہ شراب جمشید نے ایساہ کی تھی، اس لیے شراب کا پیالہ اسی سے منسوب ہوا، اگرچہ ہے معنی اضافہ۔

شرح : موجودہ دور میں شراب نوشی کی نسبت مجھ سے کی گئی، گویا مدت وراز کے بعد پھر ایسا زمانہ آیا، جس میں جمشید کے پیالے کا ظہور ہوا۔ مرزا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جو نسبت شراب کو جمشید سے تھی، وہی نسبت اسے آج مجھ سے ہے۔ زمانہ گزر گیا، لیکن ایسا دور کبھی نہ آیا، لہذا میں ہی ہوں، جس کی بدولت جامِ جمشید کا دور از سر نو تازہ ہو گا۔

۷۔ شرح : ہم جن لوگوں سے امید رکھتے تھے کہ وہ ہمارے دل کے زخم دیکھیں گے اور ان کے لیے مرہم کا انتظام کریں گے۔ جب ان کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تو ہم سے بھی بڑھ کر تیغ ستم کے زخمی ہیں۔

مطلب یہ کہ جو لوگ اپنے آپ کو روزگار کے چوکوں سے بچا نہ سکے اور زخم لگ چکنے کے بعد ان سے مراد ابن نہ آیا، ان سے ہمارے زخموں کی دوا کیونکر ملے گی؟

۸۔ شرح : عشق و محبت میں مرنا جینا ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ جس کا فریہ ہم مرتے میں، یعنی اس سے انتہائی محبت کرتے ہیں، اسی کا دیدار ہمارے لیے زندگی کا سامان ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس مقام پر مرنے جینے میں کوئی فرق نہیں۔

۹۔ مشرح : اسے غالب ! کہاں شراب خانے کا دروازہ اور کہاں واعظ؟ ان دونوں میں کیا مناسبت ہے؟ کیا یہ امید ہو سکتی ہے کہ واعظ شراب خانے کے دروازے پر ملے گا؟ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ کل ہم پی کر نکلے تو حضرت واعظ بھی اندر داخل ہو رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پھیڑ چھٹی دیکھی تو میدان خالی پا کر اندر چلے گئے۔ بیک شراب ایسی ہی شے ہے، جسے کوئی چھوڑ نہیں سکتا۔ کھلم کھلا نہیں پیئے گا تو چھپ چھپا کر مزدور لوش کرے گا۔

۱۔ لغات :
 شرابِ حبتہ :
 بھڑک ہوئی
 چنگاری۔
 شرح :
 بھڑک ہوئی

کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے
 بے تکلف اسے شرابِ حبتہ کیا ہو جائیے
 بیضہ آسا تنگ بال و پر سہیہ کنج قفس
 از سیر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

چنگاری کو از خود رنگی کے عالم میں دیکھا تو اسی سے پوچھتے ہیں، اگر ہم آواز کی طرح نہایت سبک اور لطیف شے بن جائیں تو پہاڑ جیسا پر وقار وجود ہمیں بار خاطر سمجھ کر ٹوٹا دیتا ہے۔ پھر اسے بھڑکی ہوئی چنگاری اتو ہی بتا کہ ہم کیا بن جائیں؟

پہاڑ کے لیے آواز کا بار خاطر نہنا اور ٹوٹا دینا مشاہدے کا معاملہ ہے۔ جب پہاڑ میں بلند آواز سے بولیں گے تو آواز ٹیلوں سے ٹکرا کر گونجتی ہوئی گم ہو جائے گی۔ اس سے مردانے یہ مضمون نکلا کہ صدا جیسی ہلکی چیز بھی پہاڑ جیسے عظیم القدر وجود کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ وہ اسے دل کے لیے بوجھ سمجھتا ہے، اسی وجہ سے واپس کر دیتا ہے۔ اب حیران ہیں کہ کیا بن کر زندگی گزاریں!

۲۔ لغات۔ بیضہ آسا : انڈے کی طرح

شرح : پتھرے کا گوشہ انڈے کی طرح بال و پر گوارا نہیں کرتا، یعنی بال و پر کو باعثِ تنگ سمجھتا ہے۔ معلوم ہے کہ جو نچتے انڈے سے نکلنے ہیں، ان کے بھی بال و پر نہیں ہوتے۔ اگر مجھے پتھرے سے ربانی مل جائے تو یقیناً نئے سرے سے زندگی پاؤں۔

مولانا طابا لمبانی فرماتے ہیں :

”مصنف نے ثابت کیا کہ طائر کی نئی زندگی بیضے سے نکلنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کٹیج قفس سے یعنی بیضہ فلک سے رہا ہونے کے بعد نئی زندگی عالمِ ارواح میں شروع ہوگی۔“

۱۔ شرح : مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
 ساقی کی اداسے تغافل
 موجِ شراب یک مژدہ خوابِ ناک ہے
 نے مستی کو بھی ہلاک
 جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرڈو
 کر دکھا ہے شراب
 جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
 کی لہر پر نظر ڈالی
 جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
 جابٹے تو معلوم ہوتا
 صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے
 ہے کہ وہ ایسی چک
 غلبہ ہے، یعنی اونگھ رہی ہے۔

۲۔ شرح : اب دل میں تیغِ ناز کا زخم کھانے کے سوا کوئی تئنا نہیں
 حال یہ ہے کہ میرے خیال کا گریبان بھی تیرے ہاتھوں سے تار تار ہو گیا ہے۔
 ۳۔ شرح : اے اسد! جنوں نے ایسا جوش مارا کہ میں کچھ نظر
 نہیں آتا۔ گویا صحرا خاک کی ایک مٹھی تھی، جو ہماری آنکھ میں جھونک دی
 گئی۔ اس طرح بصیرت داخل ہو گئی۔

لغات : لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گوارہ جنبانی
 گوارہ جنبانی :
 قیامت کشتہ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگین ہے
 پگورا جانا۔
 لعلِ بتاں : محبوبوں کے لب۔
 سنگین خواب : حد درجہ گہری نیند۔
 شرح : قاصدہ ہے کہ بچے کو سنانے کے لیے پگورا آہستہ

آہستہ بلاتے رہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ مَرُودوں کو زندہ کرتے تھے تو قم باذن اللہ کہتے تھے۔ اس طرح ان کے لب ملتے تھے۔

فرماتے ہیں کہ جو لوگ مجبوروں کے لب کے مارے ہوئے ہیں، وہ اسی گہری غیند سو گئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ انہیں قم باذن اللہ کہتے ہیں تو اس جنبش لب سے ان کا پنگورا بننے لگتا ہے، گویا سونے والوں کی غیند اور گہری ہو جاتی ہے۔

آہریلاب طوفانِ صدا ئے آب ہے !
 نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی بادہ سے
 بزمِ مے و دشتِ کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
 شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے
 ار لغات :
 بادہ : پگ ٹنڈی
 مشرح :
 سیلاب آرہا ہے
 اور پانی کے نور
 شور نے طوفان
 کی صورت اختیار کر لی ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ پاؤں کے نشان نے بھی
 پگ ٹنڈی کو انگلی سمجھ کر کان میں رکھ لیا ہے۔

کان میں انگلی رکھ ل جائے تو باہر کی آواز کم ہو جاتی ہے۔ پاؤں کا نشان
 کان سے مشابہ ہوتا ہے۔ اب مرزا صاحب کا کمال دیکھیے کہ سِل آرہا ہے۔
 اس کی آواز سے دشت و جبل گونج رہے ہیں۔ سب پر دشت طاری ہے۔
 یہاں تک کہ نقشِ پا بھی اس سے فارغ نہیں۔ اسے اور کچھ مد ملا تو پگ ٹنڈی
 کو انگلی سمجھ کر کان میں رکھ لیا۔

۲۔ مشرح : کس محبوب کی مست آنکھوں نے شراب کی مجلس کو
 دشت کا گھر بنا دیا اور مراجمی میں شراب کی لہر میں پری بن کر چھپ گئی۔

اب اس شعر کی مناسبتوں پر جزد مزا آئے، بزم سے، چشم مست،
 شیشہ، موج بادہ، پھر وحشت کدہ، پری، شیشہ، کیونکہ پر یاں شیشے
 ہی میں اتارتے ہیں۔ شعب، پنہاں، موج بادہ۔

شرح : ہوں میں بھی تماشا فی نیرنگ تما

میں بھی تما کی مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برائے
 نیرنگی کا تماشا

ہوں، یعنی دیکھ رہا ہوں کہ تما کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ میرا مقصد ہرگز
 یہ نہیں کہ جو حتما جی میں ہے، وہ ضرور پورا ہو جائے۔

شرح : سیا ہی جیسے گر جانے دم تحریر کا غز پر

جس طرح کوئی مری قسمت میں یوں تصویر ہے شہائے ہجراں کی
 چیز بکھتے وقت

کا غز پر سیا ہی گر جاتی ہے، اسی طرح میری تقدیر میں فراق کی راتوں
 کی تصویر بن گئی۔

مطلب یہ کہ شہائے فراق کا معاملہ تحریر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا،
 یعنی یہ نہیں لکھا کہ کتنی دیر تک اور کس کس طرح میں دکھ اعضاؤں کا اور
 کڑیاں جھیلوں کا۔ ان کی جگہ سیا ہی گرا دی اور اسی میں سب کچھ آ گیا۔

ہجوم نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افتاں ہے
 غموشی ریشہ صد نیتاں سے نفس بدنداں ہے
 تکلفِ بر طرف ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں
 نگاہِ بے حجابِ ناز تیغ تیزِ سریاں ہے
 ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
 کہ صبحِ عیدِ محبہ کو بدتر از چاکِ گریاں ہے
 دل و دیں نقدِ لاساقی سے گر سودا کیا چاہے
 کہ اس بازار میں ساغرِ متاعِ دستِ گرواں ہے
 غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
 چراغِ روشن اپنا قلمِ صرصر کا مرباں ہے
 شرح : مزید وفتاں کا ہجوم ہے ، لیکن حیرانی ایک آہ کرنے
 سے بھی عاجز ہے ۔ حیرانی کا خاصہ خاموشی ہے ، یعنی اس نے سیکڑوں
 نیتاؤں کا ریشہ گھاس کے تنکے کی جگہ دانتوں میں دبایا ہے ۔ ریشہ نیتاں
 اس لیے لائے کہ فریاد وفتاں نے ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے ، گویا وہی
 فریاد کی جڑ ہے ۔ چونکہ نالوں کا ہجوم تھا ، اس لیے جو ریشہ دانتوں میں یا
 وہ ایک نیتاں کا نہیں ، بلکہ سینکڑوں نیتاؤں کا تھا ۔
 ۲۔ لغات ۔ جاں ستاں تر : جان لینے میں زیادہ تیز و مبیک ۔
 بدخویاں : بری عموماً اے ، یعنی محبوب ۔

۱۔ لغات :
 حس بدنداں :
 پہلے مکھ چکے
 ہیں کہ جب وہ
 لشکروں میں سے
 کوئی ایک مطلوب
 ہو جاتا تو وہ
 اظہارِ محبت کے
 لیے تنکے دانتوں
 میں دبالتا اس
 سے سمجھا جاتا
 کہ رٹائی ختم
 کرنے اور شکست
 مان لینے کا
 اعلان ہو گیا ۔

شرح : پہلی بات یہ ہے کہ محبوبوں کی مہربانی ان کے تغافل سے بھی زیادہ جان لیوا ہے۔ جب وہ بے حجاب ہو کر نگاہ ناز ڈالتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ تلوار میدان سے نکل آئی اور چلنے لگی۔

۳۔ **شرح :** غم کی اتنی کثرت تھی کہ خوشی کی پوری کیفیت ہر بار ہو گئی، یہاں تک کہ عید کی صبح بھی میرے لیے گریبان تار تار ہونے سے بدتر ہے۔

۴۔ **لغات :** دست گرداں : وہ چیز جو ایک ہاتھ سے قیمت دے کر دوسرے ہاتھ سے لی جائے، یعنی نقد کپنے والی چیز۔

شرح : اگر تُو ساقی سے شراب کا سودا کرنا چاہتا ہے تو دل اور دین لے آ۔ انھیں حوالے کر دے اور شراب لے لے۔ دنیا کے بازار میں شراب کا پیالہ ہی ایسی چیز ہے، جو نقد قیمت دے کر خریداجاتا ہے۔

مولانا غلامحسین فرماتے ہیں : ”سافر کو متاع دست گرداں کہنا ایسا طعنت رکھتا ہے کہ دل و دین نیلِ مصنف کرنا چاہیے۔“

۵۔ **لغات :** قلزم صرصر : آندھی کا سمندر۔

مرحبان : مونگا۔ سرخ رنگ کی ایک جمادات نباتات، جو سمندر میں شاخ در شاخ دُور دُور تک پھیل جاتی ہے۔

شرح : غم عاشق کی پرورش ہلاکِ گود میں کرتا ہے۔ یعنی ہر طرف سے بلاؤں کے طوفان اٹھتے ہیں اور ان میں عاشق کی پرورش ہوتی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ اگر آنحضرتؐ فرما دیں کہ تم لو اس سمندر میں ہمارا روشن دیا مونگے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتنا یہ چاہتے ہیں کہ آندھی کا کتنا ہی زور ہو اور ہمارا چراغ بجھا نہیں سکتی۔ ہماری قنطرت ہی ہے کہ بلاؤں میں پرورش پاتے ہیں۔

۱۔ شرح :

غاموشیوں میں ایسی
ادائیں نکلتی ہیں، جو
دیکھنے سے ذائقہ رکھتی
ہیں۔ تیری نگاہ دل
سے نکلتی ہے تو سرے
سے بھری ہوئی آتی
ہے۔

یہاں شاعر نے غاموشی

اور سرے کی مناسبت پیشِ نظر رکھی۔ مشہور ہے کہ کوئی شخص سرمہ کھالے
تو اس کا گلہ میٹھ جاتا ہے۔

۲۔ لغات۔ فشار : بھیپنا۔

شرح : صبا کبھی پھرتی پھراتی کل کے اندر جا پہنچتی ہے تو جگہ
کی تنگی سے بھیج کر اوس بن جاتی ہے۔ گو یا شبنم کوئی الگ شے نہیں، یہی
صبا تھی، جو غیظ کی تنگی میں پہنچی تو چاروں طرف سے بھیپنی لگئی اور اسے
پسینہ آگیا۔ انہیں قطروں کو ہم شبنم کہتے ہیں۔

۳۔ شرح : اُس تیغ نگاہ کی آب و تاب عاشق کے سینے سے کیا
پوچھتے ہو؟ یہ وہی تیغ ہے، جس نے دروازے کے روزن میں زخم ڈال
ڈیے اور ان سے ہوا نکلنے لگی۔

مطلب یہ کہ محبوب جس دروازے سے جھانکتا ہے، اس میں روزن
حقیقتہً زخم میں اور زخم بھی ایسے گہرے کہ ان سے ہوا آتی ہے۔ پھر خود
ہی اندازہ کریں کہ اس تیغ نگاہ نے سینہ عاشق سے کیا سلوک کیا ہوگا
بجھوری مرحوم فرماتے ہیں :

”بجلا اطبا کے سوا کون اس بات سے واقف ہے کہ زخم
خواب ہو جانے کی علامت یہ ہے، اس کے اندر ہوا نفوذ
کرنے لگے۔ جو زخم سامنے دینے لگتا ہے، وہ ضرور ملک ثابت
ہوتا ہے۔“

۱۔ شرح:

جس جگہ نسیب کیوے
محبوب میں کلگی کر
رہی ہے اور اس
کی بدستی و آراستگی
میں مصروف ہے،
وہاں محرابے تاتار
کے آہو کا داغ
تازہ بن گیا ہے۔

تازہ اس بخیر
خون کو کہتے ہیں جو
آہوئے فتن کے
شکار کے بعد اس
کی ناک میں جم جاتا
ہے۔ عام دستور
یہی ہے کہ شکار کرتے
ہی بہرن کی ناک پکڑ

جس جا نسیب شانہ کش زلفِ یار ہے
نازد داغِ آہوئے دشتِ تتر ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کوہِ اے خدا!
آئینہِ مزین ششِ جہتِ انتظار ہے
ہے فزہ فزہ تنگی جا سے غبارِ شوق
گردامِ یہ ہے وسعتِ صحرِ اشکار ہے
دلِ مدعی و دیدہ بنا دعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر رو بکار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینہِ برگِ گل پر آب
اے عندلیبِ اوقت و دارج بہار ہے
تجِ آپڑی ہے وعدہٴ دلِ دار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے یہ یاں انتظار ہے

مے پردہ سوئے وادعی مجنوں گزُر نہ کر
 ہر قدم کے نقاب میں دلِ بیقرار ہے
 اے عذیب یک کفِ خس ہر آشیاں
 طوفانِ آمد آمدِ فضل بہار ہے
 دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
 اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے
 غفلت کینل عمر و اسد ضامن نشاط
 اے مرگ ناگماں تجھے کیا انتظار ہے
 کہ اس کی ناک کے بجائے دماغ ناذر بن گیا۔

۲۔ شرح : حیرت کس کے جلوے کا کھوج لگا رہی ہے کہ
 صورت یہ پیدا ہو گئی ہے، اگر انتظار کو ایک ایسا عالم فرما کر دی جس کی
 طرفیں عالم امکان کی طرح چھ ہوں یعنی پورب، پچیم، آد، اوکھن، اور پیچھے
 تو اس کے فرش پر آئینہ ہی آئینہ بچھا ہوا ہے، گو یادہ فرش سراسر
 آئینہ ہے۔

آئینہ ایک طرت حیرت کا منظر ہے اور دوسری طرت انتظار کا۔
 مولانا بجنوری فرماتے ہیں کہ عالم کو دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا ہے، ابھی
 کسی چیز کی کمی ہے، شش سمت آراستہ ہوئے ہیں اور منظر میں۔
 بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح انسانیت کی تکمیل باقی ہے،
 اسی طرح عالم کی تکمیل کا بھی انتظار ہے۔ اس کی کیفیت لحظہ بہ لحظہ بدل رہی

کہ اس پر ڈور باندھ
 دیتے ہیں تاکہ خون
 وداں سے پھیلنے نہ
 پائے اور یک جا
 ہو کر بہت ہو جائے
 لیکن جب نسیم نے
 زلفِ محبوب میں
 شانہ کشی شروع
 کی تو وہی خوشبو
 لے کر آہوے
 دشت تارکک بھی
 پہنچ گئی۔ نتیجہ لکھا

ہے، جیسا کہ مرزا غالب کہتے ہیں :

درد ہر مژدہ برہم زد دل میں خلق جدید است

نظارہ نگاہ کہ ہمان است، ہمان نیست

کلّ یوم ہونی شان بھی اسی کی شہادت دے رہا ہے۔

۳۔ **شرح :** میرے دل میں خاک اڑاتے کا جو شوق دلولہ امروز

ہے، صحرا کی تنگی کے باعث پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکا اور پستے پستے ذرّہ

ذرّہ ہو گیا ہے۔ اگر میرے شوق کی یہ کیفیت باقی رہی تو ظاہر ہے کہ صحرا

کی وسعت تو اس حال میں آہی جائے گی، لیکن میرے شوق کی تسکین کا سامان
کیا ہو گا ؟

ذرّہ ذرّہ ہو جانے کو مرزا نے حلقہ ہائے دام سے تعبیر کیا۔

۴۔ **لغات :** روبکار : پیشی۔ مرزا پہلے بھی لکھ چکے ہیں :

دل و دیدہ کا جو مقدمہ تھا

آج پھر اس کی روبکاری ہے

شرح : دل مدعی بن گیا اور آنکھوں کو متاع علیہ بنا دیا، یعنی دل

نے آنکھوں کے غلامت جو دعوے دائر کر رکھا تھا، اس کی بنا پر نظارے کا

مقدمہ بنا۔ اس مقدمے کی آج پھر پیشی ہے۔

۵۔ **لغات :** آئینے پر پانی چھڑکنا : ایران میں ایک رسم

ہے کہ جب مسافر سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کی یہ خیر و سلامت واپسی کے

لیے آئینے پر پانی چھڑکتے ہیں۔

شرح : پھول کی پکھڑی کے آئینے پر شبنم پانی چھڑک رہی ہے

اے بیل ! یہ کیفیت دیکھ انہی سمجھ لے کہ بہار کے رخصت ہونے کا وقت

آ گیا۔

بہار کی رخصت اور خزاں کی آمد عموماً اس وقت شروع ہوتی ہے جب

فردا موسم میں خشکی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی وقت شبنم زیادہ مقدار میں گرنے لگتی ہے۔ ممکن ہے، پہلے مصرع کے معنوں میں مرزا کے پیش نظر یہ کیفیت بھی ہے۔

۶۔ لغات - تیج آپڑنا - اپنی بات نباہنا اور اس کا پاس کرنا۔

شرح : میرے لیے تو یہ مجبوری پیش آگئی ہے کہ محبوب نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں تو بہر حال اس وعدے کا پاس کروں گا۔ وہ اسے پورا کرے نہ کرے، آئے یا نہ آئے، مجھے تو انتظار کے سوا چارہ نہیں۔ اگر میں اس کی عام بد عہدی کے پیش نظر انتظار نہ کروں، اور حرا دھر جو باتوں اور وہ واقعی آجائے تو مجھ پر یہی الزام عائد کرے گا کہ وعدے کے مطابق تو نے انتظار نہ کیا۔ غرض میں انتظار کے لیے مجبور ہوں۔

۷۔ شرح : جس دادی میں مجنوں رہتا تھا، اس کے ہر ذرے کے بارے میں ایک بیتاب و بیقرار دل موجود ہے، لہذا اسے محبوب آدمی تجھے بے پردہ نہ جانا چاہیے، ورنہ تمام دل تڑپ اٹھیں گے اور دادی میں قیامت کا منظر رونما ہو جائے گا۔

مولانا طیب علوی فرماتے ہیں :

”ذرے کے جگگاتے کو دل کے تھلانے سے تشبیہ تام ہے، غرض یہ ہے کہ دادی مجنوں میں جو ذرہ ہے، بیتابی مجنوں کا آئینہ دار ہے۔“

۸۔ شرح : اے کھیل ! کہیں سے گھاس کے تنکوں کی ایک مٹھی جمع کر لے تاکہ آشیانہ بنا لے، ورنہ فصل بہار طوفان کی شکل میں چلی آ رہی ہے۔ تمام سوکھے تنکے ہرے ہو جائیں گے۔ ہر جگہ پھول کھل جائیں گے اور تجھے تیل تک ڈھونڈنے سے نال کیے گی۔

۹۔ لغات - خبر : یہاں آگئی اور معرفت کے لیے آیا ہے۔

سیر : اس سے مراد گردش و تفریح بھی مراد ہو سکتی ہے اور وہ سیر بھی سمجھی جا سکتی ہے ، جو اہل سلوک کو روحانی منزلوں میں پیش آتی ہے ۔

تمثال دار : تصویروں کا مرتبہ ۔

شرح : اسے عقل و شعور سے کام نہ لینے والے ! دل حقائق ذکر ۔ اگر اس کے ذریعے سے تجھے معرفت کا نور حاصل نہیں ہو سکتا تو مضائقہ نہیں ، اس مرتبہ میں ایسی تصویریں تو موجود ہیں جو تیرے لیے سیر و تفریح کا باعث ہو سکتی ہیں ۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

”جس دل میں دنیا بھر کی حسرتیں اور آرزوئیں بھری ہوں ، وہ آئینہ تصویر ہے اگرچہ اس میں ایسی صفاتی نہیں کہ جلوہ معرفت حاصل ہو سکے ، لیکن سیر کیا کم ہے ؟“

گویا مولانا طہطائی کے نزدیک تمثال دار آئینے سے مقصود ایسا دل ہے ، جس میں دنیا کی حسرتیں اور آرزوئیں بھری ہوں اور ہر ایک کا عکس اس میں صاف نظر آئے ۔

ان معنی کے پیش نظر بھی یہ خیال ہوتا ہے کہ مرزا دل کو ایک قیمتی چیز سمجھتے ہیں اور اس کے دو پہلو ہیں ، ایک صوری ، دوسرا معنوی فرماتے ہیں کہ اگر معنویت اور حقیقت تک پہنچنا ممکن نہیں تو اس کا ظاہر بھی خالی از منفعت نہیں سمجھا جا سکتا ۔

۱۰۔ لغات ۔ کفیل : کفالت کرنے والا ، ذمہ اٹھانے والا ۔

ضامن : ضمانت دینے والا ۔

شرح : غفلت اور بے خبری نے یہ ذمہ اٹھایا کہ عمر کا دور کبھی ختم نہ ہو گا ۔ آندیش و نشاط کا ضامن بن گیا ۔ گویا اس نے یہ مسئلہ

اختیار کر لیا کہ کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ، کیونکہ زندگی کا حاصل یہی ہے جب کیفیت یہ ہے تو اسے اچانک آنے والی موت ! تو کس انتظار میں ہے ؟

مطلب یہ ہے، انتظار کی بڑی سے بڑی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ غفلت ختم ہو جائے گی اور اسد جان لے گا کہ مرنا لازم ہے، لہذا عمل کی کچھ متاع آئندہ زندگی کے لیے بھی جمع کر لینی چاہیے۔ اسد سے یہ امید ہو سکتی تھی کہ وہ اندازہ کر لے گا، عیش و نشاط ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتے۔ ایسے اسباب جمع ہی کر لینا غیر ممکن ہے، جو دائمی عشرت و نشاط کے ضامن بن سکیں۔ جب اس حالت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا تو نتیجہ سوا اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اچانک موت آئے اور عمر کے ساتھ عیش و نشاط کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
حسرت نے لار کھا تری بزم خیال میں
گلہ زنگاہ سویدا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
انہوں انتظار تماشا کہیں جسے
۱۔ شرح :
اے محبوب ! میں
ایسا خین کہاں سے
لاؤں، کہ تو بھی قائل
ہو جائے، واقعی یہ
مجھ ایسا ہے۔ دے
زمین پر تو ایسا
خین ملتا نہیں۔ اب
میرے لیے اس
کے سوا چارہ نہیں

تیرے لہجہ میں آئینہ
دسے دوں تاکہ تو
اپنے جیسے کا عکس
دیکھ کر حیران رہ
جائے اور یہ حیرانی
دیکھنے والوں کے
لیے ایک تماشا بن
جائے۔

سر پہ ہجوم درو غریبی سے ڈالے
وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے ہناں
شوقِ عناں گیسختہ، دریا کہیں جسے
ورکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار، پنہاؤ مینا کہیں جسے
غالبِ بُرا نہ مان جو واعظِ بُرا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

شرعے مقصود
صرف یہ ظاہر کرنا
ہے کہ محبوب کا
ثانی ہے ہی نہیں،
ہے تو صرف اسی کا عکس ہے، جو آئینے میں نظر آئے۔

۲۔ محبوب کی بزمِ خیال سے مراد عاشق کا دل ہے، کیونکہ محبوب
بہمیشہ اس میں جلوہ گر رہتا ہے۔

شرح : حسرت نے تری بزمِ خیال میں نگاہوں کا ایک گلدستہ
فراہم کر رکھا ہے۔ اسی گلدستے کو لوگ سویدہ سمجھتے ہیں، یعنی وہ داغ
جو دل پر نقش ہوتا ہے۔

سویدہ کو گلدستہ نگاہ اس لیے کہا کہ اس میں اک گوشتِ سیاہی
ہوتی ہے اور سیاہی شادمانی سے محرومی کی دلیل ہے، یعنی نگاہیں محبوب
کی زیارت سے شرف حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوتی رہیں، مگر زیارت
نہ ہو سکی اور وہ حسرت بنتی گئیں۔ اس طرح حسرت زدہ نگاہوں کا ایک
مجموعہ تیار ہو گیا چونکہ اسے بزم میں رکھنا مقصود تھا اور بزم میں گلدستہ رکھنا

جاتا ہے، لہذا انگاہوں کے مجھوٹے کو گلہ سن کر راز دے دیا۔

۳۔ شرح : اسے خدا ! محبت کے کان میں انتظار کا وہ منتر کس نے چھونک رکھا ہے، جسے تمنا کہا جاتا ہے ؟

تمنا کو انصوب انتظار کہنا ایک ایسا ادبی معجزہ ہے، جو صرف مرزا غالب سے ممکن تھا۔ تمنا کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان آرزو پوری ہونے کے انتظار میں الجھا رہے، لہذا اسے انصوب انتظار کہا، یعنی ایسا منتر، جو انسان کو انتظار پر سہرا آدہ کر دیتا ہے اور اس منتر کا اثر اس وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک تمنا پوری نہ ہو جائے۔

حقیقی محبت وہ ہے، جو سہر تمنا اور سہر آرزو سے پاک ہو۔ مردانہ عزائم ہیں کہ محبت کے کان میں تمنا کا منتر کس نے چھونکا؟ جب تمنا آئی، اپنی عرض آئی، حقیقی محبت ناپید ہو گئی۔

۴۔ شرح : غریب الوطنی کے درد نے اس درجہ پریشان کر رکھا ہے کہ مھو کو، جو بہر حال ایک مشت خاک ہے، سر پر ڈال لوں تاکہ نہ مھو باقی رہے، نہ غریب الوطنی، دونوں دکھ ختم ہو جائیں۔

۵۔ لغات۔ عنان گسیختہ : بگ ٹٹ۔ سرپٹ اے قابو۔

شرح : محبوب کے دیدار کی حسرت دل میں موجود ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہے کہ ان آنکھوں میں شوق کا ایک بگ ٹٹ اور بے قابو طوفان اُٹھ اُٹھ آیا ہے، جسے سمندر کہنا چاہیے۔

مولانا طالعباتی فرماتے ہیں : ”عنان گسیختہ“ اس شعر میں لفظ نہیں، احساس جڑ دیا ہے۔ جب دوسری زبان پر ایسی قدرت ہو، جب کہیں اپنی زبان میں اس کے الفاظ لانا محسن رکھتا ہے اور شوقِ عنان گسیختہ سے مجازاً جوش انگ مقصود ہے، کیونکہ یہاں مستب کے محل پر سبب کو مجازاً استعمال کیا ہے۔

۶۔ شرح : عیش کے پھول کھیلنے پر آمادہ ہیں اور عام بھولوں کی طرح

ان کے کھٹنے کے لیے بھی ایک صبح درکار ہے۔ وہ کیا ہو سکتی ہے ہنچ بہار جسے شراب کی مراچی کی ڈاٹ کہنا چاہیے۔

مطلب یہ کہ عام پھول موسم بہار میں صبح کے وقت کھلتے ہیں، لیکن بیش و نشاط کے پھول کھٹنے کے لیے وہ صبح بہار درکار ہے جسے شراب کی مراچی کہتے ہیں۔ شراب کی مراچی کو بند رکھنے کے لیے گزشتہ زمانے میں روٹی استعمال کرتے تھے۔ روٹی کو بہ لحاظ سفیدی صبح سے تشبیہ دی اور صبح بہار اس لیے لائے کہ شراب پینے کا اصل مزہ موسم بہار ہی میں ہے۔ بہار باغ و رانغ میں پھول کھلانے کی، شراب میش و نشاط کی کلیوں کو پھول بنانے کی۔

۷۔ مشرح : اسے غالب اگر دواعظ تیری برائی کرتا ہے تو اس پر بُرا نہ مان۔ دنیا میں کون ہے جسے سب اچھا کہیں؟ اگر تیری زندگی و خرابی غشی کو دواعظ نے بُرائی کی دستاویز بنایا ہے تو صرف اس حقیقت پر نظر رکھ کہ دنیا بھرنے آج تک کسی کو کیاں اچھا نہیں سمجھا۔

لوگ کسی کی طرف سے اختلاف رائے کا معمولی اظہار سن کر گڑبٹھٹے ہیں اور رو دکہ کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اُس حقیقت پر یقین کر لیا جائے جو مرزا غالب نے اس شعر میں پیش کر دی ہے تو کشمکش کا خاصا بڑا سلسلہ ختم ہو جائے۔ ہے تو یہ بالکل معمولی چیز اور سچائی ہمیشہ معمولی اور پیش پا افتادہ چیز ہوتی ہے، یعنی کوئی ایسا آدمی نکالیے جسے ساری دنیا نے اچھا سمجھا ہو۔ جب حقیقت یہ ہے تو ایک دو پانچ دس یا بیس تیس افراد کے بُرا کہنے کو کیوں بُرا مانا جائے؟

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی نہ ادا ہے
 داغِ دلِ بے دردِ نظر گاہِ حیا ہے
 دلِ خوں شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار
 آئینہ بہ دستِ بتِ بدستِ خفا ہے
 شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
 جی کس قدر اندرونی دل پہ جلا ہے
 تماشِ میں تیری ہے وہ شوخی کہ بعدِ فوق
 آئینہ بہ اندازِ گلِ آغوشِ کشا ہے
 قمری کفِ خاکستر و بیلِ قفسِ رنگ
 لے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے
 ٹوٹنے تری اندر وہ کیا وحشتِ دل کو
 معشوقِ دے حوصلگی طرفِ بلا ہے
 مجھوری و دعوائے گرفتاریِ الفت
 دستِ تہِ سنگِ آمدہ پیمانِ وفا ہے
 معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
 تیغِ ستم آئینہ تصویرِ نما ہے

۱۔ لغات :
 نظر گاہ : وہ مقام
 جس پر نظر پڑے ۔
 اس سے قابلِ احترام
 مقام بھی مراد ہے ۔
 شرح : لے کے
 پنکھڑیوں پر اوس کے
 قطرے پڑے ہوئے
 ہیں اور ان کا وہاں ہونا
 خالی از علت نہیں ۔
 یہ ایک خاص مطلب
 ادا کر رہے ہیں ۔ ان
 کے ذریعے سے ایک
 خاص مقصد پورا ہو
 رہا ہے ۔ مقصد یہ ہے
 کہ جس دل میں داغ ہو
 اور درد ہو اس پر
 شرم دیا کی نظر پڑتی
 ہے ، یعنی وہ باعثِ
 شرم ہے ۔
 لے میں داغ
 ہوتا ہے ، مگر سوز نہیں
 ہوتا ، یعنی وہ عاشقوں

میں تو شامل ہو گیا ، لیکن دردِ عشق سے
 خالی رہا۔ یہ جو اس
 پر شبنم نظر آتی ہے
 حقیقت میں شبنم نہیں
 بلکہ بے سوز و آغ کی
 بنا پر عرقِ مہرَم کے
 قطرے ہیں۔ گویا وہ
 اپنی دردناک آشنائی پر
 مہرِ ماری کا اظہار کر رہا ہے۔

۲۔ شرح : ایک طرف میرا دل ہے ، جو حسرت و دیدار کی کھینچ تان
 میں سراپا خون ہو گیا۔ دوسری طرف وہ محبوب ہے ، جس نے مہندی لگا کر آئینہ
 ہاتھ میں لے لیا اور بدستیاں کرنے لگا۔ یعنی میں تو اپنی آرزوؤں کا خون کیے بیٹھا
 ہوں ، وہ مہندی لگا کر آئینہ ہاتھ میں لیے عشوہ و انداز دکھا رہا ہے۔
 اب اس شعر کی بنا سبوتوں پر غزل فرمایا ہے ، اول ، آئینہ ، خون شدہ ، بدست ،
 کشمکش حسرت و دیدار ، آئینہ بدست ۔

۳۔ لغات ۔ شعلہ : یہاں اس سے مراد ہے ، سوزِ عشق ۔
 ہوس شعلہ : تھائے سوز ۔

شرح : تھائے سوز نے جو کام انجام دیا ، وہ غالباً سوزِ عشق بھی
 انجام دے سکتا۔ مجھے برابر ہی آرزو رہی کہ جل مروں ، لیکن دل کی اندر دگی
 اس حد پر پہنچی ہوئی تھی کہ میری آرزو کا ساتھ نہ دے سکی۔ اس حالت کی ناگواری
 نے مجھے اتنا غصہ دلایا کہ اس پر جلتا رہا اور یہ جلن یہاں تک پہنچ گئی کہ خود بھی
 غم ہو گیا ۔

۴۔ **شرح :** تیری تصویر میں وہ شوخی ہے کہ جب تُو نے اس پر شیشہ لگانا چاہا تو اس شیشے نے انتہائی ذوق و شوق سے پھول کی طرح آغوش کھول دی کہ آ جا۔

اگر مثال سے عکس مراد لیں اور آئینے سے آئینہ دیدنی تو معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہا جانے لگا کہ تیرے عکس کے لیے آئینہ پھول کی طرح برصِ ذوق آغوش کھول دیتا ہے۔

۵۔ **شرح :** خواجہ حالی فرماتے ہیں ،
 میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھتے تھے۔ فرمایا اے
 کی جگہ جز پڑھا، معنی خود بخود سمجھ میں آ جائیں گے۔ شعر کا مطلب
 یہ ہے کہ قریٰ جو ایک کتب خانہ کستر سے زیادہ اور میل جو ایک قفسِ مخزن
 سے زیادہ نہیں، ان کے جگہ سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف
 ان کے چمکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔

”یہاں جن معنی میں مرزا نے ”اے“ کا لفظ استعمال کیا ہے ”ظاہر
 ہے، یہ انھیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ
 اگر وہ ”اے“ کی جگہ ”جو“ رکھ دیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے:
 اے نالہ انشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے

اس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر مرزا معمولی اسلوبوں سے متا
 بہ مقتدر بچتے تھے اور شارح عام پر نہیں چلتا چاہتے رہتے۔“

علامہ اقبال نے بھی غلبہِ مشنری میں مرزا غالب سے طلاعات کی تھی اور
 دوسرے امور کے علاوہ اس شعر کے معنی بھی مرزا سے پوچھے تھے کہا حقیقت
 میں یہ حضرت علامہ اقبال کی تشریح ہے، جسے غالب کی زبان سے پیش کیا گیا
 یہاں اقبال کے شعروں کا ترجمہ دیا جا رہا ہے، جسے اصل دیکھنا ہو وہ ”جاوید نامہ“
 صفحہ ۱۴۵ دیکھ لیں)

”جو تالہ سوزِ جگر سے اٹھتا ہے، میں نے اس کی تاثیر ہر جگہ جدا جدا دیکھی۔ مرنے والی اس نالے کے اثر سے جل کر خاکستر بن گئی۔ بلبل نے اس سے رنگ جمع کر لیے۔ اس کے امدادِ زندگی کی آغوش میں ایک موت ہے۔ یہاں ایک نفسِ زندگی ہے اور وہاں موت۔ ایسا رنگ کہ ہر زندگی (رنگوں کی گونا گونی) اسی سے ہے۔ ایسا رنگ کہ بے رنگی اسی سے ہے۔ تو نہیں جانتا۔ یہ رنگ وہ بول کا مقام ہے اور ہر دل کو اس کی ہڈیوں کے مطابق حصہ ملتا ہے۔ یا تو رنگ اختیار کر لے یا بے رنگی کو مسلک بنا لے تاکہ تو سوزِ جگر سے ایک نشان پائے۔“

۶۔ **مشرح :** اے محبوب! تیری عادت نے دل کا سارا جوش و خروش اندر دھکڑالا۔ تو حسین ہے، محبوب ہے، لیکن کتنے تعجب کا مقام ہے کہ طبیعتِ محدودہ ٹھنڈی پائی ہے۔ نہ ناز، نہ انداز، نہ خیرہ، نہ عشوہ، نہ چھیڑ چھاڑ، نہ جورو ستم، نہ طعنِ محبت کا ہر معاملہ ختم کر دیا۔ اب تو ہی بنا کلاسِ عادت میں میرا جوش و خروش کیونکر باقی رہ سکتا تھا؟ آرزوؤں کے سب چراغ گل ہو گئے۔ محبت کے عام دلوے ٹھنڈے پڑ گئے۔ میرے لیے کتنی بڑی مصیبت ہے۔

۷۔ **لغات :** دستِ ترِ رنگ آمدہ : بھاری پتھر کے چٹخے آیا ہوا اٹھ۔

مشرح : ہم محبت کے پھندے میں گرفتار ہیں اور مجبوری سے وفا کا بیان نہاتے چلے جا رہے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارا اٹھ ایک بھاری پتھر کے چٹخے آ گیا ہے۔ کہیں نہیں تو نجات نہیں پا سکتے پتھر کو اٹھانا چاہیں تو اٹھا نہیں سکتے۔ ہر حال اس بیان کو آخر تک پہنچائیں گے۔

۸۔ **مشرح :** محبوب کی تیغِ ستم ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں ماضی کی

تصویریں نظر آتی ہیں۔ گویا اس کی حیثیت سینما کے پردے کی ہے، چنانچہ پہلے شہیدوں پر جو کچھ گزری، وہ سب اس میں صاف نظر آرہی ہے۔

۹۔ **شرح :** اے زمانے کو روشن کرنے والے آفتاب کے جلوے! اور بھی توجہ فرما۔ ہم پر سائے کی طرح عجب وقت آپڑا ہے۔

لطف یہ کہ وقت سائے کی طرح آپڑا ہے اور غور شہید جہاناب کے جلوے سے لطف و رحم کے طلب گار ہیں، جس کے بغیر سلیہ دور نہیں ہو سکتا۔ مولانا طہطاہی فرماتے ہیں: "وقت بڑانے کا محاورہ جس محل پر مصنف نے صرف کیا ہے، اس کی خوبی بیان نہیں ہو سکتی۔"

۱۰۔ **لغات :** ناکر وہ گناہ : جو گناہ ابھی نہیں کیے۔
کردہ گناہ : جو گناہ کیے جا چکے۔

شرح : اس شعر کی مفصل شرح :

مجھ سے مرے گناہ کا حساب آئندہ نامک

میں ہو چکی ہے۔ مختصر یہ کہ اے خدا! اگر کیے ہوئے گناہوں کی سزا لازم ہے تو جو گناہ نہ ہو سکے اور حسرت دل میں رہ گئی، ان کا صلہ بھی تو ملنا چاہیے۔

مولانا طہطاہی فرماتے ہیں: "اس شعر کی داد کون دے سکتا ہے؟ میر تقی کو بھی حسرت ہوتی ہوگی کہ یہ معنون مرزا انوشہ کے لیے لکھا رہا۔"

۱۱۔ **شرح :** اے غائب! اگر خلق خدا نے تجھ سے شتہ موڑ لیا ہے اور اتنا تعلق توڑ لیا ہے کہ بیگناہ سی بن گئی ہے تو اس پر حوصلہ دار نہ اور بیدل ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ میری جان! اگر مخلوق میں سے کوئی تیرا نہیں بتا تو تیرا خدا تو سر پر موجود ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا ضرورت ہے؟
فارسی میں بھی ایک مقام پر فرمایا ہے:

جہانیاں نہ تو برگشتہ اندر غالب

ترا چہ باک خدا سے کہ داشتی داری

۱۔ شرح :

جنتی کو یہ منظور تھا کہ ایک نورانی شکل وجود میں آجائے۔

اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

کی ذات پاک، آپ

کے مبارک چہرے

اور مبارک قامت

سے ظہور کی قسمت

کھل گئی۔ اگر آپ

کا وجود مقدس ظہور

میں نہ آتا تو جنتی

جس نورانی شکل

کی آواز مند تھی،

وہ دنیا کے سامنے

در آتی۔

۲۔ شرح :

تیرے شہیدوں کے

پاس ایک کفن کے

سوا ہے کیا، جس

میں سے لہو نیک رنا

ہے۔ یہ ایں ہم

اس کفن میں ایسا

منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی !

قسمت کھل کرے قدور رخ سے ظہور کی

اک خوشچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر خور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا

گویا ابھی سنی نہیں آواز صُور کی

آمد بہار کی بے جو بلبل ہے نغمہ سنج

اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طہور کی

گواہ نہیں پرواں کے نکالے ہوئے تو ہیں

کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طہور کی

گہری سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی
محبت سے دیکھ رہی ہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: ”یہ شعر بھی ایسا کہا کہ کروڑوں میں ایک آدمہ
ایسا نکلتا ہے۔“

۳۔ شرح: اسے واعظ! تصاریف شراب طہر کی کیا بات ہے! نہ
اسے خود پی سکتے ہو، نہ کسی کو پلا سکتے ہو۔ ہماری شراب میں یہ خرابی تو ہے نا
کہ خود بھی پیتے ہیں اور دوسروں کو بھی پلا سکتے ہیں۔

”کیا بات ہے!“ عظمت و تمجید کے لیے آتا ہے، لیکن مرزا غالب نے
اسے ایسے طریقے پر استعمال کیا ہے، جس سے استہزاء بالکل واضح ہے۔۔۔
مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: ”ایک شخص سے خطاب کر کے فوراً مجمع کی
طرف منتقل ہو جانا نئی صورت انتقادات کی ہے اور نہایت لطف دیتا ہے۔“

۴۔ لغات۔ صورت: زنگ، جو قیامت کے دن پھونکا جائے گا
اداس سے مروے جی اٹھیں گے۔

شرح: میرا محبوب حشر میں مجھ سے لڑ رہا ہے کہ تو کیوں جی اٹھا ہلہم
ہوتا ہے کہ بے نیازی، بے پردائی اور تغافل کے باعث صوبہ اسرائیل کی
آواز اس کے کان تک پہنچی ہی نہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے کشتے کو مرنے
اس کی آواز پر اٹھنا چاہیے۔

۵۔ لغات۔ طیشور: طائر کی جمع، پرندے، یہاں مراد ہے بلبل۔

شرح: بلبلوں نے نئے نئے گانے شروع کر دیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے
کہ بہار آمدی ہے، ابھی آئی نہیں۔ ہم بھی کوئی یقینی اطلاع نہیں دے سکتے!
البتہ پرندوں جی بلبلوں کی زبانی ایک اڑتی سی خبر سن کر پیش کر دی۔:

مولانا طہطاہائی کے نزدیک تشبیہ نہایت عجیب ہے اور انصاف یہ ہے کہ نئی ہے۔

۶۔ پہلے مصرع میں دونوں جگہ "داں" سے مراد کعبہ ہے۔

شرح : اگرچہ ثبوت اب کعبے میں نہیں، لیکن اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کبھی وہاں تھے اور نکالے گئے۔ گویا انھیں کعبے سے ایک نسبت منور پیدا ہو گئی، اگرچہ وہ دُور کی ہے۔

معلوم ہے کہ قریش نے دین حق سے گمراہی اختیار کی تو رفتہ رفتہ بت پرستی شروع کر دی تھی، بلکہ بت سے بت کعبے کے اندر لے گئے، جن کی تعداد فتح مکہ کے وقت تین سو ساٹھ تک پہنچی ہوئی تھی۔ مرزا غالب نے کعبے سے جنوں کی نسبت کے متعلق جو استدلال کیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ منطقی نہیں، شاعرانہ ہے اور اسے منطق کی ترادد میں نہ تو ناپا ہے، البتہ شاعرانہ نقطہ نگاہ سے جو نسبت پیدا کی، وہ ہر شخص کے دل کو پسند آتی ہے۔

۷۔ شرح : بلاشبہ حضرت موسیٰ نے رب ارنی (اے پروردگار تو مجھے اپنا جمال دکھا) کہا، جواب ملا، لمن ترانی (تو مجھے قطعاً نہ دیکھ سکے گا) مرزا فرحت پتے ہیں، کیا یہ لازم ہے کہ سب کو ایک سا جواب ملے۔ اگر حضرت موسیٰ کو جلوہ نہ دکھایا گیا تو منور ہی نہیں کہ ہمیں بھی جواب صاف ملے۔ احتیاج کم از کم تجربہ تو کر لینا چاہیے۔ آئیے افرا کو ہر طور کی سیر کر آئیں اور دیکھیں کہ واقعی وہی جواب ملتا ہے۔

شعر میں خوبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ جلوے کی طلب تو ہے اور یہ بھی کہ حضرت موسیٰ کو جواب صاف مل جائے کہ باوجود پچھلے بیٹھنے کے لیے تیار نہیں۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر خدا انھیں خواستہ جواب ملا تو کم از کم بکود طور کی سیر تو ہو جائیگی اس جگہ گاہ کو تو دیکھ آئیں گے، جہاں ایک مرتبہ حضرت موسیٰ کے لیے ہمارے محبوب نے ایک جھلک کا تماشا دکھایا تھا۔

۸۔ **مشرح :** میرا محبوب نہایت تلخ کلام اور تیز مزاج ہے۔ وہ گالی طعن، ہنسی مذاق اور کھٹکتہ چینی کے بغیر بات نہیں کرتا۔ بیشک کلام میں کچھ نہ کچھ تیزی آ ہی جاتی ہے، مگر ایسی بھی کیا تیزی کہ جس شخص سے بات کی اسے شکایت ضرور کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ پھتیاں سن کر کون شکایت نہ کرے گا؟

۹۔ **مشرح :** اسے غالب! اگر بادشاہ جج کے سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ جج کا ثواب حضور ہی کی نذر کروں گا۔

خواجہ جاتی مڑاتے ہیں۔ یہ غزال اس زمانے میں کمی گئی تھی، جب بہادر شاہ مرحوم نے جج کے لیے جانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن تعجب ہے کہ خواجہ مرحوم جیسے بالغ نظر اور حقیقت منہ انسان نے مڑایا۔ ”اُدھر سفر جج کا وہ اشتیاق اور ادھر جج کے ثواب کی بے قدری۔“

حالانکہ میرزا نے صرف انتہائی اشتیاق جج کا اظہار کیا ہے۔ جو شخص جج کرے گا، وہ ادائے فرماں کا ثواب بہر حال پائے گا، لیکن جس شخص کی وجہ سے اسے یہ سعادت نصیب ہوگی، وہ اپنی جگہ ثواب کا حقدار ہوگا۔ کیونکہ اس نے ایک نیک کام میں امداد کی۔ میرزا شاعرانہ طریق پر صرف یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ انہیں ان پاک مقامات کے دیکھنے کی کتنی آرزو ہے، جنہیں ہم حرمِ شریفین کہتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے دل اور روح میں جو بالیدگی پیدا ہوگی، اس کی خاطر وہ جج کا ثواب بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔ مطلب یہ نہیں کہ ان کے چھوڑنے سے ثواب واقعی چھین جائے گا، مطلب صرف یہ ہے کہ اس مقام سے سفر کا جو اصل ثواب ہے، وہ بھی کوئی بے لے، لیکن ان کی زیارت کرادے، اسلام کے اس بنیادی فریضے کو ادا کرنے کا موقع ہم پہنچا دے۔ حرمین شریفین کی زیارت کا انتہائی اشتیاق معاذ اللہ ثواب جج کی نذر کی کاموجب نہیں بن سکتا۔ یہ شاعری ہے۔ اس میں منطق سے کام نہ لینا چاہیے، بہر استدلال کو یوں شاعری ہی کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
 یہ رنج کہ کم ہے مئے گلغام، بہت ہے
 کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
 ہے یوں کہ مجھے دُروہ تہ جام بہت ہے
 نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاور کیں یں
 گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
 کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گر چہ ریا فی
 پاداشِ عمل کی طبعِ عام بہت ہے
 ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
 پابنگی رسم و رو عام بہت ہے
 زمزم ہی پر چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے؟
 آلودہ برے جامعہ احرام بہت ہے
 ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
 انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے
 خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکانیں، اے مرگ
 رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

۱۔ لغات:

بودا:

کمزور و ضعیف

کم بہت۔

شرح:

میرا دل غم

کھانے میں بہت

کمزور ہے۔

شراب کے

ذریعے سے

اس کمزوری

کی تلافی ایک

حد تک ہو

سکتی ہے،

لیکن مصیبت

یہ اُڑی ہے

کہ شراب بھی

کم ہے۔ گویا

غم کھانے کے

یہ جو نتائج

مزدوری یعنی

وہ بھی بے قدر

غلب تیر نہیں۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے دوسرے مصرع میں تعقید ہے ،
 شاعر تو وہ اچھا ہے پر بد نام بہت ہے ۔
 ”رخی“ کا تعلق ،

”بہت“ سے ہے ۔ درمیان ”کہ کم ہے مے گلہام“ خامسا باب جلد معترضہ آ
 پڑا ہے ، لیکن مطلع تھا ، دونوں مصرعوں میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ناگزیر
 تھی اور ”بہت“ ہے ”کا ثبوت الگ الگ دو کار تھا ، اس لیے مجبوراً یہ طریقہ کرنا
 پڑا ۔

۲۔ لغات - دُرُود : تمبھٹ

شرح : ساقی سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے ، ورنہ حق یہ ہے کہ
 مجھے شراب کی ضرورت نہیں ، وہی تمبھٹ کافی ہے ، جو جام شراب کی تڑپ میں
 فراہم ہو جاتی ہے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شرم کیوں آتی ہے ؟ اس کے مختلف وجوہ ہیں
 میں آتے ہیں :

۱۔ ساقی مجھے گا کہ یہ تو پڑا ہی کم ہمت اور بے حوصلہ شراب نوش ہے
 جو صرف تمبھٹ پر گزارہ کر لینا کافی سمجھتا ہے ۔

۲۔ اسے خیال ہوگا کہ یہ کوئی حقیر اور ذلیل شخص ہے ، جسے کسی اچھی مجلس
 میں بیٹھنے اور پینے کا موقع بھی نہیں ملا ۔

۳۔ وہ مجھے گا کہ یہ تنگ ظرف شراب نوش ہے ۔

۴۔ قناعت ، جو سیرجشی و بامہتی کی علامت ہے ، موقع و محل کے اعتبار
 سے تحقیر کا باعث بن جائے گی ۔ حوز کیا جائے تو صورت حال کے لحاظ سے اور
 بھی وجہیں پیدا ہو سکتی ہیں ۔

۵۔ مَشرَح : جب تک میں آشیانے میں تھا ، ہر لحظہ اندیشہ لگا رہتا
 تھا کہ صیاد کہیں نہ کہیں کان میں تیر جوڑے گھات میں چھپا بیٹھا ہوگا ۔ اب گرفتار ،

ہو کر مجھے پھرے میں بند کر دیا گیا تو کم از کم تیرکان یا صیاد کی کیس نشینی کا تو کوئی کھشکا باقی نہ رہا۔ اس سے تو نجات مل گئی اور آرام کی زندگی بسر ہونے لگی۔

مرزا غالب نے اس شعر میں زندگی کے دونوں رخ پیش کیے ہیں، ایک آزادی کی زندگی کا رخ، دوسرا قید و محکوم کی زندگی کا رخ۔ آزادی کی زندگی میں یقیناً مصیبتیں بھی ہیں، تاہم ان کے باوجود انسانی فطرت یہ ہے کہ سب عموماً اسی زندگی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا ہی ہے، جو خطرات کی دہشت برداشت نہیں کر سکتا اور یہی چاہتا ہے کہ سب غلشوں سے محفوظ ہو کر کسی گوشے میں پناہ میں بیٹھا رہے، لیکن اس سے زندگی کے عام عزائم پر جو تباہی خیز اثر پڑتا ہے، اس کا اندازہ پیش کرنا مشکل ہے۔ مرزا نے یہاں صرف رخ پیش کر دینے پر قناعت کر لی، کسی ایک رخ کی دعوت نہیں دی اور مرزوی نہیں کہ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی دعوت دی جائے۔

۴۔ لغات۔ زہد : عبادت اور پرہیزگاری۔

ریائی : جس میں ریا اور نمائش شامل ہو۔

پاداشِ عمل : عمل کا بدلہ

ظلمِ خام : ایسی حرص جس کا پورا ہونا ممکن نہ ہو، تازیبا حرص،

فضولِ حرص۔

شرح : میں خدا پرستی اور عبادت گزاری کا۔ کیونکہ فاضل ہو سکتا ہو،

مانا کہ وہ ریا و نمائش کے داغ سے پاک ہے، لیکن اس میں کیا شبہ ہے ہر زاہد اور پرہیزگار کے دل میں یہ چیز بیٹھی ہے کہ نیکی کے جو کام وہ کر رہا ہے، ان کا بدلہ لے گا اور یہ ایسی حرص ہے، جو خلص عبادت گزار کے لیے زیبا نہیں۔

عبادت اس لیے کرنی چاہیے کہ بندے کے لیے پروردگار کی بندگی ہی زیبا ہے اس کا بدلہ لینے کی آرزو ایسے بندے کو بالکل فضول معلوم ہوگی، جو صرف اپنی

بندگی کا حق ادا کر رہا ہو۔

۵۔ لغات۔ اہل خرد و عقل و دانش والے لوگ۔

پابستگی : پابندی۔

شرح : جن لوگوں کو عقل و دانش کا دعویٰ ہے، آخر وہ کس خاص دوش پر نازاں ہیں؟ کون سا خاص مسک ہے، جسے وہ بطور امتیاز اپنا مسک قرار دے سکتے ہیں۔ جس طرف نگاہ ڈالیں، سب عام راہ و رسم ہی کی پابندی میں مصروف نظر آتے ہیں۔

مرزا یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اہل عقل و دانش کے لیے عقلی کا ثبوت کیا ہے؟ کیا انہوں نے عام لوگوں سے الگ ہو کر کوئی طریق اختیار کیا؟ آیا انہوں نے عام راہ و رسم کی پابندی چھوڑی؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو وہ فخر کس بات پر کر سکتے ہیں؟ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی باتوں سے پرہیز کیا جائے جو نامعقول ہیں۔ حوام سیکڑوں ایسی باتیں اختیار کیے بیٹھے ہیں۔ اگر ان سے گریز نہیں، بے تعلقی نہیں تو صاحب عقل و دانش ہونا عملاً بیکار ہے۔

۶۔ شرح : بجزوری مرحوم فرماتے ہیں :

”یہ سرمستی اور مدہوشی کم باگی نہیں، بلکہ خفاۃ جاوید میں داخل ہو کر شراب بے اندازہ پی گئے۔ یہ کیفیت سروری ہے۔ عشق الہی کے نشے میں عرق ہیں۔ کون ایسا ہے، جو اس کیفیت میں سرشار ہو کر پوشمند رہ سکتا ہے؟“

مجھے چاؤ زمزم ہی پر چھوڑ دو۔ میں حرم پاک کے گرد طواف کرنے کے قابل نہیں، کیونکہ میں نے احرام کا جو لباس پہن رکھا ہے، وہ شراب سے بہت آلودہ ہو چکا ہے۔

ہاں زمزم پر رہنے اور حرم کے طواف سے احتراز کرنے کا مقصد خود واضح کر دیا، یعنی جائز احرام کا ناپاک ہونا۔ زمزم پر رہیں گے تو اس کے مقدس

پانی سے احرام کو پاک کرنے کی کوشش کریں گے اور جب تک لباسِ احرام پاک نہ ہو جائے، کعبے کی عظمت کا اتنا احساس ہے کہ اس کا طواف بھی اپنے لیے مناسب نہیں سمجھتے۔

۷۔ لغات - ابرام : امرامہ تفاعنا۔

شرح : محبوب کو وصل سے انکار نہیں اور میں اس کے لیے حد درجہ تقاضے کر رہا ہوں۔ غضب اور ظلم ہے کہ اب بھی بات نہ بنے اور میری مراد پوری نہ ہو۔

شعر میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ جب عاشق کو وصل پر امرامہ ہو اور محبوب کو اس سے انکار نہ ہو تو اس کی صورت نہ بنتا سراسر ناقابلِ تصور ہے۔

۸۔ شرح : اے موت ! ابھی تک تو میرا کلیا لہو ہو کر آنکھ سے

نہیں ٹپکا، لہذا میرے ذقے بہت کام باقی ہے اور بہتر یہی ہے کہ مجھے چپکے اور بیاں رہنے دے تاکہ یہ کام پورا کر لوں۔

شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب ہم پرچے درپے نئی مصیبتیں نازل ہو رہی ہوں، طلب کے باوجود ٹو نہ آئی۔ اب جگر خون ہو رہا ہے اور خون ہو کر آنکھ سے نہیں ٹپکا۔ جب تک یہ کام پورا نہ ہو جائے، میرے عشق کی تکمیل کیونکر ہوگی؟ اب ذرا اور صبر دے دے کہ اسے تو پورا کر لوں۔

۹۔ شرح : ایسا کون ہوگا، جو غالب کو نہیں جانتا۔ وہ دنیا بھر

میں مشہور ہے۔ انصاف یہ ہے کہ شاعر بھی بہت اچھا ہے، البتہ بدنام نہ زیادہ ہو گیا ہے۔

۱۔ شرح

محبوب کو ہمارے

بنائے ہوئے

مدت ہو گئی۔

جب وہ پہلی

مرتبہ آیا تھا

اور میرے ہاں

بٹھرا تھا تو

شراب کے

پایوں میں اتنا

جوش پیدا ہو

گیا تھا کہ پوری

بزم نے چراغاں

کی حیثیت

اختیار کر لی

تھی۔

پایوں میں شراب

بذات خود تیز

تھی۔ محبوب

کی آہ سے مجلس

کی گرمی بڑھ

گئی اور شراب

شراب آتشیں

مدت ہوئی ہے یار کو ہمارے کیسے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیسے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگہِ لخت لخت کو
عرصہ ٹہرا ہے دعوتِ مرثاں کیسے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیسے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شررِ بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیسے ہوئے
پھر پریشِ جراحِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکِ داں کیسے ہوئے
پھر بھر رہا ہے خامۂ مرثاں بہ خونِ دل
سازِ چمنِ طرازیِ داماں کیسے ہوئے
باہمِ دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارۂ خیال کا سامان کیسے ہوئے
دلِ پھر طوافِ کوٹے ملامت کو جاتے ہے
پندار کا صنم کدہِ ویراں کیسے ہوئے

ہی گئی۔ اسے
مرزا غالب
آتشِ سیال
کہتے تھے ،
یعنی بے طور و مبالغہ
بستی ہوئی آگ
ظاہر ہے کہ
ایسی حالت
میں شراب
بھرے پیالوں
کو چراغاں
سے تشبیہ دینا
میں مناسب
حال ہے ۔
۲۔ شرح
میں نے پہلی
مرتبہ محبوب
کی دعوت کی
تھی تو اس
کی پلکوں کے
یے جگر کو
پارہ پارہ کر
ڈالا تھا ۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گستاں نگاہ کا سماں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامہٴ دلدار کھو لنا
جاں نذرِ دلِ فریبیٰ عنوان کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہنس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرے سے تیز دشنہٴ مرثاں کیے ہوئے
اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہٴ مزو بخائے سے گستاں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سرزیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصویرِ جاتاں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے اب پیران
 بیٹھے ہیں خیمِ تہیہ طوفاں کیسے ہوئے کبھریں
 جگہ سے اٹھا اٹھا کر جمع کر رہا ہوں تاکہ نئی دھوت میں وہ پلکیں پیران
 کو چھیدیں اور اپنے لیے آرائش کا سامان ہم پہنچائیں۔

۳۔ شرح : پھر ضبط و احتیاط کے باعث میرا دم الجھنے لگا ہے۔
 ایسا کیوں نہ ہو؟ سا لہا سال گزر گئے، جب گریبانِ تار تار کیا تھا۔ پھر ایسی نوبت
 کبھی نہ آئی اور گریبانِ تار تار کیے بغیر ضبط و احتیاط کو کیونکر ختم کیا جاسکتا ہے؟
 جب تک یہ ختم نہ ہو، سانس کا رکن کیونکر زائل ہو سکتا ہے؟

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ ازل سے دیوانے چلے آتے ہیں۔ اہل عقل و
 دانش کی طرح ضبط و احتیاط کی زندگی ہمیں اس نہیں آسکتی۔ سہارا کام ہی یہ
 ہے کہ گریبان بچا ڈالا، لباس تار تار کیا اور جدھر جی چاہا، نکل گئے۔

اگر آپ نے تجربہ کیا ہے یا نہیں کیا تو اب کر لیجیے کہ جو خود پابندی کی
 زندگی کا عادی نہ ہو، اسے ایسی زندگی میں ڈال دیا جائے تو قدم قدم پر پریشان
 ہو گا۔ اس کے فطری جوہروں کی نمود و نمائش ہی ماند پڑ جائے گی۔ یہی حقیقت
 مرزا شعر میں بیان کر رہے ہیں۔

۴۔ لغات۔ نالہ لڑے شرر بار : شعلے برسانے والے نالے۔
 شرح : میرے سانس نے پھر انتہائی سرگرمی سے شعلے برسانے لگے
 نالے کھینچنے شروع کر دیے ہیں مجھے سیر چراغاں مطلوب تھی۔ دلت سے یہ سیر
 دیکھی نہیں تھی، سانس نے بڑی خوبی سے اس کا انتظام کر دیا۔

۵۔ شرح : عشقِ پیرِ زخمِ دل کا حال پوچھنے کے لیے چلا ہے اور
 اپنے ساتھ لاکھوں ٹکدوں کا سامان کر لیا ہے۔

مطلب یہ کہ یہ تمام ٹکدوں ان زخمِ دل پر اڑھلی دے گا تاکہ اس کی تڑپ

بڑھتے بڑھتے لاتا ہی ہو جائے۔

۶۔ **شرح :** میں پھر اپنی چکوں کا قلم دل کے سوسے ڈبو رہا ہوں۔

نقد یہ ہے کہ اپنے دامن پر بیل بوٹوں کے گلزار بناؤں اور یہی اس سامان کا اصل مطلب ہے۔

۷۔ **شرح :** میرے دل اور میری آنکھوں کے درمیان پھر کشمکش شروع ہو گئی ہے۔ آنکھیں چاہتی ہیں کہ محبوب کے دیدار کی لذت نصیب ہو۔ دل کی آرزو یہ ہے کہ اس کے خیال ہی میں لگن رہے، یعنی دونوں نے اپنی اپنی ضرورت اور طبیعت کے مطابق سامان تیار کر لیا ہے۔

۸۔ **لغات :** پسند اور خیال، غرور، تکبر

شرح : میرا دل پھر ملامت کے کوپے میں سیر و گردش کے لیے جا

رہا ہے اور غرور و تکبر کے جس جگہ سے گا وہ پھار ہی تھا، اسے دیران کر چکا ہے۔

مطلب یہ کہ میرے دل کو اپنے حال پر بڑا غرور و تکبر تھا اور وہ کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا، جو تازیبا سمجھا جائے، لیکن آخر وہ دور آگیا کہ اسے غرور و تکبر سے دست کش ہو کر طعن و ملامت کے کوچے میں جانا پڑا۔

۹۔ **شرح :** شوق یعنی عشق پھر کسی خریدار کی تلاش میں ہے۔ عقل،

دل اور جان کا سرمایہ پیش کر رہا ہے، جو چاہے خرید لے۔

ظاہر ہے کہ عقل، دل اور جان صرف محبوب خرید سکتا ہے اور مقصود یہی ہے کہ عشق پھر ہمیں اپنا سب کچھ نذر محبوب کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔

۱۰۔ گل و لالہ سے مراد حسین و جمیل لوگ ہیں۔

شرح : خیال پھر حسینوں کی طرف دوڑ رہا ہے اور نگاہ نے سیکڑوں

گلستاؤں کا سامان کر لیا ہے گویا جب تک نگاہ سیکڑوں ہاخوں کا سامان نہ کر لے، اس وقت تک حسینوں پر خیال دوڑانا مناسب ہی نہیں۔

۱۱۔ شرح : میں پھر محبوب کا خط کھولنا چاہتا ہوں ، ساتھ ہی آرزو ہے کہ جان نامے کی دلفریبی پر قربان کر دوں۔

۱۲۔ شرح : ہوس کو پھر یہ طلب ہے کہ کوئی حسین لب بام جلوہ گر ہو اور سیاہ زلفیں اس نے چہرے پر بکھیر رکھی ہوں۔

۱۳۔ شرح : پھر آرزو چاہتی ہے کہ سامنے کوئی نگار ہو جس نے پلکوں کے مخبر سرے سے تیز کر رکھے ہوں۔

۱۴۔ شرح : پھر نگاہ کسی ناز بار تاز کو ڈھونڈ رہی ہے ، جس نے چہرہ شراب کے نشے سے گلستان کی طرح سرخ و رنگین بنا رکھا ہو۔

۱۵۔ شرح : پھر دل میں یہ انگ ہے کہ کسی کے دروازے پر پڑے رہیں ، لیکن ظاہر ہے کہ دربان کے احسان کے چٹے سر دیے بغیر وہاں جگہ نہیں مل سکتی ، لہذا یہ احسان بھی قبول کر لیں۔

۱۶۔ شرح : جی پھر وہی مہممت چاہتا ہے کہ دن جو یارات ، محبوب کا تصور کیے بیٹھے رہیں۔

۱۷۔ شرح : اے غائب ! ہمیں نہ چھوڑ کہ آنسوؤں کے جوش کا یہ عالم ہے ، گویا ہم طوفانِ بپا کر دینے کی تیاری کیے بیٹھے ہیں۔

نویدِ امن ہے بے داد و دوست ہاں کے لیے
رہی نہ طر نہ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے گر مژدہ یار تشنہ خوٹوں ہے
رکھوں کچھ اپنی ہی مژگانِ خون فشاں کے لیے

۱۔ لغات :
نوید :
خوشخبری :
شرح :
محبوب کے
عظم و جو رہنے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر!
 نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے
 رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
 بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے
 فلک نہ دُور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
 دراز دوستی قاتل کے امتحاں کے لیے
 مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
 کئے قفس میں فراہم خس آشتیاں کے لیے
 گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
 اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
 بہ قدر شوق نہیں ظن تنگنائے عزل
 کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے
 دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
 بنا ہے عیش تنجمل حسینِ خاں کے لیے
 زباں پہ بارِ خدا یا! یہ کس کا نام آیا؟
 کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

جان کے لیے
 اس کی خوشخبری
 فتیا کر دی ،
 کیونکہ ستم انگیزی
 کے جتنے طور
 طریقے تھے ،
 وہ سب کے
 سب محبوب
 نے بہت لیے
 اور آسمان کے
 لیے کوئی طریقہ
 باقی نہ چھوڑا ۔
 مطلب یہ
 کہ ظلم کے جتنے
 طریقے ہو سکتے
 تھے ، وہ تو عمل
 میں آگئے ، اب
 آسمان کوئی نکتہ
 اٹھانا چاہے گا
 تو انہیں طور
 طریقوں میں سے
 کوئی ہوگا ، جن
 کے ہم محبوب

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
 بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستان کے لیے
 زمانہِ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
 بنیں گے اور سترے اب آسمان کے لیے
 کے ہاتھوں ماری ہو چکے ہیں۔ یوں
 اس کی خوشخبری متیا ہو گئی، گویا
 آسمان کوئی عظم ذکر کے گا۔

۲۔ شرح :
 اگر محبوب کی
 پکیں خون کی
 پیاسی ہیں تو ہوں
 آخر اپنی خون
 برسانے والی
 پلوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ رکھنا مزدی ہے، سب کچھ اسی کی نذر کیوں
 کر دوں؟
 ورقِ تمام ہوا اور مدحِ باقی ہے
 سفینہ چاہیے اس بحیرِ بیکراں کے لیے
 ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہِ سرا
 صلائے عام ہے یارانِ نکتہِ واں کے لیے

۳۔ شرح : عام روایت کے مطابق حضرت خضرؑ زندہ ہیں، یہی
 خاص خوش نصیبوں کے سوا کسی کو نظر نہیں آتے۔ مرزا غالب نے اس سے
 یہ پہلو پیدا کر لیا کہ زندگی سے مراد ہے خلقِ خدا سے روشناسی، میلِ جہلِ اخلا
 طہ۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو زندگی کس کام کی؟ اصل میں دنیوی زندگی کی تعبیر
 ہے ہی ہی، اس کے سوا کوئی نہیں۔

فرمانے ہیں کہ اے خضرؑ! اصل زندگی تو ہماری ہے کہ دنیا ہمیں دیکھتی
 ہے اور ہم دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ہم لوگوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں، لوگ ہماری مدد کرتے
 ہیں۔ تمہاری کیا زندگی ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے لوگوں کی نگاہوں سے
 چھپ گئے، گویا چور بن گئے، جو کبھی ظاہر نہیں ہوتا، دو پوش ہی رہتا ہے اور

وہ بھی اس غرض سے کہ ہمیشہ زندہ رہو۔

۴۔ شرح : مجھ پر بلائیں نازل ہوتی رہیں۔ اس حال میں بھی رشک کے عذاب سے میرا چشکارا نہ ہوگا۔ سبب یہ تھا کہ تیری ادا سارے جہان کے لیے بلائے جان ہے، حالانکہ اسے صرف میرے لیے بلائے جان ہونا چاہیے تھا۔

رشک کا معنوی میرزا غالب نے اس کثرت سے باندھا ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں اتنی مزادانی ساقت ہی اتنی بوقلمونی مل سکے، مثلاً اسی سے لیتا بیت مرزا کا نہایت مشہور شعر ہے :

قہر جو یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

۵۔ شرح : اے آسمان! مجھے قاتل سے دُور نہ رکھ۔ کیا اس کی دراز دستی کے امتحان کے لیے صرف میں ہی رہ گیا ہوں؟ مطلب یہ ہے کہ مجھے قتل ہونے اور جان دے دینے میں ایک لمحے کے لیے بھی تاکن نہیں لیکن ایسا کیوں ہو کہ میں محبوب کے فراق میں دُور بیٹھا ہوا گھل گھل کر جان دوں؟ یہ کیوں نہ ہو کہ میں اس کے پاس پہنچ جاؤں اور وہ مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالے؟ فراق کی حالت میں دُور بیٹھ کر موت کا انتظار کرنا اور غم میں گھل گھل کر مرنا غالب کے نزدیک دراز دستی کا امتحان ہے۔ یعنی مقصود یہ ہے کہ محبوب مختلف ذریعوں اور وسیلوں سے کہاں کہاں پہنچ کر چلتے عاشقوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا موجب بنتا ہے۔

۶۔ شرح : میری کوشش کی حقیقت سمجھنا چاہو تو یہ مثال سامنے رکھ لو کہ ایک پرندہ بجزے میں بند ہے اور وہ آشیانے کے لیے تنگے جمع کر رہا ہے۔

یہ صرف مثال ہے، یہ مراد نہیں کہ قفس میں کوئی پرندہ بند ہو تو وہاں سے

تنگے جمع کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ابھی رفاہی کی کوئی صورت نہیں۔ گرفتاری کی مصیبت نے پھینچا نہیں چھوڑا اور پھرے میں بیٹھے بیٹھے گھونسلے کے لیے تنگے یوں جمع کرنے لگا۔ گویا سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ مثال سے ظاہر ہے کہ اصل کوشش بے سود اور بے نتیجہ بھی ہے اور ہر دیکھنے والے کے دل میں اتھائی دم بھی پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ تشریح : خواجہ جاتی نے اس شعر پر ”یادگار غالب“ میں بھی بحث کی ہے اور ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں بھی۔ دونوں جگہ اس کی خوبوں کے جدا گانہ پہلو پیش کیے ہیں۔ ”مقدمہ“ میں فرماتے ہیں : ”مضمون یہ ہے :

”میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا۔ اول خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سانس بچھ کر کچھ نہ کہا۔ جب محبوب کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے۔“

فرماتے ہیں کہ اتنے بڑے مضمون کو مرزا نے صرف دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔

”یادگار غالب“ میں لکھتے ہیں : اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزاد جو مرزا کی طلب کو نام رکھتے تھے، وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر پر دانا تھے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے، اس میں دو باتوں کی تشریح کرنی ضروری تھی، ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا، دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے کیا چاہتا تھا، سو یہ دونوں باتیں بہ صراحت بیان نہیں کی گئیں، صرف کہنا نے میں ادا کی گئی ہیں، مگر صراحت سے زیادہ و موعود کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی

ہیں۔ پہلی بات پر لفظ ”شامت“ اور دوسری پر ”قدم لینا“ صاف دلائل کرتا ہے۔ اس کے سوا دوسرے کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دوسروں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں بنیادیت قرین کے قابل ہیں۔

خواجہ جاتی شعر کے تمام پہلو واضح کر چکے ہیں، تاہم نفس مطلب کی پوری توضیح کے لیے پھر ایک مرتبہ شعر کو موزوں نثر میں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مرزا محبوب کے درد اذے پر پہنچے۔ وضع قطع سے بالکل فقیر اور درویش معلوم ہوتے تھے۔ درد اذے کے پاسان نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ کوئی فقیر ہے، جو مانگنے کے لیے آگیا ہے اور فقیر آتے ہی رہتے ہیں۔ چند لمحے ٹھہرے گا اور رخصت ہو جائے گا۔ اس سے کچھ نہ کہا اور بالکل مزاحم نہ ہوا۔ مرزا اپنے ذہن میں سمجھے کہ پہلا مرحلہ تو یہ خیر و خوبی طے ہو گیا۔

پاسان ہر مان معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس کی منت سماجت کر کے بار بار کی کوشش کروں؟ چنانچہ کھڑے کھڑے آگے بڑھے اور جتنا بان پاسان کے پاؤں پر گر پڑے۔ اب اسے ہوش آیا اور سمجھا کہ بھیک مانگنے کا یہ تو کوئی طریقہ نہیں۔ یقیناً یہ بھکاری نہیں، بلکہ دوسری عزمن سے آیا ہے اور اسے معلوم تھا کہ اس عزمن سے اکثر لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے وہی سلوک کیا، جو ایسے تمام لوگوں سے کرتا رہا تھا۔ یعنی گردن میں لٹکا دیا اور پلٹ پیٹھ پر سید کیے، دو چار جوتے لگائے اور دھکیٹا ہوا دودھ لے گیا۔

کمال یہ ہے کہ اس لمبی داستان کو صرف چند الفاظ میں کہنا یہ ایسے طریق پر پیش کر دیا ہے کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ پورے شعر کا معنی صرف چار پانچ لفظوں پر مبنی ہے یعنی ”گدا“ ”چپ“ ”شامت“ ”پاسان“ اور ”قدم لینا“۔

مولانا غالب کی تک کو اعتراض کرنا پڑا: اس شعر نے ایسی بندش پائی

ہے کہ جواب نہیں۔

۸۔ لغات۔ تنگنا نے : تنگ جگہ : تنگ کوہ۔

شرح ۱ میں جو معنائیں اس زمین میں لانا چاہتا ہوں، انہیں اپنے شوق اور خواہش کے مطابق غزل میں نہیں لاسکتا۔ مطاب کا تقاضا یہ ہے کہ میرے بیان میں کسی قدر وسعت پیدا ہو جائے۔

۹۔ لغات۔ تھجمل حسین خاں : فرخ آباد کے نگلش خانہ ان کا

مشہور امیر، جس نے ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ (۹۔ ستمبر) کو وفات پائی۔

تفسیر التذکرۃ، معین الملک، ظفر جنگ اس کے خطابات تھے، جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ اور نوابوں سے علاقہ حکومت انگریزی نے واپس لے لیا تھا اور ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے سالانہ نقد مقرر کر دیا، لیکن نوابوں کا شاٹھ ایسا تھا کہ بڑے بڑے دایان ریاست ان کے مقابلے میں کمتر نظر آتے تھے، تھجمل حسین خاں کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا تھفعل حسین خاں نواب بنا۔ ۱۲۸۱ھ کے ہنگامے میں اس نے انگریزوں کی جانیں بچانے کے لیے کوئی دقیقہ سہی اٹھانہ رکھا، لیکن دوسرے لوگوں کا غلبہ اس قدر بڑھا کہ تھفعل حسین خاں خود بھی ملحدہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ ہنگامے کے خاتمے پر اس کے لیے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی پھر یہ قرار پایا کہ حکم چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ تھفعل حسین خاں نے کٹر کڑتر میں قیام کا فیصلہ کیا، چنانچہ اسے وہیں بھیج دیا گیا۔ کچھ مدت تنگی میں گذری، پھر ذاب شاہجہان بیگم دایہ بھوپال نے اس کے لیے معقول رقم کا انتظام کر دیا جو رباط بھوپال کی رقم کے ساتھ سال بہ سال نواب کو مل جاتی تھی۔ وہیں ۱۲۸۱ھ میں تھفعل حسین خاں نے وفات پائی۔

شرح : عیش و تھجمل کا ساز و سامان خلق کو اس لیے دیا گیا ہے کہ

تھجمل حسین خاں کو نظر نہ لگے، ورنہ حقیقت میں یہ ساز و سامان صرف تھجمل حسین خاں کے لیے ہے۔

جب کسی کے پاس کوئی ایسی چیز ہو، جس سے دوسرے محروم ہوں تو اندیشہ رہتا ہے کہ اسے کسی کی نظر لگ جائے گی۔ مثلاً خوب صورت بچوں کو نظر سے محفوظ رکھنے کے لیے سیاہ رنگ کا کوئی منکا گلے میں ڈال دیتے ہیں، جسے نظر بچو کہا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ دوسروں کو عیش کا بوسا مان دیا گیا ہے، اس کی غرض صرف یہ ہے کہ تجمل حسین نظر بد کا شکار نہ ہو جائے۔

۱۰۔ لغات - باری خدا یا : خدا سے بزرگوار
نطق : گویائی۔

شرح : اسے خدا سے بزرگوار / زبان پر کس کا نام آیا کہ میری گویائی کے میری زبان کو چوم چوم کیا۔

مرزا غالب نے فارسی میں بھی دوسرے مصرع کا معنون باندھا ہے :

تا نام نئے و ساقی کوثر ہر زبان رفت

صدرہ ہیم از مہر جو سید زبان را

آسی نے لکھا ہے کہ زبان چومنے کا معنون سب سے پہلے غنائی نے باندھا تھا۔ اگر حقیقت یہی ہے تو کوئی معنائی نہیں۔ ایسے ایک معنون کے سلسلے میں تو اردو تسلیم کر لینا زیادہ اچھا ہے۔

۱۱۔ شرح : جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، نصیر الدوار معین الملک

تجمل حسین خاں کے خطاب کی اجزاء بنے، ان کے استعمال کا عام طریقہ یہ تھا، نصیر الدوار والدین اور معین الملک والدت والک۔ اسی کو مرزا غالب نے پہلے مصرع میں لے لیا۔ یعنی تجمل حسین خاں، جو دین اور ملک کا باور اور ملت و ملک کا مدگار ہے، بلند آسمان اسی کے آستان کے لیے بنا ہے۔

۱۲۔ شرح : زمانہ اس کے عہد میں ذہنیت و آرائش کے درپے ہے۔

ذہن کی سجادت اور کمال پر پہنچ رہی ہے۔ یقین ہے کہ آسمان کے تارے بھی

توڑ کر اسی آرائش میں صرف ہوں گے اور آسمان کے لیے اور ستاروں کی ضرورت پیش آئے گی۔

بعض شارمین نے فرمایا ہے کہ تجمل حسین خاں کے عہد میں آسمان وزمین کی آرائش ہو رہی ہے۔ چونکہ آسمان کی آرائش ابھی نہیں ہوئی، اس لیے پہلے ستاروں میں اور ستارے بڑا حادوے جانیے جائیں گے۔

اس پر اعتراض کی ضرورت نہیں، لیکن تکمیل آرائش کو صرف آسمان تک محدود رکھنا کیونکر مناسب ہے؟ اولین شے تو زمین کی آرائش ہے۔ بظاہر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس آرائش میں ستارے بھی کھپ جائیں گے اور آسمان کی آرائش بحال رکھنے کے لیے اور ستارے درکار ہوں گے۔

۱۳۔ **شرح :** کاغذ ختم ہو گیا اور مددوح کی طرح ابھی باقی ہے۔

اس بے کنارہ سندھ کے لیے سفینہ درکار ہے "سفینہ" یہاں ذہنی میں استعمال ہوا "اول" دفتر، "دوم" کشتی "یا جہاز"، "کشتی" یا "جہاز" کو "بھریکراں" سے مناسبت ہے "دفتر" کو "کاغذ" سے۔

۱۴۔ **شرح :** آج غالب نے خاص ادا سے نکتہ سرائی کی ہے،

یعنی خاص رنگ میں شعر کہے ہیں۔ میرے جو دوست اور ہم ہمیشہ نکتہ داں ہیں، یعنی شعر کی باریکیاں سمجھتے ہیں، انھیں عام دھوت دیتا ہوں کہ اس کی پیروی کریں۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے

ہیں۔ جنہوں نے مرزا کو ہنایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد

میں بلایا تھا، مگر غالباً مرزا کا دل نہ جاتا نہیں ہوا؟

قصائد

(۱)

امیر المومنین حضرت علیؑ کی منقبت میں :

۱۔ شرح :

باغ میں فیض
کا یہ عالم ہے
کہ کسی بھی ذرے
کا وجود بیکار
نہیں رہا یہاں
تک کہ بے داغ
لاٹے کا سایہ
ہمارے دل
کا فقط سیاہ
بن گیا ہے۔

لالہ و افکار
ہوتا ہے ۔

یہاں اسے
بے داغ اس
بے کما کہ ہمار
کے فیض تو

ساڈیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار
سایہ لالہ بے داغ شہید اٹے بہار
مستی باد صبا سے ہے بعرض سبزہ
ریزہ شیشہ سے ہو ہر تیغ کسار
سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ
تازہ ہے ریشہ نارنج صفت روئے شرار
مستی ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معمورئی شوقِ ملبسبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندہ گل سے بیدار
سوئے ہے فیض ہوا صورتِ مرگانِ یتیم
سر نوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ خبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ صلال
 قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
 کعبِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
 دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤسِ شکار
 مے کدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
 بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار
 موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدہ غنچہ باغ
 گم کرے گوشہ مے خانہ میں گر تو دستار
 کینچے گرانی اندیشہ چمن کی تصویر
 سبز مثلِ خطِ نو خیز ہو خطِ پرکار
 لعل سے کی ہے پے زمزمہ رحمتِ شاہ
 طوطی سبز کسار نے پیدا منعقد
 وہ شہنشاہ کہ جس کی پے تعمیرِ سرا
 چشمِ جبریل ہڑئی قابِ خشتِ دیوار
 خاکِ العرشِ ہجومِ خیمِ دوشِ مزدور
 رشتہ فیضِ ازل سازِ مناسبِ معمار

لے اس کا
 داغ بالکل
 مٹا دیا۔ اب
 اس کا موت
 سایہ باقی رہ
 گیا اور وہ
 تہار کا سویرا
 بن گیا۔

۲۔ لغات
 میخ کسار
 پہاڑ کی چوٹی
 شرح :
 شاعر نے پہاڑ
 کی چوٹی پر
 سبز و کبیرا
 تو اسے خیال
 ہوا کہ فی سبز
 نہیں، بلکہ
 میٹھے شراب
 کی کرچیں ہیں
 جو تیغِ کوہ کے
 جو ہر جگہ
 ہیں اور یہ

باد مہا کی مستی کا
کرشمہ ہے۔

مطلب یہ ہے
کہ سبزہ سر کو بہار
ہمیں جا رہا ہے
باد صبا نے مستی
کے عالم میں میناے
سے توڑ ڈالا اور
اس کے سبز سبز
دیزے پہاڑ کی
چوٹی پر بکھر گئے،
وہی تیغ کو بہار
کے جوہر بن گئے۔
واضح رہے کہ
میناے سے کی

سبزہ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ بہتِ مدعاوت و یک ادجِ حصار
واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرکاش
وہ رہے مروجہٴ بالِ پری سے۔ بیزار
خاک صحرائے نخت، جو ہر سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم، آئینہٴ بختِ بیدار
ذہنہ اس گرد کا، خوردِ شید کو آئینہٴ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستی ناز
عرضِ خمیازہٴ احیاء ہے ہر موجِ بہار

مطلع ثانی

کرچوں کا سبز جنا
بہار کا فیضان ہے۔
تیغ کو بہار اصلاً
پہاڑ کی چوٹی کو
کہتے ہیں، لیکن
یہاں شاعر نے

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چہ راغاں پرِ مُلبَلِ گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہٴ خانہٴ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے ہو ائے دیدار

دوبارہ تیغ کو
حقیقی معنی میں
لے لیا جو ہر
سے مراد اس
کی آب داری
ہے۔

۳۔ لغات
پلنگ:
پینا جس کے
زود جسم پر
سیاہ چٹیاں
ہوتی ہیں۔

شرح:
ہمارے جوش
اور فیض کی
کیفیت بیان
کرتے ہوئے
کہتے ہیں کہ
چھتے کے درخ
یعنی چٹیاں نقرہ
کے پیالے کی
طرح سبز ہو گئی ہیں اور چنگا دیوں میں ویسی ہی تازگی آ گئی ہے، جیسے تازگی کے
ریشے میں ہوتی ہے۔

تیری اولاد کے غم سے ہے برونے گردوں
سلک اختر میں مہ نوا، مرثہ گوہر بار
ہم عبادت کو ترا نقش قدم، مہر نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے انتظار
مدح میں تیری نیاں زمزمہ لغت نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوش اسرار
جو ہر دست دعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازش مرثگان و دگر سو غم خوار
مردک سے ہو عزا خانہ اتبال نگاہ
خاکِ درد کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمن آلِ نبی کو بہ طرب خانہ دھڑ
عرضِ خمیازہ سیلاب ہو طاقِ دیوار
دیدہ تادل اسد آئینہ یک پر تو شوق
فیض معنی سے خطِ ساعنہ راقم سرشار
طرح سبز ہو گئی ہیں اور چنگا دیوں میں ویسی ہی تازگی آ گئی ہے، جیسے تازگی کے
ریشے میں ہوتی ہے۔

۴۔ لغات - فشار : دباؤ
 شرح : فضا نے عالم میں گھنٹھور گھنٹا میں چھپا رکھی ہیں۔ حسرت
 ان سے عیش و نشاط کے پھول چن رہی ہے گھنٹوں کی شدت کا یہ عالم
 ہے کہ دونوں جہان ان کی آغوش میں بھینچے جا سکتے ہیں۔

شعر کا مطلب یہ ظاہر ہے کہ بادل اتنے زور سے گھر کر آنے میں
 گویا دونوں جہان کی فضا ان کے لیے تنگ معلوم ہوتی ہے اور شاعر جیسا
 حسرت زدہ آدمی بھی ان سے خوشی کے پھول چن رہا ہے۔

۵۔ لغات - معموری : آبادی

راہِ نحو اسیدہ : لفظی معنی سویا ہوا راستہ اصطلاحی معنی وہ
 راستہ جس پر چلنا پھرنا بہت کم ہو۔

شرح : بہار کے فیض سے ہر جگہ پھول پیدا ہو گئے۔ ان کی کثرت
 کا یہ عالم ہے کہ جو راستے ویران پڑے تھے وہ بھی پھولوں سے پیر گئے۔ گویا
 سونے ہونے والے راستے پھولوں کے بننے یعنی کھلنے کی آواز سے بہار ہو
 گئے۔ کوہِ دھوا میں ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں، اس لیے تمام
 مقامات بلبلوں کے عشق سے آلود ہو گئے ہیں۔

۶۔ لغات - سر قوشت : تقدیر۔

مژگانِ یتیم : اس کی دو خصوصیتیں ہیں، اول خاک آلود ہونا، دوم
 مسلسل رونے کے باعث نم آلود رہنا۔

دو جہاں ابر : بادلوں کی انتہائی کثرت۔

غبار : ایک قسم کا خط، جو دو کاغذوں پر لکھا جاتا ہے اور دونوں
 کو ملا کر چڑھا جاتا ہے، ورنہ غبار سا معلوم ہوتا ہے۔

شرح : فصلِ بہار کی تری اور سیرابی کا یہ عالم ہے کہ مژگانِ یتیم کی
 طرح خطِ غبار کی ایک سطر میں دو جہاں ابر کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

شعر کا صاف مطلب یہ ہے کہ بہار کی رطوبت اور شادابی کی برکت سے گرد و خبار کی معمولی سی مقدار میں اتنا پانی ہے، انگو یا بے شمار بادل برسنے لگے ہیں۔

مراگانی تیم کی دونوں خصوصیتیں شعر کے سلسلے میں پیش نظر رہنی چاہئیں۔

۷۔ لغات۔ قوت نامیہ : بڑھنے اور نشوونما پانے کی قوت۔
 شرح : اگر ناضج کاٹ کر پھینک دیں تو بڑھنے اور نشوونما پانے کی قوت اسے بھی بیکار نہ چھوڑے گی، بلکہ نمودے کر اس ہلال کو بدرجہا کر رہے گی۔

۸۔ شرح : خاک کی ہر سطح، جو آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہے اس میں بہار کے جوشِ خروش نے جان ڈال دی ہے، اور وہ قمری کی طرح اڑ رہی ہے۔ اور جس کا فکڑ کر آگ لگ گئی ہو، وہ ایک جہاں ہے جس سے مور پکڑے جاتے ہیں۔

قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔ میرزا غالب پہلے بھی اسے خاک اور خاکستر سے تشبیہ سے چکے ہیں۔ بیانِ مرثیہ ہوا کہ ہمارے بے جہاں خاک میں روح پھونک دی اور وہ قمری بن کر اڑنے لگی۔ آتشِ زندہ کا فکڑ کی تشریح پہلے تفصیل سے کی جا چکی ہے۔ اس کا فکڑ میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے شعلے سے پیدا ہو جاتے ہیں، جو چند لمحے باقی رہتے ہیں، ان کی صورت بالکل ایسی ہوتی ہے، جیسے جہاں کا کوئی ٹکڑا ہو۔ وہ کاغذِ مورد کے پروں سے بھی اک گردِ مشابہت رکھتا ہے، اس لیے اُس جہاں کو طائوس شکار کہا گیا۔

۹۔ شرح : اگر تجھے یہ تمنا ہو، شراب خانے میں بیٹھ کر بھول چنے تو اس کی سہل ترکیب یہ ہے کہ شراب کا ایک پیالہ باغ کے کسی طاقتے میں رکھ کر بھول جا۔ نشوونما کی قوت اُس ایک پیالے کو اس طرح سے شمار پالیے

بنادے گی، جس طرح ایک چھوٹے سے بیج سے کئی پھول پیدا ہو جاتے ہیں یوں چمن میں میکدہ پیدا ہو جائے گا اور میکدے میں چمن۔ شراب بھی پی اور پھول بھی چمن۔

۱۰۔ شرح : اگر شراب خانے کے گوشے میں تیری پگڑی گم ہو جائے تو باغ میں پھلا جا اور غنچے کی غلوت گاہ میں موج گل ڈھونڈ لے۔ گویا جو پگڑی میکدے میں گم ہوگی، وہ لطیف ہوا سے خوشبو بن کر غنچے کی غلوت گاہ میں جا بیٹھے گی۔

۱۱۔ لغات۔ مافی : ایک مشہور معثورہ جس کا وطن بابل تھا، مفصل حالات پہلے کچھ جا چکے ہیں۔

شرح : اگر فکر و خیال کا مافی باغ کی تصویر کھینچو تو طراوت ہوا کے باعث پرکار کا خط حسینوں کے ننھے ننھے آگے ہوئے سبزہ منط کی طرح سبز ہو جائے۔

۱۲۔ لغات : منقار : چونچ۔

شرح : سبزہ کو مبارک کے طوطی نے حضرت علیؑ کی مدح کا زمزمہ گانے کے لیے لعل کی چونچ پیدا کی ہے۔

میرزا کا مقصود یہ ہے کہ پہاڑ پر سبزہ بھی اگتا ہے اور اس میں لعل بھی ہوتے ہیں۔ دونوں نے مل کر ایک ایسے پرندے کی شکل پیدا کی جس کا رنگ سبز اور چونچ سرخ ہے۔ غرض یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی مدح کریں۔ گویا یہ شعر گرہ بیکہ ہے، اس سے مدح شروع ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ شرح : حضرت علیؑ وہ شہنشاہ ہیں، جن کے محل سرسے کی تعمیر کے لیے اینٹوں کی ضرورت پڑی تو حضرت جبریلؑ نے اپنی آنکھوں کا قاب بنانے کی غرض سے پیش کی تاکہ اس میں ڈھال ڈھال کر ایشیں تھاپ لی جائیں۔

۱۴۔ لغات - نلک العرش : وہ آسمان یا بلندی جس پر

عرش ہے ۔

ہجومِ ختم : جبکاڑ کی کثرت ۔

طنائِ معمار : وہ رستی جس کے ساتھ ایک وزن لٹکا رہا ہے

اور راج معمار اس سے تعمیر کردہ دیوار کی سیدھ اور ٹیڑھ دیکھتے ہیں ۔
جہاں ٹیڑھ ہو، اسے ٹھونک کر درست کر دیتے ہیں ۔

شرح : عرش والا آسمان مزدور کے کندھے کی طرح حد درجہ

جھک گیا ہے ۔ یعنی وہ حضرت علیؑ کی محلِ سرائے کی تعمیر میں مزدوری ،
تعظیم و احترام کی بنا پر کر رہا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے ازلی فیض کا رشتہ
اس محلِ سرائے کے معمار کی وہ رستی ہے ، جس سے دیوار کی سیدھ
ٹیڑھ دیکھی جاتی ہے ۔

۱۵۔ لغات - ٹہ چین : نوا آسمان

خطِ پشتِ لبِ بام : مکان کی منڈیر پر جو رنگین خط آرائش کی

غرض سے لگایا جاتا ہے ۔

اوجِ حصار : محلِ سرائے کی فصیل کی بلندی ، جس نے پیاروں

طرف سے عمارت کو گھیر رکھا ہے ۔

شرح : نوا آسمانوں کا بزنہ اس محلِ سرائے کے لبِ بام کی منڈیر

کے رنگ میں مٹ جو گیا ۔ سیکڑوں خدا شناس لوگوں کی بلند ہمتی اس محلِ
سرائے کی بیرونی دیوار کی بلندی کے برابر ہے ۔

عادلوں کی بلند ہمتی اس اعتبار سے کہ ان کی فکر و نظر مقامِ معرفت
حاصل کرنے کی غرض سے بہت اونچی جاتی ہے ۔

۱۶۔ لغات - خاشاک : گھاس پھوس ۔

پرکاوہ : گھاس کا تنکا ۔

مرؤصہ : پٹکھا ، باوزن

شرح : اس محل سرائے کے باغ کی گھاس بھوس سے ایک تنکا بھی
سی کوٹل جاتے تو وہ پری کے بال و پر کے پٹکھے سے بھی بیزاد رہے۔

پری کے بال و پر کا پٹکھا ایسی چیز ہے جو بالکل نایاب ہے ، لیکن اس
کی آندہ ہر شخص کو ہوگی تاکہ گرمی میں راحت پہنچے اور کھیسوں سے بھاؤ ہو سکے
لیکن میرزا کہتے ہیں کہ جس شخص کو حضرت علیؑ کے باغ سے گھاس کا ایک
تنگا مل جائے وہ پری کے پٹکھے سے ہمیشہ بیزاد رہے اور اسے پرگاہ کی
بھی وقعت نہ دے گا۔

۷۱۔ لغات۔ نجف : کوڑے سے تین چار میل پر مغربی جانب ایک

شہر ، جہاں حضرت علیؑ کا مزار ہے۔

سیر : رومانی سلوک کے مراتب طے کرنا

عُرْفَا : عارف کی جمع ، خدا شناس لوگ ، اصحاب معرفت۔

شرح : نجف اشرف کے صحرا کی خاک خدا شناس لوگوں کے عرفان

سلوک کا جو سہرا یعنی مدح و مداں ہے اور اس صحرا کی خاک پر نقش پاکی اٹھ
جاتے ہوئے نصیب کا آئینہ ہے۔

مطلب یہ کہ نجف کے صحرا میں پھر ناعرفان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور

وہاں جس کا نقش قدم پڑ جائے اسے سمجھنا چاہیے کہ نصیب باگ اٹھا۔

۱۸۔ شرح : اس صحرا کی گرد کا فتنہ سودج کے لیے فخر ناز کا آئینہ

ہے اس صحرا کی گرد اُتید کے لیے بہار کا جامہ احرام ہے۔

مطلب یہ ہے کہ صحرائے نجف کا فتنہ و فتنہ سودج کے لیے مایہ ناز ہے

اور وہاں کی گرد اُتید کے لیے بہار کا سامان ہے۔

۱۹۔ شرح : آفرینش : پیدائش ، تخلیق ، کائنات۔

نحمیازہ : انگڑائی۔

شرح : تخلیق و پیدائش کو اس صحرا سے مستی ناز کی طلب ہے۔ یعنی پوری کائنات سراپا طلب بن ہوئی ہے کہ نجف کی خاک پاک سے اسے مستی ناز حاصل ہو اور صحرا سے نجف سے عبار کی جو لہرائیں رہی ہے، وہ پیدائش کی انگڑائیاں پیش کر رہی ہے۔

مطلب یہ کہ جب نشہ اترتا ہے اور پینے والے پر غبار طاری ہوتا ہے تو جسم ٹوٹتا ہے اور انگڑائیاں آتی ہیں۔ کائنات ہمیشہ مستی ناز صحرا سے نجف کی خاک سے طلب کرتی رہی۔ یہ طلب اب بھی باقی ہے اور اس کا نشہ اتر جانے کی انگڑائیاں موج غبار کی شکل میں پیش ہو رہی ہیں۔

مطلع ثانی

۲۰۔ لغات - شبستان : رات بسر کرنے کی جگہ۔

شرح : اے حضرت! آپ ہی بہار کے شبستان کی شمع ہیں اور آپ ہی کے فیض سے پردانے کا دل چراغاں اور بیل کے بال پر گلزار ہو رہے ہیں۔ پردانہ شمع کا عاشق و طاب ہوتا ہے، اس کا دل چراغاں بن گیا، گویا جو کچھ مطلوب تھا، اسے مل گیا۔ بیل کو بیل کی آواز دہرائی ہے، اس کے بال پر چمن زار بن گئے، گویا وہ بھی مراد کو پہنچ گئی۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کا مطلوب حضرت علی کے طفیل حاصل ہوتا ہے۔

۲۱۔ **شرح :** اے حضرت! آپ کے جلوے کے ذوق اور آپ کے دیدار کے شوق میں آئینہ خانہ بھی مور کی طرح اڑنے لگے۔

آئینہ خانے کی پرداز کو مورد سے تشبیہ اس لیے دی کہ اس کے پروں کے نقش و نگار آئینے کی طرح ہوتے ہیں، جب وہ اٹھتا ہے تو دیکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے، بہت سے آئینے اڑے جارہے ہیں، گویا آئینہ خانے کے پرداز

کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۲۔ **تشریح :** اے حضرات! آپ کی اولاد کے علم میں آسمان پر جان

ستاروں کی لڑی میں پیدا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی مرثہ ہے جس سے موتی برس رہے ہیں۔ ماؤ کو مرثہ گو ہر بار اس بے کہا کہ وہ دوتا ہے۔ چونکہ حضرت مٹی کی اولاد کے علم میں دوتا ہے، اس لیے آنسو موتی بنتے جاتے ہیں اور انہیں موتیوں سے ستاروں کی لڑیاں پڑتی گئیں۔

۲۳۔ **لغات :** مہر نماز : وہ چیز جو سجدے کے مقام پر رکھ لی

جاتی ہے اور عموماً خاک کر ہا کی بنیاد ہوتی ہے۔

جہم : دونوں مصرعوں میں اس کے معنی ہیں نیز، بھی۔

ریا حضرت : زہد، پرہیزگاری، دماغی منزلیں طے کرنے کے لیے

ذکر و فکر میں اٹھنا، عام معنی درخش اور کسرت بھی ہیں۔

استظہار : پشیمانی، پشت پناہی، امداد۔

تشریح : اے حضرت! آپ کا نقش قدم عبادت میں مہر نماز ہے یعنی

اسی پر سجدہ کیا جاتا ہے اور ریا حضرت کی پشیمانی بھی آپ کی حوصلہ افزائی سے ہوتی ہے۔

آپ کی ذات بابرکات کو دیکھ کر یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ریا حضرت

کی جائے۔

۲۴۔ **تشریح :** اے حضرت! آپ کی مدح میں رسول اللہ (صلعم)

کی نعت کا ترانہ چمپا ہوا ہے اور آپ ہی کے جام فیض سے پوشیدہ بھیدوں کی شراب اُبلتی ہے۔

مطلب یہ کہ آپ کی منقبت بھائے خود رسول اللہ (صلعم) کی نعت

ہے، کیونکہ آپ حضورؐ کے وصی اور محبوب ہیں اور آپ کے فیض کا پالہ اُس

شراب سے بھرا ہوا ہے جو روحانیت کے پوشیدہ بھید آشکارا کرتی ہے۔

۲۵۔ شرح : پہلے مصرع میں ”جو ہر دست دعا آئندہ“ دراصل ”جو ہر آئندہ دست دعا“ تھا، جسے مصرع میں لانے کی غرض سے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ ”آئندہ“ دو میان سے اٹھا کر آخر میں ڈال دیا گیا۔

شرح : دست دعا کے آئینے کا جو ہر تاثیر ہے، یعنی جو دعا کی باقی ہے، وہ قبول ہوتی ہے، کیونکہ اثر رکھتی ہے۔ دعا خلوص سے کی جائے تو انسان بے اختیار رونے لگتا ہے، لیکن یہ رونامرگ ان کے لیے باعث ناز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بارگاہِ باری تعالیٰ میں شرف قبول حاصل کرتا ہے۔ پھر یہی اثر ہے، جو حسرت و پریشانی کے کانٹوں کا عزم دل سے نکال دیتا ہے۔ کیونکہ دعا کا شرف قبول پانا ہی حسرت و پریشانی کو زائل کر دیتا ہے۔

۲۶۔ لغات۔ عزراخانہ : ماتم کرنے کی جگہ۔

شرح : اسے حضرت ابو آکھد آپ کی خاک و رکو آئینہ بنا کر سامنے نہ رکھے، اس کی نگاہ آکھد کی چلی سے اقبال کا ماتم کردہ بن جائے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ نگاہ سعادت و اقبال سے محروم ہو جائے۔ آکھد کی چمکی سیاہ ہوتی ہے، اس لیے اسے ماتم کا گھر بنا دیا۔ آئینہ دار کے معنی خادم کے بھی ہوتے ہیں، یعنی وہ خادم، جو آقا کے سامنے آئینہ دکھاتا ہے۔ یہ مطلب بھی یہاں درست ہے، لیکن آئینہ بنا کر سامنے رکھنا زیادہ سوزوں ہے۔

۲۷۔ شرح : جو شخص اہل بیت کا دشمن ہو، خدا کرے، اس دنیا کے عشرت کو سے میں اس کے لیے دیوار کا ہر طاقی سیلاب کی انگڑائی کی تصویر بن جائے۔

مطلب یہ کہ ہر طاقی دیوار سے سیلاب اٹھے اور اس کے عشرت کو سے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

۲۸۔ لغات۔ راقم : کھینے والا۔ یعنی آسدا یا غالب

سرشار : لبریز جب کوئی پیالہ وغیرہ اتنا بھر جائے کہ کناروں سے

بنے لگے تو اسے سرشار کہتے ہیں۔

شرح : استمیت علیٰ حبیبہ کلمہ سے دل تک پر تو شوق کا ایک آئینہ بنا ہوا ہے، یعنی دید و دل دونوں انظارِ شوق میں بیتاب ہیں اور حقیقت کی شراب سے میرا پیار آخری لحظہ تک ہا لب بھرا ہوا ہے۔

(۲)

امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی منتقبت میں !

وہر جز جلوة یکتائی معشوق نہیں
 ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں
 بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ فوق
 بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
 ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
 لغو ہے آئینہ فرقی جنوں و تمکین !
 نقشِ معنی ہمہ نخیازہ عرضِ صورت
 سخنِ حق ہمہ پیمانہ ذوقِ تخسین

۱۔ شرح :
 کائنات اس کے
 سوا کیا ہے کہ
 محبوبِ حقیقی کی
 یکتائی دیگانگی
 کا ایک پر تو
 ہے ؟ اگر اس
 کے حسن میں خودی
 کی آرزو نہ ہوتی
 تو ہم کیونکر مجدد
 پاتے ؟ یعنی محبوب

لاف و انش غلط و نفع عبادت معلوم
 فوراً ایک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
 مثلِ مضمونِ وفا باو بہ و ستِ تسلیم
 صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فزقِ تمکین
 عشقِ بے ربطی شیرازہ اجزائے حواس
 وصلِ زنگارِ رُخ آئینہ حُسنِ یقین
 کوہِ کن گرسند مزدورِ طرب گاہِ رقیب
 بے ستوں آئینہ خوابِ گرانِ شیریں
 کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتشِ خیز؟
 کس نے پایا اثرِ نالہ دل ہائے حزیں؟
 سامعِ زمزمہ اہلِ جہاں ہوں لیکن
 نہ سروِ برگِ ستائش نہ دماغِ نفیس
 کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذُ اللہ
 یکِ قلمِ خارجِ آدابِ وقار و تمکین
 نقشِ لاحول لکھ اے خامدِ ہڈیاں تحریر
 یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواسِ قویں؟

حقیقی نے اپنے
 کمالِ حُسن کی نشانی
 کے لیے یہ کائنات
 پیدا کی اور یہ
 آئینہ ہے جس
 میں اس کا عکس
 پڑ رہا ہے۔

ایک مشہور
 قول ہے، جو بطور
 حدیث پیش کیا
 جاتا ہے: کُنْتُ
 کَنْزاً مَغْفِیاً قَا صِبْتُ
 عَنْ اَعْرَفِ خَلْقَتِ
 الْخَلْقِ بَعْلِ اَعْرَفِ
 رَمِیْ اَیْکَ پَرِخِیَہ
 خَزَائِنِ تَحَا۔ میں
 نے پسند کیا کہ اس
 کی معرفت و
 شناسائی ہو یعنی
 اسے پہچانا جائے
 چنانچہ میں نے
 مخلوق پیدا کی،
 یہاں تک کہ

منظرِ فیضِ خدا جانِ دُولِ ختمِ رسل
 قبلہ آلِ نبی کعبۂ ایبادِ یقین
 ہو وہ سراپہ ایبادِ جہاں گرمِ خرام
 ہر کعبِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں
 جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا
 وہ کعبِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی ایں
 نسبت نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
 ابد اُپشتِ فلکِ خم شدہ نازِ زمیں
 فیضِ خلق اس کا ہی شال ہے کہ ہوتا ہے سدا
 بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگین
 بُرشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
 قطع ہو جائے نہ سرِ رشتہ ایبادِ کیں
 کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
 رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانہ میں
 جاں پناہ! دلِ دہاں فیضِ رسانا! شاہ!
 وصی ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقین

میں پہچان گیا
 شہر میں ہی معجز
 بانجھا گیا ہے۔
 مولانا علی ہاشمی
 فرماتے ہیں: تقویٰ
 کا ایک مشعر بھی
 ہے کہ حقائقِ ملکات
 کو ذاتِ واجب
 الوجود سے وہی
 تعلق ہے۔ جو
 آفتاب کو اجسام
 سے ہے۔ ہر جسم
 میں جیسی قابلیت
 ہوتی ہے، اسی
 کے مطابق آفتاب
 کا نور اس میں
 پہنچتا اور منعکس ہوتا
 ہے۔ مثلاً سیاہ
 پتھر میں نور کا میضامن
 بہت کم پہنچتا ہے
 اور آئینے میں پورا
 آفتاب اور آسمان
 ہے۔ اسی طرح

جسمِ اظہر کو ترے دوشِ پیمبرِ منبر
 نامِ نامی کو ترے ناصیہ عرشِ نگین
 کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
 شعلہ شمع مگر شمع پہ باندھے آئین
 آستان پر ہے ترے جوہرِ آئینہ سنگ
 رقم بندگی حضرتِ جبریلِ امین
 تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
 خاک یوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دین
 تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جان کام و ذراں
 تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبین
 کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ مدوحِ خدا!
 کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں!
 جنسِ بازارِ معاصی اسد الشدا
 کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
 شوخیِ عزمِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
 ہے تیرے حوصلہ فضل پر از بس کہ یقین

ممکنات میں ہیں
 وجود واجب کا
 جلوہ پہنچ رہا ہے
 اور پوری کائنات
 اسی وجود کا پر تو
 ہے اگر اس وجود
 کو اپنا پر تو دیکھنا
 نہ ہوتا تو ہماری
 تخلیق کیوں ہوتی
 سمجھنا یہ چاہیے
 کہ دنیا کی ہر شے
 قدرتِ باری تعالیٰ
 کا مظہر ہے اور
 یوں پوری کائنات
 کو اس کی خود بینی
 کا آئینہ قرار دیا
 جاسکتا ہے۔

۲۔ شرح
 ہم نے کائنات کا
 نظارہ انتہائی بیدار
 سے کیا۔ تجویز
 نکلا کہ نہ اس
 نظارے سے

وے دعا کو مری وہ مرتبہ حسن قبول
 کہ اجابت کہے ہر حرف پر سو بار آمین
 غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
 کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
 طبع کو الفتِ دلِ دل میں یہ سرگرمی شوق
 کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ جہیں
 دلِ الفتِ نسب و سیمہ تو حیدِ فضا
 نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
 صرف امداد اثرِ شعلہ دوزخ
 وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوس بریں

کوئی حقیقت حاصل
 کیا نہ کوئی نصبت
 پائی اور نہ کچھ لطفت
 اٹھایا۔ اسی طرح
 ہماری کتاب سے
 درجہ بیکس اور
 لاچار رہی کہ نہ اس
 نے دنیا حاصل کی،
 نہ دین کا نفع اٹھایا،
 اگر نصبت حاصل
 کرتے تو دنیا دار
 بن جاتے۔ اگر لطفت
 اٹھاتے تو دنیا مال
 جاتی، لیکن ہم دونوں
 سے محروم رہے۔

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان کائنات پر نصبت حاصل کرنے کی غرض
 سے نظر ڈالے تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ آبی اور آبی ہے۔ اس میں کوئی ثبوت
 استقلال نہیں۔ اس میں ہر لحاظ تغیر جاری ہے اور تغیر بے ثباتی کی دلیل ہے،
 لہذا انسان کو چاہیے کہ کائنات کے بجائے محبوبِ حقیقی سے کو رہے۔ یہی
 دین حق ہے۔ اگر کائنات کو محض لطفت و لذت حاصل کرنے کی غرض سے دیکھا
 جائے تو یہاں اس کے لیے بھی ہر طرف سائل پھیلے ہوئے ہیں۔ انسان جتنا لطفت
 چاہے، اٹھائے، مگر وہ اپنے مقصد سے قائل ہو جائے گا اور انسانی شرف
 کھو بیٹھے گا۔ ہر حال میں انکار سے میں نہ نصبت ہو، نہ ذوق، نہ بیداری کی دلیل

ہے۔ جس مقام میں دنیا بھٹک آئے ، مدد میں ، اس کے بے سرو پا ہونے میں کے کلام ہو سکتا ہے ؟

۳۔ لغات : ہرزہ : فعل ، بیکار ، بے سود
ذیر و بزم : بچا اور ادبچا سڑ۔
تکلیف : جھاڑ ، بھڑاڑ ، ہوشیاری۔

شرح : وجہ باری تعالیٰ کے سوا کسی اور کی ہستی یا نیستی کے اونچے نہ نکالنا بالکل بے سود اور بیکار ہے۔ ذکر باری تعالیٰ کے سوا دیوانگی اور ہوشیاری میں فرق و امتیاز کا آئینہ دکھانا سراسر لغو ہے۔ یعنی کائنات کی ہستی اور نیستی کا معما اس لائق ہی نہیں کہ کوئی اس میں وقت صرف کرے ، کیونکہ امر حقیقی ذات باری تعالیٰ ہے اور بس۔

مطلب یہ کہ باری تعالیٰ کا ذکر نہ ہو تو میاں جو کچھ ہے ، اس کی دیوانگی اور ہوشیاری میں امتیاز کی کون سی وجہ ہے ؟ جو ذکر سے غافل ہے ، وہ سراسر دیوانہ ہے اور جو ذکر سے غافل نہیں ، صرف اسے ہشیار سمجھا جاسکتا ہے۔ گویا ، اس بارے میں امتیاز کا پیمانہ صرف ذکر ہے۔

۴۔ لغات : خمیازہ : انگڑانی۔

شرح : جو لوگ معنی شناسی کے مدعی ہیں ، وہ صرف ظاہر داری میں الجھے نہ رہتے ہیں گویا ان کی معنی شناسی سراسر ظاہری غافلش کی ایک انگڑانی ہے۔ اس طرح جو لوگ حق گو ہیں ، انہیں بھی تخمین و آفرین کا ذوق ہے ، یعنی وہ بھی یک قلم اس ذوق کا پیانہ بنے ہوئے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ اچھی باتیں وہی کہی جاسکتی ہیں ، جو تحریر و تقریر میں نمود ، سب کے گوش سے پاک ہوں۔ حقیقی معنی شناسی وہی ہے ، جس میں ظاہر داری کا کوئی نکانہ نہ ہو اور حق گوئی وہی ہو سکتی ہے ، جس کے لیے کسی سے مدح و ستائش کا نشانہ نہ رکھنا چاہئے اور دل ایسی تنہا سے بالکل خالی ہو۔

۵۔ لغات : دُرد : تلخیص

شرح : جو بھی دنیا کے معاملات میں عقل و دانش کا دعویٰ کرتا ہے، اسے سراسر غلط سمجھنا چاہیے اور جو بھی عبادت سے غافل ہے کی امید رکھتا ہے، وہ بھی بیچ ہے۔ دنیا بویا دین، ہم نے دونوں کو غفلت کے پیالے کی تلخیص بتا دیا ہے۔

تلخیص کوئی نہیں پتا، بلکہ وہ پھینک دی جاتی ہے۔ گو یا ہماری دنیا بویا دین، دونوں ہمارے ہاتھوں خراب ہیں، کیونکہ نہ ہیں حقیقت، معاملات دنیا کا صحیح شعور ہے اور نہ ہماری عبادت کا وہ رنگ ہے، جو پیدا کرنا لازم ہے۔

۶۔ لغات - باویدرست : خالی : اتھ

تسلیم : رضا - بندگی۔

شرح : جس طرح وفاداری سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح رسمی رضا و بندگی بھی انسان کو خالی ہاتھ رکھتی ہے۔ نقش قدم کو پاؤں دار و استوار مانا جاتا ہے، لیکن اس کی حیثیت اس کے سوا کیا ہے کہ پاؤں جوتا ہے، ذلت اٹھاتا ہے اور اس کی پائنداری کے سر پر خاک پڑتی ہے۔

۷۔ شرح : ہمارے زمانے میں اہل ہوش و خرد کے نزدیک عشق

اس کا نام ہے کہ اجزائے حواس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے، انسانی انسان ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ محبوب کا وصل حسن یقین کے آئینے پر رنگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے، دل میں حسن یقین موجود ہو تو اپنے آئینے میں ایسی عکس دیکھ لیتا ہے کہ محبوب کا جلوہ بے تکلف نظر آئے۔ اگر وصل حاصل ہو جائے تو وہ اس آئینے کے لیے رنگ بن جاتا ہے اور اس کی آب و تاب زائل ہو جاتی ہے۔

۸۔ لغات : گرُسُنہ : بھوکا۔

بے سقون : ایران کا وہ پہاڑ، جس کے متعلق مشہور ہے کہ فرزاد نے باغ شیریں کے لیے دودھ کی ہنر لانے کی غرض سے کاٹا تھا۔

شرح : ہم فرزاد کے دعوے عشق کے قائل نہیں۔ وہ تو ایک مزدور تھا، جو روزی کی خاطر اپنے رقیب یعنی خسرو پرویز کی عشرت گاہ کے لیے عنت مشقت کرتا رہا اور اس کی محبوبہ شیریں کی غفلت و بے پروائی کا یہ عالم کہ بے ستون پہاڑ گویا اس کی گہری نیند کا ایک آئینہ تھا۔

پوشا شعر اس مشہور قصے پر مبنی ہے کہ فرزاد خسرو پرویز شہنشاہ ایران کی محبوبہ تغتازی بیوی شیریں پر عاشق ہو گیا تھا۔ اسے دوسری طرف مائل کرنے کی غرض سے یہ منصوبہ تیار کیا گیا کہ فرزاد سے کہا جائے، اگر وہ پہاڑ کاٹ کر شیریں کے باغ کے لیے ہنر لے آئے تو شیریں اسے مل جائے گی۔ یہ باغ خسرو پرویز کا تھا۔ عام روایت کے مطابق فرزاد نے پہاڑ کاٹ کر ہنر باغ تک پہنچا دی۔ گویا اس کی طرف سے شرط پوری ہو گئی۔ اب اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ ایک بڑھیا کی زبانی کہہ بیجا، شیریں مر گئی یہ سنتے ہی فرزاد بھی سر پر تمیہ مار کر ختم ہو گیا۔

مرزا کہتے ہیں، سبلا یہ عشق کی کون سی صورت ہے کہ رقیب کی عشرت گاہ کے لیے مزدوری کی جائے اور اس طرح بھوک مٹائی جائے؟ دوسری طرف شیریں کی غفلت کا یہ عالم کہ اسے کچھ خبر ہی نہیں۔ گویا گہری نیند میں سوئی چڑی ہے اور نیند بھی ایسی، جو بے سقون پہاڑ کی طرح ٹوٹنے نہ پائے۔

۹۔ شرح : خوب چھان بین کرو اور دیکھو کہ اہل وقایہ سے کوئی شخص ایسا ہے، جس کے سامنے یا آہ سے آگ بھڑکتی ہو، کیا کسی نے غلگلیں دلوں کی فریاد و فغاں میں اثر پایا ہے؟

گویا اہل وفا آہیں بھرتے ہیں اور ان سے کسی کے دل میں آگ نہیں لگتی۔ غم کے مارے ہوئے فرزاد کہتے ہیں اور اس کا اثر کسی پر نہیں ہوتا۔

۱۰۔ لغات - سامع : سنے والا۔

شرح : میں دنیا والوں کے ذمے سنتا ہوں، لیکن نہ کسی کے لیے میرے پاس مدح و ستائش کا سامان ہے، نہ کسی کے خلاف اظہارِ نفرت کی زحمت اٹھا سکتا ہوں۔

۱۱۔ لغات - سہرہ سرا : بیودہ گو، بے سرو پا باتیں کہنے والا۔

حیا ذاً یا خدا : خدا کی پناہ۔

یہ شعر گریز کا ہے۔

شرح : پناہ بہ خدا، میں کس قدر بے سرو پا باتیں کر رہا ہوں، جو عزت و تمکنت کے آداب سے بالکل خارج ہیں ! لہذا اب اُس امر کی طرف پلٹنا چاہیے، جو حقیقہً ذکر کے لائق ہے۔

۱۲۔ لغات : نقش : تلوید۔

ہدایاں تحریر : بے جوڑ باتیں لکھنے والا۔

وسواسِ قریں : جو دوسو سوں کے نزدیک ہو۔

شرح : اسے بے جوڑ باتیں تحریر کرنے والے تلم ! لاجل کا تلوید لکھ اور اسے فطرت، جو دوسو سوں کے دائرے میں پہنچی ہوئی ہے، یا علی کر۔ لاجل کا خاصہ ہی یہ ہے کہ شیطانی وسوسوں کو زائل کر دے اور یہی خاصہ غالب کے نزدیک "یا علی" کا ہے۔

۱۳۔ شرح : وہ علیؑ، جو فیضِ خدا کے منظر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کا

فیض ان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جو رسولوں کے خاتم رسول اللہ (صلعم) کے جہانِ دول یعنی عزیز ہیں۔ وہ علیؑ جو آلِ رسول کا قبہ ہیں، یعنی گیارہ امام (انہیں) کی نسل سے ہیں۔ وہ علیؑ، جو یقین کی ایجاد کا کعبہ ہیں، یعنی کعبہ یقین ہیں۔

کعبہ یقین میں غالباً یہ روایت پیش نظر رکھی : لو کشف الغطاء لما ازددت یقیناً (اگر حجابِ میری آنکھوں کے سامنے سے اٹھا دیے جائیں تو فواتِ باریؑ)۔

ہر میرے یقین میں نہ بھروسہ نہ ہوگا، یعنی میرے یقین اب بھی ایسا ہی ہے جیسا چھوٹا بچہ اپنے والد پر بھروسہ کرتا ہے۔

میلہ سے مشرف ہونے پر ہر سکتا ہے۔

۱۴۔ لغات : ایجاد : تخلیق کائنات، جہاں کا پیدا کرنا۔

گردہ : خاک، جو مستور تیار کر لیتے ہیں، پھر اس میں رنگ بھر کر تصویر بنا لیتے ہیں۔

شرح : حضرت علیؑ کا مقدس وجود اس جہان کا سرمایہ ہے۔ وہ جہاں بھی گرم خرام ہو، وہاں خاک کی ہر مٹھی ایک نئی زمین کی تصویر کا خاک بنتی جائے گی۔

۱۵۔ شرح : حضرت علیؑ کا نقش قدم جس جگہ جلوہ دکھائے، خاک کی وہ مٹھی دوڑوں جہانوں کی عزت کی امین بن جائے۔

۱۶۔ لغات : ابد : ہمیشہ کے لیے۔

شرح : حضرت علیؑ کے نام کی نسبت سے زمین کو یہ رتبہ ملا کہ اس کے ناز اٹھانے کی غرض سے آسمان ہمیشہ کے لیے جھک گیا۔ گویا آسمان کے جھکاؤ کا مقصد یہ ہے کہ زمین کے ناز اٹھائے، کیونکہ اس نے حضرت علیؑ کے نام سے نسبت پائی۔

یہ اشارہ حضرت علیؑ کی مشہور کنیت "ابو تراب" کی طرف ہے، ابو تراب اور تراب، خاک۔

مطلب یہ کہ حضرت علیؑ کی کنیت "ابو تراب" ہوئی تو زمین کا رتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ آسمان اس کے ناز اٹھانے کی خاطر ہمیشہ کے لیے جھک گیا۔

۱۷۔ لغات : عطر آگئیں : عطر سے بھرا ہوا۔ مسطر۔

شرح : حضرت علیؑ ہی کے فیض خلق کا یہ اثر ہے کہ صبح کی ہوا پھولوں کی خوشبو سے مسطر ہوتی ہے۔

۱۸۔ لغات : برش : کاٹ۔

شرح :- دنیا میں حضرت علیؑ کی تلوار یعنی ذو الفقار کی کاٹ کا چرچا

عام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس دنیا کا سررشتہ حیات ہی کٹ جائے۔

۱۹۔ **شرح :** حضرت علیؑ کا جلوہ اس طرح کفر کو صبر کر رکھ دیتا ہے کہ اگر اس کا پر تو پیک کے بت خانے پر پڑے تو اس کی رونق اور چہل پہل عاشق کے رنگ کی طرح زاکن ہو جائے۔

معلوم ہے کہ عاشقوں کا رنگ ہمیشہ اڑا رہتا ہے۔ اسی طرح چین کے بت خانے کی رونق بھی اڑ جائے گی۔

۲۰۔ **لغات :** وصی : حضرت علیؑ کا مشہور لقب، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے رسول اللہ (صلعم) نے خاص وصیت فرمائی۔

شرح : اے جان کی پناہ گاہ ! اے دل و جان کو ضیق پہنچانے والے ! اے شاہ ابلیس آپ یقین کے فتوے کی بنا پر خاتم الانبیاء یعنی رسول اللہ (صلعم) کے وصی ہیں۔

۲۱۔ **شرح :** شعر میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ فوج مکہ کے بعد رسول اللہ (صلعم) خانہ کعبہ میں تشریف لائے تو حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ جو ثبت اونچے رکھتے ہوئے ہیں، وہ میرے کندھوں پر چڑھ کر توڑ ڈالو۔

شرح : اے حضرت ! آپ کے پاک جسم کے لیے رسول اللہ (صلعم) کا دد گل مبارک منبر بنا اور آپ کے نام نامی کے لیے عرش کی پیشانی بن گئی۔ یعنی عرش کی پیشانی پر یہ نام کندہ ہے۔

۲۲۔ **لغات :** واجب : باری تعالیٰ۔

آئین باندھنا : آئین بستن کا ترجمہ ہے جس کے معنی ہیں زیب و زینت پہنا۔

شرح : اے حضرت ! آپ کی درج صرف باری تعالیٰ ہی سے ملکتا ہے۔ سچ ہے، شمع کا شعلہ ہی شمع کے لیے زیب و زینت اور فروغ کا باعث ہوتا ہے۔

شعلہ سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے اور شمع حضرت علیؑ۔ شمع شعلے کے

بغیر روشن نہیں ہو سکتی۔ باری تعالیٰ کے شعلے نے اسے روشن کیا اور وہی شعلہ شمع کے لیے ذیب و زینت کا باعث ہے۔

پہلے مصرع میں ”مکن“ کی روایت سے ”واجب“ لایا گیا، ورنہ اس کی اور صورتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

۲۳۔ شرح : اے حضرت! آپ کی چوکت پر جو پتھر لگا ہوا ہے اسے آئینہ فرما کر لیا جائے تو اس کے جوہر حضرت جبریل امین کی فرمانبرداری کی تحریریں ہیں۔

ہر آئینے میں جوہر ہوتے ہیں۔ حضرت علیؑ کے سنگِ آستان کا جو آئینہ ہے، اس میں جوہروں کے بجائے یہ تحریریں درج ہیں کہ حضرت جبریلؑ حضرت علیؑ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہیں۔

۲۴۔ شرح : اے حضرت! دوئے زمین پر بلند والے انسانوں کو خدا نے جو جان و دل و دین عطا کیے، وہ ہر لحظہ آپ کے دروازے پر بجا رہنے کے لیے آباد ہیں۔

۲۵۔ شرح : اے حضرت! دل، جان، منہ اور زبان صرف آپ کی مدح سرائی کے لیے ہیں۔ تختی اور قلم، ہاتھ اور پیشانی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو سلام کرتے رہیں۔

دوسرے مصرع کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ لوح و قلم آپ کے سلام کے لیے ہاتھ اور پیشانی بن گئے ہیں۔ اس صورت میں قلم کو ہاتھ اور لوح کو پیشانی قرار دیا۔ گویا یہ لفظ و نشر غیر مرتب ہے۔

آخری مفہوم کے مطابق لوح سے مراد لوح محفوظ اور قلم سے مراد قلم قدر ہے یعنی قضا و قدر۔

۲۶۔ شرح : جس کی تائش خدا نے کی ہو، اس کی تائش کس سے ہو سکتی ہے؟ کیا خود میں بری کی آرائش بھی کوئی کر سکتا ہے؟

مطلب یہ کہ فردوسِ بریں آرائش اور زیبائش کی آخری منزل ہے۔ پھر اس میں کوئی نئی آرائش کیا کرے گا ؟ اسی طرح ممدوحِ خدا کی مدح میں کوئی کیا کر سکا ہے ؟

۲۷۔ لغات - معاصی : معصیت کی جمع ۔ گناہ ۔

شرح : اسد اللہ اسد گناہوں کے بازار کی جنس ہے ۔ اے حضرت ! وہ اس درجہ ناچیز ہے کہ آپ کے سوا اس کا کوئی گاہک اور کوئی پوچھنے والا نہیں یعنی آپ ہی کے وسیلے سے اس کے گناہ معاف ہو سکتے ہیں ۔

۲۸۔ شرح : اے حضرت ! میں (اسد) اپنے مطالب شوخی کے ساتھ پیش کرتا ہوں غلب میں جسارت سے کام لے رہا ہوں ۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے آپ کے لطف و کرم کی وسعت پر پورا بھروسہ ہے ۔

۲۹۔ لغات - اجابت : قبول

شرح : اے حضرت ! میری دعا کو حسن قبول کا وہ مرتبہ عطا فرمائیے کہ اس کے سبب خوف پر خود قبول سو مرتبہ آئین کہے ۔

۳۰۔ شرح : حضرت امام حسینؑ کا علم میرے سینے میں اس قدر بھرا رہے کہ خوبی و برکت میری آنکھیں ہمیشہ رنگین رہیں ۔

۳۱۔ لغات - دُلْدُل : ایک ہجر کا نام تھا ، جو سکندریہ کے حاکم نے رسول اللہ (صلعم) کو بہ طور ہدیہ بھیجا تھا اور آپ نے حضرت علیؑ کو عطا فرمادیا ۔

شرح : میری طبیعت پر دلدل کی محبت میں شوق کی سرگرمی کہ یہ کیفیت طاری ہے کہ جہاں تک وہ پہنچا جائے ، اس کا قدم ہوا اور میری پیشانی پر پڑے ۔

۳۲۔ لغات - دَلّی الفتن نسب : وہ دل جسے الفت سے

نسبت ہو ۔

سینہ توحید قضا : وہ سینہ جس کی قضا توحید ہو ، یعنی توحید سے

لبریز ہو۔

صدق گزین۔ سچائی اختیار کرنے والا۔

شرح : دوزخ کی آگ اور اس کا دھواں دشمنوں پر صرف ہو فردوس
بریں کے پھول اور سنبھل دوستوں کے جھنڈے میں آتش۔

اس شعر میں صنعت ، تقابلی کمال پر پہنچا دی ہے۔ دیکھیے ، صوف کے مقابلے
میں وقت ، اعداد کے مقابلے میں احباب ، شعلے کے مقابلے میں گل ، دوو کے
مقابلے میں سنبھل ، دوزخ کے مقابلے میں فردوس بریں۔

(۳)

بہادر شاہ کی مدح میں

ہاں مد فوسین ہم اس کا نام	جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دوون آیا ہے تو نظر دم صبح	یہی انداز اور یہی اندام
بارے دوون کہاں رہا غائب	بندہ عاجز ہے گردشِ اتیم
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا	آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاص خواہم !	جذرا اے نشاطِ عام عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
 اس کو بھولا نہ چا سبیٹے کسنا
 ایک میں گیا کہ سب نے جان لیا
 رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
 جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
 میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
 جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
 مہرِ تاباں کو ہو تو ہوا اے ماہ!

سے کے آیا ہے عید کا پیغام
 صبح جو جائے اور آنے شام
 حیران آواز اور ترانہ اعجاب
 مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں تمام
 ایک ہی ہے امید گاہِ انام
 غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام
 تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام
 قرب ہر روزہ برسبیلِ دوام

ق

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
 جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
 ماہِ بنِ امہ تاب بن ، میں کون؟
 میرا اپنا جدا معاملہ ہے
 ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص

جز بہ تقریبِ عید ماہِ صیام
 پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
 مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
 اور کے لین دین سے کیا کام
 گر تجھے ہے امید رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرزندِ فروغ کیا نہ دے گا مجھے مئے گلہاں؟
 جب کہ چودہ منازلِ فلکی کہ چکی قطع تیری تیز مئی گام
 تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر کوئے و مشکوے و صحن و منظر و باغ
 دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز اپنی صورت کا اک بلوریں جام
 پھر غزل کی روشنی پہ چل نکلا تو سن طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟
 مے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں غم سے جب ہو گئی ہے زلیتِ جام
 بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ و شام
 کبھی میں جا بجائیں گے ناقوس اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
 اس قدح کا ہے دورِ محبہ کو نقد چرخ نے لی ہے جس سے گوشِ اہم
 بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار دل کے لینے میں جن کو ہے ابرام

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے

کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہ چکا میں تو سب کچھ اب ٹوکہ
 کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
 تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
 قبلہ چشم و دل بہادر شاہ
 شہسوارِ طریقہ انصاف
 جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
 بزم میں میزبانِ قیصر و جم
 اے ترا لطفِ زندگی افزا
 چشم بد دور! خسرانہ شکوہ
 جانِ نادوں میں تیرے قیصرِ دم
 وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
 نورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
 مرجا موشگافیِ نادک
 تیر کو تیرے تیر غیر بدت

اے پری چہرہ! پکیب تیز خرام!
 میں مددِ سر و زہرہ و بہرام!
 نامِ شاہنشہ بلند مقام
 منظرِ ذوالجلال والا کرام
 نو بہارِ حدیقہ اسلام
 جس کا ہر قول معنیِ الہام
 رزم میں دستاوردِ ستم و سام
 اے ترا عہدِ فرخی فرجام
 لوحِ اشد! عارفانہ کلام
 جڑِ خواروں میں تیرے مرشدِ عام
 ایرج و تور و خسرو و بہرام
 گیو و گوردزد و بیزن و دہام
 آفریں آبِ دارنی مصام
 تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
تیرے قیل گراں حبد کی صدا
برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے رخش بک عناں کا خرام

ق

فنی صورت گرمی میں تیرا گرز
اس کے معزز بکے سرو تن سے
گرنہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
کیوں نمایاں ہو صورت ادغام؟
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
اور اُن اوراق میں بہ کلمب تضا
لکھ دیا شادہوں کو عاشق کش
آسمان کو کہا گیا کہ کہیں
حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
آتش و آب و باد و خاک نے لی
مہر رخشاں کا نام خسر و روز
تیری توفیق سلطنت کو بھی
کاتب حکم نے بموجب حکم
صفحہ ہائے بیانی و ایام
مجلد مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا باشتوں کو دشمن کام
گنبد تیز گرد نیل منام
خال کو دانہ اور زلف کو دام
وضع سوز و غم و رم و آرام
ماہ تاباں کا اسم شمع شام
دی بدستور صورت ارقام
اس رقم کو دیا طراز دوام

ہے ازل سے روانی آغاز
ہو ابد تک رسائی انجام !

(۲)

بہادر شاہ کی مدح میں

۱۔ شرح : ہاں، عید کے نئے چاند ! اُس کا نام بھی تو بنا دے جسے
تو جبک جبک کر سلام کر رہا ہے۔

نئے چاند میں ختم ہوتا ہے اور کوئی جبک کر سلام کرے تو اس کی صورت
ہلال جیسی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہا : ہلال جبک کر سلام کر رہا ہے۔

۲۔ ۳۔ ۴۔ شرح : تو دو دن صبح کے وقت نظر آیا۔ تیرا ہی انداز
تھا اور ایسا ہی نازک اور باریک تھا، لیکن دو دن کہاں غائب رہا ہے ہلال
جواب دیتا ہے کہ میں گردشِ ایام کی وجہ سے مجبور تھا۔ اڑ کر کہاں چلا جاتا،
آسمان نے تو تاروں کا جال بچھا رکھا تھا اور میرے لیے اڑنے کی گنجائش
ہی نہ تھی۔

رمضان یا ہر قمری مہینے کی چھبیسویں تاریخ کو جمع کے وقت چاند دیکھتے
ہیں۔ اگر نظر آجائے تو گمانِ غائب ہو جاتا ہے کہ انیس کا چاند ہو گا۔ اگر
تساویسویں تاریخ کو بھی نظر آجائے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ مہینا تیس کا ہے اور
تیسویں کو نیا چاند طلوع ہو گا۔ گویا نئے مہینے کا چاند دو دن صبح کو بہت باریک
نظر آتا ہے اور دو دن بالکل نظر نہیں آتا۔ یہی مضمون میرزا نے ان شروں
میں پیش نظر رکھا ہے۔ چاند نے بتا دیا کہ میں اُڑ کر تو کہیں جا نہیں سکتا تھا، کیونکہ

تاروں کا جال موجود تھا، لیکن زمانے کی گردش کا طریق یہی ہے کہ نئے مہینے کے آغاز سے دو روز پیشتر صبح کو نظر آؤں اور اس سے دو دن پہلے ہلال کی شکل میں نظر آؤں۔

۵۔ ۸۔ لغات : حَبْذَا : واہ وا۔

شرح : واہ وا اے خاص لوگوں کی خاص شادمانی واہ وا اے عام لوگوں کی عام خوشی ! تین دن نظر آ یا اور اس غیر حاضری کے عذر میں عید کا پیغام لے کر آیا۔ بیگ جو جمع جائے اور شام آئے ۱۰ سے بھولا کہنا چاہیے۔ تنہا عید پر موقوف نہیں، تیرا آغاز اور انجام سب پر روشن ہو گیا۔

ساتویں شعر کے متعلق مولا تلمبا باٹی فرماتے ہیں کہ کس لطف سے اس مثل کو موندوں کیا ہے کہ صبح کا بھولا شام کو آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے اور کس محل پر صرت کیا ہے۔ چھبوسو یا تالیسویں کی صبح کو چاند نکل کر صبر اتیسویں یا تیسویں کی شام کو دکھائی دیتا ہے۔ اس سے لطف کلام ظاہر ہے۔

۹۔ لغات - تمام : چٹلخور۔

شرح : اے ہلال اتو اپنے دل کا بھید مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟ کیا مجھے چٹلخور سمجھ دیا ہے کہ تیری پیٹھ پیچھے وہ بھید ہر ایک سے کتنا پھروں گا؟

۱۰۔ لغات : انام : لوگ۔

شرح : میں جانتا ہوں کہ آج دنیا میں صرت ایک وجود ہے جس سے لوگوں کی امیدیں وابستہ ہیں۔

یہ شعر پہلے شعر کا جواب ہے، جس میں چاند سے پوچھا گیا تھا کہ تُو جس وجود کو حبیب حبیب کہہ سلام کر رہا ہے، اس کا نام کیا ہے؟ اسی کے متعلق چاند سے پوچھا تھا کہ دل کا بھید مجھے بتا دے، میں کوئی چٹلخور ہوں؟ آگے

پہل کر یہ حقیقت خود واضح کر دی ہے۔

۱۱۔ شرح : میں نے مانا کہ تو نے ایک وجود کا حلقہ نیاز کاہی میں ڈال رکھا ہے، لیکن کیا غالب اسی کا غلام نہیں ؟ یہاں ہلال کو حلقے سے تشبیہ دی ہے۔

۱۲۔ لغات - بر طرز استفہام : وہ سوال جو کسی بات کو سمجھنے کی غرض سے کیا جائے۔

شرح : میں جانتا ہوں، تو اس حقیقت سے واقف ہے کہ تیرا آقا اور میرا آقا ایک ہے، جیسی میں نے تجھ سے یہ سوال کیا، لیکن یہاں استفہام کو انکاری تہمینا چاہیے، یعنی سوال سے مقصود اصل شے کا اثبات ہے، نہ کہ نفی۔

۱۳۔ لغات : برسبیل دوام : ہمیشہ کے لیے۔

شرح : اے چاند ! بادشاہ کی بارگاہ میں ہمیشہ کے لیے روشن کتاب کو بار ہو تو ہو، مجھے اور تجھے تو یہ مرتبہ حاصل نہیں۔

۱۴۔ ۱۵۔ شرح : بعد عید العطر کی تقریب کے سوا حضور پُر نور سے روشناس ہونے کا موقع کب ملتا ہے اور تجھے یہ منصب کہاں حاصل ہے ؟ میں اتنا جانتا ہوں کہ تو بادشاہ سے فیض یاب ہو کر پورا چاند یعنی بدر بن جانا چاہتا ہے۔ تو چاند بن، چاند بن، میں پوچھنے والا کون ہوں ؟ کیا تو جو انعام پانے کا، وہ بانٹ کر مجھے دے دے گا ؟ میرا اپنا معاملہ الگ ہے، کسی اور کے عین دین سے مجھے کیا کام ہے ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ سارے قصیدے میں عموماً اور شہر۱۶ میں خصوصاً میرزا نے اردو زبان اور حسن بیان کی جب شان دکھائی ہے ایک مصرع میں۔
تین جملے، جس کے مصنفوں سے رشک ٹپک رہا ہے۔ دوسرا مصرع طرز سے بھرا ہوا ہے۔ چاروں جملوں میں حسن انشاء، پھر خوبی نظم اور بے تکلفی ادا !

۱۸۔ شرح : اگر تجھے عام لطف و کرم کی اُمید ہے تو مجھے خاص بخشش کی تمنا ہے ، یعنی ایسی بخشش جو میرے لیے خاص ہو اور اس سے تمام اُمیدیں بر آئیں۔

۱۹۔ لغات - فقر : شان ، شوکت ، روشنی

شرح : جو مبارک وجود تجھے دنیا کو منور کر دینے والی روشنی عطا کرے گا وہ میرے لیے پھول کے سے رنگ کی شراب کا انتظام ذکر دے گا۔
۲۰ - ۲۲۔ لغات : منازلِ فلکی : آسمانی منزلیں۔
مشکوے : شاہی محل۔

منظر : دریچہ۔

شرح : جب تو تیز رفتاری سے کام لے کر آسمان کی پچودہ منزلیں طے کر جائے ، یعنی ماہِ کامل بن جائے اور تیرے نور سے کوچے ، شاہی محل صحن ، دریچے ، چھتیں جگہ گانے لگیں تو دیکھنا میرے ہاتھ میں بھی شراب سے لبریز تہوہیں پیالہ ہو گا ، جس کی صورت تیری صورت جیسی ہو گی۔

۲۲۔ شرح : دیکھیے میری طبیعت کے گھوڑے کو لگام چاہیے مٹی وہ ہے نہیں ، لہذا یہ جو بھر چاہتا ہے ، چل نکلتا ہے ، اب اس نے غزل کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

غزل

۲۴۔ شرح : علم کا زہر میرے جسم میں اس پیمانے پر اثر کر چکا تھا کہ بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی ، لیکن اسے محبوب ! تو مجھے اس حالت میں قتل کر کے کیوں بدنام ہوا ، تجھے کس نے کہا تھا کہ یہ مفت کا الزام اپنے ذمے لے لے۔

۲۵۔ شرح : جب غم سے زندگی حرام ہو گئی ہو تو پھر شراب ہی کیوں نہ پیے جاؤں تاکہ غم غلط ہو جائے ؟
مطلب یہ ہے کہ شراب یقیناً حرام ہے ، لیکن غم کے باعث زندگی بھی تو حرام ہو گئی ہے ۔ کیوں نہ وہ حرام چن لوں ، جو دوسرے حرام کو ملایا کر ڈالے ؟

۲۶۔ شرح : بوسے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے ؟ اسی کو نفیت سمجھنا چاہئے کہ محبوب و شہم کی لذت سے آگاہ نہ ہو۔
محبوب گالیاں دیتا ہے اور ہمیں مزہ آتا ہے ۔ اگر اس پر واضح ہو جائے کہ اس کا گالیاں دینا ہمارے لیے لذت حاصل کرنے کا باعث ہے تو ہماری ضد سے گالیاں دینا چھوڑ دے ۔ بوسے کی قتا نہ رکھنی چاہیے ۔ میں کافی ہے کہ وہ گالیاں دیے جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ ہم ان سے لطف اٹھاتے ہیں۔
ظاہر ہے کہ جہاں بات بات پر گالیاں دی جاتی ہوں ، وہاں یہ ممکن ہی نہیں کہ عاشق کے دل میں بوسے کا خیال آ سکے ۔

۲۷۔ لغات : ناقوس : بہت بڑی کوبڑی ، سینک ، گھنٹی اور گھنٹا ، جو ہندو مندوں میں ، آتش پرست آتش گدوں میں اور عیسائی گرجوں میں اسی غرض سے بجاتے ہیں کہ ہم مذہبوں کو وقت عبادت کے متعلق خبردار کر دیں۔

احرام : وہ وہ بے ہلی چادریں ، جو عمرہ اور حج ادا کرنے والے لوگ اس مقامات سے باندھ لیتے ہیں اور حج یا عمرہ ادا ہو جائے تو اتارتے ہیں۔

شرح : ہم نے ثبت خانے میں ہوتے ہوئے احرام باندھ لیا ، حالانکہ یہ کبے کی زیارت کے لیے باندھا جاتا ہے ۔ جب ایک اٹا کام کیا تو دوسرا اٹا کام یہ کریں گے کہ کبے میں ناقوس بجانے لگیں گے ، حالانکہ وہ اذان کا مقام ہے ۔

۲۸۔ لغات - قدح : پیالہ ، شراب کا پیالہ ۔
 نقد : روپیہ ، پیا ، سراپا ، اوتھار کی ضد ، یعنی فی الحال ۔
 وام : قرض ، اوتھار ۔

شرح : مجھے ساغر معرفت کا دور فی الحال تیسرے ہے ۔ یہ وہی شراب ہے ، جس سے آسان نے گردشِ قرض لے ہے ، یعنی میری محفل میں اس شراب کا دور چل رہا ہے ، جسے پی کر آسان روزِ اول سے گردش کر رہا ہے اور اب تک اسی طرح گردش میں رہے گا ۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میری کیفیت کیا ہوگی ۔

گردشِ آسان کم از کم ادبیات میں مسلم چلی آتی تھی ، اس کا مطلب ، گردشِ زمانہ سمجھنا چاہیے ۔ یہ نہیں کہ زمین کی جگہ آسان گردش کرنے لگا ۔

۲۹۔ لغات : ابرام : اصرار ، عند ۔

شرح : محبوب بوسہ دینے سے انکار کر رہا ہے ، حالانکہ دل لے لینے پر تیار بیٹھا ہے ۔

۳۰۔ شرح : میں ہر حال میں محبوب کو چھیڑتا رہتا ہوں تاکہ وہ خفا ہو ، مجھے بے لفظ سنانے اور میں طعتِ اٹھاؤں ، یہاں تک کہ غائب نام بھی صرف چھیڑ کی غرض سے استعمال کیا ۔

غائب کا مطلب ہے وہ شخص ، جسے سب پر غلبہ حاصل ہو ، جو سب پر فوقیت رکھتا ہو ۔ ظاہر ہے کہ محبوب یہ سن کر بھی غصے میں آئے گا ۔
 غزل کے بعد پھر مرج کی طرف آتے ہیں اور بلائی ہے اذ سرِ نو خطاب شروع ہوتا ہے ۔

۳۱۔ لغات - یکب تیز خرام : تیز رفتار قاصد ۔

شرح : مجھے تو جو کچھ کہنا تھا ، کڑچکا ، اسے پری جیسے چہرے والے تیز رفتار قاصد اب قبول اور جتا ۔

۳۲ - لغات - ناہیدہ سا : پیشانی رکھنے والا ، سجدہ کرنے والا -
ذہرہ : مشہور سیارہ -

بہرام : مریخ کا فارسی نام ، جلاؤ فلک -
مشرع : وہ کون ہے ، جس کے دروازے پر چاند ، سورج ، ذہرہ اور
مریخ پیشانیاں لکس رہے ہیں - یعنی سجدہ کر رہے ہیں - ظاہر ہے اس سے
مراد بہادر شاہ ہے ، جیسا کہ خود کہتے ہیں -

۳۳ - ۳۴ - لغات : منظر : ظاہر ہونے کا مقام -
فدا الجلال : صاحب عظمت و بزرگی -

اکرام : رتبہ بلند -

یہ دونوں نام اسماء الہی میں سے ہیں ، مراد ہے اللہ تعالیٰ -

حدیقہ : وہ باغ ، جس کے گرد چار دیواری ہو -

سام : رستم کا دادا ، زال کا باپ -

مشرع : اسے بلال ! تو نہیں جانتا تو اس بلند رتبہ شہنشاہ کا نام مجھ
سے سن - وہ بہادر شاہ ہے ، جو دل اور آنکھ کی قبلہ گاہ ہے - دنیا میں اللہ
تعالیٰ کی عظمت اور رتبہ اعلیٰ کا مظہر ہے -

وہ بہادر شاہ ، جو انصاف کے راستے کا شہسوار ہے ، وہ بہادر شاہ ، جو
باغ اسلام کی توبہ بار ہے -

اس کا سر عمل عباد کی مانند ہے ، اس کی ہر بات گویا الہامی ہے -

مغفل نشاط آرا ستہ ہو تو اس میں قیصر اور جمشید جیسے بادشاہ مہمانوں
کے طور پر شامل ہوتے ہیں - اگر جنگ کا معاملہ پیش آ جائے تو رستم اور سام
جیسے پہلوان بہادر شاہ سے لڑائی کے فنون سیکھتے ہیں -

۳۵ - ۳۶ - لغات - فرجام : انجام -

لوحش اللہ : اصل میں لا اوحشہ اللہ تعالیٰ ، یعنی خدا اسے وحشت نہ دے -

خفقت کر کے لوحش اٹھ بولنے لگے۔ تعظیم، تحنیں اور استغیاب کے لیے بولتے ہیں۔ مہنوم ہے ماشاء اللہ، سبحان اللہ۔

جرمہ خوار : جرمہ، گھونٹ، خوار، پینے والا۔ یہاں جرمہ خوار سے مراد ہے فیض حاصل کرنے والا۔

مرشدِ جام : اس سے اشارہ ہدایت شیخ احمد جام ثلثہ پیل کی طرف ہے۔ شیخ موصوف علاقہ جام (ولایت ہرات) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔
۱۰۴۱ھ اور ۱۰۴۲ھ کی عمر پا کر ۵۲۶ھ میں وفات پائی۔

اہل اولیاء میں شمار ہوتے ہیں۔ جس مقام پر مزار ہے، اس کا نام ہی شیخ جام مشہور ہو گیا۔

ایرج و تور : فریدوں کے دو بیٹے۔

خسرو : اشارہ ہے کھنڈر کی طرف، جو کیا فی خاندان کا جلیل القدر بادشاہ تھا۔

بہرام : اس سے مراد بہرام گور ہے، جو ساسانیوں میں ایک مشہور بادشاہ تھا۔

گیو : ایران کا مشہور پہلوان، جو کھنڈر کو ترکستان سے ایران لایا تھا۔

گورڈز : گیو کا باپ۔

بیزن : گیو کا بیٹا اور رستم کا مہاراجا۔ مشہور پہلوان۔ دختر افراسیاب سے بیزن کے عشق کی داستان۔ شاہنامہ کا ایک اہم جزو ہے۔

رہام : اصل میں رہام، بہ تخفیف رہے ہوتے ہیں، لیکن شعرا نے "کو" مشدود باندھنے ہیں۔ یہ بھی پہلوان تھا اور گورڈز کا بیٹا تھا۔

موشگافی : بال چیرنا۔ بال کی کھال نکالنا۔

مصصام : وہ تلوار، جو نہ مڑے، نہ جھکے۔

شرح : اب براہِ راست بادشاہ سے خطاب شروع ہو گیا۔ کہتے ہیں، اے بادشاہ! تیرا لطف و کرم زندگی بڑھانے والا ہے اور تیرا عہد حکومت ایسا ہے، جو انجام تک سراپا برکت ہے۔

تیری شان و شوکت و یکیدہ کر بے اختیار زبان پر کلمہ چشمِ بد و دور جاری ہو جاتا ہے، یعنی خدا نظرِ بد سے بچائے اور تیرا معرفت سے بھرا ہوا کلمہ کائنات پر کار اٹھتا ہے، سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔

روم کا شہنشاہ تیرے جان نثاروں میں شمار ہوتا ہے اور شیخ احمد ہمام ثنوی پہلے تجھ سے فیض پانے والوں میں شامل ہیں۔

ایوب، قور، خسرو اور ہرام جیسے ذبردست فرمانروا تجھی کو ملک کا حقیقی وارث مانتے ہیں۔

گیو، گورد، بیزن اور رام جیسے پہلوان تیرے نذر بازو کا لوہا نہٹتے ہیں۔

تیرے تیر کی موٹگانی کا کیا کہنا اور تیری تلوار کی آب و تاب باعثِ صد آفریں ہے۔

تیرے تیر نے دشمن کے تیر کو نشاہٹ بھرا لیا ہے اور تیری تلوار نے قریٰ مقابل کی تلوار کو اپنا میان سمجھ لیا ہے۔

۴۵ - ۴۶ - لغات - گراں جسد : بھاری جسم والا۔
سبک عنان : تیز رفتار، یعنی وہ گھوڑا، جو باگ کے اشارے پر ہٹا ہو جائے۔

شرح : تیرے بھاری جسم والے ہاتھی کی چنگھاڑ سن کر دعد کا دم لگ رہا ہے۔ تیرے تیز رفتار گھوڑے کی چال، بجلی کو سست رفتار کی طرح بھرا رہی ہے۔ یعنی تیرے ہاتھی کی چنگھاڑ کو دعد پر اور گھوڑے کی رفتار کو بجلی پر فوقیت حاصل ہے۔

۴۷ - ۴۸ - لغات : مصدوب : جس پر حزب لگائی جانے ،
مراد دشمن ۔

ادغام : کسی لفظ کے دو ہم جنس حروف کو تشدید سے ایک کر دینا مثلاً
دقائق ، شکار ۔

شرح : تیرے گز کو مصدوری میں قدرت کا ملہ حاصل نہ ہوتی تو
حزب خوردہ دشمن پر پڑتے ہی اس کا سر اور بدن ایک دوسرے میں پیوست
کیوں ہو جاتے ؟

مطلب یہ ہے کہ تیرا گز دشمن پر پڑا تو اس کا سر بدن میں دھنس گیا اور
پہلی صورت بگڑ کر ایک نئی صورت پیدا ہو گئی ۔

۴۹ - ۵۰ - لغات - لیالی : یل کی جمع ، راتیں

دشمن کام : اپنی خواہش اور مراد کا دشمن ۔ عاشقوں کی خصلت ہی
یہ ہے کہ وہ مقصد تک نہیں پہنچتے ، برباد و تباہ حال رہتے ہیں ۔

حکم ناطق : وہ حکم ، جو نکلنے کے ۔ قلعی حکم ۔
شحنہ : کوڑاں ، یہاں مراد ہے وہ امن ، جو رات کو آبادی کی نگراں کیجے ۔
توقیع : فرمان ۔

صورتِ ارتقام : تحریر کی صورت ۔

طرازِ دوام : ہمیشگی کا نقش ۔

شرح : ازل میں راتوں اور دنوں کے صفحوں پر پیش آنے والے
واقعات کی تحریریں ثبت ہوئیں تو تقنا و قدر کے قلم نے ان صفحوں پر اختصار
سے حکم درج کر دیے ۔ یعنی لکھ دیا کہ غلاں دن اور غلاں رات یہ یہ واقعات
پیش آئیں گے ۔

محبوبوں کے متعلق واضح کر دیا کہ وہ عاشقوں کو قتل کرتے رہیں گے ۔

عاشقوں کے بارے میں لکھ دیا کہ ان کی مرادیں برہنہ آئیں گی اور وہ تباہ و خستہ مال

ہیں گے۔

آسمان کی نسبت حکم دے دیا کہ اسے ایک تیز رفتار گنبد کہیں، جس کا رنگ نیلا سا ہے۔

یہ قطعی فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ محبوبوں کے تہل کو دانہ اور ذلت کو جال نکلیں۔

آگ نے جہن پائی، پانی نے نمی لے لی، ہوا نے تیز مودی سنبھال لی اور خاک نے آرام و سکون اختیار کر لیا۔

روشن سورج کا نام دن کا بادشاہ قرار پایا۔ چھیلے جانے کا نام شام کا کو تو ال تجویز ہوا۔

ابے بادشاہ! حسب دستور تیری سلطنت کے لیے بھی تقنا و قدر نے فرمان لکھ دیا۔ حکم کے مطابق حکم لکھنے والے نے تحریر کر دیا کہ یہ سلطنت ہمیشہ کے لیے باعثِ ذہنیت رہنی چاہیے۔

۵۸۔ لغات : روانی : جاری ہونا۔

مشرح : تیری سلطنت کا آغاز ازل سے جاری ہے۔ خدا کے یہ ابد تک اسی طرح انجام کو پہنچے، یعنی کبھی ختم نہ ہو۔

مولانا جلال دہلوی فرماتے ہیں کہ میری نظر میں :

”یہ قصیدہ خصوصاً اس کی تشبیب ایک کارنامہ ہے مصنف عظم

کے کمال کا اور دیور ہے اردو شاعری کے لیے۔ اس زبان

میں جب سے قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہے، اس طرح کی تشبیب

کم کئی گئی ہے۔“

معنی یہی نہیں، یہ قصیدہ خصوصیت سے غالب کی قادر الکلامی کا ایک ایسا

مرقع ہے، جس کی نظیر پوری اردو شاعری میں نہیں مل سکتی۔ فارسی میں بھی

ایسی چیزیں بہت کم ملیں گی۔ دیکھیے، چھوٹی سی بحر ہے اور کس طرح شعروں کی

میں سچ پر سچ پہلا بار د ہے ، کس بے تکلفی سے خیالات گوہر خطاں کی طرح
صفہ قرعاس پر متحرک معلوم ہوتے ہیں ! پھر ہر خیالی دنیا ، ہر اسلوب اچھوتا
بعض اشعار ایسے ہیں ، جن کے پہلے مصرع میں چار چیزیں بیان کیں اور دوسرے
میں چاروں کی خصوصیات الگ الگ واضح کر دیں ۔

مولانا طباہیائی فرماتے ہیں کہ ایسی تشبیہ اردو میں کم کسی گئی ہیں ، لیکن
ہمیں تو تعداد کے اس دفتر میں مجھے خواجہ حالی ناپاک قرار دیتے ہیں ، ایک ہی
تشبیہ ایسی نظر نہیں آتی ، جس میں اس قصیدے کے حسن و خوبی کا پرتو ہو ۔

صبح و دم دروازہ خاور کھلا	مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسرو و انجم کے آیا صرت میں	شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود	صبح کو رازِ مر و اختر کھلا
میں کو اک کچھ نظر آتے ہیں کچھ	دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑ اختارات کو	موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر	اک نگارِ آتشیں رُخ ، سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر	بادۂ گلِ رنگ کا ساعز کھلا
لا کے ساتی نے صبو حی کے لیے	رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ	کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زرّیں بہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھلا
شاہِ روشنِ دل بہادرِ شہ کہ ہے
راہِ مہتی اس پر سرتاسر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تلوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدِ احکام پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے تام
اس کے سرِ منگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فرست ہے
واں لکھا ہے چہرہ قیصر کھلا

قطعہ

تو سنِ شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب
نقشِ پاکی صورتیں وہ دلفریب
مچھ پر فیضِ تربیت سے شاہ کے
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن بہتر
ٹوکے بتِ خاٹہ آزر کھلا
مخا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
منصبِ مہر و مہ و غور کھلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
میری حدِ وسیع سے باہر کھلا
ہر جہاں گرمِ غزلِ خوانِ نفس
کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
لوگ جا نہیں طبلہ عنبر کھلا

غزل

کج میں بیٹھا رہوں یوں پرکھلا کاشکے ہوتا قفس کا درکھلا
 ہم پکاریں اور کھلے دیوں کون جابا یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
 ہم کو ہے اس راز داری پر گمنڈ دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
 واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ زخم یکن داغ سے بہتر کھلا
 ہاتھ سے رکھ دی کب اڑنے کلاں کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا
 مُفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ رہروی میں پردہ رہ ہمبر کھلا
 سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا
 نامے کے ساتھ آگیا پیغام مرگ رہ گیا خط میری چپاتی پر کھلا

دیکھیو، غالب سے گرا بھا کوئی

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر تیرا رحمت طرازی کا خیال پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
 غامے نے پائی طبیعت سے مدد بادباں کے اٹھتے ہی ٹگر کھلا
 مدح سے مدوح کی دیکھی شکوہ یاں عرضِ صبر تیرے جو ہر کھلا
 ہر کانپا چرخ چکر کھ گیا بادشہ کا رایتِ شکر کھلا

بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علو پایہ منبر کھلا
 سکندرشہ کا ہوا ہے روشناس اب عیار آبروئے زر کھلا
 شاہ کے آگے دھرا ہے آئندہ اب گالی سی اسکندر کھلا
 ملک کے وارث کو دیکھا خلق تے اب فریب طغزل و سحر کھلا
 ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے دفتر مدح جہاں داور کھلا
 فکر اچھی پرستاشش ناتمام عجز اعجاز ستاشش گر کھلا
 جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل تم پہ اسے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تک
 ہے عظیم روز و شب کا در کھلا

(۴)

بہادر شاہ کی مدح میں

۱۔ لغات - خاور : مشرق۔

منظر : دیدہ - جھروکا۔

شرح : صبح کے وقت مشرق کا دروازہ کھل گیا، گریا ساری دنیا کو
 روشن کر دینے والے آفتاب کا دیدہ چھا ہو گیا۔

مطلب یہ کہ صبح ہو گئی اور سورج نکلنے والا ہے اور اسے ساری دنیا

دیکھے گی۔

۲۔ لغات۔ خسرو انجم : ستاروں کا بادشاہ، یعنی سورج۔

شرح : رات کو موتیوں کا خزانہ بکھرا ہوا تھا، یعنی ستارے آسمان پر جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ وہ خزانہ ستاروں کے بادشاہ نے خرچ کر ڈالا۔

مراویہ کہ سورج کے روشن ہوتے ہی ستارے غائب ہو گئے، یعنی ان کی روشنی باقی نہ رہی۔

۳۔ لغات۔ سمیا : ایک علم جس سے روح کو ایک جسم سے نکال کر دوسرے میں منتقل کر دیتے تھے اور موبوم چیزیں سامنے لے آتے تھے، اصل میں ان کا کوئی وجود نہ تھا۔

شرح : رات کو چاند اور ستاروں کا جو نظارہ آنکھوں کے سامنے تھا، صبح کو اس کا بھید کھل گیا اور معلوم ہوا کہ وہ سب کچھ تو سمیا کا کرشمہ تھا، یعنی ان کا وجود کوئی نہ تھا، لیکن ہمارے دہم نے دھوکا کھا کر انہیں حقیقت سمجھ لیا۔

۴۔ لغات۔ کو اکب : کوکب کی جمع، ستارے۔

شرح : اب ہم پر آشکارا ہو گیا کہ ستارے اصل میں کچھ ہیں، اور نظر کچھ آتے ہیں۔ گویا یہ باذکر اور بھان متی ہیں جو ہمیں دھوکا دے رہے ہیں۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ ستارے واقعی ویسے نہیں، جیسے ہمیں نظر آتے ہیں، مثلاً اکثر بے نور ہیں اور ہمیں نورانی دکھائی دیتے ہیں۔ تمام ستارے بہت ہلکے ہیں، مگر ہمیں چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ متحرک ہیں، لیکن ہمیں ساکن معلوم ہوتے ہیں۔

۵۔ شرح : رات کو ایسا معلوم ہوا تھا کہ موتیوں کا کوئی زبیر

۱۱۔ ۱۵۔ لغات : تکوین : تخلیق ، پیدا کرنا ، وجود میں لانا ۔

تاویل : شرح ، بیان ، اسلیت واضح کرنا ۔

دارا : ایران کا مشہور بادشاہ دارا گشتاسپ ۔

سرسنگ : فوج کا امیر ، کو تو ال ۔

چہرہ : علیہ ۔ پہلے بھی یہ دستور تھا (اور اب بھی ہے) کہ جب کوئی شخص فوج میں لازم رکھا جاتا ہے تو اس کا علیہ تفصیل سے لکھتے تھے ، اسے چہرہ لکھنا کہا جاتا تھا ۔

فتیصر : رومر کا بادشاہ ۔ یہ لفظ سیزر کا مترب ہے ۔ سیزر ہی کا لفظ جرمنی میں کیزر (KAISER) اور روس میں زار (CZAR) بنا اسی نے ایران میں کسریٰ کی شکل اختیار کی ۔

مشرع : کون بادشاہ ؟ روشن دل بہادر شاہ ، جس پر زندگی کا جید پورا پورا کھل گیا ہے ۔ وہ بہادر شاہ مجھے وجود میں لے آنے سے نو آسمانوں اور سات سیاروں کا مقصد واضح ہو گیا ۔ وہ بہادر شاہ ، جس کی تشریح اور حقیقت بیانی سے رسول اللہ (صلعم) کے حکموں میں سے جو باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں ، وہ آسان و روشن ہو گئیں ۔

وہ بہادر شاہ ، جس کے فوجی امینوں کا دفتر دیکھا گیا تو سب سے

پہلے دارا گشتاسپ کا نام نکلا ۔ بعض شارمین نے اسے دارا سوم سمجھا

ہے ، جو کیا نیوں کا آخری بادشاہ تھا اور جس نے سکندر سے شکست کھائی

وہ بہت معمولی بادشاہ تھا ، غالب کا اشارہ اس کی طرف نہیں ہو سکتا ۔

اسی غلط مفروضے کی بنا پر بعض اصحاب نے لکھا کہ اگلے شعر میں سکندر

جو ناچاہیے تھا تاکہ دارا اور سکندر کی مناسبت واضح ہو جاتی ۔ ظاہر ہے

کہ یہ خیال شعر کی غلط تعبیر کا نتیجہ ہے ۔ دارا گشتاسپ کو سکندر سے کوئی

مناسبت نہ تھی ۔

تھا جس کی لڑیاں ٹوٹ گئیں اور ان کے موقی آسمان کی سطح پر کبھر گئے ۔

۶۔ ۷۔ ۸۔ لغات : نگار : محبوب ۔

آتشیں رُخ : جس کے رخسار آگ کی مانند دھک رہے ہوں ،
یعنی ہنایت حسین ۔

رقیہ سحر : جادو کا اثر زائل کر دینا ۔

صبوحی : صبح کو چنے کی چیز ، جس سے رات کی پی ہوئی شراب کا
خمار زائل ہو جائے ۔

شرح : صبح کے وقت مشرق کی جانب نظر اٹھی تو آفتاب نظر
آیا ۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک ہنایت خوب صورت محبوب ہے ، جس کا سر
کھلا ہوا ہے ، یعنی اس نے کوئی چیز سر پر اوڑھ نہیں رکھی ۔

لیکن یہ تو اُس وقت کی کیفیت ہے ، جب نگاہوں پر سیمیا کے جادو
کا اثر تھا ۔ جادو کا یہ اثر زائل کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نگار آتشیں رخ نہیں
بلکہ بھول کے سے رنگ کی شراب کا بھرا ہوا پیالہ ہے ۔
ساقی نے ایک سنہری پیالہ لاکر سامنے رکھ دیا ہے تاکہ صبح کے خورد و نوش
کا انتظام ہو جائے ۔

۹۔ شرح : شاہی محفل آراستہ ہو گئی ، یعنی دربار سج گیا اور اس زمانہ
کے کعبے کا دروازہ کھل گیا ۔

ظاہر ہے کہ اس سے پیشتر کے تمام اشعار محض تمہید کے طور پر کہے
گئے ۔

۱۰۔ لغات : خسرو آفاق : زمانے کا بادشاہ یعنی بہادر شاہ ظفر ۔

مُنہ پر کھلا : زیب و زینت کا باعث ہوا ۔

شرح : زمانے کے بادشاہ نے سنہری تاج سر پر رکھا تو وہ روشن
سورج سے بھی بڑھ کر زیب و زینت کا باعث ہو گیا ۔

جہاں اس کے روشناسوں کی نمرست درج ہے، وہاں قیصر کا علیہ بھی تفصیل سے لکھ رکھا ہے۔

۱۶- ۱۷- لغات : توسن : گھوڑا۔

تھان : گھوڑا باندھنے کی جگہ۔

آذر : حضرت ابراہیمؑ کا والد یا چچا، جو شاقی بت تراش اور پتکا بُت پرست تھا۔

شرح : بادشاہ کے گھوڑے کی خوبیاں کیا بیان کروں بہ تیز رفتاری میں آندھی کو بھی اس پر رشک آتا ہے۔ جب اسے اصطبل سے کھولا جاتا ہے تو جہاں جہاں اس کے پاؤں کا نقش پڑتا ہے، ایسی دلغریب صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ دیکھنے والا سمجھے، آذر کے بُت خانے کا دروازہ کھول دیا گیا، جہاں ہر طرف نہایت خوب صورت بُت رکھے ہوئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ گھوڑا چلتا ہے تو جہاں جہاں اس کا پاؤں پڑتا ہے، ایسی خوب صورت شکلیں بنتی جاتی ہیں، جنہیں خوب صورت بتوں پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

۱۸- لغات : منصب : وظیفہ، کام

محور : وہ نرمی خط، جس پر زمین گردش کر رہی ہے اور ہر سیارے کے دائرہ گردش کو محور ہی کہتے ہیں۔

شرح : بادشاہ نے تعلیم و تربیت کے فیض سے مجھ میں صلاحیت پیدا کر دی کہ میں سورج، چاند اور سیاروں کے گھومنے کے خط کی حیثیت، وظیفہ اور کام سے آگاہ ہو گیا، یعنی مجھ پر ان چیزوں کے وظائف کی حقیقت کھل گئی۔

۱۹- ۲۰- لغات - دُوح : طاقت، مقررہ، استطاعت، دسترس

دل وابستہ، متعلق، یعنی جس پر انقباض طاری ہو، ناخوش۔

شرح : میرے دل میں لاکھوں گرمیوں پڑی ہوئی تھیں ، لیکن ہرگز کھل گئی ۔ اور اس پیمانے پر کھل کر میرے لیے اسے یوں کھولنا ممکن نہ تھا یہ بات میری دسترس سے باہر تھی ۔

حقیقت یہ ہے کہ میرا دل اس طرح منقبض ، بھتچا ہوا ، سکڑا ہوا اور ناخوش تھا کہ اسے ایسا قفل کر سکتے ہیں ، جس کی کوئی کنجی نہ تھی ۔ اب یہ کھل گیا ۔ کس نے کھولا ؟ کب کھولا ؟ کیونکر کھولا ؟

معتقد یہ ہے کہ بادشاہ نے حسن تربیت سے کھول دیا ۔
یہ استفہام سوال کی غرض سے نہیں ، تعجب اور خوشی کی غرض ہے ۔

۲۱۔ لغات ۔ کھلا : توجہ کی ، التفات کیا ۔

شرح : اگر سفور بادشاہ نے مجھے توجہ سے نوازا تو میں مسمیٰ کے بارگ کی بہار دکھاؤں گا ، یعنی ایسے شکرکوں کا کہ سننے اور پڑھنے والے کو یقین ہو جائے ، بارگ مسمیٰ میں بہار آگئی ۔

۲۲۔ لغات : طبلہ : ڈبّا ، صندوق ۔

عبر : ایک خوشبودار چیز ، جو سمندر سے نکلتی ہے ۔

شرح : جہاں میرا سانس غزل پڑھنے میں مشغول ہو ، یعنی غزل خوانی شروع کرے ، لوگ سمجھیں کہ عبر کا ڈبّا کھل گیا ہے ، جس کی خوشبو سے فنا ملک اٹھی ہے ۔

غزل

۲۳۔ لغات ۔ گنج : گوشہ ، بیاں قفس کا گوشہ مراد ہے ۔

شرح : دکتے افسوس کا مقام ہے کہ میں قفس کے گوشے میں یوں بیٹھا رہوں اور پرکھلے ہوئے ہوں ۔ کاش قفس کا درِ بچہ کھلا جوتا اور میں بارگ کی تفنا میں اٹھنے کا لطف اٹھاتا ۔

۲۲۔ شرح : اس شعر کے دو معنوم ہو سکتے ہیں ، اگرچہ کسی قدر مختلف سے کام لینا پڑتا ہے ۔

۱۔ اگر محبوب کا دروازہ کھلا پائی تو جا سکتے ہیں ، لیکن ہم دیکھیں ، گویا انتظار کریں ، پھر دروازہ کھلے ، یوں جانا ہم کیونکر گوارا کر سکتے ہیں ؟ اس معنوم سے ملتا جلتا شعر میرزا پہلے بھی کہ چکے ہیں ۔

بندگی میں بھی وہ آندوہ و خود ہیں کہ ہم
اٹھے پھر آئے ، دیکھو اگر واہ ہوا

۲۔ دوسرا معنوم زیادہ قریب قیاس ہے ۔ کہتے ہیں ، محبوب کا دروازہ کھلا پائی تو ہم کیونکر داخل ہو سکتے ہیں ؟ یہ تو بار بار عام ہوا ، اس میں ہمارے کیسے تجنیس کا کون سا پہلو ہے ؟ ہم تو اس وقت جائیں گے کہ وہاں پہنچیں ، آواز دیں ، پھر خاص ہمارے لیے دروازہ کھلے ۔

۲۵۔ شرح : ہم اپنی سادہ لوحی سے اس پر فخر کر رہے ہیں کہ دوست کا راز دل میں چھپا رکھا ہے اور کسی پر ظاہر نہیں کیا ۔ آخر یہ حال ہے کہ دوست کا راز دشمن پر آشکارا ہو چکا ہے ، یعنی خود دوست نے سب کچھ رقیب پر ظاہر کر دیا ہے ۔ پھر ہمارے لیے راز داری پر فخر کا کون سا موقع ہے ؟

۲۶۔ لغات - کھلا : باعثِ ذہنیت ہوا ۔

شرح : یقیناً محبت کا داغ دل پر بہت اچھا لگتا تھا ، لیکن محبت کا ذہم دل کے لیے اور بھی ذہنیت کا باعث بن گیا ، یعنی زخم کو داغ پر فوقیت حاصل ہے ۔

۲۷۔ شرح : میرا محبوب اس درجہ مستحکم ہے کہ اس نے ابد کی کائنات کبھی ہاتھ سے نہیں رگھی اور غم سے کی کمر سے خنجر کبھی نہیں کھولا ۔ گویا اس کے ابد اور غم سے بدستور تیرا اندازی و خنجر زنی میں سرگرم ہیں ۔

مولانا مہتابا بی فرماتے ہیں : ” ابد کو کائنات اور غم کو خنجر سے تشبیہ دینا

کرتے ہیں۔ لیکن اہرہ کو کمان دار اور غریبے کو خنجر گزار کنا زیادہ لطافت دے گیا۔

۲۸۔ لغات - بدرقہ : سفر میں مسافر کی حفاظت کرنے والا نگہبان، رہنما۔

شرح : جو بدرقہ ساتھ لے لیا تھا، راستہ چلنے میں اس کے علم و تجربہ کی حقیقت کھل گئی۔ پردہ قاش ہو گیا اور پتا چلا کہ جو خود راستہ نہیں جانتا، وہ کسی کی رہنمائی کیا کرے گا؟ لیکن مفت کا بدرقہ تھا، اس کی اجرت کچھ نہ تھی۔ ایسے شخص کو بہ طور رفیق سفر ساتھ رکھنے میں کیا برائی ہے؟

۲۹۔ شرح : آنسوؤں کی بارش دل کی جلن کا کیا علاج کر سکتی ہے حالت یہ ہے کہ اگر بختر ڈی دیر کے لیے تھمتی ہے تو آگ بھڑک اٹتی ہے۔ گویا آنسو دل کی لگی بجھا نہیں سکتے۔

۳۰۔ شرح : محبوب کا خط آ گیا، جس کا مدت سے انتظار تھا اس سے اتنی خوشی ہوئی کہ موت آ گئی۔ گویا نامہ محبوب کی انتہائی مسرت نے شادی مرگ کا سماں پیدا کر دیا۔ نامہ کھول کر پڑھنا چاہتا تھا، پڑھ نہ سکا اور دم نکل گیا۔ یوں نامہ سینے پر کھٹکا کا کھنڈارہ گیا۔

۳۱۔ شرح : دیکھو، خبردار رہو، غائب سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ دیکھنے کو کافر ہے، لیکن حقیقت میں اسے ولی کا رتبہ حاصل ہے۔ اگر اس نے جردہائی تو ہر الجھنے واسے کو خاک کر کے رکھ دے گا۔

۳۲۔ لغات - مدحمت طرازی : تعریف کرنا، مدح کرنا۔

شرح : غزل سے فارغ ہو کر پھر قصیدہ گوئی شروع ہو گئی۔ بادشاہ کی قصیدہ گوئی کی حیثیت وہی ہے، جیسے چاند اور سورج کے دفتر کھل جائیں۔ گویا بادشاہ کی مدح اصل میں چاند اور سورج کے دفتر کھلنے کے ہم معنی ہے۔

۳۳۔ شرح : قلم کو شاعر کی طبیعت سے مدد ملی، یعنی قلم اٹھایا تو

طبیعت کے سانچے سے شعر و صل حاصل کر نکلنے شروع ہو گئے۔ وہی کیفیت پیدا ہوئی کہ جہاز چلنے کے لیے بادبان کھلتے ہیں تو مگر بھی اٹھتا ہے۔

۳۴۔ لغات۔ شکوہ : جاہ و جلال۔ رتبہ۔

عرض : وہ چیز جو قیام کے لیے دوسری چیز کی محتاج ہو اچھے کپڑے کے لیے رنگ۔

جوہر : جو بالذات قائم ہو۔ شعر میں مدح۔ عرض : ہے اور جوہر : مدح
یعنی بادشاہ۔

شرح : مدح سے بادشاہ کا جاہ و جلال نمایاں ہو گیا، یعنی عرض سے یہ مکمل گیا کہ جوہر کا رتبہ کتنا بلند ہے۔

۳۵۔ لغات۔ راہیت : جھنڈا۔ علم۔

شرح : جب بادشاہ کے لشکر کا علم اٹھا اور پرچم کھلا تو سوج کا پٹ اٹھا اور آسمان چکرا گیا۔

شعر میں ایک خزانہ یہ بھی ہے کہ چرخ بہ ہر حال چکر کھاتا ہے اور سورج صبح کو نکلتا ہے تو کانپتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس لیے فارسی میں صبح کے سورج کو لرزاں کہتے ہیں۔

۳۶۔ لغات۔ مَلَو : بلند ہوا۔

شرح : خطیب نے خطبے میں بادشاہ کا نام لیا تو ملاحظہ ہو گیا کہ منبر کا پایہ کیوں بلند ہے۔ اس لیے بلند ہے کہ منبر پر کھڑا ہو کر خطیب بادشاہ کا نام لیتا ہے۔

۳۷۔ لغات۔ عیار : کوٹ، کھراکھوٹا پن و کھینا، پیانا۔

شرح : اب یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ سونے کی عزت و آبرو کا پیانا کیا ہے۔ یہ ہے کہ بادشاہ کے سکتے سے اسے روشناسی حاصل ہوتی، یعنی بادشاہ نے اسے اپنا سکڑ بنایا۔

سکتے کے لیے روشناسی دردم موزوں ہے، کیونکہ عموماً سکوں پر بادشاہ کے چہرے کی تصویر ہوتی ہے۔ اسی لیے روپے کو چہرہ شاہی کہتے تھے۔
۳۸۔ لغات۔ کمال : انجام۔

آئینے سے سکندر کی نسبت کا معاملہ اصلاً صرف اتنا ہے کہ اس نے سکندریہ میں جہازوں کی رہنمائی کے لیے ایک ادخا برج تعمیر کرا کے چاروں طرف آئینے لگائے تھے اور ان کے اندر روشنی کا انتظام کرا دیا تھا تاکہ تاریکی میں جہاز راہوں کو ہندرگاہ کا پتہ چل سکے۔ پھر شعروادب میں اس واقعے نے یہ صورت اختیار کر لی گویا آئینہ سکندر نے بنایا اور اس سے آئندہ کا حال معلوم ہو جاتا تھا، جیسے جام جمشید ہے۔

شرح : بادشاہ کے آگے آئینہ رکھا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ سکندر نے آئینہ سلاخی میں جو خست و مشقت اٹھائی تھی، اس کی عرض و غایت کیا تھی۔ یہ معنی کہ بہادر شاہ آئینہ دیکھے۔

۳۹۔ لغات۔ طغرل : بلوق سلطنت کا بانی۔ وہ خود لاؤلد تھا اور اپنے بیٹے رکن الدین ابوطالب طغرل بیگ (۶۳۰ھ - ۶۶۵ھ) حضرت الدین ابوشجاع، اب ارسلان (۶۶۵ھ - ۶۸۸ھ) کو ولی عہد بنایا تھا۔

سنجر : متوجہ الدین سنجر جو اب ارسلان کا پوتا اور جلال الدین ابوالفتح ملک شاہ کا بیٹا تھا (۶۸۸ھ - ۷۱۵ھ) یہ بلوق سلطنت کا آٹھواں اور آخری بادشاہ تھا۔

شرح : طغرل اور سنجر مزید سے ملک کے وارث بنے رہے اب خلق خدا کو معلوم ہوا کہ ملک کا اصل وارث تو بہادر شاہ تھا۔

۴۰۔ لغات : جہاں داور : بادشاہ و عالم، فرمانروائے جہاں۔
ستائش گر : مداح۔ مدح کرنے والا۔

شرح : بادشاہ و عالم کی مدح کیا ہو سکتی ہے ؟ ان کو کہہ سکتے ہیں کہ اس

کی طرح کا دفتر کھل گیا ہے۔

مرح کے سلسلے میں جو نیالات پیش کیے گئے، وہ تو یقیناً اچھے تھے، لیکن یہ ادھوری رہی، پوری نہ ہو سکی۔ اگرچہ مرح کرنے والا نہایت معجز بن تھا۔ لیکن اس کا ججز خاں سر ہو گیا، یعنی وہ مرح کا حق ادا نہ کر سکا۔

۴۲ - ۴۳ - لغات : خاتون : بڑا بادشاہ۔

خطہ لوح ازل : وہ تحریر جو دنیا کے شروع ہوتے وقت تختی پر لکھ دی گئی، یعنی خطہ تقدیر۔

صاحب قرانی : صاحب قرآن اسے کہتے ہیں، جس کی پیدائش کے وقت دو نیک ستارے ایک برج میں ہوں۔ ایسا آدمی بڑا اقبال مند سمجھا جاتا ہے۔ صاحب قرانی کا مطلب ہوا وہ حکومت، جس کی ہاگ ڈور صاحب قرآن کے ہاتھ میں ہو۔

مشرح : اسے نامور شہنشاہ : میں جانتا ہوں کہ آپ پر لوح ازل کی تحریر روشن ہے۔ آپ اس وقت تک صاحب قرآن کریں، جب تک رات دن کے ظلم کا دروازہ کھلا ہوا ہے، یعنی جب تک دنیا قائم ہے۔

سہرا

خوش ہوا اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا	تمہید :
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا	ہبادشاہ
کیا ہی اس چاند سے کمڑے پہ بھلا لگتا ہے	کے فرزند
ہے ترے حن دل اندرز کا زیور سہرا	میرزا جواں
	بخت
	جو یکم ذی قعدہ

سر پہ چڑھنا تجھے پیتا ہے پر اے طرفِ کلاہ !
 مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے تیرا لبر سہرا
 تاؤ بھر کر ہی پروٹے گئے ہوں گے موتی
 ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
 سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
 تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا
 رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ پٹکا
 ہے دگ ابر گہر بار سراسر سہرا
 یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
 رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
 جی میں اترا میں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
 چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
 جب کہ اپنے میں سادیں نہ خوشی کے مارے
 گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
 رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
 کیوں دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

کے بطن
 سے تھا۔
 کی
 شادی کے
 موقع پر
 یہ سہرا
 خود بیگم
 کی فرمائش
 پر لکھا گیا
 تھا۔ مولانا
 عرش نے
 دیوانِ غالب
 کے ساتھ
 جو حواشی
 شائع کیے
 ہیں، ان
 سے معلوم
 ہوا کہ یہ
 سہرا
 ۲۸ مارچ
 ۱۸۵۲ء
 کے دہلی
 اردو اخبارات

یہ اس تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار
 تھمید کے لئے گاتاب گراں باری گوہر سہرا
 ساتھ ساتھ ہم سخن منم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
 ہوا تھا: دیکھیں۔ کہہ دے کوئی اس سرے سے بڑھک سہرا

”عجب الحکم حضرت سلطان غلام احمد ملکہ، جو جناب نواب نجم الدولہ
 اسد اللہ خان غالب اور جناب غلامانی مہند ملک اشرف شیخ
 محمد ابراہیم خان قوٹی پر تقریب شادی میرزا جواں بہار بنت بہادر
 مرشد زادہ آفاق کے کچھ اشارہ پر سبیل مبارک بادی سہرا اس
 بخت میں حضور سلطان میں سرور بار گزارنے تھے، مع چند اشارہ
 علاوہ اس کے جو خاص نجم الدولہ بہادر نے پھر گزارنے واسطے
 حفظ کیفیت اپنے ناظرین، اہل ہنر و بصیرت و ماہرین و واقعین
 مفاہمت و بلاغت کے بموجب ترتیب در پیش ہونے کے
 ہم بھی درج اخبار کرتے ہیں۔“

صحیح یہ ہے کہ فرمائش بادشاہ کی نہیں، بلکہ کی تھی اور اس سلسلے میں
 واسطہ حکیم احسن اللہ خاں تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ سہرا سنہری کشتی
 میں رکھ کر بڑے تکلف سے گزارا گیا تھا۔ میرزا کے لیے تو یہ اہتمام ممکن
 نہ تھا۔ غالباً سہرا باندھتے وقت سنہری کشتی میں لگا کر لائے تھے۔

”سہرا“ کی روایت کے ساتھ میرزا غالب سے پیشتر کبھی کوئی نظم نہیں
 کہی گئی تھی، گویا اس صنف کے موجد وہی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے تیسرے
 دیوان میں دو سہرے ہیں اور ان کی روایت ”سہرا“ ہے۔

فتی امیر احمد صاحب علوی نے اپنی کتاب ”بہادر شاہ ظفر“ میں صرف
 ایک سہرے کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا ہے کہ یہ سہرا شہزادہ جہانگیر یا
 شہزادہ سلیم (فرزدان اکبر شاہ ثانی) کی شادی کے موقع پر کہا گیا تھا۔ یہ

بیچ نہیں، دونوں سہرے میرزا جواں بخت کی شادی پر کہے گئے تھے اور اس کی ایک سے زیادہ شہادتیں خود سہروں میں موجود ہیں۔ یہ دونوں غالبہ ذوق کے سہروں کے بعد کہے گئے۔

میرزا کے مقطع سے بادشاہ کو خیال ہوا کہ یہ ذوق پر چوٹ ہے، اس لیے ذوق سے بھی سہرا لکھوایا گیا، جس کے بعض اشعار کی کیفیت شرح کے سلسلے میں واضح ہوگی۔ میرزا کا مقطع جیسا کہ احنوں نے معذرت کے قطعے میں بیان کیا، واقعی سن گسترانہ تھا، یعنی شعرا جس طرح عموماً مقطع میں کینٹی کا دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ میرزا نے ویسے ہی کہہ دیا کہ اس سے بہتر سہرا کوئی کیا کہے گا؟ ذوق نے اسے چیلنج سمجھ کر جواب دیا اور مقطع میں اس کا اظہار بھی کر دیا۔ میرزا کے لیے کسی بھی حالت میں ذوق کو برا مقابل سمجھ لینا ممکن نہ تھا، لیکن معاملہ استادشاہ کا آپڑا تھا اور میرزا شاہی ملازم تھے، اس لیے انھیں معذرت ہی مناسب معلوم ہوئی۔

”دہلی اردو اخبار“ کی تحریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ سہرا مارچ ۱۸۵۲ء کے آخری ہفتے میں گزارا تھا۔ اور ذوق کے جوابی سہرے کے فوراً بعد میرزا غالب نے قطعہ معذرت پیش کر دیا۔

میں میرزا اور ذوق کے سہروں کا تقابل مقصود نہیں، لیکن شرح کرتے وقت سرسری طور پر چوباقی سامنے آئیں گی، وہی بیان ہوتی رہیں گی۔

۱۔ لغات - سرسہرا ہونا: کسی کام کی درستی اور سرانجام کا کسی پر موقوف ہونا۔ کسی پر کسی کام کا انحصار ہونا یا اس کے سرانجام کی عزت پانا۔

مشرح: اے نصیب! خوش رہو کہ آج ایک اہم کام کے سرانجام کی عزت تیرے حصے میں آئی۔ اس لیے اٹھ اور شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا باندھ دے۔

۲۔ شرح : سچان اللہ شہزادے کے چاند سے مکھڑے پر سہرا کتنا پسپا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سہرا شہزادے کے دل افروز حسن کا زیور ہے۔

شہزادہ حسین تو تھا ہی، جسے دیکھ کر لوگوں کے دل روشن ہو جاتے تھے۔ جب اس کے سہرا بندھا تو حسن کی شان کو چار چاند لگ گئے۔
 فوقی نے اس کے جواب میں تین شعر کہے۔ مولانا طیب لہائی فرماتے ہیں کہ غالب نے بے مثل شعر کہا تھا۔ فوقی نے جواب دیا اور خوب جواب دیا، لیکن زیور کا قافیہ غالب ہی کے حصے میں آ گیا۔

۳۔ لغات - لمبر : نمبر، درجہ۔ بقول طیب لہائی : لمبر ہی کسا ٹھیک ہے، نمبر غلط ہے۔

۱۔ شرح : اسے گوشہ کلاہ! تجھے سر پر جگہ ملی اور یقیناً تیرے لیے یہ جگہ زیادہ ہے۔ سہرا میں سر پر باندھا گیا۔ لیکن اسے گوشہ کلاہ! مجھے اب یہ ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں سہرا تیری آن بان اور شان کا درجنہ پھین لے۔
 ۴۔ لغات - کشتی : وہ کشتی غارت، جس میں کوئی چیز رکھ کر لاتے ہیں، مثلاً قیمتی زیور، پوشاک وغیرہ۔

تشریح : اگر ناؤ بھر کر موتی سہرے میں نہیں پودے گئے تو اسے کشتی میں سجا کر کیوں لائے ہیں ؟

سیرزانے اس شعر میں ناؤ اور کشتی کی رعایت پیش نظر رکھتی اور دلیل یہ دی کہ سہرا کشتی میں رکھ کر لائے ہیں۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ ناؤ بھر کر موتی رکھ لیے ہوں گے اور ان سے جن جن کے سہرا بنا دیا۔

شیخ ابراہیم فوقی نے اس شعر کے جواب میں فرمایا :

آج وہ دن ہے کہ لائے ڈیرا نجم سے فلک
 کشتی درمیں سو نو کی لگا کر سہرا

کنا یہ چاہتے تھے، آج آسان کے لیے دیا ہے کہ شادوں کے موق
چن چن کر سہرا گوندھے۔ پھر اسے ہلال کی ذریعہ کشتی میں سجا کر لائے۔ اس
میں وہی تعقید نمایاں ہے، جو اصطلاح میں تعقید قیوم ہے۔

۵۔ شرح : سہرا گوندھنے کے خیال سے ساتوں سمندروں کے
موق اکٹھے کر لیے ہوں گے۔ پھر ان میں سے نہایت خوب صورت اور سڈول
موق چن چن کر گز بھر سہرا تیار کیا ہو گا۔

ذوق نے اس کے جواب میں فرمایا :

اک گھر بھی نہیں صدکان گھر میں چھوڑا

تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

میرزا نے ساتوں سمندروں کے موق جمع کیے تھے، لیکن یہ خیال دکھا
کہ سارے موق سہرے میں گوندھے نہیں جا سکتے، اس لیے گز بھر کی قید
لگا کر واضح کر دیا کہ ان میں سے چن چن کر بہترین موق لے لیے، باقی
چھوڑ دیے، مگر ذوق نے سات کا جواب سو سے دیا، یعنی سینکڑوں کھنوں
کے گوہر اکٹھے کر لیے گئے اور وہ تمام کے تمام سہرے کی نذر کر دیے۔ یہ
خیال نہ رکھا کہ سہرے میں یہ تمام گوہر کیونکر سمائیں گے؟ بس مبالغے پر
انحصار فرمایا، گویا تم نے "سات" کے تھے، ہم "سو" کہتے ہیں۔

۶۔ شرح : دولہا کے چہرے پر گرمی سے پینا آگیا اور قطرے
پکھنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سہرا ایک قلم موق برسانے والے بادل کی رگ
بن گیا ہے۔ یعنی سہرے کے تار و یکہ کر خیال ہوتا ہے کہ بادل مسلسل
موق برسا رہا ہے۔

ذوق نے اس کے جواب میں دو شعر کہے :

دوئے فترق پہ جو میں تیرے بدستے انوار

تار و بادش سے بنا ایک سہرا سر سہرا

یعنی اسے جواں بخت! تیرے چہرہ فرخ پر انوار برس رہے ہیں اور
ان کی برسات کے تاروں سے سہرا تیار ہو گیا۔

پہلے مصرع کی سستی بندش کے علاوہ میرزا غالب ہی کا مضمون لے
کر دوسری شکل میں بامعہ دیا، البتہ پسینے کی جگہ انوار برساتے۔ گویا ایک
”دقویٰ“ چیز کو تخمینہ دقویٰ بنا دیا۔

۲ تابش حسن سے مانند شمع خورشید
رخ پر کندہ ہے تیرے منور سہرا

کنا یہ چاہتے ہیں کہ تیرے سر پر سہرا بندھا اور تیرے رخ پر نور کی
تابش حسن سے سہرے کی لڑیاں سورج کی کرنوں کی مانند منور ہو گئیں۔
شعر کی بندش میں حوالہ جاتا ہے، وہ تشریح کا محتاج نہیں۔

۳۔ تشریح : سہرے کا قبا سے آگے بڑھ جانا خلاف ادب تھا اس
لیے دامن کے برابر پہنچتے ہی وہ رک گیا۔

مطلب یہ کہ سہرا زیادہ لمبا نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ دامن سے آگے
بڑھتا تو یہ امر بے ادبی کا باعث بنتا۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ میرزا نے
حقیقت پیش نظر رکھی۔ سہرے زیادہ لمبے بنائے جائیں تو انھیں سنبھالنا
مشکل ہو جاتے۔ وہ خاص حد سے آگے نہیں بڑھاتے جاتے۔ میرزا نے
اس سے ایک پہلو پیدا کر لیا ہے کہ آگے بڑھنا خلاف ادب تھا۔

۸۔ لغات۔ مقرر : لازم، ضروری۔

تشریح : کہیں مرقی یہ سمجھ کر غرض کرنے لگیں کہ ہستی ہے تو صرت
ہماری ہے، کیونکہ ہمیں سے سہرا تو نہ چلایا گیا۔ لازم ہے کہ بھوہوں کا بھی
ایک سہرا تیار کر لیا جائے تاکہ موتیوں کے لیے اترانے کی گنجائش درجہ ہے۔
شہزادے کے لیے سہرا صرت موتیوں سے تیار کیا گیا تھا، بھوہوں
کا سہرا تھا ہی نہیں، لہذا حقیقت کے پیش نظر میرزا نے یہ نہیں کہا کہ بھوہوں

کا سہرا موجود ہے، صرف یہ کہا، ہونا چاہیے تاکہ موتیوں کا اترانا ختم ہو جائے۔
اس کے جواب میں ذوق نے خلافتِ واقع پھولوں کا سہرا تیار کر دیا اور
فرمایا :

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی باد بہار

الہا شد رے پھولوں کا معطر سہرا

پہلے مصرع میں تعقید کے علاوہ پھولوں کے سرے کا ذکر خلافتِ واقع ہے۔ عام لوگ پھولوں کا سہرا باندھتے ہیں، شہزادے نہیں۔ ان کے لیے صرف موتیوں سے سہرے تیار ہوتے ہیں۔

۹۔ **شرح :** میرزا نے اس سے پہلے شعر میں پھولوں کا سہرا ضروری بتایا تھا، چونکہ وہ موجود نہ تھا، اس لیے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ جب پھول خوشی کے مارے اپنے آپ میں سماتے ہی نہیں تو ان کا سہرا کوئی کیونکر گوندھے؟ کتنی عمدہ توجیہ ہے۔ بتا دیا کہ کیوں پھولوں کا سہرا تیار نہیں ہوا۔ اس وجہ کو موقع اور محل سے خاص مناسبت ہے۔

۱۰۔ **لغات۔** گوہرِ فلطاں : وہ بے مثال موتی، جو وضع کے حسن اور سڈول پن کے باعث کسی ہموار سطح پر پھٹ کر سکے اور لڑکھٹے ہیں۔

شرح : ایک طرف شہزادے کا رنج و دشمنی دیک رہا ہے۔ اس پر سہرے کی لڑیاں ہیں، جن میں اعلیٰ درجے کے موتی چمک رہے ہیں۔ پھر کیوں سہرا چاند اور تاروں کی بہار نہ دکھائے؟ شہزادے کے چہرے کو چاند سے اور سہرے کے موتیوں کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اس کے جواب میں ذوق نے کہا :

دونائی میں تجھے دے مر و خورشیدِ فلک

کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

دور ہے مصرع میں ”منہ“ کی تکرار مجدد و جبر نامناسب ہے اور یہاں ،

”شہ“ کے لیے ”کھول دے“ کا لفظ فوق جیسے مشتاق استاد سے تعجب انگیز ہے، جس کے و یہی معنی دہن وا کر دینے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بس وہی، مبالغے پر زور کہ میرزا نے مدد و خضر کہا تو ہم مدد و خورشید کہیں گے۔

۱۱۔ شرح : یہ دیشم کے تار نہیں، جن میں موتی پروئے گئے ہوں۔ تو اب ہمارے رنگ ہے، جس کا خاصہ یہ ہے کہ تراوش کرتی اور موتی برساتی رہے۔ گویا مسلسل موتی برستے چلے جا رہے ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آیا سہرا موتوں کے اس بارگراں کی تاب لائے گا؟ یعنی موتوں کی مسلسل بارش کا مٹل ہو سکے گا؟

۱۲۔ شرح : ہم شعر کی روح کو سمجھتے ہیں۔ غالب کی طرنداری نہیں کرتے۔ دیکھیے اس سرے سے بہتر سہرا بھی کوئی کہہ سکتا ہے؟ جیسا کہ خود میرزا نے کہا، یہ محض سخن گسترانہ بات تھی، لیکن فوق نے اسے دعوت مقابلہ سمجھا اور سہرا کہہ کر بڑے دعوے سے فرمایا:

جن کو دعویٰ ہو سخن کا، یہ سادو اُن کو
دیکھو، اس طرح سے کہتے ہیں سخنور بہرا

یہاں بحث یہ نہیں کہ سخنوری کا بلند تر مقام فوق کو حاصل ہے یا غالب کو، لیکن حقائق پیش کیے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دونوں سہروں کے درمیان موازنے میں سہولت ہوگی:

۱۔ فوق نے غالب کا سہرا سامنے رکھ کر سہرا کہا اور زیادہ تر مضامین انہیں کے لئے کر خفیف سے تغیر یا مبالغے میں اضافے کے ساتھ پیش کر دیے اور مبالغے میں حقیقت کو عموماً نظر انداز کیے رکھا۔

۲۔ غالب کے شعر صرف گیارہ ہیں، ان میں شاعری کے تمام محاسن موجود ہیں اور کوئی شعر غلاف و افح نہیں۔ فوق نے جواب میں پندرہ شعر کہے، مگر کتر اشارہ مطابق واقع ہیں۔

۳۔ ذوق کے اکثر شعروں یا مصرعوں کی بندش تعقید یا الجھاؤ کا ایسا نقشہ پیش کر رہی ہے جو ذوق جیسے شائق استاد کے لئے یقیناً محل تعجب ہے۔

۴۔ تاہم وہ کر ذوق کا دور تھا اور اکثر لوگ یا تو شعر کی حقیقت سمجھتے ہی نہیں تھے یا بہادر شاہ ظفر کی رضا ہوئی میں اسی پر واہ وا کہنے لگتے تھے، جس پر خود ظفر خوش ہوتا تھا۔

۵۔ میرزا نے جو قطعہ معذرت میں کہا، اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ذوق کا سہرا میرزا کے سہرے سے بڑھ گیا تھا یا انہیں اپنے شاعرانہ وقار میں کمی آجانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ قطعہ صرف اس لیے کنا پڑا کہ قطعہ معافی میں دقت کی مصطلحتوں کا آغا تھا ہی تھا۔

۶۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے فرمایا: ”ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں

مثنوی

آموں کی تعریف میں

ہاں دل درد مند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درخیزہ راز
نہ کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخ گل کا ہے گلشن ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے؟
نکتہ ہائے خرد منہ اٹکیے
بارے آموں کا کچھ سیاں ہو جائے
خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مرد میدان سے؟
شرو شاخ گوے و چوگاں ہے
تاک کہ جی میں کیوں رہے اراں
آم کے آگے پیش جانے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھو لے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ تاب بن گیا انگور!
یہ بھی ناچار جی کا کھوتا ہے
شرم سے پانی پانی ہوتا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ بار
جب خزاں ہو تب آئے اس کی بہار
اور دوڑا ایسے قیاس کہاں؟
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
جان شیریں میں یہ مٹاس کہاں
کوہ کن باوجود غم گینی

جان دینے میں اس کو کیتا جان
 نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
 آتش گل پہ قند کا ہے قوام
 یا یہ ہو گا کہ فرطِ رافت سے
 انگلیں کے ہر حکم ربّ الناس
 با آخِ خرنے شاخ نبات
 تب بجا ہے شرفشاں یہ نخل
 مختار بیخِ زر ایک خسرو پاس
 آم کو دیکھتا اگر اک بار
 رونق کار گاہِ برگ و نوا
 رہو راہِ خلد کا توشہ
 صاحبِ شاخِ برگ و بار ہے آم
 خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
 وہ کہ ہے دانی ولایتِ حمد
 فخر دیں عزّ شان و جاہِ ملال
 کار فرمائے دین و دولت و بخت
 سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے

پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
 کہ دوا خاثرِ ازل میں مگر
 شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
 باغبانوں نے باغِ جنت سے
 بھر کے بیجھے میں سر پہ مہر گلزار
 مدتوں تک دیا ہے آپس حیات
 ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
 رنگ کا زرو، پر کہاں بُو باس
 پھینک دیتا طلائے دست انشار
 نازش و دودمانِ آب و ہوا
 طوبیٰ و سدہ کا جگر گوشہ
 ناز پروردہ بہار ہے آم
 نویرِ نخلِ باغِ سلطان ہو
 عدل سے اُسکے ہے حمایتِ حمد
 زینتِ طہنت و جمالِ کمال
 چہرہ آرائے تاج و مند و تخت
 خلقِ پروردہ خدا کا سایہ ہے

اے مٹھیں وجود سایہ و لہجہ جب تک ہے نمونہ سایہ و لہجہ
 اس خداوند بندہ پرور کو۔ وارث گنج و تخت و انصر کو
 شاد و دل شاد و شاد ماں رکھو! اور غالب پہ سراں رکھو!

آہوں کی تعریف میں

تمہید :- یہ ثنوی، جیسا کہ آخر میں بتایا گیا ہے، میرزا غلام فخر الدین فتح الملک کے لیے کہی گئی تھی، جسے شہزادہ دارا بخت کی وفات کے بعد ولیعہد مانا گیا تھا۔ مغلستانہ میں اس کی ولیعہدی انگریزی حکومت نے منظور کی اور مغلستانہ میں اس نے وفات پائی۔ بہادر شاہ کا یہ دوسرا ولی عہد میرزا غالب کا شاگرد تھا ظاہر ہے کہ یہ ثنوی مغلستانہ اور مغلستانہ کے درمیان کہی گئی، کیونکہ شہزادے کو والی ولایت عہد کیا گیا ہے۔

۱۔ **شرح :** خبر داد جو جاؤ، میرا درد مند اور زمزمے گانے والا دل کس لیے راز کے خزانے کا دروازہ نہ کھولے ؟

اس شعر کے سلسلے میں یہ بحث چھیڑی گئی ہے کہ شعر خطابیہ ہے اور دوسرے مصرع سے پہلے ”تو“ محذوف رکھا گیا ہے۔ بہ ظاہر اسے خطاب یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں، میرزا دیکھے ہی کہتے ہیں کہ میرا درد مند دل کیوں نہ خزانہ راز کا دروازہ نہ کھولے۔

۲۔ **شرح :** کاغذ کے صفحے پر علم کا رواں ہونا ایسا ہی ہے، جیسے شاخ گل سے پھول جھرنے لگیں۔

۳۔ **شرح :** اے قلم! تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ کیا لکھنا چاہیے؟ میں کیا بتاؤں؟ لیکن موقع اور محل کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے نکتے لکھے جائیں، جن سے عقل و ہوش کی روشنی تیز تر ہو۔

۴۔ لغات - رطب فشاں : خرے ٹپکانے والا۔

مشرح : غرض آموں کی کچھ کیفیت بیان ہو جانی چاہیے اور انداز بیان ایسا ہو کہ لوگ سمجھیں، قلم خرے کا درخت ہے اور خرے ٹپکا رہا ہے۔

۵۔ لغات - گوڑے دھوگیاں : گیند، بٹا۔ اصل کھیل کا نام ہی چوگان ہی ہے اور یہ گھوڑے پر سوار ہو کر کھیلتے ہیں۔ بٹا بہت لمبا ہوتا ہے اور سوار اس سے گیند آگے بڑھاتا ہے اور انگریزی میں اسی کو پلو کہتے ہیں۔

مشرح : آم کے میدان کا مرد کون ہو سکتا ہے ؟ آم کے درخت کی شاخ بٹا اور اس کا پھل گیند ہے۔ گویا چوگان کے اس کھیل میں کوئی دوسرا پھل آم سے بازی نہیں لے جا سکتا۔

میدان اور مرد گوڑے دھوگیاں کی مناسبت سے لائے ہیں۔ آم کو گوڑے سے اور شاخ کو چوگان سے تشبیہ دی ہے۔

۶۔ لغات - تاک : انگور کی بیل، انگور۔

مشرح : انگور کے دل میں مقابلے کا ارمان سے تو آئے اور ارمان نکال لے۔ یہ گیند ہے اور یہ میدان۔

گیند سے پھر یہاں مرد آم ہے اور میدان سے میدان مقابلہ مفقود ہے۔ یعنی آم سامنے پڑا ہے۔ میدان مقابلہ آراستہ ہے۔ انگور کو حوصلہ ہے تو آئے اور قوت آزمائی کر لے۔

۷۔ لغات - جلے پھپھو لے پھوڑتا : شکایت بھری باتوں سے دل کا خباہت نکالنا۔ یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے، جب کسی کے سامنے کچھ پیش نہ ہو سکے۔

مشرح : انگور آم کا مقابلہ تاک کر سکتا ہے ؟ ہاں یہ سمجھ لیجئے کہ جلے پھپھو لے پھوڑتا ہے اور خواہ مخواہ دشمنی کا اظہار کرتا ہے، جس سے ہنر حاصل نہیں۔

۸۔ ۹۔ شرح : جب آم کے مقابلے میں انگور کچھ نہ کر سکا تو اس نے خاص شراب کی شکل اختیار کر لی۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اپنی ہستی ختم کر دی، چودہ ملا دیا اور شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

شراب اسی صورت میں بنتی ہے کہ انگور بالکل کچھ جائے اور اس کی ہستی مٹ جائے اسی کے لیے جی کا کھونا اور شرم سے پانی پانی ہونا کہا گیا اور وہ بھی تاجدار ہو کر، یعنی بھوری سے، کیونکہ اصل حالت میں آم کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ہینت بدنی اور دوسری شکل اختیار کر لی۔

۱۰۔ ۱۱۔ شرح : آپ کو کیا خبر ہے؟ مجھ سے پوچھیے کہ آم کے سامنے گن کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ دیکھیے، نہ آم کی طرح گنے میں پھول آتا ہے نہ اس کی شاخیں ہوتی ہیں، نہ آم جیسے پتے ہوتے ہیں، نہ ویسا پھل، پھر مٹت ہے کہ جب خزاں کا موسم آتا ہے تو اس کی بہار شروع ہوتی ہے۔

آخری مصرع کا مطلب یہ ہے کہ گنا اکثر بر میں پکتا ہے اور اس وقت خزاں کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ معلوم ہے کہ سرویوں ہی میں اسے پیل کر س نکالتے ہیں اور گڑ، شکر، چینی وغیرہ بناتے ہیں۔ اسی موسم میں یہ چوسا جاتا ہے یا اس کی گٹھیریاں کھاتے ہیں یا رس پیتے ہیں۔

۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ شرح : اور کہاں تھیں دوڑا ئیں؟ جان کو سب لوگ شیریں کہتے ہیں، لیکن اس میں ایسی مٹاس کہاں، جیسی عام میں ہوتی ہے۔ اگر جان میں آم کے برابر شیرینی ہوتی تو کو کبھی ایسی آسانی سے کیونکر جان دے دیتا، تاکہ اس پر ختم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور جان دے دینے میں اسے کتنا ہی حاصل ہتی، پھر ہی وہ آم جیسی میٹھی جان دے دینے پر بے تکلف آمادہ نہ ہو جاتا۔

۱۵۔ ۲۰۔ لغات - قوام : شیر۔ چاشنی۔

رافت : مہربانی۔

انگلیں : شہد۔

ربّ الناس : انسانوں کا پروردگار

شرح : مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ازل کے دورانے میں پھولوں کی آگ پر کھانڈ کا شیر تیار کیا گیا۔ اس شیرے کے تار کا نام ریشہ رکھا۔ مطلب یہ کہ یہ آم نہیں، بلکہ کھانڈ کو پھولوں کی آگ پر پکا کر چاشنی تیار کی گئی۔ وہی آم ہے اور اس چاشنی کے تار کو ریشہ سمجھو۔ اس میں خرابی یہ ہے کہ آم اور اس کے تار کی اصل ایک ہے اور وہ کھانڈ کا شیر ہے، لیکن آم شیر نہیں، بلکہ وہ جو پھولوں کی آگ پر تیار کیا گیا، یعنی بنایت لطیف و دلآویز۔

یا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ بہشت کے باغبانوں نے انتہائی مہربانی سے پروردگار کے حکم کے مطابق گلاس شہدے سے بھرے اور ان پر مہریں لگا کر دینا میں بھیج دیے۔

چونکہ آم کو شہد بھرے گلاس سے تشبیہ دی اور گلاس کا منہ کھلا ہوتا ہے، اس لیے تشبیہ کو تام بنانے کی غرض سے اسے سر بہ ہنر گلاس قرار دیا۔ یا سمجھنا چاہیے کہ حضرت خضرؑ نے کوزہ مسکری کی ایک شاخ لگائی اور مدت تک اسے آب حیات سے سینچتے رہے، یہاں تک کہ وہ شاخ درخت بنی۔ پھر اس میں پھل لگا، ورنہ آم ہمیں کیونکر نصیب ہوتے؟ ان شعروں میں بتایا گیا ہے کہ شاخ نبات مدت تک آب حیات سے سینچی باقی رہی، جب کہیں آم نیا ہوئے۔

۲۱- ۲۲- لغات : ترویج زر : سونے کا میو۔

خسرو : اس سے مراد ہے ایران کا مشہور بادشاہ خسرو پرویز جسے خسرو دوم بھی کہتے ہیں۔ یہ خسرو اذلی یعنی فوشیروان کا پوتا تھا۔ روایت ہے کہ اس کے پاس سونا تھا، جو موم کی طرح ملائم تھا اور اسے ہاتھ سے دبا کر جو چیز چاہتے تھے، بنا لیتے تھے۔ خسرو نے اس کا میو بنوایا، جو اس کے دسترخوان

پر رکھا رہتا تھا۔ اسے ترنج زر اور طلا سے دست افشار بھی کہتے تھے۔ طلائے دست افشار کے معنی ہیں، سونا جو ہاتھ سے بھیجا جا سکے۔

مشرع : خسرو پرویز کے پاس سونے کا جو ایک لمبوتر تھا اور اسے ایک نادر چیز سمجھا جاتا تھا، لیکن میرے نزدیک تو اس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ رنگ اس کا پیلا تھا اور خوشبو تھی ہی نہیں۔ اگر خسرو آدم دیکھ پاتا تو یہ ہاتھ سے دب جانے والا سونا اٹھا کر صدفیک دینا۔

رنگ زر اس لیے کہا کہ سونے کا رنگ واقعی زر ہو جاتا ہے، لیکن غالب کا اشارہ سونے کی طرف نہیں، بلکہ ترنج زر کی تحقیر کی طرف ہے، کیونکہ عام حالات میں رنگ کی زردی ضعف یا بیماری کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ بواس کی نفی کر کے ترنج زر پر آم کی فوقیت ثابت کر دی، کیونکہ اس کا رنگ بھی پک جانے پر عموماً زرد ہو جاتا ہے۔ اور اس میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔

۲۲۔ لغات۔ برگ و نوا : سرو سامان، لیکن یہاں بظاہر برگ سے مراد پتے اور نوا سے مراد مرغان چمن کی ترانہ دینیاں ہیں، گویا کار کا وہ برگ و نوا سے مراد باغ ہیں۔
دوومان : خاندان۔

مشرع : آم وہ پھل ہے جسے چمن زاروں کی رونق قرار دینا چاہیے جو درخت اور پودے پانی اور ہوا سے تربیت کے محتاج ہیں، ان کے پورے سلسلے میں آم باعث فخر و تازہ ہے۔

۲۴۔ لغات۔ طوئی : بہشت کا ایک درخت۔

سدرہ : لفظی معنی سیری، لیکن اس سے مراد سدرة المنتہی ہے جو ایسا اونچا مقام ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کوئی اس سے آگے نہیں جاسکا اور حضورؐ معراج کی رات اس مقام سے آگے گئے تھے۔
جگر گوشہ : کیچے کا کڑا۔

شرح : آم بہشت کے راستے پر چلنے والے مسافر کا نرا ویرا ہے۔
طوبیٰ اور سدرہ کے کھجے کا ٹکڑا ہے۔

پہلے مصرع کا مطلب یحزق صاحب نے یہ قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص
آم کھاتے کھاتے مر بھی جائے تو سیدھا جنت میں جائے گا۔

۲۵-۲۶۔ **شرح :** آم کا درخت خوب پھولا پھیلا اندھڑوں سے
لدا چنڈا رہتا ہے۔ گویا بہار نے اس درخت کو خاص ناز و نعمت سے پالا ہے۔
آم میں پھل تو خاص وقت ہی پر آتا ہے۔ لیکن بلاشبہ خزاں میں بھی یہ پتوں
سے خالی نہیں ہوتا۔ پتے یقیناً مہیرتے ہیں، لیکن اس طرح کہ ساتھ ساتھ پتے
نکلنے آتے ہیں اور شاخیں بدستور سبز رہتی ہیں۔

خصوصاً وہ آم جو آسانی سے ہاتھ نہیں آ سکتا اور بازار میں نہیں بیٹتا۔ وہ
سلطان یعنی شہزادے کے باغ کا نیا پھل ہے۔ سلطان سے مراد شہزادہ
ولی عہد ہے اور بادشاہ وقت کے تمام شہزادے "سلطان" ہی کہلاتے تھے،
جس طرح عام شہزادے "سلاطین" کہلاتے تھے۔

۲۶-۲۰۔ **شرح :** وہ جو ولایتِ عہد کا وافی، یعنی سلطنت کا
ولی عہد ہے اور جن کے عدل و انصاف سے زمانے کی حمایت ہو رہی ہے۔ وہ
شہزادہ فخر الدین، جس سے جاہ و جلال کی عزت و شان قائم ہے۔ وہ شہزادہ
جو حضرت کی تربیت اور کمال کا حسن و جمال ہے۔

فخر دین سے یہاں دین کا فخر بھی مراد لیا جاسکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے
کہ یہ غالب کے مدوح شہزادہ فخر الملک، عارف مرزا فخر کا اصل نام تھا، یعنی
لہام فخر الدین، اس لیے یہاں وہی مراد ہے۔

کہتے ہیں کہ لہام فخر الدین سے جاہ و جلال نے عزت، اور شان پائی، یہی
سے طبیعت کو زینت حاصل ہوئی، اسی سے کمال کو نور ملا۔

وہی دین، سلطنت اور فیضیہ کا کارفرما ہے، یعنی تینوں کے معاملات اسی

کے ذریعے سے ملے پاتے ہیں اور وہی تاج، تخت اور گدھی کے لیے رون
اور آرائش کا باعث ہے۔ یعنی یہ تینوں چیزیں اس شہزادے کی وجہ سے
خوب صورت اور دلآویز معلوم ہوتی ہیں۔ وہ شہزادہ، جس کا سایہ ہمالی
طرح مبارک سایہ ہے۔ وہ شہزادہ، جو خدا کے بندوں پر خدا کا سایہ ہے۔

۳۱ - ۳۲ - ۳۳ - یہ تینوں شعر دعائیہ ہیں۔

لغات : مفیض : فیض پہنچانے والا، فیض رساں۔

مشرح : اے سائے اور نور کے وجود کو فیض پہنچانے والے خدا

بزرگ! جب تک اس دنیا میں سائے اور نور کا وجود باقی ہے، میرے اس آقا
کو، جو اپنے غلاموں کی پرورش کر رہا ہے، خزانے، تاج اور تخت کے اثر
کو، یعنی جس کی ولی عہدی کا زمان خود بادشاہ دے چکا ہے، خوش، خوش دل اور
خوش خوش رکھنا اور تیری بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ غالب پر ہمیشہ مہربان رہے

اسی وقت، انہیں رذوق کا سہرا ملا اور شہر کی گلی گلی، کوچے کوچے میں پھیل گیا۔ میزرا
بڑے اداس بن گئے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور، ہو گیا کچھ اور، اسی وقت قطعہ لکھ
کر حضور میں گزانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔ ”مولانا کا یہ بیان بھی ان کے اکثر
بیانوں کی طرح کمتر حقیقت اور زیادہ تر سخن آرائی ہے۔“

قطعات

۱۔ بہ حضور شاہ

اے شہنشاہِ فلک منظر و بے مثل و نظیر
 اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل
 پائو سے تیرے کئے فرق ارادت، اورنگ
 فرق سے تیرے کرے کسب سعادت اکیل
 ترا اندازِ سخن، شائے زلفِ الباس م
 تری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبہ ریت
 تجھ سے عالم پہ کھلا رابطہ قربِ کلیم
 تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
 بہ سخن اوجِ دو مرتبہ معنی و لفظ
 بہ کرم، داغِ نہ ناصیہ قلزم و نیل
 تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
 تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقیل
 ماہ نے چھوڑ دیا، ثور سے جانا باہر
 زہرہ نے ترک کیا، ثوت سے کرنا تحویل

۱۔ لغات

فلک منظر:

جس کا جھڑکا آسمان پر

شبہ:

نظیر، مشابہ

عدیل: برابر، مثال

شرح

اے شہنشاہ! جس

کے بے آسمان جھڑکا

جنا ہوا ہے اور میں کا کوئی

مثیل و نظیر نہیں اور اسے

جہاں کے سلطان! جس کا

طریقہ ہی ہے کہ لوگوں

پر نوازش کرے اور جس

کا کوئی ثانی اور کوئی بدلہ نہیں۔

۲۔ لغات

فرق: سرجمتی۔

اورنگ: تخت۔

کسب: حاصل کرنا

اکھیل : تاج

شرح

تخت اپنے سر کی چوٹی
تیرے پاسے مبارک سے
نہل رہا ہے اور تیرے سر کی
چوٹی سے تاج سعادت و
نیک بختی حاصل کر رہا ہے۔

شر کی غلبی محتاج
تشریح نہیں۔ تخت پر بیٹھے
وہ اس کے پاؤں بہر حال
تخت کے سر پر ہوں گے۔
اور تاج تاجدار کے سر پر
رہے گا۔ تخت بادشاہ کی
اطاعت و فرمانبرداری کا
ظہار و اعجاز کر رہا ہے اور
تاج بادشاہ کی عزت کے
بے سر پر نہیں آیا، بلکہ اپنے
بے حصول سعادت کا موقع
سمجھ کر سر پر کیا ہے۔

۳۔ لغات :

بال جبریل :

حضرت جبریل کے بال پر

شرح :-

ترمی دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہن

ترمی بخشش، مرے اسبابِ مقاصد کی کفیل

ترا اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید

ترا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل

بخت ناساز نے چاہا کہ نہوے مجھ کو اماں

چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پچھے ڈالی بے سرشتہ اوقات میں گانٹھ

پہلے ٹھونکی ہے بن ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطہ خوفِ عظیم

کششِ دم نہیں بے ضابطہ بجزِ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہِ لقا کی داڑھی

غم گیتی سے مرا سینہ عمرو کی زنبیل

فکر میری گھرا اندوزِ اشاراتِ کثیر

کلمک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

مرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدیق توضیح

مرے اجمال سے کرتی ہے تراوشِ تفصیل

ٹیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
 جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
 قبلہ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیو
 کعبہ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل
 تیرا انداز گفتار ایسا ہے،
 جس سے ابہام کی لذت میں
 کلمی جوتی جاتی ہے، یعنی
 اسے سنوا دیا جا تا ہے اور تیرے
 قلم کی رفتار میں ہے، جیسے
 جہیز لے کے بال و پل پہنچے

۴۔ لغات۔ رابطہ: تلفیق

قربِ کلیم: حضرت موسیٰ کا قرب

اندہ: دستِ غویں

بذل: سخاوت و نوازش

تفیل: حضرت ابراہیمؑ، جنہیں خلیل اللہ کہتے ہیں۔

شرح۔ حضرت ابراہیمؑ کی ایک بڑی خصوصیت مہمانداری تھی اور حضرت موسیٰؑ کی ایک بڑی خصوصیت اللہ تعالیٰ سے ملکام ہونا، جس کی وجہ سے کلیم اللہ خطاب دیا۔ تیرے دم سے اس مذاںب میں دنیا پر یہ انگار ہوا کہ حضرت کلیم اللہؑ کو ذاتِ باری سے کتنا قرب تھا۔ تیرے ہی دم سے رو سے زمیں پر حضرت ابراہیمؑ کا دستِ فراہِ نعمت بکھا۔

مطلب یہ کہ حضرت کلیم اللہؑ کا قُرب اور حضرت ابراہیمؑ کا بذل، دونوں جو بیوں کا پر تو، تیرے اندر موجود ہے۔

۵۔ لغات۔ سخن: گفتگو، شعروں۔

ادجِ قرہ: ہندی دینے والا۔

ناصیہ: پیشانی

شرح۔ بادشاہ گفتگو اور شعرو سخن کے ذریعے سے معنی و لفظ کے درجے کو ہندی دینے والا ہے اور اس کا شیوہ کرم ایسا ہے، جو بل جیسے دریا اور قلم جیسے سمندر کی پیشانی پر بھی داغ لگا دیتا ہے۔

۷۔ ۷۔ لغات - توفیر: زیادتی، افراط۔

تقلیل: کم کرنا، کمی، قلت۔

ثور: مراد ہے بڑی ثور جس کی شکل بیل سی تجربہ کی گئی ہے۔

خوت: مراد ہے بڑی خوت، جس کی شکل بیل کی سی تجربہ کی گئی ہے۔

تجربیل: پھرنا، حواس کرنا۔

بیست دانوں کے نزدیک چاند بڑی ثور میں ہو تو عیش و طرب کی دلیل ہے اور زہرہ بڑی

خوت میں ہو تو رخ و غم میں کمی آجاتی ہے

شرح - چاند نے بڑی ثور سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ زہرہ نے بڑی خوت میں پہنچ کر

پھرنا ترک کر دیا۔ یہ اس لیے کیا کہ اسے شہنشاہ! تیرے وقت میں عیش و طرب بہت زیادہ۔

ہو جائے اور تیرے عہد کے اندر رخ و غم میں کمی آجائے۔

۸۔ لغات - مفاسد: مفسدہ کی جمع، غریباں اور غلیظاں۔

رہیں: گیزو، مٹوں۔

انجاش: پورا ہونا۔

کیفیل: قدر واری اٹھانے والا۔

شرح - اسے بادشاہ! حیرت و عقل و دانش میری خرابیوں اور کوتاہیوں کو دوست

کرنے کی غماص ہے اور تیری بخشش میرے مفاسد پر سے کرنے کی ذمہ دار بنی ہوئی ہے

۹۔ لغات - اقبال: توجہ، رخ، اوقات۔

شرح - تیرے دم و دم کی بدولت مجھے جینے کی خوشخبری ملی رہی ہے، اگر تو خلاص اختیار

کرے تو وہ میرے مر جانے کی دلیل بن جائے گا، یہی تیرے دم و دم پر زندہ ہوں اور تو

میرے پر دانی اختیار کرے تو مر جاؤں گا۔

۱۰۔ ۱۱۔ شرح - جس نیچے کو مجھ سے موافقت نہیں، اس کی خواہش سختی کہ مجھے امن و امان

حاصل ہو۔ نیز صی حال پہلنے والے آسمان نے مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

پچھ میرے ناخن تمہارے جڑ میں کیل عطرک دی، پھر اوقات کے دھاگے میں گانٹھ لٹائی

مطلب یہ کہ ادوات کے دھالے کی گانٹھ تدبیر کے ماتن ہی سے کھولی جاسکتی تھی، کیسے
 جب ماتن تدبیر کو بیکار کر دیا گیا تو اس گانٹھ کے کھولنے کی کون سی صورت باقی رہی؟
 ۱۲۔ لغات۔ بحر الثقیل : لغوی معنی، ہماری چیزوں کو کھینچنا۔ وہ علم یا آکر جس کے
 ذریعے سے ہماری چیزیں بہ آسانی اوپر کھینچی جاتی ہیں۔ آج کل ریٹوں اور بٹوں کے لیے اس قسم
 کے آسے بکثرت استعمال ہوتے ہیں

شرح۔ دل میں جو تپش واضطراب ہے وہ ایک جڑے ثوت سے بے تعلق
 نہیں۔ یعنی اس ثوت ہی کا نتیجہ ہے۔ میرے لیے سائنس لینا یا کھینچنا علم بحر الثقیل کے قاعدے
 سے کام لے کر بغیر ممکن نہیں، گویا میرے پھر سائنس لینا بھد شکل ہے۔
 ۱۳۔ لغات۔ لغات : داستان امیر حمزہؑ کے ایک مشہور کردار جس کی ٹاڑھی میں موتی،
 پلانے، بہتے تھے۔

غمر : مولانا طہطاہانی نے یہ نام آخر لکھا ہے اور فرماتے ہیں کہ غمر غالب
 نے یونہی لکھا تھا تا کہ حضرت غمرؑ سے انتباس نہ ہو۔ غرض صاحب نے اپنے دیوان میں غمر دین
 الغمر لکھا ہے۔ داستان امیر حمزہؑ غمر تا پا افشار ہے، لیکن اس کے بعض کرداروں کے نام
 ایسے رکھے گئے ہیں جو حقیقت میں موجود تھے۔ مثلاً غمر بن ابیہ زمری، جسے داستان گروں نے
 غمر میار بنا دیا۔

زنبیل : چری جھولی کہا جاتا ہے کہ غمر کی زنبیل ایسی تھی جس میں سب
 کچھ بھرا ہوا تھا۔

شرح۔ معانی کے موتیوں سے میرے کاغذ کا صفحہ ہاکی ٹاڑھی معلوم ہوتا ہے،
 یعنی جس طرح ہاکی ٹاڑھی میں موتی پرہنے بہتے تھے، اسی طرح میں بو شعر کہتا ہوں، وہ موتیوں
 کی لڑیاں ہوتی ہیں۔

زمانے کے لٹخ عالم سے میرا سینہ غمر کی چری جھولی بنا ہوا ہے، مطلب یہ کہ ساری
 دنیا کے غم میرے سینے میں جمع ہیں

۱۴۔ لغات۔ گہرا اندوز : موتی جمع کرنے والا، موتی روہنے والا۔

شرح - میری فکر بہت سے افرادوں کے موتی روحانی ہے اور میرا تم مختصر،
باز میں لکھنا سکھاتا ہے

مراد یہ ہے کہ میں سوچتا ہوں تو کثیر اشارے موتیوں کی شکل میں میرے سامنے آ جاتے
ہیں، لیکن لکھتا ہوں تو کم الفاظ میں مطلب پیش کر دیتا ہوں۔ کثیر اشاروں سے آپ پوری،
کیسیت سمجھ سکتے ہیں

۱۵۔ لغات۔ ابہام : اس طرح بیان کرنا کہ وضاحت نہ ہو مختصر الفاظ میں،
غیر واضح طریق پر بات کہنا۔

اجمال : اختصار۔

تراوش : چکاؤ، چکنا۔

شرح - میں کل سول طریق پر بھی بات ایسے انداز میں کرتا ہوں، جن پر وضاحت قراب
ہوتی ہے میرے اختصار کے تفصیل خود بخود ملتی ہے۔ یعنی میں سرسری طور پر بھی کہے کہ وہی خود بخود
ہے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ میں اختصار سے بھی بات کروں، تو جتنی تفصیل حقیقتہً،
مطلوب ہے وہ اس میں آ جاتی ہے۔

۱۶۔ لغات۔ تعجیل : جلدی، جلدی کرنا۔

شرح - اگر میری حالت اچھی ہوتی تو حضور کو تکلیف دینا گوارا نہ کرتا۔ اگر میری
ظاہر میں ہوتی تو جلدی نہ کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حالت نہایت خراب ہے اور تکلیف دینا ناگزیر ہو گیا۔ سخت پردہ شامی
ہوں اس لیے جلدی کرنی پڑی۔

۱۷۔ لغات۔ خستہ نوازی : بد حال پر نوازش۔

شرح - اسے کون و مکان کی قبل گاہ، خستہ و بد حال پر لطف و نوازش میں اتنی دہرا
یہ تو مناسب نہیں۔

اسے اس دایاں کے کچے، مشکل آسان کرنے میں اتنی تھیل؟

مولانا ملایا کہاں فرماتے ہیں، عقوہ کشائی سے ڈھیل دینے کو اس قدر مناسب ہے کہ

تقریباً نہیں ہو سکتی۔ یہ سچ ہے کہ یہ ڈھیل دیکھ کر نہیں کھل سکتی لیکن اس قدر ڈھیل
کوئی دیتا ہے ؟

۲۔ بہ حضورِ شاہ

اے جہاندارِ آفتابِ آثار !	اے شہنشاہِ آسماں اور نگ
تھامیں اک بے نواے گوشہ نشین	تھامیں اک بے نواے گوشہ نشین
ہوئی میری وہ گرمی بازار	تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
روشناسِ ثوابت و ستید	کہ ہوا مجھ سا فزہ ناپحیز
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار	گر چہ از روئے نگ بے ہنری
جاننا ہوں کہ آتے خاک کو عار	کہ اگر اپنے کو کہوں خاکی
بادشہ کا غلامِ کار گزار	شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار	خانہ زاد اور مرید اور مداح
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار	بارے نوکر بھی ہو گیا، صد شکر

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں

مدعاۓ ضروری الاظہار

پیرو مرشد ! اگرچہ مجھ کو نہیں فوقِ آرائش سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر تانہ دے باوز مہریر آزار
 کیوں نہ درکار ہو مجھے پوش؟ جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
 کچھ خریدنا نہیں ہے اب کس سال کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
 رات کو آگ اور دن کو دھوپ بھاڑ میں جاتیں ایسے لیل و نہار
 آگ تا پے کہاں تک انسان دھوپ کھائے کہاں تک جاندار

دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی

وقتنا ربتنا عذاب النار

مری تنخواہ جو مقرر ہے اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجاہ
 رزم ہے مُردے کی چھ ماہی لیک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
 مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
 بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار

مری تنخواہ میں تھائی کا

ہو گیا ہے شریک سا ہو کار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعر نغز گوے خوش گفتار
 رزم کی داستان گر سنیے ہے زباں میری تیغ جو ہوار

بزم کا التزام گر کیجئے ہے قلم میری، ابرِ گوہر بار

ظلم ہے، اگر نہ دوسخن کی داد

قہر ہے، اگر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا؟ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھا؟

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ تانہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار

ختم کرتا ہوں اب دُعا پر کلام شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تمہید۔ - مجھے سے مرزا کا سلسلہ ملازمتِ ششہ کے وسط میں شروع ہوا تھا۔

تاریخ نگاری کی خدمت سپرد ہوئی تھی۔ ملازمینِ نقد کو چھ چھ مہینے کی تنخواہیں اکٹھی ملتی تھیں مرزا، اپنے ایک خط (مرفورم ۲۔ جنوری ۱۹۳۷ء) میں منشی نبی بخش فیر کو لکھتے ہیں۔

اب چھ مہینے پورے ہو چکے، ۲۔ جولائی سے دیکر

۱۵۔ دیک، اب میں دیکھوں کہ ششہ ہر مہینے

کب ملتا ہے۔ بعد اس کے مٹنے کے اگر آئندہ

ماہ بہ ماہ کروں گے تو میں لکھوں گا، ورنہ اس

خدمت کو میرا سلام ہے۔ ابھی باہر کا حال حضور

میں نہیں پچھا، کل سورہ تمام ہوا ہے صاف جود

ہے۔ اب صاف کر کر دے دوں گا اور ماہ بہ ماہ

کی استدعا کروں گا۔ چھاہی آخر ہونے کو تھی

اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۹ء کے اواخر میں یہ قطعہ باہر کے حالات کے ساتھ
یا چند روز آگے پیچھے پیش ہوا ہوگا اور یقین ہے کہ بادشاہ نے مرزا کی درخواست منظور کرتے
ہوئے تنخواہ ماہ بہ ماہ ادا ہونے کا حکم دے دیا۔ اسی سے مرزا نے تاریخ نگاری کا کام
جاری رکھا اور مزید شکایت کا کوئی شرع نہیں رہا۔

۱۔ لغات - اورنگ : تخت ۔

شرح - اسے بادشاہ احسن کے تخت کو آسمان کی سی بندی حاصل ہے۔ اور
اسے جہاں کا انتظام کرنے والے اور آفتاب کے سے نشان رکھنے والا ہے :

۲۔ ۳۔ ۴۔ لغات - روشناس : صورت پہچاننے والا ، واقع ۔

ثابت و ستار : پرانے ہیئت و افوں نے ستاروں کی دو قسمیں
کی تھیں ، ایک ثابت ، یعنی ٹھہرے ہوئے ، دوسرے ستار ، یعنی پھلنے اور سیو گردش کرنے والے
شرح - میں ایک بے سرو سامان گوشہ نشین تھا۔ ایسا دروند تھا جس کا سینہ
زخمی تھا۔ آپ نے میری آبرورہائی اس سے میری زندگی میں ایسی رونق ہوئی اور میں نے
وہ عزت و شہرت پائی کہ مجھ ایسے نابینا ذہن کو آسمان کے ٹھہرے ہوئے اور گردش کرنے والے
ستاروں سے بھی جان پہچان ہو گئی

۵۔ ۱۔ لغات - مشفق : تشخیص کیا گیا ، متین ، مستم

شرح - اگرچہ میں بالکل بے خبر ہوں اور اس تنگ کے باعث خود اپنی نظروں
میں اتنا ذلیل و خوار ہوں کہ اگر میں اپنے آپ کو خفا کی کہوں تو جانتا ہوں کہ خفاک اس نسبت کو اپنے
پے باعث تنگ سمجھے۔ تاہم دل میں خوش ہوں کہ مجھے بادشاہ کا کار گزار قلام ہونے کا فخر حاصل
ہے۔ درخواست گزار یعنی میں ہیبت سے غارت و غلام ، مرید اور تاج پہا تھا۔ اب شکر کا مقام
ہے کہ لوگ بھی ہو گیا۔ اس طرح چار نسبتیں مسلم ہو گئیں۔ یعنی غارت و غلام ، مرید ، تاج اور لوگ۔ اب
آپ فرمائیں کہ میں مقصد کا اظہار ضروری ہو ، وہ آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں ؟

۱۱۔ ۱۔ لغات۔ باوزمریہ : نہایت سرد ہوا۔

وقتنا رہتا عذاب القار : اسے ہمارے پروردگار ! ہمیں آگ

کے عذاب سے بچا۔

شرح۔ پیر و مرشد ! اگرچہ مجھے سر پر دستار سہانے کا کوئی ذوق نہیں، یعنی میں کمالش نہیں چاہتا، لیکن جاننے کا موسم ہے، آخر کوئی مذکوئی چیز تو ہونی چاہیے، مجھے حدود پر سوار ہوا کے دکھ پہنچانے سے بچانے۔ اگرچہ میرا جسم بہت ڈبلا اور خفیت ہے۔ لیکن غور فرمائیے کر کیا اسے لباسِ درکار نہیں؟ اس سال کچھ نہیں خریدا اور اب کے کوئی کچرا نہیں بنایا۔ حالت یہ ہے کہ رات کو آگ تلپاتا ہوں، دن کو دھوپ کھاتا ہوں۔ ایسے رات دن کو آگ لگے۔ خود سوچئے کہ انسان کہاں تک آگ تلپ کر گزارہ کرے اور جاندار کب تک دھوپ کھائے؟ دھوپ کی تیزی اور آگ کی گرمی دیکھ کر بے اختیار یہ کلام زبان پر جاری ہو جاتا ہے: اسے ہمارے پروردگار ! ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

۱۸۔ ۲۲۔ لغات۔ رنجبار : طریقہ، تاعدہ، روش۔ شیوہ۔

چھو رہا ہی : فاتح اور کھانا جو کس کے مرنے کے بعد پھٹے،

ہینے ہوتا ہے۔

تکرار : دہرانا، بحث، جھگڑا، میاں مراد سود و رسود کے

ہے، یعنی سود بار بار دوگنا ہوتا رہتا ہے۔

شرح۔ میری تنخواہ، جو حضور نے مقرر فرمائی ہے، اس کے ملنے کا طریق بڑا عجیب ہے۔ چھ ہینے کے بعد فردے کی رسم ادا کی جاتی ہے اور لوگوں نے اس رسم کو پتا دستور بنایا ہے۔ اب مجھ پر نظر ڈالئے میں زندگی کی قید میں ہوں، کھانے پینے اور دوسری ضرورتوں کے لیے خرچ چاہیے۔ چھ ماہی سال میں دو مرتبہ جوتی ہے۔ مادہ خرق کیونکر پورا ہو؟ حیات کے ساتھ حقید کے لفظ سے واضح کر دیا کہ زندگی میری مرضی اور غرضی کے مطابق نہیں گزر رہی۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ میں اس کی قید میں ہوں اور چار و ناچار مجھے بغیر چارہ نہیں۔

ہر مینے مجھے قرض لے کر گزارہ کرنا پڑا ہے اور قرض پر سود برابر بڑھتا رہتا ہے ۔
 کیونکہ ساہوکار ہر مینے سود و سود پر عمل کرتا ہے ۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چھ مینے میں سود و سود
 کے باعث تنخواہ کی تنہائی رقم سود میں دینی پڑتی ہے گویا میری تنخواہ میں ایک تنہائی کا ،
 حق دار ساہوکار بن گیا ۔

۲۳-۲۵۔ لغات۔ نغز گو : منہایت شگفتہ و دلآویز شعر کہنے والا ۔

التمزام : لازم بنانا ، اہتمام ۔

شرح ۔ آج اس دور میں ایسا شاعر موجود نہیں ، جو میری طرح شگفتہ و دلآویز
 شعر کہ سکے اور شیریں بیانی سے کام لے سکے ۔ زندگی کے مشاطے کی دو جڑی تقسیمیں
 کی گئی ہیں : رزم اور بزم ، یعنی نوائیاں اور محل آرائی ۔ آپ رزم کی داستان سنیں تو میری
 زبان جو ہر وار تنوار کا کام دے گی اور میعاد جنگ کے حالات اس خوبی سے بیان کرے گی کہ اس
 سے بہتر ممکن نہ ہو ۔ اگر بزم کا ذکر لازم کر لیا جائے تو میرا نظم موتی بر سانسے والا بادل بن جائے
 گا اور جشن نشاط کا سماں باندھ دے گا ۔

۲۶-۲۸۔ شرح ۔ اگر میری شعر گوئی کی داد نہ دیں تو یہ طریقہ انصاف سے بعید ہو گا
 اور اگر غیب سے ہیار نہ کریں تو اسے قہر کھنا چاہیے ۔ میں آپ کا غلام ہو کر یوں شکا پہوں
 اور آپ کا نوکر ہو کر اڈھار کھاؤں ؟ حکم دیجیے کہ میری تنخواہ ہر مینے ادا ہوتی ہے تاکہ زندگی
 میرے لیے دشوار نہ رہے ۔

۲۹-۳۰۔ شرح ۔ اب میں یہ قطعہ دعا پر ختم کرتا ہوں ۔ اس بارے میں مجھے شعر گوئی
 سے کچھ سروکار نہیں ، صرف اپنا حال نادر و اسخ کرنا چاہتا ہوں ۔ آپ ہزار برس
 سلامت رہیں اور برس بھی ایسے کہ ہر ایک کے دل تین سو پینسٹھ کے بجائے
 پچاس ہزار ہوں ۔

۲۔ مدح شاہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاں دار ۱۔ شرح:

اے بادشاہ! جو
جہاں کو فتح کرینے والا
جہاں بخش دینے والا
اور جہاں کا انتظام کرنے
والا ہے، تیرے لیے
ممکن ہے کہ خضر سکندر سے ترا ذکر
گراں کو نہ دے چشمہٴ حیاں سے طہارت
سو خوشخبریاں ہیں۔

۲۔ شرح:

آصف کو سلیمان کی وزارت سے شرفِ مہتا
ہے فخرِ سلیمان جو کرے تیری وزارت
اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق
عطا کی ہے کہ اس گروہ
کو بعض اشارے سے
کھول کر رکھ دے۔

۳۔ شرح:

تو آگ سے گر رنج کرے، طاقتِ سیلاب
کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت
خضر سکندر سے تیرا
ڈھونڈے نہ ملے موجدِ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے، سو رکھ دے، گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں تو غسل
 کریں! یعنی تیرا نام ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
 ہوں کو پاک کیے بغیر۔ کیونکہ نہ کروں مدح کو میں ختم دُعا پر
 ۳۔ لغات: قاصر ہے تائش میں تری، میری عبارت
 آصف:

حضرت سیما کا ذکر۔ نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
 شرح: نگار کی صنعتِ حق اہل بصارت
 اس کو حضرت سیما
 کی وزارت سے بڑی تجھ کو شرفِ مہر جہاں تابِ مبارک
 لی اور اس نے رتہ
 غالب کو ترے عقبہ عالی کی زیارت
 علی پایا۔ اسے بادشاہ
 جو فرد تیری طرف سے وزارت پر نامور ہو، وہ فخر سیما ہی بن جائے گا۔

مصحف کے ایک صفحے پر بھی جو نکتے کہ حضرت سیما تیری وزارت کریں تو ہے
 ان کیلئے فخر کا باعث ہو۔ ہمارے شاعر مدح و ستائش میں عموماً صود کا خیال نہیں رکھتے۔
 ۵۔ لغات: نقش: مہر، قرع۔ نقشِ مریدی کا مطلب ہے جہ کہ منقش
 بادشاہوں نے پیری مریدی سلسلہ بھی جاری کر دیا تھا، اسی لیے بادشاہ کو پیر و مرشد
 بھی کہا جاتا تھا اور لوگ باقاعدہ ان کے مرید ہوتے تھے۔

توقیع: وہ کاغذ، جس پر شاہی دستخط ہوں، فرمایا
 شرح: جس شخص کے پاس تیری مریدی کی قرع ہو، سمجھنا چاہیے کہ اسے
 اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے حکم مل گیا، یعنی تُو دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب و خلیفہ ہے کسی
 فرد کی پیشانی پر تیری خطی کے داغ کو امیری اور حکمرانی کا درجہ حاصل ہے۔
 ۶۔ لغات: سلب: بھیٹنا، کچھ لینا، نہی کر دینا۔

سیلان : بنبا ، روانی

شرارت : شطرنج ہونا ، بھڑکانا۔

شرح : اگر تو پانی سے بہاؤ کی قوت چھین لے اور آگ سے بھڑکنے کی
خصلت نائل کر دے تو دریا کی موجوں میں بہاؤ ڈھونڈنے سے ڈھے اور جتنی ہوئی
آگ میں حرارت باقی نہ رہے۔

۸-۹۔ لغات : تَوَفُّلٌ : اٹھناک ، دھنسن ، بشفویت۔

قاصر : قصور دار ، عاجز۔

شرح : اگرچہ نکتے بیان کرنے میں مجھے کمال اٹھناک ہے اور جاہوریاتی میں
پردہ می مہارت رکھتا ہوں ، لیکن اسے بادشاہ امیراؤغیرہ الفاظ تیری تفسیر کا حق اس
نہیں کر سکتا ، اس لیے کیلائے میں صبح کو دعا پر ختم کروں ؟

۱۰۔ لغات : نظارگی : دیکھنے والا ، تماشائی۔

شرح :- آج نوروز ہے اور یہ ایسا دن ہے کہ آنکھوں والے خدا کی کارسازیاں
کا نظارہ کر رہے ہیں۔

نوروز : یہ تقریب آفتاب کے برج حمل میں داخل ہونے
پر منائی جاتی تھی اور غور مرزا نے اس بارے میں لکھا کہ موٹی بات یہ ہے ، یہ داخلہ
۲۲ مارچ کو ہوتا ہے اور کسی ۱۱ مارچ اور ۲۲ کو بھی اس سے تباہاؤ نہیں۔

۱۱۔ لغات : تختہ : آستانہ ، دبیز۔

شرح :- برج حمل میں آفتاب کے داخلے ہی کی بنا پر کہا کہ اسے بادشاہ !
تجے دنیا کو روشن کر دینے والے سورج کی سی ہندی و برتری حاصل ہو اور غائب کر
تیرے اپنے آستانے کی دیارت کا شرف نصیب رہے۔

۴۔ تقریب چار شنبہ صفر

تفسیر:-
 ماہ صفر شنبہ کے
 آخری چار شنبہ کو
 حضرت رسول اکرم
 (ﷺ) بیمار ہوئے
 تھے۔ مسلمانوں نے
 یہ دن دعا و استغفار
 اور صدقہ و خیرات
 کے لیے مقرر کر
 لیا۔ پہلے جلسہ ہائے
 وعظ ہونے لگے،
 پھر دوسری زمینیں
 شروع ہو گئیں۔ لال
 قلعہ میں اس روز
 سونے چاندی کے پھلے بٹھائے گئے۔

ہے چار شنبہ، آخر ماہ صفر چلو
 رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند
 جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست
 سبزے کو روند تا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند
 غالب! یہ کیا بیاں ہے، بجز مدح بادشاہ
 بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند
 بٹھتے ہیں سونے روپے کے چھتے حصوڑ میں
 ہے جن کے آگے سیم وزیر، مہر و ماہ ماند
 یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
 لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

خاص شکاف نے بھی یہ تقریب دیکھی تھی۔ وہ اپنے روزنامے میں اس
 کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے: بادشاہ باغ حیات بخش میں گئے۔ ایک ہنڈیا میں اشرفی
 ڈال اور اسے پاؤں کے رباؤ سے توڑا۔ پھر گھاس کو روندنا۔ بعد ازاں دیوانہ
 میں دوبارہ کاسا مان ہوا۔ ہر خانہ شاہی سے کشتی میں چھتے آئے۔ بادشاہ نے پانچ

خورچہ بنے ، پندرہ بیگم زینت محل کو دیے ، پانچ پانچ دوسری بیگمات کو ، سات گوردنجنوں کو ، پانچ اس کی میم کو ، پچھٹن گوردن آگرہ کو ، انجنٹ کو پانچ انجنٹ کے اور پانچ خطاب فرزندہ کے ، کپتان تلہ کو پانچ پتانی کے اور چار سکرٹری شپ کے ، ایک سورج نرائی کو اور ایک حکیم حسن اللہ خاں کو ۔

فرزین یہ تقریب اس طرح ہر سال منائی جاتی تھیں ۔ اسی پر کسی وقت یہ شعر کہے گئے ، جن میں رقم کے بمعنی پہلوں کا ذکر بھی آگیا ہے ۔

۱۔ لفات :- نانہ ؛ بہت بڑا کوٹھا ، مٹی کا بہت بڑا برتن ۔

شرح ؛ اہ صفر کا آخری بدھ ہے ۔ چلو ، ایک بڑا برتن مشک ہمیں ، خوشبو والی شراب سے بھر کر باغ میں رکھ دیں ۔

۲۔ شرح ؛ تاکر کو بھی آئے ، ہام بھر بھر کر پیئے اور مست ہو کر بڑے کو دھنکا پھرے ۔ پھولوں کو لاگ جانے ، یعنی ان پر پاؤں نہ پڑنے دے ۔

۳۔ شرح ؛ اسے غائب ؛ تو یہ کیا کہنا ہے ، اب تو مجھے بادشاہ کی مدح کے سوا کوئی کہنا چڑھتا پسند ہی نہیں آتا ۔

۴۔ شرح ؛ دیکھ ؛ بادشاہ کے حضور میں سونے چاندی کے چھلے جلتے ہیں ، ابھی کی چمک دمک کے سامنے سورج کی چاندی اور چاند کا سونا بھی مانتے ہے ۔

۵۔ شرح ؛ یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ چھتے نہیں ، بلکہ لاکھوں سورج اور بیسٹار چاند درمیان سے غالی کر دیے گئے ہیں ۔

۵۔ مدح نصرت الملک

نصرت الملک بہادر ! تجھے بتلا کہ مجھے ؟ ۱۔ شرح ؛
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
بہادر ! مجھے یہ

بتا کر تیرے ساتھ ہے گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
 جو اس قدر ارادت ہے رونق بزمِ مہر تری ذات سے ہے
 تو کس دہرے ہے؟ اور میں وہ ہوں کہ گرجی میں کبھی غور کروں
 مطلب یہ کہ محض افہام و اکلام، غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
 سے تو ایسے دل اور رومانی ارادت پیدا نہیں ہو سکتی، یقیناً
 اس کا سبب ذاتی محبت و عقیدت ہے ہاتھ میں تیرے رہے تو سن دولت کی عناں
 جو سرا سرا غلام ہے یہ پید دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے
 مینی ہے۔ مولا بلبل اللہ تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملتا تیرا
 بالکل بجا فرماتے ہیں گو شرفِ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
 کہ اس مقامِ پاستخام و استعجاب میں نہایت اس پہ گزریں نگاہیں ریو وریا کا زہر
 باعث ہے، جس غالب خاک نشین، اہلِ خرابات سے ہے
 سے ایسے معانی جلیل پیدا ہوئے، یعنی محض سوال ہی سے یہ واضح کر دیا گیا کہ اس ارادت کا تعلق
 دل اور روح سے ہے۔

۲-۳۔ لغات : اوقات : دوسرے معانی کے علاوہ حیثیت، مہا ط
 استطاعت یا مقدر۔

شرح : حقیقت یہ ہے کہ اگر ٹوہنگامہ پیا کرے اور جاہ و جلال دکھائے

تو سارے جہان پر روشنی ہو جائے کہ چاند سورج کی فصل یعنی پردی کائنات میں رونق
عزت تیری بدولت ہے اور میں وہ ہوں کہ دل میں سرحد تو غیر ایک طرف رہا،
خود مجھے اپنی ہیئت و بساط سے عزت پیدا ہوتی ہے۔

مطلب یہ، تو اتنا عالی مقام ہے کہ چاند سورج بھی اپنی ہدم کی رونق کے
یہ تیرے محتاج ہیں اور میں اتنا حقیر ہوں کہ اپنی ذات سے بھی عزت ہوتی ہے۔
سم۔ لغات : سر و دست : اس وقت، فی الحال۔

شرح : اگرچہ تو چاند سورج کی انہیں کے یہ رونق افزا ہے اور
میں بالکل بے حقیقت ہوں، لیکن غفلت کا مہلک ہو، جس کے سبب سے میرے دل
کو تیرے ہاتھ کے ساتھ ایک گوند نسبت پیدا ہو گئی ہے۔

اس نسبت کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں، مثلاً :

۱۔ جو ہاتھ دشمنوں کا خون بہاتا ہے۔ وہی ہتھ دلوں کے لیے سرم کا

سامان کر دیتا ہے۔

۲۔ ہتھ دلوں پر نوازش میں ہاتھ کا کام ہے، اس سے نسبت پیدا ہو جاتا

کسی قشریج کا محتاج نہیں۔

۳۔ سمجھا جاتا ہے کہ مدوح کا ایک ہاتھ دشمنی تھا، اسی لیے مرزا نے،

اپنے ہتھ دل اور مدوح کے ہتھ ہاتھ کے درمیان نسبت پیدا کی اور اس سلسلے
میں گفت سے لفظ ”سر و دست“ لائے

چونکہ مدوح کی شخصیت اس وقت تک پردی طرح واضح نہیں ہو سکی، اس

یہ آخری مطلب کے متعلق یقینی طور پر کہہنا مشکل ہے بعض اوقات خیال چڑتا
ہے کہ شاید یہ صاحب فترخ آباد کے نوادر میں سے کوئی ہے۔

۵۔ لغات : توسن : گھوڑا

تھا یعنی حاجات : ضرورتیں پردی کرنے والا

خدا سے قادر و توانا۔

شرح : میں صبح و شام خدا سے تامل و تواتر سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ ملک کے گھوڑے کی باگ تیرے ہاتھ میں رہے ۔

۴۔ **شرح :** میں تجھے اپنا سکندر ماننے بیٹھا ہوں اور تجھ سے ملنے کو باعثِ فخر سمجھتا ہوں ، اگرچہ مجھے خضر کی ملاقات سے بھی شرف حاصل ہے ۔

مطلب یہ کہ میرا علمی فوقِ علم و عرفان کے پیکر حضرت خضر سے بھی امتیاز کرتا رہتا ہے ۔ تو ثروت و برتری میں میرے لیے سکندر کی چھیت رکھتا ہے ۔

۷۔ لغات : ربوہ : کمزور و قریب

ریا : دکھاوا ، نمود ، نمائش

اہلِ خرابات : اعلیٰ معنی شراب خانے کے رند ،

ہمازی معنی وہ لوگ ، جن کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے ، و استباز ، اہل صلاح و تقویٰ ۔

شرح : اگرچہ غالب خاک نشین یعنی عاجز و مسکین ہے ، تاہم اس کا

ظاہر و باطن ایک ہے ، لہذا اس پر کمزور و قریب یا ریاکاری کا گمان نہ ہونا چاہیے

یعنی اس نے جو کچھ کہا ہے ، وہ حینِ خلوص اور ولی ارادت پر مبنی ہے ۔

۶۔ بیانِ مصنف

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سواشت سے ہے پیشہ آباگری کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسکلت ہے حال ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں انا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شریعہ ہو مجھے پرغاش کا خیال یہ تابِ یرِ مجال ، یہ طاقت نہیں مجھے

جام جہاں ناس ہے شہنشاہ کا خمیر سوگن راور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
 میں کون اور رنجیتہ ہاں اس سے دعا جزا بساطِ خاطر حضرت نہیں مجھے
 سہرا لکھا گیا، زہر امتثالِ امر دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
 مقطع میں آپڑی تھی سخن گستراد مقصود اُس سے قطع محبت نہیں مجھے
 روئے سخن کسی کی طرف ہوا تو رویا سودا نہیں، جنوں نہیں، حشمت نہیں مجھے
 قسمت تیری سہی، طبیعت برہمی ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صداق ہوں اپنے قول میں غالبِ خدا گواہ

کتابا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

ذوقی نے نمودیا بادشاہ کے ایما پر سرے کے معاملے میں حریفانہ انداز
 اختیار کیا تو مرزا نے یہ قطع بطور مسندت پیش کر دیا۔

اس سلسلے میں ایک ضروری گزارش اور ہے۔ بعض رعایتوں میں بتایا گیا ہے
 کہ زینت الملکیم نے اہل دربار کو تاکید کر دی تھی، ذوقی کا سراپا بڑھا جائے تو کسی شعر
 کی داد نہ دیں۔ چنانچہ چارپاچ شرمشک کر درباری خاموش رہے۔ جب بادشاہ نے
 ستائشِ شعر کی تو درباری بھی خاموش نہ رہ سکے۔

یہ افسانہ سراسر بے بنیاد ہے۔ ذہنِ بیک کو ایسی تاکید کی ضرورت تھی، نہ موقع
 اور نہ اس کا متقاضی تھا۔ اگر بیک اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہتا تو وہ بادشاہ
 ہی سے کہہ سکتی تھی، جو بیک کے زیر اثر تھا اور جس نے بیک کے اصرار پر میرزا جوں
 بہنت کی دلی عداوت کے لیے کوشش کے سلسلے میں بڑے بیٹوں کے مسئلہ حقوق
 سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ایسے افسانے صرف ذوقی کی پاسداری میں تیار

کچے گئے۔

خود مولانا محمد حسین آزاد مرحوم دیکھ کر ذوق کے قصیدہ ملا کے سہیلے میں فرمایا ہے کہ مرزا عالی عرض بھیجی کے آدمی نے بتایا، بیگم صاحبہ کا حکم پہنچا ہے کہ اس قصیدہ سنائی تو دربار میں کوئی ان کے شعروں پر تفسیر نہ کرے۔ (ذوق نے دم گرم بھر کر فرمایا۔ اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے غنائ کے مستند کرتی ہے۔ میں جب قصیدہ پڑھوں گا تو دلچسپی خاص کے دیکھ لوں گا۔ وہ والوں کا۔ چنانچہ دوسرے دن تعین پڑھنے لگے تو تمام دربار دم بخود۔ بادشاہ کے ذوق کو پاس ہانکے لگا لیا پھر کہا ہوں (بیٹھ پڑھو) پھر پڑھنے لگے تو سب کے دہی بند کھل گئے۔)

(دلچسپی ذوق ص ۳۰۱)

۱۔ شرح : میں یہاں حقیقی حالات شیک طلیک عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے حسب طبیعت کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا۔

مطلب یہ کہ یہ قطب صفت وہ حالات عرض کرنے کے لیے لکھا گیا ہے، جو پیش آئے، اپنی طبیعت کے محاسن بیان کرنا نہیں چاہتا۔

۲۔ شرح : زاد القریب سے میرے آباؤ اجداد سپاہیہ خدمات میں مصروف رہے ہیں اور شاعری میرے لیے عزت کا ذریعہ نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو خاندان پشتا پشت سے ششدر زن چلا آتا ہے اور مستر طور پر اہل سیٹ میں شمار ہوتا ہے، اس کے کسی فرد کے لیے اپنی قلم بن جانا یا شعروں میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا کچھ عزت کا باعث نہیں۔ میرزا نے یہاں اہل سیٹ کو اپنی قلم پر ترجیح ہی نہیں دی، بلکہ یہ پہلو بطور خاص اسرار ہے کہ میں ناکروں کو، پشتا پشت کے آباؤ اجداد کے پیشے پر کیوں ذکر کروں؟ اس پیشے میں میرے لیے کیا خاص جاذبیت ہو سکتی ہے، جو خود میں نے شروع کیا!

۳۔ شرح : میری روش آزاد اور میرا دل سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ سب سے صلح کا ہر تاؤ جاری رکھا جائے۔ مجھے کسی

سے ہرگز دشمن پیدا نہیں ہوئی

مولانا طباطبائی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ دوسرے مصرع میں عداوت کی نفی کے لیے عین تاکیدیں لائے

۱۔ لفظ ”ہرگز“ مطلق تاکید ہے۔

۲۔ لفظ ”کبھی“ میں ہر زمانہ شامل کر دیا گیا ہے۔

۳۔ لفظ ”کسی“ میں ہر فرد شامل ہے۔

سم۔ شرح : میں نے مانا کہ مذبحے اونچا درجہ حاصل ہے ، ذ میں کسی اعلیٰ عہدے پر نامزد ہوں ، نہ میرے پاس دولت ہے نہ میں ہر کیا میرے لیے اعزاز و اکرام کا یہ پہلو کم ہے کہ میں بہادر شاہ ظفر کا غلام ہوں ؟

مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کے دوسرے غلاموں کو جاہ و منصب بھی حاصل ہے اور دولت بھی ، مجھے ان میں سے کوئی بھی چیز حاصل نہیں۔ تاہم میں اسی کو بڑی بات سمجھتا ہوں کہ غلاموں میں شامل ہوں۔

۵۔ لغات : پر خاش : رنج و کاوش

شرح : میں بادشاہ کے اٹاؤ سے رنج و کاوش کا خیال کروں ؟
بہر میں نہ یہ تاب ہے ، نہ ہمال ہے ، نہ طاقت ہے۔
مولانا طباطبائی فرماتے ہیں۔

”اس قطعے میں جس جس پہلو سے معنی اختلاف

کو مصنف نے ہاندھا ہے ، قابل اس کے

ہے کہ اہل قلم اس سے استفادہ کریں۔

ایسے پہلو شاعر کے سوا کسی کو نہیں سوجھتے۔

یہ عرش کے خزانے سے نکلتے ہیں اور اس

کی کئی شاعروں کے سوا کسی کے پاس نہیں

لیکن نثر کی سبھی کو ضرورت ہے اور جس میں

مضمون پر شاعر کو قلم اٹھانا پڑتا ہے ، ان
مضامین کی ترمیمیں و تین شاعروں کی خوش
پہننی کے بغیر نہیں ہو سکتی ۔

۶۔ لغات : جام جہاں نما : اسے جام ہم اور جام بھشید بھی کہتے ہیں
بیان کیا جاتا ہے کہ یہ جام بھشید شاہ ایران کے بے لوثانی حکمران نے قواعد نجوم ،
پیش نظر رکھ کر بنایا تھا اور اس سے دنیا کے حالات معلوم ہو جاتے تھے
شرح : بادشاہ کا ضمیر ایسا جام ہے ، جس سے زمانے کے حالات
معلوم ہو جاتے ہیں ۔ اس بارے میں ذیلے قسم کھانے کی ضرورت ہے ، نگواہ
پیش کرنے کی اور نگواہ پیش کرنا ضروری ہے ۔

مطلب یہ کہ جس قلب روشن کو ہر چیز کا علم ہے ، کیونکر اس کی حیثیت ،
جام جہاں نما کی ہے ۔ اسے سو گند اور گواہ کی حاجت ہی کیا ہے ؟

۷۔ شرح : کہاں میں اور کہاں اردو شعر گوئی ؟ مجھے اس سے کیا واسطہ ؟
ہاں اگر اردو شعر کہتا ہوں تو صرف اس لیے کہ حضور کا دل خوش کرنا منظور ہے ۔ یعنی
اپنی خوشی سے اردو شعر سنیں کہتا ، صرف آپ کی خوشی کے لیے کہتا ہوں ۔

میرزا کو خاصی مدت تک یہی خیال رہا کہ ان کے شاعرانہ کمالات کا مظہر قافی
کلیات ہے ، نہ کہ اردو زبان ۔ چنانچہ ایک مرتبہ پہلے میں ذرا ان کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا تھا :-

اے کہ در بزم شہنشاہ و سخن رس ! گفتہ
کے یہ چہ گوئی فلاں در شعر ہم رنگ من است
راست گفتی ، ایک ہی دانی کہ ہو دجائے سخن
کتر از با یک قول گر نغز ، چنگ من است
فارسی ہیں تا بہ پیش ۔ نقش اسے رنگ رنگ
بگنرا ز جھوٹ اردو کہ ہے رنگ من است

ماست می گویم من و از دست سرتو تن کشید
پرچہ در گفتار فرقت ، آن رنگ من است

لیکن دیکھیے وہی اردو دیوان ، جسے وہ مجھے رنگ قرار دے رہے تھے ۔

ان کی عظمت کے لیے دستاویز بنا اور غار میں شاعری کے کالات سے شناسائی
اب تک بہت محدود ہے ۔

۸۔ لغات : زرد و اقبال اسر : حکم بجالانے کی غرض سے ۔

شرح : میں نے سہرا لکھا تو صرف اس لیے کہ حکم بجالانے کا تقاضا
یہی تھا اور لہجہ پر واضح ہو چکا تھا کہ اس حکم کو ماننے بغیر چارہ نہیں

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ، یہ حکم زینت محل بیگم نے غالباً حکیم امین اللہ
خان کے ذریعے سے دیا تھا ۔

۹۔ لغات : سخن گسترانہ : شاعرانہ ۔ گستر دی سے مراد ہے
پھیلانا ، سخن گستری ، بات یا شعر کا پھیلاؤ ، جس کے بہت سے اطراف ہوتے
ہیں ۔ مطلب یہ کہ شاعر شعر گوئی کے جوش میں اپنی شائش کے متعلق ایسی باتیں کر
جاتا ہے ، جو فی الحقیقت مقصود نہیں ہوتیں اور انھیں محض شاعری سمجھنا چاہیے ۔
سخن گستری سے مراد محض سامعین کی تفریح و خوش دلی ہوتی ہے ۔

شرح : سہرے کے مقطع میں میں نے سخن گستری سے کام لیا تھا ۔
اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ کسی کو چیلنج دوں یا کسی سے محبت کا رشتہ توڑ دوں
۱۰۔ شرح : اس میں میں نے مقطع میں کسی کی طرف اشارہ یا کنایہ جو تو خدا
کرنے ، میرا منہ سیاہ ہو جائے ۔ بھلا میں درویش ، سوداگر اور وحشت زدہ تھا کہ
بادشاہ کے استاد کی طرف اشارہ کرتا ؟

۱۱۔ شرح : انا کہ میری قسمت بُری ہے ، لیکن طبیعت بُری نہیں ۔
میں اس امر کا اشارہ کرتا ہوں کہ کہہ رہے شکایت کی کوئی وجہ نہیں ۔

مطلب یہ کہ میری قدر ویسی نہ ہوئی ، جیسی ہونی چاہیے تھی اور زندگی میں ۔

سکون و طبیعتاں میسر نہ ہوا ، مگر میری فطرت و طبیعت بڑی نہیں ۔ یا شعر گوئی کے کلمات کے لیے کسی سے اختلاف کی گنجائش نہیں ۔ یہ ایسی ہر جہر کچھ ہوا ، میں اس پر قانع ہوں اور شکر کا مقام ہے کہ کسی سے شکایت نہیں ۔ میری قیمت ہی میں یہ لکھا تھا کہ کلمات کے باوجود زندگی اسی صورت سے گزرے ۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :-

میرے شعر محقق کی بلاغت کی سند اور استاد ہی کی دستاویز ہے ، ہر لوگ محض غزل میں تاقیہ بیانی کیا کرتے ہیں ، ان کی فکر کو ان مضامین عالیہ کی طرف رسائی ممکن نہیں ۔ جس راہ پر وہ گئے ہوئے ہیں ، وہ اس میدان سے کوسوں دور ہے ۔ شیخ الرئیس لکھتا ہے کہ شعر کبھی فقط حیرت و تعجب پیدا کرنے کے لیے کہتے ہیں کبھی اعراض و معاملات کے لیے شعر اسے غزل گو کی شاعری پہلی قسم کی ہے کہ موسیقی و معنوی کی طرح ہی کفایت بھی محض حفظ نفس و تنزیہ روح کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتی ، لیکن دوسری قسم البتہ اہتمام و احتیاط کے قابل ہے ۔ ہر ادیب قابلِ علم اس کا محتاج ہے ۔

۱۲ - شرح : اسے غالب ! میں نے جو باتیں اور کہیں ہیں ، خدا گواہ ہے کہ ان میں سچا اور راستا باز ہوں ۔ میں سچ کہتا ہوں اور جھوٹ کی مجھے عادت نہیں یا سچ کہتا ہوں ، کیوں کہ مجھے جھوٹ کی عادت نہیں ۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں کہ ”یا بیان کے واسطے ہے یا توجیہ و تفسیل کے واسطے ۔ یا توجیہ مطلب ہے کہ جو کچھ کہ رہا ہوں ، سچ کہ رہا ہوں جھوٹ کی مجھے عادت نہیں یا یہ بات سچ کہتا ہوں اور اس کی وجہ و علت یہ ہے کہ جھوٹ کی مجھے عادت نہیں :-

مگر حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے ۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ پہلی

صورت میں بہ التزام مطلب حاصل ہوتا ہے ۔ اور وہ پھر کاہلہ

ہے یعنی جرات کر کے کہتا ہوں ، وہ یہ ہے کہ جھوٹ کی عادت نہیں اور جب یہ بات سچ ہوئی تو لازم آیا کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ جھوٹ نہیں۔ جب معلوم ہوا کہ جھوٹ نہیں تو لازم آیا کہ سچ ہے۔ دوسری صورت میں بالفاظت مطلب حاصل ہو جاتا ہے ، یعنی جو کچھ میں کہ رہا ہوں اس کی وجہ بیان کی کہ جھوٹ کی جگھے عادت نہیں۔“

۷۔ چکنی ڈلی

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی تمہید :-

میرزا غالب نے	زیب دیا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
حاتم علی بیگ تھر کے	خامہ انگشت بہ دندان کہ اسے کیا لکھیے
نام ایک خط میں لکھا ہے :-	ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
”جو فطانت فطانت“	مہر مکتوب عزیزانِ گرامی لکھیے
فطانت فطانت بھر ہے ،	حرز بازوئے شگرفانِ نحو آرا لکھیے
اس میں میرا ایک نقطہ ہے کہ وہ میں نے ٹکڑے	مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے
میں کہا تھا۔ تقریباً	دارغِ طرفِ جگر عاشقِ شیدا لکھیے
کہ مولوی کرم حسین ایک میرے دوست تھے	حاتم دستِ سلیمان کے مشابہ لکھیے
انھوں نے مجھ میں ایک چکنی ڈلی بہت	سرپستانِ پری زاد سے مانا لکھیے
پاکیزہ اور بے ریش	

اپنے کندہ دست پر اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجے
 رکھ کر مجھ سے کہا کہ خال مشکین رُخ و مکشِ یالی کہیے
 اس کا کچھ تشبیحاتِ نعم کیے ہیں نے بیٹھے
 ہجر الاسود دیوارِ سرم کیجیے فرض
 نافذ، آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
 قطعہ کلمہ کران کو دیا ہو
 وضع میں اس کو سمجھے لیجیے تافِ تریاق
 سے لے "چہ خراس
 نگ میں سبزہ نوخیز میسا کہیے
 قطعے سے نقل کرنے صومعے میں اسے بٹھرائیے گر مہر نماز
 کے بعد فرماتے ہیں
 میکدے میں اسے نشستِ ختم صہبا کہیے
 "غرض کہ ہیں بائیں پھتیاں ہیں۔
 کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت کہیے
 اشار سب کب یاد آتے ہیں۔
 کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمت کہیے
 خواجہ حالی ،
 کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے
 لے "یادگارِ غالب"
 کیوں اسے مردِ کمبِ دیدہ عنقا کہیے
 ہیں لکھا ہے :-
 کیوں اسے تکتہ پیرا ہن یالی کہیے
 لکھنؤ میں جبکہ نواب
 کیوں اسے نقشِ پتے ناقہ سلئی کہیے
 ضیا الدین احمد خان
 مرحوم لکھتے ہوئے
 بندہ پرورد کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
 تھے ہر دلی عہدِ عالم
 اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے
 مرحوم نے جو لکھتے

کے ایک ورہیزہ سال فاضل تھے ، نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس ،
 رہنے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے ، ایک مجلس میں جہاں
 مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا ۔ شعراء کا ذکر ہو رہا تھا ۔ اثناء
 گفتگو میں ایک صاحب نے فیض کی بہت تعریف کی ۔ مرزا نے کہا کہ ،
 فیض کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے ۔ اس پر بات چلی ۔ اس
 نے کہا کہ فیض جب پہلی ہی بار اکبر کے روپر دیا تھا ، اس نے
 ڈھائی سو شعر کا قصیدہ ، اسی وقت آتا تھا کہ کر پڑھا تھا ۔ مرزا بولے ،
 اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار
 شعر تو ہر موقع پر جا ہٹ کر سکتے ہیں ۔ غائب نے جیب سے ایک
 چکنی ڈلی نکالی کہ تھیلی پر رکھ لی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس
 ڈلی پر کچھ ارشاد ہو ۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں
 کر کے پڑھ دیا ۔

دونوں اقتباسوں کے سلسلے میں چند امور عرض کر دینا ضروری ہے ۔

۱۔ مطبوعہ قطعہ تیرہ شعر کا ہے ، گیارہ شعر کا نہیں ، جیسا کہ یادگار غالب میں
 مذکور ہے ، نہ تو دس شعر کا ، جیسا کہ مرزا غالب نے لکھا ہے ۔

۲۔ پہلے اقتباس میں مولوی کرم حسین کا نام آیا ہے ۔ یہ بگلام کے رہنے
 والے تھے اور دوبار اودھ کی طرف سے کلکتہ میں سفارت کے منصب پر مامور
 تھے ۔ شمس العلماء سید علی بگڑامی اور نواب عمار الملک سید حسین بگڑامی انھیں مولوی
 کرم حسین کے پوتے تھے ۔

۱۔ لغات : کتب دست : اتھلیں ۔

چکنی ڈلی : ایک قسم کی چھایا ، جو دودھ میں پکا
 کر خشک کر لی جاتی ہے اور نہایت نفیس و لذیذ ہوتی ہے ۔

تشریح : آپ کی تھیلی پر جو چکنی ڈلی رکھی ہے ، اس کی تعریف جس

قدر بھی کی جائے ، بالکل بھادو نہ رہا ہوگی ۔

۲۔ لغات : انگشت بدندان : دانتوں میں انگلی سے ہونے ،
نہایت حیران ۔

ناطقہ : بات کرنے کی قوت ، گویائی ۔

سر پہ گربان : گریبان میں سر ڈالے ہوئے یعنی

غور و فکر میں ڈوبا ہوا ۔

شرح : تم حیران ہے کہ اس ڈلی کے بارے میں کیا لکھا جائے ۔
گویائی خور میں ڈوبی ہوئی ہے کہ اسے کیا کہا جائے ۔

۳۔ لغات : حمزہ : پتاہ کی جگہ ، مجازاً تعویذ ۔

شکر خان خود آرا : بن سنور کر رہنے والے حسین ۔

شرح : اسے عالی قدر عزیزوں کے خط کلمہ لکھا جائے یا بخنہ

سنورنے والے حسینوں کے بازو کا تعویذ کہا جائے ۔

۴۔ لغات : سر انگشت : انگلی کا سرا ۔ پور ۔ لائق ہیں

پانچ انگلیاں ہیں ، اول انگوٹھا ، دوم انگشت شہادت ، سوم بیچ کی انگلی ، چہارم

اس کے ساتھ کی انگلی پر خیم چھلکی ۔ چھٹھی اور بیچ کی انگلی کے درمیان جو انگلی ہے

اسے چوتھیں مہی کی انگلی کہتی ہیں ، کیونکہ اسی سے عورتا مہی لگانے کا ستور ہے ۔

ظرف : گوشہ

شرح : آیا اسے حینوں کی وہ انگلی قرار دیجیے ، جس کے پر کو

مسی لگی ہوئی ہو یا وہ داغ کیجیے ، جو عاشق شیدا کے گوشہ بکریں ہوتا ہے ۔

۵۔ لغات : خاتم : انگوٹھی ، مہر ۔

مانا : مشابہ ، مانند ۔

شرح : اسے حضرت سلیمان کے ہاتھ کی انگوٹھی سے تشبیہ

دیجیے یا کیجیے کہ وہ کسی پر نژاد کے میراثی کی مانند ہے ۔

۶۔ شرح : اسے مجنوں کی قسمت کے حصے ہوئے ستارے ہے ، نسبت دیبے یا بلی کے دلاویز رخسار کا مشک جیسا تل ہو گیا ۔

۷۔ لغات : جہر الاسود : وہ مقدس سیاہ پتھر جو کبے کے ایک گوشے میں نصب ہے اسی سے کبے کے گرد طواف کے آغاز و انجام کا حساب کیا جاتا ہے ۔

تافہ : مشک والے ہرن کی ناف ، جو عام ہرنوں کی ناف سے بڑی ہوتی ہے اور اس میں خون جمع رہتا ہے ۔ ہرن ذبح کرتے ، وقت اسے کس کر باندھ دیتے ہیں تاکہ خون ٹوٹنے نہ پائے ۔ وہی خون کچھ عرصے میں خشک ہو کر چھوٹی چھوٹی ڈھیروں کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ یہی تافے کہتے ہیں جنہیں کاٹ کر مشک نکالا جاتا ہے ۔

غشش : چینی ترکستان کا ایک علاقہ ، جو اسی نام کے دریا سے سیراب ہوتا ہے ۔ یہ یارقند سے تقریباً دو سو میل جنوب میں ہے ۔ زمانہ ماضی میں بحیرہ روم کے چین تک کا برسی راستہ غشش ہی سے گزرتا تھا پاکستان کی طرف گودا کراکرم کے راستے واپس جاتے ہیں ۔ قابیل ، ریشی کپڑے اور مشک یہاں کی خاص چیزیں تھیں ۔

شرح : آیا اسے کبے کی دیوار کا جہر الاسود فرض کر لیا جائے یا بیابان غشش کے ہرن کا ناذ کہا جائے ؟

۸۔ شرح : اس کی وضع قطع پر نظر ڈالیے تو اسے تریاق کا ” ق “ تسلیم کیا جاسکتا ہے ۔ رنگ دیکھیے تو یہ کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میحاکے چہرے پر خط نیا نیا نکلا ہے ۔

۹۔ لغات : صومعہ : گرجا ، مطلق عبادت گاہ کے لیے بھی مستقل ہر ۔ مہر نماز : سجدہ گاہ ، کٹری یا کر بلائے معلی کی ، خاک کا ٹکڑا ، جسے شیعہ حضرات سجدے کی جگہ رکھ دیتے ہیں ۔

خشتِ فم صبا : شراب کے ٹکے کی اینٹ۔ ٹکے میں انگوٹھا کا رس بھر کر اس چھ اینٹ رکھ دیتے ہیں اور منہ بند کر دیتے ہیں تاکہ رس جوش میں آجائے۔ پھر اسے صاف کر کے بوتلوں میں بھر دیتے ہیں۔ اس سے وہ اینٹ بھی مراد لے سکتے ہیں، جو شراب کے ٹکے کو ٹھہرا کر رکھنے کے لیے سہاے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

شرح : اگر اس چکنی ٹولی کو عبادت گاہ میں شہرِ خاندہ ٹھہرائیں تو شراب خانے میں ٹکے کے اوپر کی اینٹ کبنا چاہیئے۔ اگر ٹکے کو سہارا دینے والی اینٹ فرض کیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ شراب کے ٹکے کی وہ اینٹ، جو رندوں کی سجدہ گاہ ہوتی ہے۔

۱۰۔ لغات : پرکار : دائرہ کھینچنے کا آلہ۔

شرح : اس چکنی ٹولی کو خزانہٴ محبت کے دروازے کا قفل کیوں کھینچا جائے؟ اسے آرزو کی پدکار کا مرکز کیوں کہا جائے۔

۱۱۔ شرح : اسے کیوں ایسا موتی تصور کریں، جو کہیں پایا نہ جاتا ہو؟ اسے کیوں چشمِ عناق کی جلی کہیں؟

۱۲۔ لغات : سلمیٰ : عرب کی ایک مشہور محبوبہ۔

شرح : کیوں اسے سلمیٰ کے پیراہن کی گھنٹی سمجھیں؟ کیوں اسے سلمیٰ کے تانے کا نقشِ پاکہیں؟

۱۳۔ شرح : مناسب یہ ہے کہ حضور کی عقل کو دلِ فرخ کر میں اور اس چکنی ٹولی کو اس دل کا سیاہ نقطہ قرار دے لیں۔

۸۔ کلکتہ

۱۔ شرح : کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں! اسے ہدم! تو نے اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

لیتی ہیں اور جانچتی ہیں کہ دیکھنے والا کتنے پانی میں ہے۔ پھر ان کا ایک / ایک اشارہ ہمارے ہمارے میں کیا کموں / کس طرح برداشت کی تاب و طاقت چھین لے جاتا ہے۔

۴۔ شرح : کلکتہ کے وہ تازہ ، میٹھے اور مزیدار میوے کہ / دیکھتے ہی زبان واہ واہ پکار اٹھتی ہے۔ دلوں کی وہ خالص خوشگوار اور طبیعت کے عین موافق شراہیں ! ہمارے ہمارے ! کلکتہ کے ذکر نے ان تمام چیزوں کی یاد تازہ کر دی۔

۹۔ بیسنی روٹی

نہ پوچھ اس کی حقیقت ، حضور والا نے

مجھے جو بھیجی ہے ، بسین کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیوں ، نہ کلکتہ نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ ۔ بیسنی روٹی
تسمیر :- خواجہ حاتمی نے لکھا ہے :-

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکوانے تھے تو اکثر معاصمین اور اہل
دربار کے لیے بطور ادولش کے بھیجا کرتے تھے ۔ اس کے شکر تھے
میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطار یا رانی بادشاہ کے حضور میں گزرا نہتے
تھے ۔ یہ قطار بھی اسی قبل کا ہے ۔

فراجہ صاحب نے ساتھ ہی ایک لطیفہ لکھا ہے :-

جس وقت چوہدار شاہی یہ ادولش لے کر آیا ، باہر کارہنے والا ایک
طالب علم ، جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا ، موجود تھا چوہدار کے چلے
جانے کے بعد اس نے مرزا سے متعجب ہو کر پوچھا ۔ ” یہ بیسنی روٹی
ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور ادولش کے تقسیم ہوتی

ہے؟ مرزا نے کہا: ”اے الحق! چنا وہ چیز ہے، اس نے ایک دفعہ جناب الہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں، پیٹتے ہیں، بھونکتے ہیں، پکارتے ہیں اور مجھے بے سیکڑوں چیزوں بنا کر کھاتے ہیں۔ بسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے، ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اسے چٹنے! تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ ہمارا بھی یہی ہی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔“

۱۔ شرح : حضور والا نے مجھے بسین کی جو روحانی روٹی بھیجی ہے، اس کی حقیقت مجھ سے نہ پوچھ۔

۲۔ شرح : اگر حضرت آدم کیوں نہ کھاتے اور یہ بیسی روٹی کھاتے تو بہشت سے باہر نکلنے کی ذمت نہ آتی۔

۱۰۔ غیروں کی وفاداری

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے یہ کیا شرمندگی، جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے، اگر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

شرح : وہ دن گزر گئے، جب تم حقیقت جانے ہو مجھے بغیر غیروں

کی وفاداری نور شور سے بیان کرتے تھے اور ہم چپ رہتے تھے۔ اب اُن سے بگاڑ جو گیا تو اس میں ہمارا کوئی قصور ہے؟ اور تم اتنے کیوں شرمندہ ہوئے کہ ہم سے ملنا نہ جھوٹے دیا شرمندگی جانے دو، ہم سے ملو اور قسم سے لو، کیسی یہ نہ کہیں گے کہ ہم حقیقت حال تم سے صاف صاف نہیں کہتے تھے؟

محبوب کو غیروں کی وفاداری پر جانا مبرور سمجھا اور آزمائش کبھی کی نہیں تھی

لیتی ہیں اور جانچتی ہیں کہ دیکھنے والا کتنے پانی میں ہے۔ پھر ان کا ایک / ایک اشارہ ہمارے ہمارے میں کیا کہوں / کس طرح برواشت کی تاب و طاقت / چھینے جاتا ہے۔

۴۔ شرح : کلکتہ کے وہ تازہ / میٹھے اور مزیدار میوے کہ / دیکھتے ہی زبان واہ واہ پکار اٹھتی ہے۔ دلوں کی وہ خالص خوشگوار اور / طبیعت کے عین موافق شراہیں ! ہمارے ہمارے ! کلکتہ کے ذکر نے ان / تمام چیزوں کی یاد تازہ کر دی۔

۹۔ بیسی روٹی

نہ پوچھو اس کی حقیقت، حضور والا نے

مجھے جو بھیجی ہے، بیسی کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں، نہ کلکتہ نہ خلد سے باہر

جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسی روٹی

تمہید :- خواجہ عاتق نے لکھا ہے:-

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہل

دربار کے لیے بہ طور اولوش کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکوے

میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گزرا کرتے

تھے۔ یہ قطعہ بھی اسی قبل کا ہے۔

خواجہ صاحب نے ساتھ ہی ایک لطیفہ لکھا ہے :-

جس وقت چہ پلار شاہی یہ اولوش لے کر آیا ، باہر کا رہنے والا ایک

طالب علم ، جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا ، موجود تھا۔ چہ پلار کے چلے

جانے کے بعد اس نے مرزا سے شہرت جو کر پوچھا۔ ”یہ بیسی روٹی

ایسی کیا تھی چہ پلار؟“ بادشاہ کی سرکار سے بہ طور اولوش کے تقدیر ہوئی

ہے؟ مرزا نے کہا: ”اے الحق! چناورہ چیز ہے، اس فطریک
 وفضل جناب انہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔
 مجھے ملتے ہیں، پھیتے ہیں، بھونکتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھ سے بیکوہوں
 چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ بسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے، ایسا کسی پر نہیں
 ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اسے چھٹے! تیری غیر اسی میں ہے کہ
 ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ ہمارا بھی یہی ہی چاہتا ہے کہ
 تجھ کو کھا جائیں۔“

۱۔ شرح : حضور والا نے مجھے مین کی جو روغنی روٹی بھیجی ہے، اس
 کی حقیقت مجھ سے نہ پوچھ۔

۲۔ شرح : اگر حضرت آدمؑ کیوں نہ کھاتے اور یہ بیسی روٹی کھا لیتے
 تو بہشت سے باہر نکلنے کی نوبت نہ آتی۔

۱۰۔ غیروں کی وفاداری

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
 کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
 بس اب بگڑے یہ کیا شرمندگی، جانے دو مل جاؤ
 قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

شرح : وہ دن گزر گئے، جب تم حقیقت جانے بوجھ بغیر غیروں

کی وفاداری زور شور سے بیان کرتے تھے اور ہم چپ رہتے تھے۔ اب اُن سے بگاڑ
 ہو گیا تو اس میں ہمارا کوئی قصور ہے؟ اور تم اتنے کیوں شرمندہ ہوئے کہ ہم سے ملنا
 جتنا چھوڑ دیا شرمندگی جانے دو، ہم سے ملو اور قسم لے لو، تمہیں یہ نہ کہیں گے کہ ہم
 حقیقت حال تم سے صاف صاف نہیں کہتے تھے؟

محبوب کو غیروں کی وفاداری پر بڑا مہروسا تھا اور زبانش کبھی کی نہیں تھی

تم ان کی وفاداری کے متعلق بڑی تقریریں کرتے تھے اور ہم دانت کچھ عرض کرتے
سے باز رہتے تھے۔ پھر غیروں کی حقیقت کھل تو ان سے تعلقات ختم ہوئے۔ محبوب
کو اپنے پہلے دعووں پر اتنی شرمندگی ہوئی کہ عاشق سے بھی مناجائنا چھوڑ دیا
عاشق مناجاتا ہے: "یقین رکھو، میں کوئی بات تمہارے خلاف نہیں کہوں گا
لیکن شرمندگی کے باعث مجھے دیدار سے محروم نہ رکھو۔"

۱۱۔ شریک غالب

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہو نہ غلبہ میتیر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا، "شریک غالب" ہے

۱۔ لغات : سیہ گلیم : "بہارِ علم" میں بتایا گیا ہے کہ سیہ گلیم کو
معنی سیاہ روزگار ہیں، یعنی بد نصیب، سیاہ بخت۔

شرح : میں سیاہ روزگار اور سیاہ بخت ہوں۔ دنیا میں جو کوئی فتح
پانے اور مراد مند ہونے کا خواہاں ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ میرا نام زبان
پر نہ لائے۔

۲۔ شرح : مجھے کبھی کسی پر غلبہ نصیب نہ ہوا۔ جو بھی میرا شریک
اور ساتھی بنا، وہ شریکِ غالب بن گیا۔

"شریکِ غالب" کے دو معنی ہیں، اول شخصِ غالب کا شریک، دوم وہ،
ساتھی، جو حصہ دار بن کر غلبہ پالے اور دوسرے حصہ دار کو کچھ نہ لینے دے۔

۱۲۔ روزہ داری

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو ،
اس شخص کو ضرور ہے ، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے ؛

تمہید :- اس قطع کے مسئلے میں خود مرزا نے منطقی نہیں بخش حقیر کو
ایک خط میں لکھا (مرقومہ ربیع ۱۲۵۵ھ)

مگر چہ تاب نجد میں روزہ رکھنے کی کہاں کو مگر پندرہ روزہ داروں سے
ہوں۔ روزہ داروں کو کیا کہوں ، کیا حال ہے۔ میرے چار خدمت گزار
ہیں ، چاروں روزہ دار۔ آخر روزہ بھائیوں نظر آتا ہے کہ چار مرگے
پھر رہے ہیں۔ یہ پریشانی اور یہ بے سامانی۔ نہ خفانہ ، نہ برغاب۔
”آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟“ انظر افطارِ صوم کی جیسے کچھ دستگاہ
ہو۔ انہی رباعی اور یہ قطع کل حضور میں پڑھا تھا۔ بہت ہنسے اور
خوش ہوئے۔“

اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رباعی اور قطعہ ۳ ربیع ۱۲۵۵ھ کو شاہی دربار
میں پڑھے گئے۔ اس دن رمضان شریف کی ساتویں تاریخ یعنی (۱۲۴۱ھ)۔

۱۔ ۲۔ لغات : افطارِ صوم : روزہ کھولنا

دستگاہ : توفیق ، سرو سامان ،

شرح : جس شخص کے پاس روزہ کھولنے کے لیے کچھ سرو سامان

ہو ، اس کے لیے لازم ہے کہ روزہ باتا عہدہ رکھے اور کوئی روزہ نہ چھوڑے لیکن

جس کے پاس روزہ کھول کر کھانے کو کچھ نہ ہو، وہ روزہ نہ کھائے، یعنی درمکے
تو آخر کیا کرے؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس قطعے میں ”ناچار“ کا لفظ مفہم و بے نوا
کے معنی بھی دیتا ہے اور اس سے مجبور ہو کر روزہ نہ رکھنے کے معنی بھی نکلتے ہیں

۱۳۔ رخصت کی عرضداشت

سہل تھا سہل ہوئے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدی، یہ سب کئے دن ہوئے

۱-۲۔ لغات : مسہل : بھلاب

تبرید : وہ ٹھنڈائی، جو معدے سے بھلاب کی گرمی دور کرنے کے لیے
دلی جاتی ہے۔

شرح : بھلاب سے لینا آسان تھا، لیکن سخت مشکل یہ آپڑی کہ اتنے
دن دربار شاہی میں حاضر ہوئے بغیر گھر پر کیا گزرے گی۔ پھر دنوں کی تفصیل بتا دی
اور گنتی غائب پر چھوڑ دی۔ فرماتے ہیں : تین دن تو بھلاب سے پہلے ضروری ہیں
تاکہ منضج پیا جاسکے، یعنی وہ دوا جو طبیب بیماروں کو بھلاب سے پہلے اس لیے،
پلاتے ہیں کہ اسد کے فاسد مادے پس جائیں تاکہ بھلاب میں بے آسانی خارج ہو سکیں
تین دن بھلاب کے بعد طبیعوں کے نزدیک ایسے ہوتے ہیں کہ چنانچہ پھر ناز چاہئے
تین بھلاب لینے منظر اور ہر بھلاب کے بعد ایک ایک دی تبرید یعنی سہی۔ یہ کہتے
ہیں جو کئے؟ تین جمع تین جمع تین، کل بارہ دن ہو گئے۔ گویا یہ ایک درجہ

ہے ، جو غیر حاضری کے عذر میں بادشاہ کے حضور پیش کی گئی۔
خواجہ عسائی فرماتے ہیں کہ سہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل رہن میں حکیم چلنے
پھرنے سے منع کرتے ہیں۔ کس عمدگی سے بیان کی ہے۔

۱۴۔ درباری

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

۱۔ لغات : سلام کے لیے کانوں پر ہاتھ دھرنا : دربار
مقلید میں دستور تھا کہ بادشاہ کے سامنے درباری ایک دوسرے کو سلام کرتے
تھے تو ماتھے پر نہیں ، کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے ، ماتھے پر ہاتھ صرف بادشاہ
کے لیے مخصوص تھا اور ویسا ہی سلام بادشاہ کے وزیر و کسی دوسرے کو کرتا
تھا۔ خلاف ادب تھا۔

محض کانوں پر ہاتھ دھرنے کا مطلب ہے ۔ ناراقت اور نا آشنا ہونے کا
ذکر کرنا ۔ مرزا نے اردو کے اس محاورے اور شاہی دربار میں دستور سلام سے
ایک پُر لطف مضمون پیدا کر لیا ۔ فرماتے ہیں :-

شرح : اگرچہ سب لوگ ایک بادشاہ کے گھر میں پے ہوئے ہیں ،
لیکن درباری لوگ ایک دوسرے سے آشنا نہیں ۔ دلیل یہ ہے کہ وہ سلام کرتے
وقت کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں ۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے
کو نہیں جانتے ۔

خواجہ حاکمی نے لکھا ہے :-

”بادشاہ کے دربار کا طریقہ متفاکر آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ دیتے تھے۔“

۱۵۔ میرزا جعفر کی شادی

نجستہ انجمن طوے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سبکا ہوا ہے جی منظور
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی محفوظ

۱۔ لغات : نجستہ : مبارک ۔

طوے : ترکی میں شادی کو کہتے ہیں

شرح : میرزا جعفر کی شادی کی محفل ایسی مبارک ہے ، ہے
دیکھ کر دل بہت خوش ہوا ۔

یہ شادی مبارک سال میں ہوئی ہے ، پھر اسے غالب ! اس
کے سال عیسوی کا مادۂ لفظ ”منظور“ کیوں نہ ہو ، لفظ ”منظور“
سے ۱۸۵۵ء متاریخ نکلتی ہے ۔

(۱۶)

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ تاہید

کہا غالب سے ! تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا : انشراحِ جشنِ جمشید

۱-۲۔ لغات : ناہید : زہرہ ستارہ، جسے ناچ گانے کی دھڑی
مانا جاتا ہے۔

انشراح : سنوئی معنی کھلنا، یہاں خوشی اور انبساط مراد ہے۔

شرح : جب میرزا جعفر کی شادی ہوئی تو شادمانی کی محفل میں
دھڑہ نے رقص کیا۔ غالب سے اس شادی کی تاریخ پوچھی گئی تو اس نے کہا :
انشراحِ جشنِ جمشید، یعنی جمشید کے جشن کی خوشی اور انبساط۔

یہ سنہ ہجری کی تاریخ ہے اور اس کے عدد ہیں ۱۲۷۰۔

رباعیات



بعد از اتمام بزم عید اطفال
ایام جوانی رہے ساغر کش مال
آپنچے ہیں تا سوارِ تسلیم عدم
اے عمر گزشتہ ! یک قدم استقبال

لغات : اتمام : پورا کرنا ، انجام کو پہنچانا ۔
ساغر کش : پیالہ پینے والا یعنی جام شراب ۔

سوار : سیاہی ، ہمارا حوالی زمین یا زمین بھی مراد دیتے ہیں ۔ سمندر کا سفر کرتے ہوئے زمین آتی ہے تو دور سے سیاہی کا ایک خط معلوم ہوتی ہے ۔ اس طرح یہ منی ہو گئے ۔ حوالی شہر ، حوالی تعلیم ۔

استقبال : آگے بڑھا ، پیشوائی ، پیش روی ، زادہ آئندہ ۔

شرح : جب بچپن کی زندگی پوری ہوگی اور ظاہر ہے کہ بچپن کی زندگی کی بہترین تعبیر ہی ہو سکتی تھی کہ اسے لاکھوں کی بزم عید کہا جاتا تو جوانی کا دور آگیا ۔ جو حالات پیش آتے رہے ، ان کے مطابق زندگی بسر کرتے چلتے گئے ۔

مطلب یہ کہ حال ہی میں محو رہے ۔ ماضی یعنی گزشتہ کا کچھ خیال آیا ، نہ مستقبل یعنی آئندہ کے لیے کچھ سوچا ۔ اسی طرح چلتے چلتے ملک عدم کے آس پاس پہنچے ہیں ، یعنی بوڑھے ہو گئے ہیں اور اب اس دنیا سے کوچ کا وقت قریب آگیا ہے ۔

اے گزری ہوئی عمر ! ایک قدم آگے بڑھ ۔

مطلب یہ کہ گزری ہوئی عمر واپس مل جائے ، جو امیدِ عبث ہے تو جوانی کی زندگی کے بہارِ آخر میں دن پھر نوٹ آئیں



شب، زلف و رخِ عرقِ فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
ہو یا میں ہزار آنکھ سے صبح تک
سرِ قطرہ اشک، دیدہ پر غم تھا

لغات : رخِ عرقِ فشاں : وہ چہرہ جس سے پسینہ ٹپک رہا ہو۔
طرفہ تر : عجیب تر۔

شرح : رات محبوب کی زلف اور پسینے سے تر چہرے کا غم کتنا بڑا
میں کیا بتاؤں کہ میرا حال کس درجہ عجیب تھا۔

ایسا مملوم ہو رہا تھا کہ میں ہزار آنکھوں سے صبح تک روتا رہا۔ اور اس
طرح جو آنسو بہا گئے، ان میں سے ہر قطرہ بجائے خود ایک آنسو بھری آنکھ تھا۔
”رات“ کی مناسبت ”زلف“ سے اور ”رخِ عرقِ فشاں“ کی مناسبت ”عرق“
سے اور رونا بھی بہ طریقِ مبالغہ ظاہر ہے۔

ہزار آنکھ سے آنسو بہے روئے کہ رخِ محبوب پر پسینے کے قطرے
پے در پے آ رہے تھے۔ چو کہ قطرے گر بھی رہے تھے، اس لیے آنسو کا ہر قطرہ
اشک بھری آنکھ بن گیا۔



آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اُسی طور کا حال

تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی
لوگوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

لغات : موجد : ایجاد کرنے والا، نئی چیز بنانے والا۔
شرح : جیسے آتش بازی لوگوں کا کھیل ہوتی ہے، جگر کے سوز
اور جان کی کیفیت کا بھی یہی طور معلوم ہوتا ہے۔
عشق ایجاد کرنے والا بھی قیامت کا پتلا تھا، جو حسین و جمیل لوگوں کے لیے
ایک کھیل نکال گیا۔

مطلب : یہ کہ جس طرح بچے آتش بازی پھوڑ کر خوش ہوتے ہیں اور اسے محض
کھیل سمجھتے ہیں، اسی طرح یہ حسین و جمیل لوگ بھی محض کھیل تماشے کی عرض سے
عاشقوں کے جگر بلاتے ہیں، شے اٹھتے ہیں تو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔



دل تھا کہ جو جان درد تمہید سی
بے تابی رشک و حسرت دید سی
ہم اور فسر دن اے تجلی ! افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

لغات : جانی درد تمہید : وہ جان، جس کی تمہید، یعنی
ابتدا ہی درد سے ہوتی ہو۔

فسر دن : افسوس ہونا۔
تکرار : بار بار آنا۔

تجدید پر : سازہ کرنا۔

شرح : ہمارا دل ایسا تھا جس کی جان کا آغاز ہی دروے ہوا تھا۔
یعنی بر زندگی کے ہر درد کو ہمیں پہنچا تھا۔ ہمیں رشک کی پیتابی اور دیدار کی حسرت ہے
تو ہوا کرے۔

لیکن اسے محبوب کے جلوے ! ہمارے کینہ ہو جانا باعث صدا فسون ہے۔
ہمیں پھر پہلے سے سوز و گداز کی آرزو ہے۔ اگر تیرا دوبارہ کرشمہ دکھانا جائز نہیں تو
یہ مجھ سے اور تو اس میں پہلا ساسوز و گداز از سر نو پیدا کر رہا ہے۔

مراد یہ کہ جو چیز گزرتی تھی، اگر وہ دوبارہ نہیں آسکتی تو نیا تصور پہلی
سی کیفیت نئے سرے سے پیدا کر سکتا ہے



ہے خلقِ حسد قماشِ لڑنے کے لیے

وحشتِ کدۂ تلاشِ لڑنے کے لیے

یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد

ملتے ہیں یہ بد معاشِ لڑنے کے لیے

لغات : حسد قماش : جن کا بنا ہوا حسد ہے بنا ہوا، یعنی

صورت پر حسد کرنے والے۔

وحشتِ کدۂ تلاش : تلاش کا وحشت خانہ، یعنی دنیا، جہاں ہر شخص

سراسیمہ وارتلاشی معاش میں سرگرم ہے۔

کاغذِ باد : ہوائی کاغذ، یعنی پتنگ، کنگڑا۔

بد معاش : جن کا روزی حاصل کرنے کا طریقہ بُرا ہو۔

شرح : غلوئی لڑنے کی غرض سے سراپا سدہ بنی ہوئی ہے ، گویا
 حسد کو اس نے بطور لباس پہن لیا ہے تلاش کا یہ وحشت خانہ جسے دنیا کھٹے ہیں بلوے
 کا پورا لڑائی کا میدان بنا ہوا ہے ۔

یعنی دو آدمی جب کیس شتے ہیں تو لکڑیوں کی شکل میں شتے ہیں ، جن کا مقصد
 ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے خوں ۔ اسی لیے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کا
 طریق معاشرہ بھی نہایت بُرا ہے ، کیونکہ بیٹھتے بھی ہیں تو لڑنے کی غرض سے ۔



دل سخت نثرند ہو گیا ہے ، گویا
 اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے ، گویا
 پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
 غالب ! منہ بند ہو گیا ہے ، گویا

لغات : نثرند : غلین دھڑی ۔

شرح : دل سخت غلین اور افسردہ ہو گیا ، گویا اسے محبوب سے ،
 شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں ۔ جب محبوب کے سامنے شکایتیں پیش نہیں کر سکتے ۔ تو ان شکایتوں
 کا فائدہ کیا ؟

اسے غالب ! ہماری حالت تو یہ ہے گویا منہ بند ہو گیا ہے ۔



فکھ جی کے پسند ہو گیا ہے ، غالب
 دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالب

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
ما، سو گند ہو گیا ہے ، غالب !

نغات : سونا سو گند ہونا : نیند آنا قسم ہو جانا یعنی بالکل نہ آنا۔
شرح : اسے غالب ! میرے دل کو دکھ بہت پسندیدہ معلوم ہوتا
ہے اور دکھ کی وجہ سے دل کی حرکت نہ کرتے نہ کرتے بالکل ختم ہو گئی۔
خدا کی قسم ، رات کو نیند آتی ہی نہیں۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ سونا میرے لیے قسم
کے برابر ہو گیا ہے



مُشکل ہے زبیں کلام میرا ، اے دل !
سُن سُن کے اے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گرنہ گویم مُشکل

شرح : اے دل ! کوئی شبہ نہیں کہ میرا کلام بہت مشکل ہے۔
سُن سُن کر وہ شاعر، جو کہاں کے مدعی ہیں، فرمائش کرتے ہیں۔
کہ آساں کہا کرو ، اب میں کہوں تو مشکل ، نہ کہوں تو مشکل۔
ایک مفہوم یہ ہے کہ اگر میں آساں شعر کہنے کی کوشش کروں تو اسے میری طبیعت
گوارا نہیں کرتی۔ اگر آساں نہ کہوں تو شاعر بنا مانتے ہیں۔ گویا کہنا بھی مشکل ہے اور نہ
کہنا بھی مشکل۔

نوراجہ عاتق کے نزدیک۔ اس سے دو سرے لطیف معنی بھی پیدا ہوتے ہیں، یعنی

صاف صاف بات کہتا ہوں تو سنو راجہ کا دل کی نافرمانی اور کٹہ ذہنی ظاہر کرنی چاہتی ہے۔
اگر صاف صاف نہ کہوں تو خود عزم سمجھتا ہوں۔ یہ دونوں طرح مشکل ہے۔



بھیجی ہے جو مجھے کو شاہ و حجم جاہ نے، وال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پر وال
یہ شاہ پسند وال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی وال

لغات : شاہ و حجم جاہ : وہ بادشاہ، جسے جمشید کا جاناو جلال مائل ہے
وال : پہلے مصرع کے آخر میں اس کے معنی اُس وال کے ہیں، جو کھائی
جاتی ہے، دوسرے مصرع کے آخر میں جو وال ہے، اس کے معنی ہیں ولایت
کرنے والا، جو تھے مصرع کے آخر میں وال سے مراد حرفِ وال ہے۔
مشائ پسند بادشاہ پسند : مولگ کی وال شاہی مطیع ہیں ایک خاص طریق پر
پکیتی بنتی، اس کا نام شاہ پسند بادشاہ پسند سمجھا گیا تھا، کیونکہ وہ بہادر شاہ کو
بھی بہت مرعوب بنتی۔

یہی وال بادشاہ وقتاً فوقتاً بہ طور عطیہ مختلف مصاحبوں کو بھیجا کرتے تھے۔
مرزا کو بھیجی گئی تو اسوں نے شکریے میں یہ رباعی کہی۔ اور بادشاہ کی خدمت
میں پیش کی۔

شرح : جمشید جیسے جاہ و جلال والے بادشاہ نے مجھے وال
بھیجی ہے۔ یہ شہنشاہ کے لطف و کرم اور نوازش و عنایات پر ولایت کرتی ہے،
یعنی اس سے پتا چل جاتا ہے کہ حضور والا مجھ پر کس قدر لطف و عنایت فرماتے ہیں

یہ شاہ پسند وال وہ حرفِ دال ہے، جو دولت، دین، دانش اور دار میں استعمال ہوا۔ گویا اس کے اندر محکمت و دین، عقل و خرد اور عدل و انصاف کے جوہر آگئے۔ میرا یہ دعویٰ مذبح کا کارواں ہے، نہ جگر سے کا، یعنی کسی کو اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔



ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں ساقل و عالی باہم
بہاب کے شبِ قدر و دوالی باہم

لغات : صفاتِ ذوالجلالی : اللہ تعالیٰ کے صفات، جو جلال والا ہے۔

آثارِ جلالی و جمالی : اہل علم نے صفاتِ باری تعالیٰ کی دو قسمیں کی ہیں، ایک جمالی صفات، جن میں حسن و غریب، جاذبیت و محبت، شفقت و رحمت اور ایسی تمام صفات شامل ہیں۔ دوسری قسم جلالی صفات کی ہے، جیسے تاہر، جبار و غیرہ۔ کائنات کے نظم میں جلال و جمال دونوں ضروری ہیں۔ اسی طرح بادشاہ میں بھی جلالی و جمالی دونوں قسم کی صفتوں کے نشان پائے جاتے ہیں۔ اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، رسول اللہ (صلعم) کا ارشاد ہے :-

تخلّقو! یا خلاق اللہ اپنے اندر خدائی صفات پیدا کروں۔ انسانیت کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان میں خدا کے صفات کا پرتو زیادہ سے زیادہ پیدا ہو جائے۔
ساقل : ادنیٰ درجے کے لوگ، یعنی عوام۔

عالی : ہنر پر یہ لوگ ایسے اور نچلے منصب رکھنے والے یا دوست مندر یا

اور باب ہجاء و حشمت ۔

شبِ قدر : قرآن مجید میں اس رات کو کہا گیا ہے ، جس میں قرآن کا نزول شروع ہوا ، انا انزلناہ فی یلۃ القدر (ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اتارا) ۔ اس رات کے تقیبن میں اختلاف ہے ۔ ۲۱ سے ۲۷ اور آخر رمضان تک ہر ایک رات کے حق میں روایتیں ملتی ہیں ، لیکن عام عقیدہ ۲۷ رمضان کی رات کے متعلق ہے ۔

قدر کے معنی ہیں اعزاز ، تیز عزت و منزلت ۔ اس سے مراد دونوں ہی چیزیں لی جاسکتی ہیں ، یعنی اعزاز کے کی رات ، جب قرآن مجید انسانوں کو برے کراشد تعالیٰ نے خیر و شر کا ایک آخری اعزازہ منقرذ کر دیا ۔ چونکہ یہ رات بہت غفیر مافی جاتی ہے ، اس لیے قدر و منزلت والی رات بھی کہہ سکتے ہیں ۔

دوای اور دیوالی : ہندوؤں کا ایک تہوار ، جس میں چراغ جلائے جاتے ہیں ۔ مشہور ہے کہ چراغاں کا انتظام بن باس سے رام چندر جی کی واپسی پر کیا گیا تھا اب تک اس یادگار کا سلسلہ جاری ہے ۔

شرح : بادشاہ میں اشد تعالیٰ کی صفات کا پرتو موجود ہے ۔ اس کی جلالی اور جمالی دونوں صفاتوں کا عکس آگیا ہے ۔

چھوٹے بڑے ، اوقی اعلیٰ کیوں ، یکساں خوشیوں ، اب کے قدر کی رات اور دیوالی دونوں تقریبیں اکٹھی آئی ہیں ۔ ان میں سے شبِ قدر صفاتِ جمالی کی مظہر ہے اور اس کا تقابلی عالم نظری ہے ، اس لیے تعالیٰ ، کہ اس کے لیے مفہوم سمجھنا چاہیے دیوالی صفاتِ جمالی کی مظہر ہو سکتی ہے اور اس کا تقابلی عالم منفی ہے ، یعنی دنیا ہے ۔

○
حقِ شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تاشاہ شیوع دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

نغات : شیوع : شاف کرنا ، پھیلاتا ، رواج دینا۔
شرح : ظاہر ہے کہ یہ رباعی بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر کہی گئی
تھی۔ فرماتے ہیں، اندر تعاضل سے دعا ہے کہ بادشاہ سلامت رہیں، ان کی عمر میں جو
اور حقوق شادمان رہے۔ مَدعا یہ ہے کہ بادشاہ کی بدولت عقل و دانش اور عدل و انصاف
رواج پاتے جائیں۔ گویا بادشاہ کے لیے میں عمر کی ضرورت اس لیے ہے کہ دانش و دلو
کی اشاعت اور پھیلاؤ کی ہیں ایک تعبیر ہے۔

اب بادشاہ کے رشتہ عمر میں ایک گانٹھ اور لگائی گئی ہے۔ یہ گانٹھ نہیں، ہاں
میں صفر ہے اور صفر بھی دیا، ہوا اعداد سے پہلے لگا دیا جائے تو ان کی تعداد میں اضافہ
ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسے پہلے صفر لگائیں تو ۱۰ بن جائے گا اور ہم سے پہلے صفر
لگا میں تو ۱۰ بن ہی نہیں گے۔

گانٹھ کی تشبیہ صفر سے کسی تشریح کی غلطی نہیں۔ رشتہ عمر میں گانٹھ سال گرہ کا رد و تہجد ہے۔



اس رشتے میں لاکھ تار ہوں ، بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں ، بلکہ سوا
ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں سہزار ہوں ، بلکہ سوا

شرح : یہ رباعی بھی پہلی رباعی سے متعلق ہے ، فرماتے

جس سال گرہ کے رشتے میں لاکھ تار، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں اور
 جتنے تار ہوں، اتنے ہی برس شمار کیے جائیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ۔
 اگر سو سال کی مدت کو ایک گز فرض کریں تو خدا کرے، ایسی ہزار گز ہیں
 لگائی جائیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ۔

ظاہر ہے کہ اس طرح حساب کرنا خاص حساب و ان کا کام ہے۔ مرزا غالب نے ایک
 قلم کے آخر میں بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے

تم سلامت و ہو ہزار برس ۴ ہر برس کے ہوں وہ پچاس ہزار
 پہلے کی طرح حساب کا یہ معاملہ بھی خاصے غور و فکر کا محتاج ہے اور تاروں کی ایک ششوی
 میں تو مرزا نے حساب کا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ کہتے ہیں:
 بردعائے شہر سخن کو تار باد تا خدا باشد یہاں بادشاہ باد



کہتے ہیں کہ ”اب وہ مردم آزار نہیں
 عشاق کی پریشانی سے اسے عاز نہیں
 جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا
 کیوں کر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

لغات : مردم آزار : لوگوں کو دکھ دینے والا۔
 ہاتھ اٹھانا : کسی چیز سے دست بردار ہو جانا اور الجھنے کے
 لیے بھی ہاتھ اٹھایا جاتا ہے، گویا اس کے منتفاد معنی ہیں اور مرزا نے دونوں
 معنی سے فائدہ اٹھا کر یہ رباعی لکھی۔

شرح : کہا جاتا ہے کہ ہمارا محبوب اب لوگوں کو دکھ نہیں

دیتا، بلکہ عاشقوں کا حال دریافت کر لینے میں بھی اسے عار نہیں آتی اور یہ محبوب کی مہربانی اور لطف و کرم کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ میں تو اس دعوے کو صحیح نہیں سمجھتا۔ جو ائمہ ظلم سے اٹھایا ہوگا، کیونکر تسلیم کریں کہ اس میں توار نہیں؟

ظاہر ہے کہ ائمہ اٹھانے کے دونوں معنی پیش نظر رکھتے ہیں۔ اگر یہ مانیں کہ ظلم کی غرض سے ائمہ اٹھایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ائمہ میں توار ہے۔ اگر یہ مانیں کہ اس نے ظلم ترک کر دیا ہے تو توار اس حالت میں بھی پاس ہوگی۔



ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے۔ اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

لغات : سلام کرنے والے : یہ ان اہل عقائد کا کام ہے جو روزانہ باکر شیوں، معتقدین کو سلام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کا کام بن جائے گا۔

درنگ : توقف، تاخیر، در۔

صبح و شام کرنا : اس میں بھی ایسا ہے۔ اول نظم کائنات کے مختار مطلق کی حیثیت میں صبح کو شام اور شام کو صبح کرنا، دم پس و پیش کرنا، صبح کو کوئی آئے تو شام کے وعدے پر مثال دینا، شام کو آئے تو صبح کے وعدے پر مثال دینا۔

شرح : ہم نے شیعوں، معتدلوں اور کام پر مار کر دینے کے ذمہ داروں کو سلام

کرتے ہیں کوئی گسراٹھانہ رکھتی، لیکن وہ لوگ کام میں دیر کیجے جاتے ہیں۔
 ہمیں بتاتے ہیں کہ چارو، خور سے کہو، افتدہ شدہ فضلہ سے کیا کہیں، وہ تو آپ مسیح و شام کرنا نہیں ہیں۔
 اس مصرع میں جو نکتہ ہے، اس کی تشریح الفت میں کر دی گئی۔

○.

سامانِ خورو خواب کہاں سے لاؤں
 آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
 روزہ، میرا ایمان ہے، غالب! لیکن
 غصہ خانہ و برقاب کہاں سے لاؤں

لغات : غصہ خانہ : امیر لوگ غصہ کی بیڑیوں سے گھر کے اندر ایک
 چار دیواری سے بنالیتے ہیں۔ ان پر بڑا بڑا پانی چھڑکا جاتا ہے اور گرمی موسمی نہیں ہوتی۔ روزہ
 رکھ کر آرام سے اس میں سو جاتے ہیں۔

برقاب : برت والی پانی، جو روزہ گزار کر تھکے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔

شرح : اسے غالب ۱ روزہ میرا ایمان صدور مجھ پر ہے۔ میں خدا
 کی طرف سے اسے ایک ایسا فرض سمجھتا ہوں، جو ہر حال میں پورا ہونا چاہیے، لیکن مصیبت
 یہ ہے کہ کھانے پینے اور بہ آرام سونے کا سامان کہاں سے لاؤں؟ روزہ کے لیے آسانگی
 کے جو اسباب درکار ہیں، وہ کہاں سے لاتے آئیں؟ شلا غصہ خانہ کہاں سے لے کر قاب کہاں
 سے دستیاب ہو؟

مطلب یہ کہ روزہ وہی لوگ بہ اطمینان رکھ سکتے ہیں، جنہیں اتنی فراخی میسر ہے کہ
 رمضانِ آرام سے گزارنے کے سامان جمع کر لیں۔ مسکین اور غریب آدمی ہوں، کھانے پینے ہی
 کا گزارہ نہیں ہوتا، سامان کہاں سے لاؤں؟

خواجہ مالکی فرماتے ہیں کہ یہ رباعی بھی اس قطعے کے ساتھ دربار میں پیش کی گئی تھی۔ جو روزے کے متعلق تعلقات میں درج ہو چکا ہے۔



ان سیم کے بچوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغان شہر والانے
رگن کر دیوں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تیج کے ہیں یہ دلنے

لغات : سیم : خواجہ مالکی فرماتے ہیں، جو فیروزہ بیضی شکل کا ہوتا ہے، وہ سیم ہے۔ سے بہت مشابہ ہے۔ بچوں کا سالن پکایا جاتا تھا، بادشاہ نے ایک مرتبہ مرزا کے لیے یہی سالن بھیجا تھا جس کے شکریہ میں یہ رباعی کہی گئی۔
ارمغان : تحفہ، سوغات۔

شرح : سیم کے ان بچوں کی حقیقت کسی کو کیا معلوم ہو سکتی ہے، جو عالی قدر بادشاہ نے سوغات کے طور پر بھیجے ہیں۔

ہم ایک ایک بچ کو سو سو بار رگن کر دعائیں دیں گے۔ یہ سیم کے بیج نہیں فیروزے کی تیج کے دلنے ہیں۔ چونکہ سیم کا بیج فیروزے سے مشابہ ہوتا ہے اس لیے ان بچوں کو فیروزے کی تیج کہنا اور تیج کی مناسبت مناج تشریح نہیں۔

ضمیمہ اول

یہ ضمیمہ غزلوں، قصیدوں، قطعوں یا دوسرے
اشعار پر مشتمل ہے، جو کسی دوسرے دیوان میں
شامل نہ ہو سکے۔ مصادر کا ذکر بابچا حواشی
میں درج ہے۔



دیکھنے میں ہیں گرچہ دو پر ہیں یہ دونوں یار ایک
 وضع میں گو ہوئی دو سز تیغ ہے ذوالفقار ایک
 ہم سخن اور ہم زبان حضرت قاسم و تپاں
 ایک تپش کا جب نشیں درد کی یادگار ایک
 نقد سخن کے واسطے، ایک حیا را لگی
 شعر کے فن کے واسطے، مایہ اعتبار ایک
 ایک وفا و مہر میں تازگی بساط و ہر
 لطف و کرم کے باب میں، زینت روزگار ایک
 گلہ ز تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بو
 ریختے کے قماش کو، پوچھے ایک تار ایک
 مملکت کمال میں ایک امیر نامور
 عرصہ قیل و قال میں، خسر و نامدار ایک
 گلشن اتفاق میں، ایک بہار بے خزاں
 میکہ وفاق میں، بادۂ بے غم را ایک
 زندہ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
 کشتہ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک

قاسم و تپاں

تہذیب :- یہ شعر
 جن کی ظاہری
 صورت غزل کی
 ہے۔ میرزا غالب
 نے گلستا میں اپنے
 دو عزیز دوستوں
 شہزادہ میرزا
 ابوالقاسم خاں قاسم
 اور میرزا احمد بیگ
 خاں تپاں کے لیے
 کہے تھے۔ انہیں
 ۱۸۶۸ء تا ۱۸۶۹ء
 کا کلام سمجھنا چاہیے
 میرزا
 ابوالقاسم خاں قاسم
 تیہوری خاندان
 کے شہزادے تھے
 بعض اصحاب نے
 لکھا ہے کہ وہ
 میں اپنے خاندان
 کی قدر و منزلت

دو نوں کے دل حق آشنا، دونوں رسول پر خدا
 کا زوال دیکھ کر
 ایک محب چار یار، عاشقِ بشت و چار ایک
 دل برداشتہ چو
 جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نو بہار
 اور وطن چھوڑ کر
 فرقِ ستیز و مست کو، ابرنگرگ بار ایک
 گلستاں چلے گئے۔
 لایا ہے کہ کے یہ غزلِ شاہدہ ریا سے دور
 دہی گوشہ نشینی
 اختیار کر لی اور
 باقی عمر گزار دی

میرزا غالب
 کی چند تحریرات

سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انگریز حاکموں سے قاسم کے تعلقات بہت گہرے تھے
 سید مسعود حسن رضوی نے یہ اشعار پہلے پہل دسمبر ۱۹۳۲ء کے "انظر"
 میں چھپوائے تھے۔ "انظر" کے حوالے سے روزنامہ "انقلاب" نے انہیں شائع کیا۔
 بعد ازاں سید موصوف نے انہیں "متفرقات غالب" پتھاپ دیا۔ ساتھ ہی میرزا کے
 بہت سے فارسی خطوط شائع کئے۔ جن میں سے نو میرزا پتیاں کے نام تھے اور بیس
 میرزا قاسم کے نام۔ موصوف نے ذکرِ مکاتیبِ قیامِ گلستاں کے دوران میں لکھے گئے تھے، جن
 سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم وقتاً فوقتاً کھانے کے خوان یا دوسرے تحفے میرزا غالب
 کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ قاسم بیمار ہوئے تو میرزا غالب نے جو باقائدہ
 طب کی تعلیم پا چکے تھے۔ مسل کا نسخہ تجویز کیا جو بے حد مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ قاسم
 نے پانچ شرکا ایک قطعہ میرزا غالب کے پاس بھیجا، جس میں لکھا:

می سزدگر بگویمت بقراط در فداطوں بخوافت زیباست
 زان گل دور شد مرض بالکل گر بگویم توئی مسخِ حبِ باست

میرزا غالب نے اس کے جواب میں دو طویل فارسی قطعے لکھے۔ قاسم کے مزید
 حالات معلوم نہ ہو سکے، البتہ میرزا غالب کے خطوط اور قطعات سے اندازہ ہوتا

ہے کہ وہ نہ بنایا شیعہ تھے۔ ایک خط میں، جو دہلی سے لکھا گیا تھا، یہ واضح ہوتا ہے کہ قاسم کے فرزند محمد میرزا کا انتقال ہو گیا تھا اور میرزا غالب اس کی تاریخ کھنہ کی ٹکریں تھے میرزا احمد بیگ پتیاں نواب عطاء اللہ خاں کے فرزند اور دہلی کے باشندے تھے۔ نکلنے ہمارے صدر دیوانی میں مختار بن گئے تھے۔ اور غالباً کچھ مدت مرشد آباد میں گزری تھی۔ وہ میرزا محمد اسماعیل معروف بہ مرزا جان تپیش کے شاگرد تھے۔ میرزا نور نواب احمد بخش خاں اور نواب انبی بخش خاں معروف کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ میرزا غالب کے بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ پتیاں بخش کے مقدسے میں نواب شمس الدین احمد خاں کے طرفدار تھے۔ جن کے خلاف میرزا غالب نے دعویٰ کیا تھا۔ پتیاں نے ۱۲۳۴ھ میں بہ تمام نکلنے ہی میں وفات پائی، جیسا کہ نساج کے تذکرہ مصنف شہادت میں بیان کیا ہے۔ پتیاں اور ان کے استاد تپیش دونوں اپنے تعلق ”طائے گھتے تھے لیکن دونوں صحیح ت ہی سے ہیں۔

۱۔ لغات - دوسرے دودھاری والی

شرح - اگرچہ یہ دونوں دوست، یعنی قاسم و پتیاں دیکھنے میں دو نظر آتے ہیں مگر ان کے درمیان محبت و رفاقتی کا ایک ایسا رشتہ موجود ہے کہ حقیقتاً دونوں ایک ہیں۔ مثال یہ سمجھنے کہ اگرچہ حضرت علیؑ کی تلوار ذوالفقار کی دھاریں دو تھیں۔ لیکن تلوار ایک ہی تھی۔

۲۔ شرح - جناب قاسم اور جناب پتیاں دونوں ہم سخن اور ہم زبان ہیں۔ یعنی دونوں شاعر ہیں۔ ان میں سے ایک تپیش کا جانشین ہے۔ یعنی احمد بیگ پتیاں جو مرزا جان تپیش کے شاگرد تھے۔ دوسرا خواجہ میر درد کی یادگار ہے، یعنی قاسم کا سلسلہ تلمذ خواجہ میر درد سے ملتا ہے۔

تلاش کے باوجود پتیاں نہ چل سکا۔ کس ذریعے سے خواجہ میر درد کے ساتھ تعلق قائم نہ ہوا۔ بظاہر خواجہ سے براہ راست استفادہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ناممکن نہیں۔ کیونکہ خواجہ مرحوم کا انتقال ۱۱۹۹ھ ۱۲۰۵ھ میں ہوا۔ بہر حال یہ واضح ہے

کو قاسم بلا واسطہ یا بالواسطہ خواجہ میر درد ہی سے وابستہ تھے ۔

۳۔ لغات - حیارہ کسوٹی

آگہی : علم و شعور

شرح : ان دونوں میں سے ایک نقد شعر کے لئے علم و شعور کی کسوٹی ہے اور دوسرا اس فن کے لیے عز و قدر کا سراپہ ہے ۔

۴۔ لغات - بساط : فرش

شرح - دونوں میں سے ایک محبت و وفا میں زندگی کے لیے تازگی و شادابی کا سر و سامان ہے اور دوسرا لطف و کرم کے اعتبار سے روزگار کی زیب و زینت ہے ۔

۵۔ لغات - تلاش : وضع ، ڈھنگ ، ایک ریشمی کپڑا ، یہاں آخری

معنی مراو ہیں ۔

پنڈ : بانا ۔

تار : تانا ۔

تار و پور : تانا بانا +

شرح - اگر تلاش کو ایک باغ فرض کریں ، جو پھولوں سے چاڑھا ہو تو اس کے لئے قاسم و تپان میں سے ایک رنگ ہے اور دوسرا خوشبو۔ بین تلاش کے باغ میں جتنے بھی پھول ہیں ۔ ان دونوں کے گلے سے بنے ہیں ۔ گویا انہیں مضامین کی تلاش میں کہاں حاصل ہے ۔ اسی طرح اردو شعر گوئی کو ریشمی کپڑا سمجھیں تو اس کپڑے کے لئے دونوں میں سے ایک بانا ہے ، دوسرا تانا ۔ مطلب یہ کہ رہنے کا انحصار انہیں پر ہے ۶۔ لغات - عرصہ قیل و قال : گفت گو کی سرزمین ۔

شرح - کہاں کی مملکت میں ایک کو نامور امیر کا منصب حاصل ہے ۔ دوسرے کو گفت گو کی سرزمین میں نام آور بادشاہ سمجھنا چاہیے ۔

۷۔ لغات - وفاق : موافقت ، یک جہتی ، محبت ، ہم آہنگی ، مل جل

کر رہنا۔

شرح۔ انفاق کے بارے میں ایک دوست ایسی ہمارے ہے۔ جس پر کبھی خدا نہیں آسکتی۔ محبت و یک جہتی کے شراب غلے میں دوسرا دوست ایسی شراب ہے۔ جس کا نشہ کبھی نہیں اترتا اور خمار کی کیفیت کبھی رونما نہیں ہوتی۔

۸۔ **شرح**۔ جو شخص شعر کے شوق میں زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے لیے دونوں دوستوں میں سے ایک کو چراغِ محفل کی حیثیت حاصل ہے۔ جس شخص نے شعر کے ذوق میں جان دے دی، دوسرا دوست اس کے مزار کے لیے شمع ہے۔

مطلب یہ کہ شعر کا شوق رکھنے والے یقیناً محفل آراستہ کریں گے تاکہ ایک دوست کو شعر مت نہیں اور محفوظ ہوں۔ ایسی محفل کے لیے دونوں دوستوں میں سے ایک چرچا ہے اسی طرح جو شخص مر جائے، اس کے مزار کی رونق اس شمع ہی سے ہوتی ہے جو وہاں روشن کی جاتی ہے۔ ذوقِ شعر میں مرنے والے مزار کی رونق دوسرا دوست ہے۔

۹۔ **لغات**۔ **مُحِبِّ چار یار**۔ رسول اللہ (صلعم) کے چار ممتاز صحابیوں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ سے محبت رکھنے والا۔ یہ اہل سنت کی خصوصیت ہے۔

عاشقِ بہشت و چار بہشت و چار بارہ، مراد ہے بارہ آئمہ کرام حضرت علیؓ سے امامِ نہدہم تک، آئمہ کرام کے عاشق سے مراد ہے شیعہ۔

شرح۔ دونوں دوستوں کے دلوں میں خدا کی محبت ہے۔ دونوں رسول اللہ (صلعم) کے دارِ شفیعہ ہیں۔ ان میں سے ایک چار یار سے محبت رکھنے والا، یعنی سنی ہے، دوسرا بارہ اماموں کا عاشق یعنی شیعہ ہے۔ سنی سے مراد میرزا احمد بیگ خاں تپاں میں اور شیعہ سے مراد۔ میرزا ابوالقاسم خاں قاسم، جیسا کہ میرزا غالب کے بعض خطوط سے بھی واضح ہوتا ہے۔

۱۰۔ **لغات**۔ **فرق**، سر

ستیز و مست : لڑائی کا دلدادہ۔

مگر گ بار :- اوے پر سانسے والا - ٹرالہ بار

شرح - جو جان وفاق کی شیدائی ہو۔ اس کے لیے دونوں میں سے ایک دوست
نوبہار کی خوشبو ہے اور چرسڑائی کا دلدارہ ہو۔ اس کے لیے دوسرا دوست اوسے بچا
دلہا دل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۱ - لغات - شانہ : آمیزش ، ملاوٹ۔

شرح - خاکسار غالب دل و زبان کو ایک کر کے یعنی خلوص سے یہ غزل کہ
کر لایا ہے اور یہ میا و نقاش کی ملاوٹ سے بالکل پاک ہے۔ یعنی جو کچھ کہا گیا ہے
اس کی حیثیت دکھاوے کی نہیں، بلکہ جو کچھ دل میں موجزن تھا، وہی زبان پر جاری
ہوا۔ اس طرح دل اور زبان ایک ہو گئے۔

۱ - لغات

آرمیدہ :-

آرام پایا ہوا،

مطلن۔

شرح :-

میرے لیے

بھولے سے

بھی اطمینان و

آرام کے ساتھ

شہر جانا ممکن

نہیں۔ میں غم

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں

میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد ویدہ ہوں

ہوں دردمند جبر مویا اختیار ہو

گناہ کشیدہ، گناہ چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن

از بس کہ تمنی غم جسراں چشیدہ ہوں

نے سحر سے علاقہ، نہ ساغر سے واسطہ

میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
 نے دانہ فقاوہ ہوں، نے دام چسیدہ ہوں
 جو چاہیے، نہیں وہ مری فتدرو منزلت
 میں یوسف بہ قیمتِ اول حسریہ ہوں
 ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
 ہوں میں کلامِ نغز، دے ناشنیدہ ہوں
 اہلِ دروغ کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
 پر عاصیوں کے زمرے میں، میں برگزیدہ ہوں
 پانی سے لگ گزیدہ ڈرے جس طرح آمد
 ڈرتا ہوں آنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں !

۲۔ لغات :- جبر :- ظلم، زبردستی، ایک عقیدہ، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اسے کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں۔
 اختیار :- جبر کے برعکس، یعنی انسان اپنے افعال میں مختار و آزاد ہے۔

شرح :- مجھے جبر کا قائل سمجھا جاتے یا اختیار کا۔ مجبور قرار دیا جائے یا مختار
 لیکن میری دردمندی اور غمگینی میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ اگر اختیار کا معاملہ ہو تو میری
 حالت اس آہ و فغاں کی سی ہے، جو درد کی حالت میں کچھ نہی یا کی نہاتے۔ اگر مجبور
 (میں تو میری حالت اس آنسو کی سی ہے، جو بے اختیار پگھلا رہتا ہے۔

جبر و اختیار کی کتنی عمدہ مثالیں پیش کیں اور دونوں درونم کی مثالیں ہیں۔ نادر کہیں اختیار ہی فعل ہے۔ وہ بھی رنج و غم کا نشان ہے۔ آنسو کا ٹپکنا اضطراری فعل ہے وہ بھی اندوہ و قلق ہی کی دلیل ہے۔

۳۔ شرح۔ جان لبوں پر آگئی۔ چونکہ وہ شیریں ہوتی ہے، اس لئے یہی ہونا چاہیئے تھا کہ منہ میں ہر طرف مٹھاس کی لذت پھیل جائے۔ یہ نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے غم فراق میں بے حد تخی اٹھائی ہے۔ اس تخی نے کام و دہن میں اس قدر کڑواہٹ پیدا کر دی کہ ہان کی شیرینی بھی ذائقہ نہیں چل سکی۔

۴۔ لغات۔ معرض مثال :- مثال عرض کرنے یعنی پیش ہونے کی جگہ۔ مطلب ہے بطور مثال۔

شرح۔ ذہ مجھے تسبیح سے کوئی علاقہ ہے کہ عبادت گزار بندہ بن جاؤں، نہ جام شراب سے کوئی واسطہ ہے کہ زندی کر سکوں۔ آپ میری کیفیت بطور مثال بتانا چاہیں تو سمجھ لیں کہ میرے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ہاتھ کٹ جائیں وہ ذہ تسبیح پکڑ سکتا ہے، نہ پیالہ اٹھا سکتا ہے۔

۵۔ شرح۔ میں یقیناً خاک پر پڑا ہوا ہوں، لیکن خاک پر پڑی ہوئی چیزوں میں سے ایسی بھی ہیں، جو دوسروں سے دشمنی رکھتی ہیں۔ مثلاً پھیلے ہوا جال اور اس پر ڈالا ہوا داغ دونوں زمین پر ہوتے ہیں۔ لیکن مقصود یہ ہوتا ہے کہ پرندوں کو کچڑ لیا جائے۔ میں وہ مسکین اور خاکسار ہوں کہ مجھے کسی سے بھی دشمنی نہیں۔ نہ میں داغ ہوں کہ پرندہ مجھے چگنے کے لیے آئے، نہ جال ہوں جس میں کسی کو پھانس لیا جائے۔

۶۔ شرح۔ میں جس عزت اور قدر و منزلت کا مستحق ہوں، وہ مجھے نصیب نہیں۔ میں یوسف تو ہوں۔ مگر اس حال میں ہوں، جب وہ پہلی مرتبہ بچے تھے۔

بھائی حضرت یوسف کو کنوئیں میں پھینک کر چلے گئے تو قرآن مجید کا بیان ہے کہ قافلہ آیا۔ سقے نے پانی بہرنے کے لیے ڈول دکھایا، اس حکمت یوسفؑ

نکل آئے۔

”سقا پکارا تھا: کیا خوشی کی بات ہے، یہ تو ایک لڑکا ہے، پھر قافلے والوں نے اسے سرہانہ تھارت سمجھ کر چھاپ رکھا، کوئی دھوکے دار نہ نکل آئے، اور وہ جو کچھ کر رہے تھے، اللہ کے علم سے پوشیدہ نہ تھا اور انہوں نے یوسفؑ کو بہت کم داموں پر کر گنتی کے چند درہم تھے: فروخت کر دیا۔“

یہ بہ قیمتِ اولِ خریدہ کاشوت ہے یعنی چند درہم۔ میرزا کہتے ہیں کہ میری قدر و منزلت بہت اونچی ہے، لیکن جوتی نہیں۔ گویا میں یوسفؑ تو ہوں مگر پہلی مرتبہ بکاموں۔ آگے چل کر میرے پورے جو سر کھلیں گے۔

۷۔ لغات۔ کلامِ نغز: نہایت عمدہ اور اعلیٰ کلام۔

شرح: ۱۔ افسوس مجھے کسی کے بھی دل میں جگہ نصیب نہیں جوتی۔ میں نہایت عمدہ اور اعلیٰ کلام ہوں۔ لیکن ابھی تک کسی نے مجھے نہیں سنا۔

کلام اُسی وقت دل میں جگہ پاسکتا ہے، جب سنا یا پڑھا جائے۔ جس کلام نے کانوں تک رسائی نہ پائی، وہ دل تک کیونکر پہنچ سکتا ہے؟

۸۔ لغات۔ وریع: پرہیزگاری۔ اہل لغت کے نزدیک ”ر“ مفتوح

بھی درست ہے اور ساکن بھی، اسی لئے یہ مصرع دونوں طرح دیکھا گیا: اتوں اہل وریع کے حلقے..... الخ، دوم ہر چند اہل وریع کے حلقے.... الخ
برگزیدہ: چنا ہوا، نہایت عالی پایہ۔

شرح: اگرچہ میں پرہیزگاروں کے حلقے میں بہت پست و ذلیل ہوں اور میری حیثیت بہت نیچی ہے، لیکن گنہگاروں کے زمرے میں اگر دیکھیں، میرا پایہ بہت بلند ہے۔

مطلب یہ کہ میں نے پرہیزگاری کا کام کوئی نہ کیا، گناہوں میں برابر سرگرم رہا۔ اس لئے جہاں اونچا مرتبہ حاصل کرنا ضروری تھا، وہاں بہت نیچا رہا۔ اور

جہاں سب سے نیچا رہنا چاہیے تھا، وہاں بہت اونچا ہو گیا۔

اس مسئلے میں عرقی کا ایک شعر قابل ملاحظہ ہے یعنی :

گو کہ نیست گنہگارِ تر دمنِ عرقی کہ ایں حدیث گراں یاف کی تائی است

یعنی اسے عرقی یہ نہ کہہ کر مجھ سے زیادہ گنہگار کوئی نہیں، کیونکہ ایسی بڑی بات منہ سے نکالنے کا مطلب یہ ہو گا کہ تو کسی نہ کسی دائرے میں رنگ نہ دیکھتا ہے۔ یہ بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔

۹۔ لغات : لگ گزیدہ : جسے دیوانے کہتے تھے کٹ لیا ہو۔ ایسے شخص کے جسم میں دیوانے کہتے کا ذہر سرایت کر جائے تو وہ پانی سے بہت ڈرتا ہے، کیونکہ پانی دیکھتے ہی اس پر تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور لگ پٹنے کھینچنے لگتے ہیں۔

مردم گزیدہ : جسے آدمیوں سے حد درجہ آزار اور دکھ پہنچا ہو۔

شرح :- اے استاد! جس طرح دیوانے کہتے کا کاٹا ہوا پانی سے

ڈرتا ہے۔ اسی طرح میں آئینے سے ڈور بھاگتا ہوں۔ کیونکہ مجھے میرے ہم جنسوں نے سخت دکھ اور آزار پہنچایا ہے، یعنی وہ ہمیشہ مجھے کٹ کھانے کے ورپے رہے۔ آئینہ دیکھنے سے ہم جنس اور ان کی تمام ایذا رسائیاں تازہ ہو جائیں گی۔

اپنا احوال دلِ زار کہوں یا نہ کہوں بے حیاءانہ اظہار کہوں یا نہ کہوں

نہیں کرنے کا میں تقریر ادبِ باہر میں بھی ہوں، اقباسِ کہوں یا نہ کہوں

لکھوہ سمجھو اے یا کوئی شکایت سمجھو اپنی رستی سے جوں بیزار کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاری دل جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں

دل کے ہاتھوں سے کہ جسے دشمنِ جانی پنا ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جاں ہے غماز گوش ہیں در پس دیوار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو استاد

حسب حال اپنے پھر اشارہ کہوں یا نہ کہوں؟

۱۔ شرح - اے خراب و خستہ حال دل! میں اپنی کیفیت بیان کروں یا نہ

کروں؟ بیان کرنے سے شرم منع کرتی ہے۔ تو بتا کہ کچھ کہوں یا کہوں؟

۲۔ شرح - اے محبوب! میں بھی آپ کے تمام بھیدوں سے واقف

ہوں۔ فرمائیے، بیان کروں یا نہ کروں؟ اتنا ہنسنے دیتا ہوں کہ میری تقریر ادب

کے دانے سے باہر کبھی نہ ہوگی۔ یعنی میں کچھ بھید زبان پر لے آؤں گا تو وہ بھی

اسی طرح بیان کروں گا، جس طرح کرنے چاہئیں۔

۳۔ بغا پر خطاب باری تعالیٰ ہے۔

شرح - کہتے ہیں، میں اپنی مستی سے بیزار ہوں۔ اب اس کا اظہار کر رہا

یا نہ کروں؟ آپ چاہیں تو اسے شکر سمجھ لیں، چاہیں شکایت قرار دے لیں۔

۴۔ شرح - میں دل کے رنج و غم اور گرفتگی کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن

غم خوار کوئی نہیں ملتا۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ یہ سب کچھ اپنے دل ہی سے کہہ

لوں یا نہ کہوں؟

۵۔ شرح - دل میرا جانی دشمن ہے اور اس کے ہاتھوں میں پھنس گیا

ہوں۔ سوچتا ہوں کہ یہ بات کہوں یا نہ کہوں؟

۶۔ لغات - غماز، چٹل خور

شرح - میں تو دیوانہ ہوں۔ جو کچھ جی میں آتا ہے۔ کہے جانا میرا خاصہ

ہے۔ زمانہ چٹل خود ہے۔ ہر دیوار کے ساتھ کان لگے ہوئے ہیں۔ عجب مصیبت

میں مبتلا ہوں، کچھ کہوں یا نہ کہوں؟

۷۔ شرح - اے استاد! میرا محبوب آپ سے میرا حال نہ پوچھے تو

جتائیے، اپنے سببِ حال شعر کہوں یا نہ کہوں تاکہ کسی طرح میرا حال محبوب
تک پہنچ جائے ؟

یہ غزل دیوانِ معروف و نواب الہی بخش خاں مرحوم، جو میرزا کے خسر تھے،
میں جٹ سوتی۔ کیونکہ معروف نے اس پر قلم لکھا تھا۔ گویا یہ ۱۸۳۱ء کا تاریخِ وفات مرثیہ
سے پیشتر کا کلام ہے۔

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بنِ تکیہ

ہوا ہے موجبِ آرامِ جہانِ دنِ تکیہ

خراجِ بادِ شبِ ہمیں سے کیوں نہ مانگوں آج ؟

کہ بن گیا ہے غمِ جعدِ پرِ شکنِ تکیہ

بنا ہے تختہ، گلہانے یا سمین، بستر

ہوا ہے دستہٴ نسرینِ دستِ نِ تکیہ

فروغِ حسن سے روشن ہے خوابِ گاہِ تمام

جو رختِ خواب ہے پردیں تو ہے پرِ تکیہ

مزا ہے، کہو کیا خاکِ ساتھ سونے کا ؟

لکے جو بیچ میں وہ شوبِ سیمِ تنِ تکیہ

اگر چہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر

اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلِ بدنِ تکیہ

۱۔ شرح

وصل کی ذات

بچہ میرا غمِ خواہ

بن گیا اور وہی

میرے جان و

تن کے لیے

آرام کا موجب

ہوا۔

۲۔ لغات

جعد پر شکن؛

بیچ در بیچ زلف

شرح :-

میرا بچہ بیچ در

بیچ زلف کا غم

بن گیا ہے اس

سے میری حیثیت

اتنی بلند ہو گئی

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو تاگہاں غالب :
 اگرچہ زانو سے تل پر رکھے دمن تکیہ
 بہ ضرب تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
 کہ ضرب تیشہ پہ رکھتا تھا کوہ کن تکیہ
 یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک
 رکھو نہ شمع پر اے اہل انجمن تکیہ

بادشاہ چین

خوار مجتہد کے ظاہر

دو سبب معلوم ہوتے

ہیں، اول برسرِ سبب

یہ کہ یوب کی سیاہ ،

خدا ارادہ معجز نہیں

مکنا ف کے یہ

باعتدال رکھتا ہوتا ہے،

اور ناطے کا سب سے

بجا مرکز زمین ہے کیونکہ

نقشا اور نقش دو نول چین

کے علاقے تھے

ایک پہلو یہ بھی

ہے کہ "چین" کے

معنی "شکن" ہوتے

ہیں اور تکیہ جس پر شکن

ہوا گیا تو کافی "چین" اس

میں آگئے، لہذا فرمایا

کہ اب تو چین کے بادشاہ

لیکن
 اگرچہ چینک دیا تم نے دُور سے، لیکن
 اٹھائے کیونکہ یہ رنجور خستہ تن، تکیہ
 غش آگیا جو پس از قتل، میرے قاتل کو
 ہوئی ہے اُس کو مری نعش بے کفن، تکیہ
 شبِ فراق میں یہ حال ہے ازیت کا
 کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کے ہے من تکیہ
 روارکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ "تکیہ کلام"
 اب اُس کو کہتے ہیں اہل سخن "سخن تکیہ"
 ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہنے ہیں
 فقیر غالب مسکین کا ہے کمن نکاہ

سے مرانے سکتا ہیں۔

۲۔ **شرح :** بستر جنبی کے پہلوں کا تہہ ہی کیا ہے اور نیچے کے پاسے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرے و فترت کے پہلو پہنچنے کو اکتھے کہیے گئے اور ایک گلو سے بنا دیا گیا۔

۳۔ **لغات :** پند و پیرن : ستاروں کے دو بڑے ست۔
شرح : عین کی جلا سے میرے سونے کا کرہ سارے کا سارہ روشن ہو گیا۔ بستر پر رہی ہو گیا اور نیچے سے پند کی شکل اختیار کر لی۔

واج رہے کہ ان چاروں شعروں میں شب وصال کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ **شرح :** بھلا سوچے کہ جب ہمارا شوخ و دین محبوب درمیان بکیر رکھ دیتا ہے تو ہم غلابی کا کیا طعم آئے؟

۶۔ **شرح :** اگرچہ بھول بیٹھے ہیں واسے محبوب کا ارادہ یہی تھا کہ بکیر اٹھا کر ایک طرف رکھ دے، مگر خدا کا شکر ہے کہ نزاکت کے باعث وہ اُسے اٹھا نہ سکا۔

۷۔ **لغات :** تل اور دمن : ہندوستان کے مشہور عاشق و معشوق۔
 تل راجا تھا، دمن اس کی محبوبہ تھی۔ ان کی داستانِ عشق فیض نے اپنی مشہور قرینِ مشنوی میں بیان کی ہے۔

شرح : اگر دمن تل کے زانو پر بکیر رکھتے اور سہارا دینا چاہے تو وہ چادر کو کاٹ کر اچانک غائب ہو جائے۔

۸۔ اس شعر میں ”بکیر“ کے معنی ”سہارا“ ہیں۔

شرح : چونکہ فریاد کا سہارا تیشے کی ضرب پر تھا۔ اس لیے وہ تیشے ہی کی ضرب سے ہلاک ہو گیا۔

مطلب یہ کہ فریاد نے تیشے کے بل پر گویا بے ستوں کاٹنے کا ارادہ کیا اور اسے کاٹ کر بھی رکھ دیا، لیکن افسر پر سہارا نہ رکھا۔ اپنی قوت سے تیشے کی ضرب لگانے ہی کو حصولِ مقصد کا ذریعہ سمجھا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر خود ہی سر پر تیشہ مار کر مر گیا۔

۹۔ یہاں بھی ”تکلیف“ کے معنی مسارا ہیں۔

شرح : اسے اہل مغل! خلع پر مبروسا ذکر ہے۔ یہ معج ہونے تک پہنچ جانے کی۔ گویا خلع کے سہارے جزم میں جو جنگا مسارا ٹائی ہے، وہ صرف رات بھر کے لیے ہے۔ صبح ہوتے ہی خلع گل ہو جائے گی۔ ساتھ ہی جنگا کے کی بلا بھی پیشی جائے گی۔

۱۰۔ لغات : رنجور خستہ تن : وہ بیمار، جس کا بدن زخموں سے پتھر پتھر ہو۔

شرح : میں بیمار ہوں، زخموں سے میرا بدن پتھر پتھر ہے۔ میں نے ٹکڑے ٹکڑے تم نے دُور سے پھینک دیا، جو مج تک نہ پہنچ سکا۔ اب تمہیں سوچو کہ میں وہ تکلیف کیوں کر اٹھاؤں!

۱۱۔ شرح : میرے محبوب نے مجھے قتل کر ڈالا۔ میں گر گیا تو اسے یہ کیفیت دیکھ کر فرش آگیا۔ پتا چلے وہ بھی گرا اور اس حال میں میری بے کفن لاش اس کے لیے ٹکڑے بن گئی۔

۱۲۔ لغات : من : وہ شرہ، جو سانپ کے منہ میں رہتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ اندھیری رات میں سانپ اسے اٹھ لی دیتا ہے تو وہ شعلے کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔

شرح : محبوب سے جدائی کی رات میں جو اذیت پہنچی رہی ہے اس کا حال کیا بتاؤں؟ بس یہ سمجھ لے کہ بستر سانپ بن گیا ہے اور ٹکڑے اس کا منہ ہے۔

۱۳۔ شرح : آپ جائز سمجھیں یا نہ سمجھیں، لیکن یہ بتا دیتا چاہتا ہوں کہ پہلے جس چیز کو ”تکلیف“ کلام کہتے تھے، اب اہل سن اسے ”سخن تکلیف“ کہتے ہیں۔

”تکلیف کلام“ سے مراد ہے وہ لفظ یا جملہ جسے کوئی شخص دوران گفتگو میں بار بار دہرا لے۔ لغت کے لحاظ سے ”سخن تکلیف“ کے بھی وہی معنی ہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ بلاشبہ ”تکلیف کلام“ ایک مسلم عاوردہ ہی چکا ہے، لیکن اب غنودوں نے ”تکلیف کلام“ کی جڑ سنو ”تکلیف“

کہنا شروع کر دیا ہے۔ آپ اسے ہائز نہیں کہتے تو نہ سہی۔

یہ غزل غزلِ خصوصیت سے آخری اشعار میں میرزا نے قاور الکلومی کے جو جو ہر دکھائے ہیں، ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔

۱۳۔ شرح : ہم اور آپ آسمان کو ملک پہنچنے پر لڑھا آسمان کو رہے ہیں۔ وہی غائب جیسے عاجز فقیر کا چڑا نا سہا ہے۔

یہ غزل مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے قلاب سعید الدین احمد خاں غائب کی بیاض سے حاصل کر کے "ابلل" نکالتے ہوئے ۲۲ جولائی ۱۹۳۲ء میں شائع کی تھی، پھر یہ "مجددہ" دہلی میں شائع ہوئی۔



تمہید :- میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیدار سے خوش اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اور سہی
تم ہو بُت، پھر تمہیں پندارِ بخارنی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
خُش میں خور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کو چھ کا ہے مائلِ دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

یہ غزل، جیسا کہ منقطع سے ظاہر ہے قلاب طاؤس الدین احمد خاں غلابی نے باسرا کی ہوئی تھی اور میرزا غائب نے ۲۶ جولائی ۱۹۳۵ء کے مکتوب میں غلابی کے پاس نوادہ بھیجی دی تھی۔ یہ اس لیے دیوان میں شامل نہ ہو سکی کہ میرزا کا کوئی دیوان ۱۹۳۵ء کے بعد نہ نکلا تھا۔

کیوں نہ فر دوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آب بقا اور سہی
مجھ سے، غالب! یہ علانی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی
اسے زیادہ کر لو، میں ہرگز مہ شکایت داد کروں گا۔

۶۔ لغات : ہوس پیشہ : جو تپا عاشق نہ ہو اور محض ہوا دوس کا بندہ ہو۔

شرح : اسے چاند کے بیسے با عشق دھک محبوب! غیر مر گیا ہے
تو اس کا غم کیوں کرتے ہو؟ ایسے بندگان ہوا دوس بہت ہیں۔ جو مر گیا ہے، اس
کے ہوا کسی کو اپنا لیجیے۔ اگر آپ کو ہوا دوس کے بندے ہی مطلوب ہیں تو وہ
ایسے نایاب نہیں کہ مل نہ سکیں۔

شاعر کا اصل مقصد یہ ہے کہ میرے سوا جتنے بھی لوگ محبوب کے پاس
جائیں گے۔ بچے عاشق نہ ہوں گے۔ حقیقی عشق صرف میری ذات تک محدود ہوگا۔
۲۔ لغات : پندار : خیال، غرور، بکثرت، تصور۔

شرح : تم ثابت ہو (اور محبوبوں کو اکثر ثابت ہی کہا جاتا ہے)، پھر تم
میں خدائی کا غرور بکثرت کیوں پیدا ہو گیا، یعنی تم خدا کیوں بن رہے ہو؟ میری بات مانو۔
خدا کو الگ رہنے دو، صرف خداوند، یعنی مالک و آقا ہی کہلاتا تھا، رہے بیسے
مناسب ہے۔

۴۔ **شرح :** اسے محبوب ! آپ کا طور طریق، طرز اور ادا کشتی ہیں عجیب و غریب کیوں نہ ہو، لیکن آپ شخص میں خود پر برتری حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ کسی ایسے موقع کا معاملہ معلوم ہوتا ہے، جب محبوب سے باتیں جو رہیں تھیں اور وہ اپنے اعزاز و ادا پر غرور میں آپ سے باہر ہو رہا تھا۔ امت چیت کے دوران میں عاشق نے تعریفاً وہ بات بھی کر دی، جو اس کی زبان پر نہیں آنی چاہیے تھی اور مقصود ہی تھا کہ محبوب کو غصہ آئے اور وہ مزید ظلم و جور کرے عاشق پہلے ہی کہ چکا ہے کہ میں مشتاق جفا ہوں۔

۵۔ **شرح :** میں مانتا ہوں کہ کعبہ ضایۃ مقدس مقام ہے۔ قبلہ نما سے بھی مجھے انکار نہیں، لیکن میں کیا کروں، اسے محبوب ! میرا دل تو اضطراب کی حالت میں صرف تیرے ہی کو پہنچنے کی طرف میلان رکھتا ہے۔ مجھے اور قبلہ نما کی طرف اسے کوئی رغبت نہیں۔

بظاہر اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ میرے نزدیک کعبہ اور قبلہ نما اصل تو قرب کی چیزیں نہیں، دل کا تعلق صرف محبوب حقیقی سے ہونا چاہیے۔

۶۔ **شرح :** اسے واعظ ! کیا دنیا میں کوئی باغ اور کوئی چمن نہ رہیں؟ بہشت بھی، ہر حال باغ ہی ہے، ہم نے مانا کہ اس کی آب و ہوا یہاں کے باغوں سے کسی قدر مختلف ہوگی۔ پھر کیا دہرے کہ آپ دغ و غم فرماتے ہیں تو اسی کی، ترغیب دیتے ہیں؟

۷۔ **شرح :** اے خدا ! بہشت میں دوزخ کو بھی کیوں نہ ڈال دیا جائے؟ اس طرح سیر و تفریح کے لیے تھوڑی سی شئی فضا پیدا ہو جائے گی۔

اس شعر میں بھی وہی مضمون پیش کیا گیا ہے، جو میرزا غالب پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک بہشت ایک ایسا مقام ہے، جو محبوب حقیقی کی عبادت کے لیے بطور ترغیب پیش کیا جاتا ہے اور میرزا نہیں چاہتے کہ اس سلسلے میں کسی ترغیب سے سابقہ پڑے۔ وہ صرف خدا کے لیے خدا کی عبادت

کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جنت اور دوزخ میں کوئی تیز قائم نہیں رکھی۔ وہ نہ اس امر کے خائف ہیں کہ عبادت کے لیے انعام کا لالچ ہو، نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ انھیں ڈرا کر بندگی پر آمادہ کیا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دونوں چیزیں انھیں کے متافی ہیں، لہذا دونوں کو ایک وجہ میں رکھ دیا۔ مقصود جتنی بہشت و دوزخ کی بحث نہیں، مقصود صرف خلوص فی الایات ہے۔ یہ مضمون میرزا نے مختلف اشعار میں بہ انداز مختلف پیش کیا ہے مثلاً :

ظاہر ہے کہ یہ دو کلمے کی لاگ
دو دفعہ میں ڈال دو کوئی نے کو بہشت کو
منور مکانت بہ خلد و سقر آ وینعت
مشافی عطا شد ز گل باز نہ دانست

۸۔ شرح : مجھے وہ چیز دے دیجیے، جسے کھاکر پانی مانگنے کی بھی نوبت نہ آئے اور مریاؤں نہ مجھے زہر کی ضرورت نہ کہنے لگاؤں۔ بدن تشنگی سے چٹکنے لگے، پانی مانگوں اور ایشیاں رگڑ رگڑ کر جان دوں۔ نہ میں آبِ حیات کا خواہاں ہوں کہ بہوں اور غم عشق کے ساتھ بیدار کے لیے دردِ مہر ہی زندگی بسر کروں۔

۹۔ شرح : اے غائب ! یہ غزل مجھ سے علامہ القاسمی احمد خاں علاقائی نے ہے۔ اصرار رکھوائی۔ پہلے ہی رنج بڑھانے والے ظالم غاصی تعداد میں موجود تھے، ان میں ایک اور کا اضافہ قبول کرو۔



آپ نے ”مسنی المصتر“ کہا ہے تو سہی
یہ بھی اے حضرت ایوب ! گلا ہے تو سہی
رنج طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیوں کر
ذہن میں خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی
تمہید :-
مجھے اس غزل کا علم
سب سے پہلے
مولانا ابوالکلام آزاد
موجوم و مغفور کے

فریے سے ہوا انتظار
انھوں نے اس کی نقل
نواب سید الدین احمد غل
طلب کی ریاض سے جہاں
کی نقل۔ مجھے اس کی نقل
دہلی کے ایک تلمیذ دیوان
سے لی جو نواب شہاب
الدین احمد کی حکایت تھا۔

۱۔ لغات :

مستی الفتر : میں
ڈکھ میں ڈال دیا گیا ہوں
قرآن : یہ میں حضرت ابراہیم
کا قول ہے ۔ اس میں کہیں
ذاتِ باری تعالیٰ سے لگ
موجود نہیں۔ یہ نہیں کہا کہ

ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی
دوست ہی کوئی نہیں ہے، جو کرے جاہ گری
نہ سہی، ایک تمنائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اُس نے
نہ سہی ہم سے، پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ تیزی شمشیرِ قضا ہے تو سہی

اسے اللہ! ٹوٹنے لگے ڈکھ میں ڈال دیا، کیونکہ وہ تو کسی کو بھی ڈکھ میں نہیں ڈالتا اس نے جو کچھ
نوشا ہے، سراسر شکوہ اور راحت ہی ہے۔ جو بھی حالتِ ہمارے سے ڈکھ میں جاتی ہے
وہ خود جاری صورتِ حال کا نتیجہ بنتی ہے۔

میرزا غالب یقیناً اس حقیقت سے ناواقف نہ ہوں گے تاہم ان کے ہاں خود اپنی
صورتِ حال بیان کرنا بھی گہر ہی ہے، خواہ اسلوب کوئی ہو۔

شرح : اسے حضرت ابوبکرؓ آخر آپؐ نے اپنی کیفیت بیان کرنے

کے لیے مستی الفتر کا کلمہ قرار شاعر فرمایا۔ یہ بھی تو ایک قسم کا گڑبگڑ ہے۔ حقیقتی سبب
شکیب کا اتنا شایع تھا کہ اپنی حالت درد و غم کسی بھی شکل میں بیان نہ کی جاتی۔ ذاتِ باری تعالیٰ

سے کون سی چیزیں جوئی تھیں کہ آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش آئی۔ مطلب یہ کہ روئے سخن خدا کی طرف نہ تھیں، مگر اپنی دردناک حالت بیان کرنا بھی تو ایک گونہ شگلوہ ہی ہے۔

۲- **شرح** : یقیناً میں تسلیم و رضا کی خوبیوں کا قائل ہوں اور خوب سمجھتا ہوں کہ صحیح مسلک و طریقہ یہ ہے جو کچھ پیش آئے، اسے خدا کی طرف سے سمجھا جائے اور اس پر کوئی جبراع فزع یا دوا دیا نہ کیا جائے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ میرے حصے میں جو رنج و غم آئے، وہ میری طاقت برداشت سے بہت زیادہ ہیں۔ پھر سر کیوں نہ پٹخوں ؟

۳- **شرح** : غنیمت سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جہز کا دن مقرر کر رکھا ہے اور ہم اس امتیاد پر زندگی بسر کر رہے ہیں کہ آخر ایک دن حساب کتاب ہوگا اور ہم نے جو مصیبتیں برداشت کیں، ان کا بھی صلہ ملے گا۔ فرم کر لو کہ اس زندگی کی طرح وہاں بھی ہم کوئی صلہ نہ پائیں، مگر روز جزا کی امتیاد پر زندگی تو بسر ہو جائے گی۔

۴- **شرح** : کوئی ایسا دوست ہی موجود نہیں، جو ہمارے دل و جگر کے زخموں کی مرہم بنی کرے۔ خیر، دوست نہیں تو نہ سہی، لیکن دوا دوا و دوا دوا ہم پٹی کیا آند تو موجود ہے۔

۵- **شرح** : دیکھیے، ہمارے محبوب نے غیر سے کتنا اچھا بھاہ کیا! اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس میں وفا کی فخلت موجود ہے، ہم سے وفا کا ہر تاؤ نہیں کیا تو نہ سہی، کسی سے کیا تو ہے۔

۶- **شرح** : اسے کاتبِ تقدیر! تو نے ازل کے روز جو کچھ میرے لیے لکھ دیا، اسے برابر اپنے نامہ اعمال میں نقل کرتا چلا جا رہا ہوں۔

گویا یہاں جبریلوں کا عقیدہ واضح کیا، یعنی یہ کہ انسان مختار نہیں، مجبور ہے۔ جو کچھ اس کے مقتدر میں دونوں ازل سے لکھ دیا گیا ہے، وہی کرتا رہتا ہے۔

بیان کا کمال یہ ہے کہ یہ نہیں کہا، جو کچھ لکھا گیا ہے، وہی کرنا ہوں بلکہ کہا :

روزِ نازل کا لکھا ہوا نقل کرتا چلا جا رہا ہوں۔

۷۔ **شرح :** اسے غائب ! شہرِ قضا کی تیزی تو بہت مشہور ہے۔ تم موت کے لیے اتنی جلدی کیوں کرتے ہو؟ یہ ہیر محل آکر ہی رہے گی۔ جس تلوار کی تیزی شہرۂ آفاق ہے، وہ آخر حیرار غتہ و حیات کاٹنے میں تامل نہ کرے گی۔



تمہید :- لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
 غزل اُس زمانے میں
 کہیں گئی تھی، جب میرزا
 جان جائے تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے
 غالب نواب کلب علی
 اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
 خانِ دلی رام پور کے
 دوست جو ساتھ مرے تائبِ ساحل آئے
 جشنِ مسندِ نشینی میں حرکت
 وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ
 کے لیے گئے تھے
 ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
 ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو دہلی
 آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکاراٹھتے ہیں
 سے چل کر ۱۲ کو رام پور
 تو وہ بزمِ زینِ ہنگامہٗ محفل آئے
 پہنچے اور اٹا خورہ جبرگ
 دیدہ خونبار ہے مدت سے ولے آج ندیم
 وہیں رہے۔ رخصت
 دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے مقابل آئے
 ہو کر پانچ روزہ دہر
 سامنا سحر و پری نے نہ کیا ہے، نہ کریں
 علامات مراد آباد شہر
 مگر تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے
 اور ۸ جنوری ۱۸۵۷ء
 کو دل پہنچے جگمگے غزل
 کے مطلع میں نواب
 سے اشارہ کلب علی خان

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب ! کی طرف ہے جہاں کا
تخلص بھی غنا اور داغ
آج ہم حضرت نواب سے بھی مل آئے ہے کہ یہ فزل نواب
سے رخصتی ملاقات کے بعد کئی گئی تھی۔

۱۔ شرح : اگر کسی پر دل آ جائے، یعنی کسی سے محبت ہو جائے تو
اسے دیکھنے کا لطف اُس وقت خوب آئے، جب وہ اپنے ہاتھ سے عاشق کو ذرا
کرتے گئے۔ بلاشبہ اس طرح عاشق کی جان ہائے گی، لیکن بلا سے، اس کی کیا پڑوا
ہے؟ وہ لطف جان سے بدرجہا زیادہ عزیز ہے، لیکن شرط میں ہے کہ کسی سے
عشق ہو جائے۔

۲۔ شرح : جو دوست، عزیز اور رفیق مجھے کشتی پر سوار کرانے کے
یہ سائل تک ساتھ آئے اور واپس پہلے گئے، انہیں کیا معلوم کر دیا میں روانگی
کے بعد میری کشتی پر کیا کیا آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوئیں۔

مطلب یہ کہ حق و صداقت کی یا سدا رہی اور ادا سے قرائن میں میں مصیبتوں
سے سابقہ پڑتا ہے، ان کا صحیح اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے، جو انگ بیٹھے ہوئے
صرف اس راستے تک چھوڑ آتے ہیں اور اصل منزل میں ساتھ نہیں دیتے۔ ہمارے
ہاں گزشتہ دور میں ہزاروں واقعات پیش آئے کہ کسی شخص کو قید یا جلا وطنی کی
سزا ملی اس کے دوست اور رفیق نعرے لگاتے ہوئے جیل خانے کے دروازے
تک ساتھ گئے، مگر انہیں اس شخص کی تکلیفوں کا صحیح اندازہ کیا ہو سکتا تھا، جس نے
خود کئی کئی سال تنہائی کی قید میں گزرے۔

۳۔ لغات : عجاج : حاج کی جمع، حاجی لوگ۔

شرح : اے شیخ ! ہم حاجیوں کے قافلے کے ساتھ غوثا کئی
کئی منزل پہلے جاتے ہیں، لیکن حرم تک نہیں پہنچے اور یہیں اس منفرد مقام تک
سفر میں جو مزل راستہ ۱۰ سے ۱۵ ہنری کر قسم نہیں کرنا چاہتے، لہذا پہنچے

سے پہنچے ہی پلٹ آتے ہیں۔

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ کسی بیش بہا اور محبوب شے کے لیے سعی و کوشش میں جو لطف ہے، وہ اس شے تک پہنچ کر باقی نہیں رہتا، کیونکہ ایک حد تک شوق کی تسکین ہو جاتی ہے۔ میرزا اس تسکین کے روادار نہیں ہو سکتے، راستے ہی میں گھومنے پر ہی گئے۔ اسی میں انہیں وہ مزہ مل رہا ہے، جو وہاں پہنچ کر نہیں مل سکتا۔

۴۔ **شرح :** میرا محبوب جس بزم میں آتا ہے، لوگ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ نو بھئی ! وہ آگیا، جو مغل کا ہنگامہ درہم برہم کر ڈالتا ہے۔ یعنی محبوب کی آمد پر بزم کا کوئی آدمی اپنی طبیعت میں نہیں رہتا۔ اس پر اضطراب و بیتابی کی کوئی نہ کوئی کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ جہی ہوئی مغل توبالا ہو جائے۔

۵۔ **شرح :** اے دوست ! ہماری آنکھیں تو لذت سے خوں کے دیا بہا رہی ہیں، لیکن آج معاملہ زیادہ نازک صورت اختیار کر گیا، کیونکہ دل کے بھی کئی ٹکڑے خون کے ساتھ بہ کر باہر نکل آئے۔

۶۔ **شرح :** اے محبوب ! نہ خیر تیرے سامنے آنے کی تاب لا سکتی ہے، نہ پرہی، حالانکہ حس میں انہیں عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ شاید تیرا عکس ہی تیرے مقابل آ سکتا ہے۔

کوئی شخص آئینہ دیکھے گا تو عکس لازمًا اس کے سامنے آئے گا۔ اس سے کسی بھی صورت مفر نہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ محبوب کا عکس ہی اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس پرہی کائنات میں اور کوئی نہیں، جو سامنے آنے کا حوصلہ کر سکے۔

۷۔ **شرح :** اے غائب ! اب ہم دہلی کی طرف روانہ ہونے والے ہیں اور حضرت نواب یعنی کلب علی خاں سے جن کا شخص بھی نواب تھا دواعی ملاقات بھی کر آئے۔



بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو غزل ملک رام صاحب تمہید :-
 کیا نطف ہو جو ابلقِ دوراں بھی رام ہو دم اسے نے رسالہ
 تا گردشِ فلک سے یونہی صبح و شام ہو، پرینِ مستور سے حاصل
 ساقی کی چشمِ مست ہو اور دورِ جام ہو کی۔ مجھے غائب سے
 بے تاب ہوں بلا سے، کن آنکھیوں سے دیکھیں حقیقت معلوم نہیں۔
 اے خوش نصیب! کاش قضا کا پیام ہو صرف اس سے بچے
 کیا شرم ہے؟ حریم ہے، محرم ہے راز دار کہ اہلِ ذوق کا ایک حلقہ
 میں سر بہ کف ہوں، تیغ ادا بے نیام ہو اسے غائب کی غزل
 میں چھپنے کو کاش اسے گھوڑ لوں کہیں ا۔ لغات :-
 پھر شوخ دیدہ بر سرِ صد انتقام ہو ابلق : گھوڑا،
 وہ دن کہاں کہ حرفِ تمنا ہو لب شناس سیاہ و سفید ہو۔
 ناکام بد نصیب کبھی شاد کام ہو دوراں : زمانہ،
 اسے ابلق کے تشبیہ
 گھس پل کے چشمِ شوق قدم بوس ہی سہی اس سے دی کہ دن
 وہ بزمِ غیر ہی میں ہوں، پر ازدحام ہو اور رات سیاہ و سفید
 ہونے میں اور ابلق

ھے بالکل مشابہ۔ اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اٹھوں

شرح : مجھے پر جو چشمِ ساقی بیت المحرام ہو
کاش میرا محبوب

بھول کر میری طرف پیرانہ سال غائب میکش کرے گا کیا
آجائے تو شام کا وقت

بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو
جو تارکات، غریب

خانے میں سناں رچھا اگر زمانے کا اہل یوں میری مرضی کے مطابق چھے تو خوب
لطفت آئے۔

۲۔ شرح : جب تک آسان کی گردش سے صبح و شام ہوتی رہے،
آرزو یہ ہے کہ میرے سامنے ساقی کی مست آنکھیں ہوں اور شراب کا دُور
پہتا رہے۔

شعر میں گردشِ فلک کو دورِ جام سے اور صبح و شام کو ساقی کی چشمِ مست
سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ لغات : کن آنکھوں سے دیکھنا : گوشہ چشم سے دیکھنا،
ترجمی نگاہ سے دیکھنا۔ اس کا اظہر کلمہ ”بھی ہے“ جو تلفظ کے عین مطابق ہے۔

شرح : میں نہایت پریشان ہوں۔ کاش میرا محبوب تر بھی نگاہ ہی سے
دیکھ لے۔ اگر یہ دیکھنا سوت کا پیغام بن جائے تو بلا سے، میں اپنے آپ کو گوشِ نصیب
بھی سمجھوں گا۔

۴۔ شرح : ہم گھر کے اندر ہیں اور جو شخص موجود ہے وہ ماؤں کی
خوب حفاظت کرتا ہے۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ پھر اسے محبوب !

آپ شرم کس بات کی کر رہے ہیں۔ تیخ ادا میاں سے نکالے اور میرا غائر کر دیجیے

۵۔ شرح : اگر محض پھیلنے کی غرض سے اسے ذرا گھوروں یعنی
ٹھنک باندھ کر محبت کی فکر سے دیکھوں تو وہ شرمِ چشم سیکڑوں بدلے لینے کے

یہ تیار ہو جائے۔

۷- شرح : وہ وقت ہی کہاں ہے کہ آرزو میرے ہوں تک پہنچے

اور جو بے نصیب عمر بھر ناکام رہا، اس کے لیے کبھی خوشی کا موقع بھی آجائے؟

۷- لغات : گفٹس مل کر : دھکا پیل سے جگر پیدا کر کے۔

ازدحام : ہجوم، بھیڑ۔

شرح : بیشک میرا محبوب غیر ہی کی منزل میں ہو، لیکن وہاں بھیڑ

ہونی چاہیے تاکہ میری بھی چشم شوق گفٹس مل کر قدم بوسی کا موقع مل جائے۔

اگر بھیڑ نہ ہوگی تو قدم بوسی کی کوشش محبوب پر آشکار ہو جائے گی اور مراد

بر نہ آئے گی۔ اس کی صورت یہی ہے کہ بھیڑ ہو۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ میری نگاہ و شوق

قدم بوس ہو رہی ہے، یہی سمجھا جائے کہ بھیڑ کے باعث میں نگاہ و شوق اس کے

قدموں پر ڈالنے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں۔

۸- لغات : ساقی بیت الحرام : حرم کعبہ کا ساقی یعنی رسول

اللہ صلم۔

شرح : اگر کعبہ مقدس کے ساقی، یعنی رسول اللہ صلم کی

چشم عنایت مجھ پر ہو تو اتنی پیوں کہ حشر تک قبر میں مست پڑا رہوں اور آفتوں تو

مست ہی آفتوں۔ اس شراب سے مقصود شراب حب رسول صلم اور شراب حب

باری تعالیٰ ہے۔

۹- شرح : اگر بھوپاں میں بوڑھا غائب دو روز آؤد معتبر رہے تو اس

جرحہ اپنے میں وہ شراب کا عادی کرے گا کیا؟

مقطع سے بالکل واضح ہے کہ یہ غزل بڑھاپے میں لکھی گئی، لیکن کلام صاف

تازہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے، یہ مشق کی پختگی کے دور کا ہے۔ اسی لیے غائب

سے اس کا انتساب کل نظر سمجھتا ہوں، اگرچہ اس کے بعض اشعار میں

غائب ہی کا رنگ ہے۔

بتائیں ہم تمہارے عارض و کاکل کو کیا سمجھے

عبدالباری آسی کی اسے ہم سانپ سمجھے اور اسے من سانپ کا سمجھے
کتاب سے منقول ہیں یہ کیا تشبیہ یہودہ ہے کیوں موذی سے نسبت دیں
لیکن اہل نظر مجموعہ

اسی میں شافی شدہ ہما عارض کو اور کاکل کو ہم ظلی ہما سمجھے
پورے غیر مطبوعہ غلط ہی ہو گئی تشبیہ یہ تو ایک طائر ہے
کلام کا انتساب صحیح نہیں سمجھتے۔ اسے برگ سمن اور اس کو سنبل کو جٹا سمجھے

۱- شرح : نباتات زمیں سے ان کو کیا نسبت ہ معاذ اللہ
اسے محبوب ام

بتائیں کہ تمہارے اسے برق اور اسے ہم کالی ساون کی گھٹا سمجھے
رخسار اور زلف کو کیا گھٹا اور برق سے کیوں کر گھٹا کر ان کو نسبت دیں
سمجھتے ہیں۔ نوسنوں

ہم زلف کو سانپ اسے ظلمات اسے ہم چشمہ آب بقا سمجھے
اور رخساروں کو نہاں جو کہیے یہ فقط مقصود تھا خضر و سکندر سے
کا من سمجھتے ہیں۔

۲- شرح : یدربینا اسے اور اس کو موٹی کا عصا سمجھے

یہ بالکل یہودہ تشبیہ ہے ہاجلا جو اس تشبیہ سے بھی داغ ان دونوں کو آتا ہو

کیونکہ مصعب ہے اسے وقت نماز صبح اور اس کو عشا سمجھے
کہ ہم زلف کو سانپ

جو یہ نسبت پسند خاطر والا نہ ہو تو پھر جیسے موزی سے
 اسے تبدیل کعبہ اس کو کعبے کی رضا سمجھے نسبت دیں ؛
 یہ ہے کہ ہم رضا اسد ان ساری تشبیہوں کو دور کر کے یہ کہتا ہے کہ ہمارا زلف
 سویرا اس کو سمجھے اُس کو ہم نورِ خدا سمجھے میں مشہور ہے
 کہ ہمارا سایہ جس پر پڑ جائے ، وہ نہایت خوش نصیب ہوتا ہے اور عاشق
 کے لیے زلفِ محبوب کے سایے سے بڑھ کر خوش نصیب کیا ہو سکتی ہے ؟
 ۳۔ شرح : یہ تشبیہ بھی غلط ہی ہو گئی ، کیونکہ کیا ایک پرندہ ہے
 اور پرندے سے محبوب کی کسی چیز کو تشبیہ دینا کچھ مناسب نہیں ، صیح یہ معلوم ہوتا
 ہے کہ رضا کو چنبلی کے پھول کی شکستگی اور زلف کو سنبل کے تاروں کا
 مجموعہ سمجھیں ۔

۴۔ شرح : تو بہ تو بہ ! یہ محبوب کے عارض زلف کو زمین سے
 اُگنے والی نباتات کے ساتھ کیا تشبیہ دے دی ؟ مناسب یہ ہے کہ رضا کو
 بھل اور زلف کو سادوں کی کالی گٹھا سمجھیں ۔

۵۔ شرح : لیکن گٹھا اور بھل سے زلف و رضا کو نسبت دینا ہرگز
 مناسب نہیں ، اس طرح ان کا رتبہ کم ہو جاتا ہے ۔ کیوں نہ زلف کو نظلات اور
 رضا کو آبِ حیات کا چشمہ قرار دیں ؟ معلوم ہے کہ آبِ حیات نظلات ہی
 میں ہے ۔

۶۔ شرح : اگر یہ تشبیہ قبول کر لی جائے تو ماننا پڑے گا کہ نباتات میں
 سے گزرتے ہوئے آبِ حیات پر پہنچنا خطر اور سکندر کا مقصود تھا تو اس طرح
 بھی زلف و رضا کی قدر و منزلت کم ہو جاتی ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ رضا کو یہ بیخا
 اور زلف کو حضرت موسیٰ کا عصا قرار دیں ۔

۷۔ شرح : اگر یہ تشبیہ بھی زلف و رخسار کے لیے مناسب معلوم نہ ہو تو چلیے ، رخسار کو صبح کی نماز اور زلف کو وٹا کی نماز سمجھ لیتے ہیں۔

۸۔ شرح : اگر یہ تشبیہ بھی آپ کے دل کو پسند نہ آئے تو رخسار کو کبجے کی قندیل اور زلف کو کبجے کا غلاف مان لیتے ہیں۔

۹۔ شرح : لیکن اسدا ان تمام تشبیہوں کو رد کر کے کہتا ہے کہ لائے سویدا ہے اور رخسار اشد قلعے کا نور ہے۔



یہ غزل بھی مجموعہ
آہی ہی سے لی
گئی ہے اور عرش
صاحب نے بھی
اسے اپنے مجموعے
میں شامل کر لیا
ہے۔

نسیم صبح جب کنگاں میں بُوے پیرا ہن لائی
پٹھے یعقوب ساتھ اپنے نویدِ جان و تن لائی
وقارِ ماتم شب زندہ دارِ حیر رکھنا تھا
سپیدی صبح غم کی دوش پر رکھ کر کفن لائی
شہیدِ شیوہ منصور ہے اندازِ رُسوائی

۱۔ شرح :
صبح کی نسیم نے
حضرت یوسفؑ کو
پیرا ہن کی خوشبو
کنگاں میں پہنچائی
تو یہ خوشبو حضرت یعقوبؑ کے جسم و جان دونوں کے لیے خوش خبری بن کر آئی۔

مُصیبت پیشگی مدعا دار و رسن لائی
وفا دامن کش پیرا یہ وہمتی ہے اے غالب
کہ پھر نر نہت گہِ غربت سے تا حدِ وطن لائی

۲۔ لغات : شب زندہ دارِ ہجر : فراق کی راتوں میں جا گئے والا۔

شرح : جس شخص نے قرآن کی مائیں جاگ کر کائیں اور مر گیا اس کے ماتم کی عزت و توقست قائم رکھنا ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صبحِ غم کی سیرگ اپنے نزد سے پر امن رکھ کر لائی تاکہ اسے احترام سے دفن کر دیا جائے۔

۳۔ **شرح :** ہمارے رسوا ہونے کا انداز ایسا ہے گویا ہم منصور کے طور طریقوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یعنی ہم رسوائی میں منصور کے طریقہ پر عمل کرتے پاسختے ہیں۔ ہمارا مقصد یقیناً مصیبت کو پسند کرتا ہے بلکہ اس نے مصیبت کو پیشہ بنا لیا ہے وہ ہمارے لیے شولی اور رتالے آیا ہے۔ گویا ہم بھی منصور کی طرح شولی پر مرنے کے آمادہ مند ہیں۔

۴۔ **لغات :** تڑپست گاہ : سیرگاہ ، پُر نضا مقام۔
غربت : بے وطنی ، اہمیت۔

شرح : اے غالب ! دنیا داری ہی ہستی کے لباس کا دامن لپیٹتی ہے۔ وہی ہمیں پردیس کی سیرگاہ سے گھنچ کر وطن کی مسجد سے آتی۔



۱۔ **شرح :** وفا جفا کی طلب گار ہوتی آتی ہے

بادِ عاشق برابر جفا
کے طلب گار رہے

۲۔ **شرح :** جو اب جنتِ بزمِ نشاطِ جانان ہے

میری نگاہ جو غوغا ہوتی آتی ہے

۳۔ **شرح :** ٹھنڈے جوشِ جنوں و حشیو! مبارک باد

میری نگاہ جو خون بہا مدیۃِ انظار ہوتی آتی ہے

برساقی آ رہی ہے۔ دل و دماغِ وفا پیشگاہ کی خیر نہیں

یہ دماغِ میرے۔ محبوب کی بزمِ نشاط

جگر سے آہِ شرر بار ہوتی آتی ہے

کے فردوس کا جواب ہے۔ یعنی محبوب کی بزمِ نشاط کو حقیقت سے تشبیہ میں
اور اس کا جواب چشمِ ثور بار نے مہیا کیا۔ محبوب عیش و نشاط میں مشغول ہے
اور غریب عاشق آنکھوں سے خون برسا رہا ہے۔

۳۔ لغات : بدیہہ انظار : نگاہوں کے یہ تھمنے۔

شرح : اسے دھیو ! جو جنوں میں مبتلا ہو، تمہیں مبارک

ہو، اب جو مثنیٰ جنوں خوب ترقی کرے گا، کیونکہ بہار آگئی ہے اور نگاہوں
کے یہ ایک تھمنے بن کر آئی ہے۔

۴۔ شرح : اب باوفا عاشقوں کے دل و دماغ کی خیر نہیں، کیونکہ
آہِ جگر سے چنگاریاں چھوڑتی ہوئی نکلی ہے۔

یہ غزل بھی اسی اور عرشی دونوں کے مجموعوں میں شامل ہے۔



۱۔ شرح : یونہی افزائشِ وحشت کے جو ساماں ہوں گے

اگر وحشت میں دل کے سب زخم بھی ہم شکل گریباں ہوں گے

ترقی کے ایسے ہی سامان جمع ہوتے وہیرِ مایوسی عاشق ہے تنافل اُن کا

ہے تو دل میں نہ کبھی قتل کریں گے، نہ پشیمان ہوں گے

بچنے زخم ہیں سب گریبان دل سلامت ہے تو صدموں کی کمی کیا ہم کو

کی صورت لے شک اُن سے تو بہت جان کے خواہاں ہونگے

منتشر ہو کے بھی دل جمع رکھیں گے ، یعنی اختیار کر لیں گے۔

۲- شرح : ہم بھی اب پیرو گیسو سے پریشاں ہوں گے

محبوب کا تعلق یعنی انجان بننے بنا عاشق

لیکن اب بھی ہر گوشہ دل میں کئی ارماں ہوں گے

کے لیے نا امید کا باعث ہے جب

ہے ابھی نول سے فقط گرمی ہنگامہ اشک وہ انجان بنا ہوا ہے

پر یہ حالت ہے ، تو نالے شر افشاں ہوں گے

تو یہ آئندہ کیونکر کسی جا سکتی ہے کہ کبھی

باندھ کر عہد وفا اتنا تنفر ؟ ہے ہے !! عاشق کو قتل بھی کرے

تجھ سے بے مہر کم اسے عمر گریزاں ! ہوں گے

اس قدر بھی دل سوزاں کونہ جان افسردہ

پشیمانی کا موقع کیونکر آئے گا۔

ابھی کچھ دافع تو اسے شمع ! فروزاں ہوں گے

آخری مصرع کا ایک مطلب یہ بھی

عہد میں تیرے کہاں گرمی ہنگامہ عیش ہو سکتا ہے کہ نہ

گل مری قسمتِ وارثوں پہ خنداں ہوں گے

شوگر عیش نہیں ہیں ترے برگشتہ نصیب کرے گا اور نہ قتل

نہ کرنے پر پشیمان ہوگا۔ یہی امر عاشق

اُن کو دشوار ہیں وہ کام جو آساں ہوں گے

موت پھر زلیلت نہ ہو جائے ، یہ ڈر ہے غائب

کے لیے یلوسی کا باعث ہے۔

وہ مری نعل پہ انگشت پر ونداں ہوں گے

اس میں میرزا انجانے قنائل کی شکایت کر رہے ہیں اور معلوم ہے کہ ان کے نزدیک جان کر قنائل کرنے کا بھی ایک مقام ہے۔ مثلاً :-

ہاں کیجئے قنائل کہچہ امید بھی ہو یہ لگا و خلط انداز توں ہے ہم کو

۲- **شرح :** اگر وہاں سلامت ہے تو اس دنیا میں سد مومن کی کمی نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہمارے محبوب جیسے تو بہت سے لوگ ہیں، جو جان کے خواہاں ہوں گے۔

مطلب یہ کہ جب تک دل انسان کے پہلو میں ہے، وہ احساس سے محروم نہیں ہو سکتا اور احساس ہی خوشگوار واقعات پر فخری اور ناخوشگوار واقعات پر صدمے کا باعث ہوتا ہے۔ میرزا یہیں کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک دل پہلو میں ہے، ہماری جان کے خواہاں سیکڑوں پیدا ہو جائیں گے۔

۳- **شرح :** ہم پریشان ہو کر بھی اپنا دل مٹھانے رہیں گے اور جمعیت خاطر کو اتنے سے نہ دیں گے۔ گویا ہم محبوب کی زلف پریشاں کے پیرو بن جائیں گے، جو پریشانی کے باوجود یکساں رہتی ہے۔

۵- **شرح :** ہمیں نصیب کی گردش نے ناامید کر رکھا ہے۔ یہ اس ہمہ دل کے کوششے کوششے میں اب بھی بہت سے ارمان موجود ہوں گے۔

۶- **شرح :** ابھی تک تو جسم میں خون ہے اور اس کی وجہ سے آنسوؤں کا ہنگامہ گرم نظر آتا ہے، لیکن یہی حالت جاری رہی تو جسم کا خون آنسوؤں میں نہ پڑ کر ختم ہو جائے گا۔ پھر نالہ دل سے آنکھیں گے تو ہر شرت شعلے برسا دیں گے، یعنی آگے چل کر ان کی وجہ سے گرمی ہنگامہ قائم رہے گی۔

۷- **لغات :** متفرد، نفرت۔

عمر گریزاں : بھاگ جانے والی عمر یعنی چند روزہ عمر۔

شرح : اسے عمر، جواب گریزاں ہے، اٹھنے ہم سے عید وفا یا نہ عاقبتاً اور اس دنیا میں لائی تھی، اب ہم سے اتنی نفرت ہو گئی کہ ساتھ

چھوڑ جا رہی ہے۔ اشد اشد! تجھ ایسے بے مروت بھی کم ہی ہوں گے۔

۸- **شرح :** اے شمع : ہمارے بجھتے ہوئے دل کو تو نے کیوں

اس قدر افسردہ سمجھ لیا ہے، ابھی تو اُس میں بہت سے داغ روشن ہوں گے۔

۹- **شرح :** اے محبوب ! تیرے علم میں میرے لیے ہنگامہ

میش گرم کرنا ممکن ہی نہیں۔ میری قسمت اس درجہ پست ہو چکی ہے کہ پھول بھی اس

کی ہنسی اُٹھائیں گے۔

۱۰- **شرح :** اے محبوب ! جو لوگ تجھ پر فریفتہ ہو کر بد نصیبی کا

تختہ مشتق بن چکے ہیں، ان کے لیے ترسہل سے پہل کام بھی سحر درجہ شواہد ہیں۔

۱۱- **شرح :** اے غالب ! اب مجھے فوت یہ ہے کہ جو بدمیری

نفس پر آئے گا تو سرخ و غم سے انگلی دانتوں میں دبائے گا۔ میں اُس کی یہ کیفیت

برداشت نہ کر سکوں گا۔ اُس وقت چاہوں گا کہ میری موت پھر نہ ہوگی سے بدن

جائے۔ یہی ڈر مجھے پریشان کیے ہوئے ہے۔



نمائش پر وہ وارِ طرزِ بیدارِ تغافل ہے ، ۱- **شرح :**

نسلی جانِ بیل کے لیے خندیدنِ گل ہے

نمودِ عالم اسباب کیا ہے ؛ لفظِ بے معنی

کہ ہستی کی طرح مجھ کو عدم میں بھی تامل ہے

نذرِ رکھ پابندِ استغنا کو قیدی رسمِ عالم کا

ترا دستِ دعا بھی رخنہ اندازِ تو کل ہے

بیل کی جانِ سرت

یہ دیکھ کر مطمئن ہے

کہ بچوں ہنس رہا ہے

یعنی کھلا ہوا ہے

حالانکہ یہ ہنسی محض

ایک نمائش ہے اور

مقصود یہ ہے کہ بچوں

نے تھانک کر ہنسنا

طریقہ اختیار کر لیا نہ چھوڑا قید میں بھی وحشیوں کو یاد دلانے کے لئے اس پر پورا ہے۔ یہ چاک پیر بن گیا جو اب خندہ گل ہے پڑا ہے۔

۲۔ شرح : ابھی دیدار کی کا باز کہہ سکتے ہیں ناصح سے عالم اسباب یعنی دنیا ابھی کچھ وقت ہے، غالب ! ابھی فصل گل و گل ہے کی جو نمود و خاش ہے، اس کی حقیقت کیونہیں۔ وجود تو رہا ایک طرف بلکہ تو عدم میں ہی کلام ہے، میں تو عدم کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔

جب وجود و عدم دونوں کو ختم کر دیا تو قفسہ پاک ہو گیا۔ کنا یہ چاہتے ہیں کہ عالم اسباب کی محض نمود ہی باطل نہیں، بلکہ اس کا عدم بھی باطل ہے۔ نہ وجود کا اطلاق جائز ہے، نہ عدم کا۔

۳۔ لغات : استغناء : بے نیازی، بے پروائی۔

شرح : دعا مانگنا دنیا کی عام رسم ہے، لیکن جو شخص بے نیازی اور بے پروائی پر استوار ہو، اسے کیوں رسم دعا کا قیدی رکھا جائے؟ اس کے لیے کیوں اس رسم کی پابندی ضروری ہو؟ بے نیازی انڈر تھانے پر کامل بھروسے سے پیدا ہوتی ہے اور جسے انڈر پر پر بھروسہ ہو، اس کے لیے عام انداز سے دعا کرنا بھی توکل میں خلل کا باعث ہے۔

مطلب یہ کہ ہم تو صرف انڈر رضا پر قائم ہیں، دنیا کی کسی چیز سے ہمیں کوئی وابستگی نہیں اور سب سے بے پروا ہیں۔ خوشی ہو یا رنج، جو کچھ خدا کی طرف سے آئے، وہ ہمارے لیے عین نعمت ہے۔ اسی کو ہم توکل سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب عام لوگوں کے انداز میں دعا کریں گے تو ہماری رضا میں خلل پیدا ہو گا اور یہ عمل توکل کے خلاف ہلے گا۔

فارسی کے ایک شعر میں کہتے ہیں !

مخور مکافات پہلو نظر آویخت
مضائق عطا شعلہ زنگ باز نداشت
جمن لوگوں کو اپنے اعمال کی جزا پر فخر ہے، وہ بہشت اور دوزخ کے جنگجے
میں پڑے جھٹے ہیں۔ بہشت میں جانا چاہتے ہیں اور دوزخ سے بچتے ہیں، لیکن جس
شخص کو وجودِ باری تعالیٰ کی عطا کا عشق ہے۔ اس کے لیے شعلے اور پھرس، بہشت
اور دوزخ میں تیز کی کوئی وجہ نہیں۔

۴۔ شرح : اگرچہ دیوانے قید کر دیئے گئے، لیکن وہاں بھی بارش
کی یاداں کے رافز سے طونہ ہو سکی۔ وہاں بھی انھوں نے اچھیری میں چاک
کر ڈالے۔ یوں پھرس کے کھٹنے کا جواب دیتا کر دیا۔

کنا یہ چاہتے ہیں کہ دیوانوں کا گریباں پھانسا، اور دامن چاک کرنا پھولوں کی
یاد کا ثبوت ہے، وہ بھی تو اپنے دامن چاک کرتے ہیں۔

۵۔ شرح : اسے غائب ! ابھی بہار کا موسم ہے، جس میں پھول
کھلتے ہیں اور شراب پی جاتی ہے۔ اس موسم کے رخصت ہونے میں ابھی کچھ
وقت باقی ہے۔ نصیحت کرنے والا چاہے تو ہم بتا سکتے ہیں کہ ہمارے دیوانہ
ہونے کا اصل بھید کیا ہے۔

مطلب یہ کہ دیوانگی کا رازہ فصلِ بہار ہی میں کہا جاسکتا ہے۔ یہ فصل گزند
جائے گی تو اس رازہ کے چہرے سے ہرگز کوئی اٹھائے گا۔
یہ غزل بھی آئسی اور عرشیی دونوں کے مجموعے میں شامل ہے۔



خود جان دے کے روح کو آزاد کیجیے
۱۔ شرح : تاکہ خیالِ خاطر جب آزاد کیجیے
جاہ سے آزاد
لوگوں کو انھوں نے

بھولے ہوئے جو غم ہیں، انہیں یاد کیجیے
تب جا کے اُن سے شکوہ بیداد کیجیے
حالانکہ اب زباں میں نہیں طاقتِ فغاں

پہرہ دل یہ چاہتا ہے کہ فریاد کیجیے
بس ہے دلوں کے واسطے اک تخیلِ نگاہ
اُڑے ہوئے گھروں کو پھر آباد کیجیے
کچھ درد مند منتظرِ انقلاب ہیں
جو شاد ہو چکے، انہیں نا شاد کیجیے
شاید کہ یاس باعثِ افشاں ہے راز ہو
لطف و کرم بھی شاملِ بیداد کیجیے
بیگانہ رسومِ جہاں ہے فراقِ عشق
طرزِ جدیدِ ظلم کچھ ایجاد کیجیے

مصیبتوں سے نجات
دلایے، بلکہ بھول
لا فیال کب تک کرتے
رہیں گے۔

۲- شرح :
جو غم دل سے غور ہو
چکے ہیں یا اس بات پر نہیں
رہے، انہیں یاد کر دینا
چاہیے۔ پھر محبوب کے
سامنے جا کر ظلم کی شکایتیں
کرنا مناسب ہو گا۔
جب تک تمام رنج
اور تمام مصیبتیں نہیں
ہیں تازہ نہ ہوں، محبوب
سے شکایت کریں بھی
تو کیا کریں گے۔

۳- شرح :
صورتِ حال یہ ہے کہ

زبان میں آہ و نالہ کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی، لیکن دل کی کیفیت ایسی ہے۔ وہ
یہی چاہتا ہے کہ فریاد پر فریاد کرتے جائے۔

۴- شرح :
دلوں کے بے صفتِ محبوب کی نگاہِ اظہارِ کافور
یہ اُڑے ہوئے گھر ایک نگاہ ہی سے اندر نو آباد ہو جائیں گے۔

۵- شرح :
کہہ ڈالیں اور ظلم کے بارے کوئے حالات کی روپوشی

کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اسے محبوب : جو آپ کی غایت سے خوش اور مسرور ہو چکے ہیں، انہیں بھی ذرا رنج و غم کا مزہ چکھنا بیٹھے۔ دکنی لوگوں کے لیے شادمانی کی مورد نہ ہو سکتی ہے کہ انقلاب آئے اور خوشی کی بہار روکھ چکے ہیں، وہ ذرا رنج کا ذور بھی رکھ لیں۔

۶۔ شرح : اگر عاشقوں پر ظلم و جور ہی ہوتا رہے گا تو مایوس رہ جائیں گے اور ان کے مشق کا مہم کٹل ہائے گا۔ مناسب یہ ہے کہ ظلم و جور کے ساتھ ساتھ مہربانی اور غایت کا سلسلہ بھی چار میں رہے، اگر عاشقوں کو مایوس سے وابستہ نہ رہے۔

۷۔ شرح : عشق کا ذوق دنیا کی رسموں سے بالکل نا آشنا ہے۔ آپ، ظلم کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کریں، اپنے انا طریقہ تو کارگر معلوم نہیں ہوتا



ہم سے خوبان جہاں پہلو ہنسی کرتے رہے ا۔ شرح :
 ہم ہمیشہ مشق از خود رفتگی کرتے رہے دنیا کے عین ہمیشہ
 کثرت آرائی خیال ماسوا کی جسم ہنسی اس کوشش میں رہے کہ ہم سے میل جول پیدا
 مرگ پر غافل گمان زندگی کرتے رہے ذکر میں اور بالکل الگ
 داغمانے دل چراغ خائے تاریک تھے کھوپے کھوپے سے تھلک رہیں، ہم ہمہ
 تاغناک قبر پیدا روشنی کرتے رہے کھوپے کی مشق کرتے رہے۔
 شور نیزنگ بہار گلشن ہستی، نہ کوچھ مطلب یہ معلوم
 ہم خوشی اکثر رہیں ناخوشی کرتے رہے ہوتا ہے کہ ہمارے

یہ تو عشق کا خمور رخصت اے تمکینِ آزارِ فساقِ ہمارا
 مدد ہی یہ تھا کہ اپنے ہو سکا جب تک غم و اماندگی کرتے رہے
 آپ کو فراموش کر دیتے اس نورِ فراموشی میں مست و مغموم رہے۔ جیسوں نے بھلایا کر ہم دیوانے ہیں، لہذا
 ہم سے دور بھاگتے رہے۔

۲۔ لغات : کثرتِ آزمائی : "کثرت"، "گھومت" کی طرح ہے،
 جسے صوفیہ توحید کے منافی سمجھتے ہیں۔ کثرتِ آزمائی سے مراد ہے ایک وجود حقیقی
 کے سوا بہت سے وجود تسلیم کر لینا۔

ماسوا : ہر وہ شے، جو دہر و بارسی تعالیٰ کے ہوا ہو۔

شرح : ماسوا کے خیال میں مبتلا ہو کر وجودوں کی جو کثرت پیدا ہوئی
 وہ دراصل ایک وحیم ہستی اس کی مثال یوں سمجھئے کہ حقیقت ناشناس ہو، موت و
 زندگی کا گمان کرتے رہے۔

مطلب یہ کہ ماسوا کے چکروں میں پڑ کر خلا کے ہوا بہت سے وجود تسلیم کر
 لینا ایسا ہی ہے، جیسے مریضوں کو زندہ سمجھ لیا جائے یا موت کو زندگی قرار دے
 لیا جائے۔

۳۔ لغات : مفاک : گڑھا۔

شرح : دل میں عشق کے جو داغ تھے، وہ اصل میں میرے
 اندر میرے گھر کے ہواغ تھے، اور قبر کے گڑھے جیسا کہ ان سے میرا پیشہ روشن ہوا۔

۴۔ لغات : مہین : گہرا۔

شرح : باغِ حق کی بہار میں رات و دن جو تئیرات ہوتے بھٹتے
 ہیں اور یہ بہار ہمیں جو تیرنگیاں دکھاتی رہتی ہے، ان کے بارے میں کچھ نہ چھو
 حالت یہ ہے کہ ہم جو چیزیں کو عموماً خوشی اور مسرت کا سامان سمجھتے رہے، انہیں
 بھی اکثر رنج و غم کے پاس گرہ رکھنا پڑا۔ یعنی یہاں کی خوشیاں عموماً رنج و غم ہی کا

موتیب بنتی رہیں۔

۵۔ لغات : دانا ندگی : پیچھے رہ جانا، پھتر جانا۔

شرح : اسے سفر کے ساتھیوں کی بددائی کے دکھ : تو کب تک دل پر پتھر بن کر بیٹھا رہے گا؟ اب رخصت ہو جا۔ جب تک ہم میں پیچھے رہ جانے کا تم کو غم کی سکت تھی، کرتے رہے، اب اس سے نجات پاتے ہیں



۱۔ شرح :

علاج دل کے دکھ درد کا کیا جاسکتا ہے۔

جب خود دل میں درد

بن جائے تو کوئی کیا

کرے؟ دیکھو،

چند دانا ظہیں، مطلب

کس سادگی سے بیان

کر دیا گیا ہے اور کتنی

بڑی جہتتد پرستی

ہے : بیماری کا علاج

کیا جاتا ہے، جب

وجود ہی بیماری بن

جائے تو کوئی کیا

کرے گا :

۲۔ شرح :

یہ دیکھو کہ ہم فریاد

درد ہو دل میں تو دوا کیجئے

دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجئے

ہم کو فریاد کرنی آتی ہے

آپ سنتے نہیں تو کیا کیجئے

ان بتوں کو خدا سے کیا مطلب

تو بہ تو بہ، خدا خدا، کیجئے

رنج اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی

پہلے دل درد آشنا کیجئے

عرض شوخی، نشاطِ عالم ہے

عُسن کو اور خود نہ کیجئے

نہیں کر سکتے یا دشمنی ہو چکی بہ قدر وفا
 اس کا طریقہ نہیں معلوم نہیں مصیبت
 اب حق دوستی ادا کیجئے یہ سہہ کہ آپ سنتے
 موت آتی نہیں کہیں غالب نہیں۔ پھر ہمارے
 کب تک افسوس زیست کا کیجئے فریاد کرنے سے کیا
 حاصل؟ آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں؟

۳۔ شرح : بھلا یہ سنگ دل حسین بھی خدا کو مانتے ہیں! تو یہ تو یہ! خدا خدا کیجئے! ان کے انداز و اطوار ہی سے ظاہر ہے کہ نہ یہ خدا کے قائل ہیں اور نہ ان سے خدا قریبی کی امید رکھتی ہے۔

۴۔ شرح : اگر دل کو درد کا نوگر بنا لیا جائے تو جو سچ پہنچے گا، وہ خود بخود خوشی کا باعث بن جائے گا۔ یہ وہی مضمون ہے، جو دوسری جگہ یوں لکھا گیا ہے!

رنگ سے منوگر ہوا انسان تو موت جاتا ہے سچ
 مشکیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ کوئی خیالی بات نہیں، حقیقت ہے۔ انسان کے تمام احساسات اس کی عادت پر موقوف ہیں۔ اگر وہ خوشی کا عادی ہے تو رنگ پہنچنے پر بخیر ہوگا، اگر رنگ کا نوگر ہے تو اسے غم سے کوئی آزار نہ پہنچے گا، بلکہ خوشی ہوگی، جو کچھ پیش آ رہا ہے، میں عادت کے مطابق ہے۔

۵۔ شرح : اے محبوب! آپ کی طرف سے شونی کا اظہار ہو تو پوری کائنات میٹھا دھانی کی لہریں دوڑ جائی ہیں۔ شونی من کی خود نمائی کا کرشمہ ہے۔ نشا طر عام کی خاطر اسے اور خود نما کیجئے۔

۶۔ شرح : ہماری وفاداری کی جتنی بساط ملتی، اس کے موافق تو

اپ دشمنی کر چلے، اب دوستی کا حق بھی تو ادا ہونا چاہیے۔

مطلب یہ کہ آپ نے دشمنی سے ہماری وقار داری کا امتحان تو کر لیا اور اس امتحان کا کوئی پہلو اظہار کرنا۔ اب دوستی کا بھی تو کوئی سلسلہ ہونا چاہیے یا ساری عمر آزمائش ہی میں گزارنا۔ اُسے کی!

۷۔ شرح : اسے غائب : سن و غم سے بھری ہوئی زندگی کا افسوس کب تک کریں، کہیں یوں بھی موت آتا ہے، وہ تو ہر حال وقت پر چلے گی، لہذا رنج و غم کا قصہ ختم کرو۔



۱۔ شرح :

جسے زبانی دعا ہوا
کہ غم کا طرہ نہ ہو
چھ کر ذاتِ خاموش
سہے بندوں بے زبانی
کا قدر بار بہتر نہ ملو
پہر ہو جاتا ہے درد
کا گدات پیر خوشی کا
راز ٹھہرا ہوا ہے۔

مطلب یہ معلوم
ہوتا ہے کہ ہم سزا
و دریں روزانہ دنیا
میں رہ سکتے ہیں
یہ ناپ ہے کہ اس

سکوت و خاموشی اظہار حال بے زبانی ہے
کہیں درد میں پوشیدہ رازِ شادمانی ہے
عیاں ہیں حال و حالِ شیخ سے اندازِ دلچسپی
مگر نہ قدح کش کا ابھی دورِ جوانی ہے
ثباتِ چند روزہ، کار فرما سے غم و حسرت
اجل سرا پیدارِ دورِ عیش و کامرانی ہے
گدازِ داغ و دل شمعِ بساطِ خانہ ویرانی
تپشِ گاہِ محبت میں فروغِ جاودانی ہے
و فرخِ خود نمائی رہنِ ذوقِ جلوہ آرائی
برہم کامرانی جذبِ دل کی شادمانی ہے

شرع عادتوں کی
یہ نیت تھیک، تھیک
واضح ہوسکتی ہے،
دل حرمات نقب کی داد دے لے چرخ بے پروا!
بہ عارت داؤد نخت و متاع کامرانی ہے۔

لیکن انتخاب جانتے ہیں کہ خوشی و درد ہی کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔

۲۔ **شرح :** شیخ کی کیفیت، وضع و لباس، طور طریق اور گفتگو کا انداز
بڑا دلچسپ ہے۔ اسی لیے اختیار کیا گیا ہے کہ ان حضرت کی نصیحت سنیں
اور انہیں کا طور طریق اختیار کر لیں، لیکن کیا کیا جائے، ابھی شراب نوشی و رندگی
جو ابی کا عالم ہے اور اس عالم میں شیخ کی پروردگارینا بالکل مناسب نہیں۔

۳۔ **شرح :** چند روزہ زندگی میں غم و مسرت کی کد فرمائی کے سوا
کچھ نظر نہیں آتا اور مسرت عیش و کامرانی کے دور کی سرمایہ دار ہے۔ یعنی زندگی
سراسر غم ہے اور موت سراسر عیش و کامیابی۔

۴۔ **شرح :** دار و دل پسند گھٹل کر گھری، برابری کے لیے پتلا دنیا
کڑا ہے۔ حقیقتاً، اس کے نقد نگاہ سے دیکھا جائے تو محبت کی تپیش گاہ میں، خدا
کے لیے واضح اجائے کا سامان ہے۔

محبت ہوئی تو دل پر دار ہو گا۔ دار کی جگہ روشنی کا سامان بہیم پہنچائے گی
ذرا محبت ہی انسان کے اندر سب دل میں وہ ضیا پیدا کرتی ہے جو کہیں اند
نہیں پڑتی

۵۔ **شرح :** ہمارے محبوب کو خود غائی کے شوق کی فراوانی نے
بلوں آرائی پر آمادہ کر رکھا ہے۔ ہمارے دار و دل، شش اس پر خوش ہے کہ اس کا
تقد حاصل ہو رہا ہے، حالانکہ یہ سراسر دہم ہے۔

مطلب یہ کہ محبوب کی تمام بلوں آرائیاں اس کے فدوی خود غائی کا نتیجہ ہیں۔
ہمارے جذب و دلچاس سے کوئی تعلق نہیں مگر ہم دہم میں مبتلا ہو کر اسے اپنا
کامیابی سمجھ کر چھوٹے نہیں سمجھتے۔

۶۔ لغات : حیراں لقب : وہ - جسے غرور و نامرادی کا لقب مل گیا ہو، یعنی سراپا غرور و نامرادی۔

شرح : اسے بے پروا آسان : ہمارے اسی بادل کی توداد دے، جو سراپا غرور و نامرادی بن گیا ہے اور کامرانی کا مرد سائن بالکل ناکام ہے۔



کس کی برقی شوخی رفتار کا دلدادہ ہے
 ذرہ ذرہ اس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے
 ہے غرور سرکشی صورت نمائے عجز بھی
 منقلب ہو کر بساں نقشب پا افتادہ ہے
 خانہ ویراں سازی عشق جفا پیشہ نہ پوچھے
 نامرادوں کا خط تقدیر تک بھی سادہ ہے
 خود نشاط و سرخوشی ہے آمدِ فصل بہار
 آج ہر سیلِ رواں عالم میں موجِ بادہ ہے
 زندگانی رہو راہِ فنا ہے اسے اسد!
 بہر نفس ہستی سے تاملِ عدم اک عبادہ ہے

۱۔ لغات :
 اضطراب آمادہ :
 آمادہ، اضطراب،
 بیتہ و مضطر۔

شرح : اس
 دنیا کا ذرہ ذرہ جو
 سراپا اضطراب بنا
 بجز اسے تو جس کی
 شوخی رفتار کی بنا پر
 فریفتہ ہے :

مطلب یہ کہ
 دنیا کے ذرے ذرے
 میں جو بے پناہ تڑپ
 پائی جاتی ہے، وہ
 ضرور کسی کی شوخی رفتار
 کی بنی کا کرشمہ ہے،

لیکن وہ کون ہے ؛ ظاہر ہے کہ یہاں اشارہ مجرب حقیقی کی طرف ہے۔

۲- **شرح :** سرکشی کا غرور عاجزی کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ جب وہ پلٹتا ہے تو فتنی قدم کی طرح زمین پر گر جاتا ہے۔

۳- **نکات :** خانہ ویران سازی : گھر برباد کر دینا۔

شرح : عشق بھی غم و ستم میں کسی سے کم نہیں۔ اس کی کیفیت کچھ نہ پوچھیے۔ اس نے ہزاروں گھر ویران کر ڈالے۔ سورہ کہ نامرادوں کی قسمت کا فطری بالکل ساوہ ہے، یعنی اس میں کوئی رنگ، کوئی دلکشی اور کوئی جان بیکارگی۔

۴- **شرح :** فصل بہار کا آنا بڑے غرور و غیث دستار کا پیام ہے۔

بہار کی آمد پر دنیا میں جہاں کوئی سیل بہتا نظر آئے گا، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ شراب کی لمر ہے۔ یعنی بہار قدرت سے ذرے میں نشا و سرخوشی پیدا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ شیل بھی جو بربادی کا ایک حامل ہے، شراب بن جاتا ہے۔

۵- **شرح :** اے استاد ! زندگی فنا کے راستے پر مسافر کی طرح چلی جا رہی ہے اور انسان جو سانس لیتا ہے، وہ ہستی کے عدم تک ایک راستہ ہے۔

ہر سانس کو عدم کی طرف راستہ قرار دینا اس اعتبار سے صحیح ہے کہ اسی طرح سانس لیتا ہوا انسان فنا کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ سانس ختم ہونے ہی آخری منزل آجاتی ہے۔



۱- **شرح :** اس جو رجفہ پر بھی، بدظن نہیں ہم تجھ سے ہم پر انتہائی غرور و غم ہو رہے ہیں، لیکن، تیرے حقیقی دل میں کوئی بڑا گمان پیدا نہیں کیا طرفہ تنہا ہے، امید کرم تجھ سے اُمید نوازش میں، کیوں جیتے ہیں ہم آخر بہتے ہی نہیں کوئی جب دردِ عالم تجھ سے

و آرتنگی دل ہے، یا دست تصرف ہے
 ہیں اپنے تخیل میں، دن رات بھم ٹچے سے
 یہ جو رجحان سنا، پھر ترک وفا کرنا
 اے ہرزہ پڑو ہی بس، عاجز ہونے ہم تجھ سے
 غالب کی وفاکیشی اور تیری ستم رانی
 مشہور زمانہ ہے، اب کیا کہیں ہم تجھ سے
 ہوا اور تجھ سے لطف و
 کرم کی امید بدستور رہتے
 ہے۔ مقام حیرت
 ہے کہ یہ کتنی عجیب
 تھا ہے !
 مطلب یہ کہ
 زندگی میں کبھی ایک
 لمحے کے لیے بھی رات
 نصیب نہ ہوئی۔ یہاں

ہم یہی سمجھتے رہے کہ جو کچھ ہے، ہمارے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ تیری طرف
 سے کبھی کوئی بدگمانی پیدا نہ ہوئی اگرچہ تجھ سے لطف و کرم کی امید عجیب سی معلوم
 ہوتی ہے، لیکن بدستور قائم ہے۔

۲۔ شرح : خود ہی سوال کرتے ہیں کہ اسے خدا! جب ہم تیری طرف
 سے کوئی رنج و غم ہی برداشت نہیں کرتے تو آخر تجھ سے لطف و کرم کی امید پر
 کیوں زندگی بسر کر رہے ہیں؟ لطف کی امید تو اسی کو ہو سکتی، جو ظلم ہے۔

۳۔ شرح : ہم اپنے خیال میں رات دن تجھ سے مل رہے ہیں۔
 معلوم نہیں، یہ ہمارے دل کی وارنگی اور دیوانگی ہے یا یہ سب کچھ کسی قوت
 کے تصرف کا نتیجہ ہے۔

۴۔ لغات : ہرزہ پڑو ہی : پیسودہ، جستجو، لغو خیال۔

شرح : اتنے ظلم و جور نہ رہے، پھر وفا کے راستے سے

ہٹ جانے کی فکر ہوئی۔ اسے پیسودہ فکر! الگ ہوا، ہمنہ پرے، انہوں نے عاجز آ گئے۔
 مطلب یہ کہ جو رجحان برداشت کر چکے کے بعد وفا سے دست بردار ہونا
 سراسر لغو خیال ہے۔

۵۔ شرح : غائب وقادار ہے اور تو نے ظلم و جور میں کبھی نہیں کی۔ دونوں باتیں زمانہ بھر میں مشہور ہیں۔ ہمارے لیے اس باب میں کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے ؟



۱۔ شرح : نالے دل کھول کے دو چار کروں یا نہ کروں
 اسے ظالم آمان !
 یہ بھی اسے چرخ شنگار ! کروں یا نہ کروں
 میں دو چار نالے کروں
 مجھ کو یہ وہم کہ انکار نہ ہو جائے کہیں
 یا نہ کروں ؟ اتنے
 ان کو یہ فکر کہ اقرار کروں یا نہ کروں ؟
 ظلم سے اتنے ڈکھ
 لطف جب ہو کہ کروں غیر کو بھی میں بدنام
 اچھا ہے اب یہ
 کیسے کیا حکم ہے سرکار ! کروں یا نہ کروں
 یا نہیں ؟

۲۔ شرح : میں نے محبوب سے وصل کا سوال کر دیا ، ساتھ ہی دل پر یہ وہم سوار ہو گیا کہ
 کہیں انکار نہ کر دیں۔ وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ اس سوال کے جواب میں انکار
 کروں یا نہ کروں ؟

۳۔ شرح : مجھ سے تو آپ کو راہ و رسم پسند نہیں اور غیر سے صلہ دل
 جاری ہے۔ مزہ اس وقت آئے جب میں آپ کے ساتھ غیر کو بھی بزم کرتا
 فرمائیے سرکار ! کیا حکم دیتے ہیں ، ایسا کروں یا نہ کروں ؟



۱۔ شرح : نہ پوچھ حال اس انداز ، اس عتاب کے ساتھ
 اے محبوب ! تو
 بیوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ
 نصتہ بھر سے انداز

غٹھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی

ملو رقیب سے، لیکن ذرا حجاب کے ساتھ

نہ ہو بہ ہرزہ روا دارِ سعی ۔ یہودہ

کہ دورِ عیش ہے مانا خیال و خواب کے ساتھ

یہ غمِ غمِ دل باعثِ مسرت ہے

نورِ حیرتِ دل ہے ترے شباب کے ساتھ

.....

سکونِ دل کو تعلق ہے اضطراب کے ساتھ

لگاؤ اس کا ہے باعثِ قیامِ ہستی کا

ہوا کو لاگ بھی ہے کچھ مگر حباب کے ساتھ

ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالب !

کہ جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

میں میرا حال نہ بدھیے۔

اگر جواب دوں تو اس

کے ساتھ جان بھی

ہوں پرا جائے گی۔

۲۔ شرح :

اگر تم رقیب سے غٹنے

پر غٹے بیٹھے موقوف ہوتے

غٹے رہو، لیکن ذرا حجاب

اختیار کرو تاکہ میں

بالکل ہی مایوس نہ ہو

جاؤں، یہاں تک کہ

تمہارا ہی تمنا سے بھی

بہتر دھو بیٹھوں ۔

۳۔ شرح :

ایک یہودہ اور

رانگلاں کو شش میں

بلے فائدہ مصروف

رہنے سے کیا حاصل !

یہ حقیقت ہے کہ عیش کا راند خیال یا خواب سے مشابہ ہے ۔ یعنی اس دنیا میں عیش

کے لیے خیال و خواب کی طرح کوئی ثبات و قیام نہیں۔

۴۔ لغات : یہ ہر غم : ہر مصرت میں، ہر طرح ۔

شرح : غمِ دل کے لیے ہر حال میں باعثِ راحت ہے، کیونکہ

جیسے جیسے شہابِ ترقی کر رہا ہے، ویسے ویسے میرے دل کی حسرت

بڑھ رہی ہے۔

۵- شرح : پہلا مصرع پڑھا نہیں گیا، دوسرے مصرع کا مطلب ہے کہ دل کے سکون کو اضطراب و پریشانی سے تعلق ہے۔

۶- شرح : ہوا کا لگاؤ ہی بیلے کے بے زندگی کا باعث ہے۔ یعنی ہوا ہی کی بدولت بیلکا پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ لگاؤ کے ساتھ ہوا کو بیلے سے۔
لاگ بھی ایسی دشمنی بھی ہے، کیونکہ ہوا ہی اسے توڑ بھی دیتی ہے۔

۷- شرح : اسے غائب ! ہزار افسوس کہ اس دنیا میں کوئی ایسا وجود نظر نہ آیا، جو جاننے کو سونے کے ساتھ ملا دے۔

مطلب یہ کہ شبِ فراق میں عاشق کو نیند نہیں آتی۔ نہ رات ختم ہوتی ہے، نہ دن کو قرار آتا ہے، نیند کا کاما دو چلتا ہے۔ اس حالت میں پریشان ہو کر کہتا ہے، کاش کوئی ایسا دہندہ حکیم ہوتا، جو میری بیداری کو نیند سے ملا دیتا، یعنی میں سو جاتا تاکہ کچھ مدت کے لیے پریشانیوں سے نجات پاتا۔

وضع نیرنگی آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و بخور گوارا ہم کو
دشت و حشت میں نہ پایا کسی صورت کمرخ
گر و جولانِ جنوں تک نے پکارا ہم کو
عجز ہی اصل میں تھا حاملِ صد رنگ و جوج
ذوقِ پستی مصیبت نے ابھارا ہم کو

۱- شرح :
ہمیں دیا کئے تفرات
کی کیفیت نے مار
ڈالا۔ اب ہر دم کے
عظم و جوہر ہمیں گولا نہیں
اور ہم انہیں خوشی
خوشی برداشت کرنے
کے لیے تیار ہیں۔
جب تک یہ

ضعف مشغول ہے بیکار برسی بھیا
 کر چکا جوش جنوں اب تو اشارا ہم کو
 صدرِ محشر کی صدا میں ہے فسونِ امید
 خواہشِ زیست ہوئی آج دوبار اہم کو
 تختہ گور سفینے کے مماثل ہے، اسدا
 بحرِ غم کا نظر آتا ہے کنار اہم کو
 اندازہ نہ تھا کہ دنیا
 کی کسی چیز کو ثبات
 نہیں تو ہر تکلیف وہ
 وقتے پر پریشان
 ہوتے تھے۔ اب
 ہم پر روشنی ہو چکا
 ہے کہ یہاں کی کسی
 بھی حالت کو قرار
 نہیں۔ زمانہ گردش

میں ہے اور ہر رنگ بدلتا چلا بار بار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے رنج و غم کو
 بھی ایک عام چیز مان لیا اور بے تکلف سب کچھ برداشت کرتے چلے جا رہے
 ہیں۔ اقبال کیا خوب کہ گئے ہیں۔

سکونِ مہال ہے قدرت کے کارِ ظہیں

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

۲۔ شرح : ہم بخود ہو کر یا باہر جنوں میں پہنچ گئے اور ایسے کم ہرے
 کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ بخود ہی کے عالم میں پھلتے پھلتے جو گروہم نے اڑائی
 تھی، وہ بھی پھارتی رہی، مگر کوئی جواب نہ ملا اور ہمارا کچھ پاتا نہ چلا۔

۳۔ شرح : ہمارا عجز و نیاز ہی اصل میں ہماری ہر قسم کی برتری کا
 ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ مصیبتوں نے ہم میں پستی کا جو ذوق پیدا کر دیا تھا، وہی ہمارے
 ابھرنے کا سہارا بن گیا اور ترقی کرتے کرتے ہم کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

۴۔ شرح : بیشک ہم ضعیف ہیں، لیکن جوشِ جنوں کا اشارہ پائے
 ہی صحرا گردی کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اب ضعف ہمیں روکنے کی جو بھی کوشش
 کرے گا، وہ بالکل بے سود اور بے حاصل ہوگی۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جامادِ آخر ذی قعدہ و طاعت پر موقوف نہیں، بلکہ اس کی ہر سرگرمی محض جہنم کا نتیجہ ہے۔ گویا ہماری ظاہری حیثیت پر نہ جانا چاہیے، معنوی قوت پر نظر رکھنی چاہیے۔

۵۔ شرح : قیامت کے دن شہرہ چوں کا گیا تو ان بھی قبر سے دوبارہ زندگی کی امید ہے کہ انہارِ معلوم ہو تا ہے کہ حقور کی آواز میں اتید کا کوئی جادو بھرا تھا، جس نے میری وہ ملاسی اور افسردگی بالکل ختم کر دی، مجھ کو مرگ کے مصیبت خیز حوادث و تجربات کا نتیجہ تھی۔

۶۔ لغات : مماثل : مانند، مشابہ۔

شرح : اے اسد ! قبر میں جو جلتے لگائے جاتے ہیں، وہ کشنی سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں، جس میں بیٹھتے ہی غم کے دریا کا کنارہ نظر آگیا۔

مطلب یہ کہ موت ہی پر اس دُنیا میں غم ختم ہوتے ہیں، جیسے کہ

دو۔ مر۔ ہر۔

قیدِ حیات و بندِ غمِ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

۱۔ شرح :
حسنِ بالکس بے نیاز ہے، پھر بھی ہر وقت
آرائش میں مصروف ہے۔ یہ آرائش ہرگز
نہ ہوتی، اگر نظر کے
حسن بے پروا گرفتارِ خود آرائی نہ ہو
گر کہیں گاہِ نظر میں دلِ تاشائی نہ ہو
میچ ہے تاخیرِ عالم گیری ناز و ادا
فوقِ عاشق گر اسیرِ دامِ گیرائی نہ ہو

ساتھ دل گھات میں
پیٹھ کر حسن کا نظارہ
ذکرتا۔

مطلب یہ کہ
حسن کو نہ اودھ سکتا یاد
آ رہا ہے جو نے اور
بننے شفق کی ضرورت
اس سے پیش آتی
ہے کہ عشق مجبور بیکار
ہے، اگرچہ کھل کر
سلسلے نہیں آتا اور
نظر کی گھات میں پیٹھ

خود گدازِ شمع، آغازِ فسر و رخ شمع ہے
سوزشِ غم درپے ذوقِ شکیبائی نہ ہو
تار تارِ پیرہن ہے اک رگِ جانِ جنوں
عقلِ غیرت پیشِ حیرت سے تماشائی نہ ہو
بزمِ کثرت، عالمِ وحدت ہے، دنیا کے لیے
بے نیازِ عشق، اسیرِ زورِ تنہائی نہ ہو
ہے محبت رہزنِ ناموسِ انساں اے اسدا
قامتِ عاشق پہ کیوں لبوسِ رسوائی نہ ہو

کر دیکھتا ہے۔ اس شعر میں بھی وہی مشہور قول پیشِ نظر رہا جو بہ طورِ حدیث بیان
کیا جا چکا ہے کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ دل چاہا کہ مجھے پہچانا جائے۔ یوں عشق
پیدا ہوا کہ حسن کی معرفت کمال پر پہنچا گئے۔ یہ حسن کی خود آرائی تھی اور کمالِ یوم ہونی
شان سے بھی یہی واضح رہتا ہے کہ خود آرائی بدستور جاری ہے۔

۲۔ لغات : گیرائی : گرفت۔

شرح : حسن کے نامزد ادا نے زمانہ بھر پر اپنی قوت کا سکہ
بھڑکھڑا رہا، لیکن اگر عشق کا ذوق اس حال کی گرفت میں آنے کے لیے تیار نہ ہو
نہ ناز و ادا کی عالمگیری بالکل ہیچ رہ جائے گی۔

مطلب یہ کہ حسن کی جاذبیت اور کششِ صرفِ عشق کی بدولت ہے، اگر کوئی
حسن کے دہم میں پہنچتا ہے تو اسے گون پر پہلے گا اور اس کے
نامزدوں کی تعداد قلیلتہ کیا رہ جائے گی ؟

۳۔ لغات : شکیبائی : صبر، ضبط۔

شرح : غم کا سوز کیوں صبر و شکیب کا ذوق پیدا کرنا چاہتا ہے؟ یعنی اسے کیوں صبر کی آرزو ہو؟ کیا یہ حقیقت معلوم نہیں کہ شمع کا پگھلنا ہی اس کے لیے روشنی کا سرد سامان ہے؟ جب گداز کے بغیر روشنی نصیب نہیں ہو سکتی تو غم کی سوزش کیوں صبر کی طرف مائل ہو؟ سوزش بدستور جاری رہنی چاہیے تاکہ ہمیں بھی شمع کی طرح روشنی مل جائے اور ہم بھی معرفت تک پہنچ جائیں۔

۴۔ شرح : ہمارے لباس کا ایک ایک تار جنوں کے لیے رگِ جان کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی جنوں زندہ ہی اس طرح رہ سکتا ہے کہ لباس تار تار رہے۔ یہ منظور و بیکہ کر عقل کو جڑی غیرت آتی ہوگی اور وہ اس پر سراپا حیرت ہے، لیکن یہ کام اُس سے بن نہیں آ سکتا، اس لیے حیرانی ہے دیکھنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں۔

۵۔ شرح : اگر کسی کے پاس حقیقت کو دیکھنے والی آنکھ ہو تو کثرت کی محفل یعنی کائنات بھی، وحدت کی دنیا ہے، یعنی حقیقت میں کوہِ حجاز، وحدت ہی وحدت نظر آتی ہے۔ جسے عشق کی بے نیازی مل گئی ہے، اسے غلو ت کے گوشے میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ جلوت میں بھی ہر طرف وحدت ہی دیکھ رہا ہے۔

۶۔ شرح : اے اسد! محبت انسان کے نام و ننگ اور عزت کے لیے قزاق کا حکم رکھتا ہے، یعنی محبت ہو جائے تو ناموس و ننگ کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ چہر کیا وجہ ہے کہ عاشق کے بدن پر رسوائی کا لباس نہ ہو؟ ننگ و ناموس ختم ہوئے تو رسوائی کے سوا کیا باقی رہ جاتا ہے؟

خزینہ دارِ محبت ہوئی ہو اسے چمن

بنائے خندہ عشرت ہے، بر بنائے چمن

برہرزہ سنجی گلچیں، نہ کھا فریبِ نظر

ترے خیال کی وسعت میں ہے فضا چمن

یہ نغمہ سنجی بلبل متارِ زحمت ہے

کہ گوشِ گل کو نہ اس آئے گی صدائے چمن

صدائے خندہ گل تا قفس پہنچتی ہے

نسیم صبح سے سنتا ہوں باجرائے چمن

گل ایک کاسہ دریوزہ مسرت ہے

کہ عندلیب نوا سنج بے گدائے چمن

حریفِ نالہ پرورد ہے، تو ہو، پھر بھی

ہے اک تبسم نہاں ترا بہائے چمن

بہارِ اسروِ جاوہِ فنا ہے، اسدا

گل شگفتہ میں گویا کہ نقشِ پائے چمن

رہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ چمن سے جو صدائیں اٹھتی ہیں اور وہ بلبل ہی کے

ترانے ہیں، پھول کے کان کو اس نہ آئیں گی۔

مطلب یہ کہ بلبل کھانے میں کتنی ہی مشقتیں اٹھائے، پھر اس کا گانا پھول

کو گوارا نہ ہو گا۔ عاشقوں کا سال ہر جگہ یہی ہے۔

۱۔ شرح :

باغ کی ہو اپنے دامن

میں محبت کا خزانہ

یہ ہوئے ہے۔

عیش و عشرت کی شادمانی

کی بنیاد باغ ہی کی بنیاد

پر رکھی گئی ہے۔

۲۔ لغات :

برہرزہ سنجی : بیہودہ

گوئی اور عبت کا رمی۔

شرح :

تو گلچیں کی بیہودگی دھوکا

نہ کھا۔ تیرے خیال

کی وسعت میں چمن

کی فضا میں سوئی ہے۔

۳۔ شرح :

بلبل خواہ خواہ ترانے

کا گانا مشقت اٹھا

کہا کہ مشقت اٹھا

بلبل ہی کے

ترانے ہیں، پھر اس کا گانا پھول

کو گوارا نہ ہو گا۔ عاشقوں کا سال ہر جگہ یہی ہے۔

۴۔ لغات : در پوزہ : بھیک۔

شرح : پھول اصل میں خوشی کی بھیک مانگنے کا ایک کارہ ہے اور گانے والی ٹیل چین میں بھکاری بن کر آتی۔

۵۔ شرح : اسے محبوب ! ممکن ہے، عاشق کا درد بھرا تلخ تیری پوشیدہ مسکراہٹ کا حریف بن سکے، لیکن اس میں کیا شبہ ہے کہ اس پوشیدہ مسکراہٹ کے بدلے میں چرما باغ پر طوقِ قیمت نذر کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ شرح : اسے اسد ! بہارِ فنا کے راستے پر چلی جا رہی ہے۔ یہ جو کچھ ہونے پھول ہیں، انہیں باغ کے پاؤں کا نقل سمجھنا چاہیے۔

۱۔ شرح : کرم ہی کچھ سببِ لطف و التفات نہیں

صرف لطف و کرم ہی محبوب کے، انتہات کا نشان نہیں۔ وہ لوازمِ شوق سے عاشق کو ہنسا لیتا ہے، پھر آنا فنا، ظلم و ستم دھا کر رُلا بھی دیتا ہے۔

۲۔ غرض کہ دل کی کسی شے کو بھی ثبات نہیں کہاں سے لا کے دکھائے گی عمرِ کم مایہ

سیہ نصیب کو وہ دن کہ جس میں رات نہیں زبانِ حمد کی خوگر ہوئی تو کیا حاصل

۳۔ شرح : شعر ناقص نقل ہوا ہے، لہذا شرح نہیں ہو سکتی۔

۴۔ شرح : عمر کا سراپا تو بہت قرارِ داخل اجزائے کائنات نہیں۔

ہی کم ہے۔ بعد پر نصیب کو وہ ایسا دن کہاں سے لاکر دکھائے گی، جس کے ساتھ
صاف نہ ہو؟

مطلب یہ کہ اس دنیا کی کوئی خوشی پائدار نہیں جس طرح ہر دن کے ساتھ
وات ہے، اسی طرح ہر خوشی کے ساتھ غم لگا ہوا ہے۔

۴۔ شرح : بیشک میری زبان صمدی ہو گئی ہے۔ اسے باری
تعالیٰ ! میں ہمیشہ تیری حمد و ثنا کرتا رہتا ہوں، لیکن ایک چیز عرض کروں کہ صرف ذات
کی حمد کرتا ہوں، صفات کو ذات میں شامل نہیں سمجھتا۔

اس شعر میں توحید کا ایک اعلیٰ تصور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر خاص
ذات کی حمد ہو ہی نہیں سکتی۔ حمد ہوگی تو صفات ہی کی ہوگی۔ محض الحمد للہ کہے
جانے سے بات نہیں بنتی، یہ بھی کہنا ہوگا کہ وہ جہانوں کا پروردگار ہے، چنانچہ وہ
رحیم ہے، یوم جزا کا انگ ہے۔ اس اعتبار سے عدالت اس کی صفت کمال ہے۔
یہی محال باقی صفات کا ہے۔

۵۔ شرح : اسے اسد ! خوشی کو خوشی نہ کہ، غم کو غم نہ جان، کیونکہ
"اے میں سے کسی بھی شے کو پائدار ہی نہیں، یہ سب بدلتی چلی چلتی ہی ہیں۔
حق یہ ہے کہ کائنات کے اجزاء میں آؤر کچھ بھی ہو، مگر ثبات شامل نہیں، یعنی
یہاں کوئی بھی چیز قائم و باقی نہیں۔

یہ وہی حقیقت ہے، جو شیخ نے اپنی نظم "تغیر" میں بیان کیا اور اقبال چرنے
اسی خیال کو یہ لباس پہنایا:

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثاب ایک تغیر کو ہے زمانے میں

۱۔ شرح :
ہم شمع کی طرح دنا
کے سوختے سا ہیں

جوں شمع ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں
اور اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں

ہیں، یعنی شمع روشنی
کے لیے اپنے آپ
کو جلا رہی ہے اور
ہم وفا کے راستے
میں اپنا ہر سامان
نذر آتش کر چکے ہیں۔
بس اس کے سوا کچھ
معلوم نہیں کہ ہم کیا
ہیں۔

۲۔ لغات :
معدوم :
گم شدہ ۔

شرح :
ہماری جتنی اگرچہ
تو ایسے مقام پر ہے
جو گم ہو۔ ہم ٹوٹے ہوئے
دل کے ساز کی صدا
ہیں اور بالکل بیکار
ہیں۔

مطلب یہ کہ
ٹوٹے ہوئے ساز
سے جو صدا نکلتی ہے
اس میں کوئی نئے
اور کوئی سر ہو ہی

اک سرحد معدوم میں ہستی بے ہماری
سازِ دل بشکستہ کی بے کار صدا ہیں
جس رُخ پہ ہوں ہم سجدہ اسی رُخ پہ ہے واجب
گو قبلہ نہیں ہیں مگر اک قبلہ نما ہیں
مست ہو جیو اے سیلِ فنا! ان سے مقابل
جاننا زالم نقش بہ دامانِ بقا ہیں
پانی ہے جگہ ناصیہ بادِ صبا پر
خاکستر پروانہء جانباز وفا ہیں
ہر حال میں ہیں مرضی صیاد کے تابع
ہم طائرِ پر سوختہ رشتہ بپا ہیں
اے وہم طرازِ نِ مجازی و حقیقی
عشاقِ فریبِ حق و باطل سے جدا ہیں
ہم بے خودی شوق میں کر لیتے ہیں سجدے
یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں تا صیر سا ہیں
اب منتظر شوقِ قیامت نہیں، غالب
دنیا کے ہر اک ذرے میں سو حشر بپا ہیں

نہیں سکتا بلکہ اسے بالکل بیکار سمجھنا چاہیے۔

۲۔ **شرح :** ہم جس طرف بھی منہ کیے بیٹھے ہوں، اسی طرف ہمارے لیے سجدہ واجب ہے۔ بیشک ہم قبلہ نہیں کر چاہیں طرف سجدہ کیا جائے، لیکن قبلہ حاضر نہیں، یعنی قبلہ کا پتا ہمیں سے مل سکتا ہے، اس لیے جس طرف ہمارا رخ ہو، اسی طرف سجدہ کرنا چاہیے۔

۳۔ **شرح :** اسے فنا کے سیل ! اُن لوگوں کے روبرو نہ آنا، جو محبوب کے غمِ عالم میں جان کی بازی لگا چکے ہیں۔ یاد رہے کہ وہ بتا کے دامن پر نقش کی طرح قائم ہو گئے ہیں، یعنی انہیں کوئی مشا نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ اپنی جگہ استوار رہیں گے اور سیل اُن کا کچھ لگاؤ نہیں سکتا۔

۵۔ **شرح :** ہم سچ دانے کی راکھ ہیں، جس نے دغا میں جان دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس راکھ کو بادِ صبا کی پیشانی پر جگہ ملی۔
پیشانی پر جگہ ملنا انتہائی عظمت کا نشان ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہوا پہلے نوسب سے پہلے راکھ ہی کو اکڑا لے گی۔

۶۔ **شرح :** ہم لوگ ہر حال میں صیاد کی مرضی کے پابند ہیں۔ ہم ایسے پرندے ہیں، جن کے پر ہلا دیئے گئے اور پاؤں میں دھاگا باندھ دیا گیا۔ گویا دھاگوں کے ہیں، نہ اور صر اور صر جاسکتے ہیں۔
میرزا کے نزدیک یہ زندگی کا نقشہ ہے۔

۷۔ **شرح :** اسے مجاز اور حقیقت کے ادغام کی آرائش کرنے والا، تم حق اور باطل کا فریب کما سکتے ہو، عاشق اس فریب سے بالکل الگ تعلق میں۔ وہ حق اور باطل، نیک اور بد کے جھگڑے میں نہیں پڑتا، اُن کے نزدیک مجاز و حقیقت میں امتیاز کی کوئی وجہ نہیں۔

۸۔ **شرح :** ہمیں عشق نے مجبور کر رکھا ہے، اپنے آپ کی خبر نہیں۔ اسی بخودی میں سجدے بھی کر بیٹھے ہیں، البتہ ہم سجدے کو سمجھنا چاہیے کہ گناہ ہے۔

سمجھ رہے کرتے ہیں، کس مقام پر پیشانی لکھتے ہیں۔

۹- شرح : اب قاتب کو شور قیامت کا کوئی انتظار نہیں رہا، کیونکہ اسی دنیا کے درے درے میں سیکڑوں محشر ہوا ہیں۔ رات دن ان محشروں کے منظر دیکھنے کے بعد قیامت کے انتظار کی کون سی صورت باقی رہ گئی؟

۱- لغات :

آفت، آہنگ :

جس کی ہر صدا آفت

ڈھانے کا باعث ہو

شرح :

بہل کی آہ و فغان آفت

ڈھان رہی ہے، اس

یسے بھول کھل کر نہیں

ہنس سکتا۔ مگر بہل کی

آہ و فغان نہ بھول تو بلیغ

میں بھول اتنا ہنستا،

اتنا ہنستا کہ دم توڑ

دیتا۔

مطلب یہ کہ

زندگی کا کوئی دائرہ

اور کوئی حلقہ ایسا نہیں

جس میں خوشی کے

ساتھ رنج اور رنج اور

آفت آہنگ ہے کچھ نالہ بلب، ورنہ

پھول ہنس ہنس کے گلستاں میں فنا ہو جاتا

کاش! ناقد ورنہ ہوتا ترا اندازِ خرام

میں غبارِ سرورِ امانِ فنا ہو جاتا

یک شہِ فرصت ہستی ہے اک آئینہِ غم

رنگ گل کا حق! گلستاں کی ہوا ہو جاتا

مستقل مرکزِ غم پر ہی نہیں تھکتے، ورنہ

ہم کو اندازہ آئینِ فنا ہو جاتا

دستِ قدرت ہے مرا خشتِ یزدیوار فنا

گر فنا بھی نہ میں ہوتا تو فنا ہو جاتا

حیرت اندوزیِ اربابِ حقیقت مت پوچھ

جلوہ لکھتے تو آئینہ ہنس ہو جاتا

کے ساتھ ملاں نہ ہو۔ اس کائنات کا توازن اسی طرح قائم رہتا ہے کہ نہ صرف خوشی ہو، نہ صرف رنج ہو۔ دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی ہوتی تو اس حد پر پہنچ جاتی کہ زندگی قائم نہ رہ سکتی۔ دن کے ساتھ رات، اگر اس کے ساتھ سرما توازن کے لیے ہے۔ اسی طرح خندہ گل کے ساتھ نازِ بیل رکھتا تاکہ توازن میں خلل پیدا نہ ہو۔

۲۔ شرح : اے محبوب ! اگر تیری رفتار ناز کا طور طریق عاشق کی ناقصی ذکر کا تلوہ اب تک کبھی کا قبار بن کر دامنِ فنا کے ساتھ لگ جاتا، یعنی فنا ہو جاتا۔ مصیبت یہ ہے کہ تیرے اندازِ خیرام نے اس کی قدر پہچانی اور وہ اب تک اسی امید پر زندہ ہے کہ کبھی نہ کبھی اُسے تیرے خیرام کی بدولت فنا کی منزل نصیب ہو ہی جائے گی۔

۳۔ شرح : پھول کے لیے زندگی کی مصلحت صرف ات بھری ہے، یعنی شام کو کھلا اور صبح کو تازگی اور شادابی کی سہار دکھا کر رفتہ رفتہ بکھر گیا۔ یہ زندگی کی مصلحت نہیں، بلکہ غم کا ایندھن ہے، کیونکہ رات بھر کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، اب حل میں یہ آہِ زہر پیدا ہو رہی ہے، کاش پھول کا رنگ باغ کی ہوا بن جائے کہ رنگِ باغ کو پھول کی مصلحتِ ہستی کے مقابلے میں زیادہ پائدار ہی حاصل ہے۔

۴۔ شرح : ہم غم کے مرکز پر پورے ہی طرح استوار ہی نہیں تھے، یعنی اس مرکز سے بھی ادھر ادھر ہٹتے رہے۔ اگر اس پر جمے رہتے تو ہمیں یہ اندازہ تو ہو جاتا کہ وفا کا طریقہ کیا ہے۔ گویا وفاداری کا طریقہ وہی بنا ہوا ہے، جو غم کے مرکز پر مستحکم قائم رہ سکے۔

۵۔ شرح : میرا دوست جنوں دیوارِ فنا کی ایک اینٹ ہے۔ اگر میں خود فنا نہ ہوتا تو اس حالت میں بھی لازم تھا کہ رفتہ رفتہ مٹ جاتا اور فنا کے گھاٹ اتر جاتا۔

فنا کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مٹا دے۔ دوسری صورت

یہ سچ کہ فنا کی دیوار چٹنی جا رہی ہے، اس میں اذیت بنی ہو کر لگتا جائے۔ جب دیوار مکمل ہو جائے گی تو فنا کا سفر بھی اختتام کو پہنچ جائے گا۔ یہی مفسرین فارسی کے ایک شاعر میں کسی نے بیان کیا ہے :

جان بہ جاناں وہ و گرد از تو بیستاند اہل
خود تو منصف باطن اسے جل : ایں بکنیہ آں بکنیہ

۴۔ شرح : حقیقت شناس لوگ حیرت پر حیرت جمع کرتے جا رہے ہیں، یعنی ان پر برابر حیرت کی کیفیت طاری ہے۔ کاش محبوب کا جلوہ کسی نہ کسی دن انھیں آئینہ دکھا دیتا۔

مطلب یہ کہ جب تک محبوب کا جلوہ نظر نہ آئے، وہ حیرت ہی میں رہیں گے۔

۱۔ شرح :

خزاں کے موسم میں
باغ کا صحن دہرائے
سب سے بھی زیادہ بے وقوف
ہو گیا ہے اور بیل کا
گھر پھول کی جسی کے
بغیر بے چراغ معلوم
ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ
باغ و بہار جو گاتونہ
کلیان نمودار ہوں گی،
نہ پھول کھلیں گے،

بدتر از ویرانہ ہے فصل خزاں میں صحن باغ
خانہ بلبلی بغیر از خندہ گل بے چراغ
پتا پتا اب چمن کا انقلاب آلودہ ہے
نغمہ مرغ چمن ترا ہے صدائے بوم و زاغ
ہاں بغیر از خواب مرگ آسودگی ممکن نہیں
درخت ہستی باندھ تا حاصل ہو دنیا سے فراغ
شورِ طوفانِ بکلا ہے خندہ بے اختیار
کیا ہے گل کی بے زبانی کیا ہے لالے کا داغ

دلیل کو اطمینان کا
چشم پر غم رہا ، زمانہ منقلب ہے اسے اسدا
کوئی ٹھہرا نہیں ہوگا۔
اس کے گھر کی رونق
اب یہی ہے بس مے شادی سے پڑھوٹا ایلاخ
پھولوں سے ہے۔
پھول نہ رہے تو گھر
کی رونق نہ رہی۔

۲- شرح : باغ نکا پتہ پتہ انقلاب سے بھرا ہوا ہے۔ یعنی زرخیز
سے اس کی حالت بدل رہی ہے۔ معلوم ہے کہ خزاں میں پتہ بھڑک رہا
ہو جاتی ہے اور بہتر پتے رفتہ رفتہ زرد ہو جو کر نہیں پڑ گئے ہیں۔
میں وہ ہے کہ اس کیفیت کے لیے انقلاب آلودہ "کی ترکیب ایجاد کی گئی۔
جو پرندے نہیں ہیں پیدا ہوئے اور چہن ہی کے ترانے گانے رہے ،
خزاں میں ان کا گانا ویسا ہی گمراہ معلوم ہوتا ہے ، جیسے آواز کوڑے کی آواز
ہو۔ یہ بھی انقلاب احوال ہی کی کیفیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عیش و طرب کی جتنی چیزیں ہیں ، ان کی رونق اور دلاویزی
خاص قسم کی فضا پر موقوف ہے۔ مثلاً باغ میں بہتر ہو ، پھول ہوں ، درخت
ہرے ہرے ہوں تو ہر پرندے کا نغمہ خوشگوار معلوم ہوگا۔ یہ سب چیزیں
ختم ہو جائیں اور بے رونق چھا جائے تو بہتر سے بہتر نغمہ بھی دلاویزی کھو بیٹھے
گا اور ناگوار معلوم ہوگا۔

میزبانے غم و رنج اور افسردگی کی حالت میں خوشگوار چیزوں کے ناگوار
ہونے کا ذکر اور جگہ بھی کیا ہے ، مثلاً :

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
تجھے دماغ نہیں خندہ لائے بیجا کا

۳- شرح : جب تک انسان موت کی غیند نہ سو جائے ، اس

کے لیے رجعت پانا اور اسودہ رہنا بالکل غیر ممکن ہے۔ اگر تو دنیا کے جہنم سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو تجھے چاہیے کہ زندگی کا سرو سامان باندھ کر یہاں سے رخصت ہو جائے۔

یہ بھی وہی بات ہے، جو پہلے کئی مرتبہ کہی جا چکی ہے، مثلاً :

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے گیوں

۴۔ شرح : بھول اپنی خوشی اور اختیار سے نہیں ہنستے۔ یعنی اُن کا کیلنا خود اُن کے اختیار میں نہیں، بلکہ وہ کسی کے حکم اور کسی کے اشارے کے تابع ہیں۔ یہ کیلنا اور یہ ہنسا اصل میں طوفانِ بلا کا شور ہے، جس نے بھول کو پکھڑیوں کی زبانوں کے باوجود بے زبان اور دم بخود بنا رکھا ہے اور اسے کے سینے میں داغ پڑا ہوا ہے۔

۵۔ لغات : منقلب : اُلٹ پلٹ، دوبالا۔

ایاغ : پیار، شراب کا پیار۔

شرح : اسے اس زمانہ دوبالا ہو رہا ہے، تو اپنی

آنکھ پر نم رکھ، یعنی اشکبار رہ۔ آج اس دنیا میں خوشی کی شراب سے پیار بریز رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہیں۔ کیوں بھری رہیں؟ اس لیے کہ زمانہ ہر لحظہ تغیر میں چھوڑتا ہے، اتنی تیزی سے جتنی جا رہی ہے :

ہر شے ماسٹر، ہر چیز راہی

قصائد

میکلوڈ صاحب کی خدمت میں

کرتا ہے چرخ روز بہ صد گونہ احترام
فرماں روائے کشورِ پنجاب کو سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نواب مستطاب، امیر شہ احتشام
بحم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم
نرب فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں جام
جس بزم میں کہ ہوا انھیں آئینِ میکشی
وال آسمان شیشہ بنے آفتاب جام
چاہا تھا میں نے تم کو مہ چار وہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
دورات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدوام

تمہید :-

۱۳ رجسٹر می ۱۸۹۹ء کو
پنجاب کے گورنر،
ڈونلڈ میکلوڈ نے یہی
کے افتتاح کے لیے
دہلی میں ایک دربار منعقد
کیا تھا۔ میرزا بھی اس میں
شریک ہوئے تھے۔
اس وقت صحت بہت
کمزور تھی۔
ماستریاں سے لالہ شوب
بوا گئے چل کر لکھے بہادر
ہوئے، چلتے ہی میرزا
کو سہارا دے رہے تھے۔
محققانہ مہاویدہ کا بیان
ہے کہ میکلوڈ صاحب
نے میرزا سے پوچھا
یہ کپ کا بیٹا ہے ؟

سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
 دریا سے نور ہے فلک آگینہ خام
 میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر
 حق کے تفضلات سے ہو مرجع انام
 اخبار لودھیانہ میں، میری نظر پڑی
 تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
 ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
 کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام
 وہ فرو جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
 جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تمام
 سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک فلم
 لمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
 ستورس کی عمر میں یہ داغ جاں گداز
 جس نے جلا کے راکھ مجھے کرویا تمام
 حقی جنوری جبینے کی تاریخ تیرھویں
 استاد ہو گئے لب دریا پہ جب خیام

کسا، جتنا نہیں مگر بیٹھے
 سے زیادہ ہے۔
 معلوم ہوتا ہے
 کراہی مجلس نے ان
 کے وقار و احترام کا پورا
 خیال نہ رکھا اور پہلے
 دستور کے مطابق نشست
 بھی نہ لی۔ لدھیانہ کے
 ایک اخبار میں جو روداد
 شائع ہوا، اس میں میٹر
 کا نام تک غلط لکھا گیا۔
 اس پر تقریب کے بعد
 میرزا نے یہ قصیدہ لکھ کر
 کی خدمت میں پیش کیا۔
 یہ بھی سب سے پہلے
 "السلام" دہریہ جنوری ۱۹۹۱ء
 ہی میں شائع ہوا تھا۔
 قصیدے میں گورنر کا نام
 میکلیوڑ چھپا ہے "السلام"
 میں نام منکروڑ تھا۔ غالباً
 بیاض میں یہی مدح ہو۔
 میرے نزدیک شعر میں
 میکلیوڑ آسکتا ہے۔

اُس بزم پُر فروغ میں اس تیر و بخت کو
 لمبرِ طائشِیب میں از روئے اہتمام
 سمجھا اسے گراب، ہوا پاش پاش دل
 دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمکِ عوام
 عزت پر اہل نام کی ہستی کی ہے بناء
 عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی، نہ نام
 تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
 اس ناز کا فلک نے یا مجھ سے انتقام
 آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
 تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام
 اس کشکش میں آپ کا مداح درد مند
 آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام
 جو واں نہ کہ سکا تھا وہ لکھا حضور کو
 دیں آپ میری داد کہ ہوں فاتر المرام
 ملک دسپہ نہ ہو تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں
 سلطانِ بڑ و بھر کے در کا ہوں میں غلام

اغلب ہے، غالب
 نے یہ لکھا ہونقل میں
 غلطی ہو گئی۔

۱۔ شرح :
 ولایت پنجاب کے حکمران
 کو آسمان پر روزِ احترام
 کے سیکڑوں طریقوں
 سے سلام کرتا ہے۔

۲۔ لغات :
 مستطاب :
 خوش، نیک، بزرگ۔

شرح : وہ
 حکمران، جو بچ کتاب ہے،
 بچ کا پابند ہے، بچ
 سوچتا، بچ پہناتا ہے۔
 وہ بزرگ قوایہ ہے

اور اگرچہ امیر ہے، لیکن
 اسے بادشاہ جیسی
 شان و شوکت حاصل
 ہے۔

۳۔ لغات :
 ترگِ فلک :
 مریخ۔

و کٹوریہ کا دہر میں جو مدح خوان ہو
 شاہان مصر چاہیے لیں عزت اس سے وام
 خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
 بے وجہ کیوں ذلیل ہو، غالب جس کا نام
 امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
 بارے قدیم قاعدے کا چاہیے قیام
 ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو،
 چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام
 دستور فق شرعی ہی ہے، قدیم سے
 یعنی دعا پہ روح کا کرتے ہیں، اختتام
 ہے یہ دعا کہ زیرِ نگین آپ کے رہے
 افلیم ہند و سند سے تا ملک روم و شام

حسام :
 جو ہر دار تنوار۔

شرح :
 جمشید جیسے مرتبے
 والا میکلوڈ بہادر اور جو
 جنگ کے وقت مشائخ
 کے باعث مدح کے
 ہاتھ سے بھی ہوا ہے
 ہے۔

۳۔ شرح :
 جس مغل میں وہ شرب
 پینے کا سروسا مل
 آرامت مگر وہاں
 شراب کی ملاحی اور
 میکاش کا پینا نہ ہیں
 ہائے۔

۴۔ لغات :
 علی اللوام :
 ہیشہ کے لیے۔

شرح :
 میری آرزو تھی کہ اسے گورنر ! آپ کو چودھری کا چاند
 کہوں، لیکن دل نہ کھا : تیرا یہ خیال بالکل خام ہے۔ دیکھو، چاند کے جلال و شکوہ
 کا ہنگامہ دو باتوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ گھٹنا شروع ہو جاتا ہے، لیکن میکلوڈ
 بہادر کی عزت اور بلند مرتبہ ہمیشہ قائم رہے گا۔

۷۔ لغات : آبلینہ فام : کالج کے رنگ کا۔

شرح : اسے گورنر ہرگز شبہ نہیں کہ آپ سورج ہیں جس کی
نیا سے کالج کے رنگ کا آسمان صریحے گورنر بنا ہوا ہے۔

۸۔ لغات : تفضلات : تفضل کی جمع، لطف و کرم۔

مردمخ انام : لوگوں کے لیے جانے رجوع۔

شرح : میری گزارش سنیں اور آج آپ اس سرزمین پر خدا کے
لطف و کرم سے عام لوگوں کے لیے جانے رجوع ہیں، یعنی سب اپنی ضرورتوں کے
لیے آپ کے پاس آ رہے ہیں۔

۹۔ شرح : ادھیانہ کے اخبار میں ایک ایسی تحریر میری نظر سے
گزری، جس سے مجھے بہت رنج پہنچا۔

۱۰۔ شرح : وہ تحریر دیکھ کر کہا ٹھوٹے ٹکرے ہو گیا۔ شاید لکھنے
والے کی آستیں، آستیں نہ تھیں، بلکہ تھوڑا کا غلام تھی۔

مطلب یہ کہ کاتب نے آستیں میں خنجر چھپا رکھا تھا، اس سے جگر پارہ
پارہ ہو گیا۔

۱۱۔ شرح : وہ درق، جس میں نام تک میرا غلط لکھا ہے، جب
کبھی یاد آئی، لکھا ختم یا۔

۱۲۔ شرح : تمام حالات یکایک بالکل بدل گئے۔ دیر اور جبرانی رہا،
ذخیرہ کا سلسلہ قائم رہ سکا، دھمکتے کا اختتام نظر آتا ہے۔

۱۳۔ شرح : ستر برس کی عمر ہو گئی اور یہ جان کو گھٹا دینے والا داغ
میرے سینے پر لگا، جس نے مجھے جلا کر بالکل ڈاکٹر کر دیا۔

۱۴۔ اب دربار کی کیفیتوں کی بیان کرتے ہیں :

لغات : خیم : خیمے کی جمع۔

شرح : جنوری ۱۸۷۹ء کی حیرتوں کی تاریخ مکتی، جب دیا کے

کنارے خیمے کھڑے ہو گئے۔

۱۵- شرح : وہاں جشن کی جو نفل آراستہ ہوئی، اس میں بھوسیاہ بخت کو انتظام کے مطابق نشست کا درجہ نشیب میں ملا۔ یعنی میرا درجہ منصب کے مقابلے میں نیچے تھا۔

۱۶- لغات : گِراب : یہ انگریزی لفظ گریپ (Grape) کو فارسی اور اردو کا لباس پہنایا گیا ہے۔ مراد ہے توپ کا وہ گولا، جس میں پھڑے گویاں اور مال بھر کر پھڑتے ہیں۔ وہ پھٹتا ہے تو شدید نقصان نہیں کرتا، لیکن نقصان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔

چشمکِ عوام : عام لوگوں کے طنزیہ اشارے۔

شرح : اپنے اصل درجے سے کم درجے میں نشست ملی تو میں نے سمجھا کہ چنگِ گِراب پھینکا گیا۔ دل کھڑے کھڑے ہو گیا، کیونکہ دربار میں لوگوں نے آنکھوں سے طنزیہ اشارے شروع کر دیئے۔

۱۷- شرح : نامور لوگوں کی ہنسی کی بنیاد عزت ہے۔ جہاں عزت گئی، وہاں نہ ہنسنی رہی، نہ نام رہا۔

۱۸- شرح : مجھے شاعری میں درجہ کمال پر ایک حد تک ناز تھا۔ اب آسان نے مجھ سے اس ناز کا بدلا لے لیا۔

۱۹- شرح : ریل کے افتتاح کا وقت بھی بہت قریب آ گیا تھا اور آپ کی خاص بارگاہ میں بے شمار خلقت جمع تھی۔

۲۰- شرح : اس کینچن خان میں آپ کا یہ دردمند مداح نامور آغا سے کوئی بات نہ کر سکا۔

۲۱- لغات : فائز المرام : مقصد کو پہنچنے والا کامیاب۔

شرح : جو کچھ وہاں عرض نہ کر سکا، وہ اب حضور کو لکھ رہا ہوں۔ آپ داد رسی فرمائیں تاکہ میں مقصد پا لوں۔

۲۲- شرح : اگر میرے پاس ملک یا قلعہ نہیں تو دس سہی، اس سے کیا نقصان پہنچتا ہے؟ میں تو سمندروں اور خشکیوں کے فرمانروا کے دروازے کا غلام ہوں۔

۲۳- لغات : وام : قرض
 شرح : کون فرمانروا؟ ڈکٹور یا، وہ ڈکٹور یا کہ زمانے میں اس کی تعمیر کرنے والا ہو، لازم ہے کہ وقت کے بادشاہ عزت اس سے اڈھار لیں۔ مطلب یہ کہ عزت اسی کے پاس ہوگی، ثناء ابنِ عصر جو کچھ لیں گے، وہ اس سے اڈھار لیں گے۔

۲۴- لغات : متارک : تلافی۔
 شرح : حکومت کے لیے لازم ہے کہ مجھ پر جو زیادتی ہوئی ہے، اس کی تلافی کر دے۔ جس شخص کا نام غائب ہے، آخر وہ کیوں ہے وہ جہیل ہو۔
 ۲۵- شرح : میں کسی نئی بات کے لیے سوال نہیں کر رہا، لیکن پہلے سے جو تاعدہ چلا آ رہا ہے، وہ تو قائم رہنا چاہیے۔

۲۶- لغات : اعادہ : لوٹانا، بحال کرنا۔
 شرح : میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری عزت بحال کی جائے۔ حضور چاہیں تو یہ کام ہرگز مشکل نہیں۔

۲۷- شرح : فن شعر کا طریقہ پہلے سے یہی چلا آتا ہے کہ مدح کو دعا پر ختم کرتے ہیں۔

۲۸- شرح : لہذا میری یہ دعا ہے کہ ہندو در سندھ سے روم اور شام تک ملک آپ کے زیرِ نگیں رہیں۔

والی الور کی سالگرہ پر

تمہید :-

یہ قصیدہ مبارکبادیاً
شیروان سنگھ کی مداح
میں اس کی سالگرہ کے
موقع پر کہا گیا تھا۔

میرزا کے کلیات میں
فارسی کا ایک قصیدہ
بھی موجود ہے، سالگرہ
واسے قصیدے سے

کچھ مدت پیشتر کہا گیا
تھا۔ اس میں وہ اپنی
عمر تریسٹھ سال بتاتے
ہیں اور کہتے ہیں،

اٹھاون سال سے
میں آپ کا حلقہ بگوش
چلا آتا ہوں، کیونکہ
پانچ سال کی عمر میں
آپ کا ملازم ہو گیا
تھا۔

گنتی ہیں سال کے رشتے میں ہمیں بارگرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ
گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بہ روز شمار
ہوا کرے گی ہر اک سال، پیش کار گرہ
یقین جان، برس گانٹھ کا جو ہے تا گا
یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ
گرہ سے اور گرہ کی امید کیوں نہ پڑے
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ
دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ دیکھو کتنی اٹھا لائے گا یہ تار گرہ
کہا کہ چرخ پہ ہم نے گنتی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنیں گے تو پاویں گے نو ہزار گرہ

خود آساں ہے ہمارا راجا جا پر صد قے
 کرے گا سیکڑوں، اس تار پر نثار، گرہ
 وہ راجا جا بہادر کہ حکم سے جن کے
 ہواں ہوں تار پہ فی الفور دانہ وار، گرہ
 انہیں کی سالگرہ کے لیے ہے سال بہ سال
 کہ لائے غریب سے غنچوں کی نو بہار، گرہ
 انہیں کی سالگرہ کے لیے بتاتا ہے
 ہوا میں بوند کو، ابر تگرگ بار، گرہ
 انہیں کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے
 کہ ہو گئے ہیں گہرا سے شاہوار، گرہ
 انہیں کی سالگرہ کے لیے ہے یہ توقیر
 کہ بن گئے ہیں ثمر ہائے شاخسار، گرہ
 سن، اے ندیم! برس گانٹھ کے یہ تاگے نے
 تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار، گرہ
 چمے دعائے بقائے جناب فیض مآب
 لگے گی اس میں ثوابت کی، استوار، گرہ

ندیم کی گشت گوہر میں صد سالہ ستم
 ندیم کی لکھنے شہید، سن بہ کاہنار
 دروغ سالوی شہداء مہاکر تضرع
 مدد میں تخی طرز ام و دیریں و عین غدار
 دام پر قوش علاقہ نہ خیالہ دشت سل
 اکوٹوں کو غرضت و سر سال است و شکار
 کالی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست
 مدد غالب راجا کو چہ بدام راجا و مزار

شیوہاں سنگھ کی
 بیسوی سالگرہ چاندو
 کا قصیدہ پیش کیا گیا تھا۔
 شیوہاں سنگھ کے والد
 راجا بیٹی سنگھ ۱۹۵۸ء
 میں مرے تھے۔ اس
 وقت شیوہاں سنگھ کی
 عمر تیرہ برس کی تھی۔
 ستمبر ۱۹۵۹ء میں بھٹو کو
 پہنچ کر با اختیار جوئے۔
 غالباً اسی تقریب پر یہ
 قصیدہ پیش کیا گیا۔

ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی
 بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ
 عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اس کو
 کہ چھوڑتا ہی نہیں، رشتہ، زمینار گرہ
 کشادہ رخ نہ پھرے کیوں، جب اس زمانے میں
 نیچے نہ اڑے بند نقاب یار، گرہ
 متاع عیش کا ہے قافلہ چلا آتا
 کہ عبادہ رشتہ ہے اور ہے شتر قطار، گرہ
 خدا نے دی ہے وہ غالب کو، دستگاہ سخن
 کروڑ، ڈھونڈ کے لاتا ہے خاکسار، گرہ
 کہاں مجال سخن؟ سانس لے نہیں سکتا
 پڑی ہے، دل میں مرے، غم کی پیچ دار، گرہ
 گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات
 زباں تک آئے، ہوئی اور استوار، گرہ
 کھلے یہ گانٹھ تو البتہ دم نکل جاوے
 بری طرح سے ہوئی ہے گلے کا ہار، گرہ

۱- شرح :
 سال کے رشتے ہیں
 ہیں گریں تو گنہ کی گنی
 ہیں، لیکن بھی حساب
 ہیں ایک کہ گریں باقی
 ہیں گویا سارا جہان
 سو سو سال میں قدم
 رکھ لیا، ابھی وہ ایک
 لاکھ سال ہیں گئے۔

۲- شرح :
 سالگرہ کی گنتی اس طرح
 ہوتی ہے کہ کیا ست،
 تک ہر سال کے شروع
 میں گرہ لگا کرے گی۔

۳- شرح :
 ثوابتین کرے کہ سالگرہ
 کا جو دھار ہے، وہ
 دھار غنوں، کبکشان
 ہے اور اس میں پتھر
 گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔

۴- شرح :
 ایک گرہ سے دوسری
 گرہوں کی امید کیوں

ادھر نہ ہوگی تو توجہ حضور کی جب تک
کبھی کسی سے کھلے گی نہ زمینار، گرہ

نہ ہو، جب ہر گز کی
گانشخ میں تین چار گرہیں
موجود ہیں۔

دعا ہے یہ کہ مخالف کے دل میں اندر بغض

۵-۴ :-

پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار گرہ

جوتشی : جوتش کا

دل اس کا پھوڑ کے نکلے، بہ شکل پھوڑے کی

عالم جانے والا، نجومی۔

خدا کرے کہ کرے اس طرح اُجھار گرہ

شرح :

ساگرہ کارشتہ کسی نجومی
کو دیکھا کر پوچھا تھا کہ دیکھ

بتاؤ، یہ تار کتنی گرہیں اٹھا دے گا؟ اس نے جواب دیا کہ ہم نے آسمان پر تو گرہیں گنی
ہیں۔ اگر زمین پر گنیں گے تو نو ہزار گرہیں پائیں گے۔

۷- شرح : خود آسان مساواؤں پر قربان ہو رہا ہے۔ وہ اس تار پر
سیکڑوں گرہیں شمار کر دے گا۔

۸- شرح : میری مراد اس مساواؤں پر ہے جس کے حکم سے وصلے
پر دائروں کی طرح فی الفور گرہیں چلتے گئیں۔

۹- شرح : وہی مساواؤں پر بہا ورہیں، جن کی ساگرہ کے بیٹے فصل بہار
ہر سال غیب سے کلیوں کی گرہیں لاتی ہے۔

۱۰- شرح : وہی مساواؤں پر، جن کی ساگرہ کے بیٹے اوئے برسانے
والا بادل ہوا میں ہر بلند کو گرہ بتا رہا ہے۔

۱۱- شرح : وہی مساواؤں پر جن کی ساگرہ کی خوشی میں اعلیٰ درجہ کے
موتی گرہیں ہی گئے ہیں۔

۱۲- شرح : اُن کی ساگرہ کی ایسی عزت ہے کہ شایوں کے پھل گرہوں
کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

۱۳-۱۴۔ لغات : ثوابت : ثابہت کی جمع ۔ وہ تارنے جن کے متعلق خیال تھا کہ گردش نہیں کرتے اور اپنی جگہ بٹھیرے ہوئے ہیں ۔ ان کے مقابلے میں ستارہ ہیں ، جو گردش کر رہے ہیں ۔

شرح : اسے دوست اسن ، تجھے بتاؤں کہ سالگرہ کے دھاگے نے گرہ کیوں اختیار کی ؟ مقصد یہ تھا کہ اس وجود کی زندگی کے بیٹے ، جو فیض کا سرچشمہ ہے ، دُعا مقصود ہے اور اس دھاگے میں دُعا کے بیٹے گردش نہ کرنے والے ستاروں کی پختہ گرہ لگ جائے گی ۔

۱۵۔ شرح : وہ دھاگا اپنے لیے ہزار دانے کی تسبیح کا آرزو مند ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس میں بلا مبالغہ ہزار گرہیں دوکار ہیں ۔

۱۶۔ لغات : ہما ذہبہ : کشش کی قوت ۔

شرح : خدا نے سالگرہ کے رشتے کو کشش کی وہ قوت عطا کی ہے کہ وہ گرہ کو اپنی طرف کھینچے لیے آتا ہے اور چھوڑتا ہی نہیں ۔

۱۷۔ شرح : ہمارے زمانے میں محبوب کے بند و نقاب کے لیے بھی کوئی گرہ باقی نہیں رہی ۔ پھر کیوں نہ وہ چہرہ کھولے پھرے ؟

۱۸۔ شرح : سالگرہ کا جو دھاگا ہے ، اسے راستہ فرض کریں اور گرہوں کو اونٹوں کی قطار قرار دے لیں تو سمجھنا چاہیے کہ ایک قافلہ عیش و نشاط کا مال متاع لیے آتا ہے ۔

۱۹، ۲۰۔ شرح : اللہ تعالیٰ نے غائب کو شرم و خجی پر وہ قدرت عطا کی ہے کہ یہ خاکسار کردار گرہیں ڈھونڈ کر لاتا ، مگر بات کہنے کی مجال ہی کہیں ہے ؟ میں تو سانس بھی نہیں لے سکتا ، کیونکہ میرے دل میں غم کی نہایت تیز چھپدار گرہ چڑ گئی ہے ۔

۲۱۔ شرح : میں نے گرہ کا نام لیا ، لیکن کوئی بات نہ کر سکا ۔ زبان تک اگر گرہ اور پکی ہو گئی

۲۲- شرح : اگر یہ گرہ کھل جائے تو بچہ شہ دم نکل جائے۔ آہ ! یہ گرہ بہت بڑی طرح گئے کا بار ہو گئی ہے۔

۲۳- شرح : جب تک حضور کی توجہ اس طرف نہ ہو گی یہ گرہ کبھی کس سے کھل نہ سکے گی۔

۲۴، ۲۵- شرح : دیکھئے ہے کہ حالت کے دل میں بغض کی وجہ سے جو بہت جی نابکار ملعون گرہ چڑ گئی ہے، خدا کرے، وہ گرہ ایسی ابھرے کہ اس کا دل پھوڑ کر پھوڑے کی طرح باہر نکل آئے۔

(۲)

تو اب یوسف علی خاں

مرحبا! سالِ فرخی آئیں	عیدِ شوال و ماہِ فروریں
شبِ دروز افتخارِ ایلِ نثار	موسالِ اشرفِ شہورِ سنیں
گرچہ بے بعدِ عید کے نوروز	یکِ عیش از سہ ہفتہ بعدِ ندیں
سوا اس آئیں دن میں ہولی کی	جا بجا مجلسیں ہر میں رنگیں
شہر میں کو بہ کو عبیر و گللال	باغ میں سو بہ سو گل و نسریں
شہر، گویا نمونہ گلزار	باغ، گویا نگار خانہ چاہیں
تین تہوار اور ایسے خوب	جج ہر گن مونسے نہ ہونگے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی جہنم میں

محفلِ غسلِ صحتِ نواب

نزدگہ میں، امیر شاہِ نشاں

جن کی مسند کا آسماں گوشہ

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے

دہر میں اس طرح کی بزمِ سرو

انجمنِ چرخ، گوہرِ آگینِ فرش

راجا اندر کا جوا کھاڑا ہے

وہ نظر گاہِ اہلِ دہم و خیال

واں کہاں یہ عطا و بدل و کرم

ہاں زمیں پر نظرِ جہاں ہمکے چاہے

نغمہِ مطربانِ زہرہ نوا

اں لکھاڑے میں جو کہ ہے مظلون

سرد مہر فر ہوا جو سوار

سب نے جانا کہ ہے پری تون

نقشِ ستمِ سمندر سے، یکسر

منعقدِ محفلِ نشاطِ قریں

رونقِ افزائےِ مستِ تمکین

نزدگہ میں، حریفِ شیرِ کین

جن کی خاتم کا آفتابِ نگین

آسماں ہے گدے سایہ نشین

نہ ہوئی ہو کبھی بدوے زمیں

نور، مے، ماہ، ساطرِ سیہیں

ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں

یہ ضیا بخش چشمِ اہلِ یقین

کہ جہاں گو یہ گر کا نام نہیں

ژالہ آسا، بچھے ہیں درِ شہیں

جلوۂ لوسیانِ ماہِ جبین

یاں وہ دیکھا بہ چشمِ صورتِ میں

ہے کمالِ تجل و تزئین

اور بالِ پری ہے دامنِ زیر

بن گیا دشت، دامنِ گلچیں

فوج کی گردِ راہ، مشکِ فشاں
 رہسوں کے شامِ عطر آگیں
 بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت
 فوج کا ہر پیادہ ہے فرزند
 موکشے ص یوں زمین پر تھا
 جس طرح ہے پہرہ یزیدیں
 چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام
 ران پر داغِ تازہ دے کے وہیں
 اور داغِ آپ کی غلامی کا
 خاص بہرام کا ہے زیبِ سر
 بندہ پرورِ شاطر ازی سے
 مدعا عرضِ فتنِ شعر نہیں
 آپ کی مدح اور میرِ اُمنہ
 اور پھر اب کہ غنصہ پیری سے
 گر کہوں بھی تو آنے کس کو یقین
 پسری و مستی، خدا کی پناہ
 ہو گیا ہوں نزار و زار و زریں
 دستِ خالی و خاطرِ غمگین
 صرف اظہار ہے ارادت کا
 جے قلم کی جو سجدہ ریز جبین
 پسری گستر نہیں، دعا گو ہے
 غالب عاجز نیاز آگین

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
 تم رہو زندہ جاوواں! آہیں

تمہید :- نواب یوسف علی خاں دہلی رام پور بہت بیمار ہو گئے۔ بیماری
 دور ہوتی تو غسلِ صحت کی تقریب پر رام پور کے ”بارغِ بنے نظیر“ میں جشن منایا گیا۔ یہ
 قصیدہ اسی موقع کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ غالب یہ رمضان ۱۲۸۱ھ (فروری ۱۸۶۵ء)

میں کہا گیا تھا، کیونکہ ہمیشہ شوال میں منایا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس موقع پر چند روز کے تقدم و تاخر سے خوشی کی چار تقریریں جمع ہو گئیں، یعنی عید شوال، عید نوروز، ہولی اور عید جشن۔ قصیدے ہیں ان کا ذکر موجود ہے۔

افسوس کہ چٹھی محنت کے بعد تقریباً ایک مہینے کے اندر اندر نواب موصوف کا انتقال ہو گیا۔

۱۔ لغات : قرخی آئین : مبارک دستور کا، بابرکت۔

فروردین : پارسیوں کا پہلا مہینا، ہوا ایران میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔

شرح : مرجا، یہ سال کتنا بابرکت ہے ! شوال کی عید آگنی، بہار کا

مہینا ہے، جس میں نوروز کی عید ہوتی ہے۔

۲۔ لغات : شہور : شہر کی جمع، مہینے۔

سین : سز کی جمع، سال۔

شرح : اس سال کے سات دن عام راتوں اور دنوں کے لیے باعث

فزیں۔ یہ مہینا اگرچہ برس تمام مہینوں اور برسوں کے برتر ہے۔

۳۔ شرح : اگرچہ نوروز عید کے بعد آئے گا، لیکن اس کی آمد میں تین ہفتے سے زیادہ مدت نہیں لگے گی۔

۴۔ شرح : تین ہفتے یا کچھ دن کی اسی مدت میں ہولی آئی اور اس کے لیے رنگیں مٹھیں، بجا منقہ کی گئیں۔

۵۔ شرح : شہر کے کوچے کوچے میں میرو کھل پھڑکے گئے۔ باغ میں ہر طرف گلاب اور نسروں کے پھول نظر آ رہے ہیں۔

۶۔ شرح : شہر باغ کا خود بن گیا۔ باغ پہن کا نگار غامض معلوم ہونے لگا۔

۷۔ شرح : یوں تین تہوار اور ایسے اچھے تہوار جمع ہو گئے۔ یہ کبھی جمع نہ ہونے اور نہ کہیں جمع ہوں گے۔

۸۔ شرح : پھر اسی مہینے میں اس محل کا اہتمام ہوا، جو نظام و شادمانی

سے بھری ہوئی تھی۔

۹- شرح : یعنی نواب کے فعلِ صحت کی محفل۔ وہ نواب، جو عز و قہار کی گدھی کے لیے روشنی بڑھانے کا موجب ہے۔

۱۰- شرح : وہ نواب، جو ہزم میں تشریف فرما ہو تو ایسا امیر ہے، جس کے پاس بادشاہ کا نشان ہوں، یعنی جو بادشاہ جیسا ہو۔ وہ نواب، جو میدانِ جنگ کے اندر شیر کی طرح گھات میں نہ بٹھنے والا حریت یعنی شیر دل حریت ہے۔

۱۱- شرح : وہ نواب، جس کی مسند آسمان کا ایک گوشہ ہے، یعنی آسمان کی طرح بلند ہے۔ وہ نواب، جس کی انگشتی میں سورج کا گینہ جڑا ہوا ہے۔

۱۲- شرح : وہ نواب، جس کے محل کی دیوار کے نیچے آسمان ایسا فیر ہے، جو سایے میں آ بیٹھا ہو۔

۱۳- شرح : زمانے میں غرضی اور شادمانی کی ایسی محفل کبھی روئے زمین پر پہائی نہیں گئی۔

۱۴- شرح : سمروں بھرا آسمان موتیوں کا ہڑاؤ فرش ہے۔ چاندنی شراب ہے اور چاند نقرتی پیالہ ہے۔

۱۵، ۱۶- لغات : اندر کا اکھاڑا : ہندوؤں کی دیو مالا کا ایک دھبہ جس کی محفل میں پریاں ناچتی تھیں۔

شرح : بیشک ماہاندر کا اکھاڑا مشہور ہے۔ لیکن وہ زمین پر نہیں آسمان کی بالائی سطح پر ہے۔ اس پر آن لوگوں کی نظریں پڑ سکتی ہیں، جو وہم و خیال میں مبتلا ہوں۔ اس سیکر عکس نواب یوسف علی خاں بہادر کے فعلِ صحت پر جو ہزم نشاطِ آرا ستہ ہوئی، وہ اہلِ یقین کی آنکھوں کے لیے روشنی کا سرمایہ ہے۔

۱۸، ۱۷- لغات : گدیہ گر : بھکاری، مانگنے والا۔

دُرّ ثبین : بیش قیمت موتی۔

شرح : بھلا اندر کے اکھاڑے میں عطا و بخشش اور کرم کا کیا موتی،

جہاں بیکار می نام کو بھی موجود نہیں۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ جہاں تک نظر جاتی ہے نہایت پیش رہا موقی اولوں کی مانند زمین پر پکے ہوئے ہیں۔

۱۹-۲۰۔ لغات : ٹوئیاں : ٹولی کی جمع ، ٹاپنے لگانے وایاں
مظنون : گمان کیا گیا ، خیالی۔

شرح : ہر طرف ایسے گرتوں کے نفوس سے فضا بھر ہے ، ہونہرہ کی طرح گاتے ہیں۔ ہر سمت اُن ٹاپنے لگانے والیوں کے جلوے ہیں ، جن کی پیشانیاں چاند جیسی ہیں۔ اندر کے اکھاڑے سے متعلق جو کچھ وہم و گمان میں آتا ہے ، وہ ہم نے نواب کی مثل میں آنکھوں سے دیکھا ، جو ہر شے کو صرف ظاہری شکل و صورت میں دیکھ سکتی ہیں۔

۲۱-۲۲۔ لغات : میر فر : آفتاب جیسی شان و شکوہ والا۔
شرح : وہ آتا ، جسے آفتاب جیسی شان و شکوہ حاصل ہے ، قتل کے ساتھ ثوب بن ستورہ کو سوار ہوا۔ سب نے سمجھ لیا کہ گھوڑا پر سی ہے اور زمین کا دامن پری کا بازو ہے۔

۲۳۔ لغات : سمند : بادامی رنگ کا گھوڑا ، عام گھوڑے کے لیے بھی مستعمل ہے۔

شرح : گھوڑے کے منوں کے جو نشان بختے گئے ، اُن سے پورا میدان پھول پھٹنے والے کا دامن بن گیا۔

اس شعر میں گھوڑے کے منوں کے نقش کو پھولوں سے تشبیہ دی ہے۔ جہاں جہاں نقش پڑے ، پھول بختے گئے اور اس کثرت سے بنے ، جیسے پھول پھٹنے والے کی بھولی میں کثرت سے جمع ہو جاتے ہیں۔

۲۴۔ لغات : مشام : قوتِ شام کی جگہ۔ دماغ۔
شرح : فوج کے چلنے سے جو گرد اُٹتی ہے ، وہ مشک بھیڑتی ہے ،

یعنی اُس سے مشک کی خوشبو آتی ہے اور راستہ چلنے والوں کے دماغِ عطر میں بختے

چمکے جاتے ہیں۔

۲۵۔ لغات : فرزین : وزیر۔ پیادہ اور فرزین شطرنج کے ہرے بھی ہیں
شرح : فوج کو اتنا اونچا درجہ دے دیا کیلئے، گویا اسے وزیر کا منصب
حاصل ہے۔

۲۶۔ لغات : موکب : وہ سوار، جو کسی بڑے آدمی کی جلو میں چلتے ہیں۔
شرح : نواب کی خاص سواری ٹہنی تو زمین پر وہی منظر پیش کر دیا، جو
آسمان پر پردہ ستارے پیدا کر دیتے ہیں۔

۲۷۔ لغات : گور : گورخ، ایک ہانور، جس کا شکار کرتے ہیں۔
بہرام : مشہور ساسانی بادشاہ، جسے گورخ کے شکار کا آنا شوق تھا کہ اس
کا لقب ہی بہرام گور پڑ گیا تھا۔ اس کا دستور یہ تھا کہ گورخ پکڑنا اور اس کی ران پر داغ
لگا کر چھوڑ دیتا۔

سُرس : پشت۔ پیٹھ۔

شرح : بہرام گور کا دستور تھا کہ گورخ کی ران پر تازہ داغ لگا کر چھوڑ
دیتا تاکہ پتہ چل جائے، یہ بہرام کا شکار ہو چکا ہے، لیکن اسے نواب عالی جناب! آپ
کی غلامی کا داغ بہرام نے اپنی پیٹھ کے لیے نرمنت کا باعث سمجھ لیا ہے۔

۲۹۔ شرح : اسے فرمانبرداروں کے پرورش کرنے والے! میں نے جو
درجہ و نشانی کرائش کی، اس کا مقصد یہ نہیں کہ نئی شعر کا کمال پیش کروں۔

۳۰۔ شرح : آپ کی تعریف اور میرامن! اگر دعویٰ بھی کروں تو کئے بغیر
آئے گا! یعنی میرامن اس قابل نہیں کہ آپ کی تعریف کر سکے۔

۳۱۔ شرح : اور تعریف، کا قصد بھی کرتا تو اب بڑھاپے کے ضعف میں
کون سا مکان تھا، جب میں بالکل بلا پتلا پریشان حال اور نگین ہوں۔

۳۲۔ شرح : بڑھاپا اور کمال ضعف کہ مرنے کے قریب پہنچا ہوا ہوں خوا
کی پناہ! اتنے غالی ہے اور دل غم سے بھرا ہوا ہے

۳۳۔ شرح : تعلم، جو زمین پر مجھ رہتا ہے، یہ صرف آپ سے عقیدت اور ارادت کا اظہار کر رہا ہے۔

۳۴۔ شرح : غالب، جو عاجز اور نیاز مند ہے، مدح نہیں کہتا، صرف دعا کر رہا ہے۔

۳۵۔ شرح : دعا بھی یہی ہے کہ آپ دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں، خدا کرے ایسا ہی ہو!



ایلین براؤن

ملاؤ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالی ایلین برون والا جاہ
بلندِ رتبہ وہِ حاکم، وہ سرفرازِ امیر
کہ باجِ تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کُلاہ
وہ محضِ رحمت وِرافت کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
وہ عینِ عدل کہ دہشت سے جس کی پریشانی
بنے ہے شعلہٴ آتش، انیسِ پترہ کاہ

تمہید :-
یہ قصیدہ غالب نے اپنے شاگرد خوشنوائی آرام کی فرمائش پر ۱۸۵۵ء میں کہا تھا۔ آرام اگرہ کے ایک ممتاز دانشمند گھرانے کے چچا چچا تھے اور ان کے دادا منشی بیس و صہر غالب سہب، خواجہ غلام حسین ڈ سے خاص دوست دوستوں میں سے

زمیں سے سودہ گوہراٹھے بجائے غبار
 جہاں ہو تو سنِ حشمت کا اس کے بوللاں گاہ
 وہ مہرباں ہو تو انجسم کہیں؟ الہی شکر
 وہ خوشگین ہو تو گردوں کہے خدا کی پناہ
 یہ اس کے عدل سے، انداد کو ہے آمیزش
 کہ دشت و کوہ کے اطراف میں، بہر سہراہ
 ہنر پر پانچے سے، لیتا ہے کام شانے کا
 کبھی جو ہوتی ہے الجھی ہوئی دمِ رواہ
 نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
 نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسراہ شاہ
 خدا نے اس کو دیا ایک خوب رو مزہ ندر
 ستارہ جیسے چمکتا جوا بہ پہلو سے ماہ
 رہے ستارۂ روشن کہ جو اُسے دیکھے
 شعاع مہر و خشاں ہو اس کا تارِ نگاہ
 خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
 بنے گا شرق سے تا غرب اس کا بازی گاہ

تھے۔ آرام نہ آگرو
 میں مفید خلافت کسٹام
 سے ایک مطیع قائم
 کر یا تھا اور اخبار بھی
 نکالتے تھے۔ اگر
 میونسپل کیش کے کٹوری
 بن گئے تھے۔ غالب
 کی کتاب مستنوی پہلی
 مرتبہ مطبع مفید خلافت
 ہی میں چھپی تھی۔ یہ
 قصیدائیں براؤن نام
 ایک انگریز افسر کے
 بچے جو سن پر کہا گیا تھا۔
 میرزا کے خط سے معلوم
 ہوتا ہے کہ یہ کیتس شعر
 رات بھر میں کر کر بھیج
 دیے گئے تھے۔

۱۔ لغات :

ملاذ : ہا چناہ۔

مشرح :

ملک اور شکر کا نام

اور شہر و سپاہ کی پناہ

کون، جناب عالی

جوان ہو کے کرے گایہ، وہ بہانہ بنی
 کہ تابع اس کے ہوں روز و شب پسید و سپاہ
 کہے گی خلق اسے "داورِ سپہر شکوہ"
 لکھیں گے لوگ اسے "خسرو ستارہ سپاہ"
 عطا کرے گا خداوندِ کار ساز اسے
 روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ
 ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے
 پڑے نہ قطعِ خصوصت میں احتیاجِ گواہ
 یہ ترکِ تاز سے برہم کرے گا کشورِ روس
 یہ لے گا، بادشہ چیں سے چھین تخت و کارہ
 سینِ عیسوی، اٹھارہ سو اور اٹھارون
 یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ
 یہ جتنے سیکڑے ہیں سب ہزار ہو جادیں
 دہرا اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ
 امیدوارِ عنایات، "شیونارائن"
 کہ آپ کا ہے نمکِ خوار اور دولتِ خواہ

ایہیں پڑوں، جن کا
 درجہ بہت اونچا ہے۔
 ۲۔ لغات :
 باج : خراج -
 شرح :
 وہ بلند مرتبہ حاکم، وہ
 ممتاز امیر، جس کا گوشہ
 کواہ تاج سے خراج
 وصول کرتا ہے۔
 ۳۔ لغات :
 رافت : مہربانی۔
 نیابت : قائم مقامی
 شرح :
 وہ امیر، جو سرِ پارِ حکومت
 اور مہربانی ہے اور جس
 کی نگاہ اہل دنیا کے
 لیے دم عین کی قائم مقام
 ہے۔
 ۴۔ لغات :
 پردہ کاہ : گھاس
 کاٹکا۔
 شرح :
 وہ سراپا عدلی امیر

یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عز و جاہ کے ساتھ جس کی پوجہ کچھ سے
ڈر کر آگ کا شعلہ لگاس
تھیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ کے تنکے کا رفیق بن

گیا ہے اور اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ وہ دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ
کرتے پائے۔ ہر ایک کو خوف ہے کہ کہیں پوجہ کچھ کی نوبت نہ آ جائے شعلہ لگاس
کے تنکے کو ایک لمحے میں ہلا ڈالتا ہے، مگر ایسے براؤں کی پرکشش کے خوف سے
شعلے نے یہ کام پھوڑ دیا اور تنکے سے محبت شروع کر دی۔

۵۔ لغات : سُودۃ گوہر : موتیوں کا سنوف۔

توسن حشمت : جاہ و حشم کا گھوڑا۔

شرح : جہاں اُس کے جاہ و حشم کا گھوڑا دوڑتا ہو، وہاں زمین سے
گرد و غبار کی جگہ موتیوں کا سنوف اُڑتا ہے۔

۶۔ شرح : وہ مہربان ہو جائے تو تھارے کہیں! اللہ تیرا شکر ہے۔
وہ غصے میں آ جائے تو آسان پکا راستے : خدا کی پناہ، یعنی آسمان کو خدا کے سوا
کہیں پناہ نہ ہے۔

۸، ۷۔ لغات : اخذاد : وہ چیزیں جو ایک دوسری کی ضد ہوں،
ایک دوسرے کے دشمن۔

ہزبر : شیر ہزبر۔

شرح : ایسے براؤں کے عدل کے باعث ایک دوسرے کے دشمن
ہیں اس طرح مل گئے ہیں کہ جنگلوں اور پہاڑوں کے اطراف میں اور ہر راستے پر
لوٹری کی ٹوم میں الجھاؤ پیدا ہو جائے تو ہزبر شیر اس الجھاؤ کو دور کرنے کے لیے
اپنے پنجے سے کنگھی کا کام لیتا ہے۔

۹۔ شرح : وہ سورت نہیں، لیکن اس کا ہم رجب ضرور ہے۔ وہ بادشاہ
نہیں، مگر درجے میں بادشاہ کے برابر ہے۔

۱۰۔ شرح : خدا نے اسے ایک خوب صورت شمع عطا کیا ہے۔ کہا جاتا ہے، جیسے چاند کے پہلو میں ستارہ چمک رہا ہو۔

۱۱۔ شرح : وہ ایسا روشن ستارہ ہے کہ جس کی بھی آنکھ اس پر پڑ جائے، اس کی نگاہ کا تار روشن سورج کی شعاع بن جائے۔

۱۲۔ شرح : خدا سے امید ہے کہ لوگوں ہی میں مشرق سے مغرب تک کی سرزمینیں اس کے بے کیل کامیدان بن جائیں گی۔

۱۳۔ شرح : جب وہ جواں ہو جائے گا تو دنیا کا انتظام اس طرح کرے گا کہ سفید اور سیاہ کے دن اور رات، اس کے فرمانبردار ہوں گے۔

روز و شب پیدا و سیاہ کو تقبیر و نشر مشرب سمجھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ سفید کے دن اور سیاہ کی راتیں اس کے تابع ہوں گی۔ اگر سفید و سیاہ کو جامعیت کے لیے ایک شے مان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس کے دن اور رات اس کے فرمانبردار ہوں گے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شب اور سفید کے درمیان اضافت کے بجائے وا و عطف رکھی جائے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ دن اور رات بھی اس کے تابع ہوں گے اور سفید و سیاہ بھی۔

۱۴۔ شرح : خلق خدا کے لیے کہ یہ ہمارا ایسا حاکم ہے جسے آسمان کی سی حکومت حاصل ہے۔ ساتھ ہی لکھیں گے، یہ ایسا بادشاہ ہے، جس کے پاس ستاروں جیسی سپاہ ہے۔

۱۵۔ شرح : کار ساز بارہی تعالیٰ اس بچے کو روشن روح، اچھی طبیعت اور تحقیقوں کو سمجھنے والا دل عطا کرے گا۔

۱۶۔ لغات : شہقتہ دلائل : پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا۔ خصوصیت : جملگرا۔

شرح : اسے وہ پوشیدہ باتیں جاننے والی عقل نصیب ہوگی، جسے جملگرا کا فیصلہ کرنے کے لیے گواہیاں لینے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ چونکہ وہ

برہم شیدہ بات عقل سے جان لے گا۔ اس بے گناہوں کے بغیر ہی صحیح فیصلے کرتا جائے گا۔

۱۷۔ شرح : یہ پھر جہان ہو کر ایسی پرورش کرے گا کہ سلطنت، روس کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ نیز یہ چین کے بادشاہ سے تخت و تاج چھین لے گا۔
۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱۔ یہ سب دعائیں اشعار ہیں۔

لغات : نگاہ : صبح ۔

شرح : ۸۵۸ھ کے عیسوی سال صبح و شام اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اس بچے کی عمر لمبی ہو، اتنی لمبی کہ ہمارے میکڑے سب کے سب ہزار ہو جائیں۔ اسے امین براؤن صاحب، شوناٹن آپ کی غیبت کا امیر و راجہ آپ کا نمک کھاتا ہے اور دولت خواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اس کی آرزو یہ ہے کہ خطا ہمیشہ آپ کو اُس بچے کو عزت سے رکھتے اور بلند رتبہ عطا کرے !

قطعات

(۱)

نواب کلب علی خاں

- ۱- شرح : ہند میں اہل تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
ہندوستان میں اہل
سنت کی دو سلطنتیں
ہیں، ایک حیدر آباد
دکن، جو بارغ بہشت
کے لیے باعث شک
ہے۔
- ۲- شرح : دو سری سلطنت
رام پور کی ہے اور
رام پور اہل نظر کی،
لگا ہوں میں وہ شہر
ہے، جہاں آسمانوں
بہشت آکر اکٹھے
ہو گئے ہیں۔
- ہند میں اہل تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آباد دکن، رشک گلستانِ ارم
رام پور، اہل نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں بہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ
اس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم
لام پور آج ہے وہ بلقہ محمود کہ ہے
مرجع و منبع اشرافِ نژادِ آدم
رام پور ایک بڑا بارغ ہے از دے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرم

جس طرح باغ میں سادون کی گشتائیں برسہیں
 ہے اسی طور پہ یاں دجلہ نشاں دستِ کرم
 ابرِ دستِ کرم کلب علی خاں سے مدام
 قوتِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
 صبح دم باغ میں آجائے جسے ہونہ یقین
 سبز و برگ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
 حبذا باغِ ہمالیوں تقدس آثا ر
 کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالینِ حرم
 مسکِ شرع کے ہیں راہِ رود راہِ شناس
 نخضر بھی یاں اگر آجائے تو لے ان کے قدم
 مدح کے بعد دعا چاہیے اور اہل سخن
 اس کو کرتے ہیں بہت بڑھکے براغراقِ قم
 حق سے کیا مانگیے ان کے لیے جب ہو موجود
 ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
 ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ خلو کے قائل
 دودعا میں ہیں کہ دیتے ہیں وہ ثواب کو ہم

۲۔ شرح :

حمید آباد بہت
 قوت رہے شانی ہند
 کے لوگ اٹن طرف
 منہں جاتے اور جو
 جاتے ہیں، ان کی تعلقہ
 کم ہے۔

۳۔ لفاظت :

بقیہ معمر :
 آباد ٹکڑا۔

مرجع : رجوع
 کی جگہ۔

مجمع : جمع
 ہونے کی جگہ۔
 نثر اور : نسل،
 اولاد۔

شرح :

آج رام پور وہ
 آباد خط ہے جہاں
 اولاد آدم میں سے
 بڑے بڑے لوگ
 پہنچتے اور جمع ہوتے
 رہتے ہیں۔

۵۔ **شرح :** یا خدا! غالب عاصی کے خداوند کو دے
 رام پور کو ایک
 بڑا باغ سمجھ دیا،
 جیسے تو وہ دکنش
 ترونازہ، شاماب
 بہت دہلے ہے۔
 دو وہ چیزیں کہ طلب گار ہے جن کا عالم
 اولاً عمر طبعی، بہ دوام اقبال
 ثانیاً دولت دیدار شہنشاہ امم

اور اس پر ہر طرف شادمانی برس رہی ہے۔

۶۔ **شرح :** باغ میں جس طرح سادوں کی گشتائیں برستی ہیں، اسی
 طرح رام پور، سخاوت کا مظہر دیا پہلے جا رہا ہے۔
 ۷۔ **شرح :** نواب کلب علی خاں کے دست کرم کے بادل سے
 جو قطرے پے پہلے گر رہے ہیں، وہ ایسے موتی ہیں، جو بادشاہوں
 کے لائق ہیں۔

۸۔ **شرح :** جیسے اس بات کا یقین نہ ہو، وہ مس کے قریب
 باغ میں آہلے اود سہرے، نیز لادہ گل کی چنگٹریوں پہاوس کے قطرے
 دیکھو۔

۹۔ **لغات :** جہذا : واہ وا، مرہا۔

تقدس آثار : پاکیزگی کے نشانوں والا، پاکیزہ۔

غزالان حرم : حرم پاک کے ہری۔

شرح : واہ وا : وہ باغ ہمایوں، جو پاکیزگی کے نشانوں
 سے مبرا ہوا ہے اور جہاں حرم پاک کے ہری چرنے کی غرض سے آئے ہوں۔

۱۰۔ **لغات :** قدم لینا : پاؤں چومنا، استقبال کرنا۔

شرح : نواب کلب علی خاں شریعت کے راستے پر چلتے
 ہیں اور راستہ پہچانتے ہیں۔ خضر بھی یہاں آجائیں تو نواب کے استقبال

کے یہ اُنہیں۔

۱۱۔ لغات : عراق : بہت زیادہ ۔ مبالغہ۔

شرح : مدح میں جو کچھ کہنا تھا۔ کچھکے، اب دعا کرنی چاہیے اور شاعر لوگ دعائیں شاعر لکھتے وقت بہت مبالغے سے کام لیتے ہیں۔

۱۲۔ شرح : خدا سے نواب صاحب کے لیے کیا مانگیں ؟ ان کے لیے تو ہر چیز پہلے ہی ہے موجود ہے۔ ملک ہے، خزانہ ہے، مصاحبوں کی جماعت ہے، لشکر ہے، نقارہ ہے جھنڈا ہے۔

۱۳۔ لغات : تبلیغ : مبالغہ کرنا

مُغْلَوٌ : مبالغہ کی ایک قسم، بہت زیادہ مبالغہ۔

شرح : جارا میلان مبالغے کی طرف نہیں اور ہم غلو کے بھی

قافی نہیں۔ دو دعائیں، جو ہم نواب کو دیتے ہیں۔

۱۴۔ شرح : لہذا کہتے ہیں کہ اسے خدا : غالب گناہگار کے آقا کو دو ایسی چیزیں عطا کر، جن کی طلب ساری دنیا کو ہے۔

۱۵۔ لغات : شہنشاہِ اُمَم : اُمَموں کا شہنشاہ مراد رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

شرح : اول انھیں طبعی عمر نصیب ہو اور اقبال ہمیشہ قائم رہے،

دوم خدا انھیں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دیوار کی دولت عطا کرے۔

(۲)

ایضاً

تہنید :-

یہ قطعہ ۱۱ اگست

۱۸۶۹ء کے مکتوب

مقام شکر ہے اے ساکنانِ خطہ خاک

رہا ہے نور سے ابرستارہ بار برس

میں نواب کلب علی خاں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ مکتوب میں میرزا لکھتے ہیں۔
 ”اگرچہ یہاں (دہلی میں) میتہ اس قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصل زمین سے ہاتھ دھو لیں، مگر چونکہ یہ فرمانا انلی میرے رزق کی برسات آپ پر ہے اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابرہت کے شکر تھے میں ایک قطعہ ملغوم اس مرضی کے بھیجتا ہوں۔“

کہاں ہے ساقی مہوش، کہاں ہے ابرمطیر
 بیار، لامے گلنارگوں، بیار، برس
 خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
 درحضور پہ اسے ابر! بار بار برس
 ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک کہے
 امیر کلب علی خاں جین ہزار برس
 فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
 کئی ہزار برس، بلکہ صد ہزار برس
 جناب قبلہ حاجات! اس بلاکش نے
 بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
 شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
 خدا کرے کہ یہ ایسا ہوساز گار برس

۱۔ شرح : اسے خطہ خاک کے رہنے والا! یعنی زمین پر بسنے والا
 شکر ادا کرنے کا موقع ہے کہ تارے برسانے والا بادل خوب زور سے برس رہا ہے۔
 ۲۔ لغات : مطیر : برسنے والا۔

شرح : سچا نہ سمیسا ساقی کہاں ہے، جیسے کہا جاتے، ”بیار“ (۱۵)؟
 گلنار ہی شرباب لا۔ برسنے والا بادل کہ صراحتاً، جیسے کہا جاتے، ”بیار“، یعنی خوب برس؟

۳۔ شرح : اسے بادل ! خدائے تجھے موتی برسانے کی غصلت عطا کر دی ہے، لہذا حضور نواب کے دروازے پر بار بار بیٹھا رہا اور موتی برساتا رہا۔

۴۔ شرح : بارش کی ہر قطرہ کے ساتھ جو فرشتہ آئے، اس کی زبان پر ہے اختیار یہ دعا جاری ہو جائے کہ نواب کلب علی خاں ہزار برس جمیں !

اس شعر میں ہر قطرے کے ساتھ ایک فرشتہ آئے گا ذکر کیا گیا ہے، وہ تمام کے اس تصور پر مبنی ہے کہ ہر بارش کا ہر قطرہ رحمت لاتا ہے، اس لیے خدا کی طرف سے ایک فرشتہ اس کے ساتھ زمین پر آتا ہے اور رحمت فرشتوں کے ذریعے سے زمین پر آتی ہے۔

۵۔ شرح : یہ بیٹھنے کی جو تجویز کی گئی ہے، وہ ہزار برس تک محدود نہیں، مطلب ہے، کئی ہزار برس بلکہ نو ہزار برس یعنی لاکھ برس جمیں۔

۶۔ لغات : قبلہٴ حاجات : دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے والا۔
بلاکش : بلائیں بھیجنے اور مصیبتیں برداشت کرنے والا۔

شرح : اسے دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے والی بارگاہ کے مالک ! اس بلائیں بھیجنے اور مصیبتیں برداشت کرنے والے یعنی غائب نے پانچ چار برس برسے عذاب سے کاٹے ہیں اور بہت ڈکھا دکھائے ہیں۔

اس شعر میں میرزا غائب نے فسادِ خون اور احتراق کے اس مرض کا ذکر کیا ہے، جو ۱۸۵۲ء میں شروع ہوا اور تقریباً ۱۸۵۵ء تک جاری رہا۔ اس دور کے تمام مکاتیب میں اس مرض کا ذکر تفصیل سے موجود ہے اور ہر مکتوب الیہ کو ضایت و رکا انداز میں مصیبت کی داستان سناتے ہیں۔ وہ پوری تفصیل اس شعر کے ہیچاز اور تاثیر پر قمران ہے۔ حق یہ ہے کہ جس شخص کو الفاظ کی معنویت اور پیش نظر مطلب کے عین مطابق تربیت پر غائب کے برابر عبور حاصل نہ ہو، وہ ایسا شعر نہیں کہہ سکتا۔ ایسے اشعار، اشعارِ سنوں، ادبی مہمزمے ہوتے ہیں اور غائب کے سوا ایسے ادبی مہمزمے شاید ہی کہیں ملی سکیں۔

۷۔ شرح : معلوم ہوتا ہے، نواب صاحب کی طبیعت بھی ناساز تھی، اسی لیے انھیں دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ شافی مطلق آپ کو شفا عطا کرے اور غالب کو بندہ غم یعنی زندگی سے نجات دل جائے۔

غالب کے نزدیک بندہ غم اور زندگی ایک شے ہیں، جیسا کہ وہ کہتے ہیں:
 قیدِ حیات و بندہ غم اصل میں دونوں ایک ہیں،
 موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(۲)

۱۸۵۷ء

بسکہ فستال ما یرید ہے آج
 ہر لکھنؤ انگلستان کا
 گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
 زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
 چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
 گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
 شہر دہلی کا فزہ فزہ خاک
 تشہ غوں ہے، ہر مسداں کا

تمہید :- ۱۸۵۷ء
 میں دہلی کے اندر انگریزی
 فوج کے ظلم و جور کا جو منظر
 میرزا غالب نے دیکھا،
 یہ اس کے تاثرات کا ایک
 سرسری خاکہ ہے۔ سات
 معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار
 کا لفظ لفظ غوں، مگر میں
 ڈوب کر نکلا ہے۔ یہ
 علامہ الدین احمد خان علقی
 کے پاس ایک خط میں
 بھیجا گیا تھا۔

کوئی داں سے نہ آ سکے یاں تک
 آدمی داں نہ جا سکے یاں کا
 میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا
 وہی رونا تن و دل و جاں کا
 گاہ جل کر کیا کیسے شکوہ
 سوزشِ داغما سے پنہاں کا
 گاہ بد کر کہا کیسے باہم
 ماجرا دیدہ مانے گریاں کا
 اس طرح کے وصال سے یارب
 کیا مٹے داغ دل سے جہاں کا

۱۔ لغات :

فہاں : ٹھنڈا
 سورہ بروج کی ایک آیت
 ہے جس کا ترجمہ ہے : کر
 گزرے والا، جو وہ چاہتا
 ہے۔

سببشور : اسواستعال
 کرنے والا، سپاہی۔

شرح : آج
 انگلستان کے ہر سپاہی
 نے وہ حیثیت حاصل کر لی
 ہے کہ جو کچھ چاہتا ہے، کر
 گزرتا ہے۔

۲۔ شرح :

گھر سے بازار میں نکلتا اس
 سو پر مشکل ہو گیا ہے کہ باہر

نہیں تو گرد و پیش کے مناظر دیکھ کر پتا پانی پانی ہوتا ہے۔

۳۔ لغات : چوک : اس سے مراد ہے چاندنی چوک، جو شاہجہا
 کی مٹی کا بہترین بازار تھا اور تین صدی تک دنیا کے کسی شہر کا کوئی بازار اس کا مقابلہ
 نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں طرف آنے جانے کی سڑکیں تھیں، درمیان میں بہتی تھی،
 جس پر خوب صورت درخت لگے ہوئے تھے اور جا بجا چین لارہ تھے۔

شرح : جسے چوک کہتے ہیں، وہ آج قتل گاہ بنا ہوا ہے اور گھرنے
 قید خانے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مطلب یہ کہ باہر نکلو تو پھانسی لگتی ہے، گھر میں بیٹھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قید خانے کی کسی تاریک کوٹھڑی میں بند ہیں۔

۴۔ شرح : دہلی کی خاک کا ذرہ ذرہ ہر مسلمان کے خون کا پیاسا ہے۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے وہاں جو کیفیت پیدا کر دی تھی، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح نقشہ یہی ہے۔

۵۔ شرح : کوئی فرو وہاں سے یہاں نہیں آ سکتا اور کوئی فرد یہاں سے وہاں نہیں جاسکتا۔

مطلب یہ کہ وہ دستوں اور عزیزوں کے درمیان آمد و رفت بالکل بند ہے بلکہ ٹوکر چاکر کو بھی باہر بھیجنے کا کوئی امکان نہیں۔

۶۔ شرح : مانا کہ دوست احباب کے لیے باہم ملاقات کا موقع پیدا ہو گیا، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں گئے تو جسم، دل اور جان کو رونے کے سوا کیا کریں گے؟

۷۔ شرح : کہیں جیل کر بیٹھنے کے چھپے ہوئے داحلوں کی جہن کا شکوہ ایک دوسرے سے کریں گے۔

۸۔ شرح : کہیں باہم رورو کر خاک بار آ نکھوں کا ماجرا ایک دوسرے سے کریں گے۔

۹۔ شرح : یا اللہ! اس طرح کے میل ملاپ کی کوئی صورت پیدا بھی ہو تو دل سے جہاد کا داغ کیونکر مٹے گا؟

مطلب یہ کہ وہ سال تو وہی مطلوب ہے، جب ملنے والے مسرور و شادمان ہوں، باہم خوشی کی باتیں کریں۔ جب رونے اور دل کی جہن کے شکوے کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تو اس وصال کو فراق سے کس بنا پر بہتر قرار دے سکتے

تمہیں یہ - یہ قطعہ

غالباً لوہار دبانے سے
معذرت بکے طور پر لکھا
گیا تھا۔

۱- شرح : برسات
کے آنے کی خوشی اس لیے
ہے کہ شراب پئیں گے
اور آم کھائیں گے۔

۲- شرح : کیا
ہم اندھے ہیں کہ اس موسم
کے عین آغاز پر دہلی سے
نکلیں اور لوہار و چلے جائیں؟
۳- شرح : ناچ

(ناچ) کے سوا، جو جان
کالاٹ ہے، وہاں ہے
کیا؟ بڑے آم ملتے ہیں، نہ انگور۔

۴- شرح :
باد چھیوں کو حکم ہوا کہ ابھی
پوچھو، گل کیا پکائیں؟

۵- شرح : اہلی کے کتے بھول کہاں ہیں؟ کون سے کبوتے کس جگہ

سے منگائیں؟

۶- شرح : بھیڑ کا گوشت موجود ہے، جو ریشتہ دار ہوتا ہے۔ جناؤ

۱۔ کھا کر کیا لطف اٹھائیں؟

(۴)

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پسین بادۂ تاب اور آم کھائیں

سر آغازِ موسم میں، اندھے ہیں ہم
کہ دلی کو چھوڑیں، لوہار کو جانیں
سواناچ کے جو ہے مقلوبِ جاں

نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم بادِ چھیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں

وہ کھٹے کہاں پائیں اہلی کے پھول
وہ کڑوے کر لیے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت سو بھیڑ کا، ریشہ دار

کہو، اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

۵- شرح : اہلی کے کتے بھول کہاں ہیں؟ کون سے کبوتے کس جگہ سے منگائیں؟

۶- شرح : بھیڑ کا گوشت موجود ہے، جو ریشتہ دار ہوتا ہے۔ جناؤ
۱۔ کھا کر کیا لطف اٹھائیں؟

(۵)

اس کتاب طرب نصاب نے جب
 آب دتاب انطباع کی یائی
 فکر تاریخ سال میں مجھے کو
 ایک صورت نئی نظر آئی
 ہند سے پہلے سات سات کے دو
 دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
 ارد پھر ہندسہ تھا بارہ کا
 با ہزاراں ہزار زیبائی
 سال ہجری تو ہو گیا معلوم
 بے ثمول عبارت آرائی
 مگر اب ذوق بذلہ سنجی کو
 ہے جدا گانہ کار زمانی
 سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
 بہ امید سعادت افزائی

۱۔ لغات :
 طرب نصاب :
 جس کا سراپہ خوش ہو۔
 شرح :
 جب اس کتاب نے، جو
 خوشی اور نشاط کی سراپا ہے
 ہے، چھپائی کی اب دتاب
 پائی۔
 ۲۔ شرح :
 تو مجھے چھپائی کے سال
 کی تاریخ سوچنی پڑی اور
 اس کے لیے ایک نئی صورت
 ذہن میں آئی۔
 ۳۔ شرح :
 پہلے مجھے اچانک سات
 سات کے دو ہندسے دکھائی
 دیئے۔
 ۴۔ شرح :
 ان کے بعد بارہ کا ہندسہ
 تھا، جو عدد و ہر ریاضی معلوم
 ہوتا تھا۔

۵- شرح :

یوں عبارت آرائی سے
کام لے بغیر تاریخ کا ہجری
سال تو معلوم ہو گیا یعنی ۱۲۷۷۔

۶- شرح :

لیکن لطیف گوئی کا ذوق اب
ہمک کار فرمائی چاہتا ہے۔

۷- شرح :

وہ کہتا ہے کہ سات جمع

غرض اس سے ہیں چارہ معصوم
جس سے ہے چشمِ جاں کو دیا تھی

اور بارہ امام ہیں بارہ

جس سے ایماں کو ہے تو اتا تھی

ان کو غالب یہ سال اچھا ہے

جو آئمہ کے ہیں تُو لاتی

ساتھ چودہ ہوتے ہیں۔ اس جمع سے سات میں اضافہ ہونے کی امید ہے۔

۸- شرح : چودہ کے چودہ سے چودہ معصوم مراد ہیں۔ جن سے جان
کی آنکھ کو آرائش ملتی ہے۔

۹- شرح : اور بارہ کا ہندسہ بارہ اماموں کی طرف اشارہ ہے جن سے
ایمان قوی ہوتا ہے۔

۱۰- لغات : تُو لاتی : محبت کرنے والا۔

شرح : اسے غالب ! یہ سال ان لوگوں کے لیے بہت اچھا ہے جنہیں
اماموں سے محبت کا دعویٰ ہے۔

(۶۱)

قطعہ تاریخ تکشف الحکمہ

تہجید :-

طب کے شفا
کتاب حکیم سلیم خان صاحب

سلیم خاں کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصلِ خاں
حکیمِ حاذق و دانا ہے وہ لطیفِ کلام

حکیم و اصل خاں کی
تصنیف تھی، یہی کہ
میرزا نے قلمے ہیں
واضح کر دیا ہے۔

۱۔ شرح :
سلیم خاں و اصل خاں
کا نوٹ مرثم ہے۔ وہ جڑا
ماہر اور دانشمند طبیب
ہے اور اس کی باتیں
بہیں نہایت پُر لطف
ہوتی ہیں۔

۲۔ شرح :
زمانہ ہجری میں اس کا
مطبہ مشہور ہے۔
لوگ علاج کے لیے
اسی کے ہاں جاتے
ہیں اور لقمان حکیم کا نام
بہیں کسی کو یاد نہیں رہا۔
۳۔ م۔ لغات :
مبدعِ عالم : دنیا
کا آغاز۔

تمام دہریہ اس کے مطب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اُسے فضائلِ علم و ہنر کی افزائش
ہوتی ہے مبدعِ عالم سے اس قدر انعام
کہ سب سے علم میں، اطفالِ ابجدی اس کے
ہزار بار قلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخہ نادر لکھا ہے ایک اس نے
کہ جس میں حکمتِ طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب ہے اک منہج نکات بدیع
نہیں کتاب ہے اک معدنِ جواہر کام
کل اس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے
کمالِ فکر میں دیکھا خرد نے بے آرام
کہا یہ جلد کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے؟
”لکھا ہے نسخہ تحفہ“، یہی ہے سالِ تمام

اطفالِ ابجدی : ابجد پڑھنے والے لڑکے۔

شرح : جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے، اُسے اللہ تعالیٰ نے غم و ہنر

بڑھانے کی اس توفیق عطا فرمائی ہے کہ اس کے لبِ بول کے ابھی ابتدائی درس ہیئت ہیں، وہ افلاطون کو گت میں ہزار مرتبہ پہنچے ہیں۔

۵۔ شرح : اس نے ایک عجیب ناول لکھا ہے جس میں اقول سے آخر تک طب کے تمام مسئلے بیان کر دیے گئے ہیں۔

۶۔ لغات : منبع : سرچشمہ۔

نکات بدیع : نئے نئے نکتے۔

معدنِ جواہرِ کام : گوہرِ بھری کان۔

شرح : یہ کتاب نہیں، بلکہ نئے نئے ناولز نکتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ کتاب

نہیں بلکہ ایک کان ہے جو گوہروں سے بھر پور ہے۔

۷۔ ۸۔ شرح : کل عقل نے مجھے اس کتاب کے پورا پورا بھانسنے کی تاریخ

بہت سوچتے مضطرب و بیتاب پایا تو فرمایا کہ : اس بارے میں کیا سوچتا ہے؟ لکھا ہے

تہذیبِ حق، میں اسی سے اس کے پورا ہونے کا سال لکھا ہے۔

(۷)

۱۔ لغات :

آئینہ سر :

پریشان حال۔

شرح :

ایک دن بیابان میں

گولاسا اٹھا اور میں

وحشت کے جوش میں

پریشان حال تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ

بیابان میں پھرتے

پھرتے دل گہرا گیا

مقا۔

اٹھا اک دن گولاسا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں

پھر آئینہ سر گہرا گیا تھا جی بیابان سے

نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پر تشنہ

ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

کہا میں نے کہ او گناہم، آخر ماجرا کیا ہے

پڑا ہے کامِ تجھ کو کس سنگِ آفت جاں سے

ہنساکچھ کھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا

تو یہ رویا کہ جوے خوں بھی پلکوں کے املاں سے

۲- شرح : کہا میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دام گئی ہیں
 واپس آیا تو مجھے ایک
 پرندہ دکھائی دیا، جو
 زخمی تھا اور اس کے
 پتھر بندھے ہوئے تھے۔
 وہ باغ کی دیوار سے،
 دیوار کے وار سے شک رہا
 تھا۔

۳- شرح : کہ جل کر ہو گیا یوں خاک مری آہ سوزاں سے
 میں نے اس سے پوچھا کہ اوگناں پرندے! تجھ پر کیا گزری! تجھے کس جہان بیوا سنگر
 سے کام پڑ گیا!

۴- شرح : میری بات سنتے ہی وہ پہلے تو کھٹکنا کر ہنسا۔ پھر مجھے
 پہچان لیا تو اتنا رو دیا کہ چکوں کے دامن سے خون کی ندی بہ نکلی۔

۵- شرح : بھر کہا : میں اُس غلم کا شکار ہوں، جن کی زخموں کے جہاں
 میں باغِ رضواں (بہشت) کے پرندے آکر رہنے کرتے ہیں۔

۶- شرح : مجھے صبح و شام اُسی کی زلفت اور چہرے کا تصور بندھا رہتا
 ہے، نہ مجھے کفر سے کوئی غرض اور نہ ایمان سے کچھ کام۔

۷- شرح : جب میں نے قزاقوں سے دیکھا تو وہ میرا ہی طائرِ دل
 تھا، جو میری شعلوں بھری آہ سے جل کر داکھ ہو گیا تھا۔

(۸)

۱- شرح : کیا ان دونوں بسر ہو ساری فراخ میں
 کچھ تفرقہ رہا نہ دل و درد و داغ میں
 آج کل جا رہے ہیں
 فراغت، آرام اور

چاہا یہ چشم شوق، جو موسیٰ نے طور پر
یاں دیکھتے ہیں روز وہی بہر چراغ میں
یہ مکنت و وقار علاقائی یہ وحشتیں
شورش سے کچھ ضرورتہاں کے دماغ میں

آسودگی سے زندگی
بے گنجی کی گویا سی صورت
جو کتنی ہے بیکر دل،
درد اور دماغ میں جبرائی
باقی ہی نہیں رہی۔

انسان کا اطمینان
خام اس وقت مائل ہو جاتا ہے جب درد شروع ہو جائے یا دل پر کوئی دماغ لگ جائے۔
جس حالت میں درد و دماغ دل کے مستقل رفیق بن جائیں تو اطمینان سے دل گزرا نہ سکیں
ہی نہیں رہتا۔

۲۔ شرح : حضرت موسیٰ جو جلوہ شوق کی آنکھوں سے کوہ طور پر دیکھنے کے
آرزو مند تھے۔ وہ جیسے روزانہ ہر چراغ میں نظر آتا ہے۔
۳۔ لغات : مکنت : قدرت، طاقت، توانائی۔

وقار : اصل لفظ بہا یعنی ہے یعنی وقار لیکن تدریجی دل سے جدا جاتے کیوں باکسر ہونے
لگے دوقار، یہ معنی صم، تسکین، بعض اوقات جاہ و جلال کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
وحشت : کوئی مضی ہیں۔ مثلاً لغت، گہرا ہٹ، جہالت، اداسی، آوارگی، اُٹلے
سیدھے طور اختیار کرنا۔ غیر مانوس حرکتوں کا سادہ ہونا۔ علاقائی سے مراد نواب علی احمد
احمد خاں، بنی نواب امین الدین احمد خاں والی نوابدیں، جو میرزا کے عزیز بھی تھے یعنی خاندانِ بیگم
علاقائی کے والد کی بچپن میں تھی علاقائی کے والد احمد بخش خاں اور بیگم غلامیہ کے والدہ الہی بخش خاں تھیں
بھائی تھے۔ علاقائی زیادہ تر لوہو میں رہتے تھے ان میں اور میرزا غلامیہ میں چھپرے پھاڑ اور لطیفہ
بازی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علاقائی نے خط لکھنے میں دیر کی۔ چپ چاپ
اپنے کام میں مصروف رہے۔ لہذا میرزا نے یہ خط لکھنا جس کے آخری شعر کا مطلب
یہ ہے کہ بڑے آرام اور آسودگی سے بیٹھے ہو۔ انہی سیدی حرکتیں کر رہے ہو۔ لہذا تھا سے
دماغ میں شورش ہے۔

(۹)

- ۱۔ لغات : مجلس شمع خزاراں میں جو آ جاتا ہوں
 شمع سال میں تہ و اماں صبا جاتا ہوں
 سرگراں مجھ سے سبک رو کے نہ رہنے سگے
 کہ یہ یک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں
 ہووے ہے جاوہ رہہ رشتہ گوہر ہر گام
 یعنی محبوب - حسین۔

شرح :

جس گزرگاہ میں، میں آ بلہ پا جاتا ہوں
 اور مسخروں کی مجلس میں آ جاتا ہوں تو شمع کی طرح دامن صبا کی ادٹ جا پختا ہے۔
 کا درد ہے کہ شمع کو ہوا کے ہونکے سے بھانے نہ کہنے کے لیے۔ بے کر نکلتے ہیں
 تاسے دامن سے ڈھانک بیٹھتے ہیں۔

- ۲۔ لغات : سرگراں : بول، رنجیدہ۔
 سبک رو : تیز پھنے والا۔

شرح : مجھ سے تیز رو کے نہ بہنے سے بول و رنجیدہ نہ ہو۔ میں تو اتنی تیزی
 سے جاتا ہوں جیسے بول کے چلنے صدائل جاتی ہے

- ۳۔ شرح : میرے پاؤں میں چھاسے ہیں۔ میں جس گزرگاہ میں قدم رکھتا ہوں ہر
 قدم پر دستہ دی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بلاوجہ میں دعا کے کی جوتی ہے۔ راستے کو رشتے
 اور پھانوں کو موتیوں کے تشبیہ دی ہے۔

(۱۰)

- ۱۔ لغات : تاک جھانک : دوزخ
 پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی
 نوزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا
 نظروں سے دیکھنا

وہ مرغ ہے خزاں کی صوبیت سے بے خبر
 کہنا گو شر چشم سے نظر
 آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا
 ڈالنا۔ اسے جھانکنا تک
 بھی کہتے ہیں۔ مطلب ہے سینوں کو دیکھنا۔

رقوزی : روشن دان۔ جو مکافوں میں ہندی پر روشنی کی مرض سے دکھ پڑتے ہیں
 شرح : بڑھاپے میں بھی تاک جھانک کی عادت نہ گئی۔ گویا نظارہ باز ہی ایک
 روگ ہے۔ ایک پکا ہے جو ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہے اور بڑھاپے میں بھی اس کے اندر
 کمی نہیں آئی۔ جس طرح مکافوں کی دیواروں میں ہندی پر روشنی دان ہوتے ہیں۔ وہی حالت
 نظارہ باز ہی کے اس آئندہ کی ہے۔ یہ ختم نہیں ہوتا۔

۲۔ لغات : صوبیت : دشواری، وقت، مصیبت۔

شرح : جو پرندہ موسم بہار میں پڑا گیا اور آئندہ سال تک قفس میں پڑا رہا۔
 اسے کیا خبر ہو سکتی ہے کہ موسم خزاں میں کیا کیا مصیبتیں اور مشکلیں آتی ہیں ؟ ان مصیبتوں کا اندازہ
 تو اسی کو ہو سکتا ہے جو بہت جلد کے موسم کاٹاٹ کے اندر رہا ہو اور اس سنے پر لٹاٹیاں دیکھیں ہوں
 دکھ سے ہوں۔ قفس کے گوشے میں بیٹھے ہوئے پرندے کے لیے بہار و خزاں کی خشیت
 یکساں ہے۔

(۱۱)

دیکھو وہ برق تبسم، بسکہ دل بیتاب ہے
 دیدہ گریاں مرا فتارۂ سیماب ہے
 کھول کر دروازہ میخانے کا بولا میفروش
 اب شکست تو بہ میخواروں کو فتح الباب ہے
 ۱۔ شرح :
 مسکراہٹ کی ہلکی چمکی مینی
 محبوب مسکرایا یکینیت
 دیکھتے ہی دل بے قرار
 ہو گیا۔ اکھیں جم جمن
 میں پہلے ہی مد رہی تھیں
 اب وہ پار سے کا فتارہ ہی گئیں۔ یعنی ایسا فتارہ جس سے پانی کے بھائے پارہ اچھل

کو اپرا راجو۔ یہ دل کی بے تابی کا کرشمہ ہے۔ جس کی دوسری آنکھوں سے پہنے والا پانی سیاب بن گیا۔

۲۔ لغات : فتح الباب : دروازے کا کھٹا۔

شرح : شراب بیچنے والے نے شراب خانے کا دروازہ کھولا اور چارکر کہا کہ اب شراب نوشی کے لیے موقع ہے کہ تو یہ توڑ ڈالیں۔ چلے آئیں اور اپنا شوق پورا کریں۔ شراب خانے کا دروازہ کھٹا ہونے کے لیے باب مراد کا کھٹا ہے۔

(۱۲)

۱۔ شرح : اک آہ گرم کی تو سبزاروں کے گھر جلے
ہمارا بگر عشق کی آگ میں بن چکا ہے۔ حالت

رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
یہ ہے کہ ہم ایک گرم آہ کو دیں تو سبزاروں

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
گھروں میں آگ بجڑا
انٹے اور سب کچھ بن جائے۔

۲۔ شرح : اسد، میرزا غالب کا ابتدائی تخلص، جسے بعد میں کہیں کہیں استعمال کرتے رہے۔

اسے اسد شمع خام سے صبح تک ہر وقت جلتی ہے۔ جنہیں معلوم ہے اس کا سبب کیا ہے! یہ پروانے کے غم کا اثر ہے۔ گریبا دہوتا تو اس پجاری کو کیا پڑی تھی کہ ہر وقت جتا رہے صبح تک بن بن کر گھسی رہتی۔

(۱۳)

۱۔ شرح : گوڑ گانویں کی ہے جتنی رحمت وہ یک قلم
پیارے دل آشوب،
عاشق ہے اپنے مالکِ عادل کے نام کی
میرزا غالب کے عزیز

لنگر دھتے ہاتھوں نے

پہلے دلی کالج میں تعلیم

پائی تھی۔ پھر ملکہ تعلیم

میں ملازمت اختیار کر لی۔ بلند عہدے پر پہنچے اور اسے بہادر کا خطاب پایا جس سے ۱۹۶۹ء میں پیشہ لی۔

معتقد و کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً رسوم ہندو تہذیبیں جند حصہ اول و دوم۔ وغیرہ۔ لالہ سری رام مصنف شہزادہ بہادر کے راسے بہادر موصوف کے بھتیجے تھے۔

بیارے لال کچھ مدت گورنر گھاٹ کے سکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ وہاں مشرکوں کا مشت کھڑے تھے ان کا تہار ہوا تو اہل گورنر گھاٹ نے چاندی کا ایک تلمذ لال بطور یادگار ان کی خدمت میں پیش کرنے کا حتمام کیا۔ اس پر ایک موزوں شعر کہہ کر نا منظور تھا۔ اس غرض سے بیارے لال اپنے ایک دوست کے ہمراہ میرزا غالب کی خدمت میں پہنچے۔ دعا بیان کیا۔ میرزا نے مندرجہ ذیل قطعہ ان کے حوالے کر دیا۔ اس وقت سے میرزا کے ساتھ آفتاب کے تعلق کی ابتدا ہوئی پھر ردائد بہت بڑھ گئے۔

۱۔ شرح : گورنر گھاٹ کی بھتیجی رعایا ہے وہ پوری کی پوری اپنے عدل دوست اور مصنف مزاج حاکم کے نام کی عاشق ہے۔ حاکم سے مراد مشرکوں ہیں۔

۲۔ شرح : اس محبت کی یادگار کے طور پر رعایا۔ یہ نظروں کو روشن کرنے والا تلمذ ابن مشرکوں کی نذر کر رہی ہے۔ جن کا حتمام بند ہے۔

(۱۴)

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خان

بزم شادی ہے فلک، کاکشاں ہے سہرا

ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو

ہے تو کشتی میں، ولے بحیرہاں ہے سہرا

۱۔ شرح :

شہاب العروج خان چاند

ہے اور اس کے دوست

احباب تارے ہیں۔

آسمان کو شادی سمجھو

سمجھیں تو کاکشاں تو

سہرا قرار دے لینا زیبا ہے

ظاہر ہے کہ یہ سہرا خطاب الترحیم، الحمد للہ، ناقب بن لوہب کیا، اللہ تعالیٰ رحمہما علیہما، تیر کی شادی پر کہا گیا تھا اور اس کے صرف دو شعر نہ ہوں گے، لیکن باقی شعر غزل نہ گئے۔

۲- شرح : سہرے کی لڑکیوں کو لڑیاں نہ کہو، یہ سمندر کی لہریں ہیں۔ مگر یہ سہرا کشتی میں لگا کر لائے ہیں۔ لیکن خود سہرا لہریں لیتا ہوا سمندر ہے۔

۱- لغات :

چرخ تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا
دائرہ، بالوں کی گھمبہ۔
چاند کا دائرہ لے، زہرہ نے گایا سہرا
ایک ساز، جن کا ایک
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں الجھے کر لڑیاں
عرفت منہ سے ہوئی اور
دوسری کھل ہوئی ہے۔

شرح : باندھنے کے لیے جب سر پہ اٹھایا سہرا

سہرا اس دھوم سے آیا کہ آسمان تک دھوم مچ گئی۔ زہرہ نے چاند کی ڈھلی ہاتھ میں لے کر سہرا لگنا شروع کر دیا۔

۲- شرح : جب سہرا سر پہ باندھنے کے لیے اٹھایا تو اس کی لڑیاں رشک کے باعث باہم الجھ کر لڑنے لگیں۔

(۱۵)

۲-۱- شرح : ایک اہل درد نے سنان جو دیکھا قفس

ایک دودھ مند نے
یوں کہا : آتی نہیں کیوں اب صدائے غنڈ لیب
ہجرے کو سنان دیکھا

بال و پردہ چار دکھلا کر کہا صیاد نے
تو کہا کہ بیل کی آواز

یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے غنڈ لیب
کیوں نہیں آتی ؟
جواب میں صیاد نے

مد چار پڑا دکھا دینے اور کہا : میں بیل کی جگہ اس کی یہ نشانی باقی رہ گئی ہے۔

(۱۴)

تمہید :-

جب کہ سید غلام بابا نے
مسند عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات
کہ کو اکب ہوئے تماشا ٹائی
(۱۴)

مسند عیش پر دو قطعے
۳۱۔ جولائی ۱۳۳۵ء کے
مکتوب میں بیت الحق
میاں داد غلام سیاح کو
کھٹے گئے تھے سیاح
نے غالباً میر غلام بابا
رغیس سوانہ کی شادی

کی تقریب پر تاجدار کی
فرمائش کی تھی۔ میرزا
فرماتے ہیں : میں فن
تاریخ گوئی و مفاہی
بیگادہ مخلص ہوں جناب
سے میرا بھگوتا ہے
اور مجھ کو جوڑ لگا نہیں آتا۔ سیاح نے کھا تھا کہ سید غلام بابا کسی بھر میں جنیں آتا فرماتے

ہیں : کیوں نہیں آتا۔ اور یہ دو قطعے لکھ بھیجے۔

۱۔ ۲۔ لغات : کو اکب : کو اکب کی جمع : تارے۔

شرح : جب سید غلام بابا عیش کی مسند پر تفریق فرما ہوئے تو برات کی رات
اتنی رونق ہوئی کہ آسمان پر تارے بھی اس رونق کو لگاؤ شوق سے دیکھنے لگے۔

۱۔ ۲۔ شرح : ہزار ہکر کا مقام ہے کہ سید غلام بابا عیش و طرب کی مسند پر تفریق
فرما ہوئے۔ برات کی رات زمین پر ایسی غفل لفظ آراستہ ہوئی کہ آسمان پر تارے بھی شوق
کی لگا ہوں سے نظارے میں مصروف ہو گئے۔

خمسہ بر غزل ابو ظفر بہادر شاہ

تمہید :-
خمس بہادر شاہ غفر
کی غزل پر کہا گیا۔ اور
یقیناً بادشاہ کی فرمائش
کا نتیجہ میں ہو گا۔

۱۔ شرح :
میرے پیر نے پیر نے
پادوں کی زنجیریں گھس
کر آدھی رہ گئی۔ ہم
گئے۔ لیکن قبر کی تعمیر
پوری نہ کی، آدھی ہی
رہ گئی۔ کاش میں تکمیل
پوری کی پوری پڑھتا،
گزرچہ میں ہی جھوڑی
پڑی۔ اسے قاتل !
جب حیرتی تلوار کھینچ کر
آدھی رہ گئی۔ تو نتیجہ
ہوا کہ غلیں عاشق کی جان
بھی غم کے باعث آدھی
رہ گئی۔

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر قبر میں تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا، کاش اکیوں تکمیل آدھی رہ گئی۔
کھینچ کے قاتل ! جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے جان عاشق دلیگر آدھی رہ گئی۔
بیٹھ رہتا لے کے چشم پر غم اس کے روبرو
کیوں کہا تو نے کہ کہ دل کا غم اس کے روبرو
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اس کے روبرو
کہ کہ سارے ساری حقیقت کب ہم اس کے روبرو
ہم نشیں ! آدھی ہوئی تقریر، آدھی رہ گئی۔
تو نے دیکھا، مجھ پہ کیسی بن گئی اسے راز دار
خواب و بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار

مثل زخم آنکھوں کو سی دیتا، جو ہوتا ہو شیار
 ”کھینچتا تھا رات کو میں خواب میں، تصویر یا ر
 جاگ اٹھا، جو کھینچنی تصویر آدھی رہ گئی۔“
 غم نے جب گھیرا تو چاہم نے، یوں اے دلتواز
 مستی چشم سید سے چل کے ہوویں چارہ ساز
 تو صد اے پاسے جاگا تھا جو محو خواب ناز
 ”دیکھتے ہی اے متگر! تیری چشم نیم باز
 کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی۔“
 اس بُت مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات
 جس کے حسن روز افزوں کی یہ ایک نئی سببات
 ماہ نو نکلے پر گزری ہوں گی راتیں پان سات
 ”اس رخ روشن کے آگے ماہ یک ہفتہ کی رات
 تابش خود شید پر تنویر، آدھی رہ گئی۔“
 تا مجھے پہنچائے کابش، بخت بد ہے کھات میں
 ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں

۲۔ شرح

کاش میں اپنی پُر غم
 آنکھیں لے کر محبوب
 کے سامنے بیٹھ رہتا
 اور منہ سے کچھ نہ کہتا
 اسے ہمیشہ! تو نے
 کیوں یہ مشورہ دیا کہ
 دل کا غم اس کے دہرہ
 بیان کرو سے، حالت
 یہ ہے کہ اس کے سامنے
 بات کر رہے ہیں جان
 نکلتی ہے۔ بھلا ہم
 کب پوری حقیقت
 اس سے کہہ سکے؟
 ہمارے کیفیت نصف
 بیان ہوئی تھی نصف
 باقی رہ گئی۔

۳۔ شرح :

اسے مازوار! تو نے
 دیکھا کہ مجھ پر کیا ہیں
 گئی؟ بھلا سو خداور
 جاگنے پر آدھی کو اختیار
 کب ہے؟ اگر میں

جز غم داغ و الم گھٹا ہے ہر اک بات میں
 ”کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں
 آتے ہی خاصیت اکسیر، آدمی رہ گئی“
 سب سے گھٹا گوشہ کنارے ہے، گلے لگ جاوے
 آدمی کو کیوں پکارے ہے، گلے لگ جاوے
 سر سے گر چا در اتارے ہے، گلے لگ جاوے
 ”لنگ کیا بیٹھا سنوارے ہے، گلے لگ جاوے“
 وصل کی شب اے بت بے پیر آدمی رہ گئی“

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے
 پر نصیب اپنا انھیں جاتے سنا، جوں پھر گئے
 دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
 ”آکے آدمی دُور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے
 کیا کشش میں دل کی اب تاثیر، آدمی رہ گئی“
 ناگہاں یاد آگئی ہے مجھ کو یارب کب کی بات
 کچھ نہیں کہتا کسی سے، سن رہا ہوں سب کی بات

اپنے آپ میں جوتا
 تو آنکھوں کو غم قرار
 دے کر ہی ڈالتا تاکر
 وہ کبھی نہ کہتیں اب
 مصیبت یہ پیش آئی
 کہ میں رات سوتے میں
 محبوب کی تصویر کھینی
 رہا تھا۔ آدمی کبھی تھی
 کہ ایک ایک آنکھ کھل گئی
 اور آدمی باقی رہ گئی۔
 ہم - شرح :
 اسے دلنواذ محبوب !
 جب غم نے ہمیں ،
 چاروں طرف سے گھیر
 لیا تو دل میں خیال پیدا
 ہوا چہرہ ختم سیاہ کی مستی
 سے غم کا علاج کریں۔
 ہم ہر سے قریب پہنچے
 تو پاؤں کی آہٹ پا کر
 تو خواب ناز ہے جاگ
 اٹھا۔ اسے عالم ! حیرت زدہ

کھلی آنکھیں دیکھتے ہیں
 ہماری سوچی سمجھی

عصرِ درہم برہم ہو گئی۔
 پوری نہ ہو سکی، آدھی
 رہ گئی، گویا دھنک
 بے تجربہ ہی کیونکہ اس
 کا تجربہ ہونا بد ماجہ ہے
 پر موقوف تھا۔

۵۔ - شرح :
 ہمارا مفرد محبوب کسی
 پرکب انتہات کر سکتا
 ہے، جس کے حسن کا
 ہر روز بڑھے ہانا مہمل
 بات ہے۔ نئے چاند کو
 لکھے ہاں سات راتیں
 گزری ہوں گی۔ ایک
 بچنے کے چاند کی رات
 ہمارے محبوب کا رنج
 روشن نمایاں ہوا تو اس
 کے سامنے پُر نور سوچ
 کی پلک ایک بھی ماند
 پڑ کر آدھی رہ گئی۔

کس لیے تجھ سے چھپاؤں؟ ہاں وہ پرسوں شب کی بات
 ”نامہ بر جلدی میں تیری، وہ جو تھی مطلب کی بات
 خط میں آدھی ہو سکی تحریر، آدھی رہ گئی۔“

ہو تجلی برق کی صورت میں، یہ بھی ہے غضب
 پانچ چھ گھنٹے تو ہوتی فرصت عیش و طرب
 شام سے آتے تو کیا اچھی گزرتی رات سب
 ”پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب
 نکلی آدھی حسرت اے تقدیر! آدھی رہ گئی۔“

تم جو فرماتے ہو دیکھ اے غالب آشفتمہ سر
 ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے، کیا کیوں اس کے گھر
 جان کی پاؤں اماں، باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
 ”دل نے کی ساری خرابی، اے گیا مجھ کو، ظفر!
 ماں کے جانے میں مری تو قیر، آدھی رہ گئی۔“

۶۔ لغات : کاش : گٹاؤ، لاغری، کمزوری۔

شرح : بہ نصیبی گات میں بیٹھی ہے۔ ہا ہنسی ہے کہ بچے کمزور کرے اور
 نقصان پہنچائے۔ میرے لیے کثرت و فراوانی ہے تو آفتوں میں ہے۔ یعنی آفتیں مجھ

پر بہت زیادہ نازل ہوتی ہیں۔ رنج، غم اور الم ہی کی زیادتی ہے۔ ان کے سوا ہر بات میں کمی ہے۔ کم نصیبی اسی کہتے ہیں کہ اکیر، جو میں غم کو بھی گداز بنا دیتی ہے، میرے ہاتھ میں پہنچی تو اس کا اثر اُردھا رہ گیا، شاعر کا دل دیکھیے کہ بے نصیبی دکھا، حالاً کر یہ اشتیاق تجیر بے نصیبی ہی تھی۔ کم نصیبی اس لیے کہا کہ اکیر ہاتھ تو آگئی، مگر اس کی خامی بہت آدھی رہ گئی۔

۷۔ شرح : یہ گورنر سب سے الگ تھلک ہے، یہاں آس پاس کوئی نہیں۔ اسے محبوب یا آ اور میرے گئے لگ جا۔ تو ملازم کو کیوں بنا رہا ہے؟ میرے گئے لگ جا۔ اگر مرے پادروں کے پاس ہے تو میرے گئے لگ جا۔ اسے بے ہریت ! بیٹھا جوتا لگ گیا ستوار رہا ہے؟ میرے گئے لگ جا۔ تو نہیں دیکھتا کہ وصل کی رات آدھی گزر چکی ہے۔ اور آدھی باقی رہ گئی ہے؟ دیکھیے جزئیات ہر شاعر کی نظر کتنی گہری ہے۔ ہلک ستوار ہی ہی نہیں جا سکتی جب تک پادروں کا دھڑکا رہا نہ جائے۔

۸۔ شرح : بھلا مجھے کیا معلوم کہ وہ (محبوب) کتنے آتے کیوں ٹوٹ گئے؟ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ جب ان کے ٹوٹنے کا سنا تو میں نے جانا کہ جس طرح میرا نصیب پیرا ہوا ہے، اسی طرح وہ بھی پہلے گئے۔ قسمت تو دیکھو کہ وہ آئے اور یوں ٹوٹ گئے۔ اپنے گھر سے نکلے میرے گھر کا رخ کر لیا۔ لیکن جب میرا گھر آدھی دُور رہ گیا تو مجھ میں ذہا یا کر انھیں ٹوٹ جانے کا خیال کیوں ہوا؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ میرے دل کی کشش میں تاثر آدھی رہ گئی تھی کہ اپنے مکان تک انھیں نہ کھینچ سکا۔

۹۔ شرح : دیکھو، اچانک مجھے کب کی بات یاد آگئی۔ سب کی باتیں سن رہا ہوں، کسی سے کچھ کہتا نہیں، لیکن اسے نامہ ہر اچھے سے پرسوں رات کی بات کیوں چھپاؤں؟ تو خط لے کر جاتے ہیں جلدی کر رہا تھا اور جو مطلب کی بات تھی، آدھی نکلی گئی۔ اور آدھی باقی رہ گئی۔

۱۰۔ شرح : اگر محبوب پہلی کی طرح چل کر جلوہ دکھائے تو یہ بھی غضب کی بات ہے۔ یعنی اس سے دل کی تسلی کیونکر ہو سکتی ہے۔ کہ جلوہ دکھائے اور غائب ہو جائے۔ اُڑ پانچ پھر گھٹنے کی فرست تو جونی پا ہے تھی تاکہ خوب خوشیاں منا لیتے۔ اگر غلام ہی سے آ جاتے تو

ساری رات کتنی ابھی گذرتی ؛ لیکن وہ میرے پاس آئے ہیں تو آدمی راست گزر جانے کے بعد آئے ۔ گویا دل کی حسرت آدمی نکلی اور اسے تقدیرِ آدمی باقی رہ گئی۔

۱۱۔ شرح : دو سنتوں تم اب یہ فرماتے ہو کہ اسے دیوانے غائب کیا ہم تجھے منع نہیں کرتے تھے کہ اس کے گھر نہ جاؤ ؟ جان کی امان پاؤں ۔ جو کچھ کہتے ہیں ۔ سب ، سچ ہے ، مگر میں کیا کروں اسے نکلے ؟ ساری خروانی دل کی ہے ۔ وہی مجھے لے گیا اور یہ صبح ہے کہ وہاں جانے میں میری عزت آدمی رہ گئی۔

سلام

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اسن کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو
نہ بادشاہ ، نہ سلطان ، یہ کیا تالش ہے
کہو کہ خامس آلِ عبا کہیں اس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو
خدا کا بندہ ، خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند ، کیا کہیں اس کو
فروغِ جوہرِ ایماں ، حسینؑ ابنِ علیؑ
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو

۱۔ شرح :

اُس مقدس وجود کو سلام
جسے بادشاہ کہیں تو خود
ہی خیال آتا ہے کہ کچھ

اس سے سوا کہنا چاہیے

۲۔ لغات :

آلِ عبا : دو بزرگ

ہشتیاں ، جنہیں عام روایت

کے مطابق رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جائے

مبارک میں لے کر گئے

تفسیر بڑھی یعنی انہیں

معاہدوں سے بالکل پاک

قرار دیا ۔ مراد ہے حضرت

کفیل بخشش امت ہے، بن نہیں پڑتی
 اگر نہ شافع روز جزا کہیں اس کو
 میخ جس سے کرے اخذ فیض ہاں بخشش
 ستم ہے کشتہ تیغ جفا کہیں اس کو
 وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل بسیل
 شہید تیشہ لب کر بلا کہیں اس کو
 صد کے سمع رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
 کہ جن و انس و ملک سب بجا کہیں اس کو
 بہت ہے پایہ گردِ رو حسین بلند
 بہ قدر فہم ہے بگر کیمیا کہیں اس کو
 نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرہ خاک
 کہ ایک جو ہر تیغ قضا کہیں اس کو
 ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
 اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو
 ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے حسن صبر کی دلو
 مگر نبی و علیؑ مرحبا کہیں اس کو

عالم، حضرت علیؑ،
 حضرت امیر حضرت حسینؑ
 جو کہ اس مقدس جاوت
 کی گفتی ہیں رسول اللہ
 (صم) سب کے پہلے
 گئے ہیں، اس سے حضرت
 امام حسینؑ کو سلام مل گیا
 کہتے ہیں، یسین آلہ عباس
 سے پانچویں۔

شرح :

دو بادشاہ ہیں، وہ
 وہ سلطان ہیں۔ انہیں
 ایسے القاب کے یاد
 کرنا تلاش کا کوئی سافلیق
 ہے؟ یہ کہنا چاہیے کہ
 وہ آلہ عباس سے ہیں
 بزرگ ہیں۔

۳۔ شرح :

بھلا اللہ تعالیٰ کے راستے
 میں بادشاہ ہیں اور خدو
 کی کیا حیثیت ہے کہ
 حضرت امام حسینؑ کے
 لیے یہ لقب ہائے

زبانِ ناقہ کف اس کے میں ہے کہ اہل یقین
 پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اس کو
 وہ ریگِ تفتہ وادی پہ گام فرسا ہے
 کہ طالبانِ خدا رہنا کہیں اس کو
 امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہل عناد
 پیادہ لے چلیں اور تاسزا کہیں اس کو
 یہ اجتہادِ عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
 عسؑ سے آکے لڑے اور عطا کہیں اس کو
 یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
 بڑا نہ مانیے گر ہم بڑا کہیں اس کو
 علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ
 کرے جو ان سے برائی بھلا کہیں اس کو؟
 نبی کا ہونہ جسے اعتقاد کا فر ہے
 رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو؟
 بھرا ہے غالبِ دل خستہ کے کلام میں درد
 غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو۔

بھگے جاہیں، یوں
 کہنا چاہیے کہ آپ راہِ خدا
 کے رہبر ہیں جہاں کی
 ہر دہائی میں لوگ یہ لڑتے
 ملے کرتے ہیں

۴۔ شرح :
 وہ خدا کے بندے
 ہیں اور جنگوں خدا
 کے آقا ہیں۔ پھر اگر
 انھیں خداوند نہ کہیں
 تو کیا کہیں۔ یعنی انھیں
 خداوند آقا ہی کہنا
 مناسب ہے۔

۵۔ شرح :
 حسینؑ ابنِ علیؑ جو سزاوارت کی
 جلا ہیں۔ مناسب یہ
 ہے کہ انھیں انھیں کہیں
 کی شیعہ قرار دیں، یعنی
 خاصانِ خدا کی جو انھیں
 ہے اس میں حضرت
 امام حسینؑ کو شیعہ کی
 حیثیت حاصل ہے

۷۔ لغات : کفیل : کفالت کرنے والا۔ ضامن۔ ذمہ دار۔

شرح : انھوں نے بخشش امت کی ذمہ داری اٹھالی ہے۔ لہذا یہی کہا جا چہ کہ انھیں قیامت کے دن شفاعت کرنے والا قرار دیا۔

۸۔ شرح : جس سے میں بھی جان بخشی کا فیض حاصل کرے یہ غضب ہے کہ اسے ظلم کی سوار کا کتھہ کہا جائے۔ مطلب یہ کہ ایسے بلند منزلت وجود نے ظلم کی سوار سے عظمت شہادت پایا۔ شہید ہونے کے اعتبار سے زمرہ جاوید ہیں انھیں مکشہ نہیں کہا جاسکتا۔

۸۔ لغات : سبیل : بہشت کی ایک نہر۔

شرح : وہ پاک فاضل جس کے امتیوں کے لیے سبیل، سبیل کی حیثیت رکھتی ہے یا سبیل سبیل بنی ہوئی ہے۔ اسے کہلا میں تعذاب شہید قرار دینا چاہیے۔
یعنی ایسا شہید جسے پتے کو پانی نہ ملا ہو۔

۹۔ شرح : دیکھو کتنا غضب ہے کہ جس راست کو جنت، انسان اور فرشتے سب جا اور دوست کہتے ہیں، وہ دشمن کی رحمتِ مہربانی کے کان میں جگہ نہ پاسکی۔ دشمن کے کان اسے سن نہ سکے۔

۱۰۔ شرح : حضرت امام حسینؑ کے راستے کی گرد کا پایہ بہت بلند ہے۔ اگر ہم اسے کیا کہیں تو یہ تو ہمارے فہم کا ایک اندازہ ہے۔ اصل حقیقت اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔

۱۱۔ شرح : کہلا کی خاک کا ذرہ ذرہ اس درجہ پتائی کو ہلا دینے والا ہے کہ اسے تیغ قضا کو ہر کہنا چاہیے۔ جس طرح سوار کے جوہروں کی درخشانی نگاہوں میں شمع کی پیرا کو جلی ہے۔ وہی کیفیت کہلا کی خاک کے ایک ایک ذرے کی چشمہ کیوں نہ نہر شمع تیغ قضا کا جوہر ہے۔
۱۲۔ شرح : اگر ہم اس خاک کو اپنے درد کی دوا نہ کہیں تو خدا کرے ہمارے درد کی دوا کہیں نہ ملے۔

۱۳۔ شرح : حضرت امام حسینؑ نے صبر کی جو شان دکھائی ہمارا کیا مذہب ہے کہ اس کی داد دے سکیں۔ یعنی ہم کیوں کہ اس کی حقیقت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ البتہ رسول اکرمؐ

صلعم) اور حضرت علیؑ اس پر مہر جا کہیں تو بالکل مناسب ہے۔

۱۴۔ لغات : زمام ناظر : اوشنی کی مہار، بکلیں۔

شرح : اب اوشنی کی مہار اُس بزرگ کے دست مبارک میں ہے، جسے

اہل ایمان حضرت امام حسینؑ کے بعد پیشوا کہیں۔ بظاہر اس سے مراد ہیں امام نیرین العابدیؑ، کیونکہ اہل شہر میں بدعتاً خاوار انہیں کی طرف ہے۔

۱۵۔ لغات : رگیب لغت : سچتی ہوئی ریت۔

شرح : وہ دلوں کی تپتی ہوئی ریت پر چل رہے تھے، جنہیں راو خدا کے

طالبوں کے لیے زربا تھا کہ اپنا رہنما قرار دیں۔

۱۶۔ شرح : حق بزرگ کو امام وقت ہونے کا شرف حاصل تھا، کیا یہ اس کی قدر و

منزلت ہے کہ دشمنی رکھنے والے لوگ انہیں پیادہ ساتھ لے کر چلیں اور ان کے لیے مناسب باتیں زبان پر لائیں؟

۱۷۔ شرح : یہ عجیب اجتہاد ہے کہ ایک شخص وہیں کا دشمن ہو کر حضرت علیؑ سے

جنگ کرے اور کہا جائے کہ ایک اجتہادی خطا تھی!

یہ اشارہ امیر معاویہ کی طرف ہے۔

۱۸۔ شرح : یزید کو تو اجتہاد کا مقام حاصل نہ تھا، وہ تو مجتہد نہ تھا۔ اگر اُسے

برا کہیں تو بڑا ذلیل ہے۔

۱۹۔ شرح : حضرت علیؑ کے بعد حضرت امام حسینؑ اور ان کے بعد حضرت امام

حسینؑ، امام و پیشوا ہیں۔ جو ان تینوں سے بڑائی کرے، اُسے بھلا کیونکر کہیں؟

۲۰۔ شرح : جو شخص رسول اللہ (صلعم) پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے۔ جو امام

سے دشمنی رکھے، اسے کیا کہیں؟

۲۱۔ شرح : غالب کا دل زخمی ہے۔ اس کے کلام میں درد و بھرا ہوا ہے۔

اگر کہیں کہ اس کی زبان پر ابو بھر سے قرآنے جا رہی ہیں تو یہ غلط نہیں۔

(مرثیہ)

خوابِ حال فرماتے ہیں
 کہ کھنڈ کے جھنڈ
 سید محمد مرحوم نے میرزا
 سے سید الشہداء کا مرثیہ
 اردو میں کھنڈ کی فرمائش
 کی تھی۔ میرزا اجتہد
 کی بہت تعظیم کرتے
 تھے۔ ان کے حکم کی
 تعمیل اکثر یہ کھنڈ بیٹھے
 اور خلک سے مدرس
 کے تین بند لکھے۔ پھر
 اجتہد کو لکھ بھیجا !
 "یہ تین جدمرتہ مختلف
 امر کے لیے لکھے ہیں۔
 ورنہ میں اس میدان کا
 مرد نہیں ہوں۔ یہ ان
 لوگوں کا حق ہے جنہوں
 نے اس وادی میں عمریں
 بسر کی ہیں۔ مجھ کو ان
 کے درجے تک پہنچنے
 کے لیے ایک دوسری

ہاں! اے نفسِ باورِ سحر شعلہ فشاں ہو
 اے وجہِ نوحں چشمِ ملائک سے رواں ہو
 اے زمزمہٴ قلم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
 اے مامیانِ شہِ مظلوم! کہاں ہو؟
 بگڑی ہے بہت بات، بنائے نہیں بنتی
 اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی
 تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
 ماتم میں شہر دیں گے ہیں، سودا نہیں ہم کو
 گھر چھوکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
 گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
 یہ خرگہ نہ پایہ جو مدت سے سجا ہے
 کیا خیمہٴ شبیر سے رتے میں سوا ہے
 کچھ اور ہی عالمِ نظر آتا ہے جہاں کا
 کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
 کیسا تلک اور مہر جہاں تابِ کسان کا
 ہو گا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
 عمر درکار ہے، بس مجھے
 اس خدمت سے معذور
 مصافحہ کیا جائے؟
 ان تین جندوں کی
 شرح ذیل میں درج ہے

بند۱۔ لغات : ملائک : ملک کی جج، فرشتے۔
 قلم : ائمہ۔ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بیمار یا مردے سے قلم کر کے تندرست
 یا زخمہ کر دیتے تھے۔

شرح : اسے جج کی ہوا کے سانس؛ تو جملہ بیاں پرسانی شروع کر۔ اسے
 خون کے دریا؛ تو فرشتوں کی آنکھوں سے جاری ہو جا۔ اسے قلم کے نئے؛ تو حضرت عیسیٰؑ
 کے لبوں پر نکلاں ہیں۔ اسے شامِ مظلوم یعنی حضرت امام حسینؑ کے ماتم ہو؛
 آؤ۔ ہاں اس دور پر جگہ گئی ہے کہ اسے جانے اور درست کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں
 آتی۔ اب گھر کو آگ لگے بغیر کوئی پارہ نہیں رہا۔

بند۲۔ لغات : عیای : پاک، پروا۔
 خرگڑہ پایہ : ثویا یوں کا برائیاں، یعنی ثوآسمان۔

شرح : ہمیں بات کرنے کا یا مانا نہیں۔ شور مچانے کی طاقت سے محروم ہیں
 ہم دین کے بادشاہ حضرت امام حسینؑ کے ماتم میں بیٹھے ہیں۔ سوائی اور دیوانے نہیں۔
 ہماری حالت ایسی ہے کہ گھر چھوٹک دینے میں بھی کوئی باگ محسوس نہیں کرتے۔ اگر ہماری
 جنگ مایاں پر سانے والی آہ و فغاں سے آسمان بھی جل جائے تو جیس کیا پروا ہے؟ یہ تو
 درجوں والا بڑا خیر، جو مدت سے اپنی جگہ قائم ہے، یعنی یہ تو آسمان رہے ہیں حضرت خیرؑ کے
 نیچے سے بڑھ ہوئے نہیں۔

بند۳۔ شرح : اب دنیا کا آؤر ہی عالم نظر آ رہا ہے۔ دل، آنکھ اور زبان کا

نفسہ ہی اور ہو گیا ہے۔ کیا آسمان اور دنیا کو ردِ خلق کرنے والا کہاں کا سورج ! اُسے کسی جگہ
 ہوئے کا وہی ہزار کہیں تو بجا ہے۔ اب سورج اور بجلی میں کوئی فرق نہیں، البتہ یہ ہم جانتے
 ہیں کہ بجلی گرتی ہے اور سورج نہیں گرتا، اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ سورج بجلی نہیں۔
 ان تینوں بندوں میں سے پہلا بند خواجہ حالی نے ”یا دگار غالب“ میں درج کیا پورے
 تینوں بند ”ہلوتہ خضر“ میں درج ہوئے۔

رباعیات

لغات : اے نشی خیرہ سر سخن ساز نہ ہو
 خیرہ سر : سرکش
 بے سوا : عصفور ہے تو مقابل باز نہ ہو
 عصفور : آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ
 چڑیا : لاٹھی وہ لگی کہ جس میں آواز نہ ہو
 شرح :

اے بے سرو یا نشی ! باتیں دہا، تو چڑیا ہے۔ خیرے جیسے باز سے خطاب نہ کیا نہیں۔
 اور خیرے منہ سے آواز نکلی، ساتھ ہی وہ لاٹھی لگی، جس میں کوئی صدا نہیں

یہ رباعی ”لطائف غیبی“ سے لی گئی ہے، جو میرزا کی تصنیف ہے، لیکن سیف الحق سیاح
 کے نام سے چھپی تھی۔ منشی سے مراد منشی امیر الدین پٹیا لوی ہیں، جنہوں نے میرزا کی
 کتاب ”طالع برہان“ کے جواب میں ”طالع القاطع“ لکھی تھی۔ باز سے مراد خود میرزا غالب
 ہیں۔ ”بے صدا لاٹھی“ اسکا مطلب یہ ہے کہ اور ”طالع القاطع“ چھپی اور سیاح نے معاً
 اس کا رد مکہ کر چھاپ دیا۔

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
 شاقب! حرکت یہ کی ہے بھیجا تم نے
 حاجی کتو کو دے کے بے وجہ جواب
 غلب کا پکا دیا کلیجا تم نے

شرح :
 اسے شاقب! تم نے
 میرے رقعے کا جواب
 کیوں نہ دیا؟ تمہاری
 یہ حرکت منہایت بیجا
 اور غیر مناسب ہے
 میں نے حاجی کتو کو تمہارے پاس بھیجا تھا۔ تم نے بغیر کسی سبب کے اسے صاحبِ جواب
 دے دیا۔ اس طرح غلب کا کلیجا پکا دیا۔

یہ رباعی شہاب الدین احمد خاں شاقب کے لیے ہے، جس طرح اگلی رباعی بھی انہیں
 کے لیے ہے۔

اے روشنی دیدہ، شہاب الدین خاں
 کتنا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضان؟
 ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
 سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن؟
 تراویح کی نماز پڑھنے سے کب تک فرصت ہوتی ہے اور تراویح میں روزانہ قرآن
 کتنا سنتے ہو؟

شرح :
 اے شہاب الدین خاں!
 تم میری آنکھوں کا نور
 ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ رمضان
 کا مہینا کس طرح بسر ہو
 رہا ہے؟ رات کو،
 تراویح کی نماز پڑھنے سے کب تک فرصت ہوتی ہے اور تراویح میں روزانہ قرآن
 کتنا سنتے ہو؟

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
 کہتے ہیں مجھے وہ رافضی و دھری
 دھری کیونکر ہو، جو کہ ہودے صوفی؟
 تیسری کیوں کر ہو ماوراء النہری

لغات :
 رافضی :
 شیعہ۔

دھری :
 دہریہ، لافنسب

ماوراءالنہر ۱ : ماوراءالنہر کے قطعی حصے میں دریائے پار کا علاقہ۔ اجنادین
اسلامی فتوحات دریائے جیوں تک پہنچ گئی تھیں اور جیوں سے پار کے علاقے کو ماوراءالنہر
کہتے تھے۔ چنانچہ جیوں اور جیوں کا درمیانی علاقہ درجے ہم ترکستان کہتے ہیں، ماوراءالنہر
ہی مشہور تھا۔ یہاں کے لوگ بڑے پکے شتی اور شیعوں کے سخت مخالف مانے جاتے
تھے چونکہ میرزا کے آباؤ اجداد ترکستان سے آئے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے
آپ کو ماوراءالنہری کہا۔

شرح : جن لوگوں کو مجھ سے شدید دشمنی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیعہ اور،
وہ یہ جوں۔ سوچنے کی بات یہ ہے جو صوفی جو اور جس کا مسلک تصوف ہو، وہ دہرے کچھ بڑے
سکتا ہے؛ جو ماوراءالنہر کا رہنے والا ہو، وہ شیعہ نہیں ہو سکتا، لہذا پکے شتی ہوگا۔
یہ حصہ لطیف باز می ہے، میرزا غالب کے شیعہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں، البتہ
وہ خاص وضع کے شیعہ تھے، یعنی ائمہ کرام سے استہجائی عہدت تھی۔ حضرت علیؑ کو دوس
مانتے تھے۔ ساتھ ہی تمام فرقوں اور طبقوں سے گرامیل بولی تھا۔ تعصب سے بالکل پاک
تھے اور بڑے بڑے صوفیوں سے بھی عقیدت مندانہ تعلق تھا، مثلاً غوث علی شاہ قلندر پانی پتی
نے خود اس تعلق کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔

متفرق اشعار

۱- شرح : جگر میں ٹوٹ کے سوئی ہوئی سناں پیدا
جگر کا دم سینے کیلے
دہانِ خرم میں آخر ہوئی زباں پیدا
سوئی اشمال کی گئی۔

وہ زخم ہی میں ٹوٹ کر رہ گئی اور اس کی جگر سناں (خیر یا بھالے کی ٹوک) نے سنبھال
۲- خاتمہ کہتا ہے کہ اچھا ہی ہوا۔ زخم کی صورت تو مزگی سی تھی۔ مگر اس نے زباں نہ تھی۔
خیر یا بھالے کی ٹوک اس منہ میں دبان ہو گئی۔

خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا ۲۔ شرح :
 جینے کی خوشی اور مرنے
 ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

پایدار و استوار زندگی حاصل ہو۔ ہماری زندگی تو سراسر ناپائیدار ہے، بقول ذوقی یہ
 برقی کی چمک یا خوار سے کی سکوٹ ہے یعنی یک لمحے میں ختم ہو جائے گا۔ اس زندگی اور
 اس بے ثباتی و بے اعتباری پر نہ جینے کی خوشی کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ مرنے کا غم کھانا کسی
 بھی اعتبار سے مناسب ہے۔

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پر پیار آئے ۳۔ شرح :
 محبوب کی دلفریبیوں پر
 کیوں نہ پیار نہ آئے نہ

دیکھیے پہلے بلاوجہ بگڑا بھی اور خفا ہو گیا۔ حالانکہ مجھ سے کوئی گناہ اور جرم سرزد نہیں ہوا
 تھا۔ یہ بھی بہر حال ایک دلفریب اور اداختی جس پر بے اختیار پیار آیا۔ پھر خود ہی راضی ہو گیا
 نہ میری طرف سے کوئی عذر پیش ہونے کا انتظار کیا۔ اور نہ مجھے منت و مہجت یا غوغا کی ضرورت
 پیش آئی۔

دورنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی تک ہیں ۴۔ شرح :
 دورنگی کا مطلب ہے۔
 منافقت، مفاہت، مفاہرت۔

دورنگی ظاہر کچھ باطن کچھ۔
 شاعر کہتا ہے کہ زمانے کو دورنگیاں اسی وقت تک ہیں جب تک ہم جیتے ہیں۔
 جب مر جائیں گے تو یہ دورنگیاں ہم پر کچھ اخراعات نہ ہو سکیں گی۔ کیا مردوں کو کسی نے کفن
 بدلنے دیکھا ہے؟ ہرگز نہیں۔ وہ جس حالت میں قبر کے اندر رکھ دیے گئے اسی حالت
 پر برابر قائم رہتے ہیں۔

۵۔ شرح : سات جلدوں کا پارسل پہنچا
میرزا غالب نے کتب خانہ کے
مشتق اپنی فارسی کتاب

دستجوہ اگرہ کے مطبع مفید الحاق میں چھپوائی تھی، جس کے مالک شیروازی آباد تھے۔ فنی
نہی بخش حقیقہ، میرزا عاتم علی بیگ۔ میرزا ہرگز پال قندھار کا بیٹا دیکھنے اور قیام کرنے کے نمودار
تھے۔ ان میں سے کچھ کتابیں جو ماکوں کو بھیجی منظور تھیں۔ مجدد کرائی تھیں۔ اور یہ کام میرزا
عاتم علی بیگ بہر کے حوالے ہو گیا تھا۔ یہ سات کتابیں تھیں۔ جب میرزا کے پاس ان
کتابوں کا پارسل پہنچا تو بعد درجہ خوش ہو کر عاتم علی بیگ بہر کو خط لکھا۔ اس میں کتابوں کا
ذکر اس شعر سے شروع کیا۔ یعنی سات کتابوں کا پارسل بر عمل پہنچ گیا۔ آگے فرماتے
ہیں :-

واللہ اگر تصور بھی میں گزرتا ہو کر کتابیں اس رقم کی ہوں گی، جب تک
جہاں ہے تم جہاں میں رہو خدا علیہم السلام کی امان میں رہو۔

میرزا نے جلدوں کی گنت کے سلسلے میں بارہ روپے بیسے لکھے۔ انہیں یقین نہیں
آتا کہ اتنی رقم میں ایسی خوبصورت جلدیں بن گئیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

اب میں حیران ہوں کہ آیا شمارائے اطہار نے ان بارہ روپے میں برکت دی،
یا کچھ شہارہ روپیہ صرف ہوا؟ ہندوستانوں کا حصول، وہ رجسٹروں کا حصول، تین
کتابوں کی لوح طوائف، یہ ساری بات اس روپے میں کس طرح بن آئی!

۶۔ شرح : ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب
خدا نے دو مرشد پیدا
کیے، جو حقوق کو پیدا
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

راستہ دکھاتے تھے اور سب کی تربیت فرماتے تھے۔ ساخند دونوں مرشدوں کو دو
حقیرت کیش طلبکاران فیض بھی دے دیئے۔ حضرت خواجہ نظام الدین نظام الدین جیسے مرشد
کو امیر خسرو جیسا طالب و اور سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ غازی جیسے مرشد کے لیے

غالب جیسا طالب پیدا کروا۔

میرزا و تنافوتا ایسے شعر انو نظر بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے۔
خواجہ حالی یادگار ہیں فرماتے ہیں کہ ایک روز خواجہ نظام الدین قدس سرہ اور امیر خسرو کی خصوصیت
کا ذکر و بار میں جو راجا میرزا نے اسی وقت یہ شعر افشا کر کے پڑھا۔

نیا ر عشقِ خرمین سوزِ اسبابِ ہو س بہتر ۷۔ - شرح :
عشق کی آگِ خرمینوں
جو ہو جائے نثارِ برقِ مشتِ خدا و خُص بہتر
کو بلا دیجیے بہتر
یہی ہے کہ خرمین و ہوس کے تمام اسباب اس آگ کی نذر کر دیے جائیں۔ خُص و غار اور
جھاڑ جھنگار کا بجلی پر لپٹا اور جو جانا جس اچھا ہے۔

خدا سے میں بھی چاہوں اذرو مہر ۸۔ - شرح :
یہ شعر میرزا غالب
فروغ میرزا حاتم علی مہر
نے عالم علی بیگ مہر
کو ان کی ایک دشمنی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا۔
مطلب یہ کہ میں مجھ کی بنا پر خدا سے عالم علی بیگ مہر کی ترقی و سر بلندی کے
بے و عا کرتا ہوں۔

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ ! غلط ۹۔ - شرح :
جب محبوب کا یہ
کہنا یاد آیا کہ نہیں،
کی تصور نے بہ صحرا سے ہوس راہ ! غلط
واہ ! غلط۔ تو تصور ہوس کے صحرا میں راستہ بھول گیا۔

سیناںِ عمر کے ستر ہوئے شمار برس ۱۰۔ - شرح :
یہ شعر میرزا غالب
نے اپنے لشکر و رشتہ
بہت جیوں توجیوں اور تین چار برس
ہرزند احمد حقیر گزلی کو ایک مکتوب مرثومہ ۲۸۔ نومبر ۱۹۵۷ء میں لکھا تھا یعنی سرے

عمر کے ستر برس پورے ہو گئے اب اگر زندگی ہوگی تو یہ ہے زیادہ تین چار برس کی ہوگی۔
یہ پیشگوئی درست ثابت ہوئی اور میرزا نے چتر برس کچھ بیٹے کی عمر میں انتقال کیا۔
شاگرد نے جواب میں لکھا :

سنا صغیر اے کہتے ہیں حضرت نقیب ! جہتہ جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد میں کی ہے دعا خدا کے میل : نقیب جیسے ہزار برس

۱۱- شرح : پیرو مرشد معاف کیجئے گا

یہ شعر میرزا نے برسات
کا ذکر کرتے ہوئے ،

میں نے جتنا کا کچھ نہ لکھا حال
نواب ، لکھنؤ دار بہادر خلیفہ ریش کو درالہن کو ۱۹ - جو ۱۱ سنہ ۱۲۹۶ کے ایک مکتوب میں
لکھا تھا ۔

مطلب یہ کہ پیرو مرشد ، معاف فرمائیے گا ۔ میں نے آپ کو دریا سے جتنا کہے بار
میں کچھ نہ لکھا ۔

۱۲- شرح : ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک

یہ شعر میرزا نے عطاء الدین

عنایات الہی ہو مبارک
احمد خاں عطاء کی کے نام

۱۲۹۳ء کے ایک مکتوب میں لکھا تھا ۔ اس کا پس منظر یہ کہ عطاء کی چونکہ امین الدین احمد خاں دہلی
لودارو کے فرزند اکبر تھے لہذا ولی عہد ریاست وہی تھے اور ان کے بارے میں دہلی عہدی
کا اعلان بھی ہو چکا تھا ۔ جب امین الدین احمد خاں کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور معاملات
اور امور ریاست کی دیکھ بھال میں انہیں وقت پہنچنے لگی تو حکومت کی منظور سے
عطاء کی کو والد کی جگہ نائبہ کاروبار ریاست سنبھالنے کا حکم ہو گیا ۔ اسی کو میرزا نے ولی عہد
تین شاہی "قبلا دیا ہے" یعنی ہو تو ولی عہد مگر ریاست کے اختیارات مل گئے ، اگرچہ
صحیح ہیں مہین اس کی مبارک باد دے اور اس صورت کو عنایات الہی کا کرشمہ قرار دے

واقعی یہ اسی ذات پاک کی خلیات سے ہوا۔

۱۳۔ شرح :

میرزا آنا دلفے آپ

حیات میں لکھا ہے کہ

درم و دام اپنے پاس کہاں

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

نور العابدین خاص عارف کا فرزند حسین علی خاں جیسے میرزا اور ان کی بیگم نے بیٹا بنالیا تھا۔ ایک دن کہیں کھینٹ آیا کہ دادا ہاں ملٹائی منگا دو وہ صندوق کھول کر ادھر ادھر ٹھٹھنے لگا۔ میرزا نے ار تھاڑ فرمایا،

ہمارے پاس درم و دام کیوں کر ہو سکتے ہیں کہیں چیل کے گھونسلے میں جس ماس

ملا ہے، یعنی چیل کو گوشت کا جو ٹکڑا مل جائے فوراً کھا جاتی ہے اور باقی نہیں چھوڑتی۔

وہی حالت ہماری ہے کہ پیرا آتا ہے اور فوراً خرچ ہو جاتا ہے۔ باقی بچا ہی نہیں کہ محفوظ رکھا جائے۔

۱۴۔ شرح :

اے غالب! شراب

نوشی کو بے حاصل اور

میکیشی کو نہ سمجھ بے حاصل

بادہ غالب عرق بید نہیں

یہ فائدہ نہ سمجھ۔ شراب بید کا عرق نہیں۔ بید کا درخت بے ثمر ہوتا ہے اور

اس کے عرق کو بھی میرزا نے غالباً اسی وجہ سے بے اثر قرار دیا۔

۱۵۔ شرح :

آپ قیامت تک سلامت

رہیں۔ اور آپ کی دولت

تم سلامت رہو قیامت تک

دولت و عزت و جاہ روز افزوں

عزت و جاہ و منہ روز بروز رو بہ اضافہ رہیں۔

۱۶۔ شرح :

آپ قیامت تک

سلامت رہیں، آپ

تم سلامت رہو قیامت تک

صحت و لطف طبع روز افزوں

کی صحت اور لطیف طبع برابر بڑھتے جاتیں

یہ دونوں شعر میرزا غالب عموماً ان خطوں میں لکھتے ہیں جو فردوسِ اہلبی کم پور کے نام سے پہچانے جاتے۔

۱۷- شرح : نہیں بھولا میں تجھ کو اسے میری جاں

یہ شعر میرزا نے
میرزا کے ہم
کروں کیا کہ یاں اگر رہے ہیں مکان

ایک مکتوب (مرقومہ ۲۶- ستمبر ۱۸۵۷ء) میں لکھا ہے۔ اس زمانے میں بارش کی کثرت کے باعث دہلی میں مکان گر رہے تھے۔ میرزا کا مطلب یہ ہے کہ اسے میرزا ہی میری جاں میں تجھ کو بھولا نہیں۔ مگر کیا کروں؟ یہاں مکان گر رہے ہیں فرماتے ہیں۔

برسات کا حال دیکھو خدا کا قبر ہے — قاسم خاں کی لگی سہاگت جہاں کی نہر ہے

۱۸- شرح : ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو

بارش اس لیے روتا ہے
کہ عیش و شادمانی کی مجلس

آرامتہ کی جائے لیکن بجلی اس پر ہنسی ہے اور کہتی ہے کہ میں تو صرف کوئی دم ہے ہم کو

ہے۔ اس میں عیش و شادمانی کے سامان کیوں کر مل سکتے ہیں۔ اور مہیا کر بھی لیے جائیں۔ تو ان کے کتنا غم مرگام لایا جائے گا۔

ابر کے رونے سے اس کا ترسنا۔ اور بجلی کے چمکنے سے اس کا ہنسا مراد ہے۔

میرزا غالب کے نزدیک شراب نوشی اور اس سے ملنے میں عیش و نشاط کا موسم ہمارے ملک میں صرف برسات کا ہے۔ ایک نادر سی غزل کا مقطع ہے۔

بہارِ ہند بود برشکالِ بلبِ غالب . دریں غرض کہ ہم کو کم شراب سے بہت

ہندوستان درجے اب پاک و ہند کہتے ہیں بھارت کا موسم برسات ہے۔ گویا اس

ملک میں ہم کی خفیتِ خزاں کی سی ہے۔ شراب نوشی کا ایک موسم ہے۔

دیکھتا ہوں اسے بھتی جس کی تمنا مجھ کو
 ۱۹۔ شرح : مجھے جس کی تمنا تھی،
 اسے اپنے سامنے دیکھ
 رہا ہوں۔ گویا میرے لیے بیداری میں زینا کے خواب کا سماں پیدا ہو گیا۔

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
 ۲۰۔ شرح : اس شعر کی مضمونیت کا
 انحصار صرف اس کیفیت
 پر ہے کہ مشہور ہے زعفران زرد دیکھ کر انسان کو بے اختیار ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے اور زعفران
 کے پھولوں کا رنگ زرد ہوتا ہے۔

کہتے ہیں : ایسے ضعیف و کمزور دیکھ کر سب ہنستے ہیں، ضعیف و کمزور آدمی کا رنگ،
 عموماً زرد ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کمزوری خون کی قلت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ میرزا کہتے ہیں کہ
 پہلا رنگ ہمارے لیے ہمن زعفران ہے۔ جسے دیکھ کر سب ہنسنے لگتے ہیں۔

ماہِ نو ہوں کہ فلکِ عجز سکھاتا ہے مجھے
 ۲۱۔ شرح : میں نیا پاند ہوں یعنی
 بال اور آسمان مجھے عجز
 کا درس دیتا ہے اور عمر بھر ایک ہی پہلو پر سلاتا ہے۔

صبا! لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبلی کی
 ۲۲۔ شرح : اے صبا بلبلی کی طرف
 سے بھول کے مز پر
 کہ روئے غنچہ گل سوئے آشیاں ہو جائے
 ایسا طمانچہ لگا کہ اس کا مز بلبلی کے گھونسلے کی طرف پھر جائے۔

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانتا ہے
 ۲۳۔ شرح : جی جانتا ہے، کا
 مطلب ہے۔ غنچہ
 ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانتا ہے

آج مجھ سا نہیں بدنام زمانے میں کوئی ۲۷- شرح :

آج زمانے میں میرے
براہر بدنام کوئی نہیں۔

پھر بھی دل چاہتا ہے اور ہوں بدنام ابھی

میں دیکھیے دل چاہتا ہے کرا بھی بدنامی کا حریف سرد سداں جو نا چاہیے۔

زرافشاں ہانگ ہے اور سبز اس پر اک دوشالا ہے ۲۸- شرح :

ہانگ دوسرے کانوں
کے درمیان میں ہے

غضب یہ ہے پر طائوس میں کالے کو پالا ہے

کیرا پر سونے کا بڑا دھچک رکھا ہے۔ اور اس پر سبز دوشالہ اوڑھ لیا ہے، غضب کی
بات ہے کہ مور کے پر میں کالے سانپ کو پالا ہے۔

بتوا تو یہ کرو، تم کیا ہو، جب ادا بار آتا ہے ۲۹- شرح :

اے بتو۔ تو یہ کرو
اپنے حسن پر زیادہ نہ

تو یوسفؑ سا حسین بکنے سر بازار آتا ہے

اتراؤ۔ جب زوال کا دور آتا ہے تو یوسفؑ جیسا میں سر بازار بکنے کے لیے آجاتا ہے۔

بجھا ہے شیریں اگر چھوڑ دتی سچ کو چلی ۳۰- شرح :

شریں طوائف تھیں
اگر شریں دی کو

مثل ہے نو سوچو ہے کھا کے بقی سچ کو چلی

پھوڑا کرچ کے لیے نگلے تو اس پر وہی مثل صادق آتی ہے کہ بقی نو سوچو بے کھا کے سچ
کے لیے رونا دھونے ہے۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے ۳۱- شرح :

یہ شہر میرا نے
میر میری جبروت

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔ یہ فروری ۱۹۵۷ء کا خط تھا۔ اس وقت تک دہلی کے
حالات مغرور مذہب میں تھے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی نیا حکم اہل شہر کے لیے جاری ہو جاتا

مقتار مرزا کہتے ہیں اس شعر میں رونما نہ کیا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ مسجد میں منہیں آنا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

۳۲- شرح : مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ شعر میرزا نے اپنے مکان کے متعلق کیا ہے
جو عین مسجد کے زیر سایہ تھا۔ فرماتے ہیں،

میں نے مسجد کے زیر سایہ مکان بنے لیا ہے گویا ایک بندہ جو نہایت حقیر اور
قرۂ بلع ہے، خدا کا ہمسایہ بن گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ مسجد کو سب لوگ خدا کا گھر کہتے
ہیں اور خدا کے گھر کے ساتھ جس کا گھر ہو گا۔ وہ اپنے آپ کو ہمسایہ خدا کہلانے
کا اقتدار جو بدلتے گا۔

خواجہ عالی یا دیگر غائب میں فرماتے ہیں کہ سب سے آخر مکان جس میں ان کا
انتقال ہوا گیم محمود خاں مرحوم کی لہان خاد نے حصل مسجد کے عقب میں تھا۔ اس کی
نسبت یہ شعر کیا

۳۳- شرح : ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم
راہ عشق میں شہادت
ہر موج گرد راہ مرے سر کو دوش ہے
پاک بچہ ہزار جسم
گئے۔ راستے میں ہو کر دامن عشق ہے اس کی ہر ہر میرے سر کے لیے کندھے کا کام
دے رہی ہے۔

۳۴- شرح : دم واپس بر سر راہ ہے
آخری سانس اس
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے
راستے پر ہوا ہے۔

جو اسے اختیار کرنا تھا۔ اسے عزیزو! اب اللہ کے سوا کچھ نہیں۔

یہ شعر زندگی کے آخری دور میں میرزا عموٹا پڑھتے رہتے تھے۔

مثنوی

ایک دن مثلِ پتنگ کا غدی
 لے کے دل سرِ شترِ آزادگی
 خود بخود کچھ ہم سے کتیا نے لگا
 اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
 میں کہا، اے دل! ہو اے دلبراں
 بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
 بیچ میں اُن کے نہ آنا زینہار
 یہ نہیں ہیں گے کسی کے یار
 گودے پنڈے پر نہ کر اُن کے نظر
 کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

۲۰۱۔ لغات :

کتیا نا : پتنگ کا
 کتنی کھانا، شرم و حجاب
 کرنا، مثالِ مثل کرنا۔

شرح :

ایک دن میرے دل
 نے کاغذی پتنگ کی
 طرح آزاد می کا سرِ شتر
 سنبھال لیا اور مجھ سے
 کتنی کھائی۔ بہت بگڑا
 اور میرا سر کھانے لگا۔

۲۰۲۔ شرح :

میں نے کہا: اے دل! یہ
 حسینوں کا عشق تیرے
 لیے نقصان کا باعث

اب تو بل جلتے گی تیری آن سے سانٹھ

لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گمانٹھ

سخت مشکل ہو گا سلجھانا تجھے

قہر ہے دل ان میں اُلجھانا تجھے

یہ جو عقل میں بڑھاتے ہیں تجھے

بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے

ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں

مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل نے سن کر کانپ کر، کھا پیچ و تاب

غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

رشتہ در گردنم انگندہ دوست

مے بردہر جا کہ خاطر خواہ دوست

اُگھیر کر ایسی گمانٹھ پڑے گی کہ ترے لیے اس کا کھونا مشکل ہو جائے گا۔ مرن

حیثوں میں دل اُلجھانا قہر ہے۔

تجھے عقل میں اوجھا دیکھ دیتے ہیں اس پر بھول دیا،

حقیقت میں تیرا مذاق اڑاتے ہیں۔

۴۔ شرح :

کہیں ان کھیچ اور

بل فریجٹاؤڈا۔ یہ

کہیں کسی کے دقا دار

دوست نہیں ہوئے۔

۵۔ شرح :

ان کے گورے بدن

مزدیکھ، یہ ڈورہٹال

کر لوگوں کو کھیچ پیتے ہیں۔

۱۶۔ لغات :

سانٹھ : رسی یا

دھاگا جس میں گرو پڑی

ہوئی ہو گھٹتی۔

شرح :

اب تو ان سے تیری

سانٹھ ل جائے گی لیکن

اُگھیر کر ایسی گمانٹھ پڑے گی کہ ترے لیے اس کا کھونا مشکل ہو جائے گا۔ مرن

حیثوں میں دل اُلجھانا قہر ہے۔

۸۔ شرح :

تجھے عقل میں اوجھا دیکھ دیتے ہیں اس پر بھول دیا،

حقیقت میں تیرا مذاق اڑاتے ہیں۔

- ۹۔ شرح : کسی ذکسی دل تجھے کہیں ظا دیں گے اور محنت میں کٹا دیں گے۔
- ۱۰۔ شرح : دل نے میری باتیں سنیں، کاتیا، پچو قاب کھایا، میری سوج بھار کے بعد کٹ کر یہ جھاب دیا : میری گردن میں دوست نے دھا کا ڈال رکھا ہے اور جس طرف، اس کا دل چاہتا ہے، ایسے پھرتا ہے۔



ضمیمہ دوم

اس نمبر میں نسر محمدیہ کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ کوشش یہی رہی کہ صرف وہ شعر ہیے جائیں جو دراصل اور واضح ہوں، نیز ان میں گھر و خیال یا اسلوب بیان کی کوئی خوبی موجود ہو۔ ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی پیش نظر رہا کہ غلبہ کے ارتقائی طرز کا اندازہ کرنے والوں کے لیے (جیسا سرمایہ فراہم ہو جائے) اور نسر محمدیہ کی اشاعت سے اصل غرض یہی تھی چنانچہ اس انتخاب میں متعدد ایسے شعرا لے لیے گئے ہیں جن سے نثری اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابتدائی دور میں، جسے مشق و ورزش کا دور کہنا چاہیے، غلبہ کس انداز میں سوچتے تھے اور کس رنگ میں اپنے افکار پیش کرتے تھے۔ ان کا طریق و پتہ ای سے فرما سکتا، لیکن جس مقام بلند کی طرف ان کی پرواز کا رخ تھا، اس تک پہنچنے کے لیے بقدر ضرورت، قوت موجود و لاتی، جس قدر قوت، ہم پہنچی تو وہی شاعر۔ جسے شروع میں بعض دماغ سوچنا کی تقلید عمل کو سمجھ رہے تھے شاعری میں اس درجہ کامل پہنچ گیا، جو اس سے بیشتر شاید کسی کو حاصل نہ تھا اور جو کچھ وہ کر گیا ہے، اسے اردو زبان میں بیشتر روشنی کے ایک بلند مینار کی حیثیت حاصل رہے گی۔



ضمیمہ دوم نسخہ حمیدیہ کا انتخاب

اسد! ہر باغن نے طرح باغ تازہ ٹوالی ہے لغات :
مجھے رنگ بہار ایجادِی بیدل پسند آیا
بہارِ بکادوسی : بہار
پیدا کرنے کی خصوصیت۔
بہار آفرینی۔

شرح : اے اسد! بیدل نے ہر مقام پر نئے انداز سے شعر و سخن کا
ہر بہار باغ لگا دیا ہے۔ یہی وہ ہے کہ مجھے اس کی بہار آفرینی کا رنگ بہت پسند
آیا ہے۔

تنگی رفیق رہ بختی، عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ ظایع چشمِ حُود تھا
بازی خورِ فریب ہے اہلِ نظر کا ذوق
ہنگامہ گرمِ حیرت بود و نہ بود تھا
پوچھا تھا گرمِ یار نے احوالِ دل، مگر
کس کو دماغِ مثبتِ گفت و شنود تھا
خورِ شبِ غمِ آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسد!
سجودِ قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

۱۔ شرح :
میں عدم کی حالت میں
تھا یا وجود کی حالت میں
آیا۔ دونوں جگہ تنگی میرے
راستے کی ساتھی بنی
رہی۔ یعنی عدم میں بھی
میرے لیے کشا نکل کہ
کوئی سامان نہ تھا وہاں
سے سفر کر کے عالمِ وجود
میں آیا تو یہاں بھی وہی
حالت رہی، معلوم ہوتا
ہے کہ میرے سفر کی

قسمت میں عاصیوں کی آنکھ کھلے دی گئی تھی، جس کی تنگی دنیا بھر میں مشہور ہے۔

۲۔ **شرح :** اس دنیا میں بہتی اور مینے کا ہنگامہ حیرت افزا صورت میں گرم تھا۔ یعنی یہی سوچا جاتا تھا کہ ہم ہیں یا نہیں؟ ہمارا وجود کوئی حیثیت رکھتا ہے یا محض ایک دھوکہ ہے؟ جو لوگ اہل نظر ہونے کے لئے تھے، وہ بھی اسی دھوکے سے بازی کھا گئے۔

مطلب یہ کہ وہ اہل نظر تھے، جس سے امید تھی کہ حقیقت تک پہنچ گئے ہوں گے اور گرہیں گئے کہ ہماری بہتی کچھ حیثیت نہیں رکھتی، لیکن موت و حیات کا جو ہنگامہ یہاں گرم تھا، اسی نے انہیں ایک فریب میں مبتلا کر دیا۔

۳۔ **شرح :** میں، تمنا ہوں کہ محبوب نے میرے دل کا حال پوچھ لیا تھا، مگر مجھ میں اتنا صبر و سکون ہی کہاں تھا کہ راستہ حقیقت کا احسان اٹھاتا، یعنی میں حال سنا تاں اور محبوب سنا۔

۴۔ **شرح :** اے استاد! میں تو سر سے پاؤں تک سجدے کا ذوق نہیں کر رہا تھا۔ یعنی میں تو بھر ہی سجدہ ہی کیا تھا، لیکن افسوس کہ آفتاب نے میری شبہ سے غما سائی پیدا کی۔

اوس کے نظریے واقعی بھر ہی سجدہ ہوتے ہیں، مگر انہیں جذب کرنے کے لیے سوچا کی شعاعیں درکار ہیں، میرزا کہتے ہیں، میں سراپا عشق تھا اور محبوب حقیقی کی ماہ میں فنا ہو جانے کی تمام ضروریات ملنے لگی تھیں۔ صرف اتنی کسر رہ گئی تھی کہ محبوب کی توجہ جو اور میں آچھے آپ کو اس کے خواہے کروں۔ میں اب تک توجہ نہ ہو سکی۔

۱۔ **شرح :** جہے کہاں تمنا کا، دوسرا قدم، یارب
اے خدا! یہ دنیا جو
ایک وسیع صحرا کی
ہم نے دشتِ اسکلان کو ایک نقشِ پایا
حیثیت رکھتی ہے، یہ
بے دماغ خجالت ہوں، رشکِ امتحانِ تا کے
تو ہمارے نزدیک تنہا
ایک بیکیسی تجھ کو، عالمِ آشنا پایا
آرزو کا ایک نقشِ قدم
ع۔ اب فرمائیے کہ

کیوں نہ وحشت غالب باج خواہ تسکیں ہو اس کا دوسرا قدم

کہاں پڑا؟

گشتہ تغافل کو خصمِ نوحوں ہسا پایا دنیا کوشت تکرار دینا ہے، عہد

سے درست ہے کہ اس کا وجود صوفیہ کے نزدیک محبوبِ حق سے فراق کا تجربہ ہے۔ پھر اس

شعر میں یہ اشارہ بھی ہے کہ محبوبِ حق نے حسن کی لائش کے لیے یہ چر کار غماز بنایا۔ گویا یہ

سب کچھ تشاکل کا ایک نقش قدم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسرا نقش قدم کہاں

ڈھونڈیں؟

۲- شرح : میں شرمندگی برداشت نہیں کر سکتا۔ امتحان کا رھک کب تک گولڈ

کو تیار ہوں؟ نہ میرا کوئی نمونہ ہے، نہ ہمدرد، میں اپنی ذات کے لیے کسی کا احسان قبول

نہیں کر سکتا۔ اسے یکجہاں جس طرح گود لیا بھر کی ساتھی ہے، اسی طرح میری بھی ساتھی

تہا کو ہے۔

۳- لغات : باج : خراج۔

شرح : غالب کی دیوانگی کس لیے تسکیں کا خراج وصول نہ کرے؟ ہمیں عاشق

کو محبوب کے تغافل نے مار ڈالا، وہ اپنا خون بہا تو نے ہی نہیں سکتا، کیونکہ تغافل میں ماما

جانا خون بہا کا مستحق ہی نہیں۔ صرف اتنی آرزو ہے کہ دیوانگی کی حالت میں کچھ تسکی ہو جائے۔

۱- لغات : جس قدر جگر خوں ہو، کو چہ دادِ دل ہے

کو چہ دادِ دل، کہیں کو

نکھنے کے لیے ماس

سے دینا۔

زخمِ تیغِ قاتل کو، طرفہ دل کشا پایا

نے اسد حفا سائل نے ستم جنوں مائل

شرح :

جس قدر جگر بہو ہو کر

تجھ کو جس قدر ڈھونڈا، الفت آشنا پایا

بھتا جائے، دل راستہ

دیتا جاتا ہے۔ قاتل کے زخم تیغ کوئیں نے صدمہ بردار دل کھول دینے والا پایا۔

مطلب یہ کہ قاتل کی تھوڑی جگہ پر چڑھی اور وہ خون ہو کر بہ گیا۔ ساتھ ہی دل کا راستہ کھل گیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ قاتل کی تھوڑی جگہ دگلتا ہے۔

۲۔ شرح : ناسخ کا سوال یہ ہے کہ اس پر نظم و جور ضرور کیا جائے۔ نہ محبوب کی سنگری کے مصلحتی کہا جاسکتا ہے کہ اس میں دلہانگی کی غصہ ہے، یعنی وہ اندھا دھند ستم کچھ بھارت ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم نے محبوب کو جس قدر ڈھونڈا، یہی معلوم ہوا کہ ہماری محبت والہ کے آزمائش ہو رہی ہے، اس کے بغیر محبوب ہی نہیں سکتا۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم جو نظم و ستم اٹھا رہے ہیں، ان میں نہ ہماری خواہش و آواز و کو دخل ہے، نہ محبوب سنگری ہے۔ یہ سب محبت کی طبعی آزمائشیں ہیں ان سے گزرے بغیر کوئی کیونکر منزل مراد پر پہنچ سکتا ہے؟ ہر طرح کا ناتوا اور پینا، جاگنا اور سونا دھنک کی خصوصیتیں ہیں، اسی طرح آزمائش محبت کے راستے کی طبعی منزلیں ہیں۔ پھر ان سے گھبرانے کا کیا مطلب؟ محبت ہے تو اس راستے کی ہر امانت قبول کرنی پڑے گی۔ جیسے کوئی شخص بھول پٹنے کا تو کامٹوں کی غرض سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

۱۔ شرح : کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر میرے سینے میں کوئی چیز کھٹک رہی تھی، توک کچھ تھے، یہ دل ہے، جس میں محبت کی غرض ہے۔ دیکھا تو حیر کی توک نکلی، جو دل میں پیوست ہو گئی تھی اور برائے کھٹکتی رہی۔

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر جس کو دل کتے تھے، سوتیر کا پکیاں نکلا کس قدر خاک بٹا ہے دل مجھوں، یارب نقش ہر فردہ سوید اے بیاباں نکلا شور رسوائی دل دیکھ کہ یک نالہ شوق لاکھ پردے میں چھپا، پروردہ ہی عریاں نکلا

شوخی رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک
۲- شرح :
اے حنا! جنوں کا
دل کس قدر رنگ چھ

کیا ہے، یعنی رنگ میں بی گیا ہے کہ ہر ذرہ دنیا باں کے لیے سویا ہی گیا ہے۔

۳- شرح : دل کی رسوائی کا جنوں کا خطرہ کہ شوق کی ایک فریاد لاکھوں پردوں
میں چھپی، پھر بھی وہ عریاں بھی نکل۔

مطلب یہ کہ نازِ شوق کو کتنا ہی چھپایا، مگر چھپ نہ سکا۔ سبب یہ تھا کہ دل کو رسوا
ہونے کا شوق تھا اور وہ اپنا شوق پورا کر کے رہا۔

۴- شرح : اے محبوبِ محبت توڑ دینے والے محبوب! تو کب تک وفا کے خون
سے اپنے لیے منہ دی کا سامان فراہم کر رہا تھا۔ آخر تجھے بھی اپنے اس فعل پر پشیمانی ہوئی۔

۱- شرح
ضعف و ناتوانی گوری
ہوئی مگر کتنا شاکر رہی
ہے جو کونائوں رنگ
ہم زور و قوت اور جوانی
کے زمانے میں دیکھ چکے
وہ آنکھوں کے سامنے
آجینے کی طرح آگئے اور
ان سے پوری گزشتہ
کی کیفیت ہم پر آشکارا
ہو گئی۔

ناتوانی ہے تماشا ٹی عمر رفتہ
رنگ نے آئینہ آنکھوں کے مقابل باندھا
اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ
جو گرہ آپ نے کھولی، اُسے مشکل باندھا
پار نے تشنگی شوق کے مضمون چاہے
ہم نے دل کھول کے دیا کو بھی ساحل باندھا
مطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پے نغمہ بیدل باندھا

عمر گزر گئی، آخری منزل پر پہنچ گئے۔ اسید پیرسی کے ضعف میں مبتلا ہیں۔ گزری ہوئی عمر پر شیشیاں ہیں اور جو بہاریں ہم گوارا کئے ہیں، وہ آئینہ عبرت کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

۲۶۔ شرح : جو لوگ غفلت کے قیدی ہیں یعنی غفلت کا فکار و پچکے ہیں، انہوں نے اپنے ایسے جو عجیب و غریب اصطلاحیں وضع کر لی ہیں، ان کی کیفیت کیلچہ پچھتے ہوئے سمجھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جو کلام غفلت کے باعث وہ خود ذکر کئے، اسے مشکل بتا کر دل کی غفلت کر لی اور اپنے خیال کے مطابق دنیا کے سامنے سرخرو ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کی ہمت ہوتی اور وہ خود تو جس سے کام لیتے تو یہاں کوئی گرہ ایسی نہ بنتی، جو کمل نہ سکتی۔ کوئی کام ایسا نہ تھا، جو انجام نہ پاسکتا۔

۳۔ شرح : محبوب ہم سے اس بات کا طلبگار تھا کہ ہم شوق کی پیاس کا مال بیان کریں۔ ہم نے انتہائی ہمت و کشادہ دلی سے کام لیتے ہوئے دیکھو کہ یہی سائل باندھ دیا۔ یعنی سائل، بگڑ دیا ہے، وابستہ ہوتا ہے، مسلسل تم آلود رہنے کے باوجود پیاسا ہی رہتا ہے۔ دیا بھی پی باندھے تو اس کی پیاس نہیں بجھتی لیکن حق یہ ہے کہ اتنی ہمت اور وسعتِ حوصلہ کے باوجود شوق کی پیاس بکے مضمون ہمارے غالب ہیں نہ آئے ہم اس کی کھینچتے ہیں۔ اس شکر کا دوسرا مصرع میرزا نے مطلوبہ دواؤں کے لیے رکھ لیا اور اس پر یہ مصرع لگایا :

نہ بندے تشنگیِ ذوق کے مضمون غالب ہم نے دل کھول کئے یا کو بھی سائل باندھا

۴۔ شرح : اے غالب ! دل کے مفتی نے میرے سانس کا تار لیا اور ساڑ پر ڈورا بٹا کر باندھ دیا مگر میں میرزا ہیدل کے لہنے گاؤں۔

یہ افس دور کی غزل ہے، جب میرزا ہیدل پر مٹے ہوئے تھے، اس لیے تارِ نفس کو سدا کا رشتہ بنا کر ہیدل کے رنگ میں شکر کھنڈ کے آرزو مند ہیں۔

زبس آتش نے فصل رنگ میں رنگ دگر پایا : شرح
 فصل بہار آئی اور باغ
 چرائی گل سے ڈھونڈے بے چمن میں شمع 'خار اپنا
 نے آگ کی صورت اختیار کر لی۔ شمع نے اپنا خار ڈھونڈنے کے لیے پھول کے چراغ
 سے لگایا۔

شمع کا خار وہ دھاگا ہوتا ہے، جو جلتا ہے۔ پھول رنگ کی فراوانی سے آگ بن
 گئے تو شمع نے پھول کا چراغ لے کر اپنا خار ڈھونڈنے کا سامان کر لیا۔

ہم نے وحشت کدۂ بزم جہاں میں، بھول شمع : شرح
 اس جہاں کی محفل ایک
 شعلہ عشق کو اپنا سرو سامان سمجھا
 وحشت کدے کے سوا
 کیا ہے ! ہر شے دیوانہ وار اپنی دھن میں لگی ہے۔ ہر محفل کے لیے شمع ضرور ہی ہے۔
 ہم نے بھی دنیا میں شمع کی طرح صرف عشق کی چنگاری کو اپنا سرو سامان قرار دے دیا۔

نہ پائی وسعت جولان یک جنوں ہم نے : شرح
 ہمیں اس دنیا میں اتنی
 عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا
 فراخی اور کشادگی بھی
 نہ مل سکی کہ ہمارے ایک دیوانگی حسب و لحاظ ہنگامہ آرائی کر سکتی۔ اس پر دل اتنا کمزور تھا اور
 کدورت کا غبار اس کثرت سے جمع ہوتا رہا کہ ایک صحرا بن گیا اور یہ غبار ہم اپنے ساتھ
 عدم کو لے گئے۔

مطلب یہ کہ یہ دنیا وسعت کے باوجود ایک جنوں کی بھی ہنگامہ آرائی ہوا داشت
 نہیں کر سکتی۔

۱۔ شرح : شرر فرصت نگہ، سامانِ یک عالم چراغوں ہے
 ہمیں جو ہمت ملی،
 وہ تو صرف اتنی ہے
 بہ قدرِ رنگِ یاں گردش میں پیمانہ ہے محفل کا
 مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں، غالب !
 ختم ہو گیا۔ اس کے
 عقابے میں نظر کی یہ
 حالت ہے کہ دنیا کو چہرہ خاں بنا دینے کا سامانِ لیے پیشی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس محفل کو پیمانہ صرف اپنے رنگ کے مطابق گردش کر سکتا ہے۔
 مطلب یہ کہ زندگی محدود و مجرّیل ہے اور انسانی اپنے ساتھ ہزاروں آدمیوں کو
 لیے پیش ہے۔ اتنا نہیں سمجھتا کہ کسی محفل میں پیمانہ اتنی دیر تک گردش کرے گا جتنی دیر
 تک شراب ہوگی۔ شراب ختم ہوگی تو پیمانے کی گردش بھی رُک جائے گی۔ گویا اس زندگی میں
 تمام آدمیوں پر ہی منہیں ہو سکتیں۔

۲۔ مشرح : اے غالب ! مجھے ظنِ گوئی کے راستے ہیں گمراہی کا کوئی ڈر نہیں
 اس صحرا میں میزِنا بیدل کا قلم میرے لیے خضر کے عصا کی حیثیت رکھتا ہے جو شخص ایسے
 خضر کی رہنمائی میں جا رہا ہو، اسے راستے سے ہٹک جانے کا کیا ڈر ہو سکتا ہے ؟

شرح : بہ صورتِ تکلف، بہ معنی تاتصف

اے استاد ! میں ان
 لوگوں کی مسکراہٹ
 ہوں، جن کے دل افسردہ و پژمردہ ہوں۔ اگر میری صورت دیکھی جائے تو میری مسکراہٹ
 سراسر تکلف کا نتیجہ نظر آئے گی۔ میری اصل حالت یہ خود کیا جائے تو وہ مسکراہٹ سراسر
 اسوس معلوم ہوگی۔

مطلب یہ کہ جن لوگوں کے دل مڑجھاپکے ہوں، وہ چھپتے بھی ہیں تو محض تکلف سے،

حقیقت میں اس کے دلوں کو جہنم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور طور سے دیکھا جائے تو وہ کھرت و
جانت ہی کے مارے ہوئے نظر آئیں گے۔

۱۔ شرح :
دلہا لگی پر صفت کی کیفیت
طاری تھی۔ سخت گرمی
کا موسم تھا۔ ایسی حالت
میں میرے لیے گھر کے
دروازے تک پہنچنا بھی
مشکل تھا۔ اس حال میں
جنون کے لیے تسکین کی
صورت اس کے سوا
کیا تھی کہ ایک چھٹا سا
پیا پان گھر میں بھی بنا
یہتے تاکہ جب ضعف
ضعف جنوں کو وقت تپش در بھی دُور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیا بیاں ضرور تھا
اے وائے غفلت نگہ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لخت دل کوہ طور تھا
شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا
ہر رنگ میں جلا اس قدر فتنہ انتظار
پروانہ تجلی شمع ظہور تھا
کے مارے اصل ضرر تک پہنچ سکتے تو گھر ہی میں صراحت کی کر لیتے۔

۲۔ شرح : نگہ و شوق کی غفلت پر افسوس ہونا چاہیے کہ اس نے حقیقت کا شیک
مشک اعجازہ نہ کیا، ورنہ اس دنیا میں پتھر کا کون سا ٹکڑا ہے، جسے کوہ طور کے فتنہ جگر
کی حیثیت حاصل نہیں؟ یعنی اس میں وہ جتنی نظر نہیں آتی، ہو کوہ طور کی زینت ہی تھی۔
نثار کا مقصد یہ کہہ ہے کہ جس تجلی کا ظہور کوہ طور پر ہوا تھا، وہ بلاشبہ ایک خاص
ظہور تھا۔ لیکن کون سا پارہ سنگ ہے، جس میں صانع حقیقی کی شان نظر نہیں آتی اور جھانٹ
کی یا دہندہ نہیں کرونا؟ البتہ انسان تو تہذیبی ذکر سے اور غفلت سے کام لے تو بات دوسرے
ہے۔ اس صورت میں تجلی طور بھی اس کے لیے ہرگز بعیرتہ اہم نہ رہیں۔

۲۔ **شرح :** راحت چاند کا بیاد توں سے بھر گیا اور بیاد بھریں ہوئے کے معنی مر جانے کے بھی ہیں۔ اسے محبوب ! معلوم ہوتا ہے، تیرا چہرہ دیکھ کر اسے موت آگئی۔

مطلب یہ کہ چہرہ صوفیوں کے چاند سے زیادہ خوب نور سے بھرا ہوا، لیکن تیرا چہرہ دیکھا تو اپنی بے آگاہی کی شرم میں ڈوب ملا۔

۳۔ **شرح :** جو اس انتظار کی آزمائش کا شکار ہو چکا تھا، وہ ہر رنگ میں جن کر خاکستر ہو گیا۔ حقیقت یہ کہ وہ شیخ ظہور کی تجلی کا پردہ نہ تھا۔ یعنی جہاں اسے محبوب حقیقی کے ظہور کی شمع روشن نظر آئی، وہیں بل مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ محبوب سے فراق پر حاششت نہیں کر سکتا تھا اور انتظار کی کڑیوں میں نہیں جھیل سکتا تھا۔

شرح : بوقتِ سرنگونی ہے تصورِ انتظارِ ستاں
جب ہم سر پہنچا کر محبوب کا تصور کر لیتے ہیں تو انتظار

نگہ کو آبلوں سے شغل ہے اخترِ شماری کا
کا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے نگاہ جاتا ہے اسے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں میں پھاسے پڑ گئے ہیں۔ بس انہیں پھالوں کو بار بار دیکھنا اور اصلِ تار سے گننا ہے، جو راستہ گنارنے کا ایک بہانہ سمجھا جاتا ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو اپنے محبوبوں سے جدا ہوں۔

شرح : ہر گامِ آبلے سے ہے دل، درتہ قدم
جو بھی قدم اٹھاتا ہوں، اس کا ہر اہل دراصل دل

کیا بیمِ اہلِ درد کو سختی راہ کا
ہے جو پاؤں کے نیچے رکھ دیا گیا ہے۔ اس حال میں درد مندوں کو راستے کے کشن اور دشوار ہونے کا ڈر کیوں؟ یعنی جو لوگ آبلوں کی بگڑاؤں رکھ دیتے ہیں، انہیں کتنی ہی سختی پہنچیں آئے، آسانی سے جھیل میں گئے، لہذا کوئی ڈر نہیں ہو سکتا۔

خود پرستی سے رہے باہمد گر نا آشنا

۱- شرح :

ہم خاص ذات کے

ہے ایک دوسرے سے

سے ناواقف رہے۔

اس کا سبب یہ تھا کہ

ہم دونوں خود پرست

تھے۔ دونوں اپنے عمل

میں مت تھے۔ ہیں

بیکسی کو اپنے لیے

باعث فخر سمجھتا تھا۔ اے محبوب !

تو نے مجھے سے دوستی پیدا کر رکھی تھی،

یعنی ہر وقت

اے ساتھ رہ کر بناؤ سنگار میں مصروف رہتا تھا۔

بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

بے دماغی شکوہ سچ رشک ہمد گیر نہیں

یار تیرا جام مے، خمسیازہ میرا آشنا

رابطہ یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار

سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

باعث فخر سمجھتا تھا۔ اے محبوب !

تو نے مجھے سے دوستی پیدا کر رکھی تھی،

یعنی ہر وقت

اے ساتھ رہ کر بناؤ سنگار میں مصروف رہتا تھا۔

۲- شرح : ہے واقعی اس امر کی رفا دار نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف رشک کی بنا پر شکوہ شکایت کریں۔ مان لینا چاہیے کہ تجھے جام پر غلام بنا پسند ہے اور میں برابر نہ کے آثار میں مبتلا ہوں۔

کہتا یہ چاہتے ہیں کہ اے محبوب ! تو نے درپے شراب کھریا ہے چڑھا رہا ہے، میرا جسم خار کھینچ دتا ہے میں مبتلا ہے۔ اب بتا کہ ایک دوسرے کی حالت پر رشک کرنے یا شکایت کے دفتر کھولنے کا کیا فائدہ ہے ؟ لطف یہ کہ ہم دونوں بے دماغ بھی ہیں اور بے دماغی شکوہ و شکایت کی رفا دار بھی نہیں ہو سکتی۔

۳- شرح : بہار کے جتنے بھی اجزاء ہیں، وہ سب بے انسی بیکر نفرت کے شیرازے میں بندھے ہوئے ہیں، یعنی ان کی فطرت ہی یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بھاگیں گے، کسی سے اُنس پیدا نہ کریں۔ جموت ملاحظہ فرمائیے : اجزائے بہار میں سے ایک بہترہ ہے۔ سادھی دنیا اسے بیگا دکھتی ہے۔ دوسرا جزو صبا ہے۔ جو سراسر آوارہ ہے۔ اجد صمد مختلف ہے، پہل نکلتی ہے۔ تیسرا جزو پھول ہے، وہ کسی سے آشنائی ہی پہیلتا

خود پرستی سے رہے باہمد گر نا آشنا
 ۱۔ شرح : ہم خاص ذات کے
 بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا
 ہے ایک دوسرے سے ناواقف رہے۔
 بے دماغی شکوہ سچ رشک ہمد گیر نہیں
 اس کا سبب یہ تھا کہ
 یار تیرا جام مے انھیازہ میرا آشنا
 ہم دونوں خود پرست
 رابطہ یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار
 تھے۔ دونوں اپنے محل
 سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا
 میں مست تھے۔ ہیں
 باعث فزسمینا تھا، اے محبوب! تونے آئینے سے دوستی پیدا کر رکھی تھی، ایسی ہر وقت
 اے سامنے دکھ کر ناؤں گار میں معروف رہتا تھا۔

۲۔ شرح : بے دماغی اس امر کی روادار نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف رشک
 کی بنا پر شکوہ شکایت کریں۔ مان لینا چاہیے کہ تجھے جام پر غلام بننا پسند ہے اور میں برابر نشے
 کے آثار میں مبتلا ہوں۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اے محبوب! تونے درپے درپے شراب کھمیا ہے چڑھا رہا ہے۔
 میرا جم غمار کھینچ و تاب میں مبتلا ہے۔ اب بتا کہ ایک دوسرے کی حالت پر رشک
 کرنے یا شکایت کے دفتر کھولنے کا کیا فائدہ ہے! لطف یہ کہ ہم دونوں بے دماغ بھی
 ہیں اور بے دماغی شکوہ و شکایت کی روادار بھی نہیں ہو سکتی۔

۳۔ شرح : بہار کے جتنے بھی اجزاء ہیں، وہ سب بے انسی بلکہ نفرت کے
 شیرازے میں بندھے ہوئے ہیں، یعنی ان کی فطرت ہی یہ ہے کہ ایک دوسرے سے
 بھاگیں گے، کسی سے انس پیدا نہ کریں۔ جموٹ غلط فرمائیے، اجزائے بہار میں سے
 ایک ہنزہ ہے۔ سارسی دنیا اسے بیگانہ کہتی ہے۔ دوسرا جزو صبا ہے۔ دوسرا جزو آوارہ
 ہے، بد مرزا آشنا ہے، یہی لکھنی ہے۔ تیسرا جزو پھول ہے، وہ کسی سے آشنا ہی نہیں

نہیں کرتا ۔

دیکھیے : تین جزو پیش کیے اور تینوں میں بے آنسی، گریز اور لغزت کی خصوصیت نمایاں کر دی ۔ بیگانہ وہی ہے ، مجھے کسی سے آفتابی دہو ، سب سے الگ تنگ رہے ، آوارہ وہی ہے ، جو کسی سے ربط ضبط نہ رکھے ۔ نا آشنا وہی ہے ، جو کسی سے انس پیدا نہ کرے ۔

شرح : قود میرا سنبلستان کی کرے ہے ہمیری

بیکہ شوق آتش گل سے سراپا جل گیا
میں سر سے پاؤں تک پھول کی آگ کے عشق میں بن گیا ہوں ۔ غم میں سے خود حواں اٹھتا ہے ، وہ سنبل کا ہمیری گیا ہے ۔

۱۔ شرح : ہوں قطرہ زن بہر وادی حسرت شبانہ روز

بجز تارِ اشک جادۂ منزل نہیں رہا
میں حسرت کی وادی میں رات دن قطرہ قطرہ ہو کر گر رہا ہوں ۔ میری منزل کا راستہ آنسوؤں کے تار کے

اے آہ ! میری خاطر وابستہ کے ہوا

دنیا میں کوئی عقدہ مشکل نہیں رہا

سوا کچھ نہیں رہا ۔ یعنی جس طرح آنسو مسلسل قطرہ قطرہ ہو کر گرتے ہیں اور ایک تار باندھ دیتے ہیں ۔ یہی کیفیت میری ہے اور اسی کو میری منزل کا راستہ سمجھنا چاہیے ۔

۲۔ شرح : میرے بندھے ہوئے دل کے سوا دنیا میں کوئی ایسی گروہ

نہیں رہی ، مجھے کھون شکل ہو ۔ اے آہ ! تو ہی مہربانی کر کر یہ کسی طرح کھ جائے ۔

یہ ہوس درو سر پہل سلامت ، تا چند
 شرح : جو لوگ اس دہلیان
 مشکل عشق ہوں ، مطلب نہیں آساں میرا
 سے بیٹھے ہیں۔ وہ ایک
 تک درو سر میں مبتلا رہیں گے کہ میرا مطلب پالیں ؟ میں عشق کی مفلک ہوں اور میرا
 مطلب پالنا سہل نہیں۔ یعنی میں لوگوں کو سلامتی سے محبت ہے ، وہ اس شکل کو حل کیونکر
 تلاش کر سکتے ہیں ، لہذا ان کا درو سر بالکل بے سود ہے۔

رکھا غفلت نے دُور افتادۂ ذوقِ فنا و رنہ
 اشارتِ فہم کو ہر ناخنِ بڑیدہ ابرو مٹھا
 ۱۔ شرح : ہم غفلت کے باعث
 ذوقِ فنا سے دُور رہ کر
 منہ ، اور حسی لوگوں
 کو حقیقت کے اشاروں
 کی بھر پوری اُسی کے ہے
 تو ہر گز ہوا ناخن بھی ابرو کی حیثیت رکھتا تھا ، میں وہ تو کچھ جوئے ناخن کی کوہ و سمیرا کر اس
 کے اشارے پر جان دے سکتے تھے غفلت نے ہم سے فہم و سمیرت کی یہ دولت ہی چھین لی۔
 ۲۔ شرح : اسے استاد اپنے پیچھے کی خاک اڑا اڑا کر سر پر ڈالتا ہوں۔ ایک زمانہ
 ایسا بھی گزرا ہے ، جب شراب نوشی کر تھوڑی سی زمین پر اٹھل دیتے تھے اور اس طرح
 شراب پھانے کے مٹی میں گھسوں تک آج بھی ختمی۔

پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنہ بالش
 لغات : پنہ بالش :
 خیالِ شوخیِ خواب کو راحتِ آخر میں پایا
 نکلے کی روٹی
 شرح : پریشانی کی حالت میں سر کے مغز کی یہ کیفیت ہو گئی جیسے نکلے کی روٹی

ہے۔ حیمینوں کی شوخی کا تصور بھی جرمی راحت پیدا کرنے کا ہے۔

مطلب یہ کہ میں شوخی کے تصور میں پریشانی تھا۔ مغز کی یہ حالت ہو گئی، جیسے دھکی ہوئی روٹی ہوا اور اسے ٹکے میں بھردیا جائے۔ تکیہ باعث راحت ہے، لہذا اس پریشانی کا انجام راحت پر ہوا۔

بہ رہیں شرم ہے، باوصف شوخی اہتمام اس کا

نگین میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا

مسی آلودہ ہے مہرِ نوازشِ نامہ، پیدا ہے

کہ داغِ آرزوئے بوسہ لایا ہے پیام اس کا

یہ اُمیدِ نگاہِ خاص ہوں محلِ کشِ حسرت

مُبادا ہو عناں گیرِ تنافلِ لطفِ عام اس کا

لیکن اس کا نام بہتر کے شرار کے کی طرح اندر ہی اندر بند ہے۔

۱- شرح :

اگرچہ میرا محبوب شوخ

ہے، تاہم اس کا اہتمام

انتظام کی باگ خود شرم

کے ہاتھ میں ہے، مثال

یہ بھنی پانی ہے کہ اگرچہ میں

نے نام کا نگین بنالیا ہے،

نایاں نہیں۔

بعض فنون میں شوخی کی جگہ شہرت کا لفظ ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ اگرچہ

اس کی شہرت بہت ہے، لیکن وہ شرم کے تمام آداب کا پابند ہے۔ لیکن بنالیا تاکہ جا بجا

مزین بہت کرنے، مگر نام چمکاؤں کی طرح چمکنے کے اندر رہا۔

۲- شرح :

عجب کے خط پر جو مٹرگی ہوئی ہے، اس میں مٹی کی آئینہ

ہے۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ ہم نے بوسے کی ہمارے زو کی تھی، اس کے جواب میں انکار میں

پیغام آگیا۔ گویا وہ پیغام آرزوئے بوسہ کا داغ ہے۔ داغ اس لیے کہ میں کے رنگ کا ہوتا

ہے۔ آرزوئے بوسہ کے لیے داغ اس بنا پر کہ میں ہونٹوں کو سیاہی مائل کرنے کے لیے

لگائی جاتی ہے۔

۳- لغات :

محل کش : کبادہ اٹھانے والا۔

شرح :

میں نگاہِ خاص کی اُمید پر حسرت کا کبادہ اٹھانے پھرنا ہوں لیکن

مجھے نگاہِ خاص کی حسرت ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کر رہا ہوں کہ کہیں اس کا لطفِ عام
تلافی کا نشانہ نہ بن جائے۔

مطلب یہ کہ سب پر اس کا لطفِ دوگہم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اسی لطفِ دوگہم میں مجھے
بھی حاصل کر لیا جائے اور نگاہِ خاص کی حسرتِ دل میں رہ جائے۔

۱- شرح :
ایک جہیں تھے، جو عشق
میں مٹا دیا اور اس سے
الگ تھک رہے اور
تمنا کے تمام اسباب موجود
تھے اور ہم اسرار کر
عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے، اسبابِ تمنا، سب تھا
آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دل دیوانہ کہ وارستہ بہرِ مذہب تھا
کتنے تھے۔

۲- شرح : ہمارا دیوانہ دل ہر ملک اور ہر مذہب سے آنا دیتا تھا۔ آخر ذہن
کے پھنسے میں گرفتار ہو گیا۔

۱- شرح :
میرا تھا بڑا دل ماتم
خانے کی شمع بنا ہوا تھا
آج وہ شمع گل ہو گئی اور
دھواں اس کے ماتم میں
سیاہ لباس پہنے ہوئے
تھو کہے، صحرایہ بار دامن دیوانہ تھا
دیکھ اس کے ساعدِ سین و دستِ پُرنگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع، گل پر دانہ تھا

۲- لغات :
برخاستن : اٹھنا۔

شرح :

میں امٹا۔ ذرا جیش

ہوئی اور پورے سراسے

کر لیا۔ اس کا کوئی حصہ باقی ہی نہ رہا۔ گویا سورا سورا نہ تھا، دیوانے کے دامن کا خیار تھا کہ نہ
بھٹکا اور جھڑ گیا۔

اس شعر میں بھی میرزا نے اپنا وہی مضمون پیش کیا ہے کہ یہ پوری کائنات ہمارے
جنون عشق کی تسکین کے لیے کافی نہیں۔ یہ تو ایک ہی جیش میں ختم ہو گئی۔

۳۔ شرح : میرے محبوب کی پانچویں بھی کھائی اور رنگے ہوئے ہاتھ دیکھ کر پھول
کی شاخ شمع کی مانند بجنے لگی اور پھول اس کا پر وادہ بن گیا۔

اس شعر میں "ساعیہ میں" کو "شاخ گل" اور "دوست پر نگار کو گل" سے تشبیہ دی
گئی ہے۔

شرح : اسے آبلہ کرم کر، یاں رنجہ یک قدم کر

اسے پھالے آنکھیں

ابے نور چشم وحشت، اسے یادگارِ سحر

اسٹا کر آ، خود یادگار

کی آنکھ کا درد ہے، تو سورا نوروی کی یادگار ہے۔

شرح :

دیکھیے، اس بے تکلف
نور کے جھلاؤ میں

اسے خوشا ذوقِ تمنائے شہادت کہ اسد

نہ بے تکلف بہ سجودِ چشمِ شمشیر آیا

مہرہ کرنے کے لیے آیا ہے۔ واہ! اٹن کی آرزو سے شہادت کا کیا عالم ہے اور کس قدر ذوق و شوق ہے !

۱۔ شرح :
 میرا محبوب پھر باٹ
 کی طرف چلا کر ہے۔
 خدا غیر کرے، خدا جانے
 کیا کئی کھیلے۔ بس ہم
 یہ دیکھ رہے ہیں کہ
 بارغین جو بھی سوا کھا رہے ہیں، ان کے ہرے کا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ یعنی وہ بھی پریشان ہیں، دیکھیں، انجام کیا ہو!

۲۔ لغات : ہرزہ درا : یہودہ گو۔

شرح : یہودہ گو اسد ! تو جند آواز سے تلے کر کے شور کیوں مچا رہا ہے ؟ دیکھ جو محبوب بغیر کسی سبب کے عاشقوں کو ڈکھ دینے کے عادی ہیں، کہیں وہ تیری آہ و فغاں سے گھبرا کر حوصلہ ہار بیٹھیں اور شیوہ آزار ترک نہ کر دیں۔

اسد ! ارباب فطرت قدر والین لفظ و معنی ہیں
 اسے اسد ! جنہیں
 سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاق تھیں کا
 اللہ تعالیٰ نے فطرت
 سمجھ عطا کی ہے، وہ لفظ اور معنی دونوں کے قدر دان ہیں۔ میں شعر گوئی کے لیے وقف

ہوں، گویا اسی کا غلام ہوں، لیکن تمہیں وافرین کا مجھے کوئی شوق نہیں۔

اس مطلق سے ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں میرزا جو شعر کہتے تھے، عام لوگ، ابھی
 کے باعث ان کی کچھ قدر نہیں کرتے تھے۔ پھر ذرا بہتر شعر کہنے لگے تو اس دور میں کچھ زیادہ
 قدر نہ ہوئی، اس لیے کہا،
 دستاویز کی تفتاد نہ ملے کی پروا
 مگر نہیں ہیں میرے اشعار میں سنی دہی

شرح : عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی، اسدا
 اے اسدا اپنا عیب
 دریافت کر لینا بڑی
 ہنرمندی اور عقل و دانش کی دلیل ہے، جس شخص کو اپنی خامی کا علم ہو گیا، بھر لیجیے کہ اس کے کان
 ہوتے کا راستہ کھل گیا۔

اس سلسلے میں عربی کیا خوب کر گیا ہے۔
 خواہی عیب اسے تو روشن شود نرا یکدم منافقانہ نشیں در کیمین خویش
 اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے عیب تجھ پر آشکارا ہو جائیں تو سنوڑی دیر کے لیے بیٹھ بدل
 کر اپنی گھات میں بیٹھ جا، اپنے عیب تلاش کرنے کا، اس سے بہتر ہی نہیں، بلکہ اس کے
 سوا بھی کوئی طریقہ نہیں۔

۱۔ شرح : سر منزلِ مستی سے ہے صحرا کے طلبِ دُور
 ہم بس صحرائیں پہنچنا
 جو خط ہے کھپ پا پہ، وہ ہے سلسلہ پا
 چاہتے ہیں وہ اس
 دیدارِ طلب ہے دلِ واماندہ کہ آخر
 تندگی کی منزل سے
 لوگ سرِ مژگاں سے رقم ہو گلنہ پا
 بہت دُور ہے ہمارے
 پاؤں سے بولتے ہیں

ہا رہے ہیں۔ وہ خفیقت میں پاؤں کے لیے ایک زنجیر ہیں جو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔
 ۲۔ شرح : ہمارا ٹھکانا ہوا اور پیچھے رہا ہوا دل محبوب کے دیدار کا طلبگار ہے۔ چاہیے کہ پاؤں کا شکوہ قلم کے بجائے نوک سرِ مرثاں سے لکھا جائے، یعنی ہم چل کر محبوب کی بارگاہ میں پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے دیدار سے شاد کام ہوں، مگر پاؤں ساتھ نہیں دیتے۔ ان کی نکالت لکھنے کے لیے نوک سرِ مرثاں سے بہتر قلم کیا ہو سکتا ہے۔

بہتر نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا
 ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
 دل جو جگرِ تنہاِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
 ولے بنو زخیال وصالِ خام رہا
 شکستِ رنگ کی لائی سحرِ شبِ سنبل
 چہ زلفِ یار کا افسانہ نا تمام رہا
 نہ پوچھ حالِ شب و روزِ ہجر کا، غالب !
 نخیالِ زلف و رُخِ دوستِ صبح و شام رہا
 ۱۔ شرح : آپ نے غلط پر مقرر کئے وقت جو عذاب دہی لگایا، وہ ہمارے لیے نغمہِ پیغام بن گیا۔ ہمارا کام ہوا، آپ کا نام نہ ہو۔
 ۲۔ شرح : دل اور جگر جدائی کی پیش سے جل کر خاک ہو گئے، لیکن وصل کا تصور ابھی تک خام چلا آتا ہے۔

مطلب یہ کہ ہم جل کر راکھ ہو گئے اور ابھی تک وصل کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

۳۔ شرح : سنبل کی رات کا رنگ فق جو گیا اور صبح طلوع ہوئی، نہیں محبوب کی زلف کا افسانہ پورا نہ ہو سکا۔

سنبل کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے، اس لیے اسے شب کہا۔ پھر اس کا رنگ ٹوٹ گیا اور وہ سفید ہو گئی۔ گویا رات صبح کی شکل اختیار کر گئی، لیکن زلف کا افسانہ پورا نہ ہوا۔

۴۔ شرح : اسے غالب اجدائی کے شب و روز کا حال کچھ نہ پریم۔ محبوب کے رخسار اور زلف کا خیال صبح اور شام برابر رہا۔
شب اور روز، صبح اور شام، زلف اور رخ کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

شرح : استاد مالووس مت ہوا، گرچہ رونے میں اثر کم ہے
اسے استاد انا اتید
کہ غالب ہے کہ بعد از زاری بسیار ہو پیدا
نہ ہو۔ میں نے مانا
کہ رونے میں کچھ زیادہ اثر نہیں، مگر غالب ہے کہ زیادہ سے زیادہ رویا جائے تو
کچھ اثر پیدا ہو جائے۔

شرح : عمر میری ہو گئی صرف بہارِ حسنِ یار
ایک میں ہوں، جس
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عنذلیب
کی نہ میں محبوب کی

: بہار میں صرف ہو گئی۔ ایک طرف بیل ہے، جس کے ماہ و سال رنگِ بلبل میں اول بدل پر
موقوف ہیں۔ یعنی چمن میں کبھی بہار آتی ہے، کبھی خزاں ہوتی ہے۔ بہار و خزاں کے جتنا رخ
ہیں سے بیل کے ماہ و سال بنتے ہیں۔ میرے لیے ہر وقت حسنِ یار کی بہار ہے اور میں اس
کی خاطر سب کچھ قربان کیے بیٹھا ہوں۔

۱۔ لغات : جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھتے ہے اُصر انگشت
ایک دست :
یک تم، سارے کا

سارا۔

شرح :

میں جو صبر بھی جاتا ہوں
اور صبر ہی لوگوں کی
انگلیاں اٹھتی ہیں، سارا
بہاں مجھ سے پھر گیا
ہے، مگر انگلی نہیں
پھری۔

دست اور باقی

کی مناسبت حنائی
تشریح تھیں۔

شاعر کا مطلب

یہ ہے کہ لوگ میری طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ سب مجھ سے برگشتہ
ہوئے، البتہ انگلی برگشتہ نہیں ہوئی، بلکہ برابر میری ہی طرف اٹھتی رہتی ہے۔

۲۔ شرح : جب سے محبوب کے حنائی ہاتھ کی پور دیکھ لی ہے، ہر کی ہو کے
ایک قطرے کی صورت میں نظر آ رہی ہے

۳۔ شرح : میرے دل میں خون بالکل باقی نہیں رہا۔ وہ پورے کو پورا محبوب
کے ہاتھ رنگین رکھنے میں صرف ہو گیا۔ اب اس کی انگلیاں اسی طرح تڑپ رہی ہیں جس
طرح پھل پانی سے باہر نکال لینے پر تڑپتی ہے۔

مطلب یہ کہ میرا خون دل محبوب کی انگلیوں کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو پانی
کو پھل کے تعلق میں حاصل ہے۔

۴۔ شرح : تیری شوخی چھرا پورا مل کھول کر رکھ دیتی ہے۔ دل خوشکوار ہو چکا
ہے۔ اس کے بازو پورہ انگلی چمک کر دیتی ہے۔

ہر غنچہ گل، صورت یک قطرہ خون ہے
دیکھا ہے کسی کا جو خنابتہ سر انگشت
خون دل میں مرے جو نہیں باقی تو عجب کیا
جوں ماہی بے آب تڑپتی ہے ہر انگشت۔
شوخی تری کہ دیتی ہے احوال ہمارا
راز دل صد پارہ کی ہے پورہ در انگشت
میں اُلفتِ مرگاں میں جو انگشت نما ہوں
لگتی ہے مجھے تیر کی مانند ہر انگشت

مقصود یہ ہے کہ تو ہماری طرف انگلی اٹھاتا ہے اور شوخی سے کہہ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم چناب و یخزود ہو جاتے ہیں اور ہمارے عشق کا بھید کھل جاتا ہے۔

۵۔ لغات : انگشت تھا : جس کی طرف انگلیاں اٹھیں۔

شرح : ہیں مڑ گاہوں کی محبت کا شکار ہوں اور لوگ میری طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ ہر انگلی مجھے تیر کی طرح لگتی ہے۔
مڑ گاہوں کو تیز سے بھی تشبیر دیتے ہیں۔

۱۔ شرح : ہے سوانیزے پر اس کے قامت نوخیزے

محبوب ابھی جوان ہوا ہے اور اس کے قد نے

آفتاب صبح محشر ہے گلِ دستارِ دوست

اے عدوئے مصلحت چندے بہ ضبطِ افسردہ

کی ہے۔ سر پر دستار باغِ ہر گنتی ہے اور

گردنی ہے جمعِ تابِ شوخی و دیدارِ دوست

دستار پر مچھول لگا ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

آتشِ مے ہے بہارِ گرمی بازارِ دوست

یہ محبوب کے نام نہ نوخیز پر گلِ دستار ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے صبحِ قیامت کا آفتاب سوانیزے پر اگیا ہے۔

۲۔ شرح : اے مصلحت کے دشمن اجلدی ذکر۔ اپنے آپ پر ضبط قائم رکھ اور افسردہ و پشیمانی پر راز۔ تو ابھی دوست کی شوخی و دیدار کے قابل نہیں ہوا۔ اس

غرض سے رفتہ رفتہ طاقت و توانائی فراہم کر لینا ضروری ہے۔

۳۔ شرح : اے استاد! دوست کے جن کی گرم بازار ہی پہلے ہی کچھ کم دھن

صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی بہارِ فروغ پر ہے۔ پھر اس نے شراب پی لی۔ اس نے

نئے گرم بازار ہی کو تیز تر کر دیا۔ اب یہ صورت ہے کہ وہ قدم قدم پر لڑکھڑا رہا ہے اور جڑوں

سے نظارے کا جوش کھولاؤ گے اور بچے پر پتہ پڑا ہوا ہے ۔

دو عالم کی ہستی پہ غلطِ وفا کھینچ

دل دوستِ اربابِ ہمت ، سلامت

نہ اوروں کی سُننا ، نہ کہتا ہوں اپنی

سرِ خستہ و شورِ وحشت ، سلامت

و فورِ بلا ہے ، ہجومِ وفا ہے

سلامت ، ملامت ، ملامت ، سلامت

نہ فکرِ سلامت ، نہ بیمِ ملامت

ز خود رفتگی ہائے حیرت سلامت

رہے غالبِ خستہ مغلوبِ گردوں

یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

۱- شرح :

اربابِ ہمت کے ہاتھ

اور دل سلامت رہیں۔

پھر دونوں جانوں کے

وہ جو پر وفا کا خط کھینچ

وینا چاہیئے۔ لیکن جب

تک دونوں جہاں سلامت

ہیں ، ہمت والے بزرگ

دلوں اور ہاتھوں سے

سب کچھ ٹاٹتے رہیں

گئے۔ نہ اُن کے ہاتھ

ڑکیں گے ، نہ ان کے

دلوں میں تلگی پیدا ہوگی۔

۲- شرح :

نہ میں دوسروں کی

سُننا ہوں ، نہ اپنی کہتا ہوں۔ خدا کرے ، میرا زخمی سراور دیوانگی کا خود سلامت رہے۔

مطلب یہ کہ سر کی خفگی کے باعث اپنی کڑ نہیں سکتا اور دیوانگی کے شور کی بنا پر

دوسروں کی سُن نہیں سکتا۔

۳- شرح : وفا بدرجہ کمال موجود ہے اور بلاؤں کا ہجوم ہے۔ ایسی

حالت میں سلامتی کو ملامت سمجھنا چاہیے۔ یعنی سلامتی نصیب نہیں ہو سکتی

اور ملامت بدستور قائم رہے گی۔

- ۴۔ - شرح : سلامت کی فکر ہے، نہ سلامت کا ڈر ہے۔ ہم حیرت میں اپنا آپ کو کچھ نہیں اور وہی سلامت یعنی قائم علی جا رہی ہے۔
- ۵۔ - شرح : غالبِ خستہ آسمان کے اہل حقوں جبر و ظلم کا شکار بنا رہے۔ اسے حضرت سلامت ! اسے باری تعالیٰ ! یہ آپ کی عجیب بے نیازی ہے۔

شرح : آہنگِ اسد میں نہیں تجزِ نغمہ بیدل
اسد کی نئی میں بیدل
کے نئے کے سوا کچھ نہیں
عالم بہہ افسانہ ماوار و ماہیچہ
ساری دنیا جانا افسانہ ہے بیٹھی ہے اور ہم کچھ بھی نہیں۔

آخری مصرع بیدل کا ہے، اچھے میرزا نے مقلد میں تعین کر دیا ہے۔ یہ بھی اسی دور کی غزل ہے، جب میرزا پر بیدل کا بہت زیادہ اثر تھا۔

۱۔ لغات
نقاب : نقب
نکاح و نکاح
شرح :
میری نگاہ کے
منہاں خانے میں نقب
جتنی نگہ میری نہا نختہ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
تھا میں گلہ ستہ احباب کی بندش کی گیارہ
متفرق ہوئے میرے رنہ امیر کے بعد
نگاہیں تھی ہر جہاں انسان دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھتا ہے، انہیں بھی معلوم
کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے ریاکاروں کے لیے اپنا پردہ قائم
رکھنا بالکل ممکن نہ تھا۔ میں مر گیا اور دل کے مجید معلوم کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اب
ریا کار لوگ بے خوف زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بالکل یہی معنوں میں میرزا نے اپنے ایک مشہور فارسی قصیدے میں بھی پیش کیا ہے۔

حکم نقب پر گھنیزہ رو دھامی دو مژدہ با عاقل ریاکار مگر زبیدی اس رقم

۲۔ شرح : میں گھاس کا وہ تنکا کھتا ہوں جس سے گلدستہ احباب بندھا ہوا تھا میں
مر گیا تو میرے تمام رفیق اور دوست بکھر گئے۔

پھر لوں کو اکٹھا کر کے گھاس کے تنکے باندھ کر گلدستہ بنایئے ہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ
میں اپنے احباب کے گلدستے کے لیے گھاس بن گیا تھا۔ جس سے وہ بندھے ہوئے تھے۔
میں نہ رہا، گلدستہ کھٹ گیا اور رفیق اُسی طرح الگ الگ ہو گئے، جس طرح گلدستے کی بندش
کھٹ جانے سے پھول الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

لامتختہ آیا زخم تیغ یارب پہلو نشین ۱۔ شرح :

کیوں نہ ہووے آج کے دن بیکسی کی روح شاد آج کے دن بیکسی کی

ہم نے سوزِ خیم جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی روح کیوں نہ زندہ ہو؟

گلّی ہوا ہے ایک زخم سینہ پر خواہانِ داد اُسے تیغِ یارب کا زخم لانتہ

تیغِ درگفت، کفِ بربا آتا ہے قاتلِ اس درگفت آگیا جو پہلو میں آ بیٹھا۔

مژدہ ادا! اسے آرزو تھے مرگِ غالب مژدہ ادا مطلب یہ بیکسی

گیا۔ پھر بیکسی کی روح کیوں خوش نہ ہو؟ تھے، کوئی ہمارا رفیق اور

۲۔ شرح : ہم نے جگر پر سیکڑوں زخم کھائے، پھر بھی حرفِ شکایت ساتھی نہ تھا۔ آ زخم

زباں پر نہ لائے۔ پھول کو دیکھو، ایک زخم سینے پر لگا اور داد خواہ ہو گیا۔ تیغِ یارب پہلو میں آ کر بیٹھا

۳۔ شرح : آج قاتلِ تلوار لامتختہ ہیں جیسے آ رہا ہے اور غصے سے لوہوں
پر جھاگ آیا ہوا ہے۔ خوشخبری ہو، اسے غالب کی آرزو سے موت ملے گی

خوشخبری ہو!

بزم، دارغ، طرب و باغ، کشادہ پر رنگ

شمع و گل تا کہ پروانہ و بلبل، تا چند

نالہ، دامِ ہوس و دردِ اسیری، مسموم

شرح بر خود غلطیہا سے تھکل، تا چند

استیختہ گرفتارِ دو عالمِ اوہام

مشکلِ آساں کن یک غلطی، تغافل، تا چند

کے مطابق شادمانی کی بزم قائم نہ رہ سکی۔ باغ گوناگوں رنگوں سے پُر رونق تھا، اسباب رنگ آڑے ہمارے ہیں۔ شمع اور پھول، پروانہ اور بلبل کب تک رہ سکتے ہیں؟ بزم کی برہمی کے ساتھ شمع گئی اور پروانے بھی پھلتے پھٹے۔ باغ کی رونق رخصت اور پھول بھی دبے، ساتھ ہی بلبلوں نے رختِ سفر باندھ لیا۔

۲۔ لغات : بر خود غلطیہا : اپنے متعلق غلط انداز سے کرنا،

بے وجہ شبہاں مارنا۔

تھکل : برداشت، ضبط۔

شرح : آدھ و فریاد ایک جاں ہے، جو ہوس نے تیار کر لیا۔ قید میں جو

ڈکھ اور رنج پہنچتے ہیں، ان کے بارے میں کیا کہا جائے؟ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کب تک ضبط و برداشت کے جھوٹے دعووں کی شرح کرتے رہیں!

مطلب یہ کہ قید کا ڈکھ اور غم ناقابلِ برداشت ہے۔ اگر کوئی شخص برداشت کرے

تو سمجھنا چاہیے کہ اس کے دلو سے غلط ہیں اور آدھ و فریاد کرنا حقیقتِ درد کا اظہار نہیں بلکہ یہ بھڑک کا ایک بہانہ ہے۔

۳۔ شرح : خستہ حال غریب و درد مند است و وہاںوں کے دمہوں میں

ابھلا ہوا ہے۔ اسے وہ پاک فرات، جو مخلوق کی غلطیوں سے آلودہ ہے، اس سے کہیں
سے کب تک تغافل پڑتا جائے گا؟

کمالِ بندگی گل ہے رہیں آزادی

۱۔ شرح :

مہول کے عشق میں

غیر دنیا زد کو کمال پر

پہنچا، اس امر پر غفلت

ہے کہ ظاہر دوسرے

تعلقات سے آلودگی

حاصل کر لی جائے۔ اور

پروں کی ایک منہی اور

چند تنگ، جنہیں آفتیاں

کہا جاتا ہے۔ اس کے

بارے میں فریاد و فغان

کرتی چاہیے۔

ز دستِ مشیت، پرو خاںِ آشیں فریاد

نوازشِ نفیس آشنا کہاں، وہ نہ

ہر زنگِ نئے ہے نہاں، در ہر استخوانِ فریاد

تغافلِ اُس نہ دارِ خموشی دل، ہے

نبہوتی ہے محو بہ تقریبِ امتحانِ فریاد

ہزار آفت و یک جاہلی۔ بے نواسے اسد

خدا کے واسطے اسے شاہِ بے کساں فریاد

مطلب یہ کہ اگر میل مہول کی بندگی کو کمال پر پہنچانا چاہتی ہے تو لازم ہے کہ آشیانے

سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ جس آشیانے کا تعلق مہول سے عشق کا حق ادا کرنے میں حائل ہو۔

ہے، لہذا اس کے خلاف فریاد کرتی چاہیے۔

میرزا نے چند غلطوں میں ایک بہت بڑا مضمون پیش کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

انسان خدا کی بندگی کا داعی ہے تو اسے اس کی کسی چیز سے کسی بھی نوع کا سروکار نہ ہونا چاہیے۔

اگر اس میں ابھلا ہے گا تو ظاہر ہے کہ خدا کی بندگی کا حق روا نہ کر سکے گا۔

۲۔ لغات : نوازش : بہانہ۔

شرح : انوس ا بے کوئی ایسا سانس نہ ملے جو خدا کی حیثیت میں

بھانے پر آمادہ ہو، ورنہ نئے کی طرح میری ہڈی ہڈی میں فریاد مہمری ہوتی ہے۔

نئے کو سانس کے زور سے بھایا جاتا ہے۔ ہڈیاں اندر سے خالی ہوتی ہیں، اس لیے وہ کس سے مشابہ ہیں۔ مگر انہیں بھی کوئی آضا بین حقیقت خناس بھانے کے لیے سانس سے کام لے تو ہر ہڈی سے فریاد کے نوے نکلنے لگیں۔

۳۔ **شرح :** محبوب کے تغافل نے میرے دل کو خاموشی کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ میرا امتحان ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں فریاد بھی منظور نہیں دیر کے لیے رک گئی ہے۔

۴۔ **شرح :** ہزاروں آفتیں ہیں اور ایک بے فدا اسد کی جان ہے۔ اسے بیکوس کے بادشاہ اخلا کے لیے میری فریاد کو پہنچے۔

۱۔ **شرح :** ظلم کرنا گدا سے عاشق پر نہیں شاہانِ حسن کا دستور
جو عاشق فیر میں چکا ہو اس پر ظلم و ستم کرنا حق کے بادشاہوں کا دستور نہیں۔

۲۔ **شرح :** دوستو! میں ستم کا ماتہ چڑا ہوں۔ مجھ سے دشمنی ہے وصال کا مذکور
زندگانی پر اعتمادِ غلط ہے کہاں قیصر اور کہاں غفور
کیجئے جوں اشک اور قطرہ زنی دشمنی ہے۔

۳۔ **شرح :** اے اسد ہے ہنوز دلی قور
زندگی بے بہرہ سا کرنا

بالکل غلط ہے۔ مہلا تباد، قیصر اور غفور، جو جلیل القدر بادشاہ تھے، آج کہاں ہیں؟

۴- شرح : اسے اسدِ آتش کی طرح آپ بھی نظرہ زنی کرنے جا بیجے مینی
ابھی آپ کو بہت مشقت کاٹنی ہے اور دلی جو آپ کی منزل مقصود ہے، تفریب نہیں کاتی،
بہت دور ہے۔

بہر گردِ باد، حلقہٴ فتر اک بے خودی
مجنونِ دشتِ عشقِ تحیرِ شکار تر
اسے چرخِ خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات
لیکن بنائے عمدہ وفا استوار تر
آئینہٴ داغِ حیرت و حیرتِ شکستِ یاس
سیمابِ بقرارِ داسدِ بے قرار تر

۱- شرح :
جو گولہ اٹھتا ہے وہ
بیخودی کے شکار بند
کا ایک حلقہ ہے۔ عشق
کے صحرایہ مجنون پہلے
سے زیادہ حیر کا شکار
ہو گیا ہے۔

مطلب یہ کہ ہر
گولہ بیخودی کو بڑھا
رہا ہے اور مجنون کی وحشت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

۲- شرح : اسے آسمانِ کائنات کی بناوٹ کے سر پہ خاک ڈال۔ یعنی کائنات
کا انجام خواہ کچھ بھی ہو، ہرگز پروا نہیں، لیکن وفاداری کی بنیاد زیادہ بخت چاہیے۔
۳- شرح : آئینہٴ حیرت کا داغ ہے اور حیرت نا امیدی کا شکنجہ ہے۔ پارا
غیناب ہے اور اسدِ باد سے سے بددجا بڑھ کر قیاب ہے۔

۱- شرح :
نئی چیزیں پیدا کرنے
کی صفت کا قریب
نظارہ خط ہے۔ دیکھیے

قریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہِ عکسِ فروش و خیالِ آئینہ ساز

بدی نظر کس پہنچتی ز بسکہ جلوۂ مینا و حیرت آرا - ہے
ہے اور خیال آئینہ آڑی - ہے صفحہ نما / س سے صودت پرواز
سازمی کرتا ہے -

شعر میں ایک ہجوم فائر سے دل، مثل موج لرزے - ہے
غزل یہ ہے کہ آنکھ کے کہ شیشہ نازک و صہ پاسے اُگیں نہ گذار
تور میں پر دے پر جس

تھے کا کس پر مٹا ہے، وہی دل تک پہنچتا ہے اور انسان ایک لمحے سے بھی کم وقت میں ہاں
فیتا ہے کہ وہ کیا چیز دیکھ رہا ہے - یہ قدرت نے چیزیں بنانے کا ایک کارخانہ قائم کر رکھا
ہے - میرزا کہتے ہیں کہ یہ صنعت بھی ایک دھوکا ہے، لیکن دیکھنے کے لائق ہے -

۲- شرح : مینا کا جلوہ دیکھتے ہی ایسی حیرت طاری ہوئی کہ دل میں آڑنے
کی صورت ہی باقی نہ رہی -

۳- شرح : افکار کی کثرت سے دل موج کی طرح لرزنا مٹا ہے - یہ شیشہ
بہت نازک ہے اور اس میں شراب ایسی پڑ گئی ہے، جو شیشے کو گٹلا دینے والی ہے
ہجوم فکر کو شیشہ پگھلا دینے والی شراب اور دل کو نازک شیشہ قرار دیا -

۱- شرح : صد تبتی کمرہ - ہے حرف جبین غربت
میں غریب اول ہوں، پیرزن میں، ہے غبارِ شمرِ ملور ہنوز
لیکن میری پیشانی میں پا پُرازا آ بار راہِ طلبِ مے میں، ہوا
سیکڑوں جلی کہ سے بھی لاکھ آیا نہیں یک داغ انگور ہنوز
ہو گئے ہیں - یوں سمجھا گل لکھ، غنچے چلنے لگے اور مجمع ہوئی
ہا ہے کہ سرے لباس میں سرخوش خواب ہے وہ نرگس، مخمور ہنوز
کہ خود کی ہنگامی کا فہم ابھی باقی ہے -

۲- شرح : اسے اسد! تیرگی و غمت سے بظاہر ہے
 میں نے شراب کی طلب کے واسطے ہیں
 نظر آئی نہیں صبح شب دیجور ہنوز

جو بھاگ دوڑ کی اس کے باعث پاؤں پھالوں سے بھر گئے۔ شراب تو کیا تھا، ابھی
 تک انگوڑے کا ایک دانہ بھی ہاتھ نہیں آیا

”پاؤں کے ساتھ“ ”انگوڑے“ آپ نے کے ساتھ انگوڑے کی مناسبت ظاہر ہے اور یہ سب
 کچھ شراب کے لیے تنگ دود میں پیش آیا۔

۳- شرح : بھول کھل گئے کیاں چلنے لگیں، صبح ہو گئی، لیکن میرے محبوب
 کی مدد بھری آنکھیں ابھی تک مینہ میں مست ہیں۔

۴- شرح : اسے اسد! کھنڈ سیاہ کی تاریکی بالکل ظاہر ہے۔ جیسے تو اندھیرا
 رات کی صبح ابھی تک نظر نہیں آتی۔

۱- شرح : کوان آیا؟ جو چین بے تاب انتظار، ہے

جنتش سورج صبا ہے شوخی و تازی بارغ

آتشِ رخسارِ رخ بر گل کو بخشے ہے فروغ

ہے دمِ سرد صبا سے گرمی بازارِ بارغ

کون گل، سے خائف و خاموشی ٹپیل کرتے

۲- شرح : نے زبانی غنچہ گویا، نے زبانی خارِ بارغ

سے ہر بھول کے رنگ رخ کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اس سے معلوم ہو کہ بارغ کی گرمی

بازار صبا ہی گرم سرد کی بکلت ہے۔

۱- شرح :

کون آیا ہے، جس کے
 لیے بارغ و شوائی کے

انتظام میں بیتاب ہو

گیا ہے۔ یہ صبا سرد نہیں

رہی، بلکہ بارغ اپنی

شوخی و تازی بکھار رہا ہے۔

۲- شرح :

صبا کے شوق سے سانس

۳۔ شرح : ببل کے ضعف اور خاموشی کو کون چھوٹا تک پہنچا کے نہ لپنے کی زبان بولتی ہے ، نہ بان کے کانٹے کی زبان میں قوت لگاتی ہے ۔

۱۔ شرح : متی میرے ہی جلانے کو لے آؤ شاہ ریزا !
اے چنگاریاں برانے والی آہ کیا اثر میرا ہی
ہی گھر جلانے کیلئے
حقہ : افسوس کو تیری
کوئی چنگاری خیر یعنی
رجب کے گھر پر نہ
پڑی ۔

۲۔ شرح : پاشی جگہ بھی داں میں تو ہو کر خبار حیف
بنتا ، اسدا ! میں سرمہ چشم رکاب یار
آیا نہ میری خاک پہ وہ شمسوار حیف
میں کے مزاج پر خفاں
غالب ہو ۔ آہ ! بہار خزاں کے خوف سے گہرا رہی ہے ۔ خفتا کی خصوصیت ہی یہ ہے
کہ وہ ہر شے سے ڈرتا اور گہرا رہتا ہے ۔ یہی کیفیت پھول پر طاری ہے ۔ اس سے نتیجہ
یہ نکلا کہ بہار خزاں کے خوف سے ڈر رہی ہے ۔

۳۔ شرح : میری مشت خاک یعنی میری فائز سے محبوب مکتد رہے افسوس !
مجھے اس کے دل میں جگہ بھی ملی تو خبار بن کر ملی ۔

۴۔ شرح : اے اسدا ! میں محبوب کی رکاب کی آنکھ میں سرمہ نہ جاتا ۔ افسوس !
کہ وہ شمسوار میری خاک پر نہ آیا !

”خاک“ سے ہم بھی مراد لی جاسکتی ہے اور قبر بھی ۔

شرح :

قیامت تک ہماری عمر
جہاد کی مانت ہے میں

تاقیامت شبِ فرقت میں گزر جائے گی عمر

سات دن ہم پہ بھی بیماری ہیں سحر ہونے تک

ہیبت جائے گی۔ ہم پر صرف سات دن بیماری ہیں، پھر صبح ہو جائے گی۔

سات دن سے بظاہر مراد ایک ہفتہ ہے اور نہ صبحی کا دو دن ہفتوں میں ہی پورا ہو جائے گا

۱۔ شرح :

آنسوؤں کے ساتھ جگر
کے ٹکڑے بھی آگئے
ہیں۔ کہنا چاہیے کہ آنسوؤں
کا معاملہ بیش قیمت اصل
لے کر آیا ہے۔

آٹے میں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک

لایا ہے نعلِ بیش بہا کا رواں اشک

روئے نے طاقتِ اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار

شرکاء کو دوں فشار، پٹے امتحانِ اشک

ضرر میں جگر کے ٹکڑوں کو بیش بہا نعلوں سے تشبیر دی ہے۔

۲۔ شرح :

میں روتے روتے اس قدر کمزور ہوا توں ہو گیا ہوں کہ اتنی طاقت
میں نہیں رہی، آنسوؤں کی جانچ پڑتال کے لیے پلکیں ایک مرتبہ جھپکا ہوں۔
مطلب یہ کہ جھپکا کر دیکھ لوں، آنسو آتے ہیں یا نہیں؟

۱۔ شرح :

اے آرزو! تجھے
وفا کی شہادتِ غیب
ہوئی ہے، اس لیے
خون کی قیمت نہ مانگ
ہا ہے۔ حیرانِ مروت

اے آرزو! شہیدِ وفا! خوں بہانہ مانگ

جز بہر دست و بازو سے قاتلِ دعا نہ مانگ

برہم ہے بزمِ غنچہ، پر یک جنبشِ نشاط

کا شانہ بیکہ تنگ ہے غافل! ہوا نہ مانگ

ہیں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں

و دشمنِ سچے، دے نگاہ آشنا نہ مانگ

یہ ہے، غافل کے ہاتھوں اور بازوؤں کے لیے دعا مانگ کر وہ سلامت رہیں اور مجھے
موسم ترقی ملیں۔

۲۔ شرح : کلی کی فصل خوشی کی ایک ہی جنبش سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ یہ
گھر بہت تنگ ہے۔ اے غافل ! اس کے لیے ہوا کی طلب نہ کر۔

کلی خوشی میں اگر کبھی ہے اور اس کی شکستیاں مقوڑی ہی دیر میں درہم برہم ہو جاتی
ہیں۔ وہ ہوا کی آرزو مند ہوئی اور اپنی ہستی ختم کر ڈیٹی۔ اے غافل ! تو اس سے سبق
لے، تیرا گھر نہایت تنگ ہے، اس لیے ہوا کا طلب گار نہ ہو، اس کے آتے ہی تیرا گھر بھی
سلامت نہ رہے گا۔

شرح : مرگاہاں تنگ رسائی لغت جگہ کہاں
جگر کے ٹکڑے بکوں
اے داسے گر نگاہ نہ ہو آشنا سے نکل
تک نہیں پہنچ سکتے۔

جب یہ ممکن نہیں تو انوس ! اگر تیری نگاہ پھول کی آشنا نہ ہو۔
مطلب یہ کہ اگر ٹو بگر کے ٹکڑوں کو مرگاہاں تک نہیں لاسکتا تو کم از کم پھول کی خفیقت
سے تو آشنا ہو جا، جو کہتے ہی سر پاخون ہو جاتا ہے۔

۱۔ شرح : بد ہے آشیہ طاق ہلال
ہلال کا طاق، اہ کمالی کا
آشیہ ہے۔ یعنی ہلال
ہر حال میں بد رہنے
کا۔ ناکو ! یہ نقصان
میں کمال نمایاں ہے۔
ہلال یعنی نیا پانہ نقصان
ہلال کا طاق، اہ کمالی کا
آشیہ ہے۔ یعنی ہلال
ہر حال میں بد رہنے
کا۔ ناکو ! یہ نقصان
میں کمال نمایاں ہے۔

ہلال کا طاق، اہ کمالی کا
آشیہ ہے۔ یعنی ہلال
ہر حال میں بد رہنے
کا۔ ناکو ! یہ نقصان
میں کمال نمایاں ہے۔
ہلال یعنی نیا پانہ نقصان
ہلال کا طاق، اہ کمالی کا
آشیہ ہے۔ یعنی ہلال
ہر حال میں بد رہنے
کا۔ ناکو ! یہ نقصان
میں کمال نمایاں ہے۔

ہو جو بابل پر و فکیر اسد
 غنچہ منقار گل ہو زبیر بال
 کی خلاصت ہے۔
 وہی جلال برحق ہے
 اپنا نقصان پورا کر کے
 ماہ کامل بن جاتا ہے، گویا نقصان ہی سے کمال پیدا کرتا ہے۔

۲۔ شرح : اے خدا ! سورج کو دشمنی صرف تیرے نور سے ملتی ہے۔ اگر
 یہ نور اس کے لیے ضیاء بخش نہ ہو تو اس کی حیثیت ایک دوست سوال کے سوا کیا ہے !
 یعنی ایک بدلتا ہے، جو مانگنے کے لیے پھیلا ہوا ہے۔

۳۔ شرح : میرے محبوب کا قامت فتنے پیدا کرتا ہے۔ اس کے سامنے
 قیامت کا خوف بھی سایہ کی طرح پامال ہے۔

۴۔ شرح : اگر ہل اسد کے منہ لکڑی کی پروسی کرے تو اس کی پونچ کی کل
 پروں کے نیچے خود خود پھول بن جائے۔

ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل
 ہوں زلف یار ہوں میں سرا پا شکستہ دل
 شرح :
 میرا جوڑ جوڑ غم کے
 ہاتھوں شکن کی مانند
 دل شکستہ ہے۔ میں سر سے پاؤں تک زلف محبوب کی طرح ایک ٹوٹا ہوا دل ہوں۔

۱۔ شرح :
 اے صبح وصال آج
 اپنی غلط نہیں سے
 آگاہ ہو گئے۔ ہیں
 معلوم ہوا کہ غم کے
 پردے میں تو ہی عشق
 ہم غلط سمجھے تھے، لیکن زخم دل پر رحم کر
 آخر اس پردے میں تو ہستی تھی اے صبح وصال
 شکوہ درد و درد داغ اے بے وفا معذرت کے
 خوں بہائے یک جہاں تمید ہے تیرا خیال

مقصود اب اس پر دم کر۔ اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
مطلب یہ کہ صبح وصال اُس کو نصیب ہوتی ہے جس کا دل زخمی ہو۔
مالِ سخی کو مباح اور خونِ صوفی کو حلال

۲۔ شرح : میرا شکوہ دردِ جنا، درد نے دارِ کی صورت اختیار کر لی۔ اسے
بے وفا اگلے معذور سمجھ۔ حیرا خیال امید کی لچر میں دنیا کا فوضیہا ہے۔
۳۔ شرح : اسے اسد! میں اُس تم پیشہ محبوب پر عاشق ہوں، جس کے
نزدیک شنی کا مال ہاتھ اور صوفی کا خون حلال ہے۔

اس شعر سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ میرزا اپنے آپ کو سُنی اور صوفی دونوں
قرار دے رہے ہیں۔

۱۔ شرح : اگر بھول آواز بھی ہیں غنچے سے، منقارِ بابل وار ہو، فریاد، غل
انجام کو یاد کرے تو کی سچی عاشق ہے فردغ افزائے آپ رشتے کار
کی حالت میں ہی ہیں کی ہو گئی کی طرح سراپا فریاد
ہے شرارِ تیشہ بہرِ تربت فریاد، غل
ہی ہائے۔

۲۔ شرح : عاشق کی سخی دکھ کشش ہی سے اس کے کام میں رونق اور
زیب و زینت زیادہ ہوتی ہے۔ دیکھیے، فردا نے ہنسر پر تیشہ چلایا۔ اس سے جو شیط
لکے، وہی اس عاشق کی قبر کے لیے پھول بن گئے۔

شرح : شوق بے پردا کے ہاتھوں مثلِ سائہِ نادرست
دلِ شوق ہے چرما کی بیچتا ہے آج نالے خارجِ آبِ تنگ ہول
میں مبتلا ہے اور بکولے

ہوئے ساز کی طرح بے سُر سے ناسے کھینچ رہا ہے۔

”شوقی بے پروا“ کا مطلب ہے وہ عشق، جو ہر شے سے بے پروا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بے سُر ہی فریاد و فغاں میں کہیں کوئی پاک نہیں۔ ایسی فریاد و فغاں کو گلو سے ہوئے ساز کی صدا قرار دینا بے محذوزوں ہے۔

۱- شرح : بہ قدرِ حوصلہ عشق جلوہ ریزی ہے
وگر نہ خانہ آئینہ کی فضا، معلوم
عشق کی ہمت کے مطابق انوار کی بارش

ہوتی ہے، ورنہ آئینہ ظلمت کی فضا میں کیا رکھا ہے؟
مراد یہ ہے کہ انسان عشق میں جو درجہ حاصل کرے، اسی کے مطابق دل میں روشنی پیدا ہوگی، ورنہ دل میں بجائے خود کیا رکھا ہے؟

۱- شرح : فرطِ بے خوابی سے ہیں شہا تے ہجر یار میں
جوں زبانِ شمع، دواغِ گرمی افشانہ ، ہم
بیکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمع ماتم خانہ ہم
محبوب سے جدائی کی راتوں میں ہم سو نہ سکے
اور زبانِ شمع کی طرح گرمی افشانہ کا دل داغ بنے رہے۔

مطلب یہ کہ جدائی میں داستانِ درد سناتے رہے، جس طرح شمع جل جل کر سوز کی داستان سناتی ہے۔ آخر اس جلن کے باعث ہم نے داغ کی صورت اختیار کر لی۔

۲- شرح : ہمارا محبوب غیروں کی محفل کا چشم و چراغ بنا ہوا ہے اور ہم ماتم خانے کی شمع کی طرح چپکے چپکے جل رہے ہیں۔

۱۔ لغات :
شعلہ درودن :
شعلہ کاٹنا، یعنی شعلہ
مائل کرنا۔

نفس ہر نہ معزول شعلہ درودن
کہ غبطہ تپش سے سرور ہیں ہم
تماشا مے گلشن، تمنائے چہرین

شرح :
ہم دل کی تپش کو غبطہ
کر کے چنگاریاں بوسے
ہیں۔ اس سے شعلوں
کی فصل تیار ہو رہی ہے
ہمارے سانس کو چلیے
کہ شعلوں کی فصل کاٹنے
سے باز نہ رہے اور
بدستور یہ پیداوار جمع کرتا جائے۔

بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم
نہ فوق گریباں نہ پودائے داماں
نگہ آشتائے گل و خار ہیں ہم
استد! شکوہ کفر و دمانا سپاسی
ہجوم تمنائے ناچار ہیں ہم

۲۔ شرح :
ہم نے کائنات کا باغ دیکھا اور اس سے پھول پھننے کی تمنا پیدا
ہوئی۔ اسے بہار پیدا کرنے والی ثابت پاک! یہیں پہنے گناہوں کا اقرار ہے۔
مطلب یہ کہ اس دنیا کی کسی چیز سے ہمیں سروکار نہ ہونا چاہیے تھا اور لازم تھا
کہ تیرے سوا کسی کی تمنا نہ رکھتے، لیکن تیری بہار آفرین کی بدولت ہمیں مختلف چیزیں پیاری
لگیں اور ان کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ گناہ تھا اور ہیں اس کا اقرار ہے۔

۳۔ شرح :
ہمیں نہ گریباں کا ذوق ہے اور نہ دامن کی پروا ہے۔ ہم پھول اور
کانٹوں سے آشنا ہو چکے ہیں۔ یعنی پھول گریباں چاک کر لیتے ہیں، کانٹے دامن الجھا لیتے ہیں۔
جب ہم نے ان چیزوں سے آشتائیں پیدا کر لی تو گریباں دامن کو پھانٹے رکھنے کی کیا صورت
باقی رہی؟

۴۔ شرح :
اسے استد! شکایت کرنا کفر ہے اور دمانا شکر گزاری کی دلیل

ہے۔ آہ! تمنائیں اتنی پیدا ہو گئیں کہ ہم بالکل بے بس رہ گئے۔

مطلب یہ کہ تمنائوں کی فراوانی نے ہم سے شکایت بھی کرائی اور دعا بھی۔ پہلے دعا کرتے رہے کہ یہ تمنائیں پوری ہو جائیں پوری نہ ہوئی تو شکایت شروع کر دی، حالانکہ دونوں چیزیں غلط تھیں دعا کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ اس نے دیا، اس پر ہم نے تقاضا نہ کی، اس طرح کفر کے مرتکب ہوئے۔ شکایت اس لیے کی کہ جو کچھ اس نے عطا کیا تھا، اسے کافی نہ سمجھا۔ یہ صریح ناکھ گزاری تھی۔ ہم اپنا ذکر کرتے، اگر اردوؤں کی فراوانی ہمیں بے بس نہ کر دیتی۔

صبر اور یہ ادا کہ دل آوے اسیرِ چاک

۱۔ شرح :

دعویٰ صبر کا کر رہا ہوں

درد اور یہ کہیں کہ رہِ نالہ وا کروں

اور حال یہ ہے کہ چاہتا

ہوں، دل چاہ گریاں میں فید ہو کر آئے۔ یعنی گریاں چاک کروں، تو دل میں ساتھ نکل آئے۔ درد ہو رہا ہے اور اس گھٹا ہٹ میں بیٹھا ہوں کہ آہ و فریاد کو کوئی راستہ کھل جائے تاکہ دل کی بھڑاس نکل جائے۔

وہ التماس لذتِ بیداد ہوں کہ میں

۱۔ شرح :

مجھے ظلم و جور کی لذت

کا اتنا شوق ہے کہ

تیغِ ستم کو پشتِ خیمِ انتخاب کروں

وہ بے دماغ منتِ اقبال ہوں کہ میں

اس کے لیے باتا عہد

التماس گزار رہتا ہوں

وحشتِ بدوارِغِ سائے بالِ ہما کوں

اور التماس بھی عام طریقہ

پر نہیں، بلکہ ظلم و جور کی توار کے غم کو دینی پیشہ کا فم بنا کر اٹھا کرنا ہوں۔

۲۔ شرح : اقبال کی احسان مندوں سے میں اتنا گھبراتا ہوں اور پریشاں ہوتا

ہوں کہ اگر چھا کے پردوں کا سایہ عجب پر پڑ جائے تو اس کا داغ دیکھ کر دُور بھاگ جاؤں۔
 چھا کا سایہ بہت باہر گت مانا جاتا ہے اور اسے اقبال مندر ہی کی دلیل سمجھا جاتا ہے،
 لیکن غالب اس سے اتنا گھبراتے ہیں کہ سایے کا داغ بھی کہیں دیکھ لیں تو دُور
 بھاگ جائیں۔

۱۔ لغات : فلکِ سفلی بے محابا ہے
 بے محابا، بے ترس۔
 شرح : اس ستم گر کو افضال کہاں
 کینہ آساں بالکل ہے
 بوسے میں وہ مضائقہ نہ کرے
 ترس اور بے رحم ہے۔
 پر مجھے طاقتِ سوال کہاں
 اس ظلم کو اپنے کسی
 نظم پر شرمندگی کہاں ہوگی؟

۲۔ شرح : میں سمجھتا ہوں کہ محبوب بوسہ دینے میں تائی نہ کرے گا، لیکن
 مجھ میں ایسا سوال کرنے کی قوت ہی کہاں رہی ہے، ضعف کا یہ عالم ہے کہ کوئی سوالِ باہن
 پر ابھی نہیں سکتا۔

لغات : آنسو کہوں، کہ آہ ! سوار ہوا کہوں؟
 عنانِ گیسختہ :
 ایسا عنانِ گیسختہ آیا کہ کیا کہوں؟
 بگ ٹٹ، جلمہ پٹہ
 تیز رفتار۔

شرح : محبوب اتنی تیز رفتاری سے آیا کہ سمجھ میں نہیں آتا، اس آمد کو
 کس چیز سے تشبیہ دوں؟ آنسو کہوں، جو بے اختیار آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے یا یہ
 کہوں کہ ہوا کے دوش پر سوار آیا۔

میتر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب

شرح :

اے غالب! میر تقی

کے شعر و سخن کی کیفیت

کہا بیان کروں؟ اس کا دیوان تو رولق، رولقانی اور بہاریں باغ کثیر سے کم نہیں۔

یعنی اس میں نہایت دکشا اور سنگفہ مضامین کی فراوانی ہے۔

کسی کو زخورد رستہ کم دیکھتے ہیں

شرح :

ہم نے کسی کو اپنے تعلق

سے باہر نہ لکھا ہوا اور

کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں

یہ خود نہت کم دیکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہرن بیخود ہو کر بھاگتے ہیں، ہم نے تو انہیں

بھی دوڑ کے پابند دیکھا ہے، یعنی انہیں بھی از خود رفتہ نہیں کہا جاسکتا۔

ناگوارا ہے جہیں احسانِ صاحبِ دولت

شرح :

ہیں دولت والوں کا

احسان ہرگز گوارا نہیں

ہے زیرِ گل بھی نظر میں جو ہر فولادیاں

اور کیوں گوارا ہو! ہم تو پھول کے زیر سے کو بھی فولاد کے جوہر دیکھتے ہیں۔

پھول میں جو زیرہ ہوتا ہے اسے زیرِ گل کہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں زرخیز ہوتا،

لیکن میرزا کو دو تہندوں کے احسان سے اتنی وحشت ہے کہ نہ گل کو بھی، جو عرضِ برائے نام

نہ ہے، فولاد کے جوہر کی طرح کاٹ ڈالنے والی چیز سمجھتے ہیں۔

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چین

۱۔ شرح :

بہار کا موسم آگیا، اب

نزاکت باغ کی تعمیر میں

قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشکِ دیوارِ چین

مصرفت ہے کیفیت
وقت ہے گر ببل مسکین زلیخائی کرے
یہ ہے کہ باغ کی دیوار
یوسف گل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چین
وہ بھی پھول کے قالب میں ڈھالی گئی ہیں۔

مقصود یہ ہے، فصلِ بہار میں باغ اس درجہ تروتازہ اور شاداب ہو گیا ہے
کہ وہاں کی کوئی بھی چیز محنت نہیں رہی، بلکہ مدور و جرم، ظلم اور تازک بن گئی،
یہاں تک کہ دیوارِ چین میں بے شمار پھول آگ آئے ہیں۔ دیکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ
پوری دیوار کی آئینیں قالبِ گل میں ڈھلی ہیں۔

۲- شرح : وقت آگیا ہے کہ ببل مسکین زلیخا کا منصب اختیار کرے،
کیونکہ پھول کے یوسف نے باغ کے بازار میں جلوہ دکھانا شروع کر دیا ہے۔

۱- شرح : کس دل پہ ہے عزم صفِ مژگانِ خود آرا
آئینے کی پایاب سے اتری ہیں سپاہیں
دیرو حرم آئینہ تکرارِ تمت
واماندگی شوق تراشے ہے پنا ہیں
اے محبوبِ اتیری
پلوں کی صفِ اچھ
آپ کو آراستہ کر کے
نگلی ہے۔ قرا بتا کر اس
صف نے کس کے

دل کا قصید کہا ہے اور کس پر حملہ مقصود ہے؟ آئینہ ساٹنے دیکھ کر تو نے جو یہ فوج
تیار کی ہے، اگر یا یہ آئینے کا دنیا پیدل عبور کر کے آئی ہے۔ یہ کس پر چڑھ کرے گی؟

۲- شرح : ہنخانہ اور کعبہ کیا ہیں؟ محبوبِ حقیقی کی آرزو دل میں تازہ کرنے
کے آئینے ہیں۔ یہی دونوں بجز اُس محبوب کی آرزو و ہوائی جا رہی ہے۔ ہم سے پوچھو
تو کہیں کہ حقیقی چلتے چلتے جھک گیا تو اس نے کچھ دیر ستانے کی غرض سے پناہ گاہیں
تھاں لی ہیں۔

۱۔ لغات :
متصل : لگاتار،
مسل۔

شرح :
میں ان آنسوؤں کی
تبیح ہوں جو شراب
سے چپکے گویا میری
ساری عمر مسلسل تلمے
گھٹنے میں بسر ہو گئی۔

آنکھوں سے
مسل آنسو چپکے کر
اختر شدہی قرار دیا۔

۲۔ شرح :
میری شکل ہی سے
افسوس کی غلاتیں

نایاں ہیں۔ میری مثال
کنگھی کی ہے جو پائیل
دست کو دانہ خور سے
جھانٹے ڈالتی ہے۔

۳۔ شرح :
بھگہ لینا چاہیے کہ میں اُس

کی متصل ستارہ شناسی میں عمر صرف
تبیح اشکبارے زمشگاں چکیدہ ہوں
ظاہر ہیں میری شکل میں افسوس کے نشان
ہوں شانہ پشت دست بردن داں گزیدہ ہوں
ہوں گرمی نشاط تصور سے نعمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں
پیدا نہیں ہے اصل تگ و تازہ جستجو
مانند موج آب، زبان بریدہ ہوں
سر پرے دباں ہزار آردو رہا
یارب! میں کس غریب کا بخت رسیدہ ہوں
میں بے بہر کہ جو ہر آئینہ متعاقبت
پائے نگاہ خالق میں خارِ غلیہ ہوں
میرا نیاز و عجز ہے معنتِ بتان، اسد
یعنی کہ بندہ بہ درم نا خریدہ ہوں
میں تصور ہی میں میل و نشاط کے جوش سے لہنے گار ہوں۔ سمجھ لینا چاہیے کہ میں اُس
بارغ کی بیل ہوں، جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

۴۔ شرح : کچھ معلوم نہیں کہ میں جتنوں میں جو دوڑ دھوپ کر رہا ہوں،

اس کا مقصد اور عرض و غایت کیا ہے ؟ میں پانی لہری کی طرح کٹی ہوئی زبان ہوں۔
 موج آب : کوتاہ زبان بڑی دھمکا ، بوسنایت سوز و تشنید ہے ۔ ساتھ ہی یہ
 واضح ہو گیا کہ موج آب ہر وقت تلک و دو میں لگی رہتی ہے ، لیکن اس کی تلک و دو کا مقصد
 واضح نہیں ۔ چند لفظوں میں ایسے عجیب و غریب مساوی اس خوبی و دلاؤ پر مبنی سے جمع کر
 دینا واقعی ادبی سمجھ ہے ۔

۵۔ لغات : بختِ رمیدہ : بھاگا ہوا نصیب ، ناسازگار بخت ، پھوٹی
 ہوئی قسمت ۔

شرح : میری گردن پر ہزاروں آرزوؤں کا وبال موجود ہے ، یعنی جتنی
 آرزوئیں کہیں ان میں سے کوئی بھی پوری نہ ہوئی اور ان کا وبال سر پر رہ گیا۔ اسے خدا !
 میں کس عریب کی پھوٹی ہوئی قسمت ہوں ؟
 آرزو پوری ہو جائے تو وہ خوش نصیب کی دلیل ہے ، پوری نہ ہو تو اسے نصیب کے
 سر پر وبال سمجھنا چاہیے ۔

۶۔ لغات : خارِ غلیبہ : چبھا ہوا کاٹا ، کھٹکا ہوا کاٹا ۔

شرح : آپ مجھے بے ہنر سمجھ لیں ، لیکن میں آئینے کا بوہر خطا ، یعنی
 فوادی آئینے کی ساری قدر و قیمت میری وجہ سے ہٹی ۔ اسوس کہ کسی نے قدر و قیمت
 نہ پہچانی اور دنیا نے مجھے پاسے نگاہ میں کھٹکا ہوا کاٹا سمجھ لیا ۔
 کاٹنے اور جوہر کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں ۔

۷۔ لغات : مفتِ بیتاں : بتوں کے لیے بلا قیمت ۔ کچھ خرچ کیے
 بغیر بتوں کے لیے حاضر ۔

شرح : اے استاد ! میری نیاز مندی اور عاجزی حسینوں کے
 لیے مفتِ حاضر ہے ۔ انہیں کچھ خرچ نہ کرنا پڑے گا ۔ گویا میں غلام ہوں ۔ جو دام و دم
 دے بغیر خرید لیا گیا ۔

لغات :

نہ افشا، معنی مضمون، نہ افلا، صورتِ موزوں

ہرزہ عنوان : ہیں

عنایت نامہ ہائے اہل دنیا ہرزہ عنوان ہیں

کہتے ہیں بے معنی ہوں۔

یعنی ایچفظ، جن سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔

شرح : اہل دنیا جو عنایت نامے لکھتے ہیں، وہ بیلے ہیں، جن سے کسی کو

کوئی فائدہ نہ پہنچے، کیونکہ نہ ان کی عبارت سے کوئی مضمون نکالا جاسکتا ہے اور نہ ان

کی لکھائی کی صورت درست ہوتی ہے۔

جس خط کا اطلاق درست اور عبارت بے معنی ہو، اس سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ

سکتا ہے ؟

۱- لغات :

اے نواساز تماشا، سر پر کف جلتا ہوں میں

نواساز تماشا :

اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں،

نظارہ دیکھ کر غرض

شمع ہوں لیکن ہر پاؤں رفتہ خارِ جستجو

سے گیت گانے والا،

مذہا گم کردہ ہر سو، ہر طرف جلتا ہوں میں

یعنی غرض ہونے والا۔

ہے تماشا گاہِ سوز تازہ ہر یک عضو تن

شرح :

جوں چراغِ دہلی صاف بہ صاف جلتا ہوں میں

اے بے دیکھ کر غرض

شمع ہوں تو بزم میں جا پاؤں، غالب کی طرح

ہونے والے میں سر

بے محل، اے مجلسِ آراے نجف، جلتا ہوں میں

بجھل پر رکھ کر محلِ ربا

ہوں۔ ایک طرف میرا

دل ہل رہا ہے اور

ایک طرف میں خود جاگ

لگی نذر ہو رہا ہوں۔

۲- **شرح :** میں شمع ہوں، لیکن ایسی شمع، جس کے پاؤں میں جھنجھو کا کاٹا چھ گیا ہو۔ میرا اصل مقصد گم ہو گیا، اب ہر طرف جلتا پھرتا ہوں۔ اسی حال میں کاٹنا چھ گیا۔ غرض کہ مقصد کو تلاش کر رہا ہوں، وہ نہیں ملتا۔

۳- **شرح :** میرے جسم کا بوڑھوڑ نمٹ رہی ہے کی تان لگا رہی ہے۔ میری کیفیت ڈوبوئی کے چرائیوں کی ہے، جو قطاروں میں بھلا کرتے ہیں۔

۴- **شرح :** اگر میں شمع ہوں تو مجھے غالب کی طرح کسی محفل میں جگہ مل پانی چاہیے۔ اسے بختِ اشرف میں مجلسِ آراستہ کرنے والے بزرگ ۱۱ سے حضرت علیؑ اب تو میں بے موقع و بے محل رہا ہوں۔

۱- **شرح :** آ نکھوں میں آنسو اٹھ آئے ہیں، لیکن دل کے مست ہونے کا موقع اور محل ان آنسوؤں سے آگے ہے یوں بھیجے کہ ہمارا ایک شراب خانہ دریا کے پار بھی ہے۔

ہزار دل پر ہم اک اختیار رکھتے ہیں
بساطِ ہچکی میں بزمِ ریگ رواں
ہزار دل بہ وداع قرار رکھتے ہیں
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالب !
بسانِ دشتِ دل پر غنبار رکھتے ہیں
مطلب یہ کہ خوب روئیں گے تو دل حسرت و بیخود ہو جائے

۱۔ گویا آنسوؤں کا دریا جو رگ رگ میں گئے تو شربتِ خانے میں پہنچ جائیں گے۔

۲- **شرح :** ہمارا رونا بے خوف و خطر جاری تھا۔ ہم نے ضبط سے کا

لیا اور وہ تسبیح بن گیا۔ دیکھیے، آنسوؤں کے ہزاروں قطرے دلوں کی خشیت رکھتے ہیں، لیکن ہمیں ان سب پر قابو حاصل ہے۔

۳۲۔ **شرح :** ہم بالکل بے مایہ ہیں۔ ہمارے خشیت کچھ نہیں، لیکن ہر لحظہ جلتی ہوئی ریت کی طرح ہمارے پاس ہزاروں دل ہیں، جو برابر ضبط و صبر کو رخصت کرتے رہتے ہیں۔

ریگِ رواں صحرایِ وہ ریت، جو ہوا سے ہر لحظہ جگہ بدلتی رہتی ہے اور دوسے دیکھیں تو پانی کی طرح بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے ذائقے کہیں ٹھہرتے نہیں، بلکہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ شاعر نے ان ذروں کو دل قرار دے لیا، جو ضبط و صبر سے یکدم غالی ہوں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ریگِ رواں بالکل بے مایہ ہوتی ہے اور کسی کام نہیں آسکتی، لہذا اسے بچکس کہا۔

۳۴۔ **شرح :** اے غالب! ہمیں کچھ بڑے ہوئے دوستوں کی جہانی نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ہمارا دل بھی صحرایِ طرح غبار سے بھرا ہوا ہے۔

ہوئی ہیں آبِ شرم کو شش بے جا سے تدبیریں : **شرح :**
عرقِ ریز پیش ہیں موج کی مانند زنجیریں
تمام تدبیریں بے سود
کوشش کی شرم سے
پانی پانی ہو گئیں۔ دیوانوں کو زنجیریں پہنائی گئیں، پیش کے باعث ان سے لہروں کی طرح پسینہ چھلنے لگا۔

تدبیریں یہ تھیں کہ دیوانوں کو زنجیریں پہنا دی گئیں تاکہ وہ دیوانگی کا مظاہرہ نہ کرنے پائیں، لیکن یہ کوششیں بے سود تھیں، لہذا ناکام ثابت ہوئیں۔ دیوانگی کے جوش سے زنجیروں کو پسینہ آگیا اور لہروں کی طرح نیچے گرنے لگا، گویا یہ کار ہو گئیں۔

شرح : کس کو دُور یارب! حساب سوز تاکیہا سے دل

اے میرے اشد! میں اپنے دل کی بہن
آمد و رفتِ نفسِ جزو شعلہ پیمانی نہیں
کاحساب کے دُور؟ میں یہ سیر لیتا چاہیے کہ سانس کا آنا جانا شعلے ناپختے کے سوا
کچھ نہیں۔

مطلب یہ کہ سانس آمد و رفت میں شعلوں ہی پر چلتا رہتا ہے۔ اس کا حساب
کون کر سکتا ہے۔

۱۔ لغات : ہو سکے کب تکلفتِ دل، مانعِ سیلانِ اشک
تکلفت : تکلیف۔
سختی، بے چینی۔

شرح : ہے طلسمِ دہر میں صدِ حشرِ پاداشِ عمل
دل کی تکلیف آنسوؤں
آگہی غافل کہ یکِ امروز بے فردا نہیں
کا جوش نہیں روک
سکتی۔ مثال یوں بھیجے کہ ساحلِ دریا کی مٹی دریا کے بہاؤ میں نہکاؤ پیدا نہیں کر سکتی۔

۲۔ شرح : زمانے کا علم ایسا تیز کیا گیا ہے کہ اس میں ہر عمل کے بدلے
کے لیے سیکڑوں محسوس ہو رہے ہیں۔ لیکن انسانی طورِ غافل ہے اور نہیں جانتا کہ یہاں آج
تک کوئی امروز پیدا نہیں ہوا، جس کے ساتھ فردا نہ لگے ہو۔ یعنی انسان آج جو کچھ
کرتا ہے، کل اس کا بدلہ مل جاتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم سمجھیں کہ یہاں ہر وقت حشرِ پاداش ہے،
انسانی اعمال کا جائزہ لیا جا رہا ہے، ساتھ ساتھ بدلہ دیا جا رہا ہے!

۱۔ لغات : ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزالت : اگر شہر گری
عزالت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
تنبہائی۔

شرح :

دیکھیے، موتی جیٹنگ
پہی کے گوشہ میں رہتا
ہے اس کی کوئی قیمت
نہیں ہوتی یہی ہے
نکل کر اس پر آجے تو

باعث ایذا ہے برہم خوردین بزم سرور
لحنت لحنت شیشہ بشکت جز نشتر نہیں
کب تلک پھیرے اسد بہائے تفتیہ رزباں
حلاقت لب تشنگی، اسے ساقی کوثر نہیں

کبھی تاج و تخت کی زینت بنتا ہے، کبھی بارہن کرسیوں کے گلے میں پہنتا ہے۔ یہ کوہِ بیت
اہل دل کی ہے۔ وہ جب تک وطن میں رہیں، ناقدری کا شکار نہ ہوتے ہیں۔ وطن سے باہر نہیں
تو قدر و منزلت پاتے ہیں۔

۲۔ شرح : عیش و سرور کی محفل درہم برہم ہو جائے تو ڈکھ کا باعث ہوتی
ہے۔ شیشہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے تو ہر کچھ نشتر کا حکم رکھتی ہے اور نشتر کا چھنا
باعث ایذا ہے

۳۔ شرح : اسے ساقی کوثر! اسد پیاس برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔
آخر آپ کا اسد کب تک اپنے جھنڈے ہوئے لبوں پر دباں پھیرے گا گزارہ کر رہے؟ اس
چہرہ فرمائیے اور لطف و کرم سے اس عاجز کی پیاس بجھائیے۔

۱۔ شرح :

اگر محبوب کے قدم کی یاد
میں تم کی آگ کے شعلے
بلند ہوں تو جگر کا ایک
ایک داغ صبح قیام
کا سورج بن جائے۔

بہ یادِ قیامت اگر ہو بلند آتشِ غم

ہر ایک داغِ جگر، آفتابِ محشر ہو

ستمکشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا

اب اس سے ربط کروں جو بہت شکر ہو

۲۔ شرح : دل نے غم و جور پہنے کا حوصلہ پیدا کر دیا۔ اب میں اُسی محبوب سے

رہا خط سطر پیدا کر دیا گا، جو بعد وہ ہر عالم ہوتا کہ وہ سنا تھے اور دل بھٹا اٹھائے۔

۱۔ شرح : بے درد سر بہ سجدة آفت نذر نہ ہو
درد و عشق کے بغیر سر
جو اٹھ شمع غوطہ داغ میں کھلا، گرد و غبار نہ ہو
کو محبت کے سجدے
یہ بھٹکانا چاہیے۔
زلف خیال نازک و نظار بے قرار
اگر تجھے دغ و غم نہیں تو شمع
یارب! بیان شانہ کشی گفتگو نہ ہو
کی مابعد داغ میں غوطہ
تمثال ناز جلوہ نیرنگ اعتبار
لگائے۔
ہستی عدم ہے آتشہ غمردہ، مد نہ ہو
حق جلتی ہے تو کھیل کھیل کر اس میں سے فکرے نکلتے دھتے ہیں یہی اس کا دغ ہے۔
یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ محبت درد کی متقاضی ہے

۲۔ شرح : خیال کی زلف نازک ہے اور قوت اظہار بختیاب ہو رہی ہے۔ اسے
میرے لہو! بیان کہیں! بعد حیات کی لگھی نہ چلانے لگے
ہاتھوں میں لگھی کی جائے تو کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ جو بال نازک ہیں، وہ شاید
کشی کی نہ محبت برداشت نہیں کر سکتے۔

۳۔ لغات : تمثال : مجسمہ، پیکر۔

شرح : ہم نے ناز کا جو پیکر تیار کر رکھا ہے، یہ صرف اعتبار کی چیز کی کارکردہ
ہے۔ یعنی محض ایک اعتباری شے ہے۔ اگر ہم اعتبار کا آئینہ سامنے نہ رکھیں تو جیسا کیا حیثیت
رکھتی ہے، وہ تو عدم ہے؟

مطلب یہ کہ اس دنیا کی ہر شے محض اعتبار کا کرشمہ ہے۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

شرح : بہر حال پردہ دن یعقوب الی خاک سے

حضرت یعقوب کی
وام۔ لیتے ہیں پردہ پردہ، پیراہن کا، جو
روح کو آدم و حوا سے

پہنچانے کی غرض سے حضرت یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو خاک کے بازوؤں سے پر ہوا ز
قرن بنتی ہے۔

مطلب یہ کہ اڑنا خاک کی فطرت میں داخل ہے۔ حضرت یوسفؑ مصر میں تھے۔ انھوں
نے والد ماجد کے بیٹے اپنا پیراہن نشان کے طور پر بھیجنا چاہا۔ حضرت یعقوبؑ کو کنعان میں
پہلے ہی پیراہن کی خوشبو آگئی جسے قرآن مجید نے حضرت یوسفؑ کی خوشبو قرار دیا، کیونکہ حضرت
یعقوبؑ کی زبان سے ارشاد ہوتا ہے۔ ”اِنِّیْ لَآخِذٌ بِرَبِّیْ یُوسُفُ“، ”تجلی تو میرے رب یوسفؑ کی
خوشبو آ رہی ہے۔“ میرزا فرماتے ہیں کہ پیراہن کی خوشبو نے خاک سے پر ہوا ز اوجھا رنگ
لیا تاکہ حضرت یعقوبؑ تکلیف پر درمی کی جا سکے۔

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے برسونیدل
شرح : کل میرا محبوب اپنے
دردِ جدائی اسداشہ خاں نہ پوچھ
ماں ہمارے کراٹھا
کہ اسداشہ خاں کا جو حال جدائی نے کر دیا ہے، وہ پوچھنا بیان کرنے کے لائق نہیں۔

خلق ہے صفیرِ عبرت سے سبقِ ناخوا زہ
شرح : ۱۔ خلق : مخلوق نے عبرت کے
درد نہ ہے چرخِ وز میں یک ورقِ گروان زہ
صحنے سے سبق نہیں
دیکھ کر بارہ پرستوں کی دل اندر و گیاں
پڑھا یعنی عبرت حاصل
موج سے مثلِ خطِ جام ہے ہر جامانہ
نہیں کی، دردِ آسان
نوازشِ دل ہے زباں کو سببِ گفتِ بیاں
اور زمین اٹھ جوئے
ہے سخن، گرو ز دامنِ ضمیرِ انشا زہ
درد کے سوا کیا ہیں؟
درد اس لیے کہ لاکس
کے دو منے ہوتے ہیں

ایک آسمان، دوسرا زمین
 دونوں اُٹھتے ہوئے
 کوئی آگاہ نہیں باطن ہمدیگر سے
 ہے ہر اک فرد، جہاں میں، ورقِ تاخواندہ
 ورقِ چمن، یعنی گردش
 میں اٹھتے بارے ہیں
 اور انہیں کوئی غائب نظر
 نہیں، لیکن دنیا عبرت
 یعنی ہیں ماندہ ازاں سوہ ازیں سوراندہ
 حاصل نہیں کرتی۔

۲۔ شرح : شراب خانے میں شراب نوشوں کی افسردگی کا یہ عالم ہے کہ
 شراب کی موج بھی پیاسے کے غط کی طرح اپنی جگہ ششکر کر رہ گئی ہے۔
 اس شعر کی ایک صورت یہ بھی ہے۔

دیکھو کہ بارہ پرستوں کی دل افسردگیاں
 موج نے خیلِ خطِ جام سے ہر ماندہ
 ۳۔ شرح : دل میں کوئی بات پیدا ہوتی ہے تو زبان کے پیسے کچے کھٹے اور بیان کرنے
 کا موقع ملتا ہے۔ گریا جو کچھ ہم کہتے ہیں، وہ ضمیر کے دامن سے جھٹکی ہوئی گڑ ہوئی ہے۔
 مطلب یہ کہ جب تک ضمیر میں کوئی بات پیدا نہ ہو، اسے بیان کرنے کا موقع کیونکر آئے
 گا : اس بنا پر بات کو دامنِ ضمیر سے جھٹکی ہوئی گڑ قرار دیا۔

۴۔ شرح : کوئی بھی ایک دوسرے کے دلِ بھید سے واقف نہیں۔ گویا اس دنیا
 کا ہر فرد کتاب کا ایسا ورق ہے، جو کبھی مطالعے میں نہیں آیا۔

۵۔ شرح : اے غالب ! ریاکاروں کی نامرادی پر دلِ افسوس ہے۔ انہیں لوگوں
 پر یہ مثل صادق آتی ہے ازاں شو ماندہ و ازیں شوراندہ (اس طرف سے پیچے رہا ہوا اور اس طرف
 سے دھتکارا ہوا، نہ اُدھر کا، نہ اُدھر کا، نہ دنیا کا، نہ دھج کا)۔

شرح : واسطے فکر مضامین متین کے 'غالب' !
 چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرمیدہ
 اے غالب ! بہتہ
 مضامین سوچنے کے

یہ ضروری ہے کہ خاطر جمع اور دل آسودہ ہو۔

تا تخلص جامہ شکر فی ارضا فی اسد ! لغات :

جامہ شکر فی :

شکر کے رنگ کا لباس۔

شاعری جز ساز و روشی نہیں، حاصل پر پوچھے

ہے اس لیے کہا کہ جب شاعروں کے دیوان علم سے لکھے جاتے تھے تو تخلص کو نمایاں اور واضح رکھنے کے لیے رنگین روشنی سے لکھتے تھے۔

شرح : اسے اسد تخلص کے لیے رنگین جامہ تجھے مبارک ہو۔ اس سے ظاہر

ہے کہ شاعری درویشی کے سر و سامان کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

درویش بھی عموماً ایسے رنگ کا جامہ پہن لیتے ہیں جس میں لباس جلد میل نہ ہو، لہذا تخلص کو رنگین رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر نے درویشی کا جامہ پہن لیا۔ اس سے غائدہ کچھ نہیں ہو سکتی۔

شکوہ و شکر کو شمر، بیم و امید کا سمجھ

۱۔ شرح :

ہمارا شکوہ اور شکر امید

بیم کا میل ہے۔ امید

بدی ہو جاتی ہے تو شکر

کرتے ہیں، بیماری نہیں

ہوتی تو شکایتیں شروع

کرتے ہیں۔ عقل کا غائدہ

خراب ہو، جامہ دل کیا

ہے، ایک بد اور مصیبت

خانہ آگہی خراب، دل نہ سمجھ، بلا سمجھ

گاہ بہ غلہ امیدوار، گہ بہ جحیم بیم ناک

گرچہ خدا کی یاد ہے، کلفت ماسوا، سمجھ

نے سرو برگ آرزو، نے رہ در رسم گفتگو

اے دل و جانِ خلاق تو، ہم کو بھی آشنا سمجھ

ہے و بول ہمارے لیے ہے کرنا چاہا، ہم ہر وقت شکر پر کاہ بند بختے۔

۲۔ لغات : بحیم : دوزخ، بہمن۔

ہیم ناک : ثور ہوا، خوف زدہ۔

شرح : ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں، مگر اس لیے کہ ہمیں بہشت کی امید ہوئی ہے اور دوزخ سے ڈرتے ہیں۔ سوچا چلیے کہ یہ کس اختیار سے خدا کی عبادت ہے؟ یہ تو خدا کے ہوا جو کچھ ہے، اس کے لیے زحمت اور کھنت میں مبتلا ہیں۔

کئی مرتبہ بیان کیا گیا کہ میرزا غائب کا فلسفہ ہوا اور سزا سب سے الگ ہے۔ وہ بہشت کی امید اور دوزخ کے خوف سے خدا کی عبادت کو خدا نہیں، ماسوا کی عبادت سمجھتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں :

ملاعت میں تاسہ نہ دے درگیں کاک
دوزخ میں فلل دو کوئی نے کی بہشت کو
یہی مضمون اس شعر کا ہے۔

۳۔ شرح : نہ ہمارے لیے آرزو کا کوئی سامان ٹوٹے ہوتا کیا ہے، نہ بات نہیت کی رائے سم پیدا ہوئی ہے۔ اسے خلق کی جان اور دل آخر میں کیوں جیگانے سمہ رہا ہے؟ ہم سے بھی ناخداؤں کا سا سلوک رہا رکھو۔

شرح : گو تم کو رضا جوئی اختیار ہے، لیکن
اے محبوب! اگرچہ تم
جاتی ہے ملاقات کنب ایسے سببوں سے
غیروں کی رضا جوئی میں
سرگرم رہتے ہو اور انھیں کی خوشی کا تمہیں خیال رہتا ہے، لیکن کیا ایس باتوں سے ہم ملاقات
چھوڑ دیں گے؟ یہ ممکن نہیں۔

شرح : مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
اے کینے آسان کی گزرا
کہیں ہو جائے جلد اسے گردش گردوں دوسرے بھی
تو نے جو کچھ میرے متعلق
سوچ رکھا ہے، مجھے معلوم ہے۔ تو جو کچھ کرنا چاہتی ہے، جلد کر گزرا تاکہ میں امید و ہم کی

کشفِ کش سے نجات پاؤں ۔

کرتے ہو شکوہ کس کا ہتم اور بے وفائی
سرپٹتے ہیں اپنا ہم اور نیک نامی

۱۔ شرح :
اے محبوب ! تم کس
کی شکایت کرتے ہو ؟
بھلا تم سے بے وفائی ممکن
ہے ! ہم اپنا سرپیٹ
رہتے ہیں ۔

ہمارے نصیب میں کب بیک نامی ہوئی !

۲۔ شرح : بالوس اور تانیہ کی میں اسد کو ساقی کی بھی ضرورت نہ رہی۔ ہم نے
مانا کہ ساقی دریا کے طہلے و گرم سے، لیکن ہم مستہ ایسے ہیں کہ دریا سے بھی پیاس نہیں بھالتے

گر مصیبت متھی تو غربت میں اٹھالیتے اسد
میری دہلی ہی میں ہوئی متھی یہ خواری ہٹے ٹٹے

۱۔ شرح :
اے اسد ! اگر مصیبت
ہم پر آنے والی تھی تو

کاش ! ہم پر ایسے وقت آتی، جب وطن سے باہر ہونے اور کسی کو اس مصیبت کا پتہ نہ
چلتا، لیکن اسے کیا کیجیے کہ یہ ذاتِ وفادار ہی ہیں وہی ہیں میں اٹھانی تھی اور اٹھانی ۔

کیا غم ہے اُس کو جس کا علیؑ سا امام ہو ؟
اتنا بھی اُسے فلک زدہ کیوں بے حواس ہو ؟

۱۔ شرح :
جس شخص کو حضرت علیؑ کا
سا امام نصیب ہوا ہے

کیا غم ہو سکتا ہے ! اُسے آسمان کے اُسے ہونے ! تو اتنا بے حواس کیوں ہے ؟
مطلب یہ کہ بیشک آسمان سے ہیں نزل پانچے، مگر ہم تو حضرت علیؑ کی یاد میں بیٹھے ہیں

پھر یہ اسی کے کیوں کام میں؟ ہیں کوئی غم نہیں ہو سکتا۔

شرح :- امام ظاہر و باطن، امیر صودت و معنی
ظاہر و باطن کے امام
علی ولی، اسد اللہ، جانشین نبیؐ ہے
اور صورت و معنی

کے امیر حضرت علیؑ ہیں، جو ولی ہیں، اللہ کے شیر ہیں، ہی اکرم (صلعم) کے جانشین ہیں

شرح :- بے چشم دل نہ کہ ہوس سیر لالہ زار
اگر تو لالہ زار کی سیر کو
یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے
نکھ تو دل کی آنکھ کھول

بغیر نہ نکل۔ حقیقت یہ ہے کہ میان کی ایک ایک پٹھری چھوٹی کر رکھی گئی ہے۔ یعنی
لالہ زار کا کوئی پتہ، کوئی پہول، کوئی پٹھری ایسی نہیں جس سے دل کی آنکھ میگزوں جہز میں
اور ہمیر تین حاصل نہ کرے۔

۱۔ شرح :- تا چند پست فطرتی طبع آرزو؟
اے خدا! میں کب
یا رب! ملے بندِ دست و عا مجھے
کب طبع آرزو کو پست
یک بار امتحان ہوس بھی ضرور ہے
فطرتی کا شکار ہوں گا؟
اے جوشِ عشق بادۂ مردِ آزما مجھے
یعنی کب تک بھول جھٹتی
آرزوؤں میں میری

زندگی گزارے گی؟ کو لطف و کرم سے میرے دست و دعا کو باندھی مٹا دے۔ یعنی میں ایسی
دعائیں مانگوں، جو انسان جیسے اشرف المخلوقات کے لیے زیبا ہوں۔

۲۔ شرح :- اے جوشِ عشق! واقعہ ہوس کی آزمائش بوجہانی چاہیے۔ موبانی

فرما کر مجھے ایسی شراب دے، جس سے مردوں کی آزمائش کی جاتی ہے اس طرح تجھے اندازہ ہو جائے گا کہ تیں بعض بوا موس ہوں یا حقیقت میں مرد میدان ہوں جو ہر قسم کی کڑیاں جھیل سکتا ہے۔

بہا یاں تک ہے اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر
 شرح : آنسوؤں کے ساتھ
 کہ چشمِ ترمیں ہر اک پارہٴ دل، پائے دیرِ گل ہے
 دل کی کدورت کا غبار
 بھی دس تھر پہ گیا کہ کپڑے کی صورت پیدا ہو گئی اور اشکبار آنکھوں میں دل کا جو کٹھن پہنچا، اس کا پاؤں کپڑے میں دھنس گیا۔

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے، اسدا
 شرح : اے استادِ ہم وصل
 لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزِ گار کے
 کے سوچ بچار اور جوابی
 کے غم کا خودِ مشق بنے ہوئے ہیں۔ ہم دنیا کا غم کھالے کے لائق نہیں رہے۔

پیدا کریں دماغِ تماشا سے سرودِ گل
 ۱۔ شرح : جو لوگ حسرت کا شکار
 حسرت کشوں کو ساغرِ دینا نہ چاہیے
 ہیں، انھیں شراب
 دیوانگیاں ہیں حاملِ رازِ نہاںِ عشق
 کی صراحتی اور پیا لہ
 اے بے تمیز گنج کو دیرانہ چاہیے
 دور کار نہیں، انھیں تو
 ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سرورِ بخشش
 یہ خودِ مسد پیدا کرنا چاہیے
 کہ سرور اور پھول کا
 چمیاں سے ہم گزر گئے نہ پیمانہ چاہیے
 نظارہ کریں۔

سرور کو پیتا اور سانسز کو گل سے نشیہ دے گئی ہے۔

۲- شرح : دلوانے حق کے چھپے ہوئے ہمید دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو، خزانہ دہی کرنے کے لیے ویرانہ ہی بہتر ہے۔

۳- شرح : اسے ساقی! فصل بہار سرور پیدا کر رہی ہے۔ ہم نے ترک شراب کا جو عہد کیا تھا، وہ چھوڑ دیا، یہیں اب شراب کے پیالے کی ضرورت ہے۔

شرح : وقت اُس افتادہ کا خوش، جو قناعت کے آس
اے آس! دعا ہے
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے
کہ اس شخص کا وقت
خوش خوش گزرے، جو قناعت کر کے بیٹھا ہے، یہاں تک کہ چوٹی کے پاؤں کا نقل بھی
دیکھے تو اسے سلیمان کا تخت بھلے۔

شرح : اسے سرشوریدہ! ذوقِ عشق و پاسِ آبرو
اے سراپا میں
جوشِ سودا کب حریفِ منتِ دستار ہے
جو شہ جنوں بھرا ہوا
ہے، تجھے صرف عشق کے ذوق اور آبرو کی پاسداری سے واسطہ ہے۔ بھلا جوشِ جنوں دستار
کا احسان کیونکر گوارا کر سکتا ہے؟

مطلب یہ ہے کہ دیوانے کا سر تو برہنہ ہی رہنا چاہیے، اسے دستار کی آرائش سے
کیا واسطہ؟ وہ تو صرف عشق کے ذوق اور دیوانگی کی آبرو قائم رکھنے کے لیے وقف ہے۔

شرح : ترے لوگ ترے در پر آس کو ذبح کرتے ہیں
اے حق ڈھانے والے
ستگر، ناخدا ترس، آشنا کش، ماجرا کیا ہے؟
خدا سے بے خوف

اور دوستوں کو فنا کے گھاٹ اتارنے والے محبوب ! نوکر تیرے دروازے پر اسٹر کو درج کر رہے ہیں، بھلا یہ تو بتا، ہوا کیا ! اس نے کون سا گناہ کیا ہے !

وا کیا ہرگز نہ میرا عقدہ تارِ نفس
ناخنِ بریدہ ہے تیغِ صفا مانی مجھے
شرح : میرے سامنے کے
تار میں جو گرہ چمک رہی تھی، اسے کھولا دیا۔ اصفافی تلوار بھی میرے لیے کٹا ہوا ناخن بن گئی۔
ظاہر ہے کہ کٹے ہوئے ناخن سے کوئی گرہ کٹ نہیں سکتی، اس لیے کہا کہ اصفہان کی
تلوار ناخن بریدہ بن گئی، گویا بالکل بیکار رہ گئی۔

۱- شرح :
اے حسن ! تو ختمِ موت
میں ہوا، بھی دیکھا۔ آخر
عاشق کب تک جیسا ہوا
خیال کا آئینہ دیکھتا ہے !
یہیں محض تصورِ مرکب
تک تفاوت کی جہت ہے !
حسن کو آنکھوں کے سامنے
بھی تو جیوہ افروز ہوا تھا !
تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن ! کب تک
آئینہ خیال کو دیکھا کرے کوئی ؟
عرضِ سرشک پر ہے فضا سے زمانہ تنگ
صحرا کہاں جو دعوتِ دریا کرے کوئی
وہ شوخ اپنے حسن پر مغرور ہے، اسد !
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑ کرے کوئی

۲- شرح : آنکھوں میں آنسوؤں کے فرش کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے، وہ ڈھلنے
کی فضا میں ساد سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی صحرایاں نہ ہو، جس کے کنارے ٹاپید ہوں،
دریا کو بہاؤ کی دعوت کیوں کر دی جاسکتی ہے !

مطلب یہ کہ جس طرح دریا کے بہنے کے لیے بہت وسیع میدانِ دریا ہے، اسی

طرح میرے آنسوؤں کے لیے بہت لمبی جیسی فضا ہونی چاہیے۔

۱۴۔ شرح : اسے استدا، میرا شوخ محبوب جس پر بہت مفرد ہے۔ اب اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ اسے آئینہ دکھا کر توڑتے رہیں !

دکا کر آئینہ توڑنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس کا مفرد ختم ہو جائے، کیونکہ مفرد کو ہوا دینے کا ذریعہ آئینہ ہے، یعنی وہ آئینہ دیکھتا ہے تو دل میں مفرد پیدا ہوتا ہے۔ اسے توڑ دیا جائے تو مفرد کا سبب ختم ہو جائے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ آئینہ دکھا کر توڑیں گے تو اس کے حسن کی فائش کے لیے ایک آئینے کی جگہ بیسیوں ٹکڑے پیدا ہو جائیں گے کیونکہ ہر ٹکڑا ایک مستقل آئینہ ہو گا۔ یوں اس کے مفرد کی تکلیف کے لیے خاصا سامان فراہم ہو جائے گا۔

شرح : یارب! ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائی

یہ محشر خیال کہ دنیا کسیں جے
اسے پروردگار! ہمیں
تو خیال کا وہ بشر خواب
میں بھی نہ دکھاتا، جسے دنیا کہتے ہیں۔

اس شعر میں دنیا کو خیال کا ایک جنگمہ قرار دیا گیا ہے، یعنی اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ پھر اس سے بیزار آدمی کا یہ عالم ہے کہ خواب میں بھی اس کی صورت نہ دیکھنا منظور نہیں،

شرح : مقررہ در پردہ، یعنی جو کہوں باطل سمجھ

وہ فرنگی زادہ، کھاتا ہے قسم انجیل کی
میرا محبوب فرنگی زادہ
ہے اور وہ جو وعدہ کرتا

ہے، اسے پتہ خاطر کرنے کے لیے انجیل کی قسم کھاتا۔ یہ اس کا اصل مقصد ہے کہ میں جو وعدہ کرتا ہوں، اسے سرسبز بھوٹا سمجھ۔

انجیل کی قسم کھانے کے وعدے کو بھوٹا سمجھنے کی دلیل اس لیے قرار دیا کہ انجیل بیشک

خدا کا کلام ہے، لیکن قرآن مجید کے نزول سے منسوخ ہو چکی ہے، اور منسوخ کلام الہی کی قسم کھانی حرام نہ ہوتی چاہیے۔

کیا ہے ترک دنیا کا اصلی سے
ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
خراج دیر، ویراں، یک کف خاک
بیاباں! خوش ہوں تیری عالمی سے
اسد! قربان لطف جو رہ بیدل
خبر لیتے ہیں، لیکن بیدلی سے

۱۔ شرح :
ہم نے دنیا کو قناعت
یا عالمی ہستی کی بنا پر نہیں،
بلکہ شوق اور کمالی کی بنا پر
چھوڑا ہے ایسا ترک
سراسر بے سود ہے،
اس سے ہمیں کیا فائدہ
ہو سکتا ہے۔

یہی مضمون

دوسرے مقام پر یوں کہا :

ضعف سے ہے، نے قناعت سے یہ ترک جستجو

ہیں وہاں تکیر گاہ جست مراد ہم

۲۔ شرح : جو گاؤں بے چراغ ہو، اس سے ایسے غمگین کی جگہ کی سوا کیا وصول ہو
سکتا ہے؟ مین جب کوئی دیں آباد ہی نہیں تو خراج کہاں سے آئے گا؟ اسے بیاباں! میں خوش
ہوں کہ میرے پر ویزی غلامی ہوئی جس میں کسی کو کچھ لینا دینا نہیں پڑتا۔
شیخ سعدی فرماتے ہیں :

کہ سلطان نہ خواہد خراج از خراب

نقدیری نے کہا ہے :

بہتان گنج بردہ کیسے منسارہ اند

وہ خراج بردہ ویراں نہ بودہ شرط

۳۔ شرح : اسے اسد! میں میرزا بیدل کے لطفِ ہمدرد پر قربان ہو جاؤں ،
 مجھ پر تو جبر تو فرماتے ہیں ، مگر ذرا بیدل کی ہے ۔
 یہ بھی اسی زمانے کی غزل ہے ، جب میرزا بیدل کا اثر بہت زیادہ تھا ۔

شرح : خرابات جنوں میں ہے ، اسد ! وقتِ قدح نوشی
 اسے اسد ! دیوانگی کے
 بہ عشقِ ساقی کو شر ، بہارِ بادہ پیانی
 میخانے میں شراب بھو
 پیالہ پیئے کا دل آگیا ۔ ساقی کو شر کے عشق میں شراب نوشی کی بہار کا لطف ہے ۔

شرح : رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر ، اسد !
 اسے اسد ! غفلت
 بیچ و تابِ دل ، نصیبِ خاطر آگاہ ہے
 کے نوگر جس آرام اور
 آسائش سے رہتے ہیں ، اس پر رشک آتا ہے اور میرٹ ہوئی ہے کہ ان میں کیوں کوئی احساس
 پیدا نہیں ہوا ۔ سچ ہے ، وہی دل بیچ و تاب کا مرکز ہی سکتا ہے ، بھرا گا ہی ۔ صبر و برد
 ہو ، جس نے غفلت سے کام لیا ، اس میں احساس کیونکر پیدا ہو سکتا ہے ؟

شرح : ہم نشینیِ رقیباں گرچہ ہے سامانِ رشک
 اسے محبوب ! تو
 لیکن اس سے ناگوار اترے بدنامی تری
 رقیبوں کے پاس بیٹھنا
 ہے ، اس پر یقیناً مجھے رشک ہونا چاہیے ، یعنی یہ کہ میرے پاس کیوں نہیں بیٹھتا ؟ یہ سب
 کچھ اپنی جگہ درست ہے ، لیکن میرے لیے اس سے بھی زیادہ ناگوار امر یہ ہے کہ رقیبوں
 کے پاس بیٹھنے سے تیری بدنامی ہوتی ہے ۔

شعر سے صاف واضح ہوتا ہے کہ عاشق نے رقیبوں کی عشقینی پر محبوب سے شکایت

کی۔ اس نے جواب دیا کہ شکایت تیرے رشک کا نتیجہ ہے۔ عاقل جواب دیتا ہے کہ رشک
رہلک بھی ہے، لیکن اس سے زیادہ بڑی تجزیہ ہے کہ تو بدنام ہوتا ہے۔

کیا کروں، غم ہائے پنہاں سے گئے صبر و قرار : شرح :
کیا کروں، میرے بچے
ہوئے غم صبر و قرار چھوٹیں
دزدگر ہو خانگی تو پاسباں معذور ہے
کڑے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر چوری کرنے والا گھر کا آدمی ہو تو چکیدار کو معذور سمجھنا چاہیے۔
کیونکہ وہ تو باہر سے آنے والوں کے سلسلے میں روک ٹوک کرے گا، گھر کے ہر آدمی پر پہلا
مذہبے گا۔ غم ہائے پنہاں اندر کے چھوٹتے۔

۱۔ شرح :
۱۔ تسلی کی حسرت ہے، ۲۔
بے قراری کا ذوق ہے، ایک
درو کے ساتھ سیکڑوں
دوایں اور ایک ہاتھ کے
ساتھ سیکڑوں دوائیوں میں
نے حسرت تسلی نے ذوقِ بے قراری
ایک درد و صدوہا ہے، ایک دست و دعا ہے
جست خانے میں اسد بھی بندہ تھا، گاہ گاہ ہے
حسرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے
جب درد کے ساتھ دوا اور خرد و رست کے وقت و محامو جو ہو تو تسلی کی حسرت وہ نکلتی ہے، ۲۔
جہاں کی کوئی وجہ باقی رہتی ہے۔

۲۔ شرح : اسد بھی کبھی کبھی تنہا نے ہی زندگی کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ اب آپ
حرم کو جا رہے ہیں، آپ کا خدا حافظ۔

اب ہو جاتے ہیں ننگِ بہت باطل سے مرد : شرح :
غیرت دے لوگ
جھوٹی جنت کی حشر
اشک پیدا کر اسدا گر آہ بے تاثیر ہے

سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ اسے اسدا اگر تیری آہ میں تاثیر نہیں رہی تو انسو ہانا خوب کر سے۔
 آہ کا بے تاثیر جوتا واقعی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس میں کوئی قوت نہیں اور اس وجہ سے
 وہ با عیب شک ہے۔ جو انسو ایسی حالت دیکھ کر پانی پانی ہو جاتے ہیں کر کیا وجہ ہے تو انسو
 پیدا نہیں کرتا؟

شرح : اسد نے کثرتِ دلہائے خلق سے جانا
 اسد نے بے شمار لوگوں
 کہ زلفِ یار ہے مجموعہ پریشانی
 کے دل محبوب کی زلف
 میں پھنسے ہوئے دیکھ کر یہ لیا کر یہ زلف پریشانی کا مجموعہ ہے۔

زلفِ محبوب میں عاشقوں کے دل پھنسے ہیں اور عاشقوں کے دل میں شہ پریشانی جوتے
 ہیں۔ جب بہت سے دل زلف میں پھنس گئے تو وہ پریشانی کا مجموعہ بن گئی اور بھائے
 خود بھی پریشانی کا مجموعہ ہے۔

۱۔ شرح : رخسارِ یار کی جو ہوتی جلوہ گسری
 زلفِ سیاہ بھی شبِ مہتاب ہو گئی
 مورچِ تبسم لبِ آلودہ رمی
 میرے لیے تو تیغِ سیہ تاب ہو گئی
 بیدادِ انتظار کی طاقت نہ لاسکی
 اسے جانِ بر لبِ آمدہ! بے تاب ہو گئی
 غالبِ زبکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
 آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی
 زلفِ کلابِ مہتاب اس
 لیے کہا کہ سخی تو دھڑکی
 بھیجے رات تاریک ہوئی
 مگر تنک نے چاندنی کی
 بہار پیدا کر دی۔
 جب محبوب
 کے رخسار جلوہ افروز
 ہوئے تو زلفِ سیاہ
 کی یہ کیفیت ہوئی کہ
 وہ چاندنی رات بن گئی۔

مطلب یہ کہ مجھ اور زوی کی فراوانی کے باعث زلف میں مایس چمک چمکا جوتی کہ اس کی سیاہی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی

۲۔ لغات : بیخ سیر تاب : بیخ کی جوتی نور پر نور کا عرق ڈال کر لگ گیا، نکھو دینے میں تو اس کا رنگ بخشنی ہوتا ہے۔ اسے بیخ سیر تاب کہتے ہیں۔

شرح : محبوب کے سہی کئے ہوئے لب پر مسکونی ہنٹ کی لہر آئی تو وہ میرے لیے بخشنی تواریج ہو گئی۔

۳۔ شرح : اسے یوں پر آئی جوتی ہاں : تو انتظار کا ظم و جبر برداشت نہ کر سکی اور نکل جانے کے لیے بیقرار ہو گئی۔

۴۔ شرح : اسے غائب : آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے۔ کہنا چاہیے کہ رنگ کی بوند یا موتی جو نکلتی، جو اٹھ نہیں آتا

شرح :

استاد اور شاگرد باوصف سامان بے تعلق ہیں اسے استاد : آزادوں

کے ساتھ سر و سامان ہیں

صنوبر گلستاں میں بادل آزادہ آتا ہے

جو تو اس کے باوجود وہ

بے تعلق رہتے ہیں اور کسی سے کچھ نہ فر نہیں دیکھتے۔ دیکھیے صنوبر بارخ میں آزادوں سے کہ

آتا ہے اور سب سے بے تعلق رہ کر اوپر نکل جاتا۔ ہے۔

سودہ صنوبر کو شاعر اس ہے آزاد باندھنے ہیں کہ وہ جست بند ہوتے ہیں اور ارد گرد کے

کسی پودے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

۱۔ شرح :

پتلا گاہ کو اور نگاہ آنکھ

کو دھن بجھتی ہے۔ کوئی

عزیز نگہ کو، نگہ چشم کو عددو جانے :

وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

نہ ہووے کیونکہ اسے فرض قتل الی و قنا

لو سے ہاتھ کے بھرنے کو جو دھن جانے

ایسا جلوہ دکھا کر میں جان بچوں، نہ تو جان سکے۔

مطلب یہ کہ سیری حالت ایسی ہے، نگاہِ اشقی ہے تو کچھ پتا نہیں جاتی اور آنکھ نگاہ کی دشمنی ہوئی ہے۔

۲- شرح : جو محبوب ہو میں ہاتھ بھر لینے کو دھوکہ دیتا ہے، بھلا اس کے نزدیک اس کی دانا کو قتل کرنا کیوں فرما نہ ہو؟

جب اس کے نزدیک وضو یہ ہے کہ ہوسے ہاتھ بھرے تو وہ یقیناً ہل دنا کو قتل کرے گا کیونکہ اُن کے سوا اور کوئی اپنے آپ کو قتل کے سہم میں نہیں کر سکتا۔

شرح : بادشاہی کا جہاں یہ خیال ہو غائب! تو پھر

کیوں نہ دہلی میں ہر اک ناچیز تو ابی کے

اسے غائب! جہاں بادشاہی کا وہ خیال ہو،

جو ہمیں نظر آ رہا ہے، لیکن کوئی نظام اور کوئی ترقیب نہ ہو تو دہلی کا ہر حقیر و ناچیز فرد کیوں تو ابی نہ کرے؟

۱- شرح : صبح سے معلوم آ شمارِ ظہورِ شام ہے

غافلان! آغازِ کار، آئینہٴ انجم ہے

کیا کمالِ عشقِ نقص آ بادِ گیتی میں ملے

پختگیہا سے تصورِ یایِ خیالِ خام ہے

صبح کے طوع ہوتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ شام ہونے کے نشان نمایاں ہو گئے۔ غفلت کے ساتھ ہر کام کا آغاز اس کے انجام کا آئینہ ہے۔

۲- شرح : یہ دنیا آسمانی عالموں سے بھری ہوئی ہے کما سے نقص آ بادِ نقصوں اور عالموں سے بھری ہوئی، قرار دینا مناسب ہے۔ یہاں عشق کا کمال کیونکر مل سکتا ہے؟

جہاں سب کچھ ناقص ہو، وہاں کامل کی تلاش عبث ہے، لہذا قصور کی پگھلی سڑسڑم خیالی ہے۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبزو پھر ہم کو کیا
آسمان سے بادۂ گلہام گو، برسا کرے
شرح : ہم تو اپنے شکے اور پیاسے کو بڑکڑا دیتے گئے۔

اگر آسمان سے پھول کے رنگ کی شراب برسات کی طرح بہہ پڑے، تو ہمیں کیا فائدہ؟ جہاں سے پاس شکے ہوتے تو بھر جیتے رہا۔ ہوتے تو تھوڑی تھوڑی کر کے پیتے رہتے۔ اب تو کچھ بھی نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اگر آسمان کے پاس کائنات کی برکات سے فائدہ اٹھانے کا سامان یا صلاحیت نہ ہو تو وہ برکات کتنی ہی زیادہ ہو جائیں، ان سے کوئی نفع نہیں اٹھایا جاسکتا۔

۱۔ شرح :
فریاد کہ ہم اس طفا کے لیے ہو حاصل نہیں ہو سکتی اور حاصل ہونے کے طریق بھی نہیں ہیں
کشا د عقدہ و شوار، کایہ آسمان ہے
فغاں کہ بہر شفا سے حصول ناشد فی دماغ نازکش، منت طیبیاں ہے
اسد ا جہاں کہ علی بر سر نوازش ہو
رہے ہیں۔

۲۔ شرح : اے اسد! جہاں حضرت علیؑ مہربانیوں کے لیے موجود ہوں، وہاں مشکل گروں کا کھنڈ اور عقود کا حل ہونا بہت آسان ہے۔

شرح :
اے اسد! میرے ہی دم سے شاعری
خامہ میرا تختِ سلطانِ سخن کا پایہ ہے
اے اسد! میرے ہی دم سے شاعری

کی دنیا آباد ہے۔ مگر شاعری کو بادشاہ فرض کر لیا ہاتھ تو میرا ظلم میں کھٹکتا
کا ایک ریا یہ ہے۔

۱۔ لغات : کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از کشکش
تجربہ : سب سے

ایک خشک رہنا۔ اے خوشا رندے کہ مرغ گلشن تجربہ ہے

شرح : کثرت اندوہ سے حیران و مضطرب ہے اسدا
اس دنیا کی کسی چیز سے

رہلہ ضبط قائم کر لینے کا یا علی! وقت عنایات و دم تاسید ہے

نتیجہ کھینچنے کے سوا کچھ نہیں۔ ہم تو اس رند کو خوش نصیب سمجھتے ہیں، جو تجربہ کے بنا کا طوطا ہے
یعنی جو نئی تعلقات سے ایک خشک رہتا ہے۔

۲۔ شرح : اسد غلوں کی کثرت کے باعث حیران و مضطرب ہو گیا ہے۔ اے حضرت
علی! یہ وقت ہے کہ اس پر عنایات ہوں اور اس کی مدد فرمائی جائے۔

شرح : اسد باوصف عشق بے تکلف، خاک گردیدن

غضب ہے گر غبار خاطر احباب ہو جاوے
اگرچہ اسد بے تکلف
خاک ہو جانے کی مشق

میں لگا رہا، لیکن کیا غضب ہے کہ اس کے باوجود وہ دوستوں کے دل کا غبار بھی جائے۔

۱۔ شرح : تاچند ناز مسجد و بُت خانہ کھینچے !

کب تک مسجد اور بت خانے
کے نازا ٹھاکے رہیں !

جوں شمع، دل بہ خلوت جاتا نہ کھینچے
کیوں نہ دل کو طبع کی طرح

وامان دل بہ وہم تماشا نہ کھینچے
عجب کے طوطا کھڑے

اے آدمی! انتخابات بے جا نہ کھینچے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
 دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچے
 حیرت، حجاب جلوہ و درشت خبار راہ
 پائے نظر بہ دامن صحرا نہ کھینچے
 گل سر بہ سراشارۂ جیب دریدہ ہے
 ناز بہار جز بہ تقاضا نہ کھینچے
 خود نامربن کے پائے اُس آشنا کے پاس
 کیا فائدہ کہ منت بیگانہ کھینچے
 ہے بے خمار نشہ خونِ جگر، اسدا
 دستِ ہوس بہ گردنِ مینا نہ کھینچے

میں نے جانیں؟

مسجد

تھانے کے ناز اٹھانے

کا مطلب یہ ہے کہ

کھڑا جان کی کشش

میں ابھے رہیں، محبوب

کے جلوہ کو سے میں پہنچ

جائیں گے تو یک ٹکاد

یک سوئی نصیب ہو

جائے گی اور کشش ختم

ہو جائے گی۔ آخر مسجد

اور تھانے کا مقصد بھی

یہ ہے کہ محبوب کے

جلوہ کو سے میں پہنچیں۔

۲۔ شرح :

نظارہ ایک وہم ہے اس کے لیے کیوں دل کا دامن کھینچیں اور خواہ مخواہ شرمناک
 اٹھانے سے کیا حاصل ہوگا؟

۳۔ شرح : محبوب کی خدمت میں عاجزی اور نیاز مندی کرنے کو تھک گئے،
 وہ کسی طرح راہ پر آیا اور ہم سے تعلق پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اب جی چاہتا ہے کہ
 عجز و نیاز اور خوفاً و کھلائے چھوڑ کر اس کا دامن حریفانہ اعلان میں کھینچیں۔

۴۔ شرح : حیرت جلوہ محبوب کے لیے پردہ بن رہی ہے اور دیوانگی
 نے راستے کے گرد و غبار کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ نگاہ کا پاؤں صراحت کے
 دامن کی طرف نہ لے جائیں۔

مطلب یہ کہ صحرانوردی اور وفات گردی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح محبوب کا جلوہ نصیب ہونے کے بجائے اس سے عروسی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ **شرح :** بھول سراپا پھٹے ہوئے گریبان کا اشارہ کر رہا ہے، یعنی جیس بھٹ و سر اسے اگر گریبان چاک کیے بغیر ہمارے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جیس بھی چاہیے کر بہار کا ناز اٹھائیں تو آقا سنے کی بنا پر اٹھائیں۔

۶۔ **شرح :** دوست کے پاس خود مکتوب بھی کر جانا چاہیے۔ اس مسئلے میں بیگانے اور نا آشنا کا احسان اٹھانے سے کیا حاصل ہے ؟

مطلب یہ کہ محبوب کے پاس پہنچنے کے لیے وسیلہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں جب تک خود کوشش کر کے دامن نہ پکڑیں گے، ویدار نصیب نہ ہوگا

۷۔ **شرح :** اے استاد! جس شخص نے خون جگر لایا، سمجھ لے کہ اس میں شراب مل گئی، جس کا لہر ہمیشہ قائم رہتا ہے اور اس میں آثار کی نگہبست نہیں ہوتی۔ پھر بتا لے کہ ان کی طرف دست جوئی کیوں کرتے تھائیں یعنی وہ شراب کیوں پیئیں، جس کا لہر متوازی دیر میں اتر جائے گا اور دوبارہ پینے کی ضرورت پیش آئے گی۔

خون جگر کی طراب پینے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں حقیقی عشق کا مذبذہ پیدا کیا جائے۔ جو ہمیشہ مست رکھے گا اور خمار کی فوجت کبھی نہ آئے گی۔

شرح : نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دور ساغر کی

میری محفل میں غالب! گردش افلاک باقی ہے

اے غالب! میری
محفل میں نہ تو چشم ساقی

کی حیرت ہے اور نہ پیا لے کا دور چل رہا ہے۔ یہاں صرف ایک گردش باقی رہ گئی ہے اور وہ آسمانوں کی گردش ہے۔ یعنی گردش روزگار نے میری محفل کو اس طرح تکیت کر دیا ہے کہ نہ اس میں شراب پلانے والا موجود ہے، نہ شراب بانٹی

جاتی ہے۔

نکاح :
 سنگ آلود سخت آمد و دوسر خود داری
 سنگ آلود سخت آمد
 معذور سبکداری، مجبور گراں جانی
 نقلی معنی، تقدیر سے بھر

میں گرا تو بھاری اور پوچھ کر اٹھائے دے اٹھے۔ یہ مثل اس وقت بولتے ہیں، جب کوئی کام چارو ناما چار کرنا ہی پڑے۔ یعنی کوئی بہت بڑی ذمہ داری آپڑے اور گریز ممکن نہ ہو۔

شرح : بھاری کام سر پر آپڑا ہے اور اسے پورا کرنے کی کوشش کیے بغیر چارہ نہیں۔ خود داری کے لیے درد سر پیدا ہو گیا۔ ایک طرف ہلکا پس ہے، جس نے بے بس کر رکھا ہے۔ دوسری طرف گراں جانی ہے جس نے بالکل مجبور بنا دیا ہے۔ ان حالات میں خود داری کا مقصد کیونکر پورا ہو؟

بظاہر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسان کے لیے بہری آزمائش ہے۔ ایک طرف وہ ہر چھوٹی بڑی مصیبت پر گھبرا جاتا ہے، دوسری طرف جان دے دینا اختیار میں نہیں۔ یہ اس ہمد انسان کے لیے لازم ہے کہ خود داری کی زندگی بسر کرے۔ یہ کام بڑا کٹھن ہے، لیکن اسے پورا کرنے ہی میں انسان کی شان ہے۔

شرح :

اے استاد! جوش
 جنوں کا، عالم ہے

جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
 صحرا بھاری آنکھ میں اک مٹھت خاک ہے

کہ ہمیں کچھ نظر نہیں آیا ، یہاں تک کہ یہاں بھی ہمارے نگاہ میں خاک کی ایک
نقطہ ہے۔

 ۵